بانی پاکستان
محمد علی جناح
شخصیت و سیاست
ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہان پوری

بانی پاکستان

محمد علی جناح

شخصیت و سیاست

مؤلف و مرتب

ڈاکٹر ابو سلمان شاہ جہان پوری

سندھ ساگر اکادمی

غزنی سٹریٹ اُردو بازار، لاہور

کتاب : بانی پاکستان محمد علی جناح: شخصیت وسیاست
مؤلف : ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہان پوری
ناشر : سندھ ساگر اکادمی
غزنی سٹریٹ، اُردو بازار، لاہور 0321-4650131

اشاعت اوّل: مارچ ۲۰۱۳ء
ضخامت : چھ سو تیس (۶۳۰) صفحات
قیمت : /-

واحد تقسیم کار
دارُالکتاب
کتاب مارکیٹ، غزنی سٹریٹ
اردو بازار، لاہور 7235094

قانونی مشیر
مہر عطاالرحمٰن، ایڈووکیٹ ہائی کورٹ، لاہور
فون: 0300-4083589

باہتمام
حافظ محمد ندیم
0300-8099774

فہرست

﴿حصہ اوّل﴾
محمد علی جناح کی شخصیت: افکار و حقایق کی روشنی میں!

حصہ دوم

محمد علی جناح: مطالعے کے چند دیگر پہلو

حصہ سوم

تاریخِ پاکستان کے چند اہم حوالے

حصہ چہارم

چند فکر انگیز مضامین اور قابلِ غور مسایل

حصہ پنجم

آزاد بنگال کی تحریک اور مسٹر جناح

حصہ ششم

انتظاریہ

کتاب : بانی پاکستان محمد علی جناح شخصیت و سیاست
مؤلف : ڈاکٹر ابو سلمان شاہ جہان پوری
ناشر : سندھ ساگر اکادمی
غزنی سٹریٹ، اردو بازار، لاہور 0321-4650131

اشاعت اول: مارچ ۲۰۱۳ء
ضخامت : چھ سو تیس (۶۳۰) صفحات
قیمت : /-

واحد تقسیم کار دارالکتاب

قانونی مشیر
مہر عطاء الرحمٰن، ایڈووکیٹ ہائی کورٹ، لاہور
فون: 0300-4083589

باہتمام
حافظ محمد ندیم
0300-8099774

فہرست

﴿حصہ دوم﴾

محمد علی جناح: مطالعے کے چند دیگر پہلو

حصہ سوم

تاریخِ پاکستان کے چند اہم حوالے

﴿حصہ چہارم﴾

چند فکر انگیز مضامین اور قابلِ غور مسایل

﴿حصہ پنجم﴾

آزاد بنگال کی تحریک اور مسٹر جناح

﴿حصہ ششم﴾

انتظاریہ

﴿حصہ ہفتم﴾

ضمیمے

حرفے چند:

اصل شخصیت کی تلاش!

جدید قومی ریاستیں اُس وقت تشکیل پائیں جب کیتھولک چرچ زوال پذیر ہو کر اپنی اہمیت کھو رہا تھا۔ جدید قومی ریاست کی تشکیل مذہب کے پیٹرن پر کی گئی۔ اس میں مذہب جیسی علامتیں تھیں۔ انداز اور اطوار تھے، احترام اور تقدس تھا، مذہب میں بانی مذہب کے مقابل قومی ریاست میں بانی قوم اور بانی ریاست قرار پایا۔ کتاب کے بالمقابل آئین سامنے آیا۔ عبادات کی جگہ ترانے نے لی۔ قومی پرچم کا احترام بھی مذہبی سطح پر کیا جانے لگا۔ سرحدوں کا تقدس مذہبی تقدس جیسا ہو گیا۔ مذہب میں اولیا اور شہدا ہوتے ہیں، قومی ریاستوں میں بھی قومی ہیرو اور شہید سامنے آئے۔ یہ بات دنیا کی ہر قومی ریاست میں اپنائی گئی۔

پاکستان بھی ایک قومی ریاست کے طور پر وجود میں آیا، مگر اتفاق سے یہاں آئین اور جغرافیے کی تقدیس تو متعارف نہ ہوئی کہ اس کے بعض خصوصی اسباب تھے، مگر بانی قوم کی تقدیس بہر حال متعارف ہوئی۔ اس تقدیس کے لیے مذہبی علامات بھی استعمال کی گئیں۔ مسلمان اُمت میں اکابر و اولیا کے لیے حضرت اور رحمۃ اللہ علیہ کے سابقے اور لاحقے استعمال کیے جاتے ہیں۔ بانی پاکستان کے لیے بھی یہ سابقے اور لاحقے استعمال کیے گئے۔ انھیں بانی مذہب کی سی تقدیس دی گئی، حالانکہ وہ عمر بھر مذہبی شخصیت نہ رہے تھے۔ ان کا پیدائش کا تعلق ایک ایسے فرقے سے تھا، جسے عامۃ المسلمین صحیح العقیدہ تو کیا مسلمان بھی خیال نہیں کرتے۔ ان کے بارے میں یہ خبر ملتی ہے کہ انھوں نے پیدائش کا عقیدہ ترک کر کے اثنا عشری شیعیت قبول کر لی تھی۔ یہ خبر درست ہو تب بھی سُنّی مسلمان کے ہاں شیعہ پسندیدہ مسلمان نہیں ہیں۔ اس کے باوجود انھیں حضرت قایداعظم رحمۃ اللہ علیہ کہا اور سمجھا جاتا ہے۔ اُن کی قبر پر اولیاء کے مزارات کی طرح کا ایک مزار بنایا گیا ہے۔ جہاں حاضری

دی جاتی ہے اور پھولوں کی چادریں چڑھائی جاتی ہیں۔ یہ سب کچھ سرکاری اور عوامی، دونوں سطح پر کیا جاتا ہے۔

مسٹر جناح کو اس قدر تقدس دے دیا گیا کہ آج اُن کی شخصیت اس تقدس میں گم ہو کر رہ گئی ہے۔ اصل شخصیت صرف دھندلائی نہیں، مسخ ہو گئی ہے۔ اُن کی ذات کو اس قدر بدل دیا گیا ہے کہ اب وہ ایک بیرسٹر، ممبئی کے ایک امیر آدمی، ایک ماڈرن پارسی لڑکی کے ادھیڑ عمر خاوند، ایک سیاستدان، مغربی طرزِ زندگی میں مگن شخص نہیں لگتے، ایک عابد شب زندہ دار لگتے ہیں۔ ان کے بارے میں یہ مشہور ہے کہ انھوں نے بیٹی سے اس لیے اپنے تعلقات قطع کر لیے تھے کہ اُس نے ایک پارسی نوجوان سے شادی کر لی تھی۔ حالانکہ حقایق اس کی تائید یا تصدیق نہیں کرتے۔ اُن کی بیٹی نے ۱۹۳۸ء میں شادی کی اور ۱۹۴۲ء میں اُسے طلاق ہو گئی۔ مسٹر جناح نے بیٹی کی شادی پر گلدستہ بھیجا اور اُس کے لیے گھر کے دروازہ کھلے رکھے۔ یہ کہانی بھی گھڑ لی گئی کہ مسٹر جناح کی بیٹی نے نانی کے زیر اثر پارسی نوجوان سے شادی کر لی۔ کسی نے یہ تحقیق کرنا گوارا نہ کیا کہ نانی اُس وقت زندہ بھی تھی یا نہیں۔ اس طرح کی سو باتیں ہیں جو عقیدت کے تخیل سے تراشی گئیں اور عام کر دی گئیں۔ روایت تراشوں میں بعض نیک آدمی بھی شامل ہوئے۔ انھوں نے کھینچ تان کر اور روایت طرازی کر کے مسٹر جناح کو اپنے جیسا صحیح العقیدہ مسلمان ثابت کر دیا۔

مسٹر جناح کی ذات کو وہ تقدیس بخشی گئی کہ اُن کے کردار پر نہ کوئی داغ تھا نہ دھبا۔ ہر طرح کے داغ دھبوں سے پاک لانڈری میں دُھلا ہوا کردار ایک انسان کا نہیں ہوتا، ایک تخیلی خاکے کا ہو سکتا ہے۔ ان دنوں مسٹر جناح کی شخصیت گم ہو چکی ہے اور تصوراتی کردار ہمارے ذہنوں میں زندہ و پایندہ ہے۔ ایسے کردار کب تک زندہ رہتے ہیں اور ان میں پائیداری کس قدر ہو سکتی ہے، ہمیں معلوم تو ہے، مگر بتانے کا فایدہ کچھ نہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ کانچ کا بنا ہوا یہ کردار تو کسی بھی وقت ٹوٹ سکتا ہے۔ ان دنوں علوم کے لیے جغرافیائی سرحدیں تو وجود نہیں رکھتیں۔ انٹرنیٹ نے ہر کسی کے سامنے جامِ جم سجا دیا ہے۔ اب کوئی نوجوان کسی مغربی مصنف کی تحریر پڑھ لے اور اس میں ایسی باتیں بھی پڑھ لے جو تصوراتی

کردار میں تو نہیں ہیں، مگر ایک زندہ کردار میں تو عام ملتی ہیں، یا کم کم ملتی ہیں، مگر محمد علی جناح کے کردار میں موجود تھیں۔ ایک نوجوان یہ باتیں پڑھ کر کس طرح ردعمل ظاہر کرے، کس انداز میں اپنا رویہ سامنے لائے گا، آپ خود ہی سوچ لیجیے۔

مسٹر جناح ایک شخص تھے، وکالت بھی کرتے تھے، کاروبار بھی، سیاست بھی کرتے تھے اور زندگی بھی۔ ان کے ہاں کمزور لمحے بھی تھے۔ ان کمزور لمحوں کو چھپانا سیاسی ضرورت سہی، مگر یہ کب تک چھپائے چھپیں گے۔ ان کے دوستوں کی روایتوں اور حکایتوں میں ان کے رفقا کی یادوں اور یادداشتوں میں بہت کچھ پڑھنے کو ملتا ہے۔ یہ بہت کچھ اس سب کچھ کی نفی کرتا ہے۔ جو ہم نے مسٹر جناح کے تصوراتی کردار میں سجا رکھا ہے۔ ان کے رفقا نے بہت کچھ لکھا تھا، وہ سب کچھ جھوٹ تو نہیں تھا۔ حقایق ان کی تائید کرتے ہیں۔ مثلاً وہ ایک سیکولر طرز کی زندگی بسر کرتے رہے۔ ان کی زندگی میں مذہب کا گزر نہیں تھا۔ وہ اسلام کی بجائے مسلمانوں کی سیاست کر رہے تھے، بلکہ صرف مسلم لیگ کی سیاست کر رہے تھے جس کے وہ خود قاید بلکہ قاید اعظم تھے۔ انھوں نے کبھی اسلام کا مطالعہ نہ کیا تھا۔ نماز روزہ ان کی زندگی میں کہیں نظر نہیں آتا۔ محترمہ فاطمہ جناح کی جائیداد کے مقدمے میں سبھی گواہوں کا اس بات پر اتفاق نظر آتا ہے کہ انھوں نے محترمہ کو کبھی نماز پڑھتے نہیں دیکھا۔ یہ سب گواہ اُن کے قریبی لوگ تھے۔ مسٹر جناح کو کم ہی نماز پڑھتے دیکھا گیا۔ اب ایسے شخص کو اسلام میں بھی حرفِ آخر مان لیا جائے تو حقایق کب تک اس کی تصدیق کریں گے۔

مسٹر جناح کے معتقدین اُن کی ہر ہر بات کو حرفِ حق خیال کرتے ہیں اور مخالفین ہر بات کو حرفِ غلط سمجھتے ہیں۔ ان میں سے حق پر کون ہے اور حقیقت کیا ہے یہ تحقیق کا موضوع ہے۔ ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہان پوری ایک بڑے محقق بھی ہیں اور جرأت اظہار بھی رکھتے ہیں۔ وہ حق تلاش کرنا بھی جانتے ہیں اور حق کہنے کی ہمت اور حوصلہ بھی رکھتے ہیں۔ انھوں نے مسٹر محمد علی جناح کو ایک محقق اور مؤرخ کی نگاہ سے دیکھا ہے، عقیدت مند بن کر نہیں دیکھا۔ انھوں نے مسٹر جناح کے رفقا کی حکایتیں اور روایتیں یکجا کر دی ہیں تاکہ حقیقتیں جمع ہو جائیں وہ افسانے کی دنیا کے آدمی نہیں۔ نہ افسانے جمع کیے ہیں نہ اُنہیں سننا سنانا پسند کیا

تھا:

نہ شمم نہ شب پرستم کہ حدیث خواب گویم
چوں غلام آفتابم ہمہ ز آفتاب گویم

مسٹر جناح کے سیاسی فیصلوں کی بھی ایک طویل داستان ہے۔ وہ اینی بیسنٹ کی ہوم رول لیگ میں رہے۔ کانگریس میں وقت گزارا اور پھر مسلم لیگ کے ہو رہے۔ وہ اُن جماعتوں سے کیوں اور کیسے الگ ہوئے۔ پاکستان کا مطالبہ کس بنیاد پر کیا، مذہبی بنیاد پر یا سیاسی بنیاد پر۔ پھر ریڈکلف ایوارڈ میں اُن کی کارکردگی کیا رہی، بلکہ ریڈکلف کو کس نے اور کیوں تجویز کیا۔ ریاستی ہندستان میں الیکشن کیوں نہ ہوئے جب ۴۶-۱۹۴۵ء میں برطانوی ہندستان میں الیکشن ہوئے۔ ریاستی ہند میں الیکشن نہ ہونے کی وجہ کیا تھی اور ذمہ داری کس پر تھی۔ کشمیر پر پٹیل کی پیشکش مسترد کر کے حیدر آباد دکن کے لیے کیوں اصرار کیا گیا اور کس نے اصرار کیا۔ نتیجتاً حیدر آباد کے سقوط کا واقعہ بھی ہوا اور کشمیر میں بے گناہ مسلمان برسوں سے اپنا خون بہا رہا ہے۔ ۱۹۴۷ء میں جو فسادات ہوئے اُس کا ذمے دار کون تھا۔ کیا قیادت کا فریضہ نہیں تھا کہ وہ بروقت عوام کو آگاہ کرتی۔ کیا قیادت صرف اس بات سے بری الذمہ ہو جائے گی کہ یہ ہندو کی سیاست تھی۔ قیامِ پاکستان کے وقت دو قومی نظریے کو بہت شد و مد سے پیش کیا گیا۔ اس کا عملی مظاہرہ یہ ہوا کہ مسلمانوں کے خلاف بھی غیر مسلم متحد ہو گئے۔ دو قومی نظریہ اس شرف سے سامنے آیا کہ خونِ مسلم سے ہندستان کا جغرافیہ گلنار ہو گیا۔ دو قومی نظریے نے مسلمانوں کو غیر مسلموں کے خلاف اُبھار دیا، مگر مسلمان زیادہ دیر تک یکجا نہ رہ سکے۔ قیامِ پاکستان کے بعد مسلمان خود دو قوموں میں تقسیم ہو چکے تھے۔ ہندستانی مسلمان اور پاکستانی مسلمان دو قوموں کی صورت میں الگ الگ زندگی بسر کر رہے تھے۔ ۱۹۵۱ء کے سٹیزن ایکٹ نے اس حقیقت کو قانونی شکل دے دی کہ جنوبی ایشیا کے مسلمان دو قوموں میں تقسیم ہو چکے ہیں۔ پاکستانی مسلمان اور ہندستانی مسلمان۔

چوتھائی صدی بھی نہ بیتی تھی کہ ایک اور سچائی سامنے آئی کہ پاکستانی مسلمانوں میں یکجائی قایم نہ رہ سکی۔ مسلمان مسلمان کی گردن کاٹ رہا تھا۔ ۱۹۷۱ء کے سانحہ مشرقی

پاکستان میں کتنے ہی لاکھوں مسلمان ایک دوسرے کے ہاتھوں ذبح ہو گئے۔ یہ قتل و غارت اس بات کی دلیل تھی کہ مسلمانانِ پاکستان ایک قوم نہ تھے۔ دو قوموں میں بٹ چکے تھے، پاکستانی مسلمان اور بنگلہ دیشی مسلمان۔ ان دنوں قتل و غارت کا وہی منظر چشم فلک پھر سے دیکھ رہی تھی جو ۱۹۴۷ء میں دیکھ چکی تھی۔ دو قومی نظریے کے بھوت نے مسلمانوں کا پیچھا نہ چھوڑا تھا۔

ان دنوں پاکستان میں سیاسی منظر نامہ خاصا خوفناک ہو رہا ہے۔ قومیتیں ایک دوسرے کے خلاف صف آرا ہیں۔ لسانی قومیتیں پاکستانی قومیت کو نظر انداز کر رہی ہیں۔ ویسے تو دو قومی نظریے کے اسلام پسند دانشور بھی پاکستانی قومیت کو نظر انداز کرتے رہے ہیں اور ''ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لیے'' گہ گہ کر مسلمانوں کو ایک ایک کر دیا ہے۔ برادرانِ اسلام ایسے مومن ہیں جو کبھی مالِ غنیمت اور کشور کشائی کے بغیر ہی جہاد کرتے رہے کہ عالمی قوتوں نے انھیں اس کام پر لگایا تھا۔ ان دنوں یہ لوگ کبھی دیواروں پر ''گو امریکا گو'' لکھ کر خوش ہو لیتے ہیں کبھی سیاست چمکانے کے لیے ایک آدھ شہید ڈھونڈ لیتے ہیں۔ کیوں کہ ''شہادت ہے مطلوب و مقصودِ مومن''۔ واضح رہے کہ علامہ اقبال نے جب یہ مصرع کہا تھا تو ان کی مراد یہ تھی کہ مسلمان اپنی شہادت کا طالب ہے۔ ان دنوں ''مومن'' غریب نوجوانوں کی شہادت کو اپنے کام میں لاتا ہے۔

یہ سارا منظر نامہ اچانک سے وجود میں نہیں آیا۔ اس سارے منظر نامے کے اسباب و عوامل قیام پاکستان اور جناب جناح کی سیاست میں نظر آتے ہیں۔ کیوں نہ ان اسباب کو تلاش کیا جائے اور حقیقتوں کا سامنا کیا جائے۔ حقیقتوں سے نظریں چرانے سے تو بات نہیں بنے گی۔ آخر ان کا سامنا تو کرنا ہی پڑے گا، کیوں نہ آج ہی ان کا سامنا کیا جائے۔ ملک کے مایۂ صد افتخار محقق و مورخ اور دانشور جناب ڈاکٹر ابو سلمان شاہ جہان پوری نے زیر نظر کتاب میں جناح صاحب کی اصل شخصیت سے متعلق بہت سے حقایق سے پردہ اٹھایا ہے۔ بلاشبہ یہ کتاب ڈاکٹر صاحب کی حق شناسی اور حق گوئی کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

اس کتاب میں ڈاکٹر صاحب نے ان لوگوں کی روایت اور شہادت کو اپنا ماخذ بنایا ہے

جو مسٹر جناح کے قریبی تھے۔ اُن سے عقیدت ومحبت رکھتے تھے یا تعلق خاطر رکھتے تھے۔ یہ پیدل روایتیں نہیں ہیں۔ یہ روایتیں کسی نے دیکھا اور کسی نے کہا سے شروع نہیں ہوتی۔ راوی اپنا تجربہ اور مشاہدہ بیان کرتے ہیں اور راوی بھی وہ جو ثقہ ہیں۔ ان کے بارے میں کسی نے کذب کی تہمت بھی نہیں لگائی۔ پھر مسٹر جناح کے بارے میں ان کی دروغ گوئی کا کوئی امکان نہیں۔ گویا یہ واقفانِ حال کے بیانات ہیں جنھیں ڈاکٹر صاحب نے اپنی تحقیق کی بنیاد بنایا ہے۔ انھوں نے نہ تو عقیدت مندی کی عینک لگا رکھی ہے، نہ نفرت کی۔ وہ مکمل معروضی انداز میں دیکھتے اور پیش کرتے ہیں۔ یہی معروضیت اس کتاب کا خاص امتیاز ہے۔ یہ کتاب ڈاکٹر صاحب کا ایک ایسا کام ہے جسے بلاتکلف کارنامہ کہہ سکتے ہیں۔ ہمیں کھلے دل سے اس کتاب میں بیان کردہ حقایق کا سامنا کرنا چاہیے۔

امجد علی شاکر

لاہور
۲۵ جمادی الثانی ۱۴۳۲ھ

مقدمہ

(ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہان پوری)

پاکستان میں مسٹر محمد علی جناح کو سرکاری طور پر قاید اعظم کہا جاتا ہے۔ ان کے یومِ پیدایش اور یومِ وفات پر سرکاری سطح پر تقریبات منعقد کی جاتی ہیں۔ ان کی تصاویر دفاتر میں آویزاں نظر آتی اور نوٹوں پر چھپتی ہیں۔ اس کے باوجود اگر کوئی جناح صاحب کی شخصیت کے بارے میں مجھ سے پوچھے تو میں کہوں گا کہ وہ اس دور کی مظلوم ترین شخصیت ہیں۔ تحریک آزادی کے آغاز سے اب تک ہندستان اور پاکستان کا کوئی سیاسی رہنما خواہ وہ کسی مذہب و مسلک اور قوم سے تعلق رکھتا ہو، ایسا نہیں گزرا جو اہل قلم کی تنقید کا نشانہ نہ بنا ہو، اس پر الزام و تہمت نہ لگائی گئی ہو، کیچڑ نہ اُچھالی گئی ہو لیکن جناح صاحب کے خلاف کہی ان کہی کے جو ڈھیر لگا دیے گئے ہیں ان کی کوئی مثال پیش نہیں کی جا سکتی۔ اشاروں کنایوں میں تو اگرچہ ان پر تنقید کا آغاز ان کی وفات کے بعد ہی شروع ہو گیا تھا، لیکن پچھلے چند برسوں میں یہ تنقید، اس کا دایرہ، اس کی وسعت، اس کا آہنگ انتہا کو پہنچ گیا ہے۔ ایک اہم بات یہ ہے کہ ان کے دفاع کا محاذ ٹوٹ چکا ہے۔ اب اخبارات بھی اس بحث میں رسماً یا دکھاوے ہی کے لیے کود پڑتے ہیں، البتہ روزنامہ نوائے وقت (لاہور، کراچی) نہایت سنجیدگی اور استقامت کے ساتھ جناح صاحب کے دفاع کو فرض سمجھ کر محاذ جنگ پر ڈٹا ہوا ہے لیکن ان پر ترجیح پاکستان کے مفاد اور تاریخ کو حاصل ہے۔ اس کا مسلک سیاسی و تاریخی یہ گوارا نہیں کر سکتا کہ پاکستان کو کوئی گزند پہنچے یا تاریخ کی مٹی پلید ہو۔ جناح صاحب کی ذات پاکستان کے مفاد اور تاریخ کی اہمیت کے بعد آتی ہے۔ اس بنیادی اصول کے بعد نوائے وقت کا انداز صحافت چاہے کچھ ہو، سیاہ کو سفید ثابت کرنے کے لیے اس کے صفحات میں

ایک سطر بھی جگہ نہیں پا سکتی۔ نیز مجھے یقین ہے کہ نوائے وقت کے ادارتی ذمے داروں میں کوئی بھی شخص ایسا نہ ہوگا جس کا ذہن اس فکر سے خالی اور اس جذبے سے معمور نہ ہو کہ غلط فہمیاں دور ہوں اور افواہوں کی دُھند چھٹے اور تاریخ کی سچائیوں کو سامنے لایا جائے۔ اگر یہ خیالات اور جذبات صالحہ قابل توجہ ہوں تو انھیں عملی زندگی میں موثر بنانے کے لیے کوئی نہ کوئی راہ بھی نکالنی ہی پڑے گی اور اس راہ کی تلخیوں کو تو برداشت کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ مجھے اُمید ہے کہ وہ اپنے موقف پر سنجیدگی اور استقامت کے ساتھ ڈٹے رہیں گے تا آں کہ یہ تاریکی چھٹ جائے اور تاریخ کی نئی صبح نمودار ہو۔

قیام پاکستان کے برسوں بعد تک یہ بات پائی جاتی رہی کہ جناح صاحب کے متعلق بہت چھوٹی چھوٹی باتوں پر گرفت کی جاتی تھی۔ ایک مشہور اہل قلم نے پہلی جماعت کے بچوں کے لیے ایک کتاب لکھی۔ اس کی ایک سطر میں قدیم سندھ کی ایک تاریخی شخصیت راجہ داہر یا کسی اور کے نام کے ساتھ ''قاید اعظم'' کا جملہ املاء و تلفظ سکھانے کے لیے درج کیا گیا تھا۔ اس پر قاید اعظم کی توہین کا الزام اس شدومد سے لگا کہ ایک علمی و تعلیمی مسئلے میں فاضل اور شریف مؤلف کی معذرت قبول نہیں ہوئی اور اسے اپنے پبلشر کو ہدایت کرنا پڑی کہ جملے کو بدل دیا جائے۔

اور سنیے! ایک کتاب مطبوعۂ ہند کے پاکستان سے دو ترجمے اور ان کی کئی اشاعتیں منظرعام پر آ چکی ہیں۔ اس کے مصنف نے جناح صاحب سے ملاقات کے دوران ہندستان کے ماضی قریب میں ہندو مسلم انقلاب، اعتماد اور مابین تعلقات کے حوالے سے اپنے دادا کا ذکر کیا، جن کے سر سیّد احمد خاں اور دیگر افراد سے قرب و مروّت اور محبت کے تعلقات تھے۔ جناح صاحب نے جوشیلے انداز میں کہا ''اور میرے دوستوں میں صرف ہندو تھے!'' اب اس بیان کے مقابلے میں ایک دوسرے مؤرخ کا یہ بیان سامنے لائیے کہ ''انھیں (جناح صاحب کو) مسلمانوں سے نہیں مسلم لیگ سے دل چسپی تھی۔'' اب غور فرمایئے کہ مسلم لیگ مسلمانوں کی واحد نمایندہ جماعت تھی اور تحریک پاکستان کے واحد رہنما اور لیگ کے صدر جناح صاحب تھے۔ اگر ان خیالات اور سیرت کے شخص کی تصویر بنائی

جائے تو وہ کیا ہوگی؟

ایک صاحب نے یہ حقیقت بیان کر دی کہ جناح صاحب جھرک (ضلع ٹھٹھہ) میں پیدا ہوئے۔ لوگ اس کے پیچھے پڑ گئے۔ حال آں کہ کسی گاؤں یا غیر مشہور جگہ یا کسی کوردیہہ میں پیدا ہونا یا کسی غریب خاندان یا کسی نیچ ذات میں پیدا ہونا ہرگز عیب اور شرم کی بات نہیں، لیکن اگر ایسا تھا تو یہ بات قابلِ فخر و تذکرہ بات ہوگی، نہ کہ لایقِ شرم اور موجبِ طعن؟

روزنامہ جنگ کراچی میں ایک چھوٹی سی خبر شایع ہوئی جو کسی کی تحقیق کا حوالہ تھا کہ جناح صاحب نسلاً ہندو تھے۔ بطور سند اس کے ساتھ ایک تصویر بھی چھپی تھی۔ تصویر بحیثیت تصویر کے اچھی نہ تھی اور چھپائی میں اس پر سیاہی کے دھبے پڑ گئے تھے۔ ہر دو لحاظ سے نسلاً ہندو ہونا یا تصویر سے سند پیش کرنا کوئی اعجوبہ بات نہ تھی۔ برّاعظم ہند پاکستان میں مسلمانوں کی اکثریت نسلاً ہندو ہی ہے اور شکل، لباس، زبان، رہن سہن، تمدن، اخلاق، عادات سے دونوں قوموں کے لاکھوں افراد ایک ہی سانچے میں ڈھل گئے ہیں، لیکن وجہ اعتراض و شکایت یہ تھی کہ اس تصویر کی اشاعت سے غرض جناح صاحب کی توہین تھی۔ حال آں کہ حقیقت یہی تھی کہ جناح صاحب نسلاً ہندو تھے اور ہندو سے آغا خانی ہوئے تھے، مسلمان نہیں اور آغا خانی ہونے کے بعد ان کی نسل نہیں بدل گئی تھی۔ آج بھی اگر کوئی بحث چھیڑی جائے یا کسی تصنیف میں ان کی نسل کی وضاحت کی جائے تو یہی بات لکھی جائے گی۔

پاکستان میں بیرونِ ملک کی تین کتابوں پر پابندی لگائی گئی۔

۱) ''رتی جناح'' دوارکا داس کانجی کی کتاب، مطبوعہ دہلی (ہند)

۲) ''روزز ان ڈسمبر'' ایم سی چھاگلا کی کتاب، مطبوعہ ممبئی (ہند)

۳) ''جناح آف پاکستان'' اسٹینلے وولپرٹ، مطبوعہ نیویارک و پاکستان

دوارکا داس کانجی رتی جناح کے دوستوں میں سے تھے۔ ان کے نام رتی کے چند خطوط میں صاف گوئی اور بے تکلفی سے جناح صاحب سے اپنی دوری اور رنجش یا شکایت کا ذکر تھا۔ کوئی بہت شرم ناک بات نہ تھی۔ یہ راے میرے ایک نہایت مخلص اور مہذب دوست کی تھی جن کی نظر سے یہ رسالہ گزرا تھا۔

دوسری کتاب ایم سی چھاگلا کی تھی جس پر پاکستان میں درآمد پر پابندی تھی۔ اگر چہ یہ بات پوشیدہ نہ تھی کہ جناح صاحب ناؤ نوش اور مخصوص برگر کا خاص ذوق رکھتے ہیں، لیکن ان معلومات سے ان کے سب سے بڑے سیاسی مخالف جمعیت علمائے ہند کے رہنماؤں نے بھی فایدہ اُٹھانے کی کوشش نہ کی تھی، لیکن یہ بلند اخلاقی اور درگزر یا صرف نظر کا رویہ ان علمائے دین کا تھا۔ عام مسلمانوں کا نہیں ہوسکتا تھا۔ جناح صاحب کو اس کی پروانہ تھی۔ شاید انھوں نے کبھی یہ نہ سوچا تھا عوام ان کے بارے میں کیا سوچتے ہیں۔ سرکاری دعوتوں اور جناح صاحب کے خاص مہمانوں کی تواضع کرتے ہوئے شراب کے استعمال میں، احتیاط کی کبھی ضرورت نہیں سمجھی گئی، لیکن اخبارات میں ان دعوتوں اور ملاقاتوں کی رودادوں اور رپورٹوں میں ان بے تکلفیوں اور آزادروشوں کے ذکر سے گریز کی روایت کو ہمیشہ برتا گیا اور ایسی کتابوں کی درآمد پر پابندی لگائی جاتی رہی۔ اس سلسلے میں چھاگلا کی کتاب پر بھی بندش لگی اور وولپرٹ کی تالیف ''جناح آف پاکستان'' پر بھی پابندی لگائی گئی۔ یہ احتیاط اس حد تک لازم قرار پائی کہ جن حضرات نے آخر الذکر کتاب کی علمی حیثیت سے اشاعت ضروری سمجھی تھی انھوں نے شراب اور برگر کے ذکر کو اُردو ترجمے سے نکال دیا تھا۔ پاکستان کے دو ڈائجسٹوں کے خصوص نمبر میری نظر سے گزرے ہیں جو وولپرٹ کی ''جناح آف پاکستان'' کے اُردو ترجمے تھے، لیکن ان سے جناح صاحب کے ذوق کے مذکورہ مباحث کو حذف کردیا گیا تھا۔

اسٹینلے وولپرٹ کی کتاب ''جناح آف پاکستان'' کا پہلا ایڈیشن ۱۹۸۴ء میں آکسفورڈ یونی ورسٹی پریس نیویارک سے شایع ہوا تھا جس پر پاکستان میں درآمد پر پابندی لگائی گئی تھی۔ ضیاء الحق کو اس کتاب کی اشاعت کی طرف توجہ ہوئی تو یہ بھی ضروری سمجھا کہ مخصوص برگر کے شوق اور شراب نوشی کے تذکرے کو کتاب سے حذف کردیا جائے، لیکن وولپرٹ نے مجوزہ کاٹ چھانٹ کی اجازت دینے سے انکار کردیا۔ اس کے صلے میں معقول رائیلٹی، تمغہ خدمت اور پاکستان کی نیشنلٹی کی آفر کو قبول کرنے سے معذرت کرلی۔

اس واقعے پر طویل عرصہ نہ گزرا تھا کہ بے نظیر بھٹو کے دور میں یہ کتاب ۱۹۸۹ء میں

آکسفورڈ یونی ورسٹی پریس کراچی سے پہلے ایڈیشن کے متن میں کسی تبدیلی کے بغیر چھاپ دی گئی، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ نیویارک ایڈیشن کومن وعن چھاپتے ہوئے پبلشر کا ذہن اس پر کسی شدید ردعمل کے خطرے سے خالی نہ تھا۔ اس لیے اس نے حکومت سے خاص اجازت لی اور ضابطے کے صفحہ ۲ پر حکومت سے چھاپنے کی اجازت کا بہ طور خاص ذکر کیا۔ اس کی عبارت یہ ہے:

"Printed by the permission of government of Pakistan."

پاکستان میں اس کتاب کی اشاعت پر کسی قسم کا کوئی ردِعمل سامنے نہ آیا تو پبلشر کو اطمینان ہوا اور ۱۹۹۸ء میں جب کہ محمد نواز شریف وزارتِ عظمیٰ کی کرسی پر بیٹھے تھے وولپرٹ کی کتاب ''جناح آف پاکستان'' کا اُردو ترجمہ بھی شایع ہوگیا۔ اب کئی سال سے اُردو ترجمہ نایاب ہے، مگر اس کی مانگ باقی ہے۔ پاکستان میں کتاب کی انگریزی اشاعت پر ۲۳-۲۴ سال کا عرصہ اور اُردو ترجمے پر ۱۳ برس گزر چکے ہیں۔ اس مدت میں عوام یا مسلمانوں کے کسی طبقے یا دینی، سیاسی یا کسی اور جماعت کی طرف سے کسی قسم کا کوئی ردعمل سامنے نہیں آیا۔ معلوم ہوگیا کہ اگر جناح صاحب اپنے کھانے پینے کے شوق میں عوام سے بے نیاز تھے تو عام مسلمانوں اور کسی سیاسی یا دینی جماعت یا کسی طبقے کو بھی اس بات کی پروا نہ تھی کہ کوئی حاکم دین و شریعت کی خلاف ورزی کر کے جہنم میں جاتا ہے یا جنت میں!

جناح صاحب کی ایک اہم اور تاریخی تقریر جو انھوں نے سول میرج کے موضوع پر اور مسلمانوں پر بھی اس کے اطلاق کے باب میں لیجسلیٹو کونسل میں کی تھی، اس تقریر پر دیو بندی، بریلوی، اہل حدیث، ہندستان کے تینوں مکاتب فکر کے علما کی رائے اس وقت سے آج تک ایک ہی رہی ہے۔ اس وقت اس تقریر پر شدید ردعمل ہوا تھا۔ اس میں قانون کی یہ دفعہ بھی تھی جس میں رشتہ ازدواج کے دونوں خواہش مندوں کو یہ اعلان و اعتراف کرنا پڑتا تھا کہ اُن کا کسی مذہب سے تعلق نہیں ہے۔ اس سلسلے میں کسی اور کا کچھ عقیدہ ہو، اس سے علمائے اسلام کو کوئی دل چسپی نہیں ہوسکتی تھی، لیکن مسلمانوں کے بارے میں یہ بات نہ

تھی! صاف ظاہر تھا کہ کوئی مسلمان بہ شمول شیعہ اثنا عشری بہ قایمی ہوش وحواس اسلام کی نفی اور اس سے بے تعلقی کا اظہار ہرگز نہیں کر سکتا تھا۔ کسی ڈیکلریشن پر خاموشی کے ساتھ دستخط کر دینے کے بعد بھی کوئی مسلمان مسلمان نہیں رہ سکتا تھا۔ جناح صاحب اور رتن بائی نے عدالت میں مجسٹریٹ کے سامنے کھڑے ہو کر اپنے اپنے مذاہب سے انکار کیا تھا اور ڈیکلریشن پر دستخط کیے تھے۔

یہ واقعہ چوں کہ ۱۹۱۷ء میں پیش آیا تھا جب کہ رتن بائی کی عمر ۱۷ برس کی تھی اور قانونی طور پر وہ ابھی اپنے بارے میں کوئی فیصلہ کرنے کی مجاز نہ تھی۔ اس بنیاد پر اس کے والد ڈنشا پٹیٹ نے مقدمہ جیتا تھا اور بیٹی کو اپنے گھر لے جا سکے تھے۔ اگلے سال ۱۹۱۸ء میں جب رتن بائی قانونی طور پر اپنے لیے کوئی بھی فیصلہ کرنے کی مجاز ٹھہری تو وہ شیعہ طریقے پر نکاح کے بعد رتن بائی سے "مریم" بن جانے کے بعد بھی "رتی جناح" کہلانے کی شایق رہی!

جناح صاحب کی پہلی شادی کے لیے بہ کوشش ایک اسماعیلی خوجہ لڑکی ایمی بائی تلاش کی گئی تھی۔ اس کے انتقال اور وطن واپس لوٹنے کے ایک مدت بعد، جب کہ جناح صاحب کی عمر ۴۰ برس کی تھی، ایک پارسی خاندان کی لڑکی کے عشق میں مبتلا ہو کر اُسے اپنی زوجیت میں لینے کا فیصلہ خود کیا تھا اور کسی بھی مذہب پر ایمان نہ رکھنے اور اس کے طور طریقوں اور رسوم و رواج کا پابند نہ ہونے کی بنا پر سول میرج کی تھی۔ اس میں اڑچن پیدا ہوئی تو ایک سال کے صبر وضبط کے بعد شیعہ فقہ کے مطابق رتن بائی ہی سے رشتہ ازدواج استوار کر لیا۔

سر چمن لال سیتلواد کے پوچھنے پر انھوں نے کہا تھا کہ وہ اثنا عشری شیعہ ہیں، لیکن کیا اس بات کا کوئی ثبوت بھی ہے؟ شیعہ مذہب کی ایک تاریخ ہے، اس کے کچھ عقاید ہیں، کچھ اعمال ہیں جن کا بجا لانا ہر شیعہ پر فرض ہے۔ اس کی شریعت اور نظام عبادات ہے۔ اس کی پابندی لازمی ہے۔ اس کی زندگی کا ایک انداز ہے، اس کے خصایص ہیں، اسی کے پیرووں کی ڈھلی ہوئی سیرتیں ہیں، جن سے انھیں ہزاروں میں نہیں لاکھوں میں پہچان لیا جا سکتا ہے۔ اس کے برعکس جناح صاحب کا اپنا طرزِ حیات ہے، ان کا رکھ رکھاؤ ہے، ان کے

عادات واطوار ہیں، ان کے شوق وذوق ہیں۔ انھوں نے بعض خاص موقعوں پر شروانی ٹوپی اورشلوار پہننا شروع کر دیا تھا۔ [۱] انھیں ''قایداعظم'' کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے! کیا ان میں کوئی بات بھی ایسی ہے جو ان کے شیعہ یا مسلمان ہونے کی سند بن سکے؟ ان کی زندگی میں ان کے عقیدہ و مذہب کا ثبوت پیش کرنے کے دو مواقع آئے تھے۔

اولاً راجہ صاحب محمود آباد نے انھیں اپنے دین کی کوئی خدمت انجام دینے کی طرف توجہ دلائی تھی۔ شاید راجہ صاحب کا منشا یہ تھا کہ پاکستان کو شیعہ ریاست ڈیکلیر کر دیا جائے یا شیعہ فقہ کا نفاذ کر دیا جائے۔ ممکن ہے اُن کے ذہن میں کوئی اور منصوبہ یا بلند خیال ہو!

ثانیاً دوسرا موقع وہ تھا جب وہ اپنی میراث کی تقسیم کر رہے تھے۔ کوئی رقم کسی دینی کام کے لیے بھی مختص کر دیتے! یا اپنی پوری دولت کو وہ شیعہ فقہ کے مطابق تقسیم کر دیتے، لیکن افسوس کہ انھوں نے یہ موقع بھی گنوایا۔ اگر وہ ایسا کرتے تو ان کا ہاتھ کون پکڑ سکتا تھا؟ کس کی جرأت تھی جو ان پر انگشت نمائی کرتا۔ جس قوم نے انھیں آغا خانی اور خوجے کی حیثیت سے قبول کرنے سے انکار نہ کیا تھا، وہ شیعہ کی حیثیت سے قبول کرنے سے کیوں کر انکار کر سکتی تھی۔

ہندستان پاکستان میں مذہبی رسوخ رکھنے والی ایک ایسی جماعت بھی ہے جو ملحدوں اور منکروں کے مقابلے میں بدعملوں کو گوارا کر لینے کی ہمت رکھتی ہے۔ کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ دین داروں کی اس جماعت نے ان کے عقاید و اعمال اور ظاہر کی تمام غلطیوں اور بداطواریوں کو اور باطن کی برائیوں کو برداشت کر لیا تھا اور انتخابات کے میدانِ جنگ میں بھی نہ تو ان کے عقیدہ و مذہب کو زیر بحث لائے اور نہ ان کے راز کو فاش کیا! کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ پاکستان میں دینی انقلاب اور اسلامی دستور کے نفاذ کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ مولویوں کا اسلام تھا۔ اگر مولوی قابل گردن زدنی اور ان کا اسلام گوارا نہ تھا تو آزاد

(۱) حال آں کہ ان کا خاص اور پسندیدہ لباس وہ ہے جو تھری پیس سوٹ، ننگے سر، سگار پیتے ہوئے تصویر میں نظر آتا ہے۔ یہ تصویر انھوں نے قیامِ پاکستان کے وقت سرکاری دفاتر وغیرہ میں استعمال کے لیے بصد شوق وبالارادہ کھنچوائی تھی۔

خیالوں کا نام نہاد اسلام نافذ کر جاتے۔ قوم اس کا قبلہ آسانی سے درست کر لیتی، لیکن شبہ ہوتا ہے کہ یہ محض ملائیت اور مذہب سے نفور نہیں تھے۔ ان کا رویہ تو اصل دین و مذہب سے دوری، نفرت اور دشمنی کے سوا کچھ اور نہ تھا۔

"جناح بانی پاکستان" ہیکٹر بلیتھو کی تالیف ہے، جو پاکستان میں سرکاری طور پر لکھوائی گئی تھی۔ اس کا مصنف ۷/اگست ۱۹۴۷ء کو دہلی تا کراچی کے سفر میں جناح صاحب کے ساتھ تھا۔ اسی وقت سے خیال تھا کہ جناح صاحب ان سے اپنے سوانح حیات لکھوائیں گے، لیکن جب یہ سوانح لکھوائے گئے تو جناح صاحب کا انتقال ہو چکا تھا۔ مصنف حکومت پاکستان کے کچھ لوگوں میں گھر گیا تھا۔ محترمہ فاطمہ جناح اسے گوارا نہ کرتی تھیں اور اسی وجہ سے انھوں نے مسٹر بلیتھو سے تعاون کرنے سے انکار کر دیا تھا۔

بلیتھو کی مجبوری یہ تھی کہ وہ حکومت کے کار پردازوں کا منشا سمجھ نہ سکا۔ براعظم ہند پاکستان کی تاریخ اور تحریک پاکستان پر اس کی گہری نظر نہ تھی۔ اس نے جناح صاحب کو بھی گاندھی جی اور پنڈت نہرو کے انداز اور سطح کا رہنما سمجھا اور جناح صاحب کے ذہن و فکر کے خصایص کو سمجھ نہ سکا۔ جناح صاحب کے ابتدائی دورِ سیاست اور فکر و اندازِ فکر کے اُتار چڑھاؤ سے آگاہی اور جناح صاحب کے اس دور کے دوستوں سے اسے ملنے اور جناح صاحب کی شخصیت اور ان کی سیاست کو دریافت کرنے کا کوئی موقع نہ ملا تھا اور فاطمہ جناح کے عدم تعاون کی وجہ سے جناح صاحب کے بعض اہم ڈاکومنٹس تک بلیتھو کی رسائی بھی نہ ہو پائی تھی۔ اس لیے قومی سیاسی رہنما اور قوم کے ہیرو کی حیثیت سے ان کی زندگی، ان کے بدلتے ہوئے خیالات، ان کی سیاست کے نشیب و فراز، ان کے ذوق و مزاج، قوم کی عام زندگی سے ان کی دوری کے اسباب کو نہ بلیتھو سمجھ سکے اور نہ تالیف کا حق ادا ہو سکا۔ ان کے سامنے زیادہ سے زیادہ ۱۹۳۷ء تا ۱۹۴۰ء اور اُس کے بعد کی زندگی تھی اور براعظم ہند پاکستان کے صف اوّل کے رہنما اور مدبر کی حیثیت کے بجائے ان کے سامنے صرف مسلم لیگ کے لیڈر اور قوم کے مقبول "قاید اعظم" کا چہرہ تھا۔ ایسی صورت میں کہ بلیتھو نے مسلم لیگ کے جھنڈا برداروں اور جلسوں کے نعرہ بازوں کو قوم اور لیگ کی ہاؤ ہو کو ہندستان کے

چالیس کروڑ باشندوں کی تحریک آزادی سمجھ لیا۔ اس کے ترتیب دادہ چار پانچ سو صفحات کے رطب و یابس کی کیا قیمت ہو سکتی ہے؟ پھر اس نے جو کچھ لکھا تھا ارباب حکومت کے منشا کے مطابق اور قوم کے لیے پسندیدہ شخصیت اور گوارا سیرت بنانے کی کوشش نے جناح صاحب کی شخصیت کی ایک مصنوعی شکل بنا کر اسے اور بھی بگاڑ دیا تھا۔ ارباب بست و کشاد نہیں چاہتے تھے کہ جناح صاحب کو ایک خاص حد سے زیادہ بلند اور حسین بنا کے پیش کیا جائے۔ وہ یہ بات بلیتھو پر ظاہر بھی نہیں کر سکتے تھے۔ چناں چہ بلیتھو کو اس کی رایلٹی دے کر انگلینڈ روانہ کیا۔ کتاب ایک کمیٹی کے حوالے کی کہ وہ اس پر نظر ثانی کرے، غلطیوں اور حوالوں کی درستگی، مضمون کے اضافے اور ترمیم و تنسیخ کے بعد اسے قایداعظم کے شایان شان سوانح اور قومی ذوق و مزاج کے سانچے میں ڈھال کر اسے ایک شان دار قومی تاریخ بنا دے۔ یہ ذمے داری جن حضرات کے سپرد کی گئی تھی ان کی قابلیت اور کام کی صلاحیت میں شبہ نہ کیا جا سکتا تھا۔ انھوں نے کتاب کو خوب سے خوب تر بنانے میں ہرگز کوتاہی نہ کی ہوگی، لیکن اس آپریشن کے بعد کتاب کی وہ شکل بھی نہ رہی۔ کیا ہی اچھا ہوتا کہ کمیٹی کے ایک رُکن سے ایک دوسری کتاب لکھوالی جاتی تو نظر ثانی اور اصلاح شدہ مسودے سے کہیں زیادہ اچھی ہوتی۔ زبان و بیان، ترتیب و تدوین اور معلومات کے اضافے اور تحقیق کے معیار وغیرہا ہر اعتبار سے اس کا ترجمہ بھی ایک مسخ شدہ تصنیف ہے!

"جناح بانی پاکستان" کے صفحات میں بعض اہم معلومات کی موجودگی سے انکار نہیں لیکن حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ کتاب میں حقایق کو چھپانے کی کوشش کی گئی اور کتاب کا دامن جھوٹے بیانات سے بھی خالی نہیں۔ جناح صاحب کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کے بارے میں اہم اور تفصیلی معلومات کا فقدان ہے۔ مطالعہ کرتے ہوئے ذہن میں سوالات اُٹھتے ہیں، لیکن تحریر میں جواب ملنے سے پہلے مطالعے کا قدم آگے بڑھ جاتا ہے، کتاب ختم ہو جاتی ہے اور تشنگی دور نہیں ہوتی۔

خاکسار نے ایک مرتبہ ایک مسلم لیگی بزرگ فاضل سے پوچھا، مجھے پاکستان کی تاریخ اور جناح صاحب کے سوانح حیات میں دو ایسی مستند اور جامع کتابیں بتایئے جو میں حاصل

کرلوں اور نقد و تبصرے اور کسی حوالے کی مجھے ضرورت پیش آئے تو اس سے استفادہ کروں!
آں فاضل نے جواب دیا ان دونوں موضوعات میں فی الحال کوئی ایک ایسی کتاب نہیں بتا سکتا۔ البتہ مختلف کتابوں، تحریروں اور انٹرویوز وغیرہا میں حقایق مل جاتے ہیں!

جناح صاحب کے انتقال پر ۶۳ برس گزر چکے ہیں۔ اگر اب بھی ان کی شخصیت کے تعارف، ان کے سوانح حیات کے حقایق، افکار و خیالات کے ماخذ اور ان کی سیاست اور خدمات کے بیان میں کوئی ایسی جامع اور مستند کتاب نہ ہو تو ان کی مظلومیت میں کون شبہ کر سکتا ہے!

جناح صاحب پر کتابیں لکھی گئی ہیں، لیکن ان کے مصنفین کے سامنے ان کا اپنا مفاد تھا۔ ان کے سامنے وقت کے تقاضوں، سوانح حیات کی قومی ضرورت، اہمیت اور تاریخ و سوانح کے فن کی پابندی کی اہمیت کا کوئی تصور نہ تھا۔ انھیں اپنے شوق یا ضرورت سے ایک کتاب لکھنی تھی، جناح صاحب کا سکہ چل رہا تھا، انھی کو موضوع بنالیا۔ وہ نہ ہوتے کسی اور پر کتاب لکھ دیتے۔ درحقیقت جناح صاحب کی شخصیت اور سیرت میں کوئی ایسی خوبی تھی ہی نہیں کہ ان پر کوئی سوانح نگار قلم اُٹھاتا۔ جناح صاحب کی شخصیت کا پس منظر، ان کا خاندان، ان کے بزرگ، ان کا بچپن، ان کی تعلیم، اساتذہ، دوست، ان سے تعلقات، دل چسپی کے پہلو، ان کے کھیل، ان کے سماجی، تعلیمی، تہذیبی پہلو، ان کا مطالعہ: ان کی تفریحات، تجربات، مشاہدات، ان کے عادات، اطوار، ان کی ملن ساری، احباب نوازی، مذہبی، علمی، اخلاقی، مسلمانوں اور اسلام دشمنی اور ان کے پس منظر کوئی پہلو ایسا نہ تھا جو بچوں کو پڑھایا جائے اور ان میں موضوع علیہ شخصیت کی پیروی اور ان جیسا بننے کا شوق پیدا ہو۔ ان پر لکھنے میں اور ان کی شخصیت کے کسی پہلو کو نمایاں کرنے میں جو وقت گزرتا، اس سے زیادہ وقت ان کے خاندان، مذہب، اخلاق، ان کے کھانے پینے کے شوق کی پردہ پوشی میں گزر جاتا۔ اس دنیا میں ایک ہستی ایسی تھی جو ان سے متاثر ہوئی، ان کے عشق میں مبتلا ہوئی، اپنے ماں باپ کو چھوڑا، ان کی زوجیت کو قبول کیا لیکن جب شوہر کے حق ازدواج ادا کرنے کا وقت آیا تو اُس نے بیوی کو مایوس کر دیا۔ وہ ایک ہسپتال میں شوہر کو یاد کرتے

ہوئے تڑپ تڑپ کر مر گئی۔ اس نے مرنے والی کا چہرہ دیکھنا بھی گوارا نہ کیا۔ ان کی ازدواجی زندگی اور ان کی محبت میں کسی عورت کے لیے، ان کی محبت میں کسی عاشق کے لیے، ان کے بچپن میں کسی بچے کے لیے، ان کی جوانی میں ماں باپ کی خدمت کے لیے [1] کوئی مثال نہیں ملتی!

اُن کی شخصیت میں، کسی کنبہ پرور کو خاندان کی سرپرستی کے لیے اور نہ کسی سیاست کے شایق اور قوم پرور نوجوان کو سیاسی تربیت کے لیے ان کی سیاسی زندگی اور سیاسی فلسفے میں کوئی رہنمائی تھی۔ ممبئی پہنچنے کے بعد وہ نہ کبھی اپنے کسی بھائی بہن سے ملے، نہ ان کی کسی خوشی غمی میں ان کی شرکت کی خبر ملی اور نہ اپنی کسی خوشی میں انھیں شریک کیا۔ دوسری شادی (تقریب نکاح) کی خوشی میں، بیٹی کی پیدایش کے وقت، اس کی شادی کے وقت، اپنی سیاسی کامیابی کے کسی موقعے پر بھی اپنے کسی عزیز کو یاد کرنے کی توفیق نصیب نہ ہوئی۔ اگر اخبار نویس کھوج نہ لگاتے تو ان کے کسی رشتے دار کا پتا بھی نہ چلتا، فاطمہ جناح کی محبت بلاشبہ ایک بہن کی بھائی سے محبت کی مثال ہے، لیکن کیا جناح صاحب نے اس کے مستقبل کے بارے میں کبھی سوچا تھا کہ قدرت نے اسے ایک مکمل جنس بنایا ہے اور اس کائنات میں اس کی ایک مستقل حیثیت، اس کے حقوق اور اس کے فرایض ہیں۔ قدرت نے ماں باپ کے ساتھ بھی اس کی زندگی کا ایک مختصر دور مقرر کر دیا ہے۔ ماں باپ کو اس مدت کے بعد بیٹی کو اپنی خدمت کے لیے روک لینے کا حق نہیں دیا گیا۔ جناح صاحب کو یہ حق کیوں کر مل سکتا تھا کہ وہ بہن کی زندگی کے رُخ کو اس کی فطرت کے خلاف بدل دیں۔ جناح صاحب نے اپنی بہن سے محبت کی، اس کو اچھا کھلایا، اچھا پہنایا، اپنے ساتھ عزت کے مقام پر بٹھایا،

---

(۱) جناح صاحب انگلینڈ سے لوٹے تو ممبئی سے قسمت آزمائی کے شوق میں بیمار باپ کی اس خواہش کو، کہ وہ کراچی سے پریکٹس کا آغاز کریں، وہ ان کے پاس رہیں اور خاندان سے دور نہ ہوں، ٹھکرا کر اور ایک بہن کو ساتھ لے کر ممبئی چلے گئے۔ پھر کبھی پلٹ کر نہ باپ کو دیکھا اور نہ خبر لی کہ وہ کب تک جیے اور کب مر گئے اور نہ ان کے پیچھے خاندان کی خبر لی، بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ خاندان کی پروا انھوں نے کبھی کی ہی نہیں!

لاکھوں کروڑوں کی جائیداد اس کے نام کر دی۔ سیاست میں جا و بے جا اسے نمایاں کیا۔ پاکستان کی تحریک اور پاکستان کے قیام میں انھوں نے اپنے نام کے ساتھ اپنی بہن کے سوا ہندستان کے کسی اور شخص کی طرف اشارہ بھی نہیں کیا۔ تاریخ کے اہم موڑ اور آزادی اور قیام پاکستان کی اہم تاریخی تقاریب میں اپنے برابر بٹھایا۔ قوم میں ان کی محبت اور احترام کی ایک فضا پیدا کر دی، لیکن وہ اپنی محبت سے اس کے دامن پر ایک داغ بھی لگا گئے، جو مذاق اور کبھی نہ مٹنے والا ایک طنز بن گیا۔ جناح صاحب ''بابائے قوم'' تھے اور ان کی غیر شادی شدہ بہن ان کی ہم نشیں اور ''مادرِ ملت'' تھیں!

کئی اہل قلم اور مصنفین نے جناح صاحب اور ان کی سیاست کو مسلمانوں کی دوستی اور دشمنی کے پلڑوں میں رکھ کر تولا ہے۔ اس کا نتیجہ معلوم ہے کہ اس امر کا کبھی فیصلہ نہ ہو سکے گا، لیکن اس بارے میں کوئی اختلاف نہیں ہو سکتا کہ وہ اپنے خاندان کے سب سے بڑے دشمن تھے۔ یہی رویہ ان کا اپنی قوم اور مسلمانوں سے بھی تھا۔ یہ مسئلہ ان کی عادت، فطرت، نفسیات کا نہ تھا، بلکہ ایک بیماری تھی جو انھیں ابتدائی دورِ حیات میں لگی تھی اور کبھی اس سے پیچھا نہ چھوٹا۔ وہ اپنے خاندان کے دشمن ہرگز نہ تھے، لیکن محبت، مروّت، اخلاص اور بہ ظاہر نیک نیتی کا برتاؤ بھی انھوں نے کسی سے نہ کیا تھا۔ اگر ان کا اور ان کے بعد ان کی بہن فاطمہ جناح کا انتقال نہ ہو گیا ہوتا تو دنیا کو ان کی دوسری بہن شیریں بائی کے وجود کا بھی پتا نہ چلتا!

براعظم ہند پاکستان کے ہر سیاسی رہنما نے اپنے پیچھے اپنے تربیت یافتہ اور عقیدت مند چھوڑے ہیں جو اپنے مربی، رہنما اور اُستاد کو یاد کرتے ہیں اور فخر سے ان کا نام لیتے ہیں۔ بعض اپنے مرشدوں اور اُستاد کے جانشین ثابت ہوتے ہیں۔ جناح صاحب کا قانون میں کوئی شاگرد اور سیاست میں کوئی جانشیں نہیں۔ ان کے نام کو استعمال کرنے والے تو بہت ہیں۔ ان کا نام روشن کرنے والا کوئی نہیں!

ایک نہایت قابل ذکر کتاب ''قایداعظم: اسٹڈیز ان انٹرپریٹیشن'' ہے۔ اس کے مؤلف پروفیسر ڈاکٹر شریف المجاہد ہیں۔ یہ ۱۹۸۱ء میں قایداعظم اکیڈمی، کراچی نے شایع کی ہے۔

اس سے پہلے جناح صاحب پر ایک کتاب کی تالیف کا منصوبہ بنایا گیا تھا۔ اس کا جن صاحب نے منصوبہ بنایا تھا وہ اتنا جامع اور اتنا ضخیم تھا کہ جس نے دیکھا حیرت زدہ رہ گیا اور تخمینہ اتنا قیمتی تھا کہ کمیٹی کے ممبران اسے دیکھ کر حواس باختہ ہو گئے۔ قاید اعظم اکیڈمی کے زیر اہتمام اور اس کے وسایل کے اندر اس کا تکمیل پانا اس کا اصولی مسئلہ تھا، لیکن اس منصوبے کے لیے اکیڈمی کے معمول کے سالانہ بجٹ کے آیندہ ۲۰ سال کا بجٹ بھی ناکافی ہوتا۔ کمیٹی کے ممبران کے لیے اس منصوبے کا روگ پالنے کی بجاے اسے فایل میں بند کر دینے کے سوا کوئی صورت نہ تھی۔ چناں چہ ایسا ہی کیا گیا۔ جب ڈاکٹر شریف المجاہد اکیڈمی کے ڈاکٹر مقرر ہوئے تو طے پایا کہ وہی اپنے فرایض منصبی کے ساتھ ساتھ اس منصوبے پر بھی کام کریں، لیکن ڈاکٹر مجاہد صاحب نے اپنے ذوق کے مطابق موضوع کا انتخاب کیا تھا۔ وہ صحافت کے بہترین اُستاد تھے، اور اگرچہ تاریخ و سیاست ان کا موضوع نہ تھا لیکن انھوں نے اپنی تالیف کے لیے جو خاکہ بنایا تھا اور پھر جو کچھ انھوں نے پیش کیا، وہ اپنی قابلیت کے مطابق زیادہ سے زیادہ تھا۔ وہ اکیڈمی کے مقاصد و مصالح کے دایرے میں یہی کر سکتے تھے اور یہ سب کچھ بڑے سلیقے سے انھوں نے کر دکھایا۔

شریف المجاہد کی تالیف انگریزی میں ہے۔ وقت کا چلن یہی ہے اور ارباب اختیار کی مصلحت بھی یہی تھی کہ کتاب چھپے اور ضرور چھپے۔ اس میں مسٹر جناح کی زندگی، ان کی سیرت، ان کے رہن سہن، ان کی سیاست، ان کے نظریۂ پاکستان، ان کے طرزِ سیاست کی ایک حد تک عکاسی ہو، لیکن ان کے مذہبی عقاید، نجی زندگی، ذوق و شوق، ان کے عادات و خصایل، ان کے خاندان کے تذکار و حالات وغیرہ کی تفصیل سے گریز کیا جائے۔ ایسی زبان اور طرزِ تحریر اختیار کیا جائے کہ وہ عام قاری خصوصاً مولوی کے ذوقِ مطالعہ کے دایرے میں نہ آ سکے۔ مجاہد صاحب کے لیے ان مقاصد کے مطابق تصنیف میں کوئی دشواری پیش نہ آئی۔ اس لیے کہ نہ تو ان کا کوئی سیاسی مسلک تھا، نہ ان کا تعلق کسی دینی مکتب فکر سے تھا۔ وہ حالات و واقعات کے مطابق ہر سانچے میں ڈھل جانے والی شخصیت تھے۔ ان کے موضوع کے دایرے میں تاویل و تعبیر کی بڑی گنجایش تھی۔ اس کا پتا کتاب کے نام ہی سے

چل جاتا ہے۔ ان کی کتاب کا نام ہے

"Quaid -i- Azam Jinnah Studies in Interpretation"

اس کے جزو ثانی سے مطالب کی تاویل میں بڑی گنجایش کا پتا چلتا ہے۔ اس کے معنی ہیں ''مراد سمجھانا، ظاہر کرنا، وضاحت کرنا، تشریح کرنا، معنی پہنانا، مراد لینا، مطلب بیان کرنا'' اس دایرۂ بحث ونظر کی مصنف نے پوری پابندی کی اور اس سے خوب فایدہ اُٹھایا۔ اس نے جناح صاحب کے دعووں اور نعروں کی تاویل، ان کے تصورات کے تعبیر اور ان کے اعمال و اقدامات کے دفاع کا فریضہ انجام دیا ہے۔ وہ اپنے مقصد میں کس حد تک کامیاب یا ناکام ہوئے ہیں، اس کا صحیح اندازہ کتاب کے مطالعے کے بعد ہی کیا جاسکتا ہے اور اس میں اختلاف کی ایک حد تک گنجایش ہے۔

لیکن اس پر بڑا ستم یہ ڈھایا گیا کہ ''امیرالمومنین'' ضیاء الحق اس کتاب پر ایک منتقمانہ تنقید سے اس درجے متاثر ہوئے کہ اسے اپنے غاصبانہ اقتدار اور آمرانہ مقاصد کے لیے انتہائی خطرناک سمجھا اور کراچی پہنچ کر کتاب سے ایک بیان اور اس سے استدلال کی بحث کو نکلوا کر اور اس کی جگہ اس کے بالکل برعکس مطلب سے ان صفحات کو پر کروا کے مصنف کی جان چھوڑی۔ اس سے کتاب کی افادیت اور خصوصی حیثیت بالکل ختم ہوگئی۔ چوں کہ یہ بات شہرت پاگئی تھی اس لیے اس کی مارکیٹ قطعی ختم ہوگئی۔ شاید سرکاری طور پر محکمہ جاتی مثلاً فوجی لائبریریوں میں وہ کتاب خریدی گئی ہو۔ مصنف نے یہ کتاب ہندستان میں چھپوا دی ہے، لیکن ضرورت ہے کہ اب اس کتاب کو پہلے کے غیر تبدیل شدہ متن کے مطابق چھاپ دیا جائے۔ اس سے پاکستان میں بدلتے ہوئے خیالات کے تاریخی موڑ کا پتا چلتا ہے۔ اب اس کتاب کی ایک تاریخی اہمیت ہوگئی ہے۔

جناح صاحب پر اور بھی کتابیں ہیں لیکن تمام کتابیں اہل قلم کے شخصی نقطۂ نظر سے یا ذاتی مصالح کی بنیاد پر لکھی گئیں۔ یہ عام طور پر ایسے لوگوں نے لکھیں جن کا نہ تو کوئی سیاسی مسلک تھا اور نہ مذہبی، علمی، سوانحی اور تاریخی اصول و معیار کسی کتاب میں نظر آتا ہے۔ اس سلسلے میں ہیکٹر بلیتھو کی کتاب اگرچہ حکومت وقت کے نقطۂ نظر سے نہیں لکھی گئی تھی، لیکن

وقت کے سربراہان حکومت کے منشا و ضرورت کے مطابق اسے بنا لیا گیا۔ ضیاء الحق کو اپنے ذہن کے مطابق جناح صاحب کے سوانح حیات میں ایک ایسی کتاب کی ضرورت تھی جو ان کے مقاصد کی تکمیل میں ممد و معاون ہو۔ اس کے لیے وہ اسٹینلے وولپرٹ کی تالیف جناح آف پاکستان کو پسند کرتے تھے، لیکن تھوڑی سی تبدیلی کے ساتھ! جس کے لیے مصنف تیار نہ ہوا اور ان کی خواہش پوری نہ ہو سکی۔ بے نظیر کی پہلی حکومت (۲ دسمبر ۱۹۸۸ء تا ۶ نومبر ۱۹۹۰ء) کا ذوق و مزاج اور مصلحت کا تقاضا بھی وہی تھا، لیکن اس نے اس سے کوئی تعرض نہ کیا کہ جناح صاحب کھانے پینے کے معاملے میں کس درجہ آزاد تھے اور دین دار مسلمانوں کا اس بارے میں رویہ اور علمائے دین کا فتویٰ کیا ہے۔ وقت کے ارکان حکومت سے یہ امر پوشیدہ نہ تھا کہ سہروردی کے زمانے سے اسکندر مرزا، ذوالفقار علی بھٹو کے زمانے میں شب کی پرائیویٹ مجلسوں اور نقاب پوش ڈانسوں کو عوام اور علمائے دین نے کس درجہ اہمیت دی تھی؟ علما نہ شریک مجالس تھے، نہ ناؤ نوش میں مصروف انھوں نے کسی کو دیکھا تھا، ان سے کسی نے فتویٰ بھی نہ پوچھا تھا اور اگر پوچھ بھی لیا ہوتا تو شرعی شہادت کہاں سے آتی۔ سنی سنائی بات پر یا مفروضات پر تو فتویٰ دیا بھی نہ جاتا تھا۔ اخبارات کی خبروں پر اعتماد نہ کیا جا سکتا تھا۔ کم و بیش پینے کی معذرت پر خموشی جواز کی حد تک پہنچ گئی تھی۔ یقین تھا کہ آیندہ اس سے زیادہ تلخ حقایق بھی برداشت کر لیے جائیں گے اور وہ وقت دور نہیں کہ سب کچھ گوارا کر لیا جائے گا۔ اس لیے جناح آف پاکستان کو کسی تبدیلی کے بغیر اشاعت کی اجازت دے دی گئی، لیکن پبلشر کا ذہن کسی شدید ردِ عمل کے خطرے سے خالی نہ تھا اس لیے حکومت سے تحریری اجازت ضروری سمجھی اور وہ مل گئی۔ پبلشر نے نہایت نمایاں طور پر اس کا اعلان کر دیا کہ Printed by permission of Government of Pakistan اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ سرٹیفکیٹ کتاب کی اشاعت کے لیے صرف اجازت نامہ ہی نہیں بلکہ اس میں حکومت کا ایما بھی شامل تھا۔ ۱۹۹۸ء میں اس کا اُردو ترجمہ بھی چھپ گیا۔ ۱۲-۱۳ برس اس واقعے پر بھی گزر گئے۔ ۱۹۸۹ء میں مذکورہ کتاب کی اشاعت تک ۲۳ برس کی تاریخ اور اس مدت میں کسی ردعمل کے عدمِ ظہور نے ثابت کر دیا کہ ملت اسلامیہ

پاکستان اور اس کے علمائے دین نے جناح صاحب پر گناہ کے اعتراض سے دستبرداری اور گریز کا رویہ اختیار کر لیا ہے۔ اگر کوئی دینی اور اسلامی جماعت چاہے تو وہ اسے تاریخ پاکستان کا ایک حادثہ قرار دے سکتی ہے۔ تاریخ پاکستان کا مورخ اور وقت کا مدبر و مبصر یہ نتیجہ بھی نکال سکتا ہے کہ اس محاذ پر شکست کے بعد وقت کی کوئی اسلامی جماعت اب کسی دینی محاذ پر قدم نہ جما سکے گی۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ حادثہ اسی وقت پیش آ چکا تھا، جب وقت کے ایک وزیر اعظم نے اسلامی نظام کے نفاذ کے بل کی قرارداد پر بحث کے موقع پر قرآنی احکام پر قومی اسمبلی کے ارکان کی رائے کی برتری کو تسلیم کروا لیا تھا۔ [۱] اور اس سے بھی پہلے اسلام کے ماتم کا روز اوّل وہ تھا جب قرآن حکیم کو حکم بنانے، سیرت نبوی کو طریق عمل سمجھنے، احادیث کو نظیر بنانے سے اعراض اور دین (اسلام) کی حاکمیت کو علی الاطلاق بنانے اور کتاب وسنت کے احکام کی تاویل کے لیے تمام دینی مکاتب فکر کو اپنی اپنی من مانی کرنے کی اجازت دی تھی کہ قرآن کتاب وسنت کے کسی حکم کا جو مطلب جس کی سمجھ میں آئے، وہی اس کے لیے طریق حق اور راہِ کتاب وسنت ہے۔ اسے حق کی تلاش اور منشائے حکم الٰہی معلوم کرنے کی ضرورت نہیں۔ خواہ مختلف مکاتب فکر کے مابین کتنا ہی اختلاف کیوں نہ ہو!

ادھر کچھ عرصے میں جو کتابیں نظر سے گزری ہیں ان کا انداز روایت سے مختلف ہے۔ ان میں تنقید ہے اور ایک حد تک صاف گوئی سے کام کیا گیا ہے۔ سوالات اُٹھائے گئے ہیں، لیکن ان کا جواب تسلی بخش نہیں ہے۔ بعض بحثیں ہیں، لیکن صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس کی بنیاد کمزور اور معلومات ناقص ہیں، لیکن انھیں قطعاً رد نہیں کر دیا جا سکتا۔ مثلاً جناح کی آمدنی، آمدنی کے ذرائع، ان کی زندگی کا رکھ رکھاؤ، ان کی جائیداد، ان کا بینک بیلنس وغیرہ کا جو علم ان کی وصیت کے بعد علم میں آیا ہے، وہ ان کی اس وقت کی آمدنی کے مقابلے میں

(۱) اس سے پہلے اسلامی نظام کے نفاذ کا جو بل سینٹ نے پاس کیا اس کے نفاذ میں اصل رکاوٹ یہ پیدا ہوئی تھی کہ اس کے نفاذ کو ماضی سے طے کیا گیا۔ وہ زمین دار اور جاگیر دار کے لیے ناقابل قبول تھا۔ قومی اسمبلی میں پاس شدہ بل میں ارکان اسمبلی کی برتری کے فیصلے میں اپنی چلا لینے کے اختیار اور من مانی کرنے کی آزادی بہت بڑھ گئی تھی۔

بہت زیادہ تھی اور شبہ پیدا کر دیا ہے کہ ان کی آمدنی کا کوئی خفیہ ذریعہ بھی تھا یا کہا گیا ہے کہ وہ گورنر جنرل اور لیجسلیٹو اسمبلی کے صدر کی حیثیت سے دو منصبوں کی پوری پوری تنخواہیں وصول کرتے تھے۔ جب کہ گورنمنٹ کا کوئی ملازم دو منصبوں کی پوری پوری تنخواہ وصول نہیں کر سکتا۔ یہ دونوں باتیں کسی حوالے سے پہلے بھی میرے علم میں آئی تھیں، لیکن پہلے میں نے اسے ذہن سے بالکل نکال دیا۔ اب یہ بات میری نظر سے گزری ہے تو محسوس کرتا ہوں کہ یہ بات میرے ذہن میں چپک سی گئی ہے۔ اس نے ذہن میں ایک کھٹک پیدا کر دی ہے۔ میرے دل کی تسکین کے لیے ضروری ہے کہ مجھے معلوم ہو کہ حقیقت کیا ہے!

بہت سی باتیں ہیں، جو ممکن ہے سیاسی مصالح کی بنیاد پر ہی پھیلائی گئی تھیں اور یہ امکان بھی ہرگز دور نہیں کہ ان میں جھوٹ بھی شامل ہو گیا ہو اور اسلوب بیان و تحریر نے اس بات کو سنگین و اشتعال انگیز بھی بنا دیا، لیکن اس میں بنیادی سچائی ضرور موجود ہو گی۔ مثلاً

۱) جناح صاحب کی سول میرج سے انکار کیا گیا۔ غلط بیانی سے کام لیا گیا۔ تاریخ کو مسخ کرنے کی کوشش کی گئی بالآخر اس حقیقت کو تسلیم کرنا ہی پڑا۔

۲) مشہور کیا گیا کہ ان کی بیٹی نے شادی کے سلسلے میں باپ کی رائے سے اختلاف کیا تھا۔ رائے سے اختلاف کی حد تک بات تو سمجھ میں آتی ہے، لیکن باپ نے بیٹی کی شادی کے موقع پر اپنے سیکرٹری کے ہاتھ گرجا میں گلدستہ بھیجا تھا اور مبارک باد دی تھی۔

۳) یہ قطعی غلط ہے کہ انھوں نے اپنی بیٹی کو عاق کر دیا تھا۔ وہ ہمیشہ بیٹی سے ملتے رہے تھے۔ ان کے ساتھ سیر و تفریح کی اور مختلف مواقع کی تصاویر موجود ہیں۔ انھوں نے اپنی وراثت میں بیٹی کو حصہ دیا تھا اور فارن کرنسی میں اس کی ادائیگی کی سہولت پیدا کر دی تھی۔

۴) جناح صاحب کے بیان میں ہے کہ جنگ کے زمانے میں انھوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا کہ عورتیں اپنے مردوں کے لیے قبریں کھودتی تھیں۔ پنجاب میں دیہات کے دورے کا ان کی زندگی میں کبھی کوئی واقعہ ہی پیش نہیں آیا۔ ان کا یہ بیان اپنی سچائی کی روح سے خالی ہے۔

۵) جناح صاحب کا لارڈ چرچل سے تعلق تھا اور دونوں میں خفیہ بدلے ہوئے ناموں

سے بدلے ہوئے پتوں پر مراسلت کا رشتہ قائم تھا۔

بیگم شائستہ اکرام اللہ نے اپنے والد گرامی سر حسن سہروردی جو سیکرٹری آف اسٹیٹ فار انڈیا کے مشیر تھے، کی روایت سے بیان کیا ہے کہ اکتوبر ۱۹۴۰ء میں جناح صاحب سیکرٹری سے ملے تھے اور مشورہ کیا تھا کہ پاکستان کی اسکیم کا متبادل کیا ہوسکتا ہے کہ ملک کی تقسیم سے بچا جا سکے۔

۶) پاکستان کے نظریے اور اسکیم کے بارے میں وہ ہرگز سنجیدہ نہیں تھے۔ ان کے اپنے بیان کے مطابق تقسیم ملک ہندستان کے سیاسی مسئلے کا حل نہیں تھا۔ اس لیے ۳ر جون ۱۹۴۷ء کے اعلان کے بعد بھی وہ متمنی تھے کہ برٹش گورنمنٹ اور کانگریسی رہنماؤں سے بات چیت کی انھیں مہلت دی جائے۔

۷) اسی لیے انھوں نے شہید سہروردی کو بنگال کے متحد رہنے اور آزاد ہونے کے لیے کانگریس کے لیڈروں سے گفتگو کرنے اور کسی نتیجے تک پہنچنے کے لیے بہ خوشی اجازت دی تھی۔

۸) ان کا یہ ارادہ تھا کہ گورنر جنرل پاکستان کے منصب سے ریٹائر ہونے کے بعد وہ ہندستان چلے جائیں گے اور اپنی بقیہ زندگی ممبئ میں اپنی شاندار کوٹھی میں گزاریں گے۔ پاکستان میں ان کے اس اظہار کو ملک سے بے وفائی کے مترادف سمجھا گیا۔

۹) مختلف رہنماؤں سے ملاقات کا مقام اور تاریخ و وقت طے پایا اور مختلف اسباب و مواقع ملاقات اور تبادلہ خیالات اور مشاورت میں پیش آئے۔

۱۰) دہلی کی کوٹھی کی فروخت کے وقت کاغذی کارروائی عمل میں نہیں آئی تھی۔ ملک کی تقسیم کے بعد پچھلی تاریخ میں کارروائی کے لیے پنڈت جواہر لال کو ان کا فون کرنا اور ان سے رعایت کا متمنی ہونا اور اسی طرح ممبئ کی کوٹھی کے لیے خوشامد کی حد تک اس پر قبضہ نہ کرنے کی گڑگڑا کر درخواست کرنا پاکستان کی توہین کرنے کے مترادف تھی۔ اس سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی کوٹھی بچانے کے لیے کس حد تک گر سکتے تھے۔

۱۱) انھوں نے ہمیشہ اپنے آپ کو مقدمۂ پاکستان کا وکیل کہا تھا۔ اگر ان کا یہ بیان ان

کے اخلاص و دیانت پر مبنی تھا تو ۳ر جون ۱۹۴۷ء کے بعد انھیں اپنے مستقبل کا فیصلہ کر لینا اور اعلان کر دینا چاہیے تھا کہ مقدمے کا فیصلہ ہو گیا۔ اب وہ پاکستان جائیں گے یا اپنی بقیہ زندگی ممبئی میں گزاریں گے۔

۱۲) جناب صاحب کو لیگ کی قیادت اور لیجسلیٹو کونسل میں تقاریر کے سوا گھر کے آنگن سے لے کر دنیاے بسیط کے آخری کونے تک عملی زندگی کا کوئی تجربہ نہ تھا۔ وہ پاکستان کے ناکام گورنر جنرل تھے۔ وہ نہ تو ملک میں امن قایم رکھ سکے تھے اور نہ اقلیتوں کی جان و مال کی حفاظت کے فرایض کی ادائیگی سے عہدہ برآ ہو سکے تھے۔ سندھ سے ہندوؤں کے ترکِ وطن اور سرحد سے (براہِ سندھ) ہندستان جانے والے سکھوں کے قافلے کے قتل پر ان کے ردعمل کے عدم اظہار سے، ان کی انسان دوستی، قلب کی کیفیت، ان کی گورنر جنرلی کے منصب کے تقاضے سے غفلت اور بے پروائی کی کس کیفیت کو اور ان کے سیاسی تدبر اور ان کی پیش بینی کی کس حالت کو ظاہر کرتے ہیں؟

۱۳) ہم اس لیے ان سے شکوہ سنج نہیں ہو سکتے کہ ان کے پاس کسی دوست اور عقیدت مند سے مزاج پرسی، عزیز بیمار کی عیادت اور وفات پر اس کے سوگواروں کے لیے تعزیت کا وقت نہ تھا۔ یوم نفیر پاکستان کے ردعمل میں ہزاروں مسلمانوں کے کلکتہ میں قتل، نواکھالی میں اسی کے بدلے اور انتقام میں ہندوؤں کے قتل، اغوا، انسانیت کی بے حرمتی اور پھر اس کے جواب اور ردعمل میں بہار میں مسلمانوں پر ٹوٹ پڑنے والی قیامت پر، مشرقی پنجاب میں مسلمانوں کے قتل عام پر انھوں نے زبان نہ کھولی تھی اور مسلمانوں کو حوادث سے بچانے کے لیے کوئی انتظام تو درکنار، ان کے قتل و تباہی پر تعزیت کا ایک جملہ بھی نہ کہا تھا۔ ایسی صورت میں تو سندھ، سرحد اور پنجاب میں ہندوؤں اور سکھوں کے جان و مال کی تباہی پر ان کے سکوت اور کسی ردعمل کے عدم اظہار پر ہم ان کا کیوں کر شکوہ کر سکتے ہیں لیکن خدارا! ہمیں اس تمنا کے اظہار سے باز رہنے پر مجبور نہ کیجیے کہ ہم دل سے چاہتے ہیں کہ جس طرح گاندھی جی نے مسلمانوں کی جان و مال کے تحفظ کے لیے مرن برت رکھ کر اپنی جان کو خطرے میں ڈالا تھا اور پاکستان کے بقیہ پچاس کروڑ روپے دلوائے تھے اور ہندستان پاکستان کے حدود

میں مظلوم اور اغوا شدہ عورتوں کی تلاش کے لیے افراد بھیجے تھے اور فسادات کے پس منظر اور صورت احوال کی دریافت کے لیے پنڈت سندر لال کو بھیجا تھا۔

کاش! جناح صاحب نے بھی اسی طرح بلند خیالی، اعلیٰ اخلاق اور انسان دوستی کا کوئی کارنامہ انجام دیا ہوتا!!

جناح صاحب کے انتقال کو ۶۰ برس سے زیادہ ہو گئے۔ ان افکار و اعمال کا دور گزر گیا۔ توبہ کی مہلت ختم ہو گئی۔ اب ان کے حساب یعنی یوم الدین کا زمانہ آ گیا ہے۔ ان کے اعمال کے شیریں نتائج سے ملک کا ایک طبقہ خوب خوب لطف اندوز ہو رہا ہے اور غلطیوں کے تلخ نتائج پوری قوم بھگت رہی ہے۔ ان کا دور گزر چکا ہے۔ اب وہ ہماری زندگی میں دخیل نہیں ہوتے۔ ان کی شخصیت کے ظاہر و باطن میں کس جماعت یا طبقے کے لیے دل کشی ہو سکتی ہے۔ عام مسلمانوں یا ملک کے عوام کے لیے کوئی دل چسپی نہیں ہو سکتی۔ ان کے افکار و عقاید میں، ان کی سیرت اور طرزِ زندگی میں، ان کے ذوق و شوق اور عادات و خصایل میں قوم کے لیے کوئی رہنمائی اور سبق نہیں۔ ان کے فلسفۂ سیاست میں (بشرطیکہ ان کا کوئی فلسفۂ سیاست ہو) اور افکار سیاسی میں مستقبل پہلے ہی نہ تھا اور اب تو زمانہ اتنا بدل گیا ہے کہ اگر کچھ ہوتا تب بھی وہ ہمارے کسی کام کا نہ تھا۔ انھوں نے اپنے نظریے اور سیاسی مقصد سے تو ۱۱/اگست ۱۹۴۷ء ہی کو توبہ کر لی تھی اور قوم کو ایک ایسے مقام پر لا چھوڑا تھا جہاں ماضی چھوٹ گیا تھا۔ حال بے حال تھا اور مستقبل کا پتا نہ تھا۔

پاکستان کی جنگ اس اصول پر لڑی گئی کہ ہندستان میں ہندو اور مسلمان دو قومیں ہیں۔ دوسرا مفروضہ یہ تھا کہ یہ دونوں مل جل کر ایک ساتھ نہیں رہ سکتیں۔ اس کا حل یہ طے پایا کہ ملک کے مختلف علاقوں کو ان کی اکثریت کی بنیاد پر تقسیم کر کے ان کے حوالے کر دیا جائے۔ چناں چہ ایسا ہی کیا گیا۔ خیالی طور پر پاکستان کے قیام کا مقصد اور اس کی ضرورت اس نعرے میں چھپی ہوئی تھی۔ پاکستان کا مطلب کیا؟ لا الہ الا اللہ!

لیکن جناح صاحب نے جو پاکستان کے بانی مبانی اور ترجمان تھے اور اسی خصوصیت کی بنا پر وہ پاکستان کے گورنر جنرل اور دستور ساز اسمبلی کے صدر بھی بنے تھے۔ اپنی پہلی

پالیسی تقریر میں ان دونوں باتوں کی نفی کردی۔ پاکستان کے نظریے میں اگر کوئی فلسفہ اور مقصدیت تھی تو وہ ختم ہوگئی۔ یہ کہہ کر کہ یہاں مسلمان اور غیر مسلمان میں کوئی قومی اور مذہبی امتیاز نہیں ہوگا، سب یکساں حیثیت میں پاکستان کے شہری ہوں گے۔ ان کے حقوق و فرایض یکساں ہوں گے اور مذہبی معاملات میں حکومت مداخلت نہیں کرے گی، جناح صاحب نے ایک تقریر سے ملک کو سیکولر اسٹیٹ بنادیا تھا۔ اسمبلی کے اجلاس میں کئی نام ور علما بیٹھے تھے۔ انھیں پتا بھی نہ چلا کہ پاکستان کے نظریے کی کایا پلٹ ہوگئی تھی۔ جناح صاحب اس معاملے میں اتنے حساس تھے کہ انھوں نے لیاقت علی خاں کے ہاتھ سے ایجنڈا لے کر دیکھا تو فہرست میں ''تلاوتِ قرآن مجید'' تھی، جسے انھوں نے قلم زد کر دیا تھا۔ اس لیے کہ یہ مسلم لیگ کا جلسہ نہیں تھا ایک سیکولر اسٹیٹ کی پیدایش کے اعلان کی رسم ادا کی جارہی تھی۔

افسوس کہ جناح صاحب کی زندگی میں ان پر کیچڑ اُچھالی گئی۔ افواہیں پھیلائی گئیں اور افسانے تراشے گئے۔ یہ دور ۱۹۳۷ء کے الیکشن سے شروع ہوکر تقسیم ملک کے فیصلے کے اعلان تک پھیلتا رہا، لیکن مسلم لیگ کے اخبارات، اس کے لیڈروں اور کارکنوں نے جمعیت علماے ہند، اس کی حلیف قوم پرور جماعتوں اور ان کے رہ نماؤں پر جو کیچڑ اُچھالی، ان پر جو تہمتیں لگائیں، ان کی سیرت، اخلاق، دیانت کے بارے میں جو جھوٹ بولے، افسانے گھڑے اور سراہے جو غیر اخلاقی اور شرم ناک برتاؤ کیے، اس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔

اس بیان سے ہمارا مقصد کسی کے خلاف غلط اور انتہائی غلط اور نہایت شرم ناک برتاؤ کا شکوہ نہیں، بلکہ اس شخص کے ساتھ اپنی ہمدردی کا اظہار ہے جو سونے، چاندی اور جواہرات میں تولا گیا تھا، جس کی گاڑی کھینچی گئی تھی، جسے کندھوں پر اُٹھایا گیا تھا، سروں پر بٹھایا تھا اور آسمان پر چڑھایا گیا تھا اور ہر چھوٹی بڑی مجلس اور ہر موقع پر اس کی آمد پر دیدہ و دل فرش راہ کیے جاتے تھے۔ جسے مقدس بزرگوں اور پیغمبروں کا درجہ دیا گیا تھا اور جس کی فضیلت کے افسانے اور نظمیں لکھی گئی تھیں۔ ان سے جو اعراض ان کے عقیدت مندوں اور پرستاروں اور ان لوگوں نے کیا جنھیں اس کے اشارہ چشم و ابرو نے اُٹھا کر قومی سیاست کے تخت اور ملک کی حکمرانی کے منصب پر بٹھایا تھا۔ انھوں نے اس کے ساتھ اس کے جیتے جی جو بے

وفائی کی، اس کی اطاعت سے گریزاں ہوئے، اس کے فیصلوں کو ردی کی ٹوکری کی نذر کیا، اس کے انتقال کی دُعائیں کیں اور وفات کے انتظار میں بے چینی سے کروٹیں لیں اور جب وہ اپنے حاصل کردہ ملک اور اپنی حکومت کے مرکزی شہر کی ایک سڑک پر گندگی کے ڈھیر کے پاس زندگی کی آخری سانسیں لے رہا تھا تو اسے ''بابائے قوم'' بنانے والے، اس کے عقیدت مند، شیدائی اور اس کے احسان مند اس کی موت کی خبر کے انتظار میں ایک غیر ملکی سفارت خانے کی مجلس میں شراب کے جام لنڈھا رہے تھے۔

ابوالکلام آزاد، حسین احمد مدنی کی بے عزتی کے واقعات کو تاریخ سے مٹایا نہیں جا سکتا، لیکن سوچیے کہ ان کی تسکین کے لیے یہ کتنا بڑا سرمایہ ہے کہ ان کے ساتھ وہ شرم ناک برتاؤ ان کے دشمنوں نے کیا۔ مسلم لیگیوں نے جو سیاسی روش اختیار کی تھی اس کا تقاضا تھا کہ راہ کی ہر کاوٹ کو دور کر دیا جائے، لیکن جناح صاحب کے ساتھ ان کی اپنی جماعت نے اور ان کے پروردہ عقیدت مندوں نے یہ الم ناک برتاؤ کیا تھا۔ معلوم نہیں کہ کسی نے یہ بھی سوچا ہے یا نہیں کہ اس میں اس مظلوم کا خود بھی کتنا حصہ تھا۔ کیا انھوں نے کانٹوں کی فصل بوئی تھی جس سے کانٹے ہی پیدا ہوئے تھے۔ کیا ان کی تربیت میں کوئی کھوٹ رہ گئی تھی۔ کیا ان کی اپنی سیرت میں کوئی خرابی تھی جس کا ردعمل بے وفائی کی صورت میں ظاہر ہوا تھا، میں سوچتا ہوں کہ اب اس کے اسباب تلاش کرنے کا فایدہ ہی کیا؟ لیکن حقیقت کی تلاش سے، گریز بھی صحیح نہیں۔ اس لیے کہ اس کے بعد آنے والی ہر حکومت اپنی پچھلی حکومت کی جانشین تھی اور کچھ نہ کچھ جراثیم کا اپنے جانشیں کے لیے چھوڑ جانا بے حقیقت نہیں! مجھے اس موقعے پر اپنے ایک بزرگ کا یہ قول یاد آتا ہے کہ ''انسان کا ہر فعل اپنی ایک تاثر رکھتا ہے اور قانون قدرت ہے کہ وہ تاثیر اپنے وقت پر ظاہر ہو۔''

صاف لفظوں میں کہنے کی بات یہ ہے جس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ جناح صاحب کے دشمن لیگ میں تھے اور ان کے مفادات نے انھیں جناح صاحب کے گرد جمع کر دیا تھا۔ اب جب کہ تحریک پاکستان نے انھیں ان کی منزل تک پہنچا دیا تھا، تو اب انھیں سیاست اور ملک کی حکمرانی میں ان کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ اب وہ اپنے مفادات کو حاصل کرنے کے

لیے بے چین تھے اور کوئی رکاوٹ گوارا نہیں کر سکتے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ جناح صاحب کو راستے سے ہٹا دیا جائے اور انھیں جیتے جی ہٹا دیا تھا!

جناح صاحب کے گرد جو ہجوم ان کے قدر دانوں، عقیدت مندوں اور جاں نثاروں اور خدمت گزاروں کا نظر آتا تھا ان میں بیشتر مطلب پرست اور اُن کے دشمن تھے۔ لیگ میں ایک جماعت ہمیشہ ایسی رہی جس کا ذہن جناح صاحب کے متبادل کی جستجو سے کبھی غافل نہیں رہا۔ جناح صاحب بھی اس حقیقت سے بالکل بے خبر نہیں تھے۔ جناح جو کبھی غصے میں، کبھی کسی کو مسلم لیگ سے شاکی پا کر اور کبھی کسی کو اپنا ہمدرد اور مخلص دیکھ کر جو کہہ اُٹھتے تھے کہ میری جیب میں سب کھوٹے سکے ہیں یا جیسا کہ ایک مرتبہ انھوں نے کہا تھا کہ ''مجھے مفاد پرستوں نے گھیر رکھا ہے،'' تو یہ بات حقیقت کے خلاف ہرگز نہ تھی۔

لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے دور میں یہ طے کر لیا گیا تھا کہ جناح صاحب نے اب اگر اپنی ضد نہ چھوڑی تو انھیں دماغی مریض قرار دے کر سیاست سے الگ کر کے یوروپ کے کسی بھیج دیا جائے گا۔ خیر ہوئی کہ انھوں نے ماؤنٹ بیٹن کی بات مان لی کہ ''اگر وہ تحریر و زبان سے پلان کی منظوری کا اعلان نہ کریں تو سر کے اشارے سے اپنی منظوری کا اظہار کر دیں۔''

مجھے یقین ہے کہ جناح صاحب نے حالات کی سنگینی کو محسوس کر لیا تھا اور جان گئے تھے کہ ماؤنٹ بیٹن ان کا پیچھا چھوڑتا نظر نہیں آتا۔ ماؤنٹ بیٹن نے سمجھ لیا تھا کہ اگر ان سے ذرا سی نرمی کی گئی تو یہ قابو سے نکل جائیں گے اور اس کی کوششوں پر پانی پھر جائے گا۔ اس لیے وہ آخر وقت تک ان پر اپنا دباؤ بڑھاتا رہا۔ تا آں کہ جناح صاحب نے سر ہلا کر پلان کی منظوری کا اظہار کر دیا۔ منظوری کے بعد تیسرے یا چوتھے روز ہی ماؤنٹ بیٹن کو اپنے خیال کی سچائی کا ثبوت مل گیا۔ جب جناح صاحب اس سے ملے اور کہا کہ ہندستان کے سیاسی مسئلے کا حل ملک کی تقسیم نہیں ہے۔ انھیں موقعہ دیا جائے کہ وہ برٹش گورنمنٹ سے اور کانگریس کے رہنماؤں سے مل کر مسئلے کا صحیح حل نکالیں!

ماؤنٹ بیٹن نے ہندستان پہنچنے کے بعد جناح سے ایک دو ملاقاتوں کے بعد ہی اس حقیقت کو پا لیا تھا کہ وہ ٹیڑھی کھیر ثابت ہوں گے اور جناح صاحب جس چیز کا مطالبہ کر

رہے ہیں اسے بالکل نہیں جانتے، ان کے ذہن میں اس کی کوئی تفصیل نہیں تھی، اس پر وہ کوئی گفتگو نہیں کر سکتے تھے، اس کے اطراف اور نتائج اور اس کے متوقع اور غیر متوقع پیش آنے والے مسایل پر ان کی کوئی نظر نہیں تھی اور ان سے نمٹنے کی ان میں کوئی صلاحیت نظر نہیں آتی تھی۔ اس نے بظاہر کوشش کی اور چاہا کہ کیبنٹ مشن کے فارمولے پر سب متفق ہو جائیں جیسا کہ کانگریس چاہتی ہے، لیکن جناح صاحب اپنی ضد پر اڑے رہے اور کیبنٹ مشن پلان کا نام سننے کے لیے تیار نہ ہوئے۔ تب اس نے اپنے منصوبے پر کام کا آغاز کیا جس کے لیے وہ لندن سے تیار ہو کر آیا تھا اور فی الحقیقت وہ اسی کو منوانا چاہتا تھا۔ اس نے سب سے پہلے پٹیل کے ذہن میں یہ بات بٹھا دی کہ ''جناح سے پیچھا چھڑانے میں ہی تمھاری عافیت اور مستقبل کا سکون ہے۔ عارضی حکومت میں تم نے تجربہ کر لیا کہ تمھیں کام نہیں کرنے دیا۔'' اس کے ذہن کا بدلنا تھا کہ چند ہی دن میں پنڈت جی اور گاندھی جی بھی اس صف میں آ کھڑے ہوئے۔

اس وقت تک جناح صاحب کے ذہن میں یہ بات تھی کہ ان کے مطالبے کے مطابق مسلم اکثریت کے صوبوں کو الگ کر دیا جائے گا۔ پہلی مرتبہ یہ بات ماؤنٹ بیٹن نے سمجھائی کہ تقسیم کے جس اصول کے تحت ملک سے صوبوں کو الگ کیا جائے گا، اسی اصول کے مطابق ان صوبوں سے ہندو اکثریت کے اضلاع اور تحصیلوں کو الگ کر لیا جائے گا۔ جناح صاحب کے پاس اس کا کوئی جواب نہ تھا۔ کانگریس کو صوبوں کی تقسیم کے دعوے کے لیے استدلال مل گیا۔ ماؤنٹ بیٹن نے جناح صاحب سے بحث کو چھیڑا۔ لیاقت علی خاں کے ذریعے سے بھی جناح صاحب کے عزم اور استقامت کو جانچا۔ اسے لیاقت علی خاں کے اس جواب سے بڑا سکون ملا کہ جناح صاحب کو اگر پاکستان کے نام پر سندھ کے ریگستان کا ایک ٹکڑا بھی دیا جائے گا تو وہ اسے قبول کر لیں گے۔ اسے یقین ہو گیا کہ اب جناح صاحب پاکستان کے موقف سے ہرگز گریز نہ کر سکیں گے!

اب اس نے اپنا پلان نہرو، پٹیل اور جناح کو دکھایا اور ان کی منظوری حاصل کر لی۔ پلان کسی کو دیا نہیں۔ وہ ۱۷ رمئی ۱۹۴۷ء کو برٹش گورنمنٹ سے اس کی منظوری کے لیے لندن

روانہ ہوا۔ اسے خطرہ پیدا ہوا کہ جناح صاحب اس کے ماننے سے انکار کر دیں گے۔ وہ جاتے جاتے لیاقت علی خاں سے کہہ گیا کہ لیگ کی طرف سے منظوری کا ڈیکلریشن سیکرٹری کے حوالے کر دیا جائے۔ وہ مجھے لندن بھیج دے گا۔

دوسرے روز ماؤنٹ بیٹن کے سیکرٹری نے جناح صاحب کو بلایا اور ڈیکلریشن پر دستخط کروائے۔ جناح صاحب نے پوچھا یہ کانفیڈنشل ہے۔ سیکرٹری نے تصدیق کی کہ یہ عام اشاعت کے لیے نہیں ہے لیکن اگلی صبح کو ''سول اینڈ ملٹری گزٹ'' میں چھپ گیا۔ ماؤنٹ بیٹن نے خطرے کے سدباب کے لیے ایک نہیں کئی دیواریں کھڑی کر دی تھیں۔ زبانی منظوری، تحریری منظوری اور اخباری سند! جناح صاحب کو ہر طرح جکڑ دیا گیا تھا۔ اب ان کے انکار کرنے کے امکان کی کوئی راہ کھلی نہ رہی تھی، لیکن وہ جناح صاحب کی طرف سے پھر بھی مطمئن نہ تھا۔ اس نے اپنے اس خدشے کا مسٹر چرچل سے ذکر کیا اور اس سے مشورہ مانگا۔ اس کا مشورہ تھا جناح کو ڈراؤ، دھمکاؤ اور قیام پاکستان کے لیے جن برٹش حکام اور انتظامیہ کی ضرورت ہے اس کو مہیا کرنے سے معذرت کر لو! ماؤنٹ بیٹن نے ان لفظوں کو گرہ میں باندھا اور ان کے نام ایک خط لکھنے کی درخواست کی اور چرچل نے خط بھی لکھ دیا جس کا مطلب یہ تھا کہ اگر تم نے یہ پلان منظور نہ کیا تو پاکستان کے مقصد کو کبھی حاصل نہ کر سکو گے۔

۲۹ر یا ۳۰ر کی شام کو ماؤنٹ بیٹن لندن سے دہلی پہنچے۔ اگلے چند دنوں کی ملاقاتوں میں تقسیم ملک کا مکمل پلان جناح صاحب کی نظر سے گزرا تو جناح صاحب نے اسے تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ ماؤنٹ بیٹن کے دل میں جناح صاحب کی طرف سے جو خطرہ پیدا ہوا تھا، وہ حقیقت بن کر سامنے آ گیا تھا۔ اس کے علاج کے لیے اس نے وہی نسخہ اختیار کیا جو چرچل نے تجویز کیا تھا۔ اب جناح صاحب کا زور ٹوٹ چکا تھا۔ وہ ماؤنٹ بیٹن کے بچھائے ہوئے جال میں پوری طرح پھنس گئے تھے۔ وہ پاکستان نہیں چاہتے تھے یا کم سے کم تقسیم کی ان بنیادوں پر جن پر تقسیم عمل میں آئی! پاکستان ان کے سر منڈھ دیا گیا تھا اور اس مسئلے پر ان کے سعی و عمل کے تمام دروازے بند کر دیے گئے تھے۔

۸ر جون کو مسلم لیگ کونسل کا اجلاس ہوا۔ جناح صاحب نے ارکان کونسل کو یقین دلانا چاہا کہ انھوں نے ماؤنٹ بیٹن پلان کو منظور نہیں کیا ہے۔ ارکان غور وفکر کے بعد آزادانہ فیصلہ کریں۔ مولانا حسرت موہانی نے ان کے اس بیان کی صداقت کی نفی کی، لیکن انھیں دھکا دے کر بٹھا دیا گیا۔ جناح صاحب سنجیدگی سے چاہتے تھے کونسل اس پلان کو منظور کرنے سے انکار کر دے، لیکن اب کونسل کے ارکان پر بھی ان کی گرفت ڈھیلی پڑ چکی تھی۔ لیاقت علی خاں، سر شاہ نواز اور ان کے ہم خیالوں نے ایسا پروگرام بنایا تھا اور چند ارکان کو تقاریر کے لیے منتخب کر لیا تھا جس میں منظوری کے خلاف فیصلہ کرنے کی کوئی گنجایش نہ تھی۔

شاید جناح صاحب کی منشا یہ تھی کہ کونسل سے پلان کو نامنظور کرانے کے بعد لنگڑے لولے پاکستان کو لینے کے گناہ سے بچ جائیں اور اپنے مطالبے کے مطابق پاکستان کے لیے تحریک کو از سرِ نو منظم کریں، مگر اب اس کا وقت گزر چکا تھا اور ان کے ساتھیوں نے ان کے منشا کو سمجھنے سے انکار کر کے ان کو شکست سے ہم کنار کر دیا تھا۔ لنگڑا لولا پاکستان جناح نے نہیں، ان کے دشمنوں نے قبول کیا تھا۔

جناح صاحب کے یہ دشمن تحریک پاکستان کے آخری لمحوں میں اچانک پیدا نہیں ہو گئے تھے۔ بہت پہلے سے موجود تھے۔ انھیں لیگ کی اندرونی کشمکش کی تاریخ میں دیکھا جا سکتا ہے۔ تحریک کے انقلابی دور میں اس طرف کسی نے توجہ نہ کی تھی، مگر پاکستان بننے کے بعد موقع پرستوں نے انھیں گھیر لیا اور ان کی بیماری نے انھیں لاچار کر دیا تھا۔

اس مقام پر پہنچ کر ہم جناح صاحب کے مزاج، ان کے بعض اقدامات کو بھی ان کی مخالفت اور ان کی عدم مقبولیت کے اسباب سے الگ نہیں کر سکتے۔

جناح صاحب پر جو لٹریچر اُردو میں میری نظر سے گزرا ہے، اس میں علمی اور فنی لحاظ سے بہت غیر معیاری مواد ہے۔ ان کے سوانح میں نہایت مبالغے سے کام لیا گیا ہے۔ حال آں کہ وہ ایک سپاٹ شخصیت کے مالک تھے۔ گجراتی ان کی مادری زبان تھی۔ انگریزی انھوں نے سیکھی تھی، انھیں انگریزی بولنے پر عبور تھا، مگر لکھنے سے کتراتے تھے۔ اُردو میں گفتگو اور تقریر سے گریزاں رہتے تھے۔ لکھنے کا انھیں کبھی اتفاق نہ ہوا تھا۔ اُردو میں ان کے لیے چند

بیانات، خطوط یا چند دیگر تحریریں ملتی ہیں، لیکن وہ ان کے سیکرٹریوں کے قلم سے ہیں۔ سندھ ان کا مولد و منشائے طفولیت تھا۔ سندھی زبان ضرور جانتے ہوں گے، لیکن اس کی کوئی مثال اور سند ہمارے پاس موجود نہیں۔ عربی، فارسی سے وہ بالکل نابلد تھے۔ مطالعے کا انھیں شوق نہ تھا۔ قانون کے سوا دیگر علوم یعنی تاریخ، فلسفے، شاعری، تحقیق، تنقید، مذہب وغیرہ سے ان کے شوق اور مطالعے کے ذوق کا کوئی سراغ نہیں ملتا۔ اسلامی فقہ (قانون) سے ان کے تعلق کا دعویٰ کیا جا سکتا ہے۔ انگریزی میں چھٹی جماعت میں پڑھنے کا ذکر ملتا ہے، پاس ہونے کا نہیں۔ انگریزی زبان پر بول چال میں مشق ہوگی۔ انگریزی میں سائنس، فلسفہ، منطق، فقہ میں ان کے مطالعہ فہم اور ان پر عبور کا کیوں کر کیا جا سکتا ہے۔ انگریزی زبان میں اسلامی فقہ (قانون) کے مطالعے کا شاید کبھی اتفاق ہوا ہو۔ قانون میں نہ ان کے پاس اُونچے درجے کی ڈگری تھی اور نہ وہ خود صفِ اوّل کے ایڈووکیٹ تھے۔ ہندستان میں ان کے ہارے جانے والے مقدمات کی تعداد ان کے جیتے ہوئے مقدمات سے زیادہ ہے۔

آج تک کسی کی زبان سے نہیں سنا کہ کسی مقدمے میں بہ طور نظیر کے ان کی کسی قانونی بحث کا حوالہ آیا ہو۔ ایک مقدمے میں ان کے لیے فارسی کی ایک دستاویز کے مطالعہ سے استفادے کی عدم صلاحیت کی مشکل تو مدن موہن مالویہ نے ترجمہ کر کے آسان کر دی تھی۔ غازی علم دین کے مقدمے کو بیچ ہی میں چھوڑ دیا تھا۔ خیال یہی ہے کہ اسلامی فقہ سے، اس کی اہمیت، وسعت اور گہرائی سے محض ناواقف اور اس کے مسایل پر بحث و جرح کی طاقت سے لاچار تھے۔ اگر وہ قابل ہوتے تب بھی نہ نبوّت کے قایل تھے نہ حدیث و سنت پر ایمان رکھتے تھے اور قرآن و حدیث و سنت فقہ کی بنیاد ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ اس مقدمے میں ان کے ساتھ علامہ اقبال بھی تھے جو اسلامیات کے دایرے میں فقہ (قانون) اصول و کلیات اور منطق و فلسفہ میں گہری نظر رکھتے تھے اور جناح صاحب ان کا ہم زلف بننا نہیں چاہتے تھے۔ جناح صاحب کی وکالت کی ایک خوبی یہ بھی تھی کہ وہ نظایر و دلایل کے بجاے جج کو زیادہ متاثر کرتے اور اپنا کام نکالتے تھے۔ حضرت علامہ کے شریک بن کر اس ہتھیار کو استعمال نہ کر سکتے تھے۔

لیجسلیٹو کونسل میں انھوں نے اپنی کئی تقریروں میں قرآن کو گزرے ہوئے عہد کی ایک غیر مؤثر کتاب قرار دیا اور قرآنی احکام کی افادیت کی نفی کی تھی اب وہ فقہ کے استدلال سے اپنے کس مقدمے کو جیتنا پسند نہ کرتے تھے۔ یہ ان کے مضبوط کیریکٹر کی بڑی دلیل ہے، جس چیز کی صداقت پر وہ ایمان نہ رکھتے تھے، اس کے حوالے سے مقدمہ جیتنا بھی انھوں نے گوارا نہ کیا! یہ بات تو ان کی سیرت کی خوبی شمار ہوگی!

ان کے ایک سیکرٹری، جس نے چار سال تک ان کے ساتھ شب و روز کام کیا تھا اور ذمے داری سے سبک دوش ہونے کے بعد بھی عام تعلقات کو منقطع نہیں کیا تھا، اپنی تحریر میں انھیں ملحد لکھا ہے۔ وہ کسی مذہب کے قایل نہ تھے۔ اگر واقعی ایسا ہو تو ہم انھیں نماز، روزے، حج، زکوٰۃ وغیرہ اسلامی فرایض ادا نہ کرنے کا طعنہ نہیں دے سکتے اور نہ اسلام کے حرام و حلال کی پابندی نہ کرنے کا انھیں الزام دے سکتے ہیں۔ یہ تو ہم بھی کہہ سکتے ہیں کہ وہ اپنے لیے ایسے خطابات کو بھی ہرگز پسند نہ کرتے تھے جس سے کسی عقیدہ و مذہب کا شبہ ہو یا اس کی طرف کوئی اشارہ ملتا ہو! مثلاً کسی بیمار کی عیادت، کسی کے انتقال پر اس کے غم خواروں سے رسم تعزیت کی ادائیگی! انھوں نے ۱۱/ اگست ۱۹۴۷ء کو دستور ساز اسمبلی کے افتتاح پر ایجنڈے کے پہلے آیٹم ''تلاوت قرآن حکیم'' کو بھی قلم زد کر دیا تھا اور لیاقت علی خاں کے بلائے ہوئے قاری زاہر قاسمی جناح کیپ اوڑھے اور شروانی پہنے تنے بیٹھے تھے اور بیٹھے ہی رہے، انھیں زحمت دینے کی ضرورت پیش نہ آئی!

جناح صاحب کے کتنے ہی اقدامات ایسے ہیں جن سے ان کے سیاسی تدبر کا ثبوت ملنے کی بجائے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ گویا وہ قوم سے انتقام لے رہے ہیں۔

مسٹر جناح نے اپنی زندگی میں سیاسی جدوجہد کی، مگر وہ جمہوری اندازِ فکر اور سیاسی طرزِ عمل نہ اپنا سکے۔ انھوں نے ایک خاص مسئلے میں اپنی رائے کے مطابق عمل نہ ہوتے دیکھ کر سندھ کی حکومت کو برطرف کر دیا تھا اور دوسری حکومت قایم کر کے اپنی منشا کے مطابق فیصلہ کروا لیا تھا۔ مسئلے کے حل کرنے کا یہ سیاسی طرز فکر نہیں تھا اور جو قدم اُٹھایا گیا تھا، وہ متبدانہ صفت سے تھا۔ جناح صاحب اگرچہ برٹش استعمار کے نامزد گورنر جنرل تھے، لیکن وہ کسی

آمرانہ حکومت کے فیصلے کا نفاذ نہیں کر رہے تھے۔ وہ ایک قومی سیاسی جماعت کے صدر تھے، انھوں نے تحریک پاکستان کی رہنمائی کی تھی۔ وہ اپنے منصب سے اپنی پشت پر مسلط استعمار کے مقاصد کو پورا نہیں کر رہے تھے ان کی ''حیثیت بابائے قوم'' کی تھی۔ ایک منتخب حکومت کا توڑ دینا اور ایک نامزد وزیر اعلیٰ سے اپنی منشا کا فیصلہ کروا لینا ان کے شایانِ شان نہیں تھا۔ اگر وہ سمجھتے تھے کہ قوم کے مفاد کا تقاضا یہی ہے تو اس کے لیے ان کا طرزِ عمل اس سے مختلف ہونا چاہیے تھا۔ شاید انھوں نے یہ سوچا ہو کہ جو وزیر اعلیٰ آج ان کے حکم کو ٹھکرا رہا ہے، وہ آیندہ بھی ان کے لیے مسایل پیدا کرے گا۔ اس لیے بہتر یہی ہے کہ اس سے آج ہی نمٹ لیا جائے۔ ان کے طرز فکر کا یہ کھوٹ تھا کہ انھوں نے سندھ مسلم لیگ کی عاملہ یا زیادہ سے زیادہ کونسل کے ارکان کی ایک میٹنگ کو سندھ کی نمایندہ سمجھ لیا تھا۔ اس سے ڈیڑھ برس پہلے بھی الیکشن کے موقع پر ان کے غیر مدبرانہ فیصلے نے سندھ کی سیاسی فضا کو مسموم کیا تھا۔ انھوں نے سندھ کے اجتماعی مفاد کو نظر انداز کر کے سندھ کے ذہین اور مخلص اصحاب کی جماعت کو میدان میں آنے سے روک دیا تھا اور پھر وہ جس جماعت کو میدان میں لائے تھے، اسے بھی اپنی انا کی بھینٹ چڑھا دیا۔

جناح صاحب کا یہ اقدام صرف ایک وزیر اعلیٰ کو برخاست کر دینے کا عمل نہ تھا، بلکہ اپنی جماعت سندھ مسلم لیگ پر عدمِ اعتماد کا اظہار بھی تھا اور سندھ کے چالیس لاکھ باشندوں کی توہین کا حادثہ بھی، جنھوں نے اپنے نمایندوں کو ووٹ دے کر سندھ اسمبلی میں اہل سندھ کی خدمت کے لیے بھیجا تھا۔ جناح صاحب کے اخلاص اور تدبر کا تقاضا یہ تھا کہ سندھ کی رائے عامہ کا احترام کیا جاتا اور سندھ اسمبلی کے متفقہ فیصلے کے بعد مسئلے کے حل کے لیے کوئی سیاسی راہ نکالی جاتی۔

سندھ کے اعتماد کو جھٹلانے، اس کے عوام کی متفقہ رائے کی توہین، جس میں سندھ مسلم لیگ کی رائے بھی شامل تھی اور سندھ کی منتخب حکومت کو توڑنے سے پہلے وہ سرحد کی حکومت کے خلاف اقدام کر چکے تھے۔ اوّلاً سرحد میں ۱۹۳۷ء کے انتخاب سے ایک انقلاب آیا تھا اور سرحد میں عوام کے منتخب نمایندوں نے پہلی بار حکومت قایم ہوئی تھی۔ اس وقت سرحد میں

نہ لیگ تھی اور نہ اس کا کوئی نمایندہ! سرحد کے حالات ومسایل ملک کے دوسرے صوبوں سے بالکل مختلف تھے۔ جناح صاحب ۱۹۴۰ء کے آغاز سے (ڈاکومنٹ کے مطابق) وایسرائے کے پیچھے پڑے ہوئے تھے کہ سرحد میں مسلمانوں کی واحد نمایندہ جماعت لیگ کی حکومت قایم کرادی جائے۔ وایسرائے ہند، گورنر سرحد، صوبے کا سیکرٹری حیرت زدہ تھے کہ سرحد میں لیگ کا وجود نہیں، اسمبلی میں اس کا نمایندہ نہیں، یہ کیوں کر ممکن ہے کہ جنگ (عالمی جنگ) میں لیگ کے تعاون اور امداد کی اجرت اور مزد مسلم لیگ کی حکومت کے قیام کی صورت میں ادا کی جائے؟ مشورے کی رسی انڈیا آفس لندن کے مدبرین اور ڈپلومیٹس تک دراز کی گئی۔ بالآخر سردار اورنگ زیب کی حکومت قایم کردی گئی، لیکن افراد اور قابلیت دونوں کے فقدان نے لیگ کی حکومت کو پھر اس کے مرجع کو لوٹا دینے پر مجبور کردیا۔ ۱۹۴۶ء کے الیکشن میں بہت تھوڑے سے فرق کے ساتھ ۱۹۳۷ء کے انتخاب کی روایت کو دہرا دیا گیا۔ سرحد میں انتخاب کے نتائج نے جناح صاحب کے جوش انتقام کی آگ کو اور بھی بھڑکا دیا۔ انھوں نے اپنی شکست کا بدلہ لینے کے لیے اسکندر مرزا کی نگرانی میں سرحد کی حکومت کو سبق پڑھانے کے لیے یوپی کی سی آئی ڈی، جس کا سرگرم رُکن انیس احمد نامی ایک شخص تھا، پنجاب کی مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے ارکان، نیشنل گارڈ کے نوجوانوں کی ایک فوج تیار کی گئی اور سرحد کی حکومت کو تہ وبالا کردینے کے مشن پر صوبہ سرحد میں خصوصاً پشاور اور اس کے گرد ونواح میں پھیلا دیا گیا۔ اس کے ضروری اور لازمی اخراجات کے اسکندر مرزا نے ایک کروڑ روپے کا تخمینہ لگایا تھا، جس میں سے بیس ہزار روپے انھوں نے نواب بھوپال سے لے لیے تھے اور مقاصد کے حصول کے لیے انھوں نے آزاد قبایل اور صوبہ سرحد میں جن لوگوں کو روپے دیے تھے ان کے ناموں اور ان کو دی جانے والی رقوم کی تفصیل بھی بیان کردی ہے۔

قومی وملی خدمت کا جو انتظام کیا گیا تھا وہ اگرچہ اس حد تک تو کامیاب نہیں ہوا تھا کہ سرحد کی منتخب حکومت کے ارکان پشاور کے محاذ کو پیٹھ دکھائیں، چارسدہ کے بزرگ کی خانقاہ میں پناہ ڈھونڈیں یا سرحد کے پٹھان اپنی شکست اور خواری کی علامت پگڑیوں کو سر پر رکھنے

کے بجائے گردن میں ڈال کر دہلی کا رُخ کریں اور برپا جنگ کے سپریم کمانڈر کے حضور اپنے گناہوں کا اعتراف کریں، حکومت سے دستبرداری کا یقین دلائیں اور صلح نامہ دہلی پر دستخط کریں اور جان و مال کی ضمانت کا پروانہ لے کر وطن کا رُخ کریں اور قصہ خوانی بازار میں جہاں کبھی وطن کی آزادی کے لیے اپنے ہزاروں سپوتوں کے خون سے اپنی وطن دوستی اور قوم پروری کی تاریخ لکھی تھی، وہیں کھڑے ہوکر مسلم لیگ سے اپنی بغاوت کے گناہ اور جنگ میں اپنی شکست کا اعتراف اور اپنی روسیاہی اور ذلت وخواری کا اعلان کریں اور اپنی سیاست کے شوق سے توبہ کر کے اپنے گھروں میں چھپ کر بیٹھ جائیں۔ میری نظر سے اس جنگ اور پیش آمدہ حالات کی کوئی تاریخ اور اس کے نتائج کی روداد نہیں گزری کہ اس کا حوالہ دوں اور آپ سے درخواست کروں کہ ان حقایق کو دل میں چھپا لیجیے۔ البتہ یہ کہہ سکتا ہوں کہ اس جنگ میں اسکندر مرزا سے لے کر ان کے عام سیاسی کارکن تک ہر کسی نے اپنے فرض کو خوب نبھایا تھا۔ سپاہیوں کی زبان سے جہاد قومی میں ان کی فتح کی داستانیں سنی ہیں اور ان کے چہروں پر خاموشی اور مسرت اور چمک دیکھی ہے۔

سیاسیات پنجاب کے اُفق پر بھی جناح صاحب کا کارنامہ نقش ہے۔ مطالعہ کر لیجیے۔ سکندر حیات کی حکومت کا تو وہ کچھ بگاڑ نہ سکے تھے۔ ان کے انتقال کے بعد ملک خضر حیات خاں ٹوانہ وزیراعظم ہوئے۔ پنجاب اسمبلی میں اس وقت ملک برکت علی خاں مسلم لیگ کے تنہا نمایندہ تھے۔ جناح صاحب اوّل روز سے پنجاب کی سیاست میں دخل دے رہے تھے۔ خضر حیات خاں سکندر حیات خاں کے جانشین تو ضرور تھے، لیکن سیاسی تدبر اور فن حکمرانی میں وہ اپنے پیش رو کے ٹھسے کی شخصیت نہیں تھے۔ جناح صاحب سے تنگ آکر انھوں نے لیگ میں شرکت گوارا کر لی تھی۔ جناح صاحب نے انھیں پھر بھی چین سے کام نہ کرنے دیا۔ اسمبلی اور کابینہ میں تو ان کی نہ چلی، لیکن خضر حیات کی مشکلات میں اضافہ ہوتا رہا۔ ان کے خلاف سول نافرمانی کی تحریک منظّم کی، لیگ سے نکالا اور بالآخر ۳/ مارچ ۱۹۴۷ء کو انھیں وزارت اعلیٰ سے استعفاء دینے پر مجبور کر دیا۔ اب خضر حیات کی جگہ افتخار حسین ممدوٹ نے وزیراعلیٰ کا چارج سنبھالا جنھوں نے ٹوانہ حکومت کے خلاف تحریک کو منظّم کیا تھا، جناح

صاحب کی زندگی نے وفا نہ کی ورنہ وہ اپنے ذوق و مزاج کے مطابق ممدوٹ صاحب کو بھی حکومت کرنے کا خوب مزا چکھاتے اور دنیا تماشہ دیکھتی۔

جناح صاحب کے تدبر کی داد دینی پڑتی ہے کہ اگرچہ وہ خود کسی تحریک میں شرکت سے گریزاں رہے اور اپنے آپ کو کسی آزمایش میں ڈالے بغیر فساد اور قتل و غارت گری کا ایک ہنگامہ برپا کر دیا۔ ذیل کی تحریکات اور ان کے ردعمل پر غور فرمایئے ۱۹۳۹ء کا یوم نجات، ۱۹۴۶ء کا یوم نفیر پاکستان، ۱۹۴۷ء میں پنجاب کی مخلوط حکومت کے خلاف تحریک سول نافرمانی، سرحد کا ریفرنڈم اور عوام کی منتخب حکومت توڑنا، سندھ میں لیگی حکومت گرانا، ریاست قلات کے خلاف آرمی ایکشن اور اس پر قبضہ اور اس کے حکمران خان احمد یار خاں کی گرفتاری!

قلات کے علاوہ بلوچستان کی لس بیلا، خاران اور مکران اور پنجاب کی ریاست بہاول پور کی جو تاریخ ہمارے سامنے آئی ہے اور جس سادگی، خاموشی اور خوشی کے ساتھ اپنے وجود کو پاکستان پر قربان کر دینے کی جو روداد ہمیں سنائی گئی ہے۔ ہم اسے جناح صاحب کے ذوق و مزاج، طرفہ سیاست اور ان کے طریقہ واردات کے بالکل خلاف پاتے ہیں۔ اس لیے ہم اسے ہرگز حقیقت تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں۔ جس سیاسی رویے کو ہم پنجاب، سرحد اور سندھ کی حکومت کے ساتھ دیکھتے ہیں، یقین نہیں آتا کہ وہ دیگر کے ساتھ نہ ہوگا!

۱۹۴۶ء کے الیکشن صوبوں میں عوام کے نمایندوں کے انتخاب کے لیے ہوئے تھے جنھیں آیندہ عوام کے لیے ان کی فلاح و بہبود اور تعمیر و ترقی کے وسایل تلاش کرنا، اس کے منصوبے بنانا، ان کی معاش کے لیے تجارت، صنعت، زراعت کا متوازن نظام قایم کرنا اور عوام کی علمی، فنی جسمانی صحت و صلاحیت کے مطابق مختلف شعبوں کی طرف ان کی رہنمائی کرنا اور ان کی تعلیم، تہذیب، تمدن، معاشرت اور زندگی کے ہمہ قسم کے مسایل میں ان کی دشواریوں کو دور کرنا اور آسانیاں پیدا کرنا۔ آخر کار ایک مہذب معاشرے کو وجود میں لانا اور ہمہ وقت عوام کی خدمت کے لیے مستعد رہنا جن کے فرایض میں شامل ہوتا ہے۔ ان مقاصد کے لیے انتخاب ہوتے ہیں اور صوبے کے دایرے میں عوام کو اپنے نمایندے منتخب

کرنے کا حق ہوتا ہے۔ اس مقصد سے ملک کے طول وعرض کے تمام صوبوں کی طرح صوبہ سرحد نے بھی اپنے نمایندے منتخب کر لیے تھے اور گزشتہ ڈیڑھ سال سے وہ اپنے حدود میں اپنے فرایض کو ادا کر رہے تھے اور مطمئن تھے کہ ریفرنڈم کے ہونے سے ان کی حکومت کو کوئی خطرہ نہیں تھا۔ ریفرنڈم کبھی کسی خاص مسئلے میں فرداً عوام کی رائے معلوم کرنے کے لیے قومی، صوبائی اسمبلیوں کے فیصلے پر یا صوبے کے گورنر یا ملک کے گورنر جنرل کے آرڈی ننس کے ذریعے کرائے جاتے ہیں۔ قومی نمایندہ حکومت کے قیام اور اس کے طریقۂ کار کے لیے دستور میں عام انتخاب ہی کا طریقہ مقرر ہے۔ اس لیے صوبے کا نظام چلانے والا ادارہ یعنی صوبائی اسمبلی موجود تھی اور اس کے لیے کوئی خطرہ نہ تھا۔ ریفرنڈم میں جو گورنر جنرل کے حکم سے ہوا تھا اور ایک فیصد ووٹ سے کامیابی اس وقت حاصل ہوئی تھی جب کہ منتخب حکومت اور اس کی جماعت نے ریفرنڈم میں حصہ لینے سے کنارہ کشی اختیار کر لی تھی۔ اگر وہ ریفرنڈم میں حصہ لینے کے لیے عوام کو اشارہ بھی کر دیتی تو گورنر جنرل کو اپنی عزت بچانا مشکل ہو جاتا۔

مسلم لیگ نے اپنے رہنماؤں، کارکنوں، طالب علموں، مولویوں کی پوری قوت کو سرحد کے محاذ پر جھونک دیا تھا۔ کفر واسلام کا معرکہ ثابت کرنے کے لیے اسٹیجوں اور اخباروں کے شور سے کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ برطانوی حکومت اور وایسرائے اور اس کے دفاتر کے اعلیٰ آفیسروں کی پشت پناہی، اس پر سرحد کانگریس کی خاموشی، سرخ پوشوں کی طرف سے ریفرنڈم کا مکمل بائیکاٹ، کل ہند کانگریس کمیٹی کا اس مسئلے سے عدم تعلق، اس پر ووٹوں میں کافی دھاندلی اور نتیجہ سامنے آیا تو معلوم ہوا کہ پاکستان کے حق میں صرف ۵۱ فیصد ووٹ پڑے۔ عام خیال یہ ہے کہ اگر سرخ پوش ریفرنڈم کا بائیکاٹ نہ کرتے اور کانگریس اس میں دلچسپی نہ بھی لیتی تو مسلم لیگ چالیس فیصد ووٹ بھی بہ مشکل حاصل کر سکتی تھی۔ ممتاز محقق جناب محمد فاروق قریشی (لاہور) نے صوبہ سرحد کے ریفرنڈم پر نہایت معلومات افزا بحث کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

”خدائی خدمت گار رہنما خان عبدالغفار کا کہنا تھا کہ:

۱) ہم کانگریس کے اتحادی ہیں، کانگریس نے تقسیم ہند کے منصوبے کو تسلیم کرلیا ہے۔ لہٰذا ہم اس فیصلے کے پابند ہیں۔

۲) دوسرے یہ کہ ابھی تقریباً ایک سال قبل پورے ہندستان کے ساتھ صوبہ سرحد میں بھی پاکستان کے مسئلے پر انتخاب ہوئے۔ جس میں خدائی خدمت گاروں کو کامیابی ہوئی۔ اب نئے سرے سے پھر اسی مسئلے پر ووٹروں سے رائے طلب کرنے کا کوئی جواز نہیں۔

۳) تیسرا بڑا اور اہم اعتراض یہ تھا کہ مسلم اکثریت کے دیگر تمام صوبوں کی اسمبلیوں نے اپنے اپنے صوبے کے بارے میں فیصلے کیے ہیں۔ یہاں تک کہ بلوچستان کا علاقہ، جہاں صوبائی اسمبلی کا وجود نہیں وہاں استصواب رائے کرانے کا جواز موجود ہے لیکن وہاں بھی ایسا نہیں ہوا، بلکہ شاہی جرگے کو بلوچستان کی تقدیر کا فیصلہ کرنے کا اختیار دیا گیا ہے جس کا عوام کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔ یہ بڑی حیرت انگیز بات ہے کہ صوبہ سرحد کے ساتھ امتیازی سلوک کیا جارہا ہے اور استصوابِ رائے کو صوبے پر مسلط کیا گیا ہے۔ جب خدائی خدمت گاروں کی معقول دلیل پر بھی کان نہ دھرے گئے تو انھوں نے مطالبہ کیا کہ ریفرنڈم میں تیسری چوائس پختونستان کو بھی شامل کیا جائے، مگران کا یہ مطالبہ بھی مسترد کردیا گیا تو خدائی خدمت گاروں نے ریفرنڈم کا بائیکاٹ کردیا۔

۶/تا ۱۷/جولائی تک ریفرنڈم کا سلسلہ جاری رہا۔ پولنگ بوتھوں پر سبز اور سرخ رنگ کے دو علاحدہ علاحدہ بکس رکھے گئے۔ پاکستان کے بکس کا رنگ سبز تھا جب کہ ہندستان کے بکس کا رنگ سرخ تھا۔ رائے دہندگان کی کل تعداد ۵،۷۲،۷۹۸ تھی۔ پاکستان کے حق میں ۲،۸۹،۲۴۴ ووٹ پڑے۔ ہندستان کے حق میں ۲۸۷۴ اور ۲،۸۰،۶۸۰ رائے دہندگان نے ریفرنڈم کا بائیکاٹ کیا۔ گو پاکستان کو پچاس اعشاریہ پانچ فی صد ووٹ ملے۔

اگرچہ خدائی خدمت گاروں نے ریفرنڈم کا بائیکاٹ کردیا تھا، لیکن باچاخان نے

ریفرنڈم کی حقیقت کا پردہ چاک کرتے ہوئے حقیقت بیان کر دی کہ ریفرنڈم میں وسیع پیمانے پر جعلی ووٹ بھگتائے گئے۔ یہاں تک کہ سرکاری ایجنسیاں بھی اس دھاندلی میں ملوث تھیں۔ اپنے الزام کی تائید میں انھوں نے لتمبر ضلع بنوں میں متعین فوج کے دستے کے کرنل بشیر کی شہادت پیش کی کہ اس کمپنی کے جوانوں نے تین تین مرتبہ پولنگ اسٹیشنوں پر جعلی ووٹ ڈالے۔ اس قدر کھلم کھلا دھاندلی کے باوجود مسلم لیگ کو انچاس کے مقابلے میں اکیاون ووٹ ملے۔‘‘(۱)

جناح صاحب نے صوبے کے گورنر کو حکم دیا کہ وہ صوبے کی حکومت کو ڈس مس کر دے۔ گورنر کو اختیار ہوتا ہے کہ وہ گورنر جنرل کے حکم اور اشارے کے بغیر صوبائی حکومت کو توڑے، لیکن اس عمل کے لیے قانونی جواز کی ضرورت ہوتی ہے جو موجود نہیں تھا۔ اب سرحد کا گورنر برٹش حکومت کا نمایندہ نہیں تھا۔ حکومت پاکستان کا ملازم تھا جو چند ہی دن پہلے سرحد پہنچا تھا اور حکومت پاکستان کی وفاداری کا حلف اُٹھایا تھا۔ وہ شش و پنج میں تھا کہ حکومت توڑنے کا قانونی جواز موجود نہیں تھا لیکن ملازمت کی صورت میں وہ گورنر جنرل پاکستان کے حکم سے انکار نہیں کرسکتا تھا اور نہ ٹال سکتا تھا۔ اس نے حکومت توڑے جانے پر لکھا ’’گورنر جنرل پاکستان کے حکم سے سرحد کی حکومت کو توڑا جاتا ہے۔‘‘

جناح صاحب نے غور نہیں فرمایا تھا کہ صوبہ سرحد کا محل وقوع اور اس کی سرحد مانع تھی کہ سرحد کی حکومت اور عوام ہندستان سے اس کے الحاق کی غلطی کریں۔ کانگریس کی عاملہ اور دیگر مجلسوں میں حضرت بادشاہ خاں خود حالات کے جبر کا اعتراف کر چکے تھے اور جیسا کہ ان پر الزام لگایا جاتا ہے کہ آزاد ریاست یا افغانستان سے وہ الحاق چاہتے تھے۔ حقیقت سے اس کا کچھ تعلق نہ تھا اور تقریباً ۶۴ برس کی تاریخ اس سچائی پر اپنی مہر لگا چکی ہے۔

افسوس کہ پاکستان اور تحریک پاکستان کے رہنما سیاسی تدبر و بصیرت سے یکسر محروم،

---

(۱) ابوالکلام آزاد اور قوم پرست مسلمانوں کی سیاست، محمد فاروق قریشی، مکتبۂ فکر و دانش، لاہور، ۱۹۹۱ء، ص ۵۵۸

تاریخ کے تقاضوں سے بے خبر، ملک کے جغرافیے سے نا آشنا، صوبوں اور علاقوں کے حدود اور ان کی اہمیت سے بالکل ناواقف تھے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو لیگ ملک کی تقسیم کو صوبوں کی تقسیم کی بنیاد پر نہ بناتی جو صوبوں تک بھی محدود نہ رہی بلکہ اس کے اضلاع، تحصیلوں کے حدود کا اثر گاؤں کی تقسیم تک سیلاب کی طرح پھیلتا چلا گیا تھا اور لیاقت علی خاں گاندھی جی، ولبھ بھائی پٹیل کی اس پیش کش کو ہرگز نہ ٹھکراتے کہ کشمیر تم لے لو کہ اس کی سرحد پاکستان سے ملی ہوئی ہے اور حیدر آباد کی آرزو سے دست بردار ہو جاؤ کہ وہ ہندستان کی آبادی اور سرزمین کے بیچ میں گھرا ہوا ہے!

جناح صاحب ریاست قلات کے مشیر تھے۔ وہ اس کی اجرت لیتے تھے۔ ریاست کے حکمران خان احمد یار خان سے دوستانہ تعلقات تھے۔ وہ قلات آتے اور ہفتوں ان کے مہمان رہتے۔ خان صاحب ان کی تواضع میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہ رکھتے تھے۔ وہ دہلی میں جناح صاحب کے مہمان ہوتے تھے۔ دونوں میں بہت قریبی اور قابل رشک تعلقات تھے۔ خان صاحب نے جناح صاحب کو سونے اور چاندی میں تولا تھا۔

قیامِ پاکستان کے بعد انھیں حکم ملا کہ وہ ریاست سے دستبردار ہو جائیں اور ریاست کو پاکستان کے نظام حکومت سے وابستہ کر دینے میں کوئی رکاوٹ پیدا نہ کریں۔ خاں صاحب اس کے لیے تیار نہیں ہوئے۔ خط وکتابت ہوئی، لیکن کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ خان محمد امین خان کھوسو علی گیرین، بلوچ زمیندار بیچ میں پڑے۔ گفتگو کا سلسلہ دراز ہوا، لیکن ابھی کسی نتیجے تک نہ پہنچے تھے کہ پاکستان کی فوج کو آگے بڑھنے کا حکم دیا گیا اور ریاست کے حکمران کو گرفتار اور ریاست پر قبضہ کر لیا گیا۔ حکومت پاکستان کے ریاست کے خلاف ایکشن اور حکمران کی گرفتاری سے ریاست کی رعایا اور بلوچستان پر بہت برا اثر پڑا۔ بلوچ سرداروں اور عوام نے اسے جناح صاحب کا دھوکا اور خان سے بے وفائی قرار دیا۔ بلوچستان میں اس وقت جو حالات پیدا ہوئے اور آج تک موجود ہیں، اس کا بیج جناح صاحب نے بویا تھا۔ جو اب تک کانٹوں کی جھاڑ بن چکا ہے۔ جس کی صفائی کی کوئی صورت نظر نہ آتی تھی!

جناح صاحب نے یہ بھی نہ سوچا کہ ان کے دشمن پنڈت نہرو نے جس سے انھیں بات

کرنا بھی گوارا نہ تھا اور انھوں نے کتنی بار اسے دشنام سے نوازا تھا۔ ان کی عاجزانہ درخواست پر خلاف قانون، پچھلی تاریخوں میں ان کے دہلی کے مکان کی خرید وفروخت کے کاغذات تیار کرا دیے تھے۔ اب وہ کس توقع پر اس سے ایک خلاف قانون درخواست کر رہے ہیں؟ کیا یہ سچ ہے کہ غرض انسان کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیتی ہے اور بے حیا و بے شرم بنا دیتی ہے اور نااہل شخص اقتدار پا کر ظلم کو وتیرہ بنا لیتا ہے اور صرف اس لیے کہ وہ اپنے اختیارات واقتدار کی قوت کو آزمانا چاہتا ہے وہ غلط سلط فیصلے کیے جاتا ہے۔

جناح صاحب کو یہ خیال نہیں آیا کہ خان آف قلات نے ان کے ساتھ کوئی نازیبا بات نہ کہی تھی۔ وہ صرف اپنی عزت اور آبرو بچانے کی فکر میں تھے۔ وہ جناح صاحب کا دوست اور محسن تھا۔ اس نے کبھی کسی مقدمے کے پیش آنے اور مشورے کیے بغیر ریاست کا مشیر بنا کر ان کی مالی امداد کی تھی۔ انھیں سونے چاندی میں تول کر ان کی شہرت میں اضافہ اور عزت افزائی کی تھی۔ خان آف قلات کے ساتھ میرے خیال میں جناح صاحب کا رویہ اس سے بہت بلند ہونا چاہیے تھا جو پنڈت نہرو نے خود ان کے ساتھ کیا تھا۔

اس مسئلے کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ سوچا جائے کہ آیا جناح صاحب نے قلات ریاست پر حملے کر کے پاکستان کے حال اور مستقبل کے لیے کوئی کارنامہ انجام دیا تھا؟ اگر فیصلہ اس کے حق میں ہو تو ہمیں جناح صاحب کی اس عظیم الشان قومی خدمت اور ان کی سیاسی بصیرت، تدبر، بلند خیالی کا اعتراف کرنا چاہیے۔ اگر یہ حقیقت ہو تو ہمارے لیے یہ ہرگز جائز نہ ہوگا کہ ہم ان لوگوں کو اچھے ناموں سے پکاریں اور ان کا احترام کریں جنھوں نے خان صاحب کا ساتھ دیا تھا اور جناح صاحب کے بارے میں بدگمانی کا شکار ہوئے تھے۔ اس صورت میں یہ بھی ضروری ہوگا کہ اس بات کی تحقیق کی جائے کہ اس فکر کی جڑیں کہیں موجود تو نہیں؟ اگر ایسا ہو تو اصحابِ نظر خود سمجھ سکتے ہیں کہ جناح صاحب سے ان کی عقیدت کا تقاضا کیا ہے؟

جناح صاحب کی زندگی کی یہ عجیب بات ہے کہ ان کے، پاکستان کی تعمیر اور عوام کی خدمت کے شوق کا یہ عالم تھا کہ پاکستان کے گورنر جنرل، پاکستان کی لیجسلیٹو اسمبلی

کے صدر ہونے کے علاوہ افواج پاکستان کے سپریم کمانڈر ہونے کے باوجود وہ لیاقت علی خاں وزیراعظم پاکستان کے آفس میں جاتے تھے اور معلوم کرتے تھے انھیں کیا مسایل درپیش ہیں، ان کی مشکلات کیا ہیں اور انھوں نے کس مسئلے میں کیا موقف اختیار کیا ہے اور کس کی درخواست پر کیا لکھا ہے؟ وہ کبھی نواب زادہ کو زبانی ہدایت فرما دیتے تھے اور شاید کبھی کسی فایل پر خود بھی کوئی نوٹ یا جواب یا فیصلہ لکھ دیتے تھے۔ عام طور پر ایسے شوق کو ایک دیوانگی کہا جاتا ہے اور ایسے شخص کو برداشت کرنے کا تحمل ہر کسی میں نہیں ہوتا۔ ایسی کوئی تراز و اور پیمانہ ایجاد نہیں ہوا کہ میں اپنے قارئین کو بتا سکوں کہ نواب زادہ میں اپنے محسن اور پیر و مرشد کو، جنھوں نے انھیں کرسی تک پہنچایا برداشت کرنے کی قوت کتنی تھی؟ لیکن اگر بہ غور مطالعہ کیا جائے تو میں سمجھتا ہوں کہ اس کے حیرت انگیز نتایج سامنے آئے۔ وہ ملک کے وزیراعظم تھے اور جناح صاحب کی مداخلت کے بجائے ان کی اپنی ذمے داریاں کیا کم تھیں اور ان کا تقاضا تھا کہ بعض انتظامی معاملات اور فیصلوں اور اقدامات میں انھیں شریک نہ کیا جائے۔ چناں چہ لیاقت علی خاں نے کشمیر پر قبضے کا جو پلان بنایا تھا تو کوشش کی تھی کہ جناح صاحب کو کسی اُلجھن میں نہ ڈالا جائے۔ انھوں نے جناح صاحب کو اس فیصلے اور اس کے مطابق عملی اقدام سے بے خبر رکھا تھا۔ جناح صاحب کو آغاز کار کے ایک ہفتے یا دس دن بعد خبر ہوئی جب پاکستان سے ہندستان تک ایک حلقے میں تہلکہ مچ گیا تھا۔

اُوپر کی سطروں میں جناح صاحب کے تین مناصب پر فایز المرامی کا ذکر آیا ہے۔

۱) وہ پاکستان کے گورنر جنرل تھے۔ سیکڑوں اہل نظر، صاحب ہنر، مشیر اور نظام کو چلانے والے، تینوں منصبوں کے الگ الگ سیکرٹری اور خدمت گزار تھے لیکن انھوں نے اپنا کوئی نائب نہ بنایا تھا۔ وہ اپنی ذمے داریوں میں کسی کو شریک کرنے کے لیے راضی نہیں ہوئے تھے۔

۲) وہ پاکستان کی دستور ساز اسمبلی کے صدر تھے۔ وہ اس کے سیکرٹری اور اس کے چند کلرکوں کی مدد سے تمام کام چلاتے تھے۔ اپنی ذمے داریوں میں کسی کی شرکت انھیں نے گوارا نہ کی تھی۔

۳) افواج پاکستان کے سپریم کمانڈر کی حیثیت سے اس کے نظام میں مداخلت کی گنجایش نہ تھی۔ ایک رسمی اور ضابطے کا منصب تھا۔ خاص اور ہنگامی حالات میں ان کے اختیارات کے استعمال کی ضرورت ہوتی ہے۔ جنرل گریسی کو انھوں نے کشمیر میں فوج داخل کرنے کا جو حکم دیا تھا، وہ انھیں اس سے اوپر عہدے دار کے دینا چاہتے تھے۔ راست گریسی کو نہیں! گریسی کو ضابطے کی پابندی کے تحت اپنے کمانڈر انچیف کے علم میں لانا اور اقدام میں اس کی اجازت لازمی تھی۔ ضابطے کے خلاف جناح صاحب نہ کچھ کر سکتے نہ کیا، وہ اس کو اُوپر کے عہدے پر ترقی پانے سے بھی نہ روک سکے تھے![1]

جناح صاحب نے ہر منصب کے کاموں کی ذمے داری اپنے کندھوں پر اُٹھا رکھی تھی۔ وہ ہر فایل کو خود دیکھتے اور اس پر نوٹ لکھتے تھے۔ وہ اپنے عمل میں دوسروں سے خدمت ضرور لیتے تھے، لیکن اپنی ذمے داری میں کسی کو شریک نہ کرتے تھے۔ وہ مسلم لیگ کے صدر بھی

---

(۱) کئی حضرات کے بیانات میری نظر سے گزرے ہیں، جن میں کہا گیا ہے کہ جناح صاحب کو لازم تھا کہ وہ جنرل گریسی سے حکم عدولی کی باز پرس کرتے، سرزنش فرماتے، اس کو اس کے منصب سے ہٹا دیتے اور کچھ نہیں تو اس کو ترقی نہ دیتے! مجھے بھی اس پر تعجب تھا! لیکن ڈاکٹر فرخ ملک مرحوم کی ایک تحریر سے یہ خلجان دور ہو گیا۔ ملک صاحب نے اوّل تو اس بات پر ہی شبہ ظاہر کیا ہے کہ آیا جناح صاحب نے اسے حکم بھی دیا تھا؟ وہ لکھتے ہیں:

> ''کیا جنرل گریسی اور آرمی کو واقعی حقیقتاً کشمیر بھیجنے کا حکم دیا گیا تھا؟ اور یہ سوال کیا ہے کہ وہ کون سی سازش تھی جس کے نتیجے میں Gen. Frank Masservy کو ہٹا کر Lt. Gen Douglos Gracey کو کمانڈر انچیف بنایا گیا۔ جنرل گریسی اپنی سوانح حیات میں لکھتا ہے کہ وہ کسی بھی پاکستانی حکمراں کے حکم کا پابند نہیں تھا۔ کیوں کہ اس کی تعیناتی بھی اسی برٹش کراؤن کی تھی جس نے پاکستان کے گورنر جنرل کی تقرری کی تھی!
>
> بعد میں کن طاقتوں نے اسے اعزازی فور اسٹار جنرل کے عہدے سے نوازا اور وہ تین سال تک پاکستان آرمی کا سربراہ بنا رہا۔'' (جھروکے (جلد پنجم)، ڈاکٹر فرخ ملک، لاہور، ۲۰۱۱ء)

تھے اور اس کا ایک سیکرٹری ہونے کے باوجود بہت سے فیصلوں کو انھیں خود کرنا پڑتا تھا۔ اس دایرے میں بھی وہ لیگ کے سیکرٹری لیاقت علی خاں پر سو فیصد اعتماد نہ کرتے تھے۔

ایسے صاحب ہمت، مستعد اور کارگزار شخص کے بارے میں افواہوں، فیصلوں اور کمزوریوں کی شہرت ہو جانا کوئی تعجب کی بات نہ ہوتی، لیکن صحیح یا غلط شہرت کے مصادر ہوتے ہیں اور کچھ باتیں ایسی ہوتی ہیں جو عوام میں پیدا ہوتی ہیں، عوام کی فضا میں ان کی پرورش ہوتی ہے اور دور تک ان کی شہرت پھیل جاتی ہے۔ یہ عام افواہیں ہوتی ہیں اور ان کی عمر دراز نہیں ہوتی، ایک عرصے میں ان کا وجود خود موت کے گھاٹ اُتر جاتا ہے۔

کچھ باتیں ایسی ہوتی ہیں جو خواص کے دایرے سے نکلتی ہیں اور فضا کو مسموم بناتی ہیں۔ یہ افواہیں نہیں ہوتیں، ان میں سو فیصد نہ سہی کسی نہ کسی حد تک حقیقت ضرور ہوتی ہے، یہ فضا کو نہیں تاریخ کو مسموم کرتی ہیں۔ ان کی زندگی دراز ہوتی ہے اور ان کا نقش مٹائے نہیں مٹتا۔ جناح صاحب کے بارے میں ایسی ہی شہرتوں میں ایک شہرت یہ ہے کہ جناح صاحب مستقلاً دو منصبوں کی پوری پوری تنخواہ لیتے تھے۔ یہ ایسی خبر نہیں جو زمین سے اُٹھ کر فضائے آسمانی سے گزر کر صحافت کے اعلیٰ علیین تک پہنچی ہو۔ یہ وہ خبر ہے جو آسمانِ سیاست کے کے تخت نشینوں نے اپنے فرستادہ ملائک کے ذریعے آسمان زمین پر نازل کی اور پھر قدیم و جدید میڈیا کے پروں پر اُڑ کر پاکستان کے دور دراز گوشوں تک پھیل گئی۔ اس کے باوجود کہ ہم اس خبر کا حصہ اوّل سوسایٹی میں تیسرے درجے کے مخالفین و منتقمین جناح صاحب کو قرار نہیں دے سکتے، ہمیں یقین ہے کہ پاکستانی سیاست کے اعلیٰ علیین سے صحافت کا کوئی فرشتہ صفت کھوجی یہ خبر لایا ہے جس میں سچائی کے عنصر سے انکار دُشوار ہے۔ پھر بھی ہم اسے علوم قرآنی کی اصلاح میں آیات محکمات میں شامل نہیں کر سکتے، لیکن قرآن حکیم کے متشبہات بھی تو اپنے اندر ایک حقیقت رکھتے ہیں۔ خواہ وہ ہمارے فہم کی دست رس سے باہر ہو، ہم اس کی پوشیدہ سچائی سے انکار نہیں کر سکتے اور عزیمت کی راہ یہ ہے کہ حقیقت کو تلاش کیا جائے اور اپنے عقیدہ وفکر کی بنیاد اس حقیقت کو بنایا جائے۔

ایک انٹرویو نگار نے وقت کے چند فضلا سے اس حقیقت کی دریافت کے لیے سوالات

کیے تھے۔ ایک فاضل مصلحت اندیش کچھ اس طرح جواب دے کر کنی کترا گئے کہ ''یہ مسئلہ اہم اور لایق توجہ ہے۔'' اس پر غور کرنا چاہیے، لیکن یہ میرا موضوع نہیں۔ یہ ایک جواب ہے۔ اگر وہ شخص مؤرخ ہونے کا دعوے دار ہے تو اس کے لیے یہ جواب نہایت شرم ناک ہے۔ کیا وہ اہل پاکستان کو اپنی تاریخ کے حقایق سے بے خبر رکھنا چاہتا ہے۔ اگر اس کے نزدیک یہ بات غلط ہے تو کیا وہ نہیں چاہتا کہ جناح صاحب کی سیرت کے بارے میں غلط فہمی دور ہو! اگر یہ حقیقت ہے تو سامنے آ جانی چاہیے۔ اگرچہ یہ قوم کے لیے بہت بڑا سانحہ ہوگا، لیکن غالب کے بقول تاب لاتے ہی بنے گی۔ یہ بات کانا پھوسی، بدگمانی اور غیبت کے گناہ سے تو بہت کم ہے۔ قوم ایک مرتبہ سینے کو پیٹ کر اور سر کو کسی دیوار سے پھوڑ کر صبر میں اپنی بے چینیوں کا علاج تلاش کرلے گی اور ہمیشہ کے لیے خاموش ہو جائے گی۔

اب یہاں تک پہنچے ہیں تو اس اندیشے کا جواب بھی مل جانا چاہیے کہ کیا جناح صاحب برٹش دور کی طرح زندگی کے آخری دور میں بھی اپنی آمدنی کا آڈٹ خود کراتے تھے یا بنک میں ان کے اکاؤنٹ سے سرکاری واجبات، انکم ٹیکس کی وصولی کرلی جاتی تھی؟

جناح صاحب کے گورنر جنرل بننے کے فیصلے کو شاید ہی کسی نے سراہا ہو۔ خود لیگ کے رہنماؤں نے اس فیصلے کو بہت بڑی غلطی قرار دیا ہے۔ ملک کی تقسیم کے بعد اس سے بڑی کوئی غلطی لیگی قیادت سے سرزد نہ ہوئی تھی۔ انھوں نے اس فیصلے کے نقصانات بیان کیے ہیں، جو قارئین مطالعہ فرمائیں گے۔ میں یہاں صرف ایک نکتہ کی طرف اشارہ کروں گا۔ ملک کے اثاثوں کی تقسیم کی ذمے داری گورنر جنرل کی تھی اور تمام اثاثے ہندستان کے حدود میں پھیلے ہوئے تھے۔ ۱۴؍اگست کی تاریخ سر پر آ پہنچی تھی اور جناح صاحب نے اس بارے میں اپنی رائے سے ماؤنٹ بیٹن کو اس کے بار بار کے تقاضوں کے باوجود اپنی رائے اور فیصلے سے مطلع نہیں کیا۔ مطلع کیا تو یہ کہ وہ پاکستان کے گورنر جنرل خود ہوں گے۔ اثاثوں کی تقسیم کی ذمے داری صرف ماؤنٹ بیٹن کی تھی اور اب وہ صرف ہندستان کے حقوق کا ذمے دار تھا۔ جناح صاحب کے فیصلے نے اُسے پاکستان کی ترجمانی اور اس کے حقوق کی نگرانی سے دستبردار کر دیا تھا۔ جناح صاحب کے لیے ہندستان جانے کا وقت گزر چکا تھا۔ یہاں کے

حالات نے انھیں قید کر دیا تھا۔ اگر یہ مجبوری نہ ہوتی تب بھی اثاثوں کی تقسیم کی نگرانی ان کے بس کی بات نہ تھی۔ جناح صاحب نے تقسیم اثاثہ جات کی نگرانی کے لیے اپنا کوئی جانشین اور نمایندہ بھی مقرر نہ کیا تھا۔ ایسی صورت میں جو ہونا تھا، وہی ہوا! لیکن سوچیے کہ اس کا ذمے دار کون تھا۔ ماؤنٹ بیٹن کا انتقام، ہندستان کی دشمنی، تقسیم کے بعد ہندستانی ارکان کی بددیانتی، کیا اس کے مقابل پاکستان کا کوئی نمایندہ اُسے ٹوکنے والا اور اس کا ہاتھ پکڑنے والا تھا؟ کیا اس کے ذمے دار جناح صاحب نہیں تھے؟ کیا وہ پاکستان کے گورنر جنرل ہو کر اپنی ذمے داری سے سبک دوش ہوئے تھے؟ کیا جناح صاحب نے تقسیم اثاثہ جات کے لیے اپنا کوئی قایم مقام نامزد کیا تھا؟

ماؤنٹ بیٹن کی ناجایز طرف داری، پاکستان سے اس کی دشمنی، ہندوؤں سے مل کر پاکستان کے خلاف اس کی سازش کے تذکار میں سیکڑوں صفحات نظر سے گزر چکے ہیں۔ کیا کسی نے جناح صاحب کی غفلت اور فرض شناسی یا ضروری اقدام و انتظام سے لاپروائی پر بھی غور کیا ہے؟ اس کے نتایج پر سب کی نظر ہے۔ اصل حقیقت پر بھی غور فرمایئے۔

جناح صاحب کے گورنر جنرل بننے پر بھی غور فرمایئے کہ مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی یا اس کی کونسل نے کب فیصلہ کیا یا فرداً فرداً ہی ارکان سے مشورہ کیا گیا تھا؟ حقیقت یہ ہے کہ یہ فیصلہ جناح صاحب نے خود اپنے طور پر کیا تھا، لیکن سوال یہ ہے کہ یہ حق انھیں کس نے دیا تھا اور خود ان کے فیصلے کر لینے کا جواز لیگ کے نظام جماعت و سیاست میں کس طرح پیدا ہو گیا تھا؟ ماؤنٹ بیٹن کی ایک ذاتی رپورٹ نمبر ۱۱، مورخہ ۴ر جولائی ۱۹۴۷ء کا حوالہ پڑھیں، کئی تاریخی حقایق سے مطلع ہوں اور جناح صاحب کے پاکستان سے حسن اخلاص کا خود ہی فیصلہ کریں۔ وہ لکھتا ہے:

"گزشتہ تین ہفتوں سے ہم مسٹر جناح سے جواب حاصل کرنے کی کوشش کرتے رہے ہیں لیکن انھوں نے جواب نہ دیا۔ آخر میں انھوں نے مجھ سے کہہ دیا کہ جب تک وہ بل کو دیکھ نہیں لیتے اس وقت تک کوئی جواب نہیں دے سکتے۔ جب انھوں نے بل دیکھ لیا تب بھی جواب نہیں دیا اور کہا کہ وہ اپنے دو دوستوں

سے مشورہ کرنے کے بعد جواب دیں گے اور یہ دونوں اس وقت ریفرنڈم میں مصروف ہونے کی وجہ سے یہاں موجود نہیں ہیں۔ آخر کار وہ میرے پاس آئے ''تاکہ مجھ سے مشورہ حاصل کریں کہ انھیں کیا کرنا چاہیے'' انھوں نے کہنا شروع کیا کہ وہ پاکستان کے ہر صوبے میں برطانوی گورنر رکھنے کے خواہش مند ہیں، سوائے سندھ کے، یہاں کا گورنر مسلمان ہو سکتا ہے، کراچی میں جس کی وہ خود ذاتی طور پر نگرانی کریں گے۔ انھوں نے کہا کہ وہ پہلے ہی تینوں افواج پاکستان کے سرابراہان انگریز بنا چکے ہیں اور کہا کہ انگریز افسروں کو ملازم رکھنے پر پاکستانیوں کو مطمئن کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ وہ خود گورنر جنرل بنیں!

انھوں نے کہا کہ وہ یہ قدم اُٹھانے کے خواہش مند نہ تھے، لیکن ان کے تین، چار گہرے دوستوں اور ہم کاروں نے، جن سے انھوں نے مشورہ کیا تھا، اس پر مجبور کیا۔ جیسا کہ نواب بھوپال ان کے اصلی دوست اور مشیر ہیں۔ انھوں نے تین یوم قبل مجھے بتایا کہ جناح نے اس مسئلے پر بطور خاص ان سے مشورہ کیا اور نواب بھوپال نے ان سے کہا تھا کہ ان کے خیال میں مشترکہ گورنر جنرل اور ان کے ساتھ برطانوی ٹیم کی تجویز کو مسترد کرنا حماقت ہوگی، جو ۳۱ر مارچ ۱۹۴۸ء تک تقسیم کے کام کی تکمیل کی نگرانی کرے گی (جو کہ تقسیم کا کام مکمل ہونے پر ختم ہو جائے گی) اور یہ بالکل واضح ہے کہ اس سے لیاقت علی خاں کو بھی پورا اتفاق تھا۔ میں یہ سوچ کر خوف زدہ ہو جاتا ہوں کہ مسٹر جناح جس مشیر کی بات پر کان دھرتے ہیں وہ صرف جناح ہی ہے۔

وہ بڑائی کے خبط میں بری طرح مبتلا ہیں۔ جب میں نے ان کی توجہ اس جانب مبذول کرائی کہ اگر وہ آئینی گورنر جنرل بنتے ہیں تو ان کے اختیارات محدود ہوں گے لیکن وزیراعظم بن کر پاکستان کو اچھے طریقے سے چلا سکیں گے تو انھوں نے حقیقت کو بیان کرنے میں ذرہ برابر پس و پیش سے کام نہیں لیا کہ ان کا وزیراعظم وہی کچھ کرے گا جس کا وہ کہیں گے۔ ''میری پوزیشن یہ ہے کہ میں

مشورہ دوں گا اور دوسرے اس پر عمل کریں گے!''

تب مجھے یہ خیال آیا کہ بل میں ایک شق شامل کی جائے جس کی رو سے پاکستان میں ایک قایم مقام گورنر جنرل مقرر کرنے کی گنجایش رکھی جائے کہ جب گورنر جنرل اس ڈومینیں کی حدود میں نہیں ہوگا تو قایم مقام گورنر جنرل کام کرے گا۔ کانگریس کی میٹنگ بل پر غور کرنے کے سلسلے میں ہو رہی تھی۔ اس میں یہ تجویز منظور کر لی گئی تب مسلم لیگ کے نمایندوں کی میٹنگ میں یہ مسئلہ پیش ہوا۔

اس کے ساتھ ہی مسٹر جناح نے اس مسئلے میں مجھ پر وار کیا کہ اگر ہندستان ثالثی ٹریبونل کے ایوارڈ پر عمل نہ کرے تو اس کے خلاف کارروائی کی جائے اور پاکستان کو اثاثہ جات میں سے منصفانہ حصہ دیا جائے۔ انھوں نے کہا کہ اتفاق کی بات ہے کہ تقریباً تمام اثاثہ جات انڈین یونین کی سرزمین پر پڑے ہوئے ہیں۔ اس پر مسٹر جناح کے معتمد خاص کی موجودگی میں مجھے یہ کہنے کا اچھا موقع مل گیا کہ تقسیم کے منصوبے میں پاکستان کے مفادات کے تحفظ کے لیے مشترکہ گورنر جنرل اور برطانوی عملہ کی تجویز رکھی گئی ہے۔ اس پر دونوں بھروسا کر سکتے ہیں کہ کام انصاف کے ساتھ ہوگا۔

میں نے ان کو بتایا کہ کانگریس نے اس سسٹم سے اتفاق کیا تھا اور مجھے گورنر جنرل نامزد کر دیا تھا۔ میں نے اور میرے برطانوی عملے نے ۳۱ر مارچ ۱۹۴۸ء تقسیم کی مدت کے اختتام تک کام کرنے پر رضامندی ظاہر کر دی تھی۔ میں نے کہا کہ مجھے خوشی تھی کہ تقسیم کا زیادہ تر کام دہلی میں بیٹھ کر سرانجام پائے گا اور کراچی جانے کے لیے میں بہت کم وقت نکال سکوں گا۔ اس لیے میں نے ساڑھے سات ماہ کے لیے قایم مقام گورنر جنرل کی تقرری پر کانگریس کو رضامند کر لیا تھا اور یہ کہ میں پاکستان کا دورہ قایم مقام گورنر جنرل کے ساتھ باہمی بندوبست سے کروں گا۔

جناح نے اس تجویز کو قبول کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ میں مشکل سے یقین کر سکا تھا کہ اثاثہ جات کی بحفاظت تقسیم کے لیے اس قابل عمل طریقے کو مسترد کرنے والا جناح تھا۔ اس طریقے پر کانگریس کو اتفاق تھا کہ ۳۱؍مارچ تک ایک مستقل گورنر جنرل کی بجائے کراچی میں قایم مقام گورنر جنرل مقرر کر دیا جائے اور اس کے بعد بہر حال وہ اپنا گورنر جنرل مقرر کریں گے۔

جناح نے مجھ سے پختہ یقین کے ساتھ کہا کہ مشترکہ گورنر جنرل کے عدم تقرر کی بنا پر تمام نقصانات کا انھیں پورا ادراک ہے۔ ان کی خواہش تھی کہ میں بطور وایسرائے یا بالا گورنر جنرل کی حیثیت میں تقسیم کے کام کی نگرانی کروں، لیکن وہ ۱۵؍اگست کے بعد پاکستان کے گورنر جنرل کے علاوہ کوئی بھی پوزیشن قبول کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔

میں نے ان سے کہا ''آپ کو اس کی کیا قیمت ادا کرنی پڑے گی؟'' انھوں نے افسردہ لہجے میں کہا ''ہوسکتا ہے کہ اس سے مجھے چند کروڑ روپوں کے اثاثہ جات سے محروم ہونا پڑے۔'' اس پر میں نے کچھ تلخی آمیز جواب دیا ''اس کی آپ کو بہت زیادہ قیمت ادا کرنا پڑسکتی ہے، جو پورے اثاثہ جات اور پاکستان کے مستقبل کی صورت میں بھی ہوسکتی ہے۔'' یہ کہہ کر میں اُٹھ کھڑا ہوا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

میٹنگ کے سیکرٹری محمد علی نے میرے پی ایس وی (جارج ایبل) کے ساتھ دوپہر کا کھانا کھایا۔ اس نے بتایا کہ میٹنگ کے بعد اگلا گھنٹہ میرے بم شیل پر گفتگو پر صرف ہوا، لیکن وہ جناح کو ان کے موقف سے دستبردار کرانے میں کامیاب نہیں ہوئے۔ دوپہر کے کھانے کے بعد لیاقت علی خاں میرے پاس آئے اور مجھ سے استدعا کی کہ میں دونوں گورنرز جنرل سے بالا گورنر جنرل بننا قبول کرلوں اور یہ جناح کے لیے قابل قبول ہوگا، لیکن مجھے توقع نہیں کہ مسٹر جناح پاکستان کا پہلا گورنر جنرل بننے کی بڑی خواہش سے دست کشی اختیار کر

سکتے ہیں۔ ''خواہ اس کا مطلب یہ کیوں نہ ہو کہ وہ اس کے آخری گورنر جنرل ہوں گے؟'' میں نے لیاقت کو بتایا۔ انھوں نے اپنے کندھے اُچکائے اور افسردہ لہجے میں کہا ''ہم اپنی بساط کے مطابق قدم اُٹھائیں گے، جو کچھ بھی ہو، لیکن مجھے توقع ہے کہ آپ ہندستان میں قیام ضرور کریں گے۔ بصورت دیگر صورت حال بڑی خراب ہوگی اور اس کا خمیازہ پاکستان کو بہت زیادہ بھگتنا پڑے گا۔'' اسی طرح جناح نے نہایت خلاف معمول مجھ سے استدعا کی کہ میں ہندستان کا گورنر جنرل بن کر حالات پر اثر انداز ہوتا رہوں۔ انھیں تشویش تھی کہ ہندستان کی حکومت پاکستان کے لیے مشکلات پیدا کرسکتی ہے۔

میں اب بڑے گومگو کی حالت میں ہوں۔ میرا ہمیشہ یہ خیال رہا تھا کہ میرا ناتا دونوں مملکتوں سے رہے گا یا پھر کسی سے بھی نہیں۔ میں نے کبھی خواب میں بھی نہ دیکھا تھا کہ دونوں مجھ سے کسی ایک کے ساتھ ناتا رکھنے کا مشورہ دیں گے۔

میرا اپنا خیال یہ ہے اور میں نے ہمیشہ محسوس کیا کہ اخلاقی طور پر یہ درست نہ ہوگا کہ میں دونوں میں سے کسی ایک کے ساتھ ناتا رکھوں، لیکن بدقسمتی سے مجھے اندیشہ ہے کہ میں نہرو اور کانگریس کی ساری قیادت کو اس راہ پر لگانے میں کامیاب رہا اور وہ مجھے اس پر کبھی معاف نہیں کریں گے کہ جناح کو ایک مرتبہ پھر اپنی ڈگر پر چلنے کی اجازت دے دی۔ اس لیے میں محسوس کرتا ہوں کہ یہ ایک ایسا معاملہ ہے جس کے لیے مجھے بہت زیادہ رہنمائی کی ضرورت ہے۔ میں اسے وطن بھیجنے کی ضرورت محسوس کرتا ہوں تاکہ رہنمائی حاصل کی جاسکے۔

ریئر ایڈمرل وسکاونٹ ماؤنٹ آف برما''(۱)

جناح صاحب کے بارے میں بہت سی باتیں پھیل گئی ہیں۔ اس کی داستانیں بنتی جا رہی ہیں جن سے جناح صاحب کی نیک نامی میں اضافہ نہیں ہو رہا ہے، نقصان پہنچ رہا ہے۔

(۱) تحریک پاکستان اور انتقال اقتدار، مترجمہ: محمد فاروق قریشی: لاہور، ۱۹۹۷ء، ص ۷۸-۳۷۶

ان کی عزت کو بٹا لگ رہا ہے۔ اگر واقعہ غلط ہے اور اکثر یہی سچ بھی ہے، تو جناح صاحب پر یہ سراسر ظلم ہے اور ایسا ہرگز نہیں ہونا چاہیے۔ اگر کسی درجے میں صحیح ہے تو حقایق سامنے آنے چاہییں، اوّلاً کامل نیک نیتی کے ساتھ تاویل سے کام لیا جائے حقایق کی جستجو میں بغض وعناد عدالت میں تعزیر یا صحافت میں تنقید میں سختی اور حد سے تجاوز کا تو ایک مسلمان کو دل میں خیال بھی نہ لانا چاہیے۔

ادھوری سچائی نہ ان کا دفاع کر سکتی ہے اور نہ انھیں رُسوائی سے بچا سکتی ہے۔ لیپا پوتی کے بیانات، اداریے اور انٹرویو کسی شخصیت کی گندگی کو دور نہیں کرتے۔ سوانح و تاریخ کو نا قابل اعتماد بنا دیتے ہیں۔

فلیگ، سٹاف ہاوس پر ان کے قبضے اور موہٹہ پیلس پر قبضے کے لیے آرڈیننس کا اجرا کہ کوئی شخص دو مکان نہیں رکھ سکتا۔ اگر قانون کا تقاضا یہی تھا اور اس لیے کسی شخص سے دوسرا مکان (موہٹہ پیلس) پر قبضہ کر لینا صحیح تھا تو موہٹہ پیلس ہی کیوں، دوسرا مکان کیوں نہیں؟ اس سلسلے میں مزید غور طلب بات یہ بھی ہے کہ مذکورہ آرڈیننس گورنر جنرل پاکستان نے جاری کیا تھا۔ اس کا دوہرا اثر کیا تھا۔ مقبوضہ مکانات کا حق دار کون تھا۔ اس کے کیا شرایط تھے۔ یہ پورے پاکستان کے لیے تھا، سندھ کے لیے تھا یا صرف موہٹہ پیلس پر قبضے کے لیے تھا۔ اس آرڈی نینس کے تحت کتنے مکانات ضبط کیے گئے اور ان کے مستحق کون لوگ قرار پائے تھے۔

پاکستان آنے سے پہلے ہندستان میں ان کے تین قیمتی سرمایے تھے۔ دو کوٹھیاں اور ایک بہن! دہلی کی کوٹھی انھوں نے پہلے فروخت کر دی تھی۔ ممبئ کی کوٹھی ان کی زندگی کے آخری لمحے تک انھی کی رہی تھی۔ انھوں نے یہ کہہ کر کہ وہ پاکستان میں اپنے منصب سے ریٹائر ہونے کے بعد اپنی زندگی کے بقیہ ایام بمبئ میں بسر کریں گے، پنڈت جواہر لال نہرو کو مطمئن کر دیا تھا اور کسٹوڈین کے قبضے میں جانے سے کوٹھی کو بچا لیا تھا! لیکن اس کے بعد کیا ہوا، معلوم نہیں!

یاد رہے کہ ممبئ کی کوٹھی کو انھوں نے اپنے دوسرے سرمائے کے ساتھ بہت بڑے انکم ٹیکس سے بچنے کے لیے اپنی بہن فاطمہ جناح کو ہبہ کر دیا تھا۔

حکومت میں چند بیوروکریٹ ایسے تھے کہ وہ جناح صاحب کی خدمت یا خوشامد کو ملک اور قوم کی سب سے بڑی خدمت سمجھتے تھے۔ ان کے کان میں یہ بھنک پڑنا کافی تھا کہ ان کے پیر و مرشد ملیر کے علاقے میں ایک قطعہ زمین لینا اور ایک کوٹھی تعمیر کرنا چاہتے ہیں کہ کبھی کاموں سے تھک کر اور ہنگاموں سے گھبرا کر، ملوں اور کارخانوں کے دھوئیں سے دور اور شہر کی آلودگیوں سے دامن بچا کر وہاں کے پرسکون علاقے اور صاف فضا میں کچھ گھنٹے یا دن گزار آیا کریں۔ ان کے منشا کا معلوم ہونا تھا کہ چند ہی دن میں ایک قطعہ زمین کا بیع نامہ اور ملکیت کے کاغذات خدمت میں پیش کر دیے گئے۔ یہ زمین ایک بڑھیا کی تھی۔ اس کے کسی ہمدرد نے اسے گورنر ہاؤس کے گیٹ تک پہنچا دیا تاکہ جناح صاحب آتے جاتے گزریں تو اپنے اُوپر ظلم کا شکوہ اور انصاف کی درخواست کر سکے۔ چناں چہ جوں ہی گیٹ کھلا اور گورنر جنرل کی گاڑی آتے نظر آئی، بڑھیا آگے بڑھی۔ گاڑی رُک گئی۔ پوچھا کیا ہے؟ بڑھیا نے قریب ہو کر کہا ملیر میں سرکاری آدمیوں نے میری زمین پر قبضہ کر لیا ہے اور درخواست بڑھا دی۔ جواب ملا کورٹ جاؤ کورٹ اور گاڑی آگے بڑھا دی۔ کم زور اور لاچار بڑھیا کورٹ تو کیا جاتی خدا کے حضور پہنچ گئی۔

اس سے آگے کوئی قدم اُٹھانا اور بڑھیا کو انصاف دلانا تو کسی عزیز و ہمدرد کے بس کی بات نہ تھی۔ بڑھیا کا انتقال ہو گیا اور جناح صاحب کو تو تعمیر کرانا ہی نہ تھی اتفاقی رہائش کے لیے تو بہاول پور کی کوٹھی ان کے قبضے میں آ چکی تھی۔

افسوس کہ تاریخ میں ان کے دامن پر ظلم اور رُسوائی کے داغ ہمیشہ کے لیے لگ گئے۔ کون ہے جو تاریخ سے ان کے دامن پر لگے ہوئے داغ کو مٹا دے۔

ملیر کے حوالے سے ایک اور واقعہ بھی جناح صاحب کی سوانح میں یادگار رہے۔ نواب بہاول پور اور جناح صاحب کی ایک ملاقات میں ذکر آیا کہ کاموں سے تھک کر قوتِ کارکردگی کو بحال کرنے کے لیے ہنگاموں سے دور صاف فضا میں کبھی آرام کرنے کی ضرورت ہوتی ہے اور اس کے لیے ملیر کے علاقے میں قیام کے لیے کسی جگہ کی ضرورت ہے۔ نواب صاحب جوشِ عقیدت میں فوراً بول اُٹھے: وہ ملیر میں بہاول پور ہاؤس ہے نا!

اسے استعمال کیجیے! جواب: لیکن میں کسی کی کوٹھی کو بغیر قیمت یا کرایہ دیے استعمال نہیں کرتا۔ از راہِ عجز و انکسار، سر! وہ آپ ہی کی کوٹھی ہے! دوسرے روز نواب صاحب نے جناح صاحب کی بھیجی ہوئی ایک دستاویز پر دستخط فرمائے جس کے مطابق اب وہ کوٹھی جناح صاحب کی ہوگئی تھی۔

پاکستان کے قیام میں آتے ہی ایک بہت بڑا مسئلہ ہوگیا تھا۔ مسئلہ یہ تھا کہ ملک کا دارالحکومت کہاں بنایا جائے۔ یہ ۳/جون کے اعلان کے فوراً بعد کرنا تھا کہ دہلی سے نکلنے کے بعد پاکستان کا مرکز کہاں جائے گا۔ یہ فیصلہ تو مسلم لیگ کونسل کو کرنا تھا لیکن ۹/۸/جون ۱۹۴۷ء کے دہلی اجلاس کے بعد ۱۵/دسمبر ۱۹۴۷ء کے کراچی اجلاس کے سوا کونسل کا اجلاس ہوا ہی نہیں۔ کونسل کے بعد لیگ کی ورکنگ کمیٹی ایک ادارہ تھا جس میں مسلم لیگ کے کاموں کے اجرا کے لیے مشورہ کرلیا جاتا تھا۔ عام طور پر جماعتی اور قومی و ملی کاموں کے فیصلے صدر جناح صاحب اور سیکرٹری اپنی صواب دید پر انجام دیتے رہتے تھے، لیکن پاکستان کے دارالحکومت کے متعلق فیصلہ کرنا ورکنگ کمیٹی کا نہیں، کونسل کا کام تھا لیکن اسے صرف یہ بتایا گیا کہ مصالح کا تقاضا ہے کہ کراچی (صوبہ سندھ) کو دارالحکومت بنایا جائے۔ اس فیصلے کے نافذ کرنے کا اختیار اسے حاصل نہیں تھا۔ اس امر کا انحصار اس صوبے کی رضامندی پر تھا۔ کسی وفاقی ادارے، مرکزی حکومت یا اس کی اسمبلی کو یہ اختیار نہ تھا کہ وہ اس فیصلے کو متاثرہ صوبے کی مرضی کے خلاف اس پر نافذ کردے۔ جناح صاحب نے اس مسئلے کو وہ اہمیت نہیں دی جس کا وہ متقاضی تھا۔ سندھ حکومت سے اجازت لینے اور اس کی رضامندی حاصل کرنے کا نہ طریقہ استعمال کیا گیا اور نہ ضابطے کے مطابق کارروائی عمل میں لائی گئی۔ مرکزی حکومت نے ایک حکم نامہ جاری کردیا اور سندھ حکومت کو اطلاع دی گئی کہ مرکزی حکومت کی ضروریات کے لیے فلاں فلاں عمارتیں خالی کردی جائیں اور اندرون اور بیرون شہر قطعات زمین ضروری تعمیرات کے لیے مخصوص کردیے جائیں۔ صحیح طریقۂ کار یہ تھا کہ سندھ حکومت کے سامنے مسئلہ رکھا جاتا اسے مشورے میں شامل اور اعتماد میں لیا جاتا اور پھر اسی کے مطابق آرڈی نینس تیار کیا جاتا۔ اگر اس مسئلے کو سلیقے سے حل کرنے کی کوشش کی

جاتی تو یقین تھا کہ مسئلہ اتنا نہ اُلجھتا۔

معلوم نہیں سندھ حکومت نے اپنی کابینہ اور اسمبلی میں سندھ کے منتخب نمایندگان کی طرف سے کیا جواب دیا کہ خان بہادر محمد ایوب کھوڑو اور ان کے ساتھ ان کی کابینہ کو برطرف کر دیا گیا۔ ٹھیک انھیں دنوں میں سندھ مسلم لیگ نے اپنے نمایندہ اجلاس میں گورنر جنرل ہاؤس کے آرڈی نینس کو رد کر دیا۔ اسمبلی، حکومت اور سندھ لیگ کے فیصلوں کے بعد خیال تھا کہ آرڈی نینس واپس لے لیا جائے گا اور سیاسی بصیرت اور تدبر کی روشنی میں مل بیٹھ کر مسئلے کا حل تلاش کر لیا جائے گا۔ اب وہ لوگ بھی جو کسی ترنگ میں جناح صاحب کے فیصلے کی تائید کر چکے تھے انھوں نے بھی ان کی طرف سے رُخ پھیر لیا تھا۔ یہ معاملہ اس درجے آگے بڑھ چکا تھا کہ پاکستان کے دارالحکومت کے لیے کوئی جگہ تلاش نہیں کی جا سکتی تھی۔ سندھ بھی اپنے موقف پر ڈٹ جاتا تو پاکستان اپنے وجود کو باقی نہ رکھ سکتا تھا۔ سندھ اپنے سر پہ الزام لینے کے لیے تیار نہ تھا۔ گورنر جنرل ہاؤس کے آرڈی نینس کو تسلیم کر لیا گیا:

اظہارِ عشق یار میں گو ذلتیں ہوئیں
لیکن اسے بتا تو دیا، جان تو گیا!

سندھ کے اس فیصلے سے رجوع میں بھی جیت تھی، شکست نہیں!

اس فیصلے کے سلسلے میں ایک معاہدہ طے پایا تھا۔ اس کی ایک شق کے تحت استعمال میں آنے والی عمارتوں وغیرہ کا کرایہ بھی طے پایا تھا۔

پاکستان میں ۶۷ برس میں جمہوری اور غیر جمہوری کتنی ہی حکومتیں آئیں اور اپنی نحوست و غلاظت کے آثار چھوڑ کر فنا ہو گئیں۔ پچاس سال ہوئے کہ مرکزی حکومت کا مستقر بھی تبدیل ہو گیا، لیکن کسی مرکزی حکومت نے اس طرف توجہ نہیں کی۔ شاید سندھ کی کسی حکومت نے بھی اپنے حقوق کو تسلیم کرانے اور وصول کرنے کی کوشش نہیں کی۔

سنا ہے حال ہی میں سندھ اسمبلی کے کسی فاضل ممبر کو یہ تاریخی واقعہ معلوم ہوا تو انھیں سخت تعجب ہوا اور انھوں نے اسمبلی میں اس مسئلے کو اُٹھانے کا عزم کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ۶۷ برس کے کرایے پر سود در سود کی اتنی بڑی رقم مل جائے گی کہ سندھ کی جگہ پر ایک عظیم

الشان نیا سندھ آباد کیا جا سکے گا۔

سندھ کے حوالے سے ایک یہ بات بھی حیرت انگیز ہے کہ پاکستان کی پہلی مرکزی کابینہ کی تشکیل میں سندھ کو قطعاً نظر انداز کر دیا گیا۔ حال آں کہ سندھ مسلم لیگ کو آل انڈیا مسلم لیگ پر یہ فضیلت حاصل ہے کہ اس نے اکتوبر ۱۹۳۸ء کی ایک کانفرنس میں تقسیم ملک کی قرارداد پاس کی تھیں اور کانفرنس کی صدارت جناح صاحب نے فرمائی تھی اور اس کانفرنس کی یادگار بات یہ ہے کہ صدر ہی نے اس قرارداد کی تائید نہیں کی تھی۔ بعد میں جب ۱۹۴۰ء میں مسلم لیگ کی فارن کمیٹی کے تحت ایک پاکستان اسکیم تیار ہوئی۔ اس کمیٹی کے صدر وہی سیٹھ عبداللہ ہارون تھے جو مذکورہ بالا کانفرنس کے بانی مبانی تھے اور اس کی استقبالیہ کمیٹی کے صدر بھی تھے لیکن یہ عجیب بات ظہور میں آئی کہ جس طرح ۱۹۳۸ء کی کانفرنس کی قرارداد پاکستان کی جناح صاحب نے تائید نہیں کی۔ ۱۹۴۰ء میں انھوں نے اپنی قایم کردہ کمیٹی اگرچہ سیٹھ حاجی عبداللہ ہارون کی صدارت میں بنائی۔ پاکستان اسکیم کو ردی کی ٹوکری میں پھینک ہی نہیں دیا بلکہ یہ بھی ظاہر کر دیا گیا کہ مسلم لیگ نے ایسی کوئی اسکیم تیار نہیں کی ہے۔

تاریخ سندھ کا ایک اہم اور یادگار واقعہ یہ ہے کہ ۱۹۳۷ء کے بعد اللہ بخش سومرو کے دورِ حکومت میں رہن شدہ جاگیروں اور زمینداریوں کی واگزاشت کے بارے میں ایک قانون بنایا گیا تھا کہ اگر کسی جاگیر پر مدتِ رہن پر ۱۵، ۲۰ برس یا کم و بیش مقررہ مدت گزر چکی ہو تو وہ جاگیر اس کے مالک یا اس کے ورثا کو لوٹا دی جائے۔ یہ قانون اسمبلی نے پاس کر دیا تھا، لیکن گورنر سے منظوری کا قدم اُٹھایا نہیں گیا تھا کہ ۱۹۴۳ء میں اللہ بخش سومرو کو شہید کر دیا گیا۔ بعد کی حکومتوں نے اپنے مسایل کے ہجوم اور وقت کے ہنگاموں میں گھر کر اس طرف توجہ نہ فرمائی یا کسی طبقے کے موثر ہونے کی وجہ سے یا اس کی خوشنودی اور حمایت حاصل کرنے کی غرض سے فایل دبا دیا گیا ہو۔ اب اس پر نظر پڑی اور کسی مصلحت سے صوبے کے گورنر کے بجائے گورنر جنرل پاکستان کو منظوری کے لیے بھیج دی گئی۔ گورنر جنرل محمد علی جناح نے منظوری نہیں دی، بلکہ اس پر یہ بھی لکھ دیا کہ یہ تمام زمینیں مہاجرین میں تقسیم کر دی جائیں۔ انھوں نے یہ نہیں سوچا کہ یہ ایک صوبائی اسمبلی کا ایک خاص قانون کسی خاص جماعت یا طبقے

کے حق میں موثر ہو سکتا ہے اور اس کے نافذ کرنے والی پارٹی سندھ کی حکومت ہے۔ اس میں موثر جماعت یا طبقے کی جگہ کوئی دوسرا نہیں لے سکتا۔ اس لیے قانون کی منظوری یا نامنظوری پر اس کے اختیار کا دایرہ ختم ہو جانا چاہیے، لیکن میں اس بحث میں پڑنا نہیں چاہتا۔ میرے پیش نظر صرف اس امر کی تحقیق ہے کیا یہ جھوٹ ہے۔ کیا یہ افواہ ہے؟ اگر یہ جھوٹ اور افواہ ہے تو اس کو یہیں پر دفن ہو جانا چاہیے۔ اگر اس میں کوئی سچائی ہے تو یہ سندھ کے مدبرین کا بہت اہم اور قابل ستایش کارنامہ تھا، لیکن اس کی آخری منظوری کے ساتھ اضافی جملہ نہایت زہرناک ہے۔ سندھ کے پچاسوں خاندانوں پر ظلم، ان کے ساتھ ناانصافی ودشمنی ہے۔ اگر حقیقت یہی تھی تو سندھ میں مقامی اور غیر مقامی کی کشمکش کی فصل کا پہلا بیج جناح صاحب کی سیاسی بصیرت کی نفی کی سب سے بڑی شہادت ہے۔ اس کے بعد وقت کی حکومت کا سب سے بڑا فرض ہوگا کہ وہ جناح صاحب کی رائے سے متاثر ہونے والے خاندانوں کے ساتھ ظلم اور ناانصافی کا تدارک کریں اور ہم اپنے فرض کو بجالائیں اور ماضی کے ان مدبرین، اہل بصیرت اور قوم پروروں کو ان کے کارنامے پر خراج عقیدت پیش کریں۔

اتنا کچھ لکھنے کے بعد خیال آتا ہے کہ ہم نے کبھی یہ بھی سوچا کہ جناح صاحب کی بنیادی شخصیت کیا تھی؟ وہ ادب، تاریخ، فلسفہ، تعلیم، معاشیات، اقتصادیات، سماجیات وغیرہ میں کوئی حیثیت اور مقام نہ رکھتے تھے۔ انھوں نے کبھی اس کا دعویٰ بھی نہیں کیا۔ وہ عوامی مقرر بھی نہیں تھے۔ اس حوالے سے انھیں ایک ڈبیٹر کہا گیا ہے اور یہی بات ان پر سجتی بھی ہے۔ انھیں کسی قانون داں نے صف اوّل کا وکیل بھی نہیں لکھا۔ وہ قانون دانی میں اپنی کوئی نظیر نہ رکھتے تھے۔ وکالت میں نکتہ رس سے زیادہ نکتہ چین تھے۔ نام رکھنے میں ماہر تھے۔ گاندھی، نہرو، آزاد، محمد علی، ذاکر حسین اور کتنے ہی لوگوں کے نام رکھ چھوڑے تھے۔ علامہ اقبال کو بھی مذہب، فلسفہ، سیاست کے بجائے شاعری میں بند کر دیا تھا۔ ایک موقعے پر انھوں نے کہا تھا یہ نہ بھولو کہ اقبال شاعر ہیں۔ حال آں کہ انھیں بھی یہ نہ بھولنا چاہیے کہ شاعری، ادب، فلسفہ، مذہب، السنہ، تہذیب، تمدن، فنون لطیفہ اور دیگر پچاس علوم وفنون و مسایل میں بھی رائے دینے کے اہل نہ تھے۔ حتیٰ کہ وہ فن حکمرانی سے بھی ناواقف اور ایک

ناکام گورنر جنرل تھے۔

اب رہ جاتی ہے سیاست تو معلوم ہے کہ وہ دادابھائی نوروجی کے مقلد تھے۔ چندنامور مدبرین کے وہ معتقد تھے، کانگریس میں ان کی کوئی خدمات ان کی کسی رائے کی پذیرائی، نظر نہیں آتی۔ ان کا نام گاندھی، موتی لال نہرو، سی آرداس کے بعد آتا ہے۔ ملک میں طبقاتی، نظریاتی، صوبائی، ملکی سطح پر حریت پسند جماعتیں تھیں۔ جناح صاحب ان کے منکر نہ تھے۔ ان کا سب سے بڑا کارنامہ لکھنو پیکٹ تھا، لیکن ملک کی سیاسیات میں وہ موثر نہ تھا اور پنجاب و بنگال سے اس کا گہرا تعلق تھا۔ انھیں نے اسے رد کر دیا تھا۔ اگر کانگریس اور لیگ کے یہ اجلاس لکھنو میں ہونے کے بجائے بہار کے مشرق اور یو۔پی کے شمال مغرب میں ہوتے تو یہ پیکٹ کبھی وجود میں نہ آ سکتا تھا۔ ۱۹۳۵ء کے بعد جناح صاحب کی سیاست رفتہ رفتہ کانگریس کی نفی کے اصول پر آ گئی تھی۔ ان کی اپنی کوئی سیاسی فکر اور ہمت بلند نہ تھی کہ کوئی تحریک پیدا کریں اور عوام کو اپنی طرف متوجہ کریں۔ اس میں ایک بڑی رکاوٹ ان کی انا، ان کا غرور، عوام بیزاری اور مذہب سے نفرت اور بدعقیدگی تھی۔ ۱۹۳۰ء کے بعد کانگریس کی سول نافرمانی کی تحریک، عوام کے مسایل، شراب، جاگیر، زمینداری کے خلاف تحریک نے عوام کو جس درجے اس کے قریب اور جاگیرداروں، زمینداروں کو جتنا خوف زدہ کر دیا تھا۔ اس نے پنجاب سے بنگال اور بندھیاچل سے راس کماری تک بلاتعرض و بلاتفریق مذہب و ملت مسلم لیگ، مہاسبھا جیسی جماعتوں اور نواب چھتاری جیسی ہندو مسلم زمینداروں اور جاگیرداروں کی مشترک پارٹیوں کے قیام اور منظم کرنے اور کانگریس کے منشور کو ناکام بنانے کی جو ضرورت پیدا کر دی تھی۔ اس میں لیگ کی قیادت کے لیے ایک شخصیت کی ضرورت تھی اور جناح صاحب کو کانگریس کے باہر اپنے شوق سیاست کو پورا کرنے کے لیے ایک لیگ کی ضرورت تھی۔ جناح صاحب جاگیرداروں اور زمینداروں سے زمین چھین لینے اور عوام میں تقسیم کر دینے کے کانگریسی فلسفے کے مخالف نہ تھے جیسا کہ انھوں نے بہاول پور اور قلات کی ریاستوں سے سیدھی اور ٹیڑھی اُنگلیوں سے یعنی ہر دو طرح سے اقتدار کا گھی نکالا تھا۔ البتہ لیگ چونکہ زمیندار اور جاگیرداروں کی جماعت تھی اور جناح صاحب کو انھیں

نے قاید اعظم بنایا اور مستقبل میں ان کی طرف سے مزید عزت افزائی اور مناصب پروری کی توقع تھی۔ اس لیے انھوں نے نہ چھیڑا تھا، لیکن وہ ان کے اغراض اور مفاد پرستی سے بخوبی واقف تھے اور اگر وہ کہتے تھے کہ میری جیب میں سب کھوٹے سکے ہیں تو ان کا اشارہ اسی طرف ہوتا اور جب وہ جناح صاحب کے طعن کو برداشت کرتے تھے تو اس لیے کہ ان کے مفاد کے حصول و تحفظ اور وقت کا تقاضا یہی تھا۔

یہ جناح صاحب کی محض خوش فہمی تھی کہ وہ لیگ کی سیاسی رہنما اور وقت کے مدبر ہیں۔ حقیقت یہ تھی کہ مفاد پرست زمیندار و جاگیردار اور خطاب یافتہ اور انگریز کے پٹھو انھیں اپنی ضرورتوں کے لیے استعمال کرتے تھے!

۱۹۴۷ء میں جناح صاحب نے گورنر جنرل، اسمبلی کے صدر اور آرمی کے سپریم کمانڈر کے مناصب حاصل کر کے اور کھوٹے سکوں نے اپنے مقاصد سے ہم کنار ہو کر ایک دوسرے سے رُخ پھیر لیے۔ اگر یہ سب کچھ وطن اور قوم کی آزادی کے لیے تھا حریت پسندی اور قوم پروری کے نظریے اور جذبے کے تحت تھا تو یہ تدبر اور سیاسی بصیرت تھی اور اگر ہر دو فریق نے اپنی ذاتی یا طبقاتی تحفظات کے لیے کیا ہو تو اس کے لیے چالاکی اور چال بازی سے اچھے اور بامعانی الفاظ لغات میں نہیں مل سکتے۔

کتنے ہی حیرت و استعجاب کے مقام سے گزر چکا ہوں۔ اب بھی منتظر ہوں کہ کوئی صاحب نظر اور مورخ آئے اور علم و حقایق کی منزل تک پہنچا کر حیرت و استعجاب کے سحر سے جان چھڑائے۔ میں یقین رکھتا ہوں کہ ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ جو واقعہ مورخ و مصنف کے قلم سے جس زبان اور طرزِ بیان میں ہمارے سامنے آتا ہے وہ حقیقت میں بالکل ویسا ہی نہیں ہوتا جیسا کہ ہم دیکھنا چاہتے ہیں، لیکن کسی نہ کسی درجے میں کوئی سچائی اس میں ضرور چھپی ہوتی ہے۔ ہم اسی چھپی ہوئی سچائی کے متلاشی ہیں۔ جناح صاحب براعظم ہند پاکستان بہ شمول بنگلہ دیش، کشمیر اور بھوٹان نیپال کی ایک بہت بڑی شخصیت تھے اور پاکستان کے بانی کی حیثیت سے تاریخ میں ان کا نام جلی حرفوں میں لکھا جائے گا، لیکن یہ تاریخ نامکمل رہے گی۔ اگر اُس سے یہ معلوم نہ ہو کہ جس پاکستان کا انھوں نے مقدمہ لڑا تھا اس کی انھوں نے

قیمت کیا وصول کی۔ پاکستان ضرور بن گیا، لیکن یہ ان کی طرزِ سیاست اور عدم بصیرت کی دلیل تھی کہ یہ وہ پاکستان نہیں ہے جس کے لیے ہندستان کے مسلمانوں نے جان و مال کی قربانیاں دی تھیں اور اپنی عزت، آبرو اور ذلت و رُسوائی کی بھی پروا نہیں کی تھی اور جن برادرانِ وطن کے ساتھ صدیاں گزاری تھیں اور لڑتے ہوئے بھی نہ ان کی اکثریت سے ڈرے تھے، نہ بزدلی پیدا ہوئی تھی، نہ فرار کا خیال پیدا ہوا تھا۔ نہ اسلام خطرے میں تھا۔ نہ مسلمان خوف زدہ ہوئے تھے۔ طرز سیاست وہ اختیار کیا کہ برادرانِ وطن سے نہ صرف دوری اور بے تعلقی پیدا ہوئی ان کی ایک بڑی تعداد مسلمانوں کے خلاف منظم و مسلح ہوگئی۔

پھر مسلم لیگ نے پاکستان کی تعمیر و ترقی، عوام کی فلاح و بہبود اور صوبوں کے پاس اتحاد و محبت کے قیام و فروغ کے لیے کیا کیا۔ پاکستان کا مطالبہ کیا، لیکن مستقبل میں پیش آنے والے واقعات اور خطرات کے بارے میں ایک لمحے کے لیے بھی نہ سوچا تھا اور نہ پاکستان کے مالہ و ماعلیہ کے بارے میں کوئی اسٹڈی کی تھی!

ان کے وجود سے پاکستان میں تہذیب، تمدن، اخلاق، انسانیت، رواداری اور آپس کے اتحاد اور محبت کی روایت میں کیا شان پیدا ہوئی۔ جو چیز خود ان میں نہ تھی، وہ قوم کو کیوں کر میسر آسکتی تھی۔ انسانی معاشرت اور تہذیب کی ان کی زندگی طرز اور ذوق و خصایل کی رُسوائی ہوئی۔ ان کے طرز سیاست نے برِاعظم ہند پاکستان کی سب سے بڑی اقلیت کو نقصان پہنچایا۔ انھیں ایک ناقابل تصور تباہی سے گزرنا پڑا اور پاکستان کے قیام میں آجانے کے بعد وہ ایک مستحکم نظام کے قایم کرنے میں ناکام رہے۔ آج سندھ، بلوچستان، سرحد، پنجاب جن مسایل سے دوچار ہیں ان کا بڑا حصہ جناح صاحب کا پیدا کردہ ہے۔ اگر یہ سب افواہیں اور جھوٹا پروپیگنڈا ہے تو اسے ثابت کیا جائے اور اس کے بعد ہمیں توبہ کرنی چاہیے اور جناح صاحب کی اور ان کی خدمات کے اعتراف سے ہرگز انکار نہیں کرنا چاہیے۔

یوپی کے جنوبی اضلاع میں جو حالات بگڑے تھے، وہ مشرقی پنجاب، دہلی، گڑھ مکھ ٹیسر یا کلکتہ، نواکھالی اور بہار کے بگڑے ہوئے حالات کا ردعمل نہ تھا۔ قصہ یہ تھا کہ لیگ کے

رہنماؤں نے مرکزی حکومت کے ملازمین کے لیے پاکستان چلنے کی جو تحریک شروع کی تھی، وہ پنجاب و بنگال کے ملازمین کے لیے ناگزیر ہو سکتی تھی اور مرکز کے تحت آنے والے شعبوں کے لیے آبائی شہریت کی بنیاد پر ملازمین کو تبدیلی کا اختیار ہونا چاہیے تھا لیکن لیگ کے رہنماؤں نے اسے نہ صرف لازمی قرار دیا تھا بلکہ اس کے لیے انھوں نے ملازمین کو دھمکیاں دی تھیں اور جبر کیا تھا کہ وہ لازماً ترکِ وطن کریں۔ انھیں مجبوراً ایسا ہی کرنا پڑا۔

اب جب کہ انھیں ملازمت کی مجبوری سے وطن چھوڑنا ہی تھا اور ایسی جگہ جا رہے تھے، جس سے وہ نہ تو واقف تھے اور نہ ان کو ایسی سوسایٹی میسر آنے والی تھی، جس سے وہ مانوس ہوتے۔ اس لیے ان کے ساتھ صرف بیوی بچے تھے، انھوں نے اپنے ساتھ عزیزوں اور دوستوں کو بھی پاکستان چلنے کی ترغیب دی تھی۔ ان کے ساتھ ان کے گھریلو خدمت گزار بھی تھے۔

پاکستان آنے والوں میں بہ کثرت ایسے لوگ بھی تھے، جنھوں نے لیگ کی خدمت گزاری میں برادرانِ وطن کے ذہنوں میں نفرت اور دشمنی کی، پچھلے کئی سال میں جو فصل بوئی تھی، اب موسم آ گیا تھا کہ اسے کاٹا جائے لیکن اب تک ان کی راہ میں اتنی مشکلات پیدا ہو گئی تھیں اور حالات نے انھیں اتنا بزدل بنا دیا اور خوف زدہ کر دیا تھا کہ اپنی بوئی ہوئی فصل کو کاٹنے کی ہمت تھی اور نہ حالات سے مقابلے کی! ان کے لیے اپنے وطن میں اطمینان و سکون کا کوئی گوشہ نہ تھا، سوائے اس کے کہ پاکستان فرار ہو جائیں!

نوجوانوں کی اچھی خاصی تعداد ایسی بھی تھی جو جشنِ آزادی منانے ۱۴ راگست سے پہلے کراچی پہنچ گئے تھے اور واپس ہو جانے کے لیے دیر ہو گئی۔ ان تمام قسم کے لوگوں کے جمع ہو جانے سے بھی کراچی کی زندگی پر بہت برا اثر پڑا۔

کراچی پاکستان کا دارالحکومت قرار پایا تھا، لیکن دارالحکومت کے کاروبار کے لیے عمارتیں میسر نہ تھیں۔ ملک کے مختلف علاقوں سے آنے والے ملازمین کو اپنے بیوی بچوں کو بٹھانے کے لیے سایہ میسر نہ تھا۔ مسلم لیگ کے ہزاروں کارکنوں اور تماش بینوں کو رات بسر کرنے کو جگہ میسر نہ تھی۔ سندھ، پنجاب و سرحد کی طرح حالات کا شکار نہ ہوا تھا۔ سندھ کے ہندوؤں اور مسلمانوں کے تعلقات اور ان کے روز و شب کی زندگی میں کوئی رخنہ نہ پڑا تھا۔

توقع تھی کہ سندھ کی صوبائی اور پاکستان کی حکومت کا مرکز ہونے کی وجہ سے یہاں کی فضا فرقہ وارانہ فساد سے مسموم نہ ہوگی۔ ایک حلقے میں جناح صاحب کی جنم بھومی اور ان کی موجودگی کا احترام بھی تھا لیکن تھوڑے سے عرصے میں ہزاروں خاندانوں کے لاکھوں افراد کا جو مجموعہ کراچی کے گلی کوچوں میں فٹ پاتھوں پر بلکتے بچوں اور نیم برہنہ میلے کچیلے کپڑوں میں عورتوں کے ساتھ پڑے ہوئے تھے۔ ان کی معاشی، معاشرتی، رہن سہن اور شرم و احترام کی بھی کچھ ضرورتیں تھیں، جن کی طرف نہ جناح صاحب کی توجہ تھی اور نہ لیاقت علی خان کو اس کا خیال آیا تھا۔

صوبائی حکومت کو نہ تو گورنر جنرل نے اعتماد میں لیا تھا، نہ وزیر اعظم نے اس کے ساتھ شفقت اور مہربانی کا برتاؤ کیا تھا۔ سندھ کی ان ٹیلی جنشیا (Intelligentsia) حیرت زدہ تھی کہ گورنر جنرل پاکستان سندھ میں کھوڑو حکومت سے، پنجاب میں افتخار ممدوٹ حکومت سے، سرحد میں ڈاکٹر خان کی حکومت توڑ کر، بلوچستان کو آزاد صوبائی حکومت کے قیام کے بجائے گورنری نظام کے حوالے کر کے، ریاست بہاول پور کو ڈرا کر، قلات ریاست کو فوجی ایکشن کر کے بلوچستان کی لسبیلا، خاران، مکران اور سرحد میں دیر، چترال اور سوات کی ریاستوں پر قبضہ کر کے وہ پاکستان کی تعمیر کر رہے ہیں یا کھوڑو اور سندھ کے قوم پروروں سے، پنجاب کے یونینسٹوں سے یا سرحد کے خدائی خدمت گاروں سے یا بلوچستان کے حریت پرستوں اور خاں عبدالصمد خاں اچکزئی، نام ور نیشنلسٹ سے انگریزی دشمنی کا، سہروردی سے کسی خطرے کی بنا پر، نواب قلات احمد یار خان سے تعلقات نبھانے میں کسی غلطی یا عقیدت و اظہار نیاز مندی میں کسی غفلت کی وجہ سے، ان تمام حضرات سے انتقام لیا جا رہا ہے؟

اس سے بھی زیادہ ہوش ربا واقعہ یہ ہے کہ ۴ اگست کو یعنی آزادی سے صرف دس روز قبل ریاست قلات کے مستقبل کا فیصلہ کرنے کے لیے ایک اجلاس دہلی میں منعقد ہوا جس میں لارڈ ماؤنٹ بیٹن، مسٹر محمد علی جناح، مسٹر لیاقت علی خاں، چیف منسٹر قلات اور سر سلطان احمد قانونی مشیر ریاست قلات نے شرکت کی اور حسب ذیل امور پر اتفاق رائے ہوا۔

الف : ۱۵/اگست ۱۹۴۷ء کو ریاست قلات کی وہ خودمختار حیثیت بحال ہو جائے گی، جو ۱۸۳۸ء میں حاصل تھی!

ب: قلات اور پاکستان کی آئندہ حکومت کے اگر کسی سبب سے تعلقات استوار نہ ہوسکیں تو ریاست قلات افغانستان میں شمولیت اختیار کرسکتی ہے۔ ۱۸۳۹ء اور ۱۸۴۱ء کے معاہدات کے تحت ''حکومت برطانیہ'' قلات کی جغرافیائی حیثیت کی بنیاد پر اس صورت میں احتیاطی تدابیر اختیار کرنے پر مجبور ہوسکتی ہے۔ (۱)

ممتاز مورخ جناب محمد فاروق قریشی مذکورہ معاہدۂ قلات پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''یہ تھا مسلم لیگ کا رویہ، انتقال اقتدار سے صرف دس یوم قبل وہ پاکستان کی جغرافیائی حدود کے بے دریغ قربان کرنے میں لگی ہوئی تھی اور اس کے رقبے کو بے رحمی سے لٹایا جا رہا تھا۔ پنجاب اور بنگال کو تقسیم کرنے کی پیش کش ہوتی ہے۔ پورے بنگال کو پاکستان سے خارج کر دینے میں خوشی محسوس کی جاتی ہے۔ صرف سندھ کے صحراؤں پر اِکتفا کیا جاتا ہے اور ریاست قلات سے بھی دشت کشی کرنے میں کوئی امر مانع نہیں ہے۔ مسلم لیگ کے اس غیر مستقل رویے اور گومگو کی روش، خودغرضی اور لالچ کے باعث مسلمانوں کو زبردست خسارے کا سودا کرنا پڑا۔'' (۲)

قلات کا مسئلہ کوئی پیچیدہ، اختلافی اور لاینحل مسئلہ نہ تھا۔ آزادی کا حلف اُٹھانے سے دس روز پہلے کا واقعہ ہے۔ یعنی ۴/اگست ۱۹۴۷ء دہلی میں ریاست قلات کے چیف منسٹر اور سر سلطان احمد ریاست کے مشیر اور پاکستان کے گورنر جنرل مسٹر محمد علی جناح اور وزیر اعظم

---

(۱) مختصر تاریخ قوم بلوچ اور بلوچ خوانین، خان آف قلات، ص ۹۳

(۲) مولانا ابوالکلام آزاد اور قوم پرست مسلمانوں کی سیاست، محمد فاروق قریشی، ۱۹۹۱ء، ص ۵۹۹-۶۰۰

نواب زادہ لیاقت علی خان کے مابین وائسرائے ہند لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے زیر صدارت ایک کانفرنس ہوئی جس میں بالاتفاق فیصلہ ہوا۔ جس میں کوئی اختلاف، شکایت، شک وشبہ پیدا نہ ہوا۔ عہدنامے پر فریقین کے دستخط اور وائسرائے ہند کی شہادت رقم ہوگئی تھی۔ نواب احمد یار خاں اور دیگر معززین ریاست و بلوچستان مطمئن اور خوش ہو گئے تھے لیکن ابھی دو ہفتے بھی نہ گزرے تھے کہ گورنر جنرل پاکستان نے حکم صادر کر دیا کہ ریاست قلات کو پاکستان میں مدغم کر دیا جائے۔ یہ عہدنامے کی کھلی خلاف ورزی تھی۔ جھگڑا پیدا ہو گیا۔ رو بہ رو گفتگو سے انکار کر دیا گیا، مراسلت کا کوئی نتیجہ نہ نکلا، کسی شریف و مخلص اور مدبر مصلح کا وسیلہ وسعی کام نہ آئی۔ آرڈر کے مطابق عمل کرنے کی تاکید وتنبیہ کی گئی اور پھر فوج کو قلات پر قبضہ کرنے کا حکم دیا گیا۔ ریاست پر قبضہ اور نواب کو فوج نے اپنی حفاظت میں لے لیا اور پھر جیل بھیج دیا گیا۔ جناح صاحب کا شوق پورا ہو گیا۔ گورنر جنرل نے ثابت کر دیا کہ ان کے اختیارات کا دائرہ بہت وسیع ہے۔

قلات کا مسئلہ اگر ایک چھوٹی سی ریاست ہی کا مسئلہ ہوتا تب بھی وہ معمولی نہیں ہوسکتا تھا۔ قلات کی ایک تاریخ تھی۔ قلات ایک تہذیب اور روایت کا نام تھا۔ اس کے بغیر بلوچستان کا حسن مکمل نہ ہوتا تھا۔ قلات بلوچستان کے مطلع پر طلوع ہونے والا سورج اور چاند کی مماثل تھی۔ جناح صاحب کے حکم سے قلات کے حسن کو فوج نے پامال کیا تھا۔ قلات بلوچستان کی عزت تھی، جسے اس کے صحن میں لوٹ لیا گیا تھا۔ یہ نقش بلوچستان کی لوح قلب پر آج تک مٹ نہیں سکا۔ اس لیے کہ اس کے سینے کو کسی دشمن نے نہیں، دوست نے زخمی کیا تھا۔ قلات پاکستان کی عزت بھی تھا، اس کا حسن اور آبرو بھی تھا! افسوس کہ اس حقیقت کو نظر انداز کر دیا گیا تھا۔ اس کے ذمے دار لیگ کے صف اوّل کے دو دیدہ ور۔ مسٹر محمد علی جناح اور نواب زادہ لیاقت علی خاں تھے۔ نواب احمد یار خان نے جناح صاحب سے محبت کی تھی اور انھیں سونے اور چاندی میں تولا تھا۔ جناح نے انھیں جیل میں ڈالا اور ان کی ریاست کو ملیامیٹ کر دیا۔ شاید یہ نسل وخون کا فرق ہو، لیکن سوچنا چاہیے کہ جناح صاحب نے اور کس کے ساتھ دوستی نبھائی تھی؟

جمعیت علمائے ہند کے بزرگوں، کانگریس کے مسلمان رہنماؤں اور نیشنلسٹ مسلمانوں کے ساتھ مسلم لیگ کے رہنماؤں اور ان کے کارکنوں نے جو توہین آمیز برتاؤ کیے تھے، اس کی داستانیں بڑی دردناک اور عبرت انگیز ہیں۔ لیگ کے تمام رہنما جانتے تھے کہ وہ جو نعرے لگا رہے ہیں، لیگ کی سیاست میں ان کے لیے کوئی جگہ نہیں، لیکن جب تک مسلم اقلیت کے صوبوں کے مسلمان تحریک پاکستان میں اپنی جانیں نہیں لڑائیں گے وہ اپنے مقاصد میں ہرگز کامیاب نہیں ہو سکتے۔ انھوں نے بے دھڑک ہو کر مسلمانوں کو اپنے مقاصد کی بھٹی کا ایندھن بنا دیا۔ جمعیت علمائے ہند کے بزرگوں اور دیگر قوم پرور محبّین ملت اور مخلص رہنماؤں کی بات نہیں سنی اور اس وقت تک ان کی آنکھیں نہیں کھلیں جب تک ایک دردناک عذاب نے انھیں ہر طرف سے گھیر نہیں لیا۔ ان کی آنکھیں کھلیں تو انھوں نے دیکھا کہ لیگ کے رہنما انھیں بے یار و مددگار چھوڑ کر پاکستان فرار ہو چکے ہیں۔ تقسیم ملک کے اعلان کو ابھی ایک ماہ بھی نہ گزرا تھا۔

ہندستان میں مسلمانوں کو اسی حکومت کا وفادار و فرماں بردار رہنا ہے، جس کو گزشتہ دس برسوں میں کوئی گالی ایسی نہ تھی جو دلوائی نہ گئی ہو اور صدیوں سے ایک ساتھ رہنے والی قوم کے خلاف نفرت اور دشمنی کے بیج نہ بوئے گئے ہوں اور اب تک تناور نہ ہو گئے ہوں۔ پاکستان پہنچنے والوں کو سر چھپانے کی جگہ اور مقامی لوگوں کو آزادی حاصل نہیں۔ ان کے صوبے خود مختار نہیں، وہ خود آزادانہ اپنے مفاد میں کوئی فیصلہ نہیں کر سکتے، ان کی ریاستوں پر جبراً قبضہ کیا جا چکا ہے اور اس کا مشرقی بازو بھی اس کا آزاد اور کھلا بازو نہیں، مقبوضہ علاقہ ہے جلد ہی ملک کے ہر حصہ پر یہ حقیقت منکشف ہو گئی کہ پاکستان میں ہر نظریۂ ریاست، ہر فلسفۂ سیاست اور نظام حکومت کو لایا جا سکتا ہے الا اسلام! جوں جوں لیگی ریاست اور اس کے رہنماؤں کے ذوق و سیاست سے پردے اُٹھے اور عوام میں بالخصوص پڑھی لکھی نئی نسل میں یہ احساس بڑھتا گیا، قوم میں بے چینی اور ملک میں خلفشار پیدا ہو گیا۔

یہ تاریخ کے محض اتفاقاً پیش آ جانے والے واقعات ہی نہ تھے، بہت سے لوگ تھے جنھوں نے اس حقیقت کو پا لیا تھا کہ ملک کی تقسیم کرانے والوں نے ہندستان میں مسلم

مفادات کو سخت نقصان پہنچایا ہے اور قیام پاکستان کے بعد وہ اس کی تلافی میں قطعی ناکام رہے ہیں اور ان کی مزید غلط کاریوں نے اس نقصان کو ہندستان اور پاکستان کے مسلمانوں کی قسمت میں لکھ دیا ہے۔ یہ احساس عام ہو گیا ہے، کچھ لوگ خاموش ہیں، کچھ لوگ اپنے غصے کی صورت میں اظہار کرتے ہیں، کچھ لوگ سنجیدگی کے ساتھ اس مسئلے کا حل بھی ڈھونڈتے ہیں، لیکن سیاست کے بگاڑ اور حالات کی پیچیدگیوں نے مسایل کے حل کو بہت دور اور ناممکن بنا دیا ہے۔

جناح صاحب نے کانگریس کے پلیٹ فارم سے سیاسی زندگی کا آغاز کیا تھا اور لیگ کے پلیٹ فارم پر ان کی سیاسی زندگی کا خاتمہ ہو گیا تھا۔ دوران کی مدت میں کچھ عرصہ مسز اینی بسنٹ کی پارٹی ''انڈین ہوم رول لیگ'' سے بھی وابستہ رہے۔ ان کی پوری سیاسی زندگی تقریباً ترپن سال پر پھیلی ہوئی ہے۔ کانگریس میں اس کے آغاز سے ۱۹۴۷ء تک بڑے بڑے مدبر اور سیاست داں موجود رہے ہیں۔ ان میں سے دادا بھائی نوروجی، گوپال کرشن گوکھلے، فیروز شاہ مہتا، بال گنگا، دھر تلک، سر ڈنشا پٹیٹ (جو ان کے خسر بھی تھے) سریندر ناتھ بینر جی، پنڈت موتی لال نہرو، ان لوگوں کی صحبت سے انھوں نے فیض پایا تھا۔ سیاست سیکھی تھی جس کا انھوں نے خود اعتراف کیا ہے۔ ان کے دوستوں میں سروجنی نائیڈو، سر تیج بہادر سپرو، سچد انند سنہا، وجے راگھو چاریئر، سی پی راما سوامی، دوارکا داس کانجی وغیرہم ان کے معاصر اور دوست تھے اور کئی ایسے لوگ تھے جن کا شمار ان کے خوردوں میں ہوتا ہے۔ مثلاً ایم سی ایم شرما، ایم سی چھا گلا، سین رام کرشن ڈویسا اور کئی لوگ ایسے تھے، جن سے نہ صرف جناح صاحب شفقت اور محبت کا برتاؤ کرتے تھے بلکہ وہ بھی جناح صاحب سے عقیدت رکھتے تھے۔ یہ سب ہندو یا عیسائی و پارسی تھے۔ جو ان کے ہم رتبہ تھے یا ان کی ضرورت تھے۔ جناح صاحب نے سری پرکاش سے جو کہا تھا کہ ان کے دوست سب ہندو ہیں تو یہ حقیقت تھی۔ مسلمانوں میں ان کا کوئی دوست نہیں تھا۔ وجہ صاف ظاہر ہے کہ ان میں نہ کوئی ان کا ہم رتبہ تھا، نہ کوئی ان کا ہم ذوق و شریک نا ؤ نوش تھا۔ کوئی کارکن، کوئی غریب ان کے پاس نہ پھٹک سکتا تھا۔ انھیں مسلمانوں سے یا ان کے مفاد سے کوئی دل چسپی نہ تھی۔

وہ ان کی ضرورت نہ تھے۔ ان سے زیادہ انھیں لیگ کی ضرورت تھی۔ ان کے سامنے مسلمانوں یا عوام کا مفاد کبھی نہیں رہا۔ مسلمانوں میں کوئی نہ ان کا ہم رتبہ تھا، نہ ہم ذوق، کانگریس میں حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر مختار احمد انصاری، مولانا محمد علی، مولانا ابوالکلام آزاد سے کبھی التفات نہ کیا۔ آخرالذکر رہنماؤں کو وہ سخت ناپسند کرتے تھے۔

۱۹۱۶ء تک جناح صاحب نے کانگریس میں اپنی جگہ بنالی تھی لیکن اس کے بعد جوں جوں گاندھی جی کا رسوخ بڑھا جناح کی سیاست کو گھن لگنا شروع ہو گیا۔ وہ گاندھی جی کے مذہبی ذوق کو سخت ناپسند کرتے تھے۔ پھر جب ۱۹۱۹ء کے گاندھی جی نے اور ان کے زیر اثر ترکی خلافت سے کانگریس کی دل چسپی بڑھی تو اس کے سب سے بڑے مخالف جناح صاحب تھے، لیکن عجیب بات ہے کہ آج تک اکثر ذہنوں میں یہ غلط فہمی موجود ہے کہ گاندھی جی یا کانگریس کی دل چسپی ترکی خلافت کے دینی اور فکری پہلو سے تھی۔ اس سے ان کا دُور کا تعلق بھی نہ تھا۔ درحقیقت ایک غلام ملک کے لیے جب کہ اس کے حریت پسند آزادی کی تحریک چلا رہے ہوں، ناگزیر ہوتا ہے کہ وہ دنیا کی اقوام وممالک اور ان کی حکومتوں کی ہم دردیاں حاصل کریں۔ خصوصاً چھوٹے بڑے ایسے ممالک سے جو غلام ہوں اور اپنے ملک میں آزادی کے خواہاں ہوں۔ اپنی گردنوں سے غلامی کا جوا اُتار پھینکنا چاہتے ہوں یا وہ کسی استعمار کے ظلم وستم کا نشانہ بنے ہوئے ہوں اور خطرات میں گھرے ہوئے ہوں، ہندستان اور ترکی کے حالات میں ایک ایسی مماثلت تھی کہ دونوں ممالک کے حریت پسند ایک دوسرے سے دور نہیں تھے۔ دونوں ممالک ایک ہی استعمار کے شکوہ سنج تھے۔ ہندستان میں اس نے پنجے گاڑ دیے تھے اور ترکی پر قبضے کے لیے حملہ آور تھے۔ اسے ہر طرف سے گھیر رکھا تھا۔ اس کی غیر مسلم رعایا کو بھڑکا رہا تھا اور غیر مسلم ریاستوں کو ترکی کا باغی بنا رہا تھا۔ ترکی کے مقبوضات پر قبضہ کر رہا تھا۔ ہندستان کے مسلمان ترکی کے حالات سے بے چین تھے، وہ ترکی کی مدد کرنا چاہتے تھے۔ ہندستان میں ان کے خلاف تحریک کو منظم کیا۔ چندوں کا نظام قایم کیا اور مالی طور پر ان کی مدد کر رہے تھے۔ ان کی فوجی امداد اور ان کی قوت بڑھانے کے لیے اپنی جانوں پر کھیل کر خفیہ طور پر ملک سے فرار ہو رہے تھے اور ہندستان کے اندر برٹش

دشمن قوموں کو متحد کرنے کی کوششوں میں مصروف تھے۔

اس وقت ترکوں کی حمایت میں مسلمانوں کی سب سے بڑی خلافت تحریک تھی جو ترکی میں برٹش استعمار کی چیرہ دستیوں کے خلاف ہندستان کے حریت پرستوں کا سب سے بڑا گروہ تھا جو پورے ملک میں پھیلا ہوا تھا۔ٹھیک اسی زمانے میں برٹش استعمار کے خلاف آزادی کی متحدہ قومی تحریک کا سب سے بڑا پلیٹ فارم ''انڈین نیشنل تحریک'' تھی حالات اور وقت کا تقاضا تھا کہ ہندستان کی دونوں قوتوں کو متحد کر دیا جائے۔ اس سلسلے میں پہلا قدم یہ اُٹھایا گیا کہ ''جمعیت خلافت ہند'' کے دستور اساسی میں ایک دفعہ کا اضافہ کیا گیا اور مقاصد کا دایرہ اس طرح ہو گیا:

دستور اساسی جمعیت خلافت ہند

مقاصد:

(ا) جمعیت خلافت ہند کے مقاصد حسب ذیل ہوں گے:

(الف) دُنیاے اسلام میں ایک مرکزی خلافتِ عظمیٰ کی تاسیس

(ب) جزیرۃ العرب کی آزادی اور حجاز و حرمین کی بہبودی اور وہاں حسبِ حال امورِ خیر و اصلاحات کے اجرا کے لیے سعی۔

(ج) ہندستان میں حصول سوراج کے لیے جدوجہد

(د) ہندستان کے اندر مسلمانوں کے مذہبی، تعلیمی، معاشرتی، اقتصادی اور سیاسی اصلاح و تنظیم اور ان کے حقوق کا تحفظ

جمعیتِ خلافتِ ہند یا مرکزی خلافت کمیٹی کے دستور اساسی ۱۹۲۰ء میں دفعہ ج کے اضافے سے انڈین نیشنل کانگریس، جمعیت خلافتِ ہند کی شریک و حلیف بن گئی۔ مسلمانوں کو کانگریس کے مقاصد، آزادی وطن، ملک و قوم کی ترقی، اہل وطن کے مابین اتحاد و اتفاق

ہی سے اختلاف، اس کی مدد اور اس کو مصیبت سے نجات دلانے سے انکار تھا۔ تو وہ حجاز و حرمین کی بہبودی اور وہاں کے حسب حال امور خیر اور اصلاحات کے اجرا میں کیوں کر ممد و معاون ہو سکتے تھے۔ بہ ظاہر تو ان کا شمار مسلمانوں میں ہوتا تھا لیکن وہ ایک ایسے فرقے سے تعلق رکھتے تھے، جو خلافت ہی پر ایمان نہ رکھتا تھا۔ نہ اسلام کے دیگر بنیادی عقاید پر اس کا اعتقاد تھا۔ اس کی تین اہم شخصیات یہ ہیں:

ہز ہائی نس سر آغا خاں، جسٹس امیر علی اور مسٹر محمد علی جناح

اس سلسلے میں سب سے عجیب و غریب رویہ فرنگی محل (لکھنؤ) کے علما کا تھا، جس کے سرخیل مولانا عبدالباری (فرنگی محلی)، تحریک خلافت کے صف اوّل کے رہنماؤں میں شامل تھے۔ بلند پایہ، نیک نفس، ایثار پیشہ، بزرگ شخصیت تھے۔ خلافت پر پختہ ایمان رکھتے تھے، لیکن شریف مکہ کی ترکی خلافت سے بغاوت کو جایز سمجھتے تھے، اس لیے حجاز کے مسئلے میں وہ امیر عبدالعزیز کے سخت مخالف تھے اور اس مسئلے میں وہ اہل حدیث اور اہلِ سنت دیو بند کے علما سے بہت قریبی روابط کے باوجود حریف بن کر سامنے آ کھڑے ہوئے تھے۔

جناح صاحب کا میدان سیاستِ ہندستان تھا۔ انھوں نے بہت کوشش کی کہ کانگریس کو تحریک خلافت کی حمایت سے الگ کر دیا جائے لیکن وہ اپنی کوشش میں کامیاب نہیں ہو سکے۔ اگرچہ خلافت تحریک تشدد کی تحریک نہیں تھی، لیکن ۱۹۲۱ء کے ختم ہوتے ہوتے سیکڑوں ہندو مسلمان رہنماؤں کو پورے ملک سے گرفتار کر کے جیلوں میں بند کر دیا گیا تھا۔ تحریک کا جوش و خروش اور ایثار و قربانی کا جذبہ کم نہ ہوا تھا، لیکن میدان عمل میں جوانوں کو منظم رکھنے اور راہ سے بے راہ ہونے سے بچانے والی قوت موجود نہ تھی۔ ایسے حالات میں پولیس کے تشدد نے تحریک کے نوجوانوں اور کارکنوں کو اور بھی مشتعل کر دیا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا تھا کہ چورا چوری کا اندوہ ناک واقعہ پیش آیا اور تحریک خلافت کو روک دیا گیا۔

تحریک کے بند ہوتے ہی شدھی اور سنگھٹن اور تبلیغ و تنظیم کا ہنگامہ کھڑا ہو گیا۔ اس فتنے پر قابو پاتے ہوئے تاریخ سیاسیاتِ ہند کے دو قیمتی سال ضایع ہو گئے۔ جنوری ۱۹۲۳ء میں

مولانا ابوالکلام آزاد رہا ہوئے اور اس کے آگے پیچھے تقریباً تمام ہندو اور مسلمان رہنما رہا کر دیے گئے۔ یہی وہ زمانہ تھا جب وایسرائے کونسل کے الیکشن کا اعلان ہوا اور کانگریس کو آپریشن اور نون کو آپریشن کے دو حصوں میں تقسیم ہو چکی تھی اور جماعت میں اتحاد و اتفاق کی فضا نہ آئی تھی۔ گزشتہ تین ساڑھے تین برسوں میں مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنی بصیرت اور بلند خیالی سے سیاست میں ایک مقام حاصل کر لیا تھا۔ اسی چیز نے انھیں کانگریس کے اندرونی جھگڑے کو دور کرنے کے لیے کانگریس کے اسپیشل اجلاس دہلی کی صدارت کے لیے دونوں گروہوں نے اتفاق کر لیا تھا۔ مولانا کی بصیرت و تدبیر نے ایک ایسا حل تلاش کر دیا تھا جس پر کانگریس کے دونوں گروہوں نے اتفاق کر لیا۔ دونوں مطمئن ہو گئے اور اختلاف رفع ہو گیا۔ ۱۵؍ستمبر ۱۹۲۳ء کو کانگریس کے اسپیشل اجلاس میں مولانا ابوالکلام نے جو خطبہ پیش کیا تھا ہندستان کی سیاسی تاریخ کا ایک یادگار خطبہ ہے۔

۱۹۲۳ء کے گزرتے گزرتے تحریک خلافت اپنی عمر طبعی کو پہنچ چکی تھی۔ جوش و جذبہ ختم ہو چکا تھا۔ مسایل باقی تھے اور تحریک پر جاں کنی کا عالم طاری تھا۔ مصطفیٰ کمال پاشا نے ترکی کے خلیفہ اور شیخ الاسلام کے نام نہاد منصب کو ختم کر دیا۔ خلافت کے نظام اور شیخ الاسلام کے بے فیض منصب کو معطل کر کے ترکی کو ایک قومی جمہوریہ بنا دیا۔ ہندستان میں تہلکہ مچ گیا۔ مولانا محمد علی نے مسجد جامعہ ملیہ دہلی کے منبر پر کئی گھنٹے خلافت کی ہلاکت کا ماتم کیا اور اب مصطفیٰ کمال کے خلاف تحریک چلانے کا عزم کر کے اُٹھے۔ مسٹر محمد علی نے اطمینان کا سانس لیا، خس کم جہاں پاک!

مولانا آزاد نے خاموشی کے ساتھ صورت حال کا جایزہ لیا، واقعات کی تحقیق کی اور بہ قایمی ہوش و حواس مقدمے کا فیصلہ لکھا اور پیش آمدہ حالات کی روشنی میں ملک کے اہل نظر، صاحب بصیرت لوگوں اور عام مسلمانوں کے سامنے وقت کے تقاضوں اور قوم و ملت کی ضرورتوں کے مطابق ان کے فرایض کو واضح کر دیا۔ مولانا آزاد کی رائے اور فکر یہ تھی!

انقلابیوں اور مدبروں نے جن کے سرخیل اتاترک مصطفیٰ کمال پاشا تھے، اپنے لیے ایک نیا اندازِ سیاست اور طرزِ حکومت اختیار کرنے کا جو بزعم خویش فیصلہ کیا تھا اس کا اختیار

انھیں کو تھا۔ اب بیرونِ ترکی کے کسی شخص یا جماعت کو اس میں مداخلت کرنے کا کوئی حق نہ تھا۔ ترکی کے دوسرے ہمدردوں کی طرح ہندستان کے محبانِ ترکی کے لیے بھی ان کے معاملے میں مداخلت کا کوئی حق نہ تھا۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے آل انڈیا خلافت کانفرنس، کان پور (دسمبر ۱۹۲۵ء) کے خطبہ صدارت میں جو تاریخ تحریک خلا ہند کی آخری کانفرنس تھی، ہندستان کے مسلمانوں کو وقت کے تقاضوں کی طرف توجہ دلائی تھی، مولانا کی یہ تقریر جس میں انھوں نے ہندستان کے مسلمانوں کے لیے مابعد سیاسی زندگی اور ملی، دینی، تعلیمی اور دیگر ضروریاتِ وقت کی طرف توجہ دلاتی تھی، بہت فکر انگیز ہے۔ اسی سلسلے میں مولانا آزاد کی وہ تقریر بھی بہت فکر انگیز اور سبق آموز ہے۔ جو انھوں نے یکم اپریل ۱۹۳۱ء کو جمعیت علماے ہند کے دسویں سالانہ اجلاس کراچی میں بہ طور خطبۂ صدارت کے پیش کی تھی۔ شایقین مطالعہ اور ہندستان کی تحریک آزادی میں جمعیت علماے ہند کے سیاسی مؤقف اور نیشنلسٹ پوائنٹ آف ویو سمجھنے کے لیے ابوالکلام آزاد کا یہ خطبہ بہت اہم ہے۔

۱۹۱۹ء سے لیگ، کانگریس اور خلافت کمیٹی میں ایک سیاسی قرب پیدا ہو گیا تھا۔ اسی سال جمعیت علماے ہند میدان سیاست میں آئی تھی۔ اس وقت کانگریس اور خلافت کمیٹی کے مابین سیاست کے ہر دو میدانوں میں ہندستان کی تحریک آزادی اور ترکی مصائب کے انسداد کے مساعی میں اتفاق ہو گیا تھا اور ڈھائی تین سال تک مذکورۂ بالا چاروں جماعتوں میں تعاون کا رشتہ قایم رہا اور تقریباً چار سال تک آزادانہ تعاون کی بنیاد پر وقت کے سیاسی سفر میں سب کا ایک ہی رُخ رہا۔ ۱۹۲۳ء کے اواخر میں ترکی میں مصطفیٰ کمال پاشا کے ''جمہوریۂ ترکیہ'' کے قیام کے اعلان کے بعد ہندستان میں خلافت تحریک کا کوئی جواز نہ رہا تھا۔ دیگر جماعتیں اپنے اپنے انداز سے سیاست میں حصہ لیتی رہیں اور جب تک جناح صاحب کا لیگ پر پوری طرح قبضہ نہیں ہو گیا لیگ اور کانگریس کی سیاست میں ٹکراؤ کی نوبت نہیں آئی۔

اس زمانے میں جناح صاحب کی سرگرمیاں بہت کم اور برائے نام ہی رہ گئی تھیں۔اس کا اندازہ ایک فاضل پروفیسر احمد سعید کی اُس علمی کاوش سے ہوتا ہے جو آں موصوف نے جناح صاحب کی تقاریر و خطبات اور بیانات کے مجموعے کی صورت میں مرتب کر دیا ہے اور ''گفتار قایداعظم'' کے نام سے اسلام آباد کے ایک سرکاری ادارے قومی ادارہ برائے تحقیق وثقافت نے شایع کیا ہے۔اس میں ۱۹۱۹ء سے ۱۹۲۴ء تک چھ برسوں میں اندراجات کی تفصیل سے ہوتا ہے۔

سال	اندراجات	سال	اندراجات
۱۹۱۹ء	۳	۱۹۲۲ء	۱
۱۹۲۰ء	۴	۱۹۲۳ء	••
۱۹۲۱ء	۳	۱۹۲۴ء	••

اس تعداد اندراجات میں اضافات کی ابھی بہت گنجایش ہے۔ایسے بہت سے حوالے ہوں گے، جن تک فاضل محقق کی رسائی نہیں ہوئی لیکن ان ۶ برس کی کوششوں سے ایک اوسط تو ضرور نکالا جا سکتا ہے! لیکن میں قارئین کی توجہ صرف اس طرف دلانا چاہتا ہوں کہ ان ہنگامہ خیز برسوں میں جناح صاحب سیاست سے کتنے دور ہو گئے تھے اور اسی سے اندازہ لگائیے کہ بازارِ عشق سیاست میں ان کی کتنی مٹی پلید ہو گئی ہو گی؟ بعض لوگوں نے طنز کیا ہے کہ اس کے بعد وہ ایک ناکام عاشق کی طرح بازار حسن سیاست سے نکل گئے تھے۔ بہ قول ڈاکٹر فرخ ملک کے وہ اپنی ''مدر کنٹری'' انگلینڈ چلے گئے تھے۔ میں نے یہ جملے ایک خاص اسلوب میں تحریر کرنا اس لیے گوارا کیے ہیں کہ میں اس طنز کا جواب بھی دے سکوں گا کہ پھر چند سال کے بعد دُنیا نے یہ بھی دیکھا کہ وہ ۱۹۳۴ء میں کس شان سے لوٹے تھے اور رفتہ رفتہ چند ہی برسوں میں کس طرح ملک کے سیاسی آسمان پر چھا گئے تھے!

جناح صاحب کے تذکرے میں ہم بیسویں صدی کی چوتھی دہائی تک پہنچ گئے ہیں۔ زیرِنظر کتاب میں، ہم ۱۹۳۵ء کے قانون ہند کے نفاذ اور اس کے تحت ۱۹۳۷ء کے انتخابات کے بعد کی سیاست اور اس میں جناح صاحب کے سیاسی رویے کا ایک خاص حد تک ذکر آ چکا ہے۔ جناح صاحب کے حوالے سے زیادہ تفصیل میں جانا تاریخ سیاسیاتِ ہند کی تاریخ جو حالات اور اطراف کے پہلو سے ایک عہد و ملت کی جامع تاریخ تو ہو سکتی ہے لیکن کسی ایک شخص کے حوالے سے نہیں ہو سکتی، اس لیے قلم کو روکتا ہوں اور جناح صاحب کی شخصیت اور ان کی سیاست کے حوالے سے ضروری اور اہم باتیں عرض کر کے مقدمے کو قایم کر دوں گا۔

جناح صاحب کے انتقال کو ۶۴ برس گزر گئے۔ گزشتہ چند برسوں میں تاریخ کی عدالت میں ان کی تاریخ و مقام پیدایش اور ان کے نام، سطح تعلیم، ان کے عقیدہ و مذہب، ان کی معاشرت، ان کے ذوق و شوق، ان کی سیرت، سماجی رویے، معاشی ذرایع، ان کی وکالت، کاروبار سیاست، افکار کے منابع، وفاداری کے مرکز، ان کی زندگی کا کوئی پہلو ایسا نہ تھا جس پر سب کا اتفاق ہو؟ ان کی زندگی کا کوئی راز ایسا نہ تھا جس سے ان کے گرد و پیش کے لوگ واقف نہ ہوں لیکن حقایق اور سچائی سے کسی نے کام نہ لیا۔ ان کے مصنفین نے اپنی ذات کے نمود، مفاد کی فکر اور مصالح کے تحت کام کیا۔ ان کی غلط روی پر ٹوکنے والا کوئی نہ تھا۔ ان پر سیکڑوں کتابیں لکھی گئیں لیکن ان کی تحریرات سچائی سے ناآشنا ہی رہیں۔ حقایق کو چھپانے اور سچائی پر پردہ ڈالنے کی ہر ممکن کوشش کی گئی لیکن قیامِ پاکستان کی ساٹھ سالہ تاریخ جس میں کم از کم دس سال تحریک پاکستان کے بھی شامل کر لینے چاہییں۔ ستر سالہ عہد کی ہر غلط اندیشی اور سلامت روی کی تاثیر کو دُنیا نے محسوس نہ کر لیا ہو اور اس کے نتایج دنیا پر ظاہر نہ ہو گئے ہوں!

جناح صاحب کو مسلمانوں سے ان کے مفادات سے، ان کے اچھے برے سے، ان

کے مرنے جینے سے کوئی تعلق نہ تھا۔ غیر مسلم اکثریت کے صوبوں کے مسلمانوں کو انھوں نے بے دردی سے اور غلط موضوع میں استعمال کیا۔

۱) پہلے کہا گیا کہ اقلیت کے صوبوں کے مسلمانوں کو قربان ہو جانا چاہیے اور اکثریت کے صوبوں میں اپنے بھائیوں کو آزاد کرا دینا چاہیے! لیکن ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ یہ اپیل بہادری، بلند خیالی، تدبر و بصیرت اور عقل و دانائی پر مبنی نہیں تھی۔ تدبر، بصیرت اور دانائی تو یہ ہوتی کہ اکثریتی صوبوں کے مسلمان آزاد بھی ہو جاتے اور اقلیتی صوبوں کے مسلمانوں کی زندگی تہہ و بالا ہوتی اور نہ وہ مصائب کا شکار ہوتے! یہ تو دانش مندی اور سیاسی بصیرت کی کوئی بات نہ تھی کہ چار کروڑ مسلمانوں کو پانچ کروڑ پر بھینٹ چڑھا دیا جائے۔

۲) پھر یہ کہا گیا کہ ''اقلیت کے مسلمانوں کو قربان کر دیا ہے!''

۳) اور جب ان کے دوست ایم سی چھاگلا نے پوچھا کہ تم جس طرح اقلیتی صوبوں کے مسلمانوں کو پاکستان کی تحریک میں استعمال کر رہے ہو، یہ بھی سوچا کہ اس کا انجام کیا ہوگا؟ اس جواب سے ان کے دل کی جس قساوت اور اقلیتی صوبوں کے مسلمانوں کی عزت و آبرو لٹنے اور ان کی زندگی کی تباہی و بربادی سے بے نیازی اور عدم تعلق کا جو اظہار ہوتا ہے اس کا اندازہ ایک جاہل شخص بھی کر سکتا ہے۔ اگر یہ مسلمانوں سے ان کی دوستی اور محبت تھی تو مسلمانوں سے ان کی دشمنی کیا ہوگی؟

پھر یہ کیا تھا کہ جن برادران کو گزشتہ دس سال سے مسلمانوں کا دشمن بنایا جا رہا تھا اور صوبوں کے اتحاد و اتفاق کے بعد ایک آسمان کے نیچے زندگی حرام ہو گئی تھی۔ اچانک قومیت بدل گئی تھی۔ اہل وطن سے اخلاق، تہذیب اور محبت و اعتماد کی دُنیا بدل گئی جس کانگریس کے ۳۵ برس رہنما رہ چکے تھے، اب وہ ایک ہندو جماعت، مسلمان اور اسلام دشمن تحریک بن گئی۔ پاکستان مل گیا تھا تو اب چوں کہ ضرورتیں بدل گئی تھیں، لازم تھا کہ عقاید و نظریات بھی بدل دیے جائیں اور گزشتہ دعووں اور نعروں کو بھی بھلا دیا جائے۔ اب وقت کا تقاضا یہ تھا کہ اسی قدیم مذہب و فلسفہ سیاست کو اختیار کر لیا جائے اور جہاں پہلے شرافت و بصیرت کا سبق پڑھانے کے بجائے جو کچھ پڑھایا اور سکھایا گیا تھا، وہ جناح صاحب کے لیے بچھائے

جانے والے تختِ اقتدار و حکمرانی کے تحفظ کا تقاضا تھا کہ ہندستان کے مسلمان اسی دشمن اور ستم گر حکومت کی وفاداری اور تابع داری کا حلف اُٹھالیا جائے۔ چناں چہ ۱۳/ جولائی ۱۹۴۷ء کو جناح صاحب نے دہلی میں پریس کانفرنس بلائی تھی۔ اس میں انھوں نے یہ اصول بیان کیا:

''اقلیتوں کو حکومتوں کا وفادار رہنا پڑے گا اور حکومت کی اطاعت قبول کرنا پڑے گی۔ کوئی حکومت یہ برداشت نہیں کر سکتی کہ اقلیتیں حکومت کی وفادار نہ ہوں یا تخریبی اقدامات شروع کر دیں۔ کیوں کہ ہر شہری کے لیے ضروری ہے کہ وہ حکومت کا وفادار بنے۔''

جناح صاحب نے اپنے دوست صحافی ایم ایس ایم شرما کو اس پریس کانفرنس سے پہلے ہی کوٹھی پر بلا کر ریہرسل کروادی تھی کہ میں یہ بیان کروں گا۔ تم اس پر مجھ سے یہ سوال کرنا اور میں اس کا جواب دوں گا۔ چناں چہ اس موقعے پر یہ ڈراما کھیلا گیا۔ جناح صاحب نے یہ بیان کر کے سانس لی تھی کہ شرما کھڑا ہوا اور سوال کیا۔

یہ بات آپ نے پاکستان کی اقلیتوں کے بارے میں کہی ہے۔ ہندستان کی اقلیتوں کے بارے میں بھی کچھ فرمائیں گے؟

جناح صاحب نے اس کا جواب یہ دیا:

''یہ تمام اقلیتوں کے بارے میں ہے، خواہ وہ دنیا کے کسی بھی حصے میں آباد ہوں، کوئی حکومت یہ برداشت نہیں کر سکتی کہ کوئی اقلیت حکومت کی وفادار نہ ہو اور حکومت کے خلاف تخریبی اقدام شروع کر دے! اس کا یہ رویہ حکومت کے لیے ناقابل برداشت ہو جاتا ہے! میں ہر مسلمان اور ہندو شہری سے اپیل کروں گا کہ وہ اپنی حکومت کا وفادار رہے!''(۱)

جناح صاحب کو مسلمانوں کی سماجی اصلاح اور تعلیمی ترقی سے کوئی دل چسپی نہیں تھی۔ تعلیم بالغان کی تحریک میں حصہ لینے سے نہ صرف خود انکار کر دیا بلکہ مسلم لیگ کو بھی تحریک

میں شامل ہونے سے روک دیا۔ مسلمانوں کی معاشرتی زندگی سے ان کا کوئی تعلق نہ تھا۔ اس کی اصلاح سے انھیں کیوں کر دل چسپی ہوسکتی تھی۔

انھیں اپنے اُوپر بہت اعتماد تھا۔ وہ اپنے سوا کسی کی رائے کو خیال میں نہ لاتے تھے۔ اپنی ہی رائے کو منوانے کی کوشش کرتے تھے۔ ان کے سامنے یوں بھی کسی کو زبان کھولنے کی جرأت نہ ہوتی تھی اور اگر کسی کو ان کی رائے کا اندازہ ہو جائے تب تو کسی کے زبان کھولنے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ مرزا راشد علی بیگ نے لکھا ہے:

''جناح صاحب لیڈر سے زیادہ ڈکٹیٹر تھے۔ مسلم لیگ ورکنگ کمیٹی ممکن ہے کمیٹی ہو، لیکن اس کا کام ''صرف اظہارِ رضامندی تھا۔ جس کی میٹنگ کی وہ اسی طرح صدارت کرتے تھے، جیسے کوئی جنرل اپنی فوج کی کمانڈ کر رہا ہو۔''(۲)

گجراتی ان کی مادری زبان تھی لیکن ان کی پیدائش چوں کہ جھرک (ضلع ٹھٹہ، سندھ) میں ہوئی تھی اور اپنی زندگی کے پندرہ برس انھوں نے کراچی کی ایک خاص سوسایٹی میں گزارے تھے اس لیے کچھ سندھی زبان بول لیتے تھے لیکن ان کی بول چال اور مطالعے کی زبان انگریزی ہوگئی تھی۔ اُردو ٹوٹی پھوٹی آتی تھی۔ وکالت کے سوا کسی علم و فن سے وہ واقف نہ تھے اور نہ مغربی و مشرقی کسی زبان سے واقف تھے۔

اُردو زبان، ادب، تنقید، شعر و شاعری، قرآن، حدیث، فقہ، تفسیر، اصول، فلسفہ کسی کا کچھ ذوق نہ تھا۔ ایک مقدمہ میں ایک فارسی دستاویز سے استفادہ ضروری تھا۔ سر تیج بہادر سپرو نے اس کا ترجمہ کر دیا، تو ان کی مصیبت ٹلی۔ ہندستان کی تاریخ و جغرافیہ سے بے خبر تھے۔ اس بات کو ہم یہ کہہ کر حقیقت سے قریب کر سکتے ہیں کہ ہمیں ان کے مطالعے کے دوران اُن کی اس واقفیت کا کوئی سراغ نہیں ملا۔ اسلامی تاریخ سے ان کی عدم واقفیت مسلم

---

(۱) گفتارِ قایدِاعظم: احمد سعید، اسلام آباد، ۱۹۷۶ء، ص ۱۵-۳۱۳

(۲) محمد علی جناح، پٹنہ، ۱۹۹۶ء، جرنل ۱۰۳

ہے۔

مشرقی آداب، تہذیب، تمدن، معاشرت سے وہ قطعاً ناواقف تھے۔ غرور و نخوت سے اُن کا سینہ معمور تھا۔

☆ غریبوں سے ملنا نہ چاہتے تھے۔ (۱)

☆ ایسے عوامی لیڈر تھے جن کے پاس ذرا سا وقت بھی نہیں تھا۔ (۲)

☆ شہرت، وافر آمدنی اور زندگی کے اعلیٰ معیار اور بلندی میں پہنچ کر اپنے کم نصیب ساتھیوں سے انھوں نے بات کرنا بند کر دی تھی۔ (۳)

☆ سماجی اعتبار سے وہ علاحدگی پسند ہو گئے تھے۔ صرف ان لوگوں سے اور وہ بھی کلب اور ڈرائنگ روم میں پسند کرتے تھے ان کے اپنے ہم رتبہ ہوتے تھے۔ (۴)

☆ ان کے قریبی دوستوں میں سے بھی جناح صاحب کے کوئی اتنا قریب نہیں ہو سکتا تھا کہ بے تکلفی کے ساتھ بات کر سکے۔ (۵)

☆ ممبئی میں ان کے متعدد رشتے دار تھے، لیکن کسی سے ملنا جلنا نہ تھا۔ (۶)

☆ لندن سے ان کے آنے کے بعد ان کے والد کی خواہش تھی کہ وہ کچھ عرصہ کراچی میں پریکٹس کریں۔ وہ اس وقت بیمار تھے اور نہیں چاہتے تھے کہ بیٹا نظروں سے دور ہو لیکن جناح صاحب اپنی چھوٹی بہن فاطمہ کو لے کر ممبئی چلے گئے۔ بہن کو ایک جدید کانوینٹ اسکول میں داخل کرا دیا۔ (۷) اور خود وکالت میں مصروف ہو گئے۔ کراچی کو مڑ کر نہ دیکھا، والد کی

---

(۱) محمد علی جناح، پٹنہ، ص ۱۴

(۲) ایضاً ص ۱۵

(۳) ایضاً ص ۲۳

(۴) ایضاً

(۵) ایضاً ص ۱۲

(۶) ایضاً

(۷) وطن پرست اور سیکولر جناح از ڈاکٹر اجیت جاوید، ص ۱۳۹

خیریت نہ پوچھی۔ وہ کب مر گئے اور کہاں دفن ہوئے، انھیں معلوم نہ تھا۔ ان کے عزیزوں نے کبھی ان کے گھر کا رُخ نہ کیا۔ اکثر کے نام جناح صاحب کے بعد سننے میں آئے جنھیں اخبار نویسوں نے ڈھونڈ نکالا تھا۔ ان کا کوئی عزیز ان کی پہلی نماز جنازہ میں جو گورنر ہاؤس میں ہوئی تھی، شریک تھا، نہ ماتم میں! ان کے خاندان کے کسی چھوٹے بڑے نے ان سے رشتے کے نام سے نہ تو اپنا تعارف کرایا، نہ کسی نے یہ ظاہر کیا کہ ان کے ورثے میں اس کا حصہ بھی ہے۔ جناح صاحب نے اپنی وصیت میں بھی اپنی ایک بہن اور بیٹی کے سوا کسی کے لیے کوئی گنجایش نہیں چھوڑی تھی۔ اعزہ اور ان کے رشتوں کا احترام، ان کے حقوق کی ادائیگی، صلہ رحمی اور ان کے تذکرے کا کوئی سراغ نہیں ملتا۔ عزیزوں، رشتے داروں سے جناح صاحب کی بے نیازی، لاپروائی اور بے تعلقی حیرت انگیز تھی۔ یہ بے حسی معاشرتی اور تمدنی اخلاقیات اور اس کے محاسن سے بعد اور دایرۂ انسانیت میں جگہ نہ پانے والی چیز ہے اور قطع رحمی کی بدترین اور ملعون مثالی ہے۔

جناح صاحب کے مزاج اور تمکنت نے رشتے داروں پر گھر کے دروازے بند کر دیے تھے۔ عزیزوں اور رشتے داروں کو چھوڑ دینا، ان سے بے نیاز اور دور ہو جانا اور انھیں کو ان کے حقوق سے محروم کر دینا انسانیت کے خلاف ہے۔ اگر ان کا خاندان سے تعلق استوار ہوتا اور خاندان کے نوجوانوں کو ان کی سرپرستی (جس میں تربیت داخل ہے) حاصل ہوتی تو کیا تعجب تھا کہ ان میں سے کوئی قوم کے لیے عزت و شہرت کا موجب ہوتا! پھر یہ کہ ان کا خاندان بھی تو مسلم لیگ کی ذریت ہی کا حصہ تھا جس کے ''باپ'' جناح صاحب تھے۔ جو باپ اپنی اولاد کی سرپرستی اور تربیت سے غافل رہا ہو اس کے بارے میں یہ کیوں کر یقین کر لیا جائے کہ وہ قوم کا باپ بن کر اپنے فرض سے عہدہ برآ ہو سکے گا۔ یہ محض سوال ہی نہیں، مسلمہ حقیقت ہے کہ وہ اپنے فرایض کی ادائیگی میں ناکام رہے ہیں۔ پاکستان کا گورنر جنرل بننے کا فیصلہ کرنا اور ''لے جسلیٹو'' کا صدر بننا ان کا اپنا فیصلہ تھا۔ وہ ان عہدوں پر براجمان ہوئے لیکن وہ ان عہدوں کے لیے اپنی قابلیت اور دیانت کو ثابت نہیں کر سکتے تھے۔

جب وہ یہ بات کہتے ہیں تو اس کا صاف مطلب یہ ہوتا ہے کہ انھیں اپنی سیاسی زندگی

کے پچاس برسوں میں، اپنے معاصرین میں کوئی شریف اور مہذب مسلمان نہیں ملا جو سیاست میں ان کی ہم سری، دوستی میں ان کی ہم نشینی، ناؤ نوش میں حریفِ مئے مرد افگن عشق اور مجلس عیش و نشاط میں ان کا حریف بذلہ بن سکتا!

میرے سامنے حوالے کی جو کتابیں ہیں ان میں ایک بلوچی رہنما سے گفتگو کرتے ہوئے فرمایا کہ مسلمانوں میں غدار بھرے ہوئے ہیں۔ جناح صاحب نے ایک تقریر میں علمائے دین کے بارے میں یہی بات کہی لیکن جب یہ خیال کیا کہ علما کے بغیر تو ان کا کام بھی نہ چلے گا، کچھ علما کو تو انھوں نے ہائر کیا ہوا ہے ایسا نہ ہو کہ وہ بگڑ جائیں لیکن اس بات کی داد دینی پڑتی ہے کہ انھوں نے اعتراف کیا کہ ان کی جیب میں سب کھوٹے سکے ہیں۔ کیا ان کھوٹے سکوں کا شمار قوم و وطن کے غداروں میں نہیں ہوگا؟

قارئین کرام کو کسی بحث میں اُلجھانا نہیں چاہتا۔ جناح صاحب کی ملاقات کا حوالہ اور ان کے بیانِ اعتراف کا ایک ٹکڑا پیش کرتا ہوں، اس کا مطلب خود نکال لیں! ڈاکٹر اجیت جاوید کے شکریے کے ساتھ:

"سیکولر پاکستان بنانے کے لیے جناح نے خدائی خدمت گار پارٹی کے رہنما بادشاہ خان سے مدد مانگی۔ خدائی خدمت گار پارٹی [اپنے قیام کے روز سے آخر تک] انڈین نیشنل کانگریس کی [تحریک] متحدہ ہندستان میں اتحادی تھی۔ جناح نے [انھیں مخاطب کرتے ہوئے] کہا:

"خان صاحب میں جانتا ہوں کہ آپ باکردار اور ایمان دار شخص ہیں۔ پاکستان کی تعمیر میں مجھے آپ جیسے ایمان دار لوگوں کی ضرورت ہے اور اس وقت میں چوروں اور لفنگوں میں گھرا ہوا ہوں۔ اس لیے ان غریب مسلمانوں کے لیے کچھ نہیں کرسکتا۔ جنھوں نے بڑی تکلیفیں اُٹھائی ہیں۔"

انھوں نے مزید کہا:

"میں لوگوں کی کم سمجھی کا شکار ہوں۔ میں یہ خون خرابہ ہرگز نہیں چاہتا تھا۔ میں

امن چاہتا ہوں۔ یقین کیجیے! میں عوام الناس کے لیے کچھ کرنا چاہتا ہوں۔"[1]

جناح صاحب کی سماجی زندگی کا ایک عجیب پہلو اور بھی ہے۔ غور فرمایئے:

ہندستان کی متحدہ سماجی زندگی، چوں کہ مختلف عناصر کے ملاپ سے ظہور پذیر ہوئی ہے۔ اس لیے اس کے قیام واستحکام اور اس کے نشو وارتقا اور توسیع کے اعمال انجام نہیں پا سکتے۔ جب تک ان میں ترتیب و توازن نہ ہو! اس کے بغیر اس میں وہ خصوصیات پیدا نہیں ہوسکتیں جو اس کا واقعی حسن ہے۔ اس لیے جناح صاحب کا یہ کہنا کہ ان کی دوستی صرف غیر مسلموں سے ہے، ان کے الفاظ میں "میرے احباب صرف ہندو ہیں" ان الفاظ کے استعمال نے جناح صاحب کے فکر اور عمل۔ دونوں کی تصویر ہمارے سامنے پیش کر دی ہے اور ہم کہہ سکتے ہیں کہ جس طرح ان کے سماجی رویے میں بہ ظاہر توازن کا فقدان تھا، اسی طرح ان کا سماجی فکر بھی ذہنی عدم توازن کا شکار رہے۔ اس سے یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ انھوں نے ہندستان کے بارے میں کبھی یہ سوچا بھی نہ تھا کہ یہ ہندستان قدیم نہیں آخری دور کا ہندستان ہے جو ہندوؤں اور مسلمانوں کے ملاپ سے پیدا ہوا۔ اس کی تعمیر میں دونوں کا حصہ ہے اور دونوں یہ دعویٰ کر سکتے ہیں کہ ہندستان ہمارا ہے! اور ہم اس کے ایک ذرا سے ٹکڑے سے بھی دست بردار ہونے کے لیے ہرگز تیار نہیں۔ جناح صاحب کی زبان سے جو بات نکلی تھی وہ نہ تو ان کی بلند خیالی کی بات تھی اور نہ ان کی اعلیٰ ہمتی کا ثبوت تھا۔ اگر یہ بات کسی عام شخص کی زبان سے نکلتی تو ہرگز لایق اعتنا نہ ہوتی، لیکن ایک مدبر اور رہنما شخصیت کی زبان سے نکلی ہوئی بات کے اثرات مثبت اور منفی ہر دو صورتوں میں بے اثر سے زیادہ خطرناک بھی ہو سکتے ہیں۔ سری پرکاش نے جب یہ حقیقت بیان کی تھی کہ "مجھے خوب یاد ہے کہ میرے بچپن میں میرے دادا کے مسلم احباب کی میرے یہاں بہت آمد و رفت رہتی تھی اور میرے والد وغیرہ ان کو چچا کہہ کر خطاب کرتے تھے۔ میں نے یہ بھی ان سے (جناح صاحب سے) کہا کہ میرے دادا کے دوستوں میں بانی علی گڑھ کالج سیّد احمد بھی تھے!"

---

(1) پاکستان ایکسریز، ہاشو کیول رامانی، دہلی، نیو ایج، 1951ء، ص 48، 49

تو یہ بات ہندستان کی ایک حسین سماجی زندگی کی تاریخ اور اعلیٰ تہذیب کا بیان تھا، جو ہندو مسلم ملاپ نے صوبوں میں پیدا کی تھی۔ سری پرکاش نے اس کو بے مقصد اور بے محل بیان نہیں کر دیا تھا۔ انھوں نے اپنے ملک کی قابل فخر سماجی زندگی کا حوالہ دیا تھا۔ اپنے بزرگوں کی تمدنی زندگی کی ایک خوبصورت تصویر دکھائی تھی۔ سرسید کے عہد اور اس سے پہلے اور بعد کی سماجی وتمدنی زندگی سے اس کی بہت مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں لیکن جناح صاحب کے جواب سے ان کے منصب کے علو اور بلند خیالی کا اظہار نہیں ہوتا۔ یہ دوشناسا و بے تکلف دوستوں کی ملاقات نہیں تھی۔ بلکہ ہندستان کے ایک ڈپلومیٹ کی ایک ایسے منصب علو سے ملاقات تھی، جس کے بارے میں یہ شہرت عام تھی کہ وہ اس منصب کا اہل نہیں ہے، اسے اس منصب کے لیے کوئی تربیت حاصل نہیں تھی۔ اس نے اس منصب کے لیے اپنے انتخاب میں ریاست کے مفاد اور حالات کے تقاضے کا خیال نہیں رکھا تھا۔ وہ اپنے ہی شوقِ حکمرانی اور ہوس اقتدار سے مغلوب ہو گیا تھا۔ سری پرکاش نے وقت کی ایک اہم سیاسی ضرورت کے بعد —— ہندستان پاکستان میں اچھے تعلقات اور اتحاد واعتماد کی طرف توجہ دلائی تھی اور امن اور دوستی کے ایک نئے دور کے آغاز میں انھیں شرکت کی دعوت دی تھی، جس کی پاکستان کو فی الواقع ضرورت تھی۔ آج اس سے بہت زیادہ ضرورت ہے، یہ ضرورت ہمیشہ باقی رہے گی اور پاکستان کو اس سے کبھی مفر نہ ہوگا!

ترکیہ کی خلافت کا مسئلہ سب سے پہلے ترکوں کا مسئلہ تھا اور بالآخر انھیں کو فیصلہ کرنا تھا۔ اب جب کہ انھوں نے ایک خاص صورت حال میں اپنے مسئلے کا حل تلاش کر لیا ہے تو یہ ان کا حق ہے۔ ہم ان کی راہ میں رکاوٹ نہیں بننا چاہتے۔

خلافت کسی بے حس اور بے تاثیر شے کا نام یا عنوان نہیں۔ یہ ایک زندہ اور پر تاثیر نظام ہے، جس سے ہمارے معاشرتی، عدالتی اور سماجی مسایل حل کرنے میں مدد ملتی ہے اور اخلاقی تہذیبی تربیت سے قوم میں انسانیت کی روح پیدا کرتی ہے اور ہر طرح کی افراط وتفریط سے بچا کر سوسایٹی کے ہر فرد اور اجتماع میں توازن پیدا کرتی ہے۔ ترکی کے انقلاب نے اس کا

صرف نام بدلا ہے۔ حکومت کے تمام شعبے اور دایرۂ عمل کے تمام کام ہمیشہ کی طرح انجام پاتے رہیں گے۔ ان شعبوں اور عہدوں کے نام اور بعض اصطلاحات کے بدل جانے سے نہ مسایل بدلیں گے اور نہ ان کے حل کی ضرورت اور اس کی ذمے داری میں کوئی تبدیلی ہوگی!

زبان واصطلاحات بدل جانے سے سہولت ہی پیدا ہوگی کہ کسی اُلجھن کے پیدا ہونے کی اُمید نہ کرنی چاہیے۔ فن کی حیثیت وحقیقت میں کوئی تبدیلی نہیں ہوسکتی۔ اس کا فیضان ہر حالت میں برقرار رہے گا۔

آخری بات مولانا نے یہ فرمائی کہ ترکی کے مسئلے کی طرف متوجہ ہو جانے سے ہم خود اپنی وطنی ذمے داریوں کو پورا نہیں کر سکے تھے، جو ہمیں ہندستان میں انجام دینی تھیں۔ جب کہ ترکی کے حالیہ اقدام نے ہمارے لیے اپنے کسی معاملے میں مداخلت کا دروازہ کھلا نہیں رکھا ہے تو ہمیں اپنے ملک میں اپنی قومی، ملی اور وطنی ذمے داریوں کے لیے کمر ہمت کس لینی چاہیے۔(۱)

جناح صاحب نے ہندستان کے سیاسی مسئلے کا جو حل تجویز کیا تھا مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا حسین احمد مدنی نے اس کی افادیت سے انکار کیا، ان کے دوقومی نظریے سے انھیں اختلاف تھا۔ انھیں اس سے بھی اتفاق نہیں تھا کہ ہندستان کی تقسیم اس مسئلے کا حل ہے۔ انھوں نے یہ بھی تسلیم نہیں کیا تھا کہ مذہب قومیت کی بنیاد ہے لیکن جس روز حریت وطن کی

---

(۱) مولانا ابوالکلام آزاد کا یہ مقالہ زمیندار لاہور کی ۱۱رمئی تا ۷رجون ۱۹۲۴ء سات قسطوں اور کتاب کے ۴۸ صفحات میں شایع ہوا تھا۔ خاک سار نے اسے سترہ سطروں میں کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس میں مولانا کی ہرگز ترجمانی نہ ہوسکی۔ مولانا نے اسلامی حکومت یا خلافت (نظامِ حکومت) کے تعارف میں افکار کے جو موتی بکھیرے ہیں، میں اس کا ہزارواں حصہ بھی بیان نہ کر سکا۔ قارئین سے میری گزارش ہے کہ مذکورہ حوالے سے وہ خود لطف اندوز ہوں اور فیصلہ کریں کہ ترکی خلافت ترک کر کے ہم مسلمانوں نے کیا گنوایا تھا اور اسلامی حکومت کے قیام کی دعوت سے ہم اپنے ملک میں وہ کیا حاصل کرنا چاہتے ہیں جو ہمیں کسی فلاحی جمہوریہ میں نہیں مل سکتا؟

تحریک کے تمام فریق ایک فیصلے پر متفق ہو گئے، ان کا رویہ بدل گیا اور انھوں نے دعا کی کہ پاکستان قایم رہے، وہ مضبوط ہو، ترقی کرے اور تاریخ کی مسلم ریاست کی حیثیت سے مثال ثابت ہو۔

مولانا حسین احمد مدنی نے اپنی جماعت کے رہنماؤں اور کارکنوں کو اپنے مریدوں اور عقیدت کیشوں کو جو پاکستان کے حدود میں تھے، تلقین کی کہ اپنی حکومت کے وفادار ہوں، وطن کی خدمت کرو، مسلمانوں کی اصلاح اور اسلام کی تبلیغ کا فرض ادا کرو، مخلوق خدا کی خدمت کرو اور اللہ کے اور مسلمانوں کے حقوق ادا کرو اور اللہ کی عبادت اور حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کرو۔

مولانا ابوالکلام آزاد نے کہا جو کچھ گزر رہا ہے اسے بھول جاؤ۔ مستقبل کی فکر کرو، محبت اور اعتماد کو بحال کرو، پاکستان کو مضبوط بناؤ، ترقی کی راہیں نکالو، مذہبی انتہا پسندی سے گریز کرو، آمریت سے پیچھا چھڑاؤ، ریلوے کے قلیوں، کوئلہ جھونکنے والوں، پوسٹ مینوں کی درآمد اور فوج کی تقسیم سے گریز کا مشورہ دیا۔ نیز عام مسلمانوں کو ترک وطن سے روکنے کی تاکید کی! ہندستان سے کلرکوں کی درآمد کو ہندستان کے مسلمانوں کے لیے نقصان دہ اور پاکستان کی سوسایٹی کے لیے نہایت ضرر رساں قرار دیا۔ پوسٹ مینوں کو پاکستان لے جانے کے بارے میں کہا کہ پنجاب یونی ورسٹی سے میٹرک پاس ہزاروں کی تعداد بے روزگار اور ان میں ہر سال ہزاروں امیدواروں کا اضافہ ہو رہا ہے۔ اس میں درآمد شدہ کو اہمیت دی جائے گی۔

افسوس کہ لیگ کے رہنماؤں نے مولانا کی نصیحتوں اور مشوروں کو لایق اعتنا ہی نہ سمجھا۔ ہندستان سے ترک وطن کر کے جو مسلمان کسی نہ کسی طرح پہنچ گئے تھے ان کے مسایل کی طرف توجہ نہ کی گئی اور نہ ان کی رہایش اور بے سروسامانی میں ان کی امداد کے لیے کوئی قدم اُٹھایا گیا۔ ان کی حالت روز بہ روز بدتر سے بدتر ہوتی جا رہی تھی۔ وہ اقلیت کے لوگوں کو گھومتے پھرتے، بازاروں اور مارکیٹوں میں انھیں کاروبار کرتے دیکھتے اور خود گلیوں اور فٹ پاتھوں پر پڑے انھیں آتے جاتے چلتے پھرتے اور اپنے گھروں میں گھستے نکلتے

دیکھتے اور اپنی بدحالی اور کس مپرسی پر غور کرتے تو اشتعال میں مبتلا ہوتے۔ حکومت کو توجہ نہ تھی اپنے ہی اوپر غصہ آتا اور اپنا ہی گوشت نوچتے۔ بالآخر ان کا پیمانہ صبر لبریز ہو گیا ایک روز اپنی بپتا سنانے گورنر جنرل ہاؤس پہنچ گئے۔ نہ کسی سے ملاقات ہوئی اور نہ کسی کی نظر التفات حاصل کر سکے۔ مار دھاڑ اور پکڑ دھکڑ ہوئی، کچھ گرفتار ہوئے، چھوڑ دیے گئے۔ اب کسی کی شہ پا کر انھوں نے خود ہی اپنا انتظام کر لینے کا فیصلہ کر لیا۔ کراچی میں قیامت برپا ہو گئی۔ قتل ہوئے لیکن تارکین ہند کی اصل توجہ لوٹ مار اور مکانوں اور دکانوں کے قبضے پر تھی۔ اب ہندستان سے آئے ہوئے کراچی میں گھروں اور بازاروں میں تھے اور بدنصیب مقامیوں کے لیے ہندستان کے ہائی کمشنر نے جو سفارت کے فرایض ادا کرتا تھا اس نے ہندستان جانے والے بے گھروں کے لیے شہر سے باہر کیمپ قایم کر دیے تھے۔ کیمپ گورنر جنرل ہاؤس سے ڈھائی تین کلومیٹر دور تھے۔ ہواؤں نے اپنا رُخ بدل لیا اور ہاؤس بدبو سے بھر گیا۔ کیمپ پر ہزاروں روپے خرچ ہو چکے تھے، لیکن جگہ چھوڑنی پڑی، کسی شخص نے کہا: اگر ان کے گھروں کو لٹنے اور انھیں قتل ہونے سے بچایا نہیں جا سکا تھا تو کیا حکومت اتنا بھی نہ کر سکتی تھی کہ ایک شخص کو بے بدبو کی بدبو سے بچا لے!

جناح صاحب کے انتقال پر ۶۴ برس گزر گئے۔ اب ان کا معاملہ خدا کے سپرد ہے۔ تاریخ میں ان کے خلاف گزشتہ چند برسوں میں اتنے مقدمات درج ہو چکے ہیں جن کا شمار مشکل ہے اور ایسا کوئی نظر نہیں آتا، جو ان کا مقدمہ لڑے!

شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن کی انگریز سے نفرت و دشمنی ضرب المثل تھی۔ کسی نے پوچھا کہ حضرت یہ بتایئے کہ انگریزوں میں کوئی اچھی بات بھی ہے؟

حضرت نے فرمایا: ہاں کیوں نہیں!

پوچھا: وہ کیا؟

حضرت نے جواب دیا: ان کے گوشت کے کباب بہت لذیذ ہوں گے!

اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ حضرت مولانا کے نزدیک انسانی گوشت حلال تھا۔ دراصل مولانا نے یہ کہہ کر انگریز سامراج سے اپنی نفرتِ شدیدہ کا اظہار کیا تھا۔

میں نے ایک نہایت سنجیدہ، دین دار، متقی و پرہیز گار، صاحبِ علم و فضل سے، جو سیاسی سوجھ بوجھ اور تاریخی شعور بھی رکھتے ہیں اور جن کے بارے میں بعض دوستوں کا خیال ہے کہ وہ صاحبِ کشف بھی ہیں۔ مجھے ان کی سادہ زندگی میں دنیاداری اور دنیاداری میں دنیا سے بے نیازی بہت پسند ہے۔ میں ان سے بہت کم بات چیت کرتا ہوں۔ ایک روز میں نے انھیں حضرت شیخ الہند کا یہ لطیفہ سنایا اور پھر ان سے ڈرتے ڈرتے پوچھا:

آپ کے خیال میں جناح صاحب میں کیا خوبی تھی؟ اس کے بعد ان سے میری یہ بات چیت ہوئی:

وہ: ان میں قطعاً کوئی خوبی نہیں تھی! ان کا تو گوشت بھی حرام تھا!

میں: یہ بات تو سچ نہیں ہو سکتی۔

وہ: فقہ کا مسئلہ تو یہی ہے! آپ مانیں یا نہ مانیں!

میں: ہمیں احساس ہونا چاہیے، ہم ان کے پاکستان میں بیٹھے ہیں اور انھیں کے خلاف...

وہ: پاکستان انگریز کا عطیہ ہے جناح کا احسان نہیں!

میں: وفات پا جانے والوں کا ذکر اچھے لفظوں میں کرنا چاہیے۔

وہ: میں اپنا ایمان خراب کرنا نہیں چاہتا!

میں: وہ جیسے بھی تھے، خدا کے حضور میں ان کے لیے دعاے مغفرت کرنی چاہیے۔

وہ: میں خدا کو ناراض کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا!

میں: میں نے ان سے آخری سوال یہ کیا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے ساتھ کیا برتاؤ کیا ہو گا؟

وہ: جناب مجھے معاف کیجیے میں جہنم کے قریب بھی پھٹکنا نہیں چاہتا!

اس جواب کے بعد میں ایک اور سوال کرنے پر مجبور ہو گیا۔ میں نے ان سے کہا اس میں آپ کے جہنم کے قریب پھٹکنے کی کیا بات ہے؟

مجھے سوال کا جواب نہیں ملا، بلکہ مجھ سے سوال کیا گیا:

کیا آپ قارون، شداد، ہامان، ابولہب، چنگیز خان، ہلاکو اور جنرل ڈائر کے لیے دل میں نرم گوشہ رکھتے ہیں؟

میرے پاس اس کا کوئی جواب نہ تھا!

جناح صاحب کو اپنی زندگی میں ملک وقوم کی جو خدمت انجام دینا اور جو کارنامہ انجام دینا تھا، وہ پایہ تکمیل کو پہنچا کر گزر گئے۔ بہ طور فلسفہ وفکر کے ان کے پاس جو چیز تھی وہ دو قومی نظریہ تھا اور بطور نصب العین کے ان کے سامنے پاکستان کا حصول تھا۔ جہاں تک دو قومی نظریے کا تعلق ہے قیام پاکستان کے اعلان کے ساتھ ہی وہ اس سے دستبردار ہو گئے۔ ان کے نزدیک سرزمین ہند پر ہندو اور مسلمان ایک قوم نہیں تھے لیکن پاکستان کی سرزمین پر دونوں ایک قوم بن گئے تھے، ہندو مسلمان کا فرق مٹ گیا، دونوں برابر کے شہری تھے، دونوں میں کوئی امتیاز نہ تھا، دونوں کے حقوق برابر کے تھے اور فرایض میں دونوں برابر کا اشتراک رکھتے تھے۔ نصب العین میں صرف حصولِ پاکستان کے نعرے پر لیگیوں کا اتفاق تھا۔ پاکستان کے مقصد اور اس کے نظام حکومت کے بارے میں کسی کے ذہن میں کوئی بات نہ تھی۔ پاکستان کے وجود میں آجانے کا کسی کو یقین ہی نہ تھا۔ وہ اس بارے میں سوچنا محض تضیع اوقات سمجھتے تھے۔ جناح صاحب جب تک زندہ رہے، ۱۹۳۵ء کے انڈیا ایکٹ سے اپنی مرضی کے مطابق کام چلاتے رہے۔ پاکستان کا اپنا کوئی آئین نہ تھا۔ پھر جب آئین بن بھی گیا تو ابھی اس کے نفاذ کی نوبت نہ آئی تھی کہ حکومت کی باگ ڈور ایک ڈکٹیٹر کے قبضے میں چلی گئی۔ آزاد جمہوری بنیادوں پر ملک کو ۱۹۷۳ء تک کوئی دستور نصیب نہیں ہوا۔

جناح صاحب نے اپنے پیچھے کسی فکر اور فلسفے کو نہ چھوڑا تھا، جس کی روشنی میں قوم اپنے عقیدے، ملک کی معاشرتی، تمدنی، معاشی ضرورتوں اور وقت کے تقاضوں کے مطابق کوئی نظام مرتب کر لیتی! جناح صاحب کی زندگی کے تجربات اور مشاہدات بھی ان کی زندگی کے سرمایہ میں نہ تھے، جن سے کوئی سبق حاصل کیا جا سکتا!

زبانی کلام وخطاب میں وہ پختہ کار ضرور تھے، تحریر کی مشق نہیں تھی۔ مرزا ارشد علی بیگ ۱۹۳۴ء سے مارچ ۱۹۴۰ء تک تقریباً ٦ برس ان کے سیکرٹری رہے تھے۔ ان کا بیان ہے کہ

اس دوران کے تمام مضامین و بیان اور خطوط انھیں کے لکھے ہوئے ہیں۔ دسمبر ۱۹۳۹ء میں یوم نجات کے سلسلے میں جو مضمون جناح صاحب کے نام سے چھپا تھا۔ وہ بیگ صاحب کا لکھا ہوا تھا۔ اس میں ہندو مسلمانوں کو راشد صاحب نے ایک مقام پر ''دو فرقے'' لکھا تھا۔ جناح صاحب نے اسے ''دو قومیں'' بنا دیا تھا۔ دوسرے سیکرٹریوں کی سب سے بڑی ذمے داریاں بھی یہی ہوتی تھیں۔ علامہ اقبال کے خطوط بنام جناح کے مقدمے نگار کا دعوئ بھی کسی جگہ نظر سے گزرا ہے۔ یہ کوئی حیرت اور تعجب کی بات نہیں! یہ سیکرٹریوں کی ذمے داریاں بھی ہوتی ہیں۔

میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ جناح صاحب کے انتقال کے بعد ان کی سیرت و اعمال، ان کے فلسفہ سیاست، ان کے افکار، ان کے تدبر و بصیرت میں کوئی لایق توجہ چیز نہیں۔ البتہ اگر ہم چاہیں تو ان سے عبرت حاصل کر سکتے ہیں!

جناح صاحب مشرقی معاشرت، تہذیب و تمدن سے زندگی بھر دور و نفور رہے تھے۔ اگر کوئی مشرقی ان سے کوئی فیض اُٹھانا چاہے تو اس کے لیے یہ ممکن نہیں! ۱۹۲۴ء سے ۱۹۴۷ء تک ان کی زندگی، ان کی سیاسی دوستی اور پس پردہ کے بارے میں پچھلے چند برسوں میں جن حالات کا انکشاف ہوا ہے اگر ان میں کچھ باتیں مشکوک بھی ہوں، تب بھی کوئی شخص ان پر اعتماد نہیں کر سکتا۔

جناح صاحب نے پاکستان کی ترقی اور اس میں بسنے والی قوم کی فلاح و بہبود اور سرزمین پاکستان سے وفاداری کو حلف نہیں اُٹھایا تھا۔ وہ صرف برطانوی شہنشاہ معظم جارج ششم اور ان کے ولی عہدوں اور جانشینوں سے وفاداری کا حلف اُٹھایا تھا۔

اب ہم میں نہ جناح ہیں، نہ وہ شہنشاہ اور ان کے ولی عہد اور جانشین ہیں جن کی وفاداری کا عہد بہ عہد حلف اُٹھایا تھا۔

اب اہل وطن کے سامنے ان کا وطن ہے اور ان کی اپنی ذمے داریاں ہیں۔ ان ذمے

داریوں کی ادائیگی کے لیے جناح صاحب کا حوالہ غیر موثر بن گیا اور موجب شرمندگی بھی ہے۔ پاکستان تباہی کے گڑھے کنارے پہنچ گیا ہے۔ اگر ہم نے اس وقت پاکستان کی بقا کی طرف توجہ نہ دی تو وقت کی مہلت سے ہم ہاتھ دھو بیٹھیں گے۔ تاریخ اپنا فیصلہ نافذ کردے گی۔ توبہ وتدارک کا وقت گزر جائے گا اور ہم اپنی قسمت پر ہاتھ ملتے رہ جائیں گے۔ ہمیں اس بحث ومباحثہ وتکرار میں اپنے فرض کو فراموش نہ کردینا چاہیے!

گزشتہ چند برسوں میں جناح صاحب کے بارے میں جو تصانیف سامنے آئی ہیں، ان میں شخصیت کے تقریباً ہر پہلو پر کم وبیش معلومات اور انکشافات کا سرمایہ جمع ہوگیا ہے۔ تحریک پاکستان اور اس کے رہنما کی شخصیت کے بارے میں مناصب وسیاست اور موضوع علیہ شخصیت کی سیرت و کردار، فکر وفلسفہ، مذہب وسیاست کے بارے میں ایسی باتوں اور معلومات کا تہ در تہ انبار لگ گیا تھا۔ جس میں سچائیاں گم اور حقایق فراموش ہوگئے تھے۔

پاکستان کی فتح اور اس کے بانی کی شخصیت کے بارے میں غلط فہمیاں پیدا ہو رہی تھیں۔ غلط فہمیاں ہوسکتی ہیں لیکن انھیں باقی نہیں رکھا جاسکتا۔ کسی ملک وقوم کی تعمیر وترقی کا دارومدار عمل پر ہوتا ہے نہ کہ خواب وخیالات وتصورات پر؟ نوجوانوں کی تربیت حقایق اور ٹھوس معلومات کی بنیاد پر ہوتی ہے۔ ہمارے نوجوانوں کو معلوم ہونا چاہیے کہ ان کے پیش رو تاریخ کے کن نشیب وفراز سے گزر کر اس مقام تک پہنچے ہیں۔ ان کا ماضی کیا تھا اور اب وہ کس حال سے گزر رہے ہیں اور مستقبل کے بارے میں کیا توقع رکھتے ہیں اور ان کے عزایم کیا ہیں؟

جناح صاحب پر تحقیق اور تصنیف وتالیف کا جو موسم بدلا ہے اور ان کے مطالعے کی جو لہر آئی ہے وہ کوئی منفی عمل نہیں ہے لیکن اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ یہ گزشتہ ۶۰ سالہ دور میں تصنیف وتالیف کے میدان میں غلط اندازِ فکر اور تاریخ وسوانح میں اصول وحقایق کو نظر انداز کردیے جانے کا ردعمل ضرور ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ مسلم لیگ کے

زمانے سے ایک گروہ ان کا مخالف تھا جو لیگ میں اپنے مفاد کے لیے انھیں برداشت کرتا رہا تھا۔ دوسرا گروہ اگست ۱۹۴۷ء سے عہد حکمرانی میں ان کا دشمن بن گیا تھا اور اپنے مفاد میں انھیں استعمال کرنا چاہتا تھا اور اپنی ضرورت اور موقع و محل کے مطابق ان کے عیوب کی کبھی پردہ پوشی اور کبھی پردہ دری کے اعمال انجام دیے جاتے تھے۔ اس نے جناح صاحب کی بعض تقاریر کو بند کر دیا تھا اور بعد میں خود ہی چھپوایا تھا۔ تعلیمی اداروں سے وابستہ نام نہاد مصنفین نے زیادہ ستم ڈھایا۔ انھوں نے درسی کتابوں میں لغویات کو جمع کر دیا اور غور نہیں کیا کہ وہ اپنے ہی زیر تعلیم و تربیت نسل پر کیا ستم ڈھا رہے ہیں۔

جناح صاحب سے خدا نہ کرے ہمیں کوئی بغض ہو یا عداوت۔ ہم ان پر کیچڑ اچھالنے کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا حسین احمد مدنی نے جس کے ستم کو معاف کر دیا ہو ہم اس سے بدلا لینے کا خیال بھی دل میں لا سکتے ہیں لیکن جناح صاحب کے عقیدت مندوں کو سوچنا چاہیے کہ جناح صاحب پہلے شخص نہیں ہیں جن پر تنقید کی جا رہی ہے۔ ہندستان کے خواہ مسلمان سیاست دان ہوں خواہ ہندو ہوں بتائیے کس پر تنقید اور اعتراض نہیں کیا گیا۔ ان سب میں جناح صاحب کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ انھوں نے اپنے مخالفین کی سیاست ہی کو رد نہیں کیا بلکہ ان پر سب و شتم کیا۔ ان پر الزام لگایا، بہتان دھرے، ان کے نام رکھے۔ تحریک پاکستان اقلیت کے صوبوں کے مسلمانوں کو استعمال کرنے سے دوستوں نے منع کیا تھا لیکن جناح صاحب نے انھیں ہندو دشمنی کی بھینٹ چڑھا دیا۔ انھوں نے مسلم اقلیت کے چار کروڑ مسلمانوں کو دھوکا دیا تھا۔

اب اس کا کیا جواب ہے کہ انھوں نے مسلمانوں سے اپنا مخلص ہونا ثابت نہیں کیا۔ وہ پاکستان نہیں چاہتے تھے۔ ان کا مقصد ہندستان کو تقسیم کرانا بن گیا تھا۔ انھوں نے ہندستان تقسیم کروا کے پاکستان یورپین استعمار کو تھالی میں رکھ کر پیش کر دیا تھا۔

لیکن میں جب یہ سوچتا ہوں کہ آخری دور میں انھیں احساس ہو گیا تھا کہ تحریک آزادی قوم و وطن میں وہ ایک جرم کے مرتکب ہو رہے ہیں۔ وہ اپنی راہ بدل لینا چاہتے تھے۔ انھوں

نے محسوس کر لیا تھا کہ ہندستان کی تقسیم سیاسی مسئلے کا حل نہیں ہے اور وہ اس مسئلے کو برٹش گورنمنٹ اور کانگریس کے رہنماؤں سے ملاقات کرنے اور کسی باعزت فیصلے کے لیے مہلت کے متقاضی تھے۔ جس کی رعایت دینے سے ماؤنٹ بیٹن نے انھیں جھڑک دیا تھا اور کہا تھا کہ مسٹر جناح! وہ وقت گزر چکا ہے۔

اس غیر مہذب اسلوب بیان اور توہین آمیز رویے سے جناح صاحب کے دل پر کیا گزرا ہوگا؟ سوچتا ہوں تو کلیجہ منہ کو آتا ہے۔

وتعز من تشاء وتذل من تشاء بيدك الخير!

(ابوسلمان شاہ جہان پوری)

۱۰رجنوری ۲۰۱۳ء

حصہ اوّل

محمد علی جناح کی شخصیت

افکار و حقایق کی روشنی میں!

محمد علی جناح

جناح کے سکریٹری مرزا راشد علی بیگ کے قلم سے

ترتیب وترجمہ

ڈاکٹر عابد رضا بیدار

ڈائریکٹر خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری۔ پٹنہ

مشمولہ

خدابخش لائبریری جرنل ستمبر ۱۹۹۶ء

باب: ۱

مسٹر جناح
اپنے پرائیویٹ سیکرٹری
مرزا ارشد علی بیگ
کی نظر میں

مرزا راشد علی بیگ اور ان کے افکار و خیالات

مرزا راشد علی بیگ ۱۹۰۵ء میں پیدا ہوئے تھے۔ جدید تعلیم سے آراستہ اور نیشنلسٹ خیالات رکھنے والے شخص تھے۔ انگریزی پر عبور تھا۔ جناح صاحب ان کے خیالات سے واقف اور ان پر اعتماد کرتے تھے۔ دونوں کے خیالات میں کوئی بڑا فرق نہ تھا۔ ۱۹۳۴ء میں مسٹر جناح کے پرائیویٹ سیکریٹری ہو گئے تھے۔ ۱۹۳۷ء کے بعد جناح صاحب کے خیالات اور طرز سیاست میں رفتہ رفتہ تبدیلی آنی شروع ہوئی۔ ۱۹۴۰ء کے آتے آتے ان کے خیالات نے فرقہ وارانہ رخ اختیار کرلیا تو راشد علی بیگ نے ان کی سیکریٹری شپ سے استعفادے دیا۔

جناح صاحب کے ساتھ انھوں نے تقریباً چھ برس گزارے۔ وہ جناح صاحب کے نام آنے والے خطوط کے جواب لکھتے تھے، بیانات لکھتے تھے اور ان کی موجودگی اور عدم موجودگی میں تمام دفتری کام وہی نمٹاتے تھے۔ جناح صاحب سے علاحدگی اختیار کرلینے کے بعد بھی ان سے معاشرتی تعلقات منقطع نہیں کیے۔ ان کی خدمت میں حاضر ہوتے اور آداب بجالاتے رہے۔ اگرچہ جناح صاحب کو بیگ صاحب سے التفاتِ خاص باقی نہیں رہا تھا، لیکن جناح صاحب نے ان پر اپنے گھر کے دروازے بند نہیں کرلیے تھے۔ بیگ صاحب کی بیوی تارا بیگم جناح صاحب کی معتقد اور مس فاطمہ جناح کی دوست بن گئی تھیں، ان سے جناح صاحب کی شفقت میں کوئی فرق نہ آیا۔

راشد علی بیگ نے ایران، انڈونیشیا وغیرہ میں ہندستان کی سفارتی خدمات انجام دیں۔ ریٹائرمنٹ کے بعد دونوں میاں بیوی نے خدمت خلق کے لیے اپنی زندگی کو وقف کردیا تھا۔ ''مسلم پروگریسو گروپ'' قایم کرلیا تھا۔ اسی گروپ کے کاموں، تصنیف و تالیف کے شغل اور خدمتِ خلق کی سرگرمیوں میں ان کے اور ان کی بیوی کے مسلک و مشرب کو تلاش کرنا چاہیے کہ یہی ان کی زندگی کا اوڑھنا بچھونا تھا۔ اس سے باہر انھیں دین و دنیا کے حسن و رنگ سے کوئی دل چسپی نہ تھی میاں بیوی دونوں نے بڑی ذمے دارانہ اور قوم و وطن کی خدمت میں مصروف زندگی گزاری تھی۔ ان کی تواریخ وفات کا صحیح علم نہیں ہوسکا۔ ڈاکٹر عابد رضا بیدار نے محمد علی جناح کے بارے میں ان کی انگریزی تالیف "Indefrant Saddles" (دو کشتیوں کی سواری) کے بعض اجزا اور ان کا ترجمہ خدا بخش لائبریری جنرل (پٹنہ) شمارہ ۱۰۳، ۱۹۹۶ء میں چھاپا تھا تو اس سے پہلے ان دونوں میاں بیوی کا انتقال ہوچکا تھا۔

یہ تالیف خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ نے ایک خاص مقصد سے ایک منصوبے کے تحت ایک

سلسلۂ مطبوعات میں شایع کی تھی۔ یہ خاص مقصد کیا تھا اور اس کے مطابق کن حضرات کی کون کون سی کتابیں شایع ہوئی تھیں۔ ان کی تفصیل میں اس وقت ادارے کے ڈایریکٹر محترم ڈاکٹر عابد رضا بیدار فرماتے ہیں:

''وہ الگ بیٹھا ہوا ہنستا ہے، جس کا کام ہے

برصغیر کے دونوں ملکوں، ہندستان اور پاکستان کے درمیان خیر سگالی جذبے کو بڑھانے کے لیے ایسے لٹریچر کی ضرورت ہے جو سیکولرازم کو بڑھائے اور فرقہ پرستی کا زور گھٹائے، آپسی نفرت کو کم کرے اور جانوروں کو انسان بنانے کی ترغیب دے۔''

اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے جو اہتمام پیش نظر تھا، اس کے بارے میں محترم ڈاکٹر بیدار لکھتے ہیں:

''ان دونوں ملکوں کے درمیان محبت کے روابط پیدا کرنے کے لیے خدابخش لائبریری نے یہ اہتمام کیا ہے کہ دوقومی نظریے کی بنیاد پر قایم ہونے والی مملکت کے مصنفوں یعنی پاکستانیوں کے قلم سے دوقومی نظریے کے سب سے بڑے مخالف ابوالکلام آزاد پر اور ہندستانی اہل قلم کی طرف سے پاکستان کے بانی جناح پر اہم لوگوں کی تحریریں شایع کی جائیں۔''

اس پروگرام کے مطابق ۱۹۹۶ء تک خاک سار ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہان پوری، پروفیسر قمر آستاں اور قدرت اللہ فاطمی، پاکستانی اہل قلم کی چھ تالیفات مولانا ابوالکلام آزاد پر اور ہندستانی اہل قلم میں ایس کے مجمدار، کانجی دوارکا داس، سیلش بندھوا پادھیالے، سچد انند سنہا، ڈاکٹر عابد حسین اور مسز سروجنی نائیڈو کی پانچ اور چھٹی کتاب مرزا راشد علی بیگ کی تھی جو خدابخش لائبریری جرنل کے شمارہ ۱۰۳ میں اور دیگر نمبروں میں شایع ہوئی تھی۔

خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری۔ پٹنہ کا یہ وقتی یا مختصر مدتی منصوبہ نہیں بلکہ حالات نے اسے دائمی ضرورت بنا دیا ہے۔ ہندستان اور پاکستان کے مابین خیر سگالی کے زندہ جذبات اور بہترین، مستقل اور مستحکم تعلقات اور پختہ اعتماد کی ضرورت ہے اور اس کے لیے خیر سگالی کے رویوں کی نگہداشت اور تعلقات و اعتماد کے معاملات پر ہمیشہ کڑی اور گہری نظر رکھنے کی ضرورت ہوگی۔ خیر سگالی اور اعتماد و محبت کی فضا پیدا کرنے میں شعرا اور مصنفین اور علمی و ادبی ادارے بہت اہم کردار ادا کر سکتے ہیں۔ خدابخش لائبریری کی خدمات اس سلسلے میں ناقابل فراموش ہیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد کے سلسلے میں پاکستانی مصنفین کی صرف چھ کتابیں ہی شایع نہیں کیں، مولانا محمد اسحاق بھٹی کی تالیف ''مولانا ابوالکلام آزاد'' اور ڈاکٹر انوار احمد کا پی ایچ ڈی کا تحقیقی مقالہ اور صرف خاکسار ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہان پوری کے مضامین و کتب مولانا آزاد اور ان کے بھائی آہ اور ان کی بہنوں آرزو اور آبرو کی نظم و نثر میں ایک درجن ہیں۔ ان کے علاوہ ہندستان کے دیگر علما اور دیگر انقلابی شخصیات میں مولانا سیّد حسین احمد مدنی، مفتی محمد

کفایت اللہ دہلوی، علامہ سیّد مناظر احسن گیلانی، شاد عظیم آبادی، اشفاق اللہ خاں شہید (کاکوری کیس کا ہیرو)، ۱۸۵۷ء میں معرکۂ شاملی ضلع سہارن پور (کے مجاہدین وشہدا) بھوپال کے مشہور انقلابی وُرکن ریشمی رومال تحریک مولانا برکت اللہ بھوپالی کے بارے میں پروفیسر شفقت رضوی کی تالیف، حیدرآباد دکن کی تاریخی شخصیت پر ابوسعادت جلیلی وغیرہم کی، نیز ابوالکلام آزاد سے متعلق پروفیسر قدرت اللہ فاطمی اور پروفیسر قمر آستان خاں کی متعدد تالیفات یادگار ہیں۔ جرنل میں بیسیوں پاکستانی اہل قلم کے پچاسوں مقالات الگ ہیں۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ان تالیفات اور مقالات نے دونوں ملکوں کے درمیان جو خیر سگالی جذبات پیدا کیے ہیں۔ اس کی تفصیل وتجزیے کے لیے ایک مقالے کی نہیں ایک ضخیم کتاب کی ضرورت ہوگی۔

مرزا راشد علی بیگ نے مسٹر محمد علی جناح پر جو کتاب لکھی، وہ ان کے چھ سالہ زندگی کے شب وروز کے مشاہدات، تجربات، مطالعات اور تاثرات ہیں۔ وہ چوں کہ جناح صاحب کے علمی وعملی میدان میں حریف نہیں، ان کے عقیدت مند ہیں اور بڑی حد تک ان کے وکیل صفائی ہیں۔ ان کا دامن اعتراض سے آلودہ نہیں۔ جناح صاحب سے ان کے اخلاص کا ایک بڑا ثبوت یہ ہے کہ انھوں نے پختہ کانگریسی ہونے کے باوجود کانگریسی رہنماؤں پر بے باکانہ تنقید اور مسٹر جناح کا دفاع کیا ہے۔ جب کہ حالات کی خرابی کے لیے ہر کوئی ملک کی تقسیم اور اس کے لیے مسٹر محمد علی جناح کو اس کا ذمے دار ٹھہراتا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ حالات خراب ضرور ہیں اور اس کی وجہ تقسیم ملک ہے لیکن اس کا الزام صرف مسٹر جناح پر نہیں ڈالا جاسکتا۔ اس میں انگریز کے مصالح، وقت کی مجبوریاں، کانگریس کے رہنماؤں کا رویہ اور آخر میں ان کی رضامندی وغیرہا بہت سی باتیں شامل ہیں۔ اب آپ مرزا راشد علی بیگ کے مشاہدات اور افکار کا مطالعہ فرمائیں۔ (ا۔س۔ش)

جناح صاحب سے پہلی ملاقات:

ان سے ملنے، میں ہائی کورٹ میں ان کے کمرے میں گیا۔ ''سنیے جناب!'' انھوں نے کہا، میں آپ کے خیالات سے اچھی طرح واقف ہوں، آپ سمجھتے ہیں کہ ہندو مسلمان مل کے کام کر سکتے ہیں، جی میرا بھی یہی چاہتا ہے کہ کاش ایسا ہی ہوتا! لیکن واقعہ یہ ہے کہ ایسا ممکن نہیں ہے، جب تک ہندو متحد اور مضبوط ہیں اور مسلمان منتشر اور کم زور ہندو اور مسلمان ہندستانی جسم کے دو بازو ہیں، لیکن وہ جسم کس کام کا، جس کا ایک بازو مفلوج ہو جائے۔ بازو کو مضبوط کر کے آپ پورے جسم کو مضبوطی بخشیں گے۔ دیو اور بونے کی شادی سنی ہے آپ نے؟ ایک سے قد کے لوگوں میں شادی ہوا کرتی ہے، ہندو مسلم اتحاد کبھی ممکن نہیں، جب تک مسلمان اپنی موجودہ سماجی، تعلیمی اور سیاسی پس ماندہ حالت میں ہیں۔ اگر ہندو مسلم ایکتا کے لیے کام کرنا چاہتے ہو تو پہلے مسلمانوں کے لیے کام کرنا چاہیے۔ [ص ۹، ۱۰]

جناح صاحب کی ایک کم زوری اور میری ذمے داری:

شان دار بیرسٹر، جیسا کہ وہ تھے، بولنے میں وہ اگرچہ انتہائی لسّان تھے، لیکن یہ بڑی عجیب و غریب بات ہے کہ لکھنے میں انھیں اظہار پر اتنا قابو نہیں تھا اور لکھنے کا زیادہ تر کام وہ میری طرف بڑھا دیتے تھے۔ یہ میں جانتا ہوں یا وہ کہ کن کن خطوں کے جواب، کون کون سے اخباری بیانات، اور کون کون سے مضامین میں نے لکھے۔ اس طرح میں نے ۱۹۳۴ء سے مارچ ۱۹۴۰ء تک کا عرصہ تقریباً ۶ سال، ان کے ساتھ گزارا! میں بمبئی پریسیڈنسی مسلم لیگ کونسل کا ممبر ہو گیا اور محمد علی چاے والا اور عباس طیب جی اور مجھ پر مشتمل وہ کمیٹی بنی، جسے جناح صاحب نے بمبئی قانون ساز اسمبلی کے لیے امیدوار منتخب کرنے کا اختیار دیا تھا۔ اسی قسم کی اور بھی ذمے داریاں میرے سپرد کی جاتی رہیں۔ [ص ۱۱، ۱۲]

ایک احساس مجھے ہمیشہ رہا ہے کہ کہیں دور گہرائی میں جناح کا ضمیر انھیں ان کے فرقہ وارانہ رول پر ملامت کرتا رہتا تھا۔ [ص: ۱۳]

لیڈر یا ڈکٹیٹر؟

اپنے اوپر بے پناہ اعتماد سے بھرپور جناح صاحب لیڈر سے زیادہ ڈکٹیٹر تھے۔ مسلم لیگ ورکنگ کمیٹی ممکن ہے کمیٹی ہو لیکن اس کا کام صرف اظہار رضامندی تھا جس کی میٹنگز کی وہ اس طرح صدارت کرتے تھے۔ جیسے کوئی جنرل اپنی فوج کی کمانڈ کر رہا ہے۔ ایک بار سر سکندر حیات خاں اور لاہور والوں کا ایک گروپ بمبئی کی میٹنگ کے سلسلے میں آئے ہوئے تھے۔ ایک مشترک دوست نے ہمیں کھانے پر بلایا۔ جب تک کھانا چلتا رہا۔ سر سکندر اور ان کے احباب ایک مسئلے پر جس کے وہ سب سختی سے مخالف تھے بحث کرتے رہے۔ ''اس کا مطلب پنجاب کی صورت حال کو قطعاً نظر انداز کرنا ہے، میں کبھی اسے قبول نہیں کروں گا'' سر سکندر نے انتہائی غصے میں کہا۔ شام کو وہ میٹنگ ہونا تھی۔ پھر دوسرے دن میں نے سر سکندر سے پوچھا کیا رہا؟ ''بھئی، میں نے وہ مسئلہ چھیڑا ہی نہیں۔'' حال آں کہ واقعہ یوں ہوا، جو ایک دوست نے جو موقع پر موجود تھے، بعد میں بتایا کہ سر سکندر نے مسئلہ چھیڑا تھا۔ ''جناح صاحب! میں اس مسئلے پر بحث کرنا چاہتا تھا کہ...'' سر سکندر نے شروع کیا تھا کہ جناح صاحب نے آہستگی سے اپنی کرسی سر سکندر کی طرف موڑی اور ان کی طرف گھورا۔ سر سکندر بلبلے کی طرح بیٹھ گئے۔ [ص ۱۴]

غریب معتقدوں سے جناح صاحب کا رویہ:

مجھے بڑی حیرت ہوتی جب اپنے معتقدوں تک سے ان کا رویہ دیکھتا! مجھے یاد ہے، ایک بار میں ان کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا کہ نوکر نے آکر کہا کچھ مسلمان ملنے کے لیے آئے ہیں۔ بڑی افروختگی کے ساتھ کہنے لگے'' بھیجو'' سیدھے سادے کچھ لوگ ڈرے سہمے ہوئے اندر آئے۔ ''ویل وھاٹ ڈو یو وانٹ؟'' انھوں نے انگریزی میں کہا۔ (کہیے آپ لوگ کیا

چاہتے ہیں) ''صاحب'' ان میں سے ایک اردو میں بولا ''آپ کے دیدار کرنے آئے ہیں۔'' ''ویل'' یو، ہیو سین می''! انھوں نے انگریزی میں کہا (میرا دیدار کرلیا آپ نے!) اور اپنی کرسی موڑ کر ہم سے بات چیت کرنے لگے۔ [ص ۱۴]

مسلمانوں سے بے زار رہنما:

وہ ایسے عوامی لیڈر تھے جن کے پاس عوام کے لیے ذرا سا وقت بھی نہیں تھا۔ عوام کے لیے ان کا رویہ وہی تھا جو ٹینی سن کے مشہور مصرعوں میں ہے کہ:

ان کا یہ کام نہیں کہ وہ پوچھیں، یہ کیوں؟ یہ کیا ہے؟
ان کو بس کرنا ہے یا مرنا ہے!

اس پر اضافہ کیجیے: ان کو بس ووٹ دیے جانا ہے اور مرنا ہے، میرا خیال ہے بعد میں انھوں نے اس کی بھی شعوری کوشش کی کہ اپنے تئیں کچھ بدلیں لیکن ہر ایسی کوشش مصنوعی تھی، تکلیف دہ حد تک! [ص ۱۵]

ان کی دل چسپی مسلم لیگ کے ساتھ تھی، مسلمانوں کے ساتھ نہیں! مجھے مسلمانوں سے دل چسپی تھی۔ ہندستانی جسم کے ایک کم زور بازو کی حیثیت سے، نہ کہ مسلم لیگ سے![(۱)] [ص ۱۶]

---

(۱) میں نے بیگ صاحب کی یہ بات پڑھی تو مجھے یقین نہیں آیا کہ وہ سچ کہہ رہے ہیں! مسلم لیگ کے صدر، مسلمانوں کے محبوب رہنما جسے وہ عقیدت کے ساتھ قاید اعظم کے نام سے یاد کرتے ہیں، آل انڈیا سطح کے لیڈر، عالمی شہرت کے مالک، یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ اپنے مخلصین اور مسلمانوں سے بیزار ہو، ان کے مسایل سے دوری اور بیگانگی ہو، وہ مسلمانوں کو محض ووٹ دینے اور مر جانے والا اور ٹینی سن کے شعر

their's not to wonder why their's to do and die

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر......)

معاشیات سے ناواقف اور تعلیم سے عدم دل چسپی:

جب جناح صاحب نے مجھے اپنے ساتھ کام میں لگایا، اس وقت سے وہ دو امور جو انھوں نے مجھے آمادہ کرنے کے لیے میرے سامنے رکھے تھے، میں نے اپنے پیش نظر رکھے اور میں حسرت کے ساتھ یہ سوچتا رہتا کہ وہ کب معاشی، سماجی اور تعلیمی لحاظ سے مسلمانوں کی تعمیر کا کام اپنے ہاتھ میں لیں گے تاکہ ہندو مسلم اتحاد کے لیے ان کی تجویز عملی جامہ پہن

کا مصداق سمجھتے ہوں، مجھے یہ پڑھ کر حیرت ہوئی۔ مجھے خیال آیا کہ شاید بیگ صاحب کے دل سے گزشتہ (۱۹۴۰ء) کی رنجش دور نہیں ہوئی، لیکن جب مطالعے کا قدم آگے بڑھا اور غور کیا تو مسلم عوام تو درکنار مسلمان رہنما اور لیگ کے کارکنوں سے بھی جو ان کے دست و بازو، ان کے خدمت گذار اور جاں نثاروں کی حیثیت رکھتے ہیں، ایسا ہی برتاؤ روا رکھتے ہیں۔ جناح صاحب کی سیرت کا یہ پہلو سامنے آیا تو میری حیرت دور ہوگئی۔ اب دیکھتا ہوں تو معلوم ہوتا ہے کہ زیر نظر کتاب کے مسودے کے مختلف صفحات میں ایسی معلومات مرتب ہوگئی ہیں اور میرا خیال بھی اس طرف نہ گیا کہ ان سے بھی بیگ صاحب کی رائے کی تائید ہوتی ہے۔ سر یامین خان کا نامۂ اعمال تو اس وقت میرے مطالعے میں ہے، اس سے بھی ان کی سیرت کی اس خوبی کی متعدد مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔ میں یہاں ''نامۂ اعمال'' سے صرف ایک اندراج پیش کروں گا۔ سر یامین خاں لکھتے ہیں:

''۱۳ر اپریل ۱۹۴۷ء اسمبلی کا سیشن ختم ہوگیا، لیکن ابھی تک یہ ٹھیک نہیں معلوم ہوا کہ آیندہ سیشن ہوگا یا نہیں یا اونٹ کس کل بیٹھے گا۔ شام کو مسلم لیگ پارٹی کی میٹنگ وچار لیاقت علی خان کے یہاں ہوئی۔ اکثر معاملات طے ہوئے، احمد ہارون جعفر نے یہ زور دیا کہ مسلمانوں کا روپیہ جو سود کا گورنمنٹ کے پاس جمع ہے اکثر مسلمانوں نے گورنمنٹ کو قرض دیا تھا اور سود نہیں لیا اور ڈاک خانہ جات میں ہے وہ مسلمانوں کی ایسوسی ایشن کو مل جائے۔

قاید اعظم نے یہ کام مسٹر چندریگر کے سپرد کیا کہ وہ مسودہ بنا کر جو قانوناً درست ہو وہ دیں تاکہ اس کے ذریعہ سے رُپیہ مسلم ایسوسی ایشن کو مل سکے۔ نواب اسماعیل خان کو چوں کہ کرسی قریب میں نہ مل سکی وہ قالین پر بیٹھ گئے اس کو سب نے محسوس کیا۔ پارٹی کے سب ممبروں نے قاید اعظم

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر......)

سکے۔ اور ہو یہ رہا تھا کہ وہ انھیں کسی دوسری ہی سمت میں لے جارہے تھے، جو اتحاد کی مخالف سمت تھی۔ مجھے یہ بھی پتا لگا کہ معاشیات کے بارے میں وہ مجھ سے بھی کچھ کم ہی جانتے تھے۔ فرق یہ تھا کہ میں کچھ جاننے کے لیے آمادہ رہتا تھا، سماجی اور تعلیمی کاموں سے بھی انھیں کم ہی دل دل چسپی تھی۔ [ص ۱۵]

سے دریافت کیا ہم کو بتائیے پاکستان ملنے یا نہ ملنے کی کیا صورت ہے۔ میں نے اپنی وایسرائے سے گفتگو کا حال بتایا۔ قاید اعظم نے کہا کہ آپ یہ گفتگو کرنے کیوں گئے، میں نے کہا کہ میں تو ہر وایسرائے سے ہر سیشن میں کم از کم ایک دفعہ ملاقات کرتا ہوں چوں کہ میرے پاس تمام مسلمانوں کے معاملات ہندستان بھر سے آتے ہیں جن پر زیادتی ہوتی ہے حتیٰ کہ بعض لوگ آپ کے پاس اپنی مصیبت لکھ کر بھیجتے ہیں اس کو بھی آپ میرے ہی پاس بھیج دیتے ہیں کہ میں اس کا انسداد کرادوں۔ میں ۱۹۲۱ء سے ہر مصیبت زدہ مسلمان کو گورنمنٹ حکام سے مدد لے کر مصیبت کو رفع کرنے کی کوشش کرتا رہا ہوں۔ اکثر ریاستوں کے معاملات وایسرائے کی مدد سے نکلتے ہیں۔ آپ نے آج تک کسی مسلمان کا کوئی کام نہیں نکالا اگر وہ آپ کو لکھتا ہے تو آپ بھی مجھی کو لکھتے ہیں اس لیے میں وایسرائے اور اکزیکٹو کونسلروں سے دوستی رکھتا رہا ہوں اور میں گورنمنٹ آف انڈیا سے متعلق کمیٹی آف ایکشن کا نمایندہ اور اس کی حیثیت رکھتا ہوں۔ جب وایسرائے نے خود قصہ تقسیم بنگال اور پنجاب کا نکالا اور اپنی رائے بتائی تو میں نے سن لی اور لیاقت علی خان کو اور آپ کو متنبہ کر دیا کہ مسٹر مینن کے ذریعہ کیا اسکیم بن رہی ہے تا کہ آپ آگاہ ہو جائیں اور عین وقت پر دھوکا نہ کھائیں اور سب لوگوں سے مشورہ لیجیے تا کہ سب آپ کی مدد کر سکیں صرف اکیلے اپنے اوپر نہ چھوڑیے کہ کہیں دھوکا نہ کھائیں۔

اس کے بعد سب نے ان سے کہا کہ آپ بتائیں کہ صورت ہے کیا؟ اس پر قاید اعظم ایک دم کھڑے ہو گئے اور ڈرامائی طور پر یہ کہتے ہوئے کہ ''پاکستان لیں گے۔'' ان شاء اللہ!'' کمرے سے چلے گئے۔''

[نامۂ اعمال: جلد دوم، صفحہ ۵-۱۲۶۸]

یومِ نجات (دسمبر ۱۹۳۹ء) پر جناح صاحب کا بیان:

مرزا راشد علی بیگ کے بہ قول یہ بیان جناح صاحب کے لیے انھوں نے لکھا تھا۔ مسٹر جناح نے اس میں ایک لفظ بدل دیا تھا۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ فرقہ وارانہ سیاست کا آغاز کب ہوا۔ بیگ صاحب لکھتے ہیں:

... جناح صاحب کے پاس لے گیا، انھوں نے اسے پسند کیا، لیکن ایک لفظ بدل دیا۔ میں نے لکھا تھا:

ایسا آئین تشکیل دیا جائے جو یہ تسلیم کرتا ہو کہ ہندستان میں دو ''فرقے'' ہیں۔ دونوں کو مشترک مادرِ وطن کی حکومت میں حصے دار ہونا چاہیے۔ ایسا آئین تشکیل دینے کے لیے مسلمان حکومت برطانیہ، کانگریس یا کسی کے بھی ساتھ تعاون کے لیے تیار ہیں۔ تاکہ موجودہ دشمنیاں ختم ہو سکیں اور ہندستان دنیا کی بڑی قوموں میں اپنا مقام حاصل کر سکے۔

انھوں نے لفظ ''فرقے'' کھرچ کر اس کی جگہ ''قومیں'' لکھ دیا!

یہ پہلی بار میرے سامنے ایسا ہوا تھا جب جناح صاحب نے مسلمانوں کو قوم کہا تھا۔ لیکن چوں کہ ''مشترک مادرِ وطن'' کے الفاظ جوں کے توں برقرار رہنے دیے تھے۔ اس لیے ایک لمحے کے لیے بھی مجھے یہ شک نہیں ہوا کہ بالکل ہی غیر آمادہ ہندستان کے لیے وہ جلد ہی دو قومی نظریہ ہندو اور مسلم، پیش کرنے والے ہیں۔ ہر ایک نے اس نظریے کے بارے میں سنا ضرور تھا، جو ایک صاحب چودھری رحمت علی نے سوچا تھا۔ لیکن اس اکیلے واقعے کے سوا جس کا ابھی ذکر ہوا جناح صاحب نے اس سے پہلے دو قوموں یا دو ریاستوں کا کبھی نام نہیں لیا تھا۔ [ص ۱۷]

پیرپور رپورٹ کی واقعی حیثیت:

یہ مجھے معلوم تھا کہ لیگ کی ایک کمیٹی نے کانگریس کی صوبائی حکومتوں کے ''نام نہاد مظالم'' کے بارے میں ایک پیرپور رپورٹ تیار کرائی ہے جس میں شروع سے آخر تک ہندو مسلم فسادات بھرے ہوئے تھے۔ صوبائی کانگریس حتیٰ کہ افسرانِ ضلع تک اس میں ملوث

تھے۔ یہ صحیح ہے، لیکن یہ بات کہ کانگریسی حکومتیں بھی ان فسادات میں شریک تھیں محض افترا تھا۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان حکومتوں نے اپنے ووٹروں کے خلاف سخت ایکشن البتہ نہیں لیا اور جس حد تک ان کے بس میں تھا، امن وامان کی بحالی کے لیے انھوں نے وہ بھی نہیں کیا۔

اسی سلسلے میں بیگ صاحب لکھتے ہیں:

معاملہ یوں نہیں ہے کہ کانگریس نے مسلمانوں کے خلاف کچھ کیا ہو، واقعہ یوں تھا کہ اسے مسلمانوں کے سلسلے میں کچھ نہ کچھ کرنا چاہیے تھا اور وہ اس نے نہیں کیا تھا۔ کانگریس کا اوپر کا حلقہ جنھیں میں بیشتر ذاتی طور پر جانتا تھا، گاندھی جی، جواہر لال جی، مسز نائیڈو اور دوسرے کسی اینٹی مسلم اقدام کے اہل ہی نہ تھے۔ [ص ۱۸]

یوم نجات، بغیر کسی جھگڑے کے گزر گیا۔ کسی نے کسی کے ایک ہاتھ تک رسید نہیں کیا، ایک کنکری تک نہیں پھینکی... اگلی بار جب جناح صاحب نے ''یوم'' منایا تو وہ ایسے خوش نصیب نہیں رہے تھے۔ ۱۹۴۶ء میں مسلم لیگ نے ''راست اقدام کا یوم'' منایا اور نتیجے میں کلکتے کا خوف ناک فساد برپا ہوا۔ [ص ۱۹]

اجلاس سے پہلے لاہور ریزولیوشن کی اشاعت:

مرزا راشد علی بیگ مسٹر محمد علی جناح کے بڑے عقیدت مند تھے۔ وہ ایک خاص مقصد سے مسلمانوں کی رہنمائی کے لیے جناح صاحب کی دعوت پر ان کے ساتھ شریک ہوئے تھے۔ اب وہ اس بات سے سخت رنجیدہ ہوئے کہ جناح صاحب نے اپنی سیاست کا رخ بالکل ہی بدل لیا اور بیگ صاحب سے مشورہ کرنا اور انھیں بدلے ہوئے رخ میں بھی اعتماد میں لینا تو دور کی بات ہے۔ انھیں اپنے فیصلے سے مطلع بھی نہیں کیا۔ جناح صاحب کے اس رویے سے ان کے دل کو ٹھیس لگی تھی۔ انھوں نے فوراً فیصلہ کر لیا کہ وہ ان کے ساتھ کام نہیں کر سکتے۔ انھوں نے جناح صاحب کے لوٹنے کا انتظار اور ان سے گفتگو کرنے کی ضرورت

بھی محسوس نہیں کی، قطع تعلق کا اعلان کر دیا اور استعفاء اخبارات میں چھپوا دیا۔

بیگ صاحب کے لیے جناح صاحب کا یہ انقلابِ فکر اور طرزِ سیاست کی تبدیلی ناقابلِ برداشت ہوئی۔ صحافت کے دایرے میں انگریزی اور اردو اخبارات کے لیے ان کے طرزِ سیاست کی تبدیلی موجب حیرت ہوئی۔ ابھی تک قومی فکر اور اسی کے مطابق عملی سیاست میں ان کا رویہ تھا۔ انھیں اتحاد کا سفیر سمجھا جاتا۔ وہ سیاسی مسایل کو متحدہ ہندستان اور تمام اہل ہند کے اجتماعی مفادات کے تناظر میں سوچتے تھے۔ لاہور ریزولیوشن نے انھیں فرقہ وارانہ سیاست کے مقام پر لا کھڑا کیا تھا۔ انھوں نے مسلم اکثریت کے علاقوں کو الگ کر کے ان کے مفاد کے تحفظ کی نگرانی و رہنمائی کا منصب اپنے لیے پسند کر لیا تھا اور اس میں بھی کوئی بات نہ تقسیم کے بعد ہندستان سے الگ ہونے والے حصوں کے بارے میں، نہ ہندستان کے علاقوں میں رہ جانے والے مسلمانوں کے بارے میں، واضح تھی! بیگ صاحب نے لکھا ہے:

مسلم ریاست کا سارا نصب العین فرقہ وارانہ امن کا حصول ہونا چاہیے... تقسیم کے معنی یہ ہیں کہ یہ پہلے ہی تسلیم کر لیا گیا ہے کہ فرقے وارانہ اتحاد ناممکن چیز ہے۔

جناح صاحب نے اپنے بدلے ہوئے خیالات، نئے طرز فکر اور تقسیم کے منصوبے کی کوئی تشریح نہیں کی۔ اگرچہ انھوں نے اس وقت تک پاکستان کا لفظ استعمال نہیں کیا۔ یہ ان کی زبان پر تقریباً دو سال کے بعد آیا لیکن اس کی وضاحت سے وہ ہمیشہ گریز ہی کرتے رہے۔ بہت سے پہلو ہیں جن سے بحث کی جاسکتی ہے۔ لیکن یہاں تو بیگ صاحب کے افکار و تاثرات کا مطالعہ پیش نظر ہے۔ اس لیے انھیں سے استفاضہ کرتے ہیں: بیگ صاحب لکھتے ہیں:

''مارچ کے وسط میں جناح صاحب لاہور جا رہے تھے۔ جانے سے ایک دن پہلے میری ملاقات ہوئی۔ کسی ایک لفظ یا کسی قرینے سے انھوں نے ذرا سا اشارہ بھی نہیں دیا کہ مارچ کے اس لیگ سیشن میں لاہور میں پاکستان ریزولیوشن پیش کیا جانے والا ہے۔ مگر چند ہی دن بعد، بہت رات گئے فرینک موریس نے مجھے فون کیا'' تم نے مجھے پاکستان

ریزولیوشن کے بارے میں کچھ کیوں نہیں بتایا؟ اس نے پوچھا۔ ''ریزولیوشن''؟ میں نے حیران ہو کے پوچھا۔ اس نے پورا پڑھ کے سنا دیا۔ میں دنگ رہ گیا۔ لیکن اپنا راستہ مجھے صاف دکھائی دے رہا تھا۔ میں لیگ میں اس لیے آیا تھا کہ جہاں تک ہو سکے اتحاد کے لیے کام کر سکوں۔ لیکن اگر لیگ کے ذریعے اتحاد ممکن نہ رہا تو میری اس کے اندر کوئی جگہ نہ تھی، فرینک جسے میرے نصب العین اور ہدف اچھی طرح معلوم تھے، پوچھنے لگا۔ ''اب کیا ارادہ ہے''؟

''ظاہر ہے، استعفاء! یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے؟'' میں نے فوراً جواب دیا۔ لیکن فرینک میں چھپا ہوا صحافی فوراً بولا:

''تمھارا استعفاء دینا تو ٹھیک ہے ہی، لیکن اس کے لیے ایک بیان جاری کرو جس میں اپنے مستعفی ہونے کے وجوہ بتاؤ، ہم اسے اس طرح مشتہر کرنا چاہتے ہیں۔''

صبح میں ذرا جلدی اٹھ گیا اور لکھنے کے لیے بیٹھ گیا، جب اپنے لکھے سے پوری طرح مطمئن ہو چکا تو اسے فرینک کے پاس لے گیا، اس نے کئی بار پڑھا اور پھر مجھ سے کہا ''اس میں تمھارے نظریات اور خیالات پوری طرح آ گئے ہیں۔'' اگلے دن یہ بیان ''ٹائمز آف انڈیا'' میں آ گیا اور اس کے دوسرے دن باقی تمام اخباروں میں بھی۔ اچھی خاصی مشتہری اس بیان کی ہوئی، کئی ایک اخباروں نے اداریے بھی لکھے۔ اردو اخبارات نے بھی کوئی تنقید نہیں کی کہ یہ غریب بھی پاکستان ریزولیوشن پر محض بھونچکے رہ گئے تھے۔ ان کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا رویہ اختیار کریں۔

میرا یہ بیان اچھا خاصا طویل تھا، لیکن اس کے زیادہ ضروری حصے تو نقل کر ہی دوں:

''مسلم سیاست کا سارا نصب العین فرقہ وارانہ امن کا حصول ہونا چاہیے۔ اس منزل کی طرف تھوڑا سا اقدام بھی بھلی سیاست ہے۔ تقسیم کے معنی یہ ہیں کہ یہ پہلے ہی تسلیم کر لیا گیا کہ فرقہ وارانہ اتحاد ناممکن چیز ہے، اور اسی لیے یہ بدترین سیاست کی صورت ہے... مسلم لیگ کی ضرورت میں دو وجوہ سے سمجھتا تھا کہ ایک تو وہ یک جائی کا باعث ہوگی، اور دوسرے اس یک جائی سے فرقہ وارانہ امن مل

سکے گا اور مستقلاً مل سکے گا۔ ان دونوں وجوہ پر اب بھی میرا ایمان ہے اور اگر اس وقت میں مسلمان عوام سے ناتا توڑ رہا ہوں تو اس کا سبب بھی یہی ہے کہ ایک وجہ دوسری وجہ کی مخالفت کے لیے استعمال کی جا رہی ہے۔ میں ملت کی یک جائی میں جو مستقل جدائی یا علاحدگی کے مقصد کی خاطر ہو، عقیدہ نہیں رکھتا... مسئلے کی نوعیت اب ہم مسلمانوں کے سامنے بالکل واضح ہے۔ کیا ہم ہندو مسلم اتحاد میں عقیدہ رکھتے ہیں یا نہیں؟ اگر ہم اسے ناممکن سمجھتے ہیں تو ہماری جگہ لیگ میں ہے اور اگر ہم اسے ممکن سمجھتے ہیں تو لیگ سے باہر!''

''کیا میں نے استعفاء دینے میں کچھ جلد بازی کی؟ یہ سوال میں نے اپنے آپ سے کئی بار پوچھا ہے۔ ایک انگریز ''پنڈرال مون'' نے جو پنجاب کے مسلمان لیڈروں سے کافی قریب اور ان کا معتمد تھا اپنی کتاب ''ڈوائڈ اینڈ کویٹ'' میں لکھا ہے:

سودے بازی یا واقعی مطالبہ!

''نجی طور سے جناح نے لاہور میں ایک دو لوگوں سے کہا کہ یہ ریزولیوشن محض ایک شاطرانہ چال ہے، اور یہ امر کہ وہ چھ برس بعد تقسیم سے کچھ کم پر بھی راضی نظر آتے تھے، یہ ظاہر کرتا ہے کہ ۱۹۴۰ء میں وہ حقیقتاً اس مسئلے پر آخری فیصلہ کن موڑ پر نہیں پہنچے تھے۔ اس لیے ایک حد تک یہ ایک شاطرانہ چال بھی ہو سکتی تھی جس کا مقصد کانگریس سے ایسی رعایتیں حاصل کرنا ہو جو پارٹنرشپ کو گوارا بنا دیں۔ یہ امرِ واقعہ ہے کہ ریزولیوشن کے نتائج پر مجوزہ آزاد ریاستوں کی ہیئت ترکیبی پر، اور ان کے باہمی روابط کے بارے میں، اس مرحلے پر پوری طرح غور و خوض قطعی نہیں کیا گیا تھا۔ ان میں بعض امور بعد میں صاف ہوئے، لیکن جناح صاحب پاکستان کے واقعی خدوخال کی وضاحت دینے کے سلسلے میں بہت زیادہ مشتاق نہیں رہتے تھے، حتیٰ کہ ۱۹۴۷ء تک بھی اس بارے میں کچھ شکوک رہے کہ بالآخر جناح صاحب اپنے تصورات کو عملی جامے میں کس انداز پر دیکھنا پسند کریں گے؟''

''مون کا اس نتیجے پر پہنچنا کہ قوی امکان ہے کہ ریز ولیوشن محض سودے بازی کے نقطۂ نظر سے منظور کیا گیا ہو، اس میں ان بیانات سے خاصی مطابقت ہے جو لاہور سے واپسی پر لیگی دوستوں نے میرے سامنے رکھے۔ ''تم بھی عجیب عقل مند آدمی ہو جو ریز ولیوشن پر سنجیدگی سے غور کرنے بیٹھ گئے۔'' ان لوگوں نے مجھ سے کہا، ''تمھیں یہ نہیں معلوم کہ ہندو تو بنیے ہیں اور بنیا صرف یہی زبان سمجھ سکتا ہے؟'' اور خود جناح صاحب! ان کے مقصد کی غیر لچک داری اور ارادے کی پختگی وغیرہ کے بارے میں بہت کچھ لکھا جاتا رہا ہے لیکن ۱۹۴۶ء کی جولائی کے پہلے ہفتے تک کی صورت حال یہ تھی کہ وہ ایک غیر متحدہ مرکز (یونین سینٹر) قبول کرنے کے لیے پوری طرح آمادہ تھے۔ آخری فیصلہ تو جولائی ۱۹۴۶ء کے دوسرے ہفتے میں انھوں نے کیا کہ پاکستان سے کم اب کچھ بھی نہیں، اور اس کے اسباب تھے جن پر پھر گفتگو ہوگی۔''

''حقیقت جو کچھ بھی رہی ہو، میں مستعفی ہونے کے اپنے فیصلے پر کبھی نادم نہیں ہوا ہوں۔ استعفیٰ دینے کے کچھ عرصے بعد میں اور تارا جناح صاحب اور مس فاطمہ جناح سے ملنے گئے۔ تارا کے ساتھ ان کے اخلاق اور رویے میں کوئی تبدیلی نظر نہیں آئی، لیکن میری طرف انتہائی سرد مہر رہے۔ مجھے اس کا افسوس ہے کہ میرا ان کا ربط و تعلق اس طور پر ختم ہوا۔ ان کی شخصیت میں ایسی کوئی بات نہیں تھی کہ کوئی کسی بھی لحاظ سے ان کا شیفتہ یا گرویدہ ہو جائے، لیکن جب بھی اور آج تک بھی، میں ان کی دیانت و خلوص کو ہمیشہ گہری عزت و احترام کی نظر سے دیکھتا رہا ہوں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو اتنا طویل عرصہ میں نے محض حماقت میں ان کے ساتھ نہیں گزارا ہوتا۔''

فرقہ پرستوں کے امام:

''مستعفی ہونے کے بعد میں اس بارے میں بہت کچھ سوچتا رہا کہ جناح صاحب جیسا آزادانہ مذہبی اور سیاسی حریت فکر کے ایک طویل ریکارڈ کا مالک شخص مذہب اور سیاست میں فرقہ پرستوں کا امام بن گیا۔ اس ظاہری تضاد کو سلجھانے کے لیے ہمیں ان امور کو پیش نظر رکھنا ہوگا۔ جنھوں نے ان کی شخصیت کی تشکیل و تعمیر کا کام انجام دیا تھا۔ ان کی شخصیت جوان

کے بنیادی کردار، ان کے رجحانات، ان کی تعلیم و تربیت، ان کے تجربات اور تجربات کے ردعمل اور اسی قسم کے عوامل کا مجموعہ تھی۔''

خصایل کا ایک پہلو:

☆ ''معمولی سے گھر میں پیدا ہوئے لیکن اپنی محنت، قابلیت اور صلاحیت سے بمبئی میں قانونی پیشے میں ممتاز ترین نام پیدا کیا۔ پیشے کی ناموری سے وافر آمدنی اور وافر آمدنی سے ایک اعلیٰ معیار رہن سہن اور معیارِ زندگی ان کے یہاں ایسی ہی سہولت سے آتی چلی گئی جیسا کہ لوگ پیدائشی ہی رہے ہوں''۔

☆ ''بلندی پر پہنچ کر اپنے کم نصیب ساتھیوں سے بات بھی کرنا بند کر دی۔

☆ بہترین سے کم اب انھیں گوارا ہی نہ رہا تھا۔ بہترین دوست، بہترین کپڑے، بہترین ہوٹل، بہترین کلب۔۔۔

☆ وہ بالآخر سیاسی اور سماجی دونوں لحاظ سے سنوب Snob [1] ہوتے گئے۔ سماجی اعتبار سے وہ علاحدگی پسند ہو گئے، صرف ان لوگوں سے، اور وہ بھی کلب اور ڈرائنگ روم میں ملنا پسند کرتے تھے جو ان کے اپنے ہم رتبہ اور ہم مذاق ہوں، اور سیاسی لحاظ سے وہ کمیٹیوں والے آدمی (کمیٹی مین) ہو گئے، جو صرف اپنی ذہنی سطح کے لوگوں سے اور اپنے سے اتفاق رائے رکھنے والوں سے کانفرنس میں ملنا پسند کرتے تھے۔

☆ عوامی مقرر لیڈر کی وہ عین ضد تھے۔ شاید کم لوگ گاندھی جی اور جواہر لال نہرو کی اتنی بڑی ضد ہوں، ان دونوں نے اپنی ساحرانہ خصوصیات کے باوجود تقریروں کے بل پر اتنے معتقد اور یہ قیادت حاصل کی تھی، جب کہ

☆ جناح صاحب کا انداز یہ تھا کہ اپنے ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہیں، جہاں مسلمانوں کے عوامی لیڈر انھیں کھوجتے پھر رہے ہیں کہ کسی طرح کھینچ کے باہر لائیں۔

☆ اردو سے ناواقفیت کے سبب وہ پبلک میں بولنے سے کتراتے بھی تھے۔

---

(۱) ڈکشنری میں اس لفظ کے معنی یہ لکھے ہیں: One who pays too much respect to social position or wealth امارت پرست، غریبوں کو حقیر جاننے والا۔

☆ سماجی لحاظ سے عام آدمی کے لیے ان کے پاس وقت بھی نہیں تھا اور

☆ سیاسی لحاظ سے عام سیاسی ورکر یا معمولی سیاست دانوں کے لیے ان کے پاس مطلق وقت نہیں تھا، اور پھر بھی یہ سب ان کے مرید تھے۔"(۱) [ص ۲۳،۲۴]

مسٹر جناح اور ان کا مذہب:

☆ "مذہب کا جہاں تک تعلق ہے پاکستان میں کوئی کچھ بھی کہا کرے، لیکن وہ بنیادی طور سے سیکولر اور ناعقیدہ (Agnostic) تھے۔ ان کے انتہائی معتقد سوانح نگار کو بھی اس کی تلاش میں خاصی مشکل پڑے گی کہ

☆ ان کی تحریر و تقریر سے مذہب کی تبلیغ یا تشویق کے سلسلے میں ایک آدھ جملہ بھی مہیا کر سکے۔

☆ مجھے ان کی کسی تحریر و تقریر میں ایسی کوئی چیز یاد نہیں آتی، جس میں انھوں نے اسلام کی خوبیاں بیان کی ہوں اور وہ کبھی مسجد میں گئے ہوں، کم سے کم میری یاد میں ایسا کبھی نہیں ہوا، ہو تو وہ سیاسی ضرورت کے تحت ہوا ہوگا۔

☆ اگر مولاناؤں سے انھوں نے کبھی کچھ تعلق رکھا ہو، کم سے کم مجھے ایسا یاد نہیں آتا، ہوا ہو تو یہ محض ووٹوں کے سلسلے سے ہوا ہوگا۔ اگر وہ مجھے پسند کرتے تھے، تو اس کا یہی مطلب تھا کہ میں بھی ان کی مانند ماڈرن، مہذب اور ناعقیدہ تھا!..." [ص ۲۴]

☆ حقیقت یہ ہے کہ جناح صاحب اول و آخر ایک سیاسی مسلمان تھے۔

☆ وہ اپنے آپ کو مسلمان فرقے کا سیاسی لیڈر سمجھتے تھے۔ جب غیر منقسم ہندستان ان کے ذہن میں تھا، اور پھر مسلمان قوم کا سیاسی لیڈر جب وہ پاکستان کے بارے میں سوچنے

---

(۱) بیگ صاحب کی ان چند سطروں نے جناح صاحب کی شخصیت اور ان کے کیریکٹر کا تجزیہ جس انداز سے کیا ہے۔ اس کی کوئی مثال جناح صاحب کے سوانحی لٹریچر میں نہیں ملتی۔ ان کے ایک لفظ Snob نے عوام سے دوری، علما سے نفرت، مذہب دشمنی اور گاندھی، نہرو، ابوالکلام آزاد، سیّد حسین احمد مدنی، محمد علی (جوہر)، ڈاکٹر ذاکر حسین وغیرہم کے نام دھرنا، ان پر طنز کرنا۔ لوگوں کی توہین کرنا، ان کے مزاج کی سختی، اا٠کا ے لک رو یہ، ان کی شخصیت کی کس حقیقت کی نشان دہی کرتی ہے؟

لگے!

☆ اسلام ان کے فکری دایرے میں کسی جگہ کم ہی آتا تھا اور اگر کوئی پوچھتا کہ محض مشترک عقیدہ نسلی اعتبار سے مختلف لوگوں کو ایک قوم کیسے بنا سکتا ہے تو ان کا جواب یہ ہوتا کہ امریکہ نے ثابت کر دیا ہے کہ قومیت تو محض اپنی اختیاری ہوتی ہے، اگر مسلمان ایسا سوچتے ہیں کہ وہ ایک قوم ہیں تو وہ ایک قوم ہیں اور یہی اس کے لیے کافی ہے''۔

مسٹر جناح کی سیاست:

وہ اتنا ہندومت یا ہندوؤں کے خلاف نہ تھے جتنا کانگریس کے، جسے وہ مسلم لیگ کی سیاسی حریف سمجھتے تھے۔ ہندو مسلم فسادات سے اچھا خاصا فایدہ اٹھایا۔ یہ ثابت کرنے کے لیے کہ کانگریسی حکومتیں مسلمانوں کی حفاظت کی اہل نہیں اور مسلمانوں کو خوف زدہ کر کے لیگ کی طرف رولنے کے لیے ہندو راج کا ہوّا بھی کھڑا کرتے رہے۔ لیکن ان سے بے تعداد مرتبہ بات چیت میں مجھے مشکل ہی سے کوئی بات یاد آتی ہے جب انھوں نے ہندوؤں یا ہندو مذہب پر کوئی حملہ کیا ہو۔ ان کی مخالفت جو بعد میں نفرت میں ڈھلتی گئی، کانگریس قیادت کی جانب مرکوز تھی، اور اگر وہ گاندھی جی اور جواہر لال جی سے ٹکر لینا چاہتے تھے تو اس میں دونوں کے ہندو پن سے زیادہ کانگریسیت کو دخل تھا۔ ان کے کتنے ہی ہندو دوست تھے۔

اس کا اعتراف کرنا چاہیے کہ اس زمانے میں کانگریس میں بعض افسوس ناک خصوصیات در آئی تھیں۔ اس سے اکثر غیر کانگریسی ہندو اور مسلمان غالباً متفق ہوں گے کہ کانگریس کے ممبروں میں کچھ شوں فوں آ گئی تھی جو افسوس ناک تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ ''ہم تم سے زیادہ متقی اور نیک لوگ ہیں'' والا گاندھیائی گروپ اتنا زیادہ کچوکے دینے والا نہ تھا۔ جتنا ''ہم تم سے زیادہ بڑے محبِ وطن ہیں'' والا گروپ جو جواہر لال جی، ولبھ بھائی پٹیل اور سبھاش چندر بوس وغیرہ کے گرد جمع ہو چلا تھا۔

سیکولرازم کی جانب دوبارہ رجوع:

اور یہ کم اہم بات نہیں ہے کہ ایک بار اپنی نفرت انگیز کانگریس سے گلو خلاصی پانے کے

بعد جناح صاحب نے اپنے بنیادی سیکولرازم کو پھر سطح کے اوپر ابھر آنے دیا۔ تقسیم کی انتہائی ہول ناک فرقہ پرستی بھی بظاہر ان کے بنیادی سیکولرازم کو نہ دبا سکی۔ یہ سچ ہے، جیسا کہ تفصیل آئے گی، کہ غالباً ان کے محرکات ملے جلے تھے، لیکن اس سے زیادہ کون سی چیز نمونے کے سیکولرازم کے طور سے پیش کی جاسکتی ہے۔ انھوں نے پاکستان آئین ساز اسمبلی کو ۱۵ر اگست ۱۹۴۷ء کے خطاب میں کہا جب انھوں نے اعلان کیا کہ:

"تم میں سے ہر ایک، وہ کسی بھی فرقے سے تعلق رکھتا ہو، کسی بھی رنگ، ذات یا عقیدے کا ہو اولاً، ثانیاً اور آخراً اس ریاست کا شہری ہے، برابر کے حقوق، برابر کے امتیازات اور برابر کی ذمے داریوں کے ساتھ!... تم کسی بھی مذہب، ذات یا عقیدے سے متعلق ہو، ریاست کے معاملے کا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے، ہم اس بنیادی اصول سے ابتدا کر سکتے ہیں۔ اسے ہمیں اپنے نصب العین کی حیثیت سے اپنے سامنے رکھنا چاہیے۔ پھر جوں جوں زمانہ گزرتا جائے گا ہندو ہندو نہیں رہیں گے اور مسلمان مسلمان نہیں رہیں گے۔ مذہبی معنی میں نہیں کہ مذہب تو ہر فرد کا ذاتی معاملہ ہے، بلکہ سیاسی معنی میں، قوم کے شہری کی حیثیت سے!" [ص ۲۵ تا ۲۷]

یہ جناح صاحب کی ۱۵ر اگست کی نہیں ۱۱ر اگست کو پاکستان کی قانون ساز اسمبلی کے پہلے اجلاس کی تقریر کا اقتباس ہے، یہ تقریر چوں کہ پاکستان کے نظام حکومت کے بارے میں ایک پالیسی تقریر تھی۔ اس لیے اس مضمون کے آخر میں اس کا خاص حصہ شامل کر لیا گیا ہے۔ بیگ صاحب اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

تبصرہ:

"ان کا سخت ترین نقاد بھی یہ تو مانے گا کہ کسی اسلامی ریاست کی افتتاحی تقریر تو یہ ہونے سے رہی! ذہن عجیب فضاؤں میں پرواز کرنے لگتا ہے کہ دونوں ملکوں کے تعلقات کیا ہوتے اگر کشمیر بیچ میں ایک دیوار بن کر نہ ابھرا ہوتا۔ کچھ بھی ہو بعد میں صورت حال جس طرح خراب ہوئی اور حتیٰ کہ باقاعدہ جنگ تک نوبت پہنچی، اس کی ذمے داری ان کے سر نہیں

ڈالی جاسکتی۔ جناح کچھ بھی رہا ہو۔ مذہبی مجنون ہرگز نہیں تھا!"[۱] [ص ۲۷]

جناح صاحب کا نظریہ یرغمال:

"آخر آخر ان میں اتنا ضرور ہو گیا تھا کہ وہ بے حد سخت دل اور[۲] ہو گئے تھے۔ مسلم اکثریت کے صوبوں میں، پاکستان میں، ہندوؤں کے ٹھہرے رہنے کے وہ ممکن ہے دل سے خواہش مند رہے ہوں لیکن ان کے اندر کے سیاستداں نے یرغمال کا نظریہ محض ان کے سبب نہیں چلایا ان کے اپنے، اور کچھ گنے چنے، انتہا پسند لیگیوں کے سوا مجموعی طور سے مسلمانوں نے پاکستان کو سودے بازی کے ایک نقطۂ آغاز سے بڑھ کر کچھ نہیں سوچا تھا۔ اس لیے جب انھوں نے دیکھا تو وہ سچ مچ ملنے لگا تو ہندو اکثریت کے علاقوں میں رہنے والے مسلمان حیران و پریشان رہ گئے۔ ان مسلمانوں کی ڈھارس کے لیے اور انھیں سیاسی حمایت مہیا کرنے کے لیے ہی جناح صاحب نے انھیں یہ یقین دہانی کی تھی کہ پاکستان میں ایک مطمئن ہندو اقلیت کا وجود ہندستان میں باقی ماندہ مسلمانوں کے ساتھ اچھے سلوک کی خود بخود ضمانت بن جائے گا۔" [ص ۲۷]

---

(۱) مرزا راشد علی بیگ نے اوپر کے اقتباس میں جناح صاحب کے لیے جملہ استعمال کیا ہے:

"جناح کچھ بھی رہا ہو، مذہبی مجنون ہرگز نہیں تھا۔"

میرے دل میں خیال آیا کہ مجنون لکھنا تو درست نہیں۔ اس کی جگہ متعصب استعمال کرنا چاہیے۔ لیکن معاً مجھے خیال آیا کہ مذہبی متعصب تو وہ کہلاتا ہے جو کوئی مذہب رکھتا ہو جناح صاحب تو بہ قول بیگ صاحب ملحد و ناعقیدہ Agnostic تھے، اس لیے ان کے لیے متعصب کے لفظ کا استعمال بھی درست نہیں۔ یہ سوچ کر اس لفظ کو میں نے مترجم کے استعمال کے مطابق جوں کا توں ہی چھوڑ دیا۔ (ا۔س۔ش)

(۲) مصنف نے اس مقام پر (Ruthless and Cynical) دو لفظ استعمال کیے ہیں۔ اُردو مترجم نے Cynical (منہ پھٹ، بدمزاج) لفظ چھوڑ دیا ہے۔ پہلے لفظ کے معنی ہیں بے رحم، سنگ دل تحریک پاکستان میں ہندو اکثریت کے صوبوں کے مسلمانوں کو استعمال کیا گیا تھا۔ لیکن ان کا مستقبل کیا ہوگا۔ اس بارے میں جناح صاحب نے یہی کہا تھا کہ انھیں اپنی قسمت پر راضی رہنا چاہیے۔ یا یہ کہ انھیں اکثریت

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر......)

بیگ صاحب اسی نظریہ پر عمال پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں!

''ان کے اس استدلال میں ایک Cynicism تھا، جس پر یونہی تنقید کے تیر نہیں برستے رہے ہیں۔ جناح جس کا نام تھا، وہ ایسا کوئی کند ذہن شخص نہیں تھا کہ اسے اپنے ان عقیدت گذاروں کے ذہنی رخ کا اندازہ نہ ہو، جنھیں اس نے خود ہندوؤں سے کٹ کے ایک الگ ریاست بنانے کے راستے پر ڈالا تھا۔ یہ ذہنی رخ کہ وہ اپنے درمیان ہندوؤں کو کس حد تک گوارا کرسکیں گے اور اگر کانگریس

کے صوبوں کے مسلمانوں کو اپنی قربانی دے کر آزاد کرا دینا چاہیے۔ ہندستانی علاقے میں رہ جانے والے مسلمانوں کے لیے جناح صاحب کے خیالات کتنے بلند تھے، چودھری خلیق الزماں لکھتے ہیں:

''ان حالات میں اگر میں نے ہندستان کی مسلم اقلیت کی طرف سے ایک مصالحانہ قدم اٹھایا تھا تو جناح صاحب کا اس پر اعتراض مجھے بالکل حق بہ جانب نظر نہ آیا۔ خصوصاً جب کہ وہ ہندستان کی مسلم اقلیت کو اکثر اپنی گفتگو میں یہ کہہ چکے تھے کہ انھوں نے ان کو رائٹ آف (ختم) کر دیا ہے۔ پھر رائٹ آف شدہ پانچ کروڑ کی اقلیت اگر اپنی بچت کی کوئی معقول صورت نکالنے کی کوشش کرے تو اس پر ان کو چراغ پا ہونے کی کوئی ضرورت نہ تھی۔''

(شاہراہ پاکستان: ص ۱۱۰۶)

یہ بات مسلم اکثریت کے صوبوں کے مسلمانوں کے سوچنے کی نہ تھی۔ ہندو اکثریت کے صوبوں کے مسلمانوں نے سوچی نہ تھی۔ اور یہ رویہ اس لیے بھی ظہور میں آیا تھا کہ پاکستان بننے کی کسی کو امید بھی نہ تھی۔ لیکن پاکستان کا قیام یقینی ہو گیا تو انھیں (مسلم اقلیت کو) اپنے انجام کی فکر ہوئی۔ جناح صاحب نے دراصل متوقع انجام سے ان کی توجہ ہٹانے کے لیے یہ بات کہی کہ تم فکر مت کرو اگر کسی نے تمھاری طرف ٹیڑھی نظر سے دیکھا تو ہم پاکستان میں ہندوؤں کی آنکھیں نکال لیں گے! لیکن یہ محض فریب تھا اور اس کا ردعمل نہایت بھیانک اور عدم تدبر کی بات تھی! جناح صاحب کو اس بات کی سنگینی کا احساس ہو گیا اور دوبارہ ان کی زبان سے یہ بات نہیں سنی گئی! اس کی تکرار ہندو اکثریت کے صوبوں میں لیگ کے رہنماؤں نے کی۔ لیکن جو تیر کمان سے نکل چکا تھا، اسے تو کسی نہ کسی دیوار سے ٹکرانا ہی تھا! میرے علم میں نہیں کہ لیگی رہنماؤں نے ہندستان میں رہ جانے والے مسلمانوں کی جان و مال کے تحفظ اور ان کی فلاح و بہبود کے بارے میں کچھ سوچا بھی ہو!

اور ہندوان کے پروپیگنڈا کیے ہوئے پیمانے کا دسواں بیسواں حصہ بھی اینٹی مسلم تھے تو اپنے ملک کو منقسم دیکھنے کے بعد اس میں کسی قسم کی کمی آنے کا تو سوال ہی نہیں تھا۔ نتیجہ یہ ہے کہ ہندو اقلیت پاکستان سے نکالی جارہی ہے یا انھیں مسلمان بنایا جارہا ہے۔ ادھر ہندستان میں کتنے ہی فرقہ وارانہ فسادات ہوتے چلے آرہے ہیں اور جتنے کا پتا چلتا ہے، اس سے کہیں زیادہ تعداد میں مسلمان مارے جاچکے ہوتے ہیں۔ یہ معلوم کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں ہے کہ کتنے ہندو اور مسلمان اب تک اس ''پُرخون نظریے'' کی بھینٹ چڑھ چکے ہیں۔'' [ص ۲۷]

جناح - مذہب، مسلمان اور پاکستان کے رشتے:

بیگ صاحب ہی کے الفاظ ہیں:

☆ ''جناح صاحب لاادریے تھے اور زندگی کے اخیر تک لاادریے ہی رہے۔

☆ جداگانہ انتخابات سیاسی اسباب کی بنا پر روشناس کیے گئے۔ جناح صاحب انھیں کے زائیدہ اور ایک سیاسی مسلمان تھے۔

☆ مسلمان فرقہ، ان کے لیے حلقۂ انتخاب کی جگہ حاصل کرتا گیا، اور

☆ مسلمان قوم ان کے سیاسی ارادت مند۔

☆ جنگ جو انھوں نے لڑی، سیاسی تھی۔ مسلم لیگ اور کانگریس کے درمیان! اور

☆ پاکستان ان کی سیاسی مانگ تھی، ایک الگ علاقے کے لیے جس پر وہ اور مسلم لیگ حکومت کرسکیں۔

☆ اس سب میں مذہب محض امرِ اتفاقی تھا!'' [ص ۲۸]

بیگ صاحب نے جناح صاحب کے مذہب، سیاست اور مقصدِ حیات کے بارے میں جو نکات تالیف کیے ہیں، وہ ایک طویل بحث کا عطر ہے جو کشید کردیا گیا ہے۔ اگر کوئی صاحب ذوق چاہیں تو مقالہ لکھ سکتے ہیں!

قیام پاکستان میں کانگریس کا حصہ:

قیام پاکستان کے کارنامے کا سارا کریڈٹ پہلے تو جناح صاحب کو دیا گیا۔ پھر انھیں اس جرم کا سزاوار ٹھہرایا گیا اور اب انھیں ناکامیوں کا ذمے دار قرار دے کر انھیں رسوا کیا جاتا ہے۔ حال آں کہ قیام پاکستان میں کانگریس کا حصہ جناح صاحب کے حصے سے کچھ کم نہیں۔ بلکہ بعض اہلِ نظر نے تو جناح صاحب کو اِس ظلم سے مستثنا کر کے صرف کانگریس کو اس کا ذمے دار قرار دیا ہے! ۱۹۳۷ء کے بعد خاص طور پر کانگریس کے ہر سیاسی فیصلے اور اقدام نے پاکستان کی منزل کو قریب سے قریب تر کر دیا ہے۔ بیگ صاحب کے تجزیے سے تو میں اسی نتیجے پر پہنچا ہوں۔

تقسیم اور تقسیم کے بعد:

تقسیم نے جنم جنم کے بندھن کو کاٹ دیا اور بعد میں ہونے والے سارے واقعات کے باوجود،

☆ دونوں ملکوں کے لیے اپنی اپنی صلاحیتوں اور ذرائع کے مطابق آگے بڑھنے کے راستے کھول دیے۔

☆ مسلم لیگ کی ہجرت کے بعد یہاں (ہندستان میں) ایک قومی حکومت بن سکنا ممکن ہوگیا۔

☆ کل ہند سطح پر منصوبہ بندی، جو قومی ترقی کی تنہا بنیاد ہے، ممکن العمل ہی نہ ہو پاتی، اگر کچھ صوبوں میں عدم تعاون پر عامل اور ہر بات پر شک شبہ کرنے والی مسلم لیگی وزارتیں ہوا کرتیں۔

☆ ہندی کبھی قومی زبان نہیں قرار دی جا سکتی تھی اگر مسلم لیگ اردو کی پشت پناہی کے لیے موجود رہتی۔ بلکہ

☆ ہندو مہا سبھا، جن سنگھ اور راشٹریہ سیوک سنگھ کو بھی جناح صاحب کا شکر گزار ہونا چاہیے کہ پاکستان کی تشکیل کے بعد ہی ان کا ہندو احیا کا خواب ممکن ہو سکا ہے۔

☆ اس لیے جو کچھ ہوا میرا یقین واثق ہے کہ دونوں ملکوں کے لیے بہتر سے بہتر ہی ہوا

(بس مسلمانانِ ہندستان ہی کسی حد تک دو استولوں کے درمیان گر پڑے ہیں۔)

ویسے یہ جتنے جھگڑے یا بحث وجدل تھی پڑھے لکھوں اور شہری لیڈروں کے درمیان تھی۔ عام لوگوں کا موقف کیا تھا، کیا وہ پاکستان چاہتے تھے؟ ہندستان بنیادی طور سے دیہاتوں پر مشتمل ہے، جہاں ہندو اور مسلمان دیہاتی صدیوں سے ایک دوسرے کے پہلو بہ پہلو رہتے چلے آئے ہیں، کیا اس طویل عرصے میں ان میں ایسے مضبوط رشتے استوار ہو سکے تھے جو حریص سیاستدانوں کے اکساؤ اور ترغیب کا شکار نہ بن پاتے؟ افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ بات ایسی نہیں تھی، دونوں فرقوں کے درمیان بندھن اس قدر بودے تھے کہ ان کا عدم اور وجود برابر تھا۔ اسے سمجھنے کے لیے ہمیں ہندو اور مسلمان طریق ہائے زندگی اور انداز ہائے فکر کو جانچنا ہوگا۔ یہ عرض کردوں کہ میں یہ بات عمومی انداز پر کہہ رہا ہوں، بلاشبہ بہت سے استثنیٰ بھی مل جائیں گے۔ لیکن استثنیٰ بہرحال استثنیٰ ہی ہوتے ہیں۔ پھر یہ بھی ہے کہ میں اُن دنوں کی بات کر رہا ہوں، برسوں پہلے کی بات، جب جداگانہ انتخابات کے نتیجے میں پیدا شدہ فرقہ واریت کے زخم گہرے ہوتے جارہے تھے۔...

[ص ۳۳، ۳۴]

جداگانہ طریق انتخاب اور کانگریس کا رویہ:

جداگانہ انتخابات نے سیاسی مسلمان اور سیاسی ہندو پیدا کر ڈالے تھے، اب فطری طور سے کوئی وجہ نہیں تھی کہ ایک سیکولر پارٹی عام اور مسلم دونوں نشستوں کے لیے اپنے امیدوار نہ کھڑے کرے: عملی سیاست نے تو اسے ناگزیر بنا دیا تھا، اور منطقی بھی کہ مسلم نشستوں کے لیے کوئی مسلم سیاسی پارٹی مقابلہ کرے۔ مزید برآں، اُس وقت کانگریس قوم پرست اور محبّ وطن بھلے ہی ہو، پر سیکولر تو دور دور نہیں تھی، اس لیے مسلمان ووٹروں نے مسلم لیگ میں جان ڈال دی، اور خیال آتا ہے کہ یہی سلسلہ انجام کار پاکستان کی صورت میں ڈھلتا گیا، لیکن بات ایسی بھی نہیں تھی۔ اس وقت کے مسلمان لیڈر، جو زیادہ تر اعتدال پسند تھے، اتنی دور تک اور ایسی انتہا پسندی کے ساتھ نہیں سوچتے تھے اور ان میں جو زیادہ دوراندیش تھے، جن

میں جناح صاحب ممتاز ترین تھے، وہ خوب سمجھتے تھے کہ اس نظام میں تو مسلمان مستقلاً ایک اقلیت بن جاتے تھے۔ جس کے نتیجے میں بالادستی مضبوط تر ہی کی رہتی۔ اس لیے کم سے کم دو موقعوں پر وہ مشترک انتخاب کے اصول کو مان لینے کے لیے آمادہ ہو گئے تھے۔ لیکن ہندو سیکولر ہو سکتا ہے، اس پر انھیں پورا اعتماد نہیں تھا، اس لیے مسلمان کی ریزرو نشستیں ضرور رہنے دینا چاہتے تھے۔ ایسی حوصلہ افزا اور خوش آیند گفت وشنید کم وبیش دو تین نشستوں کی چٹان پر ٹکرا کے پاش پاش ہوگئی۔ کون جانے اگر ایک بار مسلمانوں کے اندر اعتماد آجاتا تو کیا وہ اپنے اس مطالبے کو ختم نہ کرا دیتے۔

تاہم بات ایسی بھی نہیں تھی کہ سب کچھ کھو گیا ہو، جب مسلم لیگ نے مسلم نشستوں کی بہت بڑی تعداد جیت لی تو مسلمان لیڈر اب اس انداز پر سوچنے لگے کہ قومی حکومت تو وہی ہو سکتی ہے جس میں ہندو مسلمان دونوں کی پوری نمایندگی ہو، اور یہ خوش گوار انداز جبھی ممکن الوقوع ہے جب کانگریس لیگ مخلوط حکومتیں بنیں، لیکن کانگریس کا حال ہی دوسرا تھا۔ ایک عرصے سے جس طاقت کی انھیں طلب تھی جو پاس آ آ کے نکل نکل جاتی تھی، وہ تازہ تازہ انھیں ہاتھ لگی تھی اور اب اس میں انھیں کسی کو بھی شریک کرنا کسی طرح منظور نہ تھا۔ خود انگریزوں کا سیاسی نظام جو اکثریتی پارٹی پر چلتا تھا۔ اس سے انھیں یہ موقف اختیار کرنے میں شہ ملتی تھی۔ اس لیے کانگریس نے بڑی سختی اور مستقل مزاجی کے ساتھ لیگ کے سمجھاؤ کو رد کر دیا۔ آج کون یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہے کہ مشترک ذمے داری بالآخر مشترک تشخص پیدا کرنے میں بھی کامیاب نہ ہو لیتی۔

وقوعے کے بعد عقل آجانا کچھ مشکل نہیں، لیکن بات ہے کچھ یوں ہے کہ خالص برطانوی پارلیمانی انداز کو اختیار نہ کرنا اور دو تین مسلم نشستیں دے کر ایک قومی محاذ میں مسلمانوں کو ساتھ ملا کے چلنا، یہ مسلمانوں کا اعتماد جیتنے کے لیے انتہائی حقیر قیمت تھی جو ادا کر دینی تھی۔ [ص ۳۶۔۳۷]

ہمیں انگریزوں نے منقسم کیا یا...؟

مجھے ہمیشہ اس نظریے پر بے حد توہین کا احساس ہوا ہے کہ انگریزوں نے تقسیم کرو اور

حکومت کرو، پالیسی ہی کے نقطۂ عروج کے طور سے ہندستان کو منقسم کر دیا۔ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ ہمارے لیڈر جن میں مہاتما گاندھی، جواہر لال نہرو، ولبھ بھائی پٹیل، راج گوپال اچاری، جناح اور لیاقت علی خاں جیسے لوگ تھے۔ دراصل شطرنج کے بے جان مہروں کی مانند تھے۔ جنھیں چالاک انگریز بساط سیاست پر ادھر سے ادھر گھماتے رہے تا آں کہ ایک صبح کو وہ جاگے تو پتا چلا کہ کھیل ختم ہو چکا اور پاکستان بن گیا...

یہ بات کہ انگریزوں نے ہمیں منقسم کر کے حکومت کی، اتنی صحیح نہیں، جتنی یہ کہ ہم منقسم تھے اور وہ ہم پر حکومت کرتے تھے۔ انصاف کی بات یہ ہے کہ ان کے ذہن میں پاکستان کبھی نہیں تھا، نہ ہی مسلمانوں کے لیے ان کے کچھ اقدامات کسی سوچی سمجھی عصبیت کا نتیجہ ہوتے تھے، کچھ ضرور رہے ہوں گے اور انھیں کی برکت سے اس آرام دہ نظریے کو تقویت مل جاتی ہے، جس سے اپنی ذمے داری بھی ٹل جاتی ہے اور جرم کی سنگینی بھی کم ہو جاتی ہے۔

تو، اس طرح، پاکستان، حوا کی مانند، ہندستان کی کوکھ سے پیدا کیا گیا۔ یہ کسی طرح بھی ناگزیر نہیں تھا۔ لیکن ہماری اپنی حماقتوں اور کوتاہیوں کے سبب ہی ایسا ہو گیا۔ اور واقعہ یہ ہے، جیسا کہ میں نے پہلے کہا، جیسی صورت حال کہ بنتی چلی تھی اس میں یہ دونوں ملکوں کے لیے بہترین بات ہوئی۔

ایک الم انگیز سانحہ:

لیکن پاکستان کی ٹریجڈی، کم سے کم ہمارے نقطۂ نظر سے، اس کا قیام نہیں، بلکہ اس کا ڈھانچا ہے۔ نصف حصہ ادھر نصف حصہ اُدھر، اور دونوں میں کوئی مشترک بات اتفاق ہی سے مل جائے تو مل جائے! بیچ میں وسیع ہندستان کی زمین پھیلی ہوئی، ایسے میں ایک مشترک تشخص پیدا کرنے کی ایک ہی صورت ہے کہ کسی دشمن کا اور کسی حملہ آور کا تصور تخلیق کر کے اور ذہن میں خطرہ پیدا کر کے دفاعی نفسیات کو مضبوط کیا جاتا رہے، اس لیے پاکستان کے لیے ہندستان مخالف انداز (یا ہندستان دشمنی) ایک سیاسی ضرورت ہو گئی ہے۔

مسئلہ کشمیر:

اگر یہ بات سمجھ لی جائے تو پھر یہ سمجھنے میں بھی مشکل نہیں پڑے گی کہ مسئلہ کشمیر دراصل

مرض نہیں مرض کی علامت ہے۔ اگر یہ پاکستان کی حسب مرضی بھی سلجھا دیا جاتا تو اسے کوئی دوسرا مسئلہ تخلیق کرنا پڑتا۔ یہ سب کچھ سمجھ میں آتا ہے، لیکن یہ نہیں آتا کہ جنگ آزمائی کی انتہا تک جانے کی کیا ضرورت آپڑی تھی۔ پاکستان کو اس سے ہندستان کی بہ نسبت کچھ زیادہ ہی نقصان پہنچا ہے۔ سب سے بڑھ کے یہ ہو گیا کہ صریحی اسباب کی بنا پر اگرچہ دونوں میں قریبی تعلقات کا دور دور تک امکان نہ تھا لیکن جنگ کی پیدا کردہ تلخی نے جو تھوڑے بہت رشتے اور بندھن تھے، انھیں بھی کاٹ دیا۔ یہ بات بہر حال اپنی جگہ پر ہے کہ اگر پاکستان ایک اکائی رہتا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ دونوں ملک اچھے پڑوسیوں کی حیثیت سے نہ رہ سکیں۔

[ص ۳۸، ۳۹]

باب: ۲

محمد علی جناح

ایک معروضی مطالعہ

ڈاکٹر سچدانند سنہا

وہ جناح
جنہیں میں جانتا ہوں
مصنفہ
ڈاکٹر سچدانند سنہا
ترجمہ
احمد یوسف
خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ

ڈاکٹر سچدانند سنہا

ڈاکٹر سچدانند سنہا (۱۰/نومبر ۱۸۷۱ء۔ ۶/مارچ، ۱۸۵۰ء) آرہ۔ صوبہ بہار کے باشندے تھے۔ یورپ میں زمانۂ طالب علمی (۹۲۔۱۸۹۰ء) سے جناح صاحب کے دوستوں میں سے تھے۔ زندگی بھر دونوں کے نہایت مخلصانہ تعلقات رہے اور جناح صاحب کے انتقال کے بعد محبت اور احترام سے انھیں یاد کیا۔ "وہ جناح جنھیں میں جانتا ہوں!" (مترجمہ: احمد یوسف/ ناشر: خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ/ اشاعت ثانی ۱۹۹۸ء/۲۴ص) ان کا ایک رسالہ یادگار ہے۔ ہم نے اس رسالہ سے چند اقتباسات چنے ہیں۔ تفصیلی مطالعے کے لیے رسالے سے رجوع کریں اور مؤلف کے مکمل افکار و معلومات سے ان کے اپنے الفاظ میں مطالعہ فرمائیں۔ خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ (بہار) نے رسالہ چھاپ دیا ہے۔ (ا۔س۔ش)

لندن کی یادیں:

اٹھارھویں صدی کے نویں عشرے کی ابتدا میں لندن میں سیکڑوں ہندستانی طلبہ میں دو گجراتی (مسٹر موہن داس کرم چند گاندھی اور مسٹر محمد علی بھائی جنا بھائی خوجہ) ایسے ہوئے ہیں جنھوں نے انسانی تاریخ میں اپنے نام ثبت کر دیے ہیں... بہار میں میرے احباب کے حلقے میں سیّد علی امام نے ۱۸۸۷ء میں لندن کے لیے بحری سفر اختیار کیا۔ میں دسمبر ۱۸۸۹ء میں لندن کے خیال سے کلکتہ روانہ ہوا، اور محمد علی بھائی جنا بھائی خوجہ وہاں ۱۸۹۲ء میں پہنچے۔ مسٹر علی امام کو ۱۸۹۰ء میں پیشۂ وکالت میں نامزد کیا گیا، مسٹر گاندھی کو ۱۸۹۱ء میں، مجھے ۱۸۹۲ء میں اور مسٹر جناح کو ۱۸۹۷ء میں نامزد کیا گیا، کیوں کہ وہ اس سے پہلے سن بلوغ کو نہیں پہنچے تھے اس وقت مسٹر گاندھی مسٹر علی امام اور مسٹر جناح میں سے ہر ایک، میرے لندن کے قیام کے زمانے میں کچھ دنوں کے لیے میرا اہم عصر رہا اور اس طرح ان تینوں سے میرا رابطہ قایم ہوا۔

ان میں سے ہر ایک نے ہندستانی (اسٹیج پر قابل ذکر کردار ادا کیا)۔

☆ مسٹر گاندھی عالمگیر شہرت کے مہاتما، جو ساری دنیا میں اپنے تقدس اور عدم تشدد کی اشاعت کے سبب جانے گئے۔

☆ مسٹر جناح پہلے ہندستانی الاصل مسلمان تھے، جنھوں نے (خوفناک قوم پرستانہ مخالفت کے مقابلے میں) اپنے ہم مذہبوں کے لیے ہندستان کے نقشے سے ایک آزاد خود مختار ملک نکالنے میں کامیابی حاصل کی اور

☆ سید علی امام ایک انتہائی کامیاب قانون داں، جج، منتظم اور معاملہ فہم تھے۔

☆ میں ان تینوں کی موت کے بعد بھی زندہ ہوں۔ یوں میں ان کی خدمات اور ان کے کارنامے کی وقایع نگاری کر سکتا ہوں۔ کیوں کہ کسی دوسرے شخص کو یہ خصوصیت حاصل

نہیں ہے کہ وہ ان میں سے ہر شخص سے کما حقہ واقف ہو۔ اس حد تک کہ ان کی زندگی کی تابناکیوں اور تاریکیوں کو بخوبی پیش کر سکے۔

موجودہ خاکے میں میں قوم پرست مسٹر جناح کی کچھ یادیں پیش کروں گا۔

دادا بھائی نوروجی کا الیکشن:

مستقبل کے قاید اعظم لندن میں ۱۸۹۲ء میں پہنچے، اس وقت ان کی عمر ۱۶ سال کی تھی اور یہ وہ وقت تھا کہ وہاں جو ہندستانی موجود تھے وہ دادا بھائی نوروجی کے لیے ووٹ حاصل کرنے میں تن دہی سے مصروف تھے۔ دادا بھائی جو مجلس عامہ (ایوان زیریں) کے لیے کھڑے ہوئے تھے مارکویس آف سالسبری نے کچھ پہلے ہندستان اور ہندستانیوں کی تذلیل کی تھی اور وہ اس طرح کہ انھوں نے دادا بھائی نوروجی کو Black Man کہا تھا۔ اس بالقصد توہین پر ہماری برہمی عروج پر تھی اور دادا بھائی کے کارکنوں کی حیثیت سے ہمارے دماغ نہ بھی بہکے ہوں تو ہمارے قدم ضرور بہک گئے تھے۔ جناح جو اس وقت پر جوش نوجوان تھے اور وہ ساری زندگی اسی طرح رہے، اس جدوجہد میں کود گئے۔... جب یہ اعلان ہوا کہ دادا بھائی منتخب ہو گئے۔ ان کے اعزاز میں زبردست ضیافت جو مشہور Nolborn ریسٹوران کے آراستہ و پیراستہ ہال میں رکھی گئی تھی جس میں پانچ سو سے زیادہ مہمان شریک تھے، یہ تقریبِ ضیافت اپنی غیر مشتبہ کامیابی کے لیے خاص طور پر جناح کی احسان مند تھی جو کہ اس تقریب کی تنظیمی کمیٹی کے سکریٹری منتخب ہوئے تھے۔

وطن واپسی:

چناں چہ ۱۸۹۲ء میں گھر واپس آنے سے پہلے جب مجھے بار میں بلایا گیا تھا میں اور جناح اچھے دوست ہو چکے تھے۔ اس کے بعد ہم لوگ ممبئی میں سر فیروز شاہ مہتا کے چیمبر میں ملتے رہے جو کہ ٹھیک ہائی کورٹ کے سامنے واقع تھا اور (فیروز شاہ مہتا کی موت واقع ۱۹۱۵ء تک) ممبئی کا بہت بڑا سیاسی اجتماع گاہ تھا۔...

وہ ایک ایسی جگہ تھی جس کا مقابلہ کرتے ہوئے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ چھوٹے پیمانے پر افلاطون کی درس گاہ تھی، کیوں کہ ہر روز کم از کم چار پانچ گھنٹے سر فیروز شاہ اور ان کے شرکا

جونیروں سے بحث کرتے اور فلسفۂ سیاست بیان کرتے جو اٹھارھویں صدی کے آخری عشرے میں ہندستان کے دایرہ فہم میں تھا۔... اس لیے جناح سے میری گاہے گاہے ملاقات ہوجاتی تھی۔ اس طرح ہم نے اپنے دوستی کے رشتوں کو اور بھی مضبوط بنالیا۔

بیسویں صدی کا آغاز:

دسمبر ۱۹۰۶ء میں انڈین نیشنل کانگریس کا ایک خاص سیشن کلکتہ میں دادا بھائی نوروجی کی صدارت میں منعقد ہوا۔ جو اس مقصد سے لندن سے براہ راست آئے تھے، تاکہ اعتدال پسندوں اور انتہا پسندوں کی متصادم آرا میں اتحاد کا ایک پہلو نکال سکیں۔ کلکتہ کے قیام کے دوران دادا بھائی آنجہانی مہاراجہ بہادر آف دربھنگہ کے مہمان تھے اور مڈلٹن اسٹریٹ کے علاقے میں جو ان کے دو مکان تھے، چھوٹے والے میں وہ ٹھہرے تھے۔

دادا بھائی کے سیکریٹری کی حیثیت سے جناح مہمان خانے میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ اس وقت وہ صرف تیس سال کے تھے۔ طویل قامت، تندرست، وجیہہ، خوش مزاج، حد سے زیادہ احتیاط سے بیرونی لباس میں ملبوس... میں اور وہ کلکتہ میں پرانے دوستوں کی طرح ملے، کانگریس کے اندر بھی اور کانگریس کے باہر بھی۔ اس کے بعد ہمارے دوستانہ تعلقات اور بھی بڑھ گئے۔

۱۹۱۰ء میں مورلے منٹو اصلاحات کے بحال ہونے کے بعد ہم دونوں یعنی جناح اور میں امپیریل لے جس لیٹو کونسل کے ممبر منتخب ہوئے تھے۔ وہ ایک ایسے حلقے سے آئے، جن میں صرف ۴ ممبر تھے (وہ سبھی ممبئی لے جس لیٹو کونسل کے ممبر تھے۔)... ۱۹۱۰ء کے کانگریس سیشن الہ آباد میں جناح نے ایک تجویز پیش کی اور ایک پرزور تقریر میں مورلے منٹو اصلاحات میں مسلمانوں کے لیے علاحدہ رائے دہندگی کی سخت مذمت کی اور ۱۹۱۰ء کے بعد ان کی مراجعت کا دور شروع ہوتا ہے تا آں کہ انھوں نے اپنے قدموں کو قرارداد پاکستان ۱۹۴۰ء میں پیوست پایا اور ۱۹۴۷ء میں انھیں پاکستان کا گورنر جنرل بنا دیکھا۔ لیکن اس کا ذکر بعد میں ہوگا۔

اُس وقت جناح نے مجلس قانون ساز میں اپنا مشہور وقف بل پیش کیا تھا اور پریشان

تھے کہ اسے کچھ غیر مسلم رفقاء کی حمایت مل جائے۔ انھوں نے گوکھلے سے مشورہ کیا۔ جنھوں نے انھیں یہ مشورہ دیا کہ وہ مجھ سے یہ کرنے کو کہیں، میں فوراً راضی ہوگیا کیوں کہ میں نے یہ سوچا تھا کہ جناح دوست تھے اور پریوی کونسل کے ججوں نے اس معاملے میں غلط رائے دی تھی۔ چناں چہ جناح کے بعد میں نے ایک طویل تقریر کی جس میں بل کے خالصتاً قانونی پہلوؤں پر بحث کی۔ میری حمایت کو میرے سبھی رفقاء بالخصوص جناح نے پسند کیا۔ وہ میرے مضامین اور تقاریر کے مجموعے میں شایع ہوچکی ہے۔ اکیلا یہ واقعہ ہمیں بتاتا ہے کہ ہم تعاون کے سلسلے میں اس وقت سے آج تک کس درجے زوال کے شکار ہوئے ہیں۔ لیکن بدقسمتی سے یہ سب کچھ قوم پرستی کی راہ میں خود جناح کی لغزشوں سے ہوا۔

کانگریس کا الٰہ آباد سیشن ۱۹۱۰ء کے کرسمس ہفتے میں منعقد ہوا تھا۔ اور اس وقت تک جناح، میں اور لے جس لیٹو کونسل کے کچھ ممبر تقریباً ایک سال تک کام کرچکے تھے۔ کسی پارٹی کے پیروکار کی حیثیت سے نہیں بلکہ اس عہد کے عظیم ترین سیاسی قاید گوپال کرشن گوکھلے کی قیادت میں، جن کی شخصیت ملک میں ہر شخص سے زیادہ ممتاز تھی۔... گوکھلے نہ تو ہم لوگوں کے گرو تھے اور نہ انتقال (فروری ۱۹۱۵ء) کے بعد رہے ہیں۔ جناح خوش قسمتی سے دوسرے سانچے میں ڈھلے ہوئے تھے۔ اور یہی شے انھیں ان کے اوسط ہم وطنوں سے ممتاز کرتی ہے۔ انھوں نے گوکھلے کو ہمیشہ حد درجے احترام، عزت اور محبت سے نوازا، اور ان کے انتقال کے بعد ان کی یاد کو بھی بے حد عزیز جانا۔ میں نے Sir William Wedderburn صدر کانگریس کے اعزاز میں ایک عشائیہ دیا تھا جس میں تقریباً سبھی بڑے سیاست داں شریک تھے۔ اس میں جناح اپنی تابانی اور درخشانی ہر سو بکھیر رہے تھے، اور ہم سبھوں نے یہ محسوس کیا تھا کہ کچھ سال بعد وہی نیشنل کانگریس کے سیشن کی صدارت کریں گے لیکن تقدیر کو کچھ اور ہی منظور تھا۔

۱۹۱۰ء کی ایک یادگار صحبت:

اس وقت جناح زبردست عقلیت پسند تھے۔ اسی طرح گوکھلے کو سخت قسم کا ''لاادری'' شمار کیا جاتا تھا۔ یکم ستمبر ۱۹۴۱ء کو پونا سے سر رفیع الدین احمد سابق وزیر حکومتِ ممبئی نے ایک

خط میں مجھے یہ تحریر کیا کہ ’’کیا آپ مجھے یہ بتا سکتے ہیں کہ آپ کو کلکتہ کی وہ نشست یاد ہے جو ۱۹۱۰ء میں امپیریل لے جس لیٹو کانگریس کے پہلے سیشن میں اس کی عمارت کے ایک کمرے میں ہوئی تھی اور کیا آپ کو میرے وہ سوال یاد ہیں جو میں نے اس موقعے پر جناح سے ان کے مذہب کے متعلق کیے تھے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس وقت آنجہانی مہاراجہ آف بردوان بھی کمرے میں موجود تھے‘‘؟ میں نے سر رفیع الدین کو جواب دیا کہ مجھے اچھی طرح وہ موقع اور وہ مخصوص واقعہ یاد ہے۔ اسی سلسلے میں یہ وضاحت کرتا ہوں کہ سابق وزیر رفیع الدین جناح کے شکست خوردہ حریف تھے۔ اور انھوں نے پونا سے کلکتہ کا طول طویل سفر اختیار کیا تھا۔ بین طور پر اس غرض سے کہ یہ بات ثابت کر دکھائی جائے کہ جناح اس کے اہل نہیں ہیں کہ ممبئ پریسیڈنسی (بشمول سندھ) کے مسلمانوں کے واحد نمایندے کی حیثیت سے امپیریل لے جس لیٹو کونسل میں شریک ہوں۔

ایک تاریخی انٹرویو:

وہ گفتگو جو رفیع الدین اور جناح کے درمیان ہوئی اسے میں ذیل میں اپنی ڈاری سے نقل کرتا ہوں:

رفیع الدین: مسٹر جناح، آپ اس بات کا دعویٰ کرتے ہیں کہ آپ بمبئ پریسیڈنسی کے مسلمانوں کی نمایندگی کرتے ہیں؟

جناح: کون اس پر شک کرتا ہے؟ آپ کرتے ہیں؟

رفیع الدین: مجھے افسوس ہے کہ آپ جیسے لوگ ان کی نمایندگی کریں گے جو اسلام اور پیغمبر اسلام (صلی اللہ علیہ وسلم) کے متعلق کچھ بھی نہیں جانتے ہیں اور نہ اسلامی احکام کی پیروی کرتے ہیں۔

جناح: یہ آپ کس طرح کہہ سکتے ہیں؟ میں اچھی طرح جانتا ہوں، آپ سے کہیں زیادہ!

رفیع الدین: آپ کے کہنے کے مطابق آپ جانتے ہیں، تو یہ بتائیں کہ آپ عربی یا فارسی جانتے ہیں؟

جناح: مجھے کیا ضرورت ہے عربی یا فارسی جاننے کی؟ میں نہ تو عرب ہوں اور نہ ایرانی، میں تو ہندستانی ہوں اور یوں مجھے کوئی ضرورت نہیں ہے کہ میں عربی یا فارسی جانوں۔

رفیع الدین: لیکن کیا آپ اردو جانتے ہیں؟

جناح: اس حد تک میں ضرور جانتا ہوں کہ میں اپنے چھوکروں اور حمالوں سے بات کر سکوں۔ مجھے اردو میں عدالتوں اور ارکان جیوری سے اردو میں بات نہیں کرنی ہوتی ہے۔ اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ مجھے زیادہ زبان جاننے کی چنداں ضرورت نہیں ہے! ویسے میں گجراتی اچھی طرح جانتا ہوں۔

رفیع الدین: لیکن اگر آپ عربی نہیں جانتے ہیں تو آپ عبادتیں کس طرح کر سکتے ہیں؟

جناح: عربی میں عبادت میں کیوں کروں؟ میں کوئی ایسا زبردست گناہ گار تو نہیں ہوں کہ اپنے گناہوں کی معافی کے لیے برابر عبادت کرتا رہوں۔ قطع نظر اس سے یقینی طور پر میں جس زبان میں بھی اپنی التجا کروں گا خدا اسے سمجھ لے گا۔

رفیع الدین: اور آپ اپنے ملبوسات، کھانے پینے اور مشروبات کے سلسلے میں کیا کہتے ہیں؟ کیا یہ سب شریعت کے مطابق ہیں؟

جناح: لباس کا شریعت سے کیا تعلق؟ یقینی طور پر مختلف مسلم ممالک کے لوگوں کا پہناوا مختلف ہے۔ حتیٰ کہ مسلمانوں میں بھی سبھی مسلمان ایک طرح کا لباس نہیں استعمال کرتے۔ جہاں تک کھانے پینے کا معاملہ ہے اس کا تعلق بیشتر ذاتی پسند و ناپسند، اشتہا اور ہاضمے سے ہے، نہ کہ مذہبی رسم و رواج سے۔

رفیع الدین: (فتح مندی کے عالم میں جناح کی طرف دیکھتے ہوئے) دیکھیے دیکھیے مہاراجہ بہادر (مہاراجہ آف بردوان کی طرف مڑتے ہوئے) اپنے ممبئی کے رفیق کو ملاحظہ فرمائیے اور دیکھیے کہ یہ کیا کہتے ہیں اور کیا دیکھتے ہیں، یہ عربی، فارسی، حد تو یہ ہے کہ اردو بھی نہیں جانتے ہیں۔ یہ کبھی عبادت نہیں کرتے ہیں اور حرام و حلال کو کھانے پینے میں شریعت کا احترام نہیں کرتے ہیں اور آپ اس بات پر غور کیجیے مسٹر سنہا۔ (میری طرف مڑتے

ہوئے)...

میں نہیں جانتا کہ مولوی رفیع الدین جیسا کہ وہ اس زمانے میں خود کو کہتے تھے، مجھے کیا نوٹ کرنے کو کہہ رہے تھے، کیوں کہ ٹھیک اسی وقت تقریباً سبھی معزز ممبران جو ملاقات کے کمرے میں جناح سے سیاست یا دوسرے امور پر گفتگو کر رہے تھے، سبھی کونسل چیمبر میں جمع ہو گئے اور وائسرائے کے نقیب نے اپنی بلند و بانگ آواز میں بانگ لگائی ''وائسرائے'' رفیع الدین اچانک غائب ہو گئے...

رفیع الدین اور جناح کی گفتگو میں جناح کی کشادہ ذہنی اور کردار کی پختگی نے مجھے اس قدر متاثر کیا تھا کہ لے جس لیٹو کونسل سے واپسی میں میں نے اس کا اندراج کر لیا...اب میں متن کو لفظ بہ لفظ پیش کر رہا ہوں۔

جناح صاحب اور مذہب:

اسی طرح مذہب کے معاملے میں جب تک وہ علانیہ مسلم لیگی اور کٹر فرقہ پرست نہیں ہو گئے تھے، اور جناح کے دوسرے دوستوں کا یہ خیال تھا کہ اگر وہ ''لاادری'' بھی ہوں تب بھی وہ دینِ فطرت کے ماننے والے، خدا پرست اور عقلیت پسند ہوں گے۔ اس خیال کی تصدیق بعد میں ۱۹۳۶ء میں ہوئی جب دیال سنگھ کالج یونین، لاہور میں خصوصی مہمان کی حیثیت سے جناح نے ایک رپورٹ کے مطابق کہا کہ

> ''مجھے یہ محسوس ہو رہا ہے کہ میں ان لوگوں کے درمیان آ گیا ہوں جن سے میرا روحانی رشتہ ہے۔ یہ کالج کسی عقیدے کو نہیں مانتا ہے۔ میں خود بھی یہ محسوس کرتا ہوں کہ ہندستان کی نجات غیر فرقہ پرستانہ مسلک میں ہے اور یہی وہ عقیدہ ہے جو میں ماضی میں رکھتا تھا، جو آج بھی ہے اور جو مستقبل میں بھی رہے گا اور جسے میں دل سے عزیز رکھتا ہوں۔''

کیا اس درجے عظیم الشان جذبات کا اتنی عالی ظرفی کے ساتھ کبھی اعلان کیا گیا ہوگا۔ اعلان کہ جس میں زورِ بیان بھی تھا اور عہد و پیمان بھی تھا؟...

لیکن انھوں نے بعد ازیں کیا کہا اور کیا کیا، اس سے ان کے کیریر کے کشادہ ذہن

نقادوں کو اپنی بینائی اسی طرح نہیں کھودینی چاہیے کہ وہ ان کے قوم پرستی کے دور کے شاندار کارناموں کو نظر انداز کردیں۔...

جناح صاحب کا رہن سہن:

میرے احباب کے بڑے حلقے میں جس میں سبھی صوبوں کے لوگ تھے، جناح سرتاپا مغربی طرز کے لباس میں سب سے زیادہ خوش پوشاک انسان تھے۔ اس وقت سے جب سے میں نے انھیں پہلی بار ۱۸۹۲ء میں دیکھا تھا، تقسیم ملک تک جو اگست ۱۹۴۷ء کا واقعہ ہے جب کہ انھوں نے اپنے بیرونی لباس کو عوامی تقریبات کے لیے ترک کرکے مشرقی لباس اپنالیا تھا۔ لیکن انھوں نے پچاس سال سے بھی زیادہ اپنے کپڑوں کی الماری پر خصوصی توجہ دی، جو کافی بھری پری ہوا کرتی تھی۔ ان کے کپڑے بہترین اور مہنگے درزیوں کے یہاں سے سل کرآتے اور اسی طرح لندن کے مہنگے بنیاین فروشوں، کلاہ سازوں اور جوتا فروشوں کے یہاں سے ان کے لیے متعلقہ سامان فراہم کیے جاتے۔ وہ اپنے کپڑوں کے سلسلے میں بے حدنک چڑھے تھے اور کافی عرصے تک انھوں نے خود کو ان کے حصول کے لیے لندن کی ایک انتہائی چھوٹی گلی تک محدود کردیا تھا، جو Saville Row کہلاتی تھی؟ جو ساری دنیا میں اپنی نصف درجن کپڑے سینے والی فرموں کے لیے مشہور تھی۔ جنھوں نے فن خیاطی کو کمال بخشا تھا۔ ان میں سے ایک شاہی درزی Poole's تھا، جو اس وقت تک کسی کا آرڈر نہیں لیتا تھا، جب تک کہ کوئی پرانا گاہک اس کا تعارف نہ کرادے... جناح کپڑے کے معاملے میں بے حد محتاط تھے، کبھی کسی نے ان کے کورٹ آستین یا پینٹ پر شکن نہیں دیکھی تھی...

آخر میں جب وہ مسلم لیگ کے تسلیم شدہ لیڈر ہوگئے تو لیگ کے پلیٹ فارم پر وہ نام نہاد جناح کیپ کا استعمال کرتے (جو ایرانی ٹوپی کی بدلی ہوئی شکل تھی)۔ ایک خراب سلی ہوئی شروانی، اور ڈھیلاڈھالا پائجامہ جو ان کے جسم پر جھول جھال اور بدوضع نظر آتا تھا، جس میں وہ مغربی طرز کے لباس کے مقابلے میں نصف بھی باوقار اور پراثر شخصیت کے مالک نہیں دکھائی دیتے تھے۔ انھوں نے تقریباً اپنی پوری زندگی ہی کو پرتصنع بنادیا تھا''

کھانے پینے میں بے تکلفی:

اگر چہ انھوں نے گورنر جنرل کی حیثیت سے اپنا معیار بدل لیا تھا۔ انھوں نے کھانے پینے اور رہن سہن میں کوئی تبدیلی نہیں کی تھی۔ جب میں ۱۹۴۶ء میں دلی میں ان سے ملا تو انھیں میز پر بے تکلف اور ہمیشہ کی طرح آزاد خیال پایا۔ ان کے سیاسی مسلک میں جو بھی تبدیلی آئی ہو لیکن وہ ہمیشہ ایک عقلیت پسند دکھائی دیتے۔ Mr. George Catlin کی کتاب جس کا نام "In the Path of Mahatma Gandhi" ہے، جو ۱۹۴۸ء میں شایع ہوئی تھی، ہمیں ص ۳۷۱ پر یہ عبارت ملتی ہے:

''وایسرائے ہاؤس کے لمبے کمرے کا عشائیہ ایک شان دار تقریب کا سماں باندھ دیتا تھا، جس میں شراب کا انتخاب رسم کے مطابق اور نہایت معقول کیا گیا تھا، جس سے جناح نے اجتناب نہیں برتا''۔

جناح صاحب کا ذہنی تجزیہ:

یہاں جس ڈنر کا ذکر کیا گیا ہے اس کا اہتمام اپریل ۱۹۴۷ء میں کیا گیا تھا جب کہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن وایسرائے تھے۔ جناح کو منشیات سے کبھی پرہیز نہیں تھا اور نہ وہ کبھی شراب بندی کے حامی رہے، کیوں کہ وہ اس حد تک آزاد خیال اور صاحبِ عقل وفہم تھے کہ وہ یہ سمجھتے تھے کہ جہاں تک ممکن ہو ان ساری نعمتوں سے لطف اندوز ہونا چاہیے۔ جنھیں خدا نے انسان کو بخشا ہے۔

باقی زندگی حتیٰ کہ اپنے آخری دنوں میں بھی جناح کا انداز دلبرانہ تھا اور وہ یار باش تھے۔ مدنیت سے پُر اور خوش اخلاق تھے، اور ان کے لطیفے ان کی بدیہہ گوئی اور قصہ گوئی مجلس کو لالہ زار بنا دیتی تھی، بہر حال باہر کی دنیا میں وہ محتاط رہتے اور عوامی معاملات کو نمٹنے میں درشت بھی ہو جاتے۔

جناح صاحب کا نفسیاتی تجزیہ:

جناح کا مسئلہ (یعنی قوم پرستی سے فرقہ پرستی کی جانب مراجعت) Supego کی

مرضیات کا مطالعہ ہے، جس کے متعلق علم نفسیات کے معالجوں کا خیال ہے کہ یہ لا علاج مرض ہے۔ اس مرض کے آثار ان کے یہاں بہت پہلے دکھائی دیے تھے، لیکن جوں جوں دن گزرتے گئے مرض بد سے بدتر ہوتا گیا...

کوئی تیسرا یا دوسرا کلاس کسی صورت یا کسی ہیئت میں جناح کے لیے پسندیدہ نہیں تھا ان کا جست کرتا ہوا حوصلہ انھیں یہ سمجھاتا تھا کہ وہ ہر جگہ مقدم رہیں یا پھر کچھ نہ رہیں یعنی یہ کہ جناح ہوں تو سب کچھ وہی ہوں اپنی ساری زندگی وہ اپنی اعلیٰ استعداد کے سلسلے میں حد درجے باشعور رہے۔ وہ شخص جس نے خود کو کبھی کسی کے دباؤ میں آنے نہ دیا خواہ کوئی شعبہ یا سرگرمی ہو۔ قانون، سیاست یا سماجی زندگی۔

جناح کسی کے ماتحتی میں کام نہیں کر سکتے تھے۔ وہ یا تو لازمی طور پر قیادت کریں گے یا پھر کہیں نہیں رہیں گے۔ ان کا مطمحِ نظر واضح طور پر یہ تھا کہ جہنم میں حکومت کرنا بہتر ہے، بہ نسبت اس کے کہ دوسروں کے اشتراک سے جنت میں حکومت کریں۔... کرم خوردہ تقسیم شدہ اور کٹے پھٹے پاکستان کا پہلا گورنر جنرل بننا بہتر ہے، بہ نسبت اس کے کہ فیڈریشن آف انڈیا کی سب سے بڑی ریاست کے گورنر یا اس کے گورنر جنرل۔ جناح کی کامیابی میں حیرت انگیز بات یہ تھی کہ وہ اپنی زندگی کے آخری بارہ برسوں میں اسلامیان ہند کے تسلیم شدہ لیڈر رہے کیوں کہ مسلمانوں کے ''اپنے وطن کا فسوں'' اتنا زبردست تھا کہ جب جناح مذہبی جوش اور متشددانہ دیوانگی کی آگ کو بھڑکاتے تو اس کا مقابلہ کرنا، ان کے لیے ناممکن ہو جاتا اور اس طرح واقعات کی منطق کے دباؤ میں آکر جناح بہت سمٹ گئے اور ایک ایسے ملک کے لیے رضامند ہو گئے جس کے نہ صرف یہ کہ دو حصے کر دیے گئے تھے جن کا آپس کا ہزار میل سے بھی زیادہ کا فاصلہ تھا، بلکہ بہت کچھ ان کی مرضی کے خلاف بنگال اور پنجاب کے صوبے سفاکانہ انداز سے بانٹ بھی دیے گئے۔ جناح کی کامیابی کی خاص وجہ تھی، ایک فرد، ایک آواز، ایک نظریہ، ایک مقصد (پاکستان) بہ مقابل کانگریس پارٹی کے بار بار رنگ بدلنے کے، جس نے اپنے اعلان کے ساتھ کہ وہ حق خود اختیاری کے اصول کو تسلیم کرتی ہے۔ یہ بات ماننے کو تیار نہیں ہوئی کہ وہ صوبے یا صوبے کے حصے جو ایک واضح مسلم

اکثریت رکھتے تھے، انھیں یہ استحقاق حاصل ہو کہ اس اصول پر وہ انڈین یونین سے علاحدگی اختیار کر سکیں۔

قوم پرستی سے فرقہ پرستی کی طرف:

کانگریس سے جناح کا انحراف اور ان کا آہستہ آہستہ ایک اعلیٰ پائے کے قوم پرست سے ایک سخت قسم کا فرقہ پرست بن جانا، یہ ایسا موضوع ہے جو پچھلے کئی برسوں سے مختلف ذمے دار شخصیتوں کے درمیان زیر بحث رہا ہے۔ یہاں ہندستان کے موجودہ وزیر اعظم (جواہر لال نہرو) کی رائے پیش کر دینا کافی ہوگا۔ انھوں نے اپنی یہ رائے اپنی مشہور تصنیف "The Discovery of India" میں درج کی ہے، جو دسمبر ۱۹۴۷ء میں شایع ہوئی تھی۔ یعنی اس وقت جب جناح زندہ تھے، انھوں نے اس تصنیف کے صفحہ ۳۰۲ میں لکھا ہے:

> ''جناح نے ہندو مسلم سوال پر نااتفاقی کے سبب کانگریس نہیں چھوڑی بلکہ یوں کہ وہ خود کو نئے اور زیادہ ترقی یافتہ نظریے میں ڈھال نہیں سکے اور اس سے بھی زیادہ یوں کہ وہ ایسی بھیڑ کو ناپسند کرتے، جس کا لباس خستگی اور بدحالی ہو، جو ہندستانی زبان بولتی ہو اور جو کانگریس کا ایک حصہ ہو، سیاست کے معاملے میں ان کا مطمحِ نظر تھا کہ وہ ایک اعلیٰ وارفع قسم کی چیز ہو جو کہ لے جس لیٹو چیمبر اور کمیٹی روم کو زیادہ راست آتی ہو، کچھ برسوں تک وہ مکمل طور پر لوگوں کی نظروں سے چھپ گئے، حتیٰ کہ یہ فیصلہ بھی کر لیا کہ ہمیشہ کے لیے ہندستان چھوڑ دیں گے۔ انگلستان میں بس گئے اور وہاں کئی برس گزارے...''

میرا خیال ہے کہ پنڈت نہرو نے جناح کے کردار کا ہر طرح سے سرتاسر غلط مطالعہ کیا ہے کیوں کہ ان کا جو کردار تھا، اس کے برعکس انھوں نے اسے پیش کیا ہے۔ میں نے اپنے ایک مضمون "Jinnah the Nationalist" میں لکھا تھا کہ اپنے کیریر کی ابتدا سے جناح کے دل کی سب سے بڑی خواہش یہ تھی کہ وہ زندگی کے ہر شعبے اور ہر منطقے میں سب سے

مقدم رہیں۔ گرہن کی طرح وہ سب پر چھا جائیں۔ بقیہ ہر شے معدوم ہو جائے۔ جب تک کہ کانگریسیوں نے انھیں یہ موقع دیا، وہ ان کے ساتھ رہے، لیکن ۱۹۲۰ء میں کانگریس کے نئے لیڈر مہاتما گاندھی کے آنے کے بعد جناح پر جو بے انتہا فراست مند انسان تھے، فی الفور یہ انکشاف ہوا کہ اب کئی وجوہ کی بنا پر یہ قطعی طور پر ناممکن ہے کہ کانگریس میں وہ برتری برقرار رکھیں جو انھوں نے بہت حد تک حاصل کر لی تھی اور وہ بڑی گرم جوشی سے اس بات کے خواہش مند تھے کہ وہ ہمیشہ اسی طرح ایک مقررہ وقت تک قایم رہے۔ جناح کے اس مزاج کا اظہار کانگریس کے سالانہ سیشن منعقدہ دسمبر ۱۹۲۰ء کی کارروائی کے دوران ہوا تھا، جس میں عدم تعاون کی تجویز ایک بڑی اکثریت سے پاس ہوئی تھی اس وقت تک گاندھی جی نے کانگریسیوں کی ایک بڑی اکثریت کے ذہن پر ایسی فرماں روائی حاصل کر لی تھی کہ وہ انھیں مہاتما کہنے لگے تھے!

چناں چہ جب جناح نے اپنی تقریر کے دوران (عدم تعاون کی تجویز کی مخالفت میں) گاندھی جی کا حوالہ دیتے ہوئے انھیں مسٹر گاندھی کہا تو زبردست شور مچا اور حاضرین نے جناح کو چیخ کر کہا کہ وہ گاندھی جی کو مہاتما گاندھی کہیں، یہ افسوس ناک واقعہ سنگین صورت اختیار کر گیا کہ جناح نے حاضرین کے حکم یا ان کے دھونس جمانے کی روش کے آگے جھکنے سے انکار کر دیا تھا۔ اور صدر محترم اور عظیم المرتبت لیکن کہنہ سال "Shri Vijay Raghava Cuariar" اس کشیدہ صورت حال پر قابو نہیں پا سکے۔ نہ تو جلسے کے بپھرے ہوئے شرکا کو اور نہ ہی جناح کو جو گاندھی جی کو مسٹر گاندھی کہہ کر اپنے پارلیمانی حق پر مصر تھے، سمجھانے میں کامیاب ہو سکے۔ اس واقعے کا ذکر کچھ تفصیل سے مسٹر اے۔ اے رؤف نے اپنی تصنیف "Meet Mr. Jinnah" میں کیا ہے اور اسے کانگریس کی رپورٹ میں تفصیل سے درج کیا گیا ہے۔ یہ واقعہ تھا جس کی اہمیت کو سمجھا گیا اور نکتہ رسی سے پسند کیا گیا، گویا مصیبت کی ابتدا تھی، جس نے بالآخر ہندستان کو تقسیم کیا اور پاکستان کو وجود میں لانے کا سبب بنا۔

جناح نے فوراً اس بات کو اپنی گرفت میں لیا کہ کانگریس پر گاندھی جی کا تسلط پورے

طور پر بلاشرکت غیرے قایم ہو چکا ہے۔ اور کوئی بھی (یقینی طور پر انگریز نما جناح بھی) کامیابی سے اس نئے لیڈر کا مقابلہ نہیں کر سکتا ہے، جو مجموعہ ہے تیاگ، علم باطن، امن پسندی، نباتات خوری، مسکرات کی مخالفت، عدم تعاون، عدم تشدد، چرخہ کاتنے اور ترک علایق کا جو ہم آہنگ ہے ہندستان کی آزادی کے حد درجے وطن دوست مطالبے سے۔ جناح کو ایک دم سے یہ احساس ہوا کہ کانگریس کے اوپر مطلق برتری کی جنگ میں جو کہ ایک بے ڈھنگے سبزی خور اور سخت قسم کے مسکرات مخالف سے ہوگی۔ انگریز نما حریف فوراً مات کھا جائیں گے...

سیاسی زندگی کے ایک نئے دور کا آغاز:

اس کے بعد جناح ملک کی عوامی سرگرمیوں سے اس شدت سے مایوس ہوئے کہ وہ پریوی کونسل میں پریکٹس کرنے کی غرض سے لندن میں جا بسے۔ لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ وہ محض موقع کا انتظار کر رہے تھے اور حالات کا جایزہ لے رہے تھے کہ جوں ہی وہ سازگار ہوں گے، وہ ہندستان لوٹ جائیں گے۔... جناح واپس ہوئے اور انھوں نے اپنے لیے ایک اچھی، بری یا غیر متعلق ریاست حاصل کی تاکہ وہ ساری زندگی اس پر حکومت کریں۔

اس وقت کی لیگ کے اندر کی شکست وریخت نے جناح کو ایک موقع فراہم کیا کہ وہ اس کے اوپر اپنا اختیار قایم کر لیں۔... آزردہ خاطر جناح کے ہندستان واپس ہونے کے بعد اور ان کے تحت مسلم لیگ کا استحکام اور اس کی روز بروز بڑھتی ہوئی طاقت اور اقتدار۔ مصیبت یہ تھی کہ مسلم عوام میں جناح کی بڑھتی ہوئی شہرت جس کی بنیاد مطلق فرقے وارانہ تنگ نظری پر تھی۔

لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی رائے:

اس موضوع پر لارڈ ماؤنٹ بیٹن (آخری وایسرے) نے ''رایل انڈین سوسایٹی (لندن)'' میں اکتوبر ۱۹۴۸ء کو اپنے ایڈریس میں حقایق سے پردہ اٹھایا:

''مسٹر جناح نے پہلے لمحے سے یہ بات حد درجے واضح کر دی تھی کہ وہ اپنی

زندگی میں متحدہ ہندستان کو تسلیم نہیں کریں گے۔ انھوں نے تقسیم کا مطالبہ کیا اور پاکستان پر زور دیا۔ دوسری طرف کانگریس جو شدت سے کسی قسم کی تقسیم کی مخالف تھی، متحدہ ہندستان کے موقف پر قایم رہی اور جب تک کہ میں نہیں گیا اس نے کبھی یہ بات نہیں کی کہ وہ اس کے علاوہ کسی اور بات پر غور وخوض کرے گی لیکن جب میں پنڈت نہرو اور مہاتما گاندھی اور دوسروں سے ملا تو انھوں نے اس امر سے اتفاق کیا کہ بغیر خانہ جنگی کے متحدہ ہندستان کو قایم رکھنا ممکن نہیں تھا اور مجھے یقین تھا کہ مسلم لیگ اس کے لیے جنگ کرتی۔ کیوں کہ یہ بات مسٹر جناح نے صاف صاف کہہ دی تھی۔ یوں انھوں نے تقسیم کو مان لیا، لیکن انھوں نے اس پر زور دیا کہ تقسیم اس بات کی بھی یقین دہانی کرائے کہ کوئی غیر مسلم اکثریت کا علاقہ پاکستان میں نہ رہے۔ جس کے معنی صاف صاف یہ ہیں کہ پنجاب اور بنگال جیسے بڑے صوبوں کی تقسیم کی جائے۔

یہ پہلا موقع ہے کہ تقسیم ہند کی اندرونی کہانی اس شخص نے پیش کی ہے، جو اعلیٰ ترین عہدے پر فایز تھا، اس نے اب تک ہندستان کی روشنی نہیں دیکھی ہے اور مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ میں اس لایق ہوں کہ تصدیق شدہ متن کو شایع کر سکوں۔"

سلسلہ جاری رکھتے ہوئے لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے کہا:

"جب میں نے مسٹر جناح سے کہا کہ میرے پاس تقسیم کا ایک عارضی معاہدہ ہے تو وہ بے حد خوش ہوگئے۔ جب میں نے کہا کہ اس کا منطقی نتیجہ یہ ہوگا کہ اس اسکیم میں پنجاب اور بنگال کی تقسیم بھی شامل ہوگی تو انھیں صدمہ پہنچا۔ انھوں نے اس بات کے مضبوط ترین دلایل پیش کیے کہ کیوں ان صوبوں کی تقسیم نہ کی جائے انھوں نے کہا کہ ان کی قومی خصوصیتیں ہیں اور ان کی تقسیم تباہ کن ہوگی۔ میں نے اتفاق کیا لیکن میں نے کہا کہ میں کس درجے سے یہ محسوس کرتا ہوں کہ ان قابل لحاظ امور کا اطلاق پورے ہندستان کی تقسیم پر بھی ہوتا ہے۔ انھوں نے اسے تسلیم

نہیں کیا اور اس بات کی صراحت کرنے لگے کہ ہندستان کی تقسیم کیوں ضروری ہے اور اس طرح ہم لوگ اس کھیل کی طرح جس میں بچے شہتوت کے درخت کے چاروں طرف گھومتے ہیں بار بار اسی نقطے کے چاروں طرف گھومتے رہتے اور بالآخر انھیں یہ احساس ہوا کہ یا تو وہ متحدہ ہندستان لے سکتے ہیں، غیر منقسم پنجاب اور بنگال کے ساتھ یا پھر پاکستان! اور بالآخر انھوں نے ثانی الذکر حل کو منظور کر لیا۔ دراصل یہ وہی پرانی کہانی تھی، بہتر یہ ہے کہ ایسے جہنم میں حکمرانی کرو جہاں تم ہی تم ہو یا پھر جنت میں دوسروں کے ساتھ عروج و ناموری میں شرکت کرو۔ جناح بالکل اسی خیال کے تھے اور اسی طرح انھوں نے اپنی زندگی بسر کی۔''

حرف آخر!

جناح فرقہ پرست اور اس کے مقابل جناح قوم پرست! لیکن میں اور بھی بہت کچھ لکھ سکتا ہوں لیکن میں سمجھتا ہوں کہ میں نے ان دونوں پہلوؤں پر اپنے نقطۂ نظر کی پیشکش میں بہت کچھ لکھا ہے۔ اور میں یہ عرض کرتا ہوں کہ یہ سب صحیح واقعات پر مبنی ہیں۔ جناح جو خوجہ تھے یعنی ان گجراتی ہندوؤں کی نسل سے تھے جنھوں نے اسلام قبول کر لیا تھا، اپنی جملہ صلاحیتوں، خداداد ذہنی اپج، اور قانون دانوں کے درمیان اور ملک کی عوامی زندگی میں ایک بلند مقام رکھتے ہوئے، ضرورت اس امر کی تھی کہ ان کے ساتھ بالکل ہی دوسری نہج سے پیش آیا جاتا، نہ ایسا کہ جس طرح ان کے ساتھ ۱۹۲۰ء کے ناگ پور کے کانگریس کے سیشن میں یا بعد کے دنوں میں جب تنازعہ چل رہا تھا، پیش آیا گیا۔

باب: ۳

مسٹر جناح کا شخصی اور نظریاتی مطالعہ

سری پرکاش

(پاکستان میں ہندستان کے پہلے ہائی کمشنر)

پاکستان
قیام اور ابتدائی حالات
سری پرکاش
ترجمہ محمد حمایت الحسن
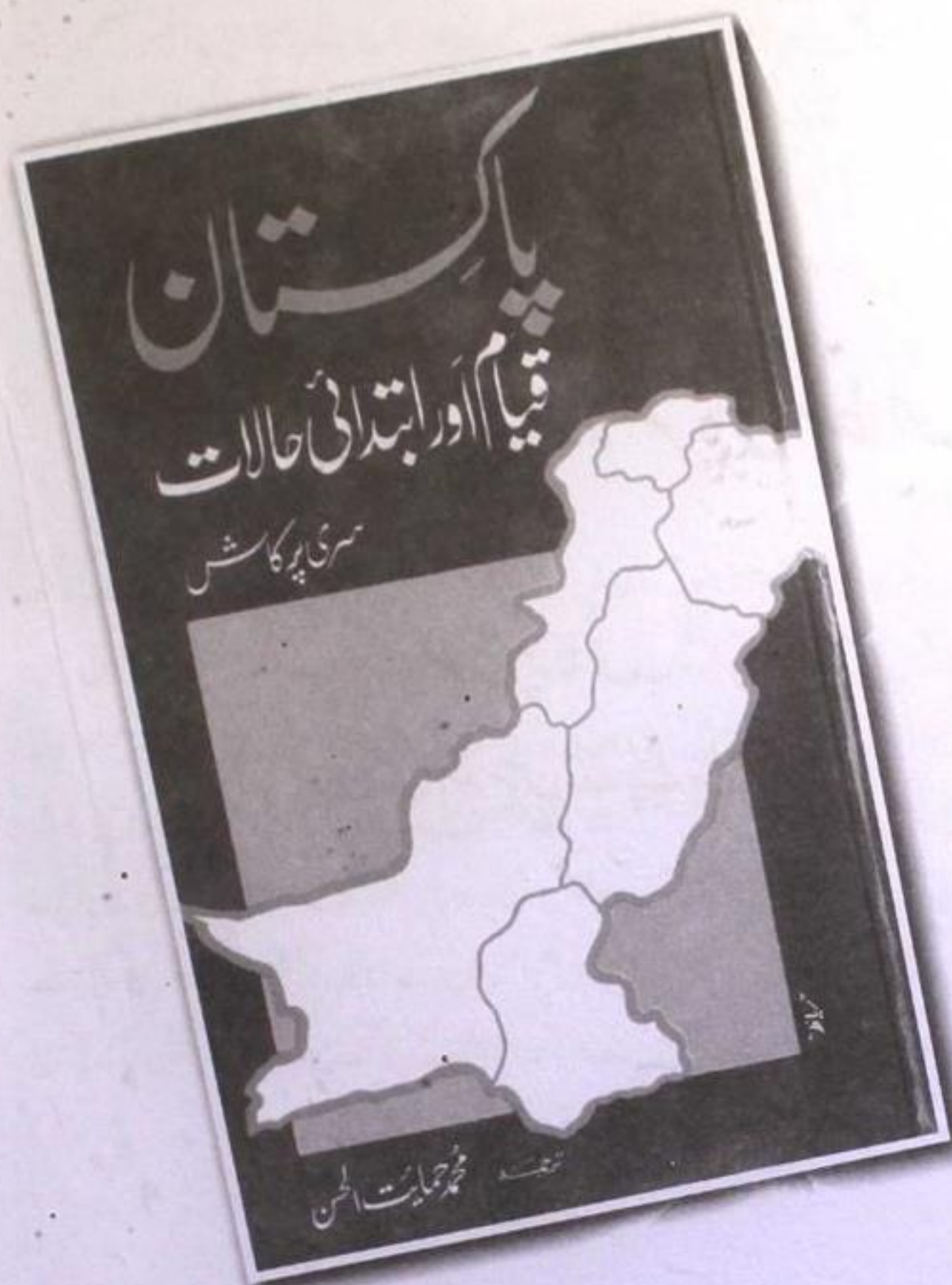
سری پرکاش کا تعارف نامہ

سری پرکاش تحریک آزادی وطن کے سپاہیوں اور اپنے گرد و پیش کے لوگوں میں ایک خاص ذوق و مزاج اور اخلاق و سیرت کی شخصیت تھے۔ ۱۹۴۷ء سے پہلے اور آزادی کے بعد اپنی زندگی کے ۶۰، ۶۵ سال حصولِ آزادی کی جدوجہد اور ملک و قوم کی خدمت میں گزارے تھے اور ہر مرحلے سے کامیاب اور ہر آزمائش سے سرخرو نکلے تھے۔

سری پرکاش ۳ر اگست ۱۸۹۰ء کو بنارس (یوپی) میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کا خاندان علم وتہذیب اور قوم و وطن کے خدمت گزاروں کا ایک خاص اور مشہور خاندان تھا۔ ان کے دادا، والد، چچا، بھائی، کزن کے سوسایٹی میں بڑے رُتبے اور نام تھے۔ خاندان میں ایک بڑی لائبریری تھی۔ گھر کی تربیت، اسکول، کالج اور یونی ورسٹی کی تعلیم اساتذہ کی رہنمائی، لائبریری کی موجودگی، مطالعے کے شوق، ذاتی اپچ، سوسایٹی کے رنگ اور مشاہدات و تجربات سے گزر کر انھیں ایک اعلیٰ تہذیبی، تاریخی اور سیاسی شخصیت بننا ہی تھا اور ایسا ہی ہوا، وہ خاندان کی روایات کے سچے جانشین اور قابل فخر شخص ثابت ہوئے۔

انھوں نے ۱۹۱۱ء میں بنارس یونی ورسٹی سے گریجویشن کیا تھا اور اعلیٰ تعلیم کے لیے لندن چلے گئے تھے اور ۱۹۱۴ء میں کیمبرج یونیورسٹی سے قانون میں ڈگری حاصل کی تھی اور تعلیم ختم ہونے کے بعد وطن لوٹ آئے تھے۔ اوّلاً انھوں نے بنارس کے سنٹرل ہندو کالج میں پڑھانا شروع کیا۔ عجیب بات کہ قانون جوان کا خاص فن تھا، اس کی طرف ان کی توجہ نہ ہوئی! تقریباً دو سال کے بعد انھوں نے کالج سے بھی رشتہ توڑ لیا اور سی وائی چنتامنی جو ''لیڈر''۔ الٰہ آباد کے ایڈیٹر جو نہ صرف مشہور صحافی ہونے کے، وقت کے مدبر بھی تھے، سری پرکاش نے ان کی اسسٹنٹی قبول کرلی۔ وہاں سے نکلے تو موتی لال نہرو کے اخبار ''انڈی پینڈنٹ''۔ الٰہ آباد میں اسسٹنٹ ایڈیٹر بن گئے۔ پھر ان کی توجہ سیاست کی طرف ہوئی تو مسز اینی بیسنٹ کی شاگردی اختیار کرلی۔ مسز اُن کو بیٹے کی طرح عزیز رکھتی تھیں۔ سری پرکاش نے بھی ان کی عزت واحترام میں کمی نہیں کی اور ان سے بہت فیض اُٹھایا۔

سری پرکاش نے تعلیم و تدریس، صحافت و سیاست کے دایروں میں چند سال گزارے تھے۔ یہ نہ ان کی جوانی کا بے بنیاد جوش تھا، نہ ان کی عدم استقامت کی مثال تھی، نہ کسی ذریعۂ

معاش کی تلاش تھی اور نہ ان کی ناسمجھی کی مصروفیات تھیں! درحقیقت یہ زندگی کے ایک عظیم مقصد کے حصول کے لیے میدان میں اُترنے سے پہلے سوسایٹی اور وقت کے تقاضوں اور ضرورتوں کا مختلف پہلوؤں سے مطالعے کا ایک جانا پوچھا اور سوچا سمجھا کورس تھا جسے پورا کرنا انھوں نے نہایت ضروری جانا تھا۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے مولانا غلام رسول مہر کو جب کہ وہ قومی، ملی خدمات کے میدان میں آنے کا ارادہ کر رہے تھے، لکھا تھا:

> ہر وقت اسے پیش نظر رکھیے کہ استقامت اصل کار ہے۔ اگر ایک آدمی فوج کی نوکری قبول نہیں کرتا تو یہ جرم نہیں لیکن اگر سپاہی بن کر میدانِ جنگ میں آ کر پیچھے ہٹتا ہے تو اس کی سزا موت کے سوا کچھ نہیں ہوتی:
>
> ہاں، رہِ عشق است کج رفتن نہ دارد بازگشت
>
> جرم را ایں جا عقوبت ہست و استغفار نیست!
>
> دریا میں اُترنے سے پہلے سب کچھ سوچ لینا چاہیے، لیکن جب اُتر گئے تو پھر موجوں کا شکوہ فضول ہے اور کبھی سنا نہ جائے گا۔ ممکن ہے پہلے ہی غوطے میں خوں خوار نہنگوں سے سامنا ہو جائے، لیکن جو شخص سمندر میں کودتا ہے، اسے نہنگوں کے وجود سے بے خبر نہیں ہونا چاہیے۔"(۱)

سری پرکاش گویا دریا میں اُترنے سے پہلے غور و فکر کے اسی مقام سے گزر رہے تھے۔ سیاست سے انھیں اپنے بزرگوں کی صحبت ہی میں شوق پیدا ہو گیا۔ کانگریس کی سیاسی سرگرمیوں سے فضا معمور تھی۔ ۱۹۱۸ء میں سری پرکاش نے کانگریس کا ممبر بن کر رسمی تعلق پیدا کر لیا تھا۔ اگرچہ کانگریس میں ان کی جدوجہد کا خاص دور ابھی شروع نہیں ہوا تھا۔ مسز اینی بیسنت کی انڈین ہوم رول لیگ سے علاحدگی کے بعد ان کی ساری کوششیں آل انڈیا نیشنل کانگریس کے لیے وقف ہو گئی تھیں۔ ۱۹۲۰ء کے بعد تحریک عدم تعاون میں، ۱۹۳۰ء سے تحریک سول نافرمانی میں انھوں نے سرگرم حصہ لیا تھا اور ۱۹۳۴ء تک پہنچتے پہنچتے انھوں نے اپنی جماعت کے کارکنوں اور رہنماؤں کی توجہ حاصل کر لی تھی کہ ۱۹۳۴ء میں سنٹرل لے جس لیٹو کے لیے کانگریس نے انھیں اپنا نمایندہ مقرر کیا اور وہ کامیاب ہوئے۔ ۱۹۴۵ء میں وہ دوبارہ لے جس لیٹو کونسل کے رُکن مقرر ہوئے۔ ۱۹۱۸ء کے بعد صوبائی اور ملکی سطح پر کانگریس کی کوئی ایسی تحریک نہ تھی جس میں سری پرکاش نے حصہ لیا نہ ہو۔ زندگی کے آغاز ہی سے جب انھوں نے کانگریس کی ضلعی کمیٹی میں حصہ لینا شروع کیا اور پھر صوبائی اور آل انڈیا نیشنل کانگریس کے کل ملکی مسایل اور تحریکات کے اہم کارکن کی حیثیت سے سیاسی سطح پر

(۱) نقش آزاد: ۱۹۵۹ء، ص ۳،۴

نمایاں ہوئے۔ تب ان کی فکر، راے، تدبر، استقامت اور ان کے اخلاص پر کانگریس کے بزرگ و خرد رہنماؤں کا اعتماد پیدا ہوا۔ یہ ان کے تدبر اور بصیرت پر اعتماد ہی کا نتیجہ تھا کہ انھیں آزادی کے بعد پاکستان میں ہندستان کا ہائی کمشنر بنا کر بھیجا گیا تھا۔ یہ ان کے لیے بہت بڑی آزمایش تھی۔

۱۹۳۷ء کے بعد ہندستان کی سیاست کا جو رفتہ رفتہ انداز پیدا ہوا تھا، اس نے ہندستان اور پاکستان کی ہر دو حکومتوں کے چھوٹے بڑے کارپردازوں میں ایک دوسرے پر اعتماد اور اخلاق و تہذیب کا کوئی نشان نہ چھوڑا تھا۔ ایک دوسرے سے بیزاری، نفرت، بدگمانی اور بے اعتمادی کی فضا پورے ملک پر اور زندگی کے ہر گوشے میں عوام تک اس کی تاثیر پھیل گئی تھی۔

سری پرکاش نے ہائی کمشنر کے عہدے پر اپنے فرایض اس خوبی اور قابلیت کے ساتھ ادا کیے تھے کہ پاکستان کی حکومت اور سیاست کے اُونچے درجے میں انھیں پاکستان کا مخلص اور بہی خواہ سمجھا جانے لگا تھا۔ پاکستان کے گورنر جنرل، وزیر اعظم اور سندھ کے لیگی رہنما ان پر اعتماد کرتے تھے۔ انھوں نے اپنی ذات اور رویے سے یہ احساسات دور کر دیے تھے کہ ہندستان پاکستان کا دشمن ہے اور اسے جب موقع ملے گا وہ اسے صفحۂ ہستی سے مٹا دینے کے در پے ہوگا۔ انھوں نے پاکستان میں اپنے فرایض منصبی کو ایسی خوش اسلوبی سے ادا کیا تھا کہ عام سفیر اور ڈپلومیٹ کی حیثیت سے ان کا رویہ بلند اور شکوک و شبہات سے پاک نظر آتا تھا۔

ان کی شخصیت کی بلندی، ان کے اخلاق اور سچائی کا ثبوت ان کی وہ یادداشتیں اور خیالات ہیں جو آزادی کے پندرہ سال بعد "پاکستان: قیام اور ابتدائی حالات"[۱] کے عنوان سے شایع ہوئے۔ یہ ایک سلسلہ مضمون تھا جو اولاً ہندستان ٹائمز میں شایع ہوا اور کتابی شکل میں اس کا ترجمہ مکتبہ جامعہ ملیہ، دہلی سے چھپا تھا۔ میرے سامنے "تخلیقات" لاہور کا ایڈیشن ہے جو مکتبہ جامعہ دہلی کی اشاعت (۱۹۶۸ء) کے مطابق ہے۔ یہ محمد حمایت الحسن کا ترجمہ ہے اور محمد سعید الرحمٰن علوی مرحوم کے "حرفے چند" سے مزین ہے۔ اس کتاب کے معیاری اور صحیح ہونے کے لیے میرے پاس کئی دلایل ہیں:

(۱) نوٹ: پاکستان میں اس کتاب کا ایک اور ایڈیشن "پاکستان بکس اینڈ لٹریری ساؤنڈز: لاہور" سے ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے ذوقِ ترتیب و تعارف کا شاہ کار ۱۹۹۳ء میں شایع ہوا تھا۔ فاضل مرتّب کی فکر اور کتاب کی اہمیت کے بارے میں ان کی راے تو سرورق پر کتاب کے نام اور تعارف کی سطر ہی سے معلوم ہو جاتی ہے: "سری پرکاش اور پاکستان". اس کے نیچے تعارفی سطر: "پاکستان میں ہندستان کے پہلے ہائی کمشنر کے مشاہدات و بیانات پر مبنی سیاسی دستاویز"۔ افسوس کہ مجھے کتاب کے اس ایڈیشن کی اشاعت کا علم نہ تھا اور میں اس سے استفادہ نہ کر سکا۔

۱) میرے اپنے اطمینان کے لیے تو یہی دلیل محکم تھی کہ تاریخ کے طلبہ کے لیے معیاری مضامین اور بلند خیالات کا مجموعہ ہے۔

۲) اسے مکتبہ جامعہ دہلی نے شایع کیا ہے۔ یہ کتاب ۱۹۴۷ء کے بعد کے دور میں ہندستان اور پاکستان کے مفاد میں معیاری اور متوازن خیالات اور تاریخ و اخلاقیات کی کسوٹی پر پوری نہ اُترتی تو یہ ادارہ اس کتاب کو کبھی نہ چھاپتا!

۳) اس کتاب کے معیاری، متوازن اور حقایق پر مبنی مضامین نہ ہوتے تو ہندستان کی صحافت اور اس کے بعد پاکستان اور اس کے بانی کے بارے میں نرم گوشہ رکھنے اور پاکستان کی وکالت کرنے والے سری پرکاش کو کبھی معاف نہ کرتے اور اسی طرح کسی پاکستانی نقاد نے بھی مؤلف کے کسی بیان کو چیلنج نہیں کیا۔

یہ اس بات کے ثبوت ہیں کہ ہندستان اور پاکستان کے مابین یہ ایک متوازن اور گوارا کتاب ہے۔ اہل پاکستان کو اس کا مطالعہ ضرور کرنا چاہیے۔ پھر اگر کسی پاکستانی یا ہندستانی کو اس میں کوئی بیان اُن کے ذوق و فکر اور معلومات کے مطابق نظر نہ آئے تو وہ اطمینان رکھیں کہ سری پرکاش نے اپنے مطالعے، مشاہدے اور تجربے کے مطابق بس ایک تاریخ لکھی ہے گیتا نہیں اور اس کے مؤلف خدا کی مخلوق میں انسانوں کی نسل سے تعلق رکھتے ہیں اور انسان خطا و نسیان کا پتلا ہے۔

میں اس سلسلے میں صرف یہ عرض کروں گا کہ سری پرکاش نے اپنے ذہن اور قلم کو بہت تہذیب و شرافت سے استعمال کیا ہے۔ اسی کتاب میں بہت خوبیاں ہیں جن سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ بعض باتیں حیرت انگیز، بصیرت افروز، قابل غور اور نہایت سبق آموز ہیں اور بعض باتیں قطعی حقیقت ہیں اور اسی اعتبار سے نہایت کڑوی بھی ہیں، جنھیں حلق سے نیچے نہیں اُتارا جاسکتا۔ ان سب باتوں پر بحث و نظر، نقد و تبصرہ اور وضاحت کے لیے نہ وقت ہے نہ کتاب میں گنجایش!

ہمیں آں جہانی سری پرکاش کی نیک نیتی پر یقین رکھنا چاہیے اور تالیف کتاب کے مقصد کو اپنے مطالعہ و تحریر کے شوق سے آگے بڑھ کر اپنی زندگی کا محبوب مقصد بنالینا چاہیے کہ اب ان دونوں ممالک کے درمیان اچھے تعلقات اور اعتماد کی دائمی فضا ہو۔ اسی پر انسانیت کی بقا اور اس کی عزت و حرمت کا دارومدار ہے اور جیسا کہ صاحب تالیف نے فرمایا:

> ''مجھے امید ہے کہ جس نیت سے یہ کتاب شایع کی گئی ہے، وہ پوری ہو جائے گی اور قارئین کرام ان واقعات پر غور کرسکیں گے، جن سے تقسیم ملک کی نوبت آئی! اور یہ سب مل جائے گا کہ آیندہ کوئی غلطی نہ کریں جس کا خمیازہ بھگتنا پڑے اور

ملک ٹکڑے ٹکڑے ہو کر رہ جائے۔ ہمارے ملک کو نہ صرف تہذیب و تمدن کے نقطۂ نظر، بلکہ سیاسی نقطۂ نظر سے بھی متحد رہنے کی ضرورت ہے۔''

تفصیلی مطالعے کے لیے ہمیں اصل کتاب سے رجوع کرنا اور بصیرت حاصل کرنا چاہیے۔

میں یہاں صرف چند باتوں کی طرف اشارہ کروں گا:

۱) جناح صاحب سے ابتدائی ملاقات میں سری پرکاش نے اپنے باپ دادا کا ذکر کیا کہ ان کے احباب میں مسلمان شامل تھے۔ وہ ان پر اعتماد کرتے تھے اور ان کو چچا کہتے تھے! جناح صاحب نے اس کے جواب میں نہایت شفقت کے لہجے میں کہا:

''جس طرح تمھارے دادا کے مسلمان احباب تھے، اسی طرح میں تمھیں بتاتا ہوں کہ میرے احباب میں صرف ہندو ہیں!''

۲) ایک مرتبہ سری پرکاش کی جناح صاحب سے ملاقات ہوئی تو وہ شغل فرما رہے تھے، انھوں نے سری پرکاش کو بھی پیش کش کی! سری پرکاش نے جواب دیا، وہ شراب نہیں پیتے!

۳) جناح صاحب کی زندگی کی جس آخری شب کی شام کو وہ زیارت سے کراچی پہنچے اُس وقت فرانسیسی سفارت خانے میں شراب پارٹی ہو رہی تھی۔ سری پرکاش نے نواب زادہ لیاقت علی خاں سے مسٹر جناح کے آنے کا ذکر کیا تو انھوں نے کہا کہ مسٹر جناح سادہ مزاج آدمی ہیں اس لیے انھوں نے پسند نہیں کیا کہ ان کی آمد کے وقت ہنگامہ ہو!

پھر اسی رات کے چوتھے پہر کی روداد کے بارے میں لکھتے ہیں:

''۱۲ر ستمبر ۱۹۴۸ء کی صبح چار بجے ہوں گے... میرے ٹیلی فون کی گھنٹی مسلسل بجنے لگی۔ میں نے ٹیلی فون اُٹھایا۔ گورنمنٹ آف پاکستان کا ایک سیکرٹری بول رہا تھا۔ سنیے! مسٹر سری پرکاش!... کا انتقال ہوگیا۔ (توصیفی لفظ قابل بیان نہ تھا) [سری پرکاش سمجھ نہ سکے] اس لیے پوچھا کون؟ جواب ملا ''قایدِ اعظم'' میں نے کہا، شاید آپ غلطی پر ہیں، یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ کل شام کو میں، آپ، سب پارٹی میں تھے اور ''آپ'' نے مجھے یقین دلایا تھا کہ مسٹر جناح اچھے ہیں!''

قابلِ غور بات یہ ہے کہ جناح صاحب کے زیارت سے آنے کا ذکر لیاقت علی خاں سے آیا تھا۔ وفات کی اطلاع ایک سیکرٹری سے منسوب کی جاتی ہے اور اس رودکد میں صاف لکھتے ہیں کہ ''آپ نے مجھے یقین دلایا تھا کہ جناح صاحب اچھے ہیں'' اب غور کیجیے کہ یہ گفتگو کون کر رہا ہے۔ یہ زبان، انداز لہجے اور اگلے انتظامات اور ذمے داری کی فکر کس کی تھی؟ سیکرٹری کی یا کسی اور بلند مقام شخصیت کی؟ یہ کیوں کر تسلیم کر لیا جا سکتا ہے کہ شام کی

گفتگو کی یاددہانی سیکرٹری کو کرائی جائے اور وہ جواب میں شراب پارٹی کے ذکر پر ڈنر کے ذکر کا اضافہ بھی کر دے۔ پھر وہ رات گئے میٹنگ میں جانشینی کے فیصلے اور اس سلسلے کے انتظامات کی ضرورتوں کا ذکر بھی کر دے۔ جب کہ اس تفصیل کا پتا نہیں چلتا۔ رات کی میٹنگ میں شرکاء کی تفصیل سامنے نہیں۔ کچھ پتا نہیں چلتا کہ اس میں وزیروں، سیکرٹریوں، بیوروکریٹوں، خفیہ محکموں کے اعلیٰ حکام، فوج کے عہدے داروں، عالمی سفرا، ڈپلومیٹوں اور دیگر غیر سرکاری اہم اور صاحب رسوخ شخصیات میں کون کون لوگ شریک تھے۔ معلوم یہ ہوتا ہے کہ چند مخصوص اور ہم خیال و ہم راز لوگوں نے فیصلہ کر لیا تھا اور کب کیا تھا۔ شاید حقیقت یہ تھی کہ فیصلہ پہلے ہی کر لیا گیا تھا، اس کے لیے ضروری انتظامات بھی اور ہر طرح کی تیاریاں بھی ہو چکی تھیں۔ گروپ کے تمام لوگ مطمئن تھے، بے چینی کسی کو نہ تھی سب کو اپنے سرگروہ، رہنما اور انھیں ایک آزاد ملک کے بااختیار مناصب سے سرافراز کرنے والے اور محسن کی آخری سانس نہ آنے کی خبر کے منتظر تھے۔

سری پرکاش کے سوال کا آخری جملہ یہ تھا:

آپ نے مجھے یقین دلایا تھا کہ مسٹر جناح اچھے ہیں، پھر یہ خبر کیسی؟

ہوم سیکرٹری صاحب کا جواب یہ تھا۔

''...صرف پارٹی ہی نہیں، بلکہ ہم لوگ کھانے کے لیے (بھی) مدعو تھے۔ آدھی رات کو انتقال کی خبر ملی۔ میں ابھی گورنمنٹ ہاؤس سے اس کی تحقیق [فیصلہ] کر کے آ رہا ہوں کہ کون جانشین ہوگا! میں آپ سے پرمٹ مانگ رہا ہوں تا کہ دہلی سے نئے گورنر جنرل اور دوسرے اراکین ہوائی جہاز سے یہاں آ سکیں۔'' (خواجہ ناظم الدین جو اس وقت مشرقی پاکستان کے چیف منسٹر تھے اور دہلی گئے ہوئے تھے۔ اب پاکستان کا گورنر جنرل بنانے کے لیے انھیں کراچی لایا جانا تھا۔ ان کے ساتھ ان کا عملہ بھی جسے اسی وقت تو ان کے ساتھ کراچی (مغربی پاکستان، ہی آنا تھا) اس جملہ معترضہ پر اتنا تو اور سوچنا چاہیے کہ سری پرکاش نے ان کے نام کے ساتھ ''گورنر جنرل'' لکھا ہے، ان کا پورا جملہ یہ ہے:

''اس وقت گورنر جنرل معہود خواجہ ناظم الدین جو اس وقت مشرقی پاکستان کے چیف منسٹر تھے۔''

قارئین کرام غور فرمائیں کہ اتنے اعتماد، معلومات اور یقین کے ساتھ یہ گفتگو کون کر سکتا ہے؟ ایک سیکرٹری یا لیاقت علی خاں جیسی باعتبار اور نظام حکومت پر چھائی ہوئی کوئی اور شخصیت؟ اس سے یہ نتیجہ بھی نکلتا ہے کہ سری پرکاش نے بہت تھوڑے عرصے میں پاکستان کی بااختیار اور موثر انتظامیہ میں رسوخ پیدا کر لیا تھا۔

۴) اس بات نے مجھے بہت حیرت میں ڈالا کہ جناح صاحب نے پہلے ہی یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ گورنر جنرل کے عہدے سے فارغ ہونے کے بعد اپنی بقیہ زندگی اپنے قدیم اور محبوب شہر بمبئی میں گزاریں گے۔ یہ بات انھوں نے نہ صرف سری پرکاش سے اپنی گفتگو کے دوران کہی تھی بلکہ اس سے پہلے ۱۵ر دسمبر ۱۹۴۷ء کو خالق دینا ہال۔ کراچی میں جب کہ آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کا آخری اجلاس، منعقد ہوا تھا جس کا سب سے اہم فیصلہ یہ تھا کہ ہندستان کے لیگیوں کو اپنے گرد و پیش اور ملکی تقاضوں کے مطابق اپنی قیادت کا انتظام کر لینا چاہیے [1] لیکن اس اجلاس کی سب سے اہم بات یہ تھی کہ انھوں نے کونسل کے اراکین سے گفتگو کرتے ہوئے اس حقیقت اور عزم کا اظہار کیا تھا کہ گورنر جنرل کے منصب سے فارغ ہونے کے بعد وہ اپنی بقیہ زندگی کا حصہ اپنے قدیم اور محبوب شہر بمبئی میں گزاریں گے۔

مجھے یقین ہے کہ جناح صاحب نے سری پرکاش سے اپنے جس عزم اور ارادے کا اظہار کیا تھا وہ سچ تھا۔ کوئی شخص اتنا بے حس اور پتھر دل نہیں ہوسکتا کہ اپنے وطن مالوف کو بھول جائے۔ کاش وہ مسلم اقلیت کے مسلمانوں کے لیے بھی یہ راہ کھول دیتے! اور پاکستان کی تحریک میں انھیں بے تحاشا استعمال نہ کرتے!

---

(۱) ٹھیک اسی زمانے میں جمعیت علمائے ہند کے زیر اہتمام آل مسلم پارٹیز کانفرنس لکھنو کے انعقاد کا انتظام کیا جا رہا تھا۔ مسئلہ یہ تھا کہ حالات اور وقت کے تقاضوں کے مطابق آزاد ہندستان میں مسلمانوں کا موقف اور طرزِ سیاست کیا ہو؟ اس سلسلہ میں مسلم لیگ کو بھی کانفرنس میں شرکت کی دعوت دی گئی تھی۔ اس وقت تک مسلم لیگ کونسل نے مستقبل کے سیاسی موقف اور اپنے طرز سیاست کا فیصلہ نہیں کیا۔ ہندستان کے لیے بھی وہی لیگ تھی جس نے پاکستان بنوایا اور ملک تقسیم کرایا تھا، اب اس کا مرکز کراچی تھا اور جناح صاحب حسب سابق اس کے صدر تھے۔ ہندستان میں لیگ کے باقیات نے ضابطے کے مطابق کانفرنس میں حصہ لینے کے لیے اپنے صدر سے اجازت چاہی تھی اور صدر نے لیگ کے نمایندے کی حیثیت میں انھیں شریک ہونے سے روک دیا تھا۔ لیگ کے مقامی نمایندوں نے کارپردازانِ کانفرنس سے بہ حیثیت نمایندگان لیگ کانفرنس میں شرکت سے اپنی معذوری ظاہر کر دی لیکن بہ طور مبصر شریک ہونے کی اجازت چاہی۔ وہ انھیں مل گئی اور اسی حیثیت میں وہ شریک ہوئے۔

پاکستان میں لگی کونسل کا اجلاس ۱۵ر دسمبر ۱۹۴۷ء میں کراچی کے خالق دینا ہال میں منعقد ہوا تھا اور ہندستان میں لیگ کے ارکان کو حالات اور وقت کے تقاضے کے مطابق نظام و مقاصد میں تبدیلی کا حق دے دیا گیا تھا۔ (اب.ش)

سری پرکاش نے اپنی کتاب میں ایک عنوان ''چند ناخوش گوار تاثرات'' بھی رکھا ہے۔ نہیں کہہ سکتا کہ یہ ناخوش گواری ان کے لیے ہے یا کتاب کے قارئین کے لیے؟ بہر حال جو کچھ بھی ہے حیرت انگیز ہے اور سبق آموز بھی! میں یہاں ''مشتے نمونہ از خروارے'' اس باب کا ایک اندراج پیش کرتا ہوں۔ کتاب کے فاضل مولف لکھتے ہیں:

۱) ''جو لوگ میرے پاس اکثر آیا کرتے تھے، ان میں ایک رانی جونا گڑھ بھی تھیں، میرا خیال ہے کہ نواب صاحب کی نظر التفات ان کی طرف کم تھی۔ وہ اپنے ہمراہ ایک لڑکے کو لایا کرتی تھیں اور ہمیشہ درخواست کیا کرتی تھیں کہ میں وزارتِ امور داخلہ دہلی پر یا بہ الفاظ دیگر سردار پٹیل پر زور ڈالوں کہ یہ بچہ جونا گڑھ کا گدی نشین بنا دیا جائے! انھوں نے مجھے یقین دلایا تھا کہ وہ ہندستان میں شمولیت چاہتی ہیں۔

مجھے یاد ہے کہ میں نے اسی مضمون کا ایک خط سردار پٹیل کو لکھا۔ ان کا جواب آیا کہ میں ان لوگوں کو ہدایت کروں کہ وہ اس جھگڑے میں نہ پڑیں اور اس سے کنارہ کش رہیں۔ ورنہ ہندستان کی سرزمین پر قدم رکھتے ہی ان کی گرفتاری کا خطرہ ہے!''

اسی تسلسل میں سری پرکاش نے یہ بھی لکھا ہے:

نواب صاحب (جونا گڑھ) کا ایک داماد بھی اپنے خسر کا پیغام لے کر آیا کرتا تھا کہ میں سردار صاحب کو لکھ دوں کہ وہ نواب صاحب کے کتوں کی نگہ داشت کا انتظام کر دیں۔

پاکستان کے حصے میں جونا گڑھ ریاست تو نہیں آئی، اس کی رانی اور مہاراجہ آئے تھے، جنھیں مذاق اور سیاست میں تمیز کا شعور بھی نہ تھا۔ کتنے افسوس کی بات ہے کہ پاکستان نے یو این او میں جونا گڑھ پر ہندستان کے غاصبانہ و جارحانہ قبضے کے خلاف مقدمہ دائر کر رکھا تھا اور جونا گڑھ کی ایک رانی اپنے بیٹے کو راج گدی پر بٹھانے کے صلے میں ریاست ہی کو ہندستان کے حوالے کر دینا چاہتی ہیں اور خود نواب صاحب سردار پٹیل کو خط پر خط لکھوا رہے تھے کہ کتوں کی دیکھ بھال اور ان کی صحت و عافیت سے غفلت نہ برتی جائے!

کاش نواب صاحب کو کتوں کے بجائے اپنی رعایا کی اصلاح و بہبود سے اتنی دل چسپی ہوتی!

۲) سری پرکاش کی جناح صاحب سے ایک بحث میں ایک بڑی بات قطعی طور پر ثابت ہوگئی کہ پاکستان کو اسلامی ریاست بنانے کا مقصد جناح صاحب کے سامنے ہرگز نہیں تھا۔ یہ کوئی انکشاف نہیں ہے لیکن بعض ہٹ دھرم طبائع اس کو نہیں مانتے، ان کے منہ پر جناح صاحب کا یہ بیان مار دینا چاہیے۔ مذہب کا کوئی تصور نہ جناح صاحب کے ذہن میں تھا اور نہ اسلامی نظام حکومت کے قیام کے عزم کے اظہار سے کبھی ان کی زبان آشنا ہوئی تھی۔ ان کا

پاکستان کو ایک جدید سیکولر ریاست بنانے کا ارادہ تھا اور اس کی بنیاد انھوں نے اپنی ۱۱ر اگست ۱۹۴۷ء کی تقریر میں رکھ دی تھی۔ [۱] ملک کی تقسیم اور پاکستان کا مطالبہ جناح صاحب کا ایک ردعمل تھا جس میں تدبر و بصیرت کی روشنی کی ایک کرن اور ملک و قوم کی بہی خواہی کا کوئی جذبہ نہ تھا۔

اب میں سعید الرحمٰن علوی کے اس بیان پر یہ بحث ختم کرتا ہوں۔ ان کا خیال ہے کہ سری پرکاش کے تمام افکار و خیالات سے اتفاق نہیں کیا جا سکتا، لیکن اس میں بھی شبہ نہیں کہ تاریخ کے طلبہ کے لیے اس میں بہ ہر طور بڑا مواد ہے۔ اس قسم کی کتابوں کی اشاعت کا سب سے بڑا مقصد یہی ہے کہ نسل نو ایک مخصوص قسم کے نصابی کورس سے ماورا ہو کر حالات کا از خود تجربہ کرے۔ اس ضمن میں یہ کتاب بڑی مفید ثابت ہوگی۔

میں نے اپنی زیر نظر تالیف میں سری پرکاش کی کتاب سے ایک حد تک استفادہ کیا ہے۔ اس کے چند اقتباس اگلے صفحات ہی سے آپ کے مطالعے میں آئیں گے اور ان سے کہیں زیادہ ان کے افکار و خیالات سے مختلف مسایل و مباحث میں استدلال کیا ہے۔ مطالعہ فرمایئے۔ (ا-س-ش)

---

(۱) آج ہم خود بھی سوچتے ہیں کہ آج ۶۲ برس کے بعد جناح صاحب کی اس فکر کی پاکستان کے لیے عملی قدر و قیمت کیا ہے؟ اور اگر نہیں سوچتے تو سنجیدگی کے ساتھ سوچنا چاہیے اور تاریخ کے تجربات سے سبق حاصل کرنا اور فایدہ اٹھانا چاہیے۔ خواہ اس کا تجربہ کسی دوست یا دشمن نے کیا ہو، خواہ اپنے یا بیگانے نے کیا ہو!

جناح صاحب سے چند یادگار ملاقاتیں

''جوں ہی میں نے ان سے کہا کہ میں آپ کی قیام گاہ پر آپ سے ملنا چاہتا ہوں انھوں نے فوراً تاریخ اور وقت کا تعین کر دیا۔ اسی کے مطابق میں گیا۔ ایک گھنٹہ میری ان کی بات چیت ہوتی رہی۔ حال آں کہ بہت سے مسلم لیگی کارکن ان سے ملاقات کے منتظر تھے۔ میری ان کی گفتگو کھل کر ہوئی۔ مجھے یقین ہے کہ باوجود میری قدامت پسندی اور قدیم طرزِ معاشرت کے میں مسلمانوں کا دوست سمجھا جاتا تھا۔ کم از کم اتنا تو میں کہہ ہی سکتا ہوں کہ میرے دل میں مسلمانوں کے خلاف تعصب نہیں ہے۔

جناح صاحب کے دوست صرف ہندو تھے!

آغاز گفتگو میں میں نے ان کو یقین دلایا کہ میرے دل میں ان کی بڑی عزت ہے۔ یہ بھی ان کے گوش گزار کیا کہ میرے خاندان اور مسلمانوں کے تعلقات کتنے گہرے ہیں۔ نہ صرف میرے وطن بنارس ہی میں بلکہ اس کے باہر بھی۔ میں نے یہ بھی ذکر کیا کہ مجھے خوب یاد ہے کہ میرے بچپن میں میرے دادا کے مسلم احباب کی میرے یہاں بہت آمد ورفت رہتی تھی اور میرے والد وغیرہ ان کو چچا کہہ کر خطاب کرتے تھے، میں نے یہ بھی ان سے کہا کہ میرے دادا کے دوستوں میں بانی علی گڑھ کالج، سر سید احمد بھی تھے۔ مسٹر جناح نے جواب دیا کہ میں خود بھی کانگریس کا ایک ممتاز ممبر رہ چکا ہوں۔ ظاہر ہے کہ اب اس سے علیحدہ ہو جانے کے کوئی خاص وجوہ ہوں گے۔ یہ کہہ کر وہ بہت شفقت آمیز لہجے میں بولے کہ جس طرح تمھارے دادا کے مسلمان احباب تھے اسی طرح میں تمھیں بتاتا ہوں کہ میرے احباب صرف ہندو ہیں۔ [ص ۱۵]

گورنر ہاؤس کراچی کی ایک دعوت:

ستمبر ۱۹۴۷ء میں دورہ کرتا ہوا حیدر آباد (سندھ) پہنچا۔ سادھو وسوانی کا یہی مستقر تھا۔ ان کی ایک مرید عورت کو کسی نے قتل کر ڈالا تھا۔ میں تعزیت کے لیے گیا تھا۔

یہیں مجھے ایک ضروری پیغام بذریعہ ٹیلی فون ملا کہ گورنر جنرل مسٹر جناح مجھ سے ملنا چاہتے ہیں اور فلاں تاریخ کھانے کے لیے مدعو کیا ہے۔ صدر سلطنت کا دعوت نامہ دراصل ایک قسم کا حکم ہوتا ہے۔ چوں کہ ڈپلومیٹک زمرے میں میں بھی تھا اور اس گروہ سے توقع کی جاتی ہے کہ ایسی بڑی ہستی کے ساتھ انتہائی خوش خلقی سے ملے۔ اس لیے میں اپنا دروہ منسوخ کر کے کراچی واپس گیا۔ مسٹر جناح نے گورنمنٹ ہاؤس کا نظم ونسق بالکل یوروپین طرز معاشرت کے مطابق رکھا تھا جس سے میں ہنوز یک لخت نابلد تھا۔ وہاں کی ہر چیز میرے لیے نئی تھی۔ اولاً تو میں بنارس کے ایسے قدیم تہذیب وتمدن والے شہر کا باشندہ تھا۔ ثانیاً پچھلی تیس سالہ سیاسی زندگی کانگریس میں گزری جو حکومت برطانیہ سے ترک موالات کر رہی تھی۔ ان حالات میں گورنمنٹ ہاؤس کے معاملات سے میں مطلقاً ناآشنا تھا۔

میرا گمان تھا کہ یہ پرائیویٹ دعوت ہوگی لیکن وہاں پہنچنے پر پتا چلا کہ اور بہت سے حضرات مدعو تھے۔ ڈنر سے پہلے سب مہمان ایک صف میں کھڑے ہوئے۔ مسٹر جناح اور ان کی بہن مس فاطمہ جناح آئیں اور سب سے مصافحہ کیا۔ چوں کہ میں صرف ترکاری کھاتا ہوں اس لیے میرے لیے ذرا دقت تھی۔ اعلیٰ قسم کی شرابیں خوب صورت بوتلوں میں تھیں۔ شرابوں کے نام چاندی کی چھوٹی چھوٹی تختیوں پر کھدے ہوئے تھے۔ یہ تختیاں چاندی کی زنجیروں میں بوتلوں پر لٹک رہی تھیں۔ شراب کا دور چل رہا تھا۔ کچھ مہمانوں نے تو اپنے گلاس بھر لیے اور نہ پینے والے آگے بڑھا دیتے تھے۔ یہ چیز پہلی بار میرے دیکھنے میں آئی۔ کھانے سے فراغت کر کے ہم لوگ ڈرائنگ روم میں اکٹھے ہوئے۔

مسٹر جناح اپنے مہمانوں سے ملنے کے لیے خود نہیں اٹھے۔ وہ ایک گدے دار صوفے پر بیٹھے ہوئے تھے اور فرداً فرداً ان لوگوں کو بلاتے جو ان کے منظور نظر تھے۔ ان لوگوں کی فہرست ایک یورپین افسر کے ہاتھ میں تھی جو غالباً ان کا ملٹری سیکریٹری تھا۔ دیگر حضرات

ادھر ادھر کھڑے تھے۔

ایک مکالمہ:

سب سے پہلے مجھے بازیابی ہوئی اور میں ان کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔ انھوں نے بڑے اخلاق سے پوچھا ''مسٹر سری پرکاش'' کیسے ہو؟ تم سے بہت دنوں بعد ملاقات ہوئی۔ پہلے تو میں نے ان کی عنایت کا شکریہ ادا کیا پھر بتایا کہ میں ایک دلچسپ دورے پر تھا اور ضلع لاڑکانہ میں موہن جوداڑو تک گھوم آیا، جہاں ہماری چھ ہزار سال قبل تہذیب وتمدن کے آثار پائے جاتے ہیں۔ میں نے انھیں بتایا کہ مشہور ماہر آثارِ قدیمہ ڈاکٹر بینرجی، جنھوں نے اس کا پتا لگایا تھا۔ ان کا لیکچر میں نے بنارس میں سنا تھا، جس سے پہلی بار مجھے اس تہذیب وتمدن کا علم ہوا۔ پھر میں نے خود مسٹر جناح کا شکریہ ادا کیا۔ نیز دوسرے حکام کا جنھوں نے ہمیشہ میرے ساتھ بہت خوش خلقی کا برتاؤ رکھا۔ مسٹر جناح نے کہا کہ تم جہاں بھی جانا چاہو جا سکتے ہو، اور حکومت تمھارے لیے ہر قسم کی سہولتیں مہیا کردے گی۔ میں نے کہا اگرچہ یہ ہم لوگوں کی بدقسمتی ہے لیکن جب تک میں زندہ ہوں دونوں ریاستوں کو ہرگز الگ الگ نہ سمجھوں گا۔ میں ہمیشہ ''انڈیا'' کو ایک ہی ملک کہوں گا اور باشندگان پاکستان کو اپنے بھائی اور ہم وطن! میں نے یہ بھی کہا کہ میں کبھی نہیں بھول سکتا کہ آپ کا کانگریس سے تعلق ایک ممتاز لیڈر کی حیثیت سے رہ چکا ہے، اور میرے دل میں آپ کا احترام جیسا پہلے رہا ہے ویسا ہی ہمیشہ رہے گا۔

اسلامی یا مسلم ریاست:

پھر میں نے کہا کہ میں آپ سے ایک بات کہنا چاہتا ہوں بہ شرطے کہ آپ برا نہ مانیں، اور قبل اس کے کہ میں جو کہنا چاہتا ہوں آپ سے خواستگار عفو ہوں۔ اگر آپ اجازت دیں تو عرض کروں۔ انھوں نے کہا ضرور کہو۔ ہر وقت تو مجھ کو چاپلوس گھیرے رہتے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ کوئی دوست تو ملے جو صاف گو ہو۔ جو کہنا چاہتے ہو ضرور کہو۔ اس جواب سے میری ہمت بڑھی۔ پھر بھی اپنے ڈپلومیٹک عہدے کو مدنظر رکھتے ہوئے میں متردد تھا۔ اس لیے میں نے کہا کہ میں آپ کا بہی خواہ ہوں اور مجھے یقین ہے کہ آپ کو غلط فہمی نہ ہوگی۔

ان کے دوبارہ یقین دلانے پر میں نے کہا کہ (اور اتنی مدت گزر جانے کے بعد وہ الفاظ ہنوز مجھے یاد ہیں) کہ ''میں یہ جانتا ہوں کہ مذہبی اختلافات کی بنیاد پر یہ بٹوارا ہوا ہے۔ اب اس تقسیم کی تکمیل ہو جانے پر اس بات پر کیوں زور دیا جائے کہ یہ اسلامی حکومت ہے۔'' میں نے یہ کہنے کی بھی جرأت کی کہ ''اگر اس پر زور نہ دیا جائے کہ یہ اسلامی حکومت ہے تو غیر مسلم یہاں سے نہ بھاگیں گے'' پھر میں نے اپنے تاثرات اور چشم دید حالات کا تذکرہ کیا کہ ملک کے اندرونی حصے کیسے ویران پڑے ہیں، اور خود ایسے ہزاروں آدمیوں سے میرا سابقہ پڑا ہے جو اپنا سب کچھ چھوڑ کر بھاگے جا رہے ہیں۔ اس پر انھوں نے کہا کہ ''میں نے لفظ ''اسلامی'' کبھی نہیں استعمال کیا ہے۔ تم ایک ذمے دار افسر ہو اور یہ بتانا تمھارا فرض ہے کہ میں نے کہاں ایسا کہا ہے؟'' میں نے جواباً کہا کہ وزیر اعظم پاکستان نواب زادہ لیاقت علی خان نے کہا تھا کہ پاکستان ایک اسلامی حکومت ہے۔ مسٹر جناح نے کہا کہ ''تب تم لیاقت علی سے نمٹو۔ مجھ سے کیوں جھگڑ رہے ہو؟'' میں خاموش نہیں رہا بلکہ کہا کہ ''خود آپ نے اپنے نشریے میں ۳۱ راگست کو لاہور میں کہا تھا کہ پاکستان اسلامی حکومت ہے'' مسٹر جناح کو کامل یقین تھا کہ انھوں نے پاکستان کو ''اسلامی ریاست'' کبھی نہیں کہا تھا۔ چناں چہ انھوں نے جواب دیا کہ ''اصل بیان مجھے دکھاؤ'' یہ کہہ کر فوراً اٹھ کھڑے ہوئے اور چہرہ غضب ناک ہو گیا، اور نہایت معمولی طریقے سے مجھے رخصت کر دیا۔

میری بدقسمتی کہ مجھے کامل وثوق تھا کہ انھوں نے اپنے نشریے میں لفظ ''اسلامی'' استعمال کیا تھا۔ صبح ہوتے ہی میں کراچی کے ایک مشہور اخبار کے ہندو ایڈیٹر کے پاس جن سے میں خوب شناسا تھا، پہنچا۔ ان سے شروع ستمبر کے اخبار کی کاپی مانگی جس پر وہ پورا نشریہ شایع ہوا تھا۔ ایڈیٹر ٹوہ لگانے لگا کہ یہ معاملہ کیا ہے۔ تب میں نے بصیغۂ راز شب گزشتہ مسٹر جناح سے انٹرویو کا تذکرہ کر دیا۔ یہ بھی سوے اتفاق ہے کہ بعض اخبار نویس اس نوعیت کے معاملے کو ہضم نہیں کر سکتے۔ چناں چہ اس نے اپنے اخبار میں میرا انٹرویو شایع کر دیا اس کے بعد مجھے مسٹر جناح کا خط ملا جس میں انھوں نے حق بہ جانب شکایت کی تھی کہ میں نے ڈنر کے بعد کی گفتگو اخبار میں شایع کرا دی۔ مجھے خود بھی ایڈیٹر پر بہت غصہ تھا لیکن میرے پاس

کوئی چارۂ کار نہ تھا۔ میں نے مسٹر جناح سے بہت معافی چاہی اور اخبار کا وہ تراشا بھی ملفوف کر دیا (جس میں ان کی نشری تقریر چھپی تھی)۔

ریفرنس کی تلاش:

اس اخبار کا میں نے بہت غور سے مطالعہ کیا۔ یہ بالکل صحیح ہے کہ لفظ ''اسلامی'' کا استعمال مسٹر جناح نے ایک بار بھی نہیں کیا تھا۔ ہاں لفظ ''مسلم'' کا پانچ چھ بار اعادہ کیا تھا۔ میں نے اپنی غلطی پر اظہار افسوس کیا۔ ''مسلم'' اور ''اسلامی'' میں مجھے تشابہ ہو گیا تھا، اگرچہ عوام کی نظروں میں دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ بالخصوص جب کہ وزیر اعظم (پاکستان) اپنی تقریروں میں دونوں لفظ استعمال کرتے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس مسئلے پر مسٹر جناح نے کوئی مداخلت نہیں کی۔

مسٹر جناح نے میرے اس خط کا جواب ہی نہیں دیا۔ لیکن میں اپنے دل میں دونوں کا فرق سمجھ رہا تھا۔ اب بھی میں اپنے دعوے کا کوئی ثبوت نہیں پیش کر سکتا لیکن ایک ممتاز قانون دان ہونے کی وجہ سے مسٹر جناح ان دونوں لفظوں کا نازک فرق سمجھ رہے تھے۔ میں نے یہ رائے قایم کی اور ہنوز اس پر قایم ہوں کہ مسلم حکومت وہ ہے جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہو اور عنانِ سلطنت اسی مذہب کے متبعین کے اختیار و اقتدار میں ہو۔ دوسری صورت ہے کہ اسلامی قوانین کے مطابق نظم و نسق ہو اور انھیں احکام کی پابندی بھی کی جاتی ہو۔ یہ ریاست ''اسلامی ریاست'' ہوگی خواہ وہاں غیر مسلم آبادی کی اکثریت ہو۔ مسٹر جناح کا یہ نظریہ ہوگا کہ چوں کہ پاکستان میں مسلم آبادی بڑی اکثریت رکھتی ہے اس لیے یہ ''مسلم ریاست'' ہے اور انتظامی سلطنت مسلمانوں ہی کے قبضۂ قدرت میں رہنا چاہیے۔ چوں کہ ان کی تعلیم و تربیت جدید حالات اور قوانین کے ماحول میں ہوئی تھی اس وجہ سے انھوں نے یہ سمجھا کہ موجودہ نظام سلطنت میں تیرہ چودہ سو برس پیشتر کے احکامات نئے ملک اور فضا میں سازگار ثابت نہ ہوں گے۔ یہ میرا ذاتی نظریہ ہے اور ہنوز مجھے اس پر کامل اعتماد نہیں ہے۔

[ص ۵۹-۵۶]

جناح صاحب مصنف کی نظر میں:

''مسٹر جناح دنیا کی ان معدودے چند ہستیوں میں تھے جنھوں نے از سر نو ایک آزاد ملک بنایا جو دنیا کے نقشے پر ثبت ہو گیا۔ ان کی زندگی کے آخری ایام خوش گوار نہ تھے۔ وہ بالکل تنہائی محسوس کرنے لگے تھے۔ ان کے دوست اِنے گِنے تھے۔ کیوں کہ وہ ہر ایک کے ساتھ مساوات برداشت ہی نہیں کر سکتے تھے۔ ایک مقنن اور ایک وکیل کی حیثیت سے وہ حالات حاضرہ کی وجہ سے افسردہ رہتے تھے جن کو بر بنائے خود داری و تمکنت وہ ظاہر نہیں ہونے دیتے تھے۔ غالباً یہ ان کے وہم و گمان میں بھی نہ ہوگا کہ مرد، عورتیں اور بچے اتنے وسیع پیمانے پر لاکھوں کی تعداد میں اپنا گھر بار چھوڑ کر چل دیں گے اور اس قدر خون ریزی اور سفا کی وقوع میں آئے گی۔ لیکن خدا کی مرضی یہی تھی۔ مسٹر جناح اب دنیا میں نہیں رہے اس لیے ان کا ذکر اچھے الفاظ میں کرنا چاہیے۔ خدا ان کی روح کو سکون عطا فرمائے۔'' [ص ۱۰۴]

باب: ۴

سیکولر اور وطن پرست جناح

ڈاکٹر اجیت جاوید۔ دہلی
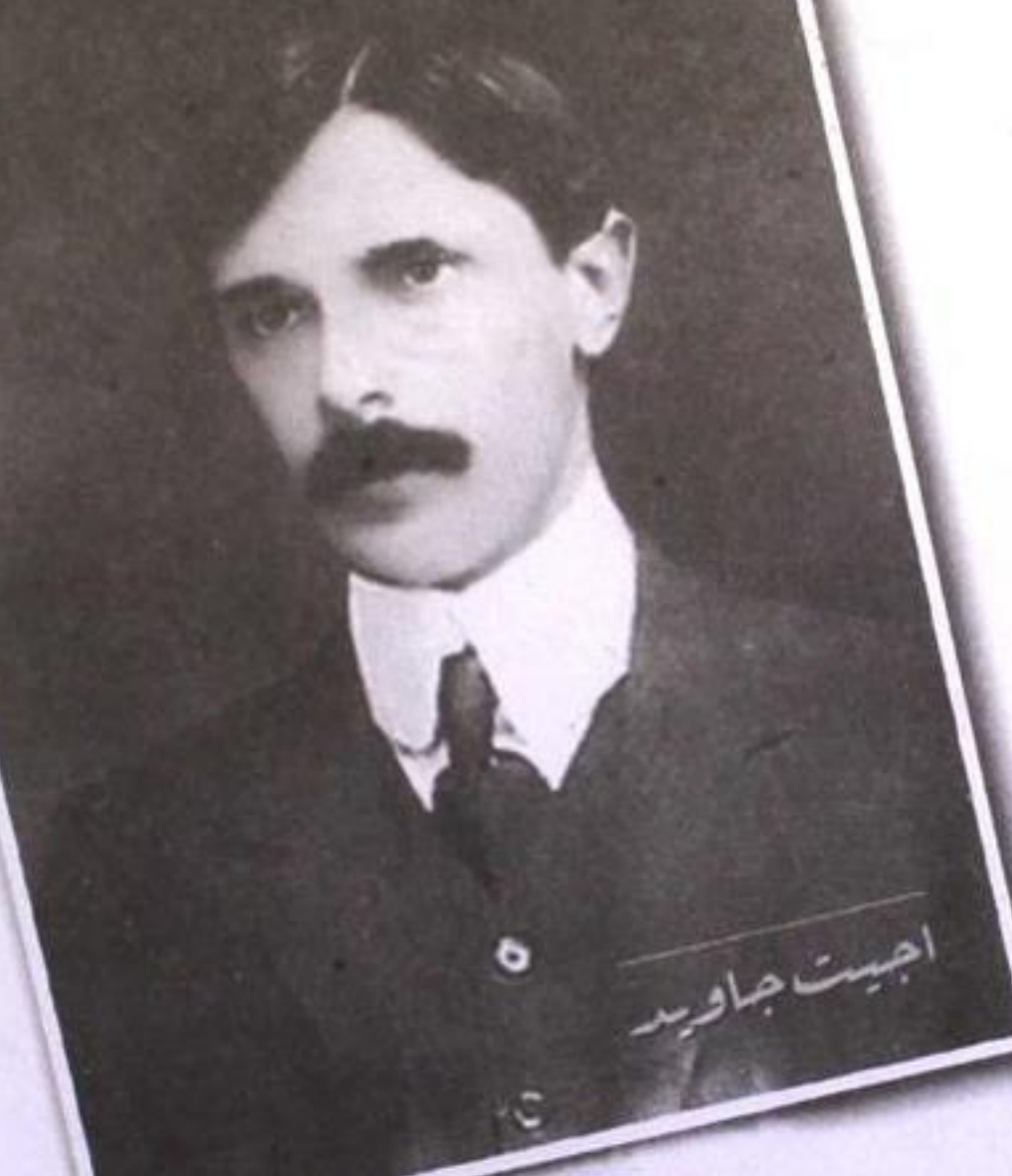
وطن پرست اور سیکولر جناح
اجیت جاوید

پیش رس

خاک سار اہلِ سنت دیوبند کے سیاسی مدرسۂ فکر کا عقیدت مند ہے اور دیوبند کے بزرگوں کے افکار کی بلندی، اعمال میں اخلاص اور خدمات کی وسعت وعظمت کا معترف، اس نقطۂ نظر سے میں نے برِاعظم ہند پاکستان کی سیاسی شخصیات، تحریکات قومی اور اداراتِ ملّی کا مطالعہ کیا ہے۔ میں نے سب کو پڑھا ہے اور بزرگوں سے سب کا احترام کرنا سیکھا ہے۔ سب کے بارے میں میری ایک رائے ہے۔ عناد کسی سے نہیں، جس کسی میں جو اچھائی ہے، اس کی قدر کرتا ہوں۔

شیخ الہند مولانا محمود حسن، مولانا سید حسین احمد مدنی، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا عبیداللہ سندھی، مولانا مفتی کفایت اللہ شاہ جہان پوری ثم دہلوی، جمعیت علمائے ہند کی دیگر شخصیات اور ان کے علاوہ مولانا سیّد عطاء اللہ شاہ بخاری، خان عبدالغفار خان، خان عبدالصمد خان اچک زئی، اللہ بخش سومرو شہید، مولانا داؤد غزنوی، مولانا عبدالقادر قصوری وغیرہم میرے آئیڈیلز ہیں۔ میں نے ان میں سے بعض بزرگوں کے تعارف، ان کے افکار پر تبصرے اور خدمات کے تعارف میں بہت کچھ لکھا ہے۔ لیکن جب ۱۹۶۰ء کے لگ بھگ میں نے تصنیف وتالیف کا شغل اختیار کیا تھا، تو یہ عہد کیا تھا کہ وقت کی عملی سیاست میں کبھی حصہ نہیں لوں گا اور سیاسی اور مذہبی بحثوں میں کبھی نہیں پڑوں گا۔

اس کے ساتھ ہی میں نے اپنے مطالعے اور تصنیف وتالیف کی سرگرمیوں کی حد بھی ۱۵/اگست ۱۹۴۷ء مقرر کردی تھی۔ میں کہنا یہ چاہتا ہوں کہ میں نے اپنا موضوع سیاست کو نہیں، تاریخ سیاسیاتِ ملتِ اسلامیۂ ہند کو قرار دیا ہے اور جس طرح اس کی آخری حد مقرر کردی تھی، اسی طرح اس سفرِ علمی اور مشغلۂ تصنیف وتالیف کے آغاز کی تاریخ کا ایک پتھر نصب کرلیا تھا۔ اور وہ ہے حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی ولادت کا واقعہ ۱۷۰۴ء!

اگرچہ حضرت شاہ صاحب بھی اپنے فکر ودعوت کا ایک عظیم الشان پس منظر رکھتے تھے اور وہ خود بھی دعوت احیاے ملت اور قومی زندگی کے ازسرِنو قیام کی تحریک کی ایک درمیانی کڑی تھے۔ لیکن میں اپنے لیے عمل کے دایرے کو اس سے زیادہ طویل وعریض نہیں کرسکتا تھا۔

الحمدللہ! میں آج تک اپنے اس عہد پر قایم ہوں۔ گزشتہ نصف صدی کی مدت میں، نہ

میں نے اس دایرے سے قدم باہر نکالا، نہ کسی سیاسی جماعت، تحریک یا شخصیت سے کوئی تعلق رکھا اور کبھی کسی جلسہ وجلوس میں شریک بھی نہیں ہوا۔

اپنے بارے میں یہ وضاحت میں نے اس لیے کی کہ بانی پاکستان مسٹر محمد علی جناح بھی اس دور کی ایک اہم شخصیت تھے اور کئی پہلوؤں سے وہ میرے مطالعے میں آئے اور مطالعے کے آغاز ہی میں ان کے بارے میں ان کی شخصیت کے سیاسی اور غیر سیاسی پہلوؤں کے اعتبار سے میری ایک رائے قایم ہوگئی تھی اور اتفاق یہ کہ بعد کے مطالعے سے میری رائے پختہ سے پختہ تر ہوتی رہی، ذہن میں پڑی ہوئی کوئی گرہ کھلتی تو کیا کبھی ڈھیلی بھی نہیں پڑی لیکن دنیا میں بہ شمول دنیا، ہر وہ چیز جو پیدا ہوئی ہے، اس کی انتہا بھی مقدر ہے، اس لیے یہ کیسے ممکن تھا کہ میرے دل میں اگر کوئی بات بیٹھ گئی تھی تو یقین کر لیتا کہ اس میں شکست وریخت کا کوئی عمل نہیں ہوگا اور وہ اپنی انتہا کو نہیں پہنچے گی۔ میرے عقیدے کے مطابق یہ بات ضرور پیش آنی تھی اور وہ آگئی!

حال ہی میں ڈاکٹر اجیت جاوید کی تالیف "سیکولر اور وطن پرست جناح" میرے مطالعے میں آئی، جس نے میرے خیالات کی کایا پلٹ دی۔ بانی پاکستان مسٹر محمد علی جناح پر آں موصوفہ کی یہ تالیف جامعیت کی مثال، تحقیق کا شاہ کار اور ایک یادگار پیش کش ہے۔ جناح صاحب کی شخصیت ان کے سوانح وسیرت کے اہم اجزا، سیاسی افکار کے عہد بہ عہد ارتقا اور شکست وریخت کے عمل اور خدمات قوم وملت کے تعارف میں یہ کتاب موضوع عصبہ شخصیت سے اخلاص ومحبت کے جس جذبے کے جس جذبے سے تالیف ہوئی ہے، اس کی مثال نہیں۔ جناح صاحب کے حوالے سے سیاسی لٹریچر میں یہ ایک ناقابل فراموش اضافہ ہے۔

ایسا لٹریچر اردو میں بہت کم شایقین کے مطالعے میں آیا ہوگا۔ اس لیے میرے دل میں یہ خیال آیا کہ کسی پبلشر کو پاکستان میں کم از کم اس کے اردو ترجمے کی اشاعت کی طرف توجہ دلاؤں، لیکن جب یہ تحریک پیدا کرنے کا موقع آیا تو معلوم ہوا کہ لاہور کے ایک بلند خیال پبلشر نے تو اس کے دہلی ایڈیشن کا عکس چھاپ دیا ہے۔

میں نے زیر نظر مجموعے میں ڈاکٹر اجیت جاوید کی اس گراں مایہ تالیف سے بہت استفادہ کیا ہے اور کئی ابواب کی تلخیص میں ان کے مطالب کا عطر کشید کر لیا ہے، اور نقل واقتباس سے اپنی تالیف کی تزئین میں اس حد تک استفادہ کیا ہے کہ ڈاکٹر صاحب موصوفہ کے لیے رائیلٹی کے مطالبے کا جواز پیدا ہوگیا ہے۔ اگر وہ رائیلٹی کا مطالبہ کر دیں تو میرے لیے راہِ فرار مسدود!

میں ڈاکٹر اجیت جاوید کو ان کی اس گراں قدر تالیف پر مبارک باد پیش کرتا ہوں اور خاک سار نے زیادہ سے زیادہ ان کی تالیف سے جو استفادہ کیا ہے، اس کے لیے ان کا شکر گذار ہوں۔

یہاں یہ وضاحت کرنا بھی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پاکستان کے اکثر مسلم لیگی دانشور ڈاکٹر اجیت جاوید کی اس کتاب کی تعریف و توصیف میں رطب اللسان ہیں۔ معروف مسلم لیگی دانشور، ادیب اور صحافی جناب شریف فاروق (ایڈیٹر روزنامہ **جہاد** پشاور) نے اپنی تصنیف **قاید اعظم جناح– برصغیر کا مردِ حریت** (مکتبۂ اتحاد، پشاور/ ۲۰۰۶ء/ ۵۳۲ص) میں ڈاکٹر اجیت جاوید کی کتاب سے بھرپور استفادہ کیا ہے۔ انھوں نے اجیت جاوید کی کتاب کے بارے میں جو ریمارکس دیے ہیں، وہ حسبِ ذیل ہیں:

> ''دہلی یونیورسٹی کی پروفیسر ڈاکٹر اجیت جاوید کی کتاب Jinnah: Secular and Nationalist میں انھوں نے جس جرأت مندانہ حقیقت پسندی سے کام لیتے ہوئے قایداعظم کی جدوجہد حیات پر روشنی ڈالی ہے، وہ قابلِ صد ستایش ہے۔ ہمارے نزدیک اس کا اہم ترین اعتراف ڈاکٹر اجیت سے ایک امریکی سکالر نے یہ کہہ کر قطعی درست کیا:
>
> I had decided never to visit Jinnah's Pakistan but after reading "Jinnah: Secular and Nationalist" I have changed my mind and will visit Jinnah's Pakistan."
>
> قایداعظم جناح اور تحریک پاکستان کے خلاف جو بے بنیاد مہمیں چلائی گئیں اس کے اثرات سے یہ امریکی سکالر بھی نجات حاصل نہ کر سکتے اگر انھوں نے ڈاکٹر اجیت کی تصنیف کا مطالعہ نہ کیا ہوتا!
>
> اے کاش! بھارت میں ڈاکٹر اجیت جیسے اور بھی حقیقت پسند اہل قلم سامنے آتے تو پاکستان اور بھارت کے درمیان نہ تو جنگیں ہوتیں، نہ نفرتیں اور تعصّبات پھیلتے، نہ مسئلہ کشمیر دونوں ملکوں کے عوام کے سر پر شمشیر برہنہ کی طرح لٹکتا رہتا اور نہ دونوں ملکوں کے لامحدود مادّی اور مالی وسائل تباہ ہوتے...اور... آج نصف صدی گزرنے پر برصغیر کے کروڑوں عوام بڑی حد تک غربت اور افلاس سے نجات حاصل کر چکے ہوتے۔'' (ص ۲۶)

جناب شریف فاروق کی مذکورہ کتاب کے دیباچہ نگار پروفیسر پریشان خٹک بھی اجیت

جاوید کی کتاب کے معترف اور مداح ہیں۔ وہ اپنے دیباچے میں لکھتے ہیں:

''سٹینلے ولپرٹ کی شہرہ آفاق تصنیف Jinnah of Pakistan کے بعد دہلی یونیورسٹی کے شعبہ تاریخ و سیاست کی ریسرچ سکالر اور لیکچرار ڈاکٹر اجیت جاوید نے کتاب Jinnah: Secular an Nationalist لکھ کر اہم تاریخی کارنامہ انجام دیا ہے۔ انھوں نے جس محنت، مشقت کے علاوہ غیر جانبداری اور جرأت مندی سے قاید اعظم کی زندگی کی سیاسی جدوجہد کو اُجاگر کیا ہے، یہ کریڈٹ جناب شریف فاروق کو جاتا ہے کہ انھوں نے ڈاکٹر اجیت جاوید کی کتاب کو اہل پاکستان سے متعارف کرایا۔'' (ص ۱۷-۱۸)

جناب شریف فاروق کی کتاب پر سیّد شریف الدین پیرزادہ نے ''مستقبل کی امانت'' کے عنوان سے جو رائے لکھی ہے، اس میں انھوں نے بھی اجیت جاوید کی کتاب کے بارے میں اچھی رائے کا اظہار کیا ہے اور کتاب کو بڑی حقیقت پسندانہ اور تاریخی بد دیانتیوں کی درستگی کے لیے مثبت اقدام قرار دیا ہے۔

(ا۔س۔ش)

---

(۱)

سیکولر جناح

ڈاکٹر اجیت جاوید لکھتی ہیں:

جناح سیکولرازم کے نقیب تھے۔ وہ شکل صورت اور خیالات میں جدید، ترقی پسند، اور ''لاادری'' تھے۔ فرقہ پرستی کے جذبات اور تعصب کی ان کی ذاتی و پبلک زندگی میں کوئی جگہ نہیں تھی...

ان کے تصور دنیا میں مذہب اور خدا کی گنجایش نہ تھی۔ مسلمانوں کے عوامی مذہبی یا سیاسی اجتماعات میں وہ کم ہی دکھائی پڑتے تھے۔[۱] وہ باقاعدہ روز صبح داڑھی مونڈتے تھے اور جمعہ کو مسجد جانے سے گریز کرتے تھے۔[۲] رمضان کے مبارک دنوں میں بھی وہ شوق سے سور کے گوشت کے سینڈوچ اور ساسج کھاتے تھے۔ سگار اور شراب کا شوق کرتے تھے[۳] وہ اردو سے نابلد تھے۔ اسلامی ادب نہیں پڑھا تھا۔ انھوں نے ایک غیر مسلم لڑکی سے شادی کی تھی۔ کٹر مسلمان ان کو لامذہب گردانتے تھے۔ جس کی وہ ذرا بھی پروانہ کرتے تھے۔ [سیکولر اور وطن پرست جناح، ص ۱۳۸]

جناح نسلاً ہندو تھے اور اس پر ان کو فخر تھا۔ ایک بار اپنے کچھ دوستوں کو گھر پر مدعو کیا۔ ان میں ہار نیمان، سید حسین، جمناداس، دوارکا داس، عمر سبحانی، شنکر لال بینکر اور شوارا و شامل تھے۔ شوارا و رقم طراز ہیں:

---

(۱) B.R. Ambedkar, Pakistan or Partition, Bombay, Thacker and Co., 1940, p. 405

(۲) Larry Collins and Dominique Lapierre, Freedom At Midnight, Bombay, Vikas, 1975, p. 102

(۳) Stanley Jackson, The Aga Khan, London, O Dham Press, 1952, p. 169. Also see M.C. Chagkla, Roses in December, Bombay, Bhartiya Vidya Bhavan, 1978, p. 118

''تلک کو آنے میں قدرے دیر ہوئی اور جناح نے اس درمیان ہارنیمان کو بتایا کہ ان کا فرقہ (خوجا) دس اوتاروں (امام) کو مانتا ہے اور وراثت، قانون اور سماجی ریت رواجوں میں ہندوؤں سے ملتا جلتا ہے۔''(۱)

ان کے صرف ہندو دوست تھے۔ وہ اپنی شامیں ہندو دوستوں پنڈت موتی لال نہرو اور سپرو کے ساتھ کلب میں شراب نوشی، سگار پینے، سور کے گوشت کے سینڈوچ کھانے اور شطرنج اور بلیئرڈ کھیلنے میں گزارتے تھے۔

وہ ذات پرستی کے سخت مخالف تھے اور کوشش کرتے تھے کہ ان کا فرقہ ذات پرستی کے نظریات اور لیڈرشپ کے مضر اثرات سے محفوظ رہے۔ انھوں نے پردہ اور ایک سے زیادہ بیویاں رکھنے کی زوردار مخالفت کی۔ لڑکیوں کو اعلیٰ تعلیم پر زور دیتے تھے۔ خیالات و مزاج کے اعتبار سے وہ ترقی پسند تھے، اور کسی بات کو بنا دلیل تسلیم نہیں کرتے تھے ان کی سیاست میں جذبات و احساسات کی کوئی گنجایش نہیں تھی مروجہ دھار کے خلاف تیرنے کا ان میں حوصلہ تھا۔ انھوں نے خلافت تحریک اور عدم تعاون تحریک کی مخالفت کی اس پر انھیں مسلمان مخالف اور قوم مخالف طعنے سننے کو ملے۔ [ص ۳۳]

جناح مذاہب میں عدم برداشت سے سخت نفرت کرتے تھے اور متعصب ملاؤں، مولویوں اور مذہبی ٹھیکے داروں سے نالاں تھے۔ حال آں کہ ان کا خوجہ فرقے سے تعلق تھا مگر وہ اس کے روحانی رہنما آغا خان کو ان کے متعصب اور فرقہ وارانہ نقطۂ نظر کی وجہ سے اپنی تنقید و ملامت کا نشانہ بنانے سے نہیں چوکتے تھے۔(۲) انھوں نے ایک مرتبہ سر تیج بہادر

---

(۱) Sri Praicass, Pakistan - Birth and Early Days, p. 4. Also see Shiva Rao, India's Freedom Movement, p. 125

(۲) کہا جاتا ہے کہ آغا خاں کی جماعت اور ان کے مذہب و مسلک سے جناح صاحب نے قطعِ تعلق کر لیا تھا لیکن اس بات کا ثبوت ان کے کسی بیان میں نظر سے نہیں گزرا۔ یہ حقیقت ہو تب بھی جب تک عقاید و اعمال میں زبان و سیرت اس بات کی گواہی نہ دے، کیوں کر یقین کر لیا جائے؟
رہی یہ بات کہ انھوں نے خوجہ ہونے کے باوجود وہ فرقے کے روحانی رہنما کو ان کے تعصب اور

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر......)

سپرد سے کہا تھا:

''میرے پاس ہندو مسلم نزاع کا ایک حل ہے۔ آپ اپنے مذہب کے کٹر پجاری طبقے کو ختم کر دیں اور ہم ملاؤں کو۔ بس فرقہ وارانہ امن قایم ہو جائے گا۔''(۱)

ملاؤں کے کٹر پن اور دوغلے پن کو وہ ناپسند کرتے تھے۔ انھوں نے پنڈت موتی لال نہرو کو بتایا کہ وہ ان کی ''فضول باتوں'' میں یقین نہیں رکھتے۔ حال آں کہ ان کو کسی نہ کسی طرح ان ''بیوقوفوں کو ساتھ لے کر چلنا ہوتا ہے۔...''(۲)

اپنے سیکولر اور وطن پرست خیالات وعقاید کی بنا پر انھوں نے کانگریس میں شمولیت اختیار کی تھی۔ مسلم لیگ ۱۹۰۶ء میں قایم ہوئی۔ اس کی نوعیت فرقہ واریت پر مبنی تھی، اسی لیے جناح مسلم لیگ میں شامل نہیں ہوئے۔ انھوں نے مسلمانوں کے لیے علاحدہ رائے دہندگی کی مخالفت کی تھی۔ ان کا خیال تھا کہ اس سے مسلمانوں میں علاحدگی کا احساس پنپے گا!... [ص ۱۴۰-۱۳۹]

جناح مسلمانوں سے کہتے تھے کہ اپنی شکایتوں کو دور کرنے کے لیے وہ کانگریس میں شامل ہو جائیں اور فایدے کے لیے برطانیہ کی طرف دیکھنا بند کر دیں۔ ۱۹۰۶ء کے کانگریس اجلاس میں مسلم وقف قانون پر انھوں نے کہا:

''میرے اور مسلمانوں کے لیے بڑے اطمینان کا مقام ہے کہ کانگریس کے ایجنڈے میں ایک ایسا مسئلہ زیر بحث ہے جو صرف مسلمانان ہند سے تعلق رکھتا

فرقہ وارانہ نقطۂ نظر کی وجہ سے اپنی تنقید کا نشانہ بنانے سے نہیں چوکتے تھے۔ گویا کہ جناح صاحب بار بار انھیں اپنی تنقید کا ہدف بناتے تھے۔ خاک سار کی نظر سے ایک بار بھی کوئی ایسا حوالہ نہیں گزرا۔ میرا خیال ہے ڈاکٹر اجیت جاوید سے اس بیان میں تسامح ہوا ہے۔

البتہ یہ حقیقت ہے کہ جناح صاحب آغا خاں کے معتمد علیہ وکیل تھے اور پاکستان کے گورنر جنرل ہونے تک وہ اس منصب خدمت پر مامور رہے تھے۔ (ا.ب.ش)

(۱) B. Shiva Rao, India's Freedom Struggle, New Delhi, Orient Longman, 1972, p. 126

(۲) V.B. Kulkarni, India and Pakistan, Bombay, Jaico Publications, 1973, p. 274

ہے۔ یہ چیز ثابت کرتی ہے کہ ہم مسلمانوں کی اس (کانگریس) کے مشترک پلیٹ فارم پر ایک جگہ ہے اور ہماری خواہش ہے کہ نیشنل کانگریس کے پروگرام میں ہماری مشکلات کا حل ملتا رہے۔....''[۱]

جناح بمبئی پریسیڈنسی ایسوسی ایشن میں شریک تھے۔ یہ سیکولر تنظیم تھی۔ اُن کے علاوہ ممتاز اشخاص جیسے فیروز شاہ مہتا اس کے ممبر تھے۔ ۱۹۰۸ء میں انھوں نے فرقے وارانہ رائے دہندگی پر ایک بیان میں کہا:

''یہ عوام میں نسلی و مذہبی عناد و دشمنی پیدا کرے گا۔ جو امن وسکون کو تباہ کرے گا۔ قانون ساز اسمبلیوں میں تفرقے کی وہ روح دیکھنے کو ملے گی، جو ان کی کارکردگی میں رکاوٹ ڈالے گی اور (عوام میں) ان کی ضرورت واہمیت کو گرادے گی۔''[۲]

الہ آباد میں منعقدہ کانگریس کے پچیسویں سالانہ اجلاس زیرِ صدارت ولیم ویڈربرن، میں جناح نے درج ذیل ریزولیشن پیش کیا:

''کانگریس اسمبلی میں مسلمانوں اور دیگر اقلیتوں کو انصاف پر مبنی مناسب نمایندگی کے اصول کو تسلیم کرتی ہے۔ اس سلسلے میں پچھلے سال میں جاری کردہ ریگولیشن پر جس میں علاحدہ رائے دہندگی کا اہتمام ہے، اعتراض کرتی ہے اور سرکار سے مطالبہ کرتی ہے کہ انڈین کونسل ایکٹ ۱۹۰۹ء کے تحت الیکشن سے قبل ریگولیشن میں مناسب وانصاف پر مبنی تبدیلی کرے، تاکہ ملک معظم کی رعایا کے مختلف طبقات میں غیر مناسب امتیازات رائے دہندگی، امیدواروں کی اہلیت و یک طرفہ نااہلیت، اور پابندی کو دور کیا جاسکے، کانگریس یہ بھی مطالبہ کرتی ہے کہ جہاں بھی ضروری ہو، صوبائی اسمبلیوں میں غیر سرکاری ممبران کی اکثریت بنائے جانے کے بارے میں ریگولیشن میں مناسب تبدیلی کی جائے۔ تاکہ عملاً یہ زیادہ

---

(۱) Aziz Beg, Jinnah and His Times, Pakistan, Babur and Amer Pub., 1986, p. 243

(۲) V.N. Naik, Indian Liberalism - A Study (1918-43), Bombay, Padma Publications, 1945, P. 28

موثر ثابت ہو سکیں۔''(۱)

سرکار نے ۱۹۱۳ء میں بلدیاتی اداروں (Self Governing Bodies) میں فرقے وارانہ بنیاد پر نمایندگی دے دی۔ جناح اس کے خلاف تھے۔ آگرہ میں منعقدہ مسلم لیگ کے ستائیسویں اجلاس دسمبر ۱۹۱۳ء میں جناح نے سرکار سے کہا کہ وہ غیر جذباتی انداز میں غور کرے۔ فوری مفاد سے صرف نظر کر کے مستقبل کے مستقل و پایدار فایدے پر توجہ دے!(۲)

''جناح بنیادی طور پر سیاست دان تھے اور مذہب سے ان کا فعال تعلق نہیں تھا''۔(۳) وہ ان لوگوں کو جو اپنے ہم خیال لوگوں کے مفاد کے لیے کام کرتے ڈانٹتے پھٹکارتے تھے۔ آزادی کے ایک سپاہی کے۔ اے۔ حمید اپنی سوانح حیات میں لکھتے ہیں کہ وہ جب جرمنی سے اپنی تعلیم پوری کر کے واپس وطن ۱۹۲۷ء میں آئے وہ جناح سے ان کے بمبئی ہائی کورٹ کے چیمبر میں ملے۔ حمید بتاتے ہیں۔''میں نے ملک میں پھیلی جہالت کے بارے میں انھیں بتایا... خاص طور سے مسلمانوں میں تعلیم کے لیے کام کرنے کی ان سے درخواست کی''۔ اس پر جناح نے جواب دیا:

> نوجوان! آپ سوچتے ہیں کہ میں صرف مسلمانوں کا لیڈر ہوں۔ میں ایسا نہیں ہوں۔ میں ہندستان کا قومی لیڈر ہوں۔ میں صرف مسلمانوں کے لیے کام نہیں کر سکتا۔(۴)

جناح ترقی پسند اور وطن پرست تھے اور وہ اپنے ہندستانی ہونے پر فخر کرتے تھے اور اپنے ہم مذہبوں سے ایسا ماننے کے لیے کہتے تھے۔ جناح نے آل انڈیا مسلم لیگ کا کردار

---

(۱) C.H. Setalvad, Recollections and Reflections - An Autobiography, Bombay, Padma Publications, 1946, pp. 282-83

(۲) Shan Mohammad, The Indian Muslims, vol. IV, New Delhi, Meenakshi Pub., 1981, pp. 129-131

(۳) J.N. Sahani, The Lid Off, Bombay, Allied Publications, 1971, p. 41

(۴) K.A. Hamied, An Autobiography, Bombay, Lalvani Publishers, 1972, p. 64

ہی بدل ڈالا۔ انھوں نے مسلم لیگ میں فرقے وارانہ احیا کے لیے شرکت نہیں کی تھی بلکہ اس کو مسلم سماج کے قدامت پسند عناصر کے چنگل سے بچانا ان کا اصل مقصد تھا۔"[1] اس زمانے میں بہ یک وقت دو تنظیموں کا رکن ہونا غیر معمولی نہیں تھا۔ کانگریس کے بہت سے ممتاز لیڈر ہندو مہاسبھا کے لیڈر بھی تھے۔ جناح نے مسلم لیگ میں اس کو سیکولر بنانے کے لیے شمولیت کی تھی اور بہت حد تک اس میں وہ کامیاب بھی ہوئے تھے۔ جناح نے مسلم لیگ کے ساتویں اجلاس (۳۰ر و ۳۱ر دسمبر) منعقدہ آگرہ میں شریک ہوکر مولوی رفیع الدین کے ریزولیوشن کی سخت مخالفت کی تھی۔[2] اس ریزولیوشن میں مقامی بلدیاتی اداروں میں فرقے وارانہ بنیاد پر نمایندگی کی توسیع کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ انھوں نے مسلم لیگ کے دستور میں تبدیلی کی مانگ کی تاکہ مسلم لیگ کو کانگریس کی پالیسی کا ہم نوا بنایا جاسکے اور یہ دونوں تنظیمیں ملک کی بہبود کے لیے مل کر کام کرسکیں۔[3] [ص ۴۵-۱۳۸]

مجالس عیش وطرب:

جناح پنڈت موتی لال نہرو اور سپرو کے ہم راہ کلبوں میں، پارٹیوں میں اور ایک دوسرے کے گھروں پر کھانا کھاتے اور شراب پیتے تھے۔ گاندھی جی ساتھ کھانا کھانے، ساتھ شراب پینے اور بین المذاہب شادی کے مخالف تھے۔ ان کے نزدیک "ساتھ کھانا کھانے اور بین المذہب شادی پر روک روح کی تیز بالیدگی کے لیے اشد ضروری ہے۔"[4] [ص ۱۹۷]

---

(۱) جناح کی ان قدامت پسند عناصر سے مراد مولوی، مولانا ہی تھے۔ (ا۔س۔ش)

(۲) آگرہ میں مسلم لیگ کا یہ اجلاس ۱۹۱۳ء میں ابراہیم رحمت اللہ کی صدارت میں ہوا تھا۔ (ا۔س۔ش)

(۳) P.C. Roy Chaudhry, Gandhi and HIs Contemporaries, p. 182

(۴) B.R. Ambedkar, Gandhi or Gandhism, Jullundur, Bheema Patrika Publications, 1970, p. 152

(۲)

فکر و عمل کی چند جھلکیاں

تحریک پاکستان کے رہنما:

ڈاکٹر اجیت جاوید لکھتی ہیں:

جناح سُور کا گوشت کھاتے تھے، اسکاچ شراب پیتے تھے، مسجد میں کبھی کبھار جاتے تھے، اسلامی تعلیمات سے لاعلم تھے، اسلامی ارکان ادا نہیں کرتے تھے، اردو نہیں بول سکتے تھے، بہترین مغربی لباس پہنتے تھے، اور اُن کا تعلق ہندو بھاٹیہ خاندان سے تھا۔ مسلمان مولویوں نے انھیں قایدِ اعظم بنا دیا۔

تحریک پاکستان کا رہنما قرار دیے جانے پر جناح کو ایک نئی شبیہ دینے کی سرتوڑ کوششیں کی گئیں۔ مسلم جاگیرداروں اور سرمایہ داروں نے اس کے لیے پیسوں کی بارش کر دی، دانشوروں نے جناح کو نئی صورت عطا کرنے میں اپنی ذہنی و تخیلاتی صلاحیتوں کا بھرپور استعمال کیا۔ اخبارات، دی اسٹار آف انڈیا اور ''ڈان'' اس مہم میں پیش پیش تھے۔ جناح کو پیغمبر اسلام (ﷺ) کے بعد اسلامی دنیا کی دوسری عظیم شخصیت اور ہندستانی مسلمانوں کا بے تاج بادشاہ کہا گیا۔ (۱)

اس نئے رول میں پہچان بنانے کے لیے جناح نے پہلے سے تیاریاں کی تھیں۔ مغربی لباس چھوڑ دیا۔ اردو سیکھی۔ مسلم لیگ کے جلسوں میں چوڑی دار پاجامہ اور اچکن میں شرکت کی اور جب وہ شمال مغربی سرحدی صوبے اور پنجاب کے دورے پر گئے تو پنجابی شلوار یہ دکھانے کے لیے پہنی کہ وہ اُنھی میں سے ہیں۔ قدامت پسند علاقوں میں انھوں نے اپنی بہن فاطمہ کو جو بُرقع نہیں اوڑھتی تھیں'' اپنے ساتھ نہیں بٹھایا۔ نماز کے لیے اُن میں کوئی رغبت نہ تھی، مگر عید کے دن لوگوں نے انھیں بمبئی کے آزاد میدان میں غریب اور مال دار

---

(۱) Home Political Reports, December 18, 1939

مسلمانوں کے درمیان رکوع اور سجود کرتے دیکھا۔[۱] بہار کے شہر گیا میں وہ بیس ہزار لوگوں کے جلوس کے ہمراہ چلے۔ لوگ تلواریں اور دیگر ہتھیار اٹھائے ہوئے تھے۔ جامع مسجد کے پیش امام نے انھیں تلوار اور قرآن کا ایک نسخہ نذر کیا۔[۲] انھوں نے دستوری طریقۂ کار کو چھوڑ ''یوم بالواسطہ عمل'' (ڈائریکٹ ایکشن ڈے) کا اعلان کیا۔ اس کے کچھ عرصے بعد کلکتہ میں ہندو مسلم فساد ہوئے جس میں غیر معمولی پیمانے پر لوٹ مار، زنا بالجبر، آتش زنی اور قتل کی وارداتیں ہوئیں، جن میں ہندو اور مسلمان دونوں کی جانیں تلف ہوئیں۔[۳] ہندو مسلم اتحاد کا خیال چھوڑ کر نئے مسلک کی تبلیغ شروع کر دی۔ انھوں نے کہا:

> ''ہندستان کے ہندو اور مسلمان مذہب کو ان معنوں میں نہیں سمجھتے جس طرح مغرب میں اس کو سمجھا جاتا ہے۔ یہاں مذہب ایک ضابطۂ حیات ہے۔ اسلام زندگی کے ہر شعبے میں رہنمائی کرتا ہے۔ اس ملک کا مسلمان دوسرے کسی ملک کے مسلمان سے زیادہ ہمدردی رکھتا ہے اتنی وہ اس ملک کے غیر مسلم سے نہیں رکھتا ہے۔ یہاں تک کہ ایک ہندستانی مسلمان کے دل میں غیر ملکی مسلمان کی تکلیف پر ہلچل مچتی ہے۔ ایسی ہلچل وہ اپنے ہی ملک کے غیر مسلم کی تکلیف پر محسوس نہیں کرتا۔''[۴]

---

(۱) Joachim, Alva, Leaders of India, Bombay, Thacker and Co. Ltd., 1943, p. 65

(۲) Home Political Reports, January 18, 1938

(۳) In the Calcutta riots 5,000 lives were lost, over 15,000 persons were injured and about one hundred thousands were rendered homeless. Regarding the killings Patel wrote in the letter to Rajaji, "This will be a good lesson for the League because I hear that the proportion of the Muslims who have suffered death is much larger.' Damodar P. SInghal, Pakistan, New Jersey, Prentice Hall, 1972, p. 170

(۴) Binayendra Mohan Choudhry, Muslim Politics in India, Calcutta, Orient Longman, 1946, p. 67

مذہب کی اہمیت بیان کرتے ہوئے کہا:

''قومیت کو جوڑنے والی قوت صرف مذہب ہے۔ اُن ممالک میں جہاں کے عوام مختلف مذاہب میں عقیدہ رکھتے ہیں وہاں ایک قومیت کا نظریہ کبھی کامیاب نہیں ہوا۔ جرمنی میں عیسائی اور یہودی صدیوں سے ساتھ رہے مگر وہ کبھی مل کر ایک قوم نہ بن سکے۔''(۱)

قومیت کے بنیادی مفروضے کو پھیلاتے ہوئے انھوں نے کہا:

''یاد رکھیے! اسلام صرف ایک مذہبی اساس کا نام نہیں ہے بلکہ یہ حقیقی اور عملی ضابطۂ حیات ہے۔ میں زندگی اور ہر وہ چیز جو زندگی میں اہم ہے اُس کے متعلق سوچ رہا ہوں۔ اپنی تاریخ، تاریخ ساز شخصیتوں، ہمارا فن تعمیر، موسیقی، قانون اور فقہ،... ان سب میں ہمارا نظریہ ہندوؤں سے نہ صرف بنیادی طور پر مختلف ہے بلکہ مکمل طور سے مخالف ہے۔ ہم بالکل مختلف ہیں۔ زندگی میں ہم دونوں کے درمیان وجہِ اشتراک کچھ بھی نہیں۔''(۲)

اس نئی طرز خطابت اور یک طرفہ پروپیگنڈے کے زور پر جناح نے اُس دور کی ملکی سیاست میں خود کو نہایت فعال اور اہم قوت ثابت کر دیا۔ مسلم لیگ کی رکنیت میں زبردست اضافہ ہوا۔ ممبروں کی تعداد بیس لاکھ تک جا پہنچی۔ انتخابات میں بھی کامیابیاں ہوئیں ۱۹۳۷ء اور ۱۹۴۶ء کے درمیان ۶۱ ضمنی انتخابات میں مسلم لیگ نے ۴۷ انتخابات جیتے۔(۳) اس جیت نے اُن کو مسلم لیگ کا عظیم ترین لیڈر بنا دیا اور مسلم لیگ صرف اُن کی پرچھائیں بن کر رہ گئی تھی۔

اس طاقت کے بل بوتے پر جناح نے مسلمانوں کا واحد نمایندہ ہونے کا دعویٰ کیا۔

---

(۱) Ibid

(۲) Cited from Merriam Allen Hayes, Gandhi vs. Jinnah: The Debate Over Partition, Calcutta, Minerva, 1980, p. 90

(۳) Ibid., p. 91

مسلمان کانگریس میں تھے، کمیونسٹ پارٹی میں تھے۔ کانگریس سوشلسٹ پارٹی میں تھے، ایم این رائے کی ریڈکل ڈیموکریٹک لیگ میں اور فارورڈ بلاک میں تھے، لیکن وہ اُن کو مسلم فرقے کا نمایندہ نہیں مانتے تھے۔ اُن کے لیے وہ شو بوائز (طفل تماشہ) اور راہ سے بھٹکے ہوئے اشخاص تھے۔ اُنھوں نے مسلم لیگ کو مسلمانوں کی واحد بااختیار نمایندہ جماعت ماننے کا دعویٰ پیش کیا۔ برطانیہ نے فوراً اس پر رضامندی ظاہر کردی۔ بعد میں کانگریس بھی مان گئی۔ [ص ۲۷۳-۷۵]

علماے دین سے جناح صاحب کی کد:

علی گڑھ کی ایک تقریر (۱۹۳۷ء) میں انھوں نے کہا:

''لیگ کی کوششوں سے آپ رجعت پسند مسلم عناصر سے آزاد ہو گئے ہیں۔ اور آپ یہ بات بھی محسوس کرنے لگے ہیں کہ جو خود غرضی کا کھیل کھیلتے ہیں، وہ حقیقت میں غدار ہیں۔ اس (لیگ) نے یقیناً ناپسندیدہ عناصر مثلاً مولوی اور مولانا کے چنگل سے آپ کو آزاد کردیا ہے۔ میں مولویوں کے پورے طبقے کی بات نہیں کررہا ہوں۔ اُن میں سے کچھ دیش بھگت اور دل کے سچے ہیں، لیکن اُن میں ایک ناپسندیدہ طبقہ ضرور ہے۔''(۱)

الیکشن سے ایک سال بعد مسلم لیگ کے کلکتہ اجلاس میں انھوں نے کہا:

''ہم کسی حد تک اپنے لوگوں کو ناپسندیدہ رجعت پسند عناصر سے، جن کو عرفِ عام میں مولوی مولانا کہا جاتا ہے، آزاد کرانے مین کامیاب ہوئے ہیں، مگر ان کا خوف اور مضر اثر مکمل طور پر دور نہیں ہوا ہے۔''(۲) [ص ۱۸۳]

---

(۱) Cited from Zia-ul-Hasan Faruqi, The Deoband-School and the Demand for Pakistan, Bombay, Asia Publishing House, 1963, p. 79

(۲) Foundation of Pakistan, Documents of All India Muslim League, vol. II, p. 290

مسلمانوں کے مفاد سے عدم دلچسپی:

کانگریس سے اپنی مانگیں منوانے کے لیے پاکستان تو اُن کے ہاتھ میں ٹرپ کا پتا تھا! ورنہ انھیں اپنے فرقے (کے مفاد) سے کوئی خاص لگاؤ نہیں تھا۔ مسلمان عوام کی ترقی و بہبود کے لیے دوسری پارٹیوں میں شامل مسلمانوں کی جدوجہد میں شامل ہونے سے انھوں نے انکار کر دیا تھا۔ ایک ایسی مہم ممبئی میونسپل کارپوریشن کی تعلیمی مہم تھی۔ اس نے شہر بھر میں شبینہ اسکول کھولے تھے۔ مسلم علاقوں میں ان اسکولوں کی نگرانی بیگم کلثوم سایانی کو دی گئی تھی۔ وہ کانگریسی اور مشہور سوشل ورکر تھیں۔ بیگم کلثوم سایانی مسلمانوں کے مفاد کے اس کام میں مسلم لیگ کی اخلاقی مدد چاہتی تھیں۔

مرزا راشد علی بیگ لکھتے ہیں:

> ''ایک رات ہم مسٹر جناح کو یہ اسکول دکھانے لے گئے۔ ہم اُن کو ایسی جگہوں پر لے گئے، جن کے متعلق ان کے ہونے کا بھی اُن کو علم نہیں تھا۔ وہ بڑی خوشی سے گندے، اندھیرے زینوں پر چڑھ کر تاریک تنگ کمروں تک پہنچے۔ لیکن ہم اپنے مشن میں ناکام رہے۔ آخر میں انھوں نے شکریہ ادا کیا اور بیگم کلثوم سایانی سے کہا کہ وہ بہت اچھا کام کر رہی ہیں لیکن مسلم لیگ کو تعلیم بالغان کی اس مہم میں تعاون کی ہدایت دینے سے انکار کر دیا''۔ (۱)

وجوہات ظاہر تھیں۔ کارپوریشن پر کانگریس کا قبضہ تھا۔ اُن کے اور مسلم لیگ کے لیے یہ مناسب نہیں تھا کہ وہ کانگریس کو مسلم عوام میں رسوخ اور مقبولیت حاصل کرنے میں مدد دیتے۔ مسلم عوام کو فائدہ پہنچتا یا نہیں، اس سے اُن کو کوئی غرض نہیں تھی۔ (۲) اُن کی دل چسپی مسلم لیگ میں تھی، نہ کہ مسلمانوں میں!'' [ص ۲۷۶]

---

(۱) M.R.A. Baik, In Different Saddles, New York, Asia Publications, 1967, pp. 135-36

(۲) Ibid.

تحریک خلافت اور اتحاد اسلامی سے اعراض:

''جناح نے خلافت کے لیے سوراج کے مسئلے سے بچ نکلنے پر سخت ناراضگی جتائی۔ انھوں نے خلافت سے خود کو الگ کرلیا۔ بہ قول درگا داس ''ان کو حیرانی تھی کہ ہندو لیڈروں کو ذرا بھی احساس نہیں تھا کہ اس سے پان اسلامزم کو تقویت ملے گی اور یہ کہ ترکی کے سلطان کی لڑکھڑاتی سلطنت کو سہارا دیا جارہا تھا اور ہندستانی مسلمانوں کی قوم پرستی کی آنچ کو دھیما کیا جارہا تھا۔''[۱] [ص ۲۱۰]

غریب کے مصافحے سے انکار:

قاید اعظم بننے کے بعد بھی انھوں نے نہ صرف مسلم عوام سے بلکہ مسلم لیڈروں سے فاصلہ قایم رکھا۔ بیگم لیاقت علی خان ایک واقعے کو یاد کرتی ہیں کہ بلوچستان کے دورے پر اُنھوں نے لوگوں سے ہاتھ ملانے سے گریز کیا۔ وہ کہتی ہیں:

''ایک گارڈن پارٹی میں شریک تھے، جہاں سیکڑوں لوگ ملاقات کے لیے جمع تھے۔ اُن میں ایک ضعیف قبایلی مسلمان سردار بھی تھا۔ وہ ہاتھ ملانے جناح کی طرف بڑھا۔ جناح نے اچانک علاحدگی کے موڈ میں کہا۔ اگر میں آپ سے ہاتھ ملاؤں گا تو ان تمام لوگوں سے ہاتھ ملانا پڑے گا اور اس کے لیے وقت نہیں ہے''۔ [۲]

کارکنوں کو جھڑکنا:

اُن کے سوانح نگار ہیکٹر بولیتھو ایک واقعہ بیان کرتے ہیں جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ

---

(۱) Durga Das, From Curzon to Nehru and Afterwards, p. 353

(۲) Hector Bolitho, Jinnah: Creator of Pakistan, London, John Murry, 1954, p. 153

جناح مسلم لیگیوں کی رائے کی پروا نہیں کرتے تھے اور متعدد بار اُن کو جھڑک دیتے تھے۔ ایک مرتبہ مسلم لیگ کے کچھ ممبروں نے اُن سے گاندھی جی کی طرح تیسرے درجے میں سفر کرنے کی صلاح دی۔ وہ غصے میں آ گئے، اور کہا، میں کیا کروں اور کیا نہ کروں اس پر حکم نہ لگاؤ۔ میں تمھارا پیسہ خرچ نہیں کرتا۔ میں جس طرح چاہوں گا، رہوں گا اور جو چاہوں گا، سو کروں گا۔''

وہ کہتے تھے کہ ''اُن کے دوست سب ہندو تھے اور رئیسانہ ٹھاٹ باٹ سے رہنا اُن کو پسند تھا۔ مسلمانوں کے سماجی اجتماعات میں وہ غیریت محسوس کرتے تھے۔''(۱)

یہی بات جناح صاحب نے سری پرکاش کو ایک ملاقات کی گفتگو میں جواباً فرمائی تھی:

''جس طرح تمھارے دادا کے مسلمان احباب تھے، اسی طرح میں تمھیں بتاتا ہوں کہ میرے احباب صرف ہندو ہیں''(۲)

جناح نسلاً ہندو تھے اور اس پر ان کو فخر تھا۔ ایک بار اپنے کچھ دوستوں کو گھر پر مدعو کیا۔ ان میں بار نیمان، سید حسین، جمنا داس، دوارکا داس، عمر سبحانی، شنکر لال بینکر اور شیوا راؤ شامل تھے۔ شیوا راؤ رقم طراز ہیں: تلک کو آنے میں قدرے دیر ہوئی اور جناح نے اس درمیان ہار نیمان کو بتایا کہ ان کا فرقہ خوجا دس اوتاروں (اماموں) کو مانتا ہے اور وراثت، قانون اور سماجی ریت رواجوں میں ہندوؤں سے ملتا جلتا ہے۔(۳) ان کے صرف ہندو دوست تھے۔

---

(۱) Ibid.

(۲) ڈاکٹر اجیت جاوید کی اپنی تحقیقات و معلومات ہیں کہ ''ان کے سب دوست ہندو تھے۔ سری پرکاش جی نے جناح صاحب کا بیان نقل کیا ہے کہ انھوں نے فرمایا: میرے احباب ''صرف ہندو ہیں۔'' یہ بات ناممکن تو نہیں، لیکن حیرت انگیز ضرور ہے۔ یہ جناح صاحب کے ذوق و مزاج کا ایک آئینہ بھی ہے!

(۳) Sri Prakasa, Pakistan - Birth and Early Days, p. 4. Also see Shiva Rao, India's Freedom Movement, p. 125

وہ اپنی شامیں ہندو دوستوں پنڈت موتی لال نہرو اور سپرو کے ساتھ کلبوں میں شراب نوشی، سنگار پینے، سور کے گوشت کے سینڈوچ کھانے اور شطرنج اور بلیئرڈ کھیلنے میں گزارتے تھے۔" [ص ۳۳]

مسلمانوں سے بدظنی:

جناح مسلمانوں کے متعلق اچھا گمان نہیں رکھتے تھے۔ اُنھوں نے قاضی عیسیٰ سے جب وہ اُن سے ملنے جولائی ۱۹۴۵ء میں نئی دہلی گئے کہا:

"مسلمانوں میں آپ کو ہمیشہ غدار ملیں گے۔"(۱)

اقلیتی صوبوں کے مسلمانوں سے عدم دل چسپی:

ایم سی چھاگلا نے ایک مرتبہ جناح سے پوچھا: "آپ پاکستان کے لیے لڑ رہے ہیں جس میں مسلمان اکثریتی صوبے شامل ہوں گے۔ لیکن جن صوبوں میں، خصوصاً یوپی میں، جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں، ان کا کیا ہوگا؟ تھوڑی دیر تک وہ میری طرف دیکھتے رہے اور پھر بولے:

"وہ اپنی دیکھ بھال خود کریں۔ میری اُن کے مستقبل میں کوئی دل چسپی نہیں ہے۔"(۲)

---

(۱) K.H. Khurshid, Memories of Jinnah, Karachi, Oxford University Press, 1990, p. 62

(۲) M.C. Chagla, Roses in December, Bombay, Bhartiya Videya Bhavan, 1978, p. 80 کیسی قساوت اور کیسی ظالمانہ فکر ہے۔

جواب سے پہلوتہی اور ناراضگی کا اظہار:

میجر جنرل شاہد حامد کا بھی یہی خیال تھا۔ اُنھوں نے جناح کو ۳/ اگست ۱۹۴۷ء کو اپنے گھر مدعو کیا۔ ایک افسر نے جناح سے پاکستان میں ترقی کے مواقع کے بارے میں سوال کیا۔ جناح نے ناراضگی کے ساتھ کہا۔ ''تم مسلمان، یا تو آسمان پر رہتے ہو اور اگر گرتے ہو تو گڑھے میں (جہاں شہر کی گندگی دفن کی جاتی ہے) پہنچتے ہو۔ تم ہموار راستے پر تو چل ہی نہیں سکتے۔''(۱) [ص ۲۷۹]

---

(۱) Shihid Hamid, Disastrous Twilight, Leo Cooper, 1986, p. 219

(۳)

انقلاب فکر

جناح صاحب کے فکر اور رویے کی تبدیلی:

ڈاکٹر اجیت جاوید رقم طراز ہیں:

۱۹۳۸ء تک جناح کے ہم مذہب ان کو ملحد کہہ کر پکارتے تھے۔ وہی انیسویں صدی کے چوتھی دھائی کے شروع میں ایسا رول ادا کرنے لگے [۱] جس کے سبب آزادی کے بعد ہندستان میں سب سے زیادہ قابل نفرت مانے جانے لگے۔ انھوں نے علاحدگی کا مطالبہ ضرور کیا مگر وہ ہندو مخالف نہ تھے۔ رنجی شاہانی نے ایک مرتبہ ان سے پوچھا: ''کیا یہ سچ ہے کہ آپ ہندوؤں سے نفرت کرتے ہیں؟ ایک افسردہ مسکراہٹ ان کے مرجھائے چہرے پر پھیل گئی'' میں ان سے نفرت کیسے کرسکتا ہوں؟ میں ان ہی میں سے پیدا ہوا ہوں لیکن تم اپنے بڑے بھائی کے گھر میں اس کے چاہے بغیر مہمان بن کر کیسے رہ سکتے ہو؟ اگر تم میں ذرا بھی غیرت ہے تو وہ گھر چھوڑ دو گے اور اگر کسی غریب بستی میں رہنے کی مجبوری ہوئی تو رہ لو گے؟ [۲]

---

(۱) ہر صدی، اس کا پہلا سال اور پہلی دھائی کا آغاز یکم جنوری سے شروع ہوتا ہے۔ بیسویں صدی، اس کا پہلا سال اور پہلی دھائی یکم جنوری ۱۹۰۰ء سے شروع ہوتی ہے اور ۳۱ر دسمبر ۱۹۹۹ء کو بیسویں صدی ختم ہوجاتی ہے۔ پس ۱۹۳۸ء بیسویں صدی کا اڑتیسواں سال تھا۔ یہ انیسویں صدی نہیں۔ انیسویں صدی کی چوتھی دھائی کے شروع سے مصنف کا اشارہ ۲۳ر مارچ ۱۹۴۰ء کی مشہور قرار دادِ لاہور کی طرف ہے جو درحقیقت بیسویں صدی کی پانچویں دھائی کا تیسرا مہینا ہے۔

یہ غلطی تو ''مسٹر گاندھی'' کے مصنف جناب رنجی شاہانی کی تھی۔ اسی اقتباس کے متعاقب اقتباس میں نصف غلطی ڈاکٹر اجیت جاوید کے سہو قلم سے ظہور میں آئی ہے۔ ۲۳ر مارچ ۱۹۴۰ء کی قرار داد مشہور بہ ''قرار دادِ پاکستان'' ''تیسرے دہے'' کا وقوعہ نہیں ''چوتھے دہے'' کا حادثہ ہے۔ (ا۔س۔ش)

(۲) Ranjee Shahani, Mr. Gandhi, New York, Macmillan Co., 1961, p. 186

اور یہ سانحہ ہی تو ہے کہ جناح نے جو کبھی فخریہ کہا کرتے تھے کہ وہ پہلے ہندستانی ہیں اور بعد میں مسلمان آخر میں سیکولرازم کے محبوب عقیدے کو ترک کر دیا اور فرقہ پرست اور علاحدگی پسند ہندستان کے مسلمانوں کے بلاتفریق لیڈر یعنی قایداعظم بن گئے"۔ (۱)

[ص ۱۸۷]

انقلاب فکرورائے کی تاریخ:

بیسویں صدی کے تیسری دہائی کے آخر تک جناح کے خیالات اور آدرشوں میں بڑی تبدیلی رونما ہو چکی تھی۔ نوروجی اور گوکھلے کی طرز کا غیر مصالحتی سیکولرازم اور وطن پرست اب فرقہ پرست اور رجعت پسند طاقتوں کا مسیحا بن چکا تھا۔ ہندو مسلم اتحاد کا نقیب اور متحدہ ہندستان کے پرستار نے لوگوں کو تقسیم کرنے کے لیے اور ہندستان کی ایکتا کو پارا پارا کرنے کی راہ پر قدم بڑھا لیے تھے۔

جناح کی اس غیر معمولی قلابازی کے لیے بہت سی تشریحات دی جاتی ہیں۔ فرقہ پرست ہندوؤں نے جناح میں اس تبدیلی کو اس وقت محسوس کیا تھا، جب انھوں نے کانگریس چھوڑی تھی اور مسلمانوں کے لیے علاحدہ مطالبات کیے تھے۔ کچھ کے نزدیک جناح کانگریس میں دوسرے نمبر کی پوزیشن میں کام کرنے کو ذہنی طور پر تیار نہیں تھے، دوسروں کے نزدیک وہ خودرائے، قدرے مغرور، صاحبِ انا اور برطانیہ سے ملے ہوئے تھے، جس نے انھیں کانگریس سے تعلق توڑنے اور پاکستان بنانے کے لیے اکسایا تھا لیکن امبید کر کے الفاظ میں:

"لوگ کہتے ہیں کہ مسٹر جناح کے آدرشوں میں بڑی تبدیلی ہوئی تھی۔ وہ یہ بات

---

(۱) اگر فاضل مولفہ کا اشارہ قرارداد لاہور (یا پاکستان) کی طرف ہے، جس سے جناح صاحب کی فکرو رائے کے انقلاب کا ظہور ہوا تھا، تو قرارداد لاہور (پاکستان) کا واقعہ تیسری دہائی کا ہے۔ بیسویں صدی کی تیسری دہائی اکیسویں سال تا تیسویں سال پڑتی ہے۔ اور ۱۹۳۱ء سے چوتھی دہائی شروع ہوتی ہے۔ (اب.ش)

بھول جاتے ہیں کہ ان (جناح) کے کٹر دشمن بھی ان پر انگریزوں کا پٹھو ہونے کا الزام نہیں لگا سکتے۔ ہوسکتا ہے وہ کچھ زیادہ ہی خودرائے ہوں، کھلے طور پر ان کی انا قدرے بڑھی ہوئی ہو اور اس درجے میں تکبر ہو کہ ان کی غیر معمولی ذہانت اور قابلیت جس کی پردہ پوشی نہ کر سکتی ہو۔ ان کی وجہ سے یہ بھی ممکن ہے کہ وہ دوسری پوزیشن میں دوسروں کے ساتھ عوامی خدمت نہ کر سکتے ہوں، ہوسکتا ہے ان کے ذہن میں نئے تصورات کی بھرمار نہ ہو، پھر بھی ان کے نقادوں کے برخلاف وہ خالی الذہن خوبصورت شخصیت نہ تھے اور نہ ہی مانگے کے تصورات وخیالات سے کام چلاتے تھے اس کا بھی امکان ہے کہ ان کی شہرت کی تعمیر میں حقیقت کی جگہ تصنع اور آرٹ کو زیادہ دخل ہو۔ ساتھ ہی ہندستان میں وہ ایسے سیاست داں تھے جسے کرپٹ کرنا ناممکن تھا۔ کرپشن سے پاک ہونے کی صفت صرف ان میں پائی جاتی ہے۔ وہ لوگ جوان کے اور برطانوی حکومت کے تعلقات کے بارے میں جانتے ہیں وہ تسلیم کرتے ہیں کہ وہ ہمیشہ اس کے نکتہ چین رہے۔ حال آں کہ وہ کبھی اس کے دشمن نہ تھے۔ کوئی ان کو خرید نہیں سکتا تھا۔ قسمت کا دھنی نہ ہونا ان کی نیک نامی میں چار چاند لگاتا ہے۔ ان کی تبدیلی کے متعلق عام ہندو تشریح یہ بات بنانے میں ناکام ہوئی ہے کہ آخر اس زبردست تبدیلی کا سبب فی الحقیقت کیا تھا۔''(۱)

اس کے برخلاف مسلم فرقہ پرست کانگریس اور ہندو مہاسبھا پر ہندو حکومت بنانے کی خواہش کا الزام لگاتے ہیں جس میں مسلمانوں کے لیے کوئی عزت کا مقام نہ ہوگا۔ ان کے خیال میں اس نے جناح کی آنکھیں کھول دیں اور وہ مسلمانوں کی حفاظت میں سرگرم ہوگے اور اس طرح پاکستان وجود میں آیا۔ لیکن یہ تشریح بھی پاکستان بننے کا سبب بتانے کے لیے ناکافی ہے۔ شیوا راؤ کی رائے ہے ''وہ کسی قدر زیادہ ضدی سیاست داں تھے، ورنہ وہ کیسے

(۱) B.R. Ambedkar, Pakistan or Partition of India, Bombay, Thackery and Co. Ltd., 1945, p. 323

آسانی کے ساتھ علاحدہ ریاست پاکستان کے نظریے سے اتفاق کر لیتے''۔ (۱)

قومی سیاست سے بھٹکنے کے اسباب:

پہلا سبب: ہندو فرقہ پرستوں نے انھیں قوم پرستی کے اصل دھارے سے رفتہ رفتہ الگ کر دیا اور

دوسرا سبب: مسلم فرقہ پرستوں نے یہ کہہ کر ان کو رجھایا کہ وہی مسلمانوں کی رہنمائی کر سکتے ہیں۔ ان کے علاوہ کچھ اور بھی اہم اسباب تھے مثلاً

تیسرا: فریق یعنی برطانوی حکومت۔ برطانیہ آخری فیصلہ کن طاقت تھی۔

چوتھا: بین الاقوامی بدلتے حالات۔

پانچواں: ترقی پذیر اقتصادی ہندو بورژوا طاقت جو کانگریس پر دباؤ بنائے ہوئی تھی۔

چھٹا: جناح کے متعلق کچھ کانگریسی لیڈروں کا رویہ۔

ساتواں: ہندو فرقہ پرست اور تشدد پسند تنظیموں کا احیا و فروغ اور ان کا کانگریس کی پالیسیوں پر اثر۔

آٹھواں: جناح کی مایوسی و ناکامیابی۔ ذاتی اور پبلک زندگی میں اور

نواں: ان کا قانونی طرزِ فکر جو زیادہ سے زیادہ حاصل کرنا چاہتا تھا۔

یہ تمام اسباب بالآخر ہندستان کی تقسیم کا باعث بنے۔ [ص ۹۵۔۱۹۳]

قومی دھارے سے علاحدگی:

☆ ۲۶ دسمبر ۱۹۳۸ء کو پٹنہ میں انھوں نے کانگریس کے اس دعوے کی کہ وہ نیشنل پارٹی ہے۔ تردید کی۔ انھوں نے کہا:

''کانگریس ہندو تنظیم کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔ سچائی یہی ہے اور کانگریس لیڈر اس سے واقف ہیں۔ کچھ بھٹکے اور کچھ خود غرض مسلمانوں کا اس میں ہونا اس کو نیشنل پارٹی نہیں بناتا۔ میں اُن لوگوں کو جو کانگریس کو ہندو پارٹی نہیں مانتے چیلنج

---

(۱) B. Shiva Rao, India's Freedom Movement, New Delhi, Orient Longman, 1972, p. 130

کرتا ہوں۔''(۱)

☆ کانگریس وزارتوں کے طریقۂ کار اور اس سے بڑھ کر کانگریس کے غیر مصالحانہ رویے نے جناح کے مزاج میں تلخی کا اضافہ کیا۔ ۱۹۳۷ء تا ۱۹۳۹ء کے وقفے میں جناح میں منفی سوچ پیدا ہوئی۔ وہ فرقہ پرست بن گئے۔ ہندو مسلم اتحاد میں اُن کا یقین ختم ہو گیا۔ کانگریس کو ہندو پارٹی سمجھنے لگے۔ اُس کے لیڈروں کو، ہندو لیڈر راس کے راج کو، ہندو راج اور اس کے آدرش کو ہندو ویت۔ ایک شخص جو کانگریسی ہونے پر فخر کرتا تھا۔ اُسی تنظیم کا سخت دشمن بن گیا۔ وی۔ این۔ نایک کے بقول:

''مسٹر جناح کے کٹر فرقہ پرست بننے میں کانگریس کا ہاتھ ہے۔ اگر کانگریسی سرکاروں میں منتخب مسلم لیگیوں کو مناسب حصے داری دی جاتی تو بعد میں دکھائی دینے والی کشیدگیاں، پیدا شدہ تلخیوں، اکثریت کے ظلم کے خلاف چیخ پکار سے بچا جا سکتا تھا۔ لیکن کانگریس نے ان سب کو اپنایا اور آخر میں ہندستان کی ایکتا کو برباد کرنے میں مدد کی۔ یہ بدانتظامی نہیں بلکہ انتظامیہ کا جبر تھا۔ جس نے مسٹر جناح میں کانگریس کے خلاف غصہ کو جنم دیا۔''(۲)

(۱) Ibid., pp. 304-305. Rafiq Zakaria is wrong when he says that Jinnah turned his wrath on his Hindu compatriots in the Congress on the spurious grounds that the Hindus were the real enemies of the Muslims. The fact is that he turned his wrath not only on his Hindu compatriots but also on Muslim leaders of the Congress, calling them traitors. He characterized Maulana Azad as a "Showboy".

(۲) V.N. Naik, Mr. Jinnah - A political Study, pp. 19-20. Sir Tej Bahadur Sapru too spoke of high-handedness of Congress Ministries in his letter dated 16th September 1940 to B. Shiva Rao: "You at Delhi, where there has been no responsible government, probably cannot have an idea of the experience we had of party dictatorship of Congress ministries wherever they have existed and particularly in UP and Bihar... one thing I shall say that so long as these people were in power they treated everybody else with undisguised contempt and asserted the weight of their majority in a most unfortunate manner".

☆ کے، ایم منشی کی رائے میں، جناح نے ۱۹۳۷ء میں اس قدر لاچاری محسوس کی کہ وہ کانگریس کے ساتھ کام کرنے کے لیے کوئی بھی قربانی دے سکتے تھے۔[۱] دیوان چمن لال کہتے ہیں کہ ۱۹۳۷ء میں جناح مشترکہ رائے دہندگی کے لیے تیار تھے، بشرطے کہ مرکزی قانون ساز اسمبلی میں کانگریس مسلمانوں کو ۳۳٫۳ فیصد سیٹیں دینے کے لیے تیار ہو جاتی، لیکن کانگریسی لیڈر جناح کو نبھانے کے لیے راضی نہیں ہوئے۔[۲] کئی مصنفوں کا خیال ہے کہ کانگریس نے جناح کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا۔ حال آں کہ جناح سابق پُرجوش کانگریسی اور برطانوی حکومت کے سخت مخالف تھے۔

☆ دھننجے کیر کے الفاظ میں:

''کیوں کہ جناح کو وہ توجہ اور عزت نہیں دی گئی، جس کے وہ بہ حیثیت ہندو مسلم اتحاد کے علم بردار ہونے کے حق دار تھے۔ اس لیے انھوں نے اپنے اس مقام کو ترک کر دیا اور بتدریج وہ کانگریس اور اُس کی پالیسیوں کے سخت مخالف بن گئے۔''[۳] بنی پرساد، شیوا راؤ، درگا داس، سی۔ ایس۔ وینکٹ اچاری، کانجی دوارکا داس، ڈاکٹر سی۔ آر۔ ریڈی، ایم۔ سی۔ چھاگلہ، سیتلواد، ڈاکٹر پرانجپے، بی۔ آر۔ امبیڈکر، کوپلینڈ، آر۔ سی۔ مجمدار، فرینک موریس، مشیل بریچر، ایم۔ آر۔ بیگ، راج موہن گاندھی، وغیرہ کی رائے ہے کہ ملی جلی وزارتوں کے معاملے نے بالآخر جناح کو تنہا کر دیا اور اُن کو ملک کی تقسیم کی طرف دھکیل دیا۔ سیروائی لکھتے ہیں:

''۱۹۳۷ء میں قانون ساز اسمبلیوں کے صوبائی انتخابات کے دوران کانگریس اور مسلم لیگ کی پالیسیوں میں کچھ زیادہ بڑے اختلافات نہیں تھے۔ دونوں کے درمیان یوپی میں مفاہمت تھی (جس کو دوسرے صوبوں تک وسیع کیا جانا تھا) کہ یوپی میں ملی جلی سرکار بنے گی۔ لیکن جب نہرو کی قیادت میں کانگریس کو مکمل اکثریت حاصل ہو گئی تو اس مفاہمت

(۱) Diwan Chaman Lal, Oral History Transcript, No. 220, NMML, New Delhi

(۲) K.M. Munshi, Oral History Transcript, No. 15, NMML, New Delhi

(۳) Dhananjay Keer, Mahatma Gandhi - Political Saint and Unarmed Prophet, p. 500

کو نظر انداز کر دیا گیا اور کسی مسلمان کو کانگریس وزارت میں نہیں لیا گیا، جب تک اُس نے کانگریس رکنیت حاصل نہیں کی۔''(۱)

☆ جواہر لال نہرو کے قریبی دوست مولانا ابوالکلام آزاد اپنی کتاب انڈیا ونس فریڈم میں لکھتے ہیں:... ''اگر لیگ کی تعاون کرنے کی پیش کش قبول کر لی جاتی، تو مسلم لیگ تمام عملی مقاصد کے لیے کانگریس میں ضم ہو جاتی''۔(۲)

☆ مسلم لیگ کے قاید جناح نے اس پر بے عزتی، مایوسی اور نامرادی محسوس کی۔ کانگریس نے اُن کو اتنی بھی اہمیت نہیں دی کہ اُن کے ساتھ کوئی معاہدہ کرتی۔ سروجنی نائیڈو نے بعد میں اقرار کیا کہ۔ ''ہم نے جناح کے ساتھ اچھا برتاؤ نہیں کیا''۔

مایوس و برہم جناح اُن تمام (لیگی اور غیر لیگی) عناصر کی پہنچ میں تھے۔ جو اُن کو اپنے خود غرضانہ مفادات کے لیے استعمال کرنا چاہتے تھے۔ کانگریسی لیڈروں کے برابر اپنی اہمیت جتانے اور کانگریس کو ذلیل کرنے کی غرض سے جناح نے ایسا رویہ اختیار کیا جو بالآخر اُن کو پاکستان لے گیا۔ وہ نہ تو برطانیہ کے حمایتی تھے اور نہ ہی فرقہ پرست!

ایم، این۔ رائے لکھتے ہیں:

''سچائی یہ ہے کہ اگر برطانیہ سے بے اعتمادی اور نفرت دیش بھگتی کا اعلیٰ معیار ہے تو جناح اتنے ہی بڑے دیش بھگت تھے، جتنا کہ کوئی اور ہندستانی! اس سچائی

(۱) H.M. Seervai, Partition of India: Legend and Reality, Bombay, Emmenem, 1989, p. 169

(۲) Abul Kalam Azad, India Wins Freedom, New York, Longmans and Green Co., 1960, p. 160. Sir Sikandar Hayat Khan, the Unionist Premier of Punjab had a comfortable majority. He offered a ministerial birth to the Hindu Mahasabha. Similar gesture, according to Rajmohan Gandhi, from Congress to the League in the Hindu majority provinces would have made it more difficult for Jinnah to convince the qualm that Congress was its enemy. See Rajmohan Gandhi, Eight Lives, New Delhi, Roll Books, 1986, pp. 146-57

کو جتنا زیادہ اُن کے مخالفین نے نظر انداز کیا، اُن کو جان بوجھ کر بدنام و مطعون کیا، قدرتاً اُتنا ہی زیادہ جناح برہم اور تلخ ہوتے گئے اور ''دشنام طرازی'' اُن کی سیاست کا مرکز بن گئی۔ اس کے باوجود سیاسی اقتدار حاصل کرنا اُن کی تمنا نہیں تھی۔ وہ اپنے ساتھ صرف غلط برتاؤ کا انتقام لینا چاہتے تھے۔''(۱)

اس طرح پاکستان وجود میں آ گیا۔ اس میں وہ علاقے شامل تھے جنھوں نے ہندستان سے علاحدگی کی مستقل مخالفت کی تھی۔ اس کو بنانے والا وہ شخص تھا جو اپنی زندگی کے آخر دس سالوں کو چھوڑ کر اپنے عہد کے کسی بھی مسلمان کے مقابلے میں کہیں زیادہ پرجوش وطن پرست تھے۔ کانگریسی لیڈروں کو بہت دیر میں احساس ہوا کہ جناح کو نہ نبھانے کی پاداش میں، اُن کو بہت بھاری قیمت چکانی پڑی۔ اُنھوں نے وہ موقع گنوا دیا جب جناح معقول مانگیں پیش کر رہے تھے اور اپنے پیروکاروں کو دبا سکتے تھے۔(۲) [سیکولر اور وطن پرست جناح: ۲۶۰-۶۳]

---

(۱) M.N. Roy, Men I met, New Delhi, Lalvani Publications 1968, p. 33

(۲) Shiva Rao, India's Freedom Movement, p. 133. The Congress contribution towards the creation of Pakistan is substantial. The British were in hurry to leave India and the Congress leaders were in hurry to take over the rein of political power. Pandit Jawahar Lal Nehru and Sardar Patel have stated, in their interviews that they were old, tired and could not wait more. Hence they gave their consent to Mountbatten's Award, which divided our country. But Gandhiji assured Maulana Azad 'if the Congress wishes to accept partition it will be over my dead body. So long as I am live, I will never agree to the partition of India. Nor will I, if I can help it, allow Congress to accept it.' He however rejected the suggestion that the undertake a protest fast, claming that his inner voice had not spoken. On Monday the 2nd June 1947, Gandhiji went to see Mountbatten but did not speak, as Monday was his day of silence for him. He gave a clean chit to Mountbatten saying, "The Viceroy has no hand in it. In fact he is opposed to division as Congress

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر......)

آخری ایام:

''جناح روز بروز تنہائی پسند اور چڑچڑے ہوتے جا رہے تھے۔ مملکت کے سارے اختیارات انھوں نے اپنے ہاتھوں میں لے رکھے تھے۔ ان کے ملٹری سیکریٹری کرنل برنی نے اپنی ڈائری میں لکھا ہے:

''جناح کی حالت اس بچے جیسی ہوگئی تھی جسے اتفاق سے چاند مل گیا ہو اور وہ ایک پل کے لیے اسے چھوڑنے کے لیے تیار نہ ہو''۔

ان کے پھیپھڑوں کی بیماری بڑی تیزی سے سر اٹھا رہی تھی۔ ہندستان کے خطرناک ارادوں نے ان کی نیند حرام کر دی تھی۔ جوناگڑھ، کشمیر اور پنجاب ہر جگہ انھوں نے ہندستان کی مکاری کا روپ دیکھا تھا اور وہ یہ محسوس کرتے تھے کہ ان کی نئی مملکت کا شیرازہ منتشر کرنے کا کوئی موقع ہندستان ہاتھ سے جانے نہیں دے گا۔ ہندستان کی مکاری کا سب سے بڑا تجربہ انھیں دسمبر کے وسط میں ہوا''(۱)

ایک تنہا فرد اور اس کا ذکر:

''مسلمانوں میں جناح کا دوست کوئی نہیں تھا۔ ساتھی ضرور تھے۔

جناح کا شاگرد کوئی نہیں بن سکا، ساتھ کام کرنے والے ضرور تھے۔ بہن کے علاوہ جناح کے خاندان میں کوئی اور فرد نہیں تھا، دراصل جناح کے خاندان میں دو افراد تھے ایک بہن اور دوسرا پاکستان کا خواب!

---

itself. But if both of us - Hindus and Muslims - cannot agree on anything else, then the Viceroy is left with no choice". However, on another Monday the 16th Jun 1947, he violated his vow, as he had to participate in the Congress Working Committee meeting. He therefore, observed his silence on one day earlier i.e. on Sunday. Ironically in the Congress Working Committee Gandhiji spoke in favor of Partition for forty minutes when there was strong opposition to partition resolution from several members.

(۱) آدھی رات کی آزادی: ص ۲۴۷-۲۴۶

جناح کا قد تقریباً چھ فٹ تھا لیکن ان کا وزن بمشکل ایک سو بیس پونڈ تھا۔ ان کے چہرے کی جلد اتنی کھنچی ہوئی تھی کہ گالوں کی دونوں ہڈیاں خوب اُبھر آئی تھیں۔ وہاں ان کی جلد میں ایک عجیب سی چمک تھی ان کے بال سفید، بھورے اور گھنے تھے"۔

"جناح نے اپنی زندگی کے سترہ سال ایک دانتوں کے ڈاکٹر کے ساتھ گزارے تھے ان کی بہن دانتوں کی معالج تھیں۔ اس کے باوجود ان کے پیلے دانتوں کی سڑاند میں کوئی کمی نہیں ہوئی۔ جناح ہر وقت اتنے چوکس اور مستعد نظر آتے تھے جیسے وہ گوشت ہڈی کے بجائے فولاد کے بنے ہوئے ہوں۔ لیکن یہ فولادی وجود محض دکھاوا اور دھوکا تھا اندر سے جناح کمزور، نازک اور بیمار آدمی تھے۔ ان کے ڈاکٹر نے ایک بار کہا تھا کہ "زندگی کے آخری برس انھوں نے قوتِ ارادی، وہسکی اور سگریٹوں پر گزارے"۔ (۱)

(۱) آدھی رات کی آزادی: ص۹۶

(۴)

جناح صاحب کی بے بسی و لاچاری!

ڈاکٹر اجیت جاوید نے اپنی کتاب کے چھٹے باب کا عنوان ''جناح صاحب کا المیہ'' رکھا ہے۔ البتہ یہ بات کہ مسلم لیگ کی پوری تاریخ میں جن لوگوں نے جناح صاحب کی جھڑکیاں کھائی تھیں اور کسی کو ان کے سامنے زبان کھولنے کی جرأت نہ ہوئی تھی۔ یس سر، کہتے کہتے زبان خشک ہوتی تھی۔ ''نو سر'' کے لفظ سے زبان نا آشنا ہو گئی تھی، پاکستان بننے کے بعد ان کے پر نکل آئے اور ایک ملی بھگت کے ذریعے انھوں نے جناح صاحب کی حکم عدولی شروع کر دی تھی۔ وہ بہ ظاہر آداب اور کورنش بجا لاتے تھے، زبان سے کچھ نہ کہتے تھے، لیکن ان کے حکم کو پس پشت ڈال دیتے تھے۔ ان کے بہت سے فیصلے اور عمل ایسے ہوتے تھے، جن کی جناح صاحب کو خبر بھی نہ ہونے کی کوشش کی جاتی تھی۔ ڈاکٹر اجیت جاوید نے اس قسم کی بہت سی مثالیں پیش کی ہیں جن سے جناح صاحب کی بے بسی اور لاچاری ظاہر ہوتی ہے۔ بول چال کے عام اور مستعمل الفاظ میں یا اردو محاورے میں انھیں مسلم لیگی حکومت کا ''شو بوائے'' بنا دیا گیا تھا۔ وہ اپنی زندگی سے اس درجے بے زار ہو گئے تھے کہ اس عزم کا اظہار کیا تھا کہ صحت مند ہو جائیں تو ہندستان جا بسیں گے۔ سری پرکاش سے انھوں نے ایک موقعے پر کہا:

''تمھیں پتا نہیں کہ بمبئی سے مجھے کتنا پیار ہے۔ میں اب بھی واپس وہاں جانے کے انتظار میں ہوں۔'' [ص ۳۰۰]

آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کے آخری اجلاس منعقدہ کراچی، خالق ڈنا ہال، مورخہ ۱۵ر ستمبر ۱۹۴۷ء کو ہوا تھا۔ ایم ایس ایم شرما کے حوالے سے کونسل کے ارکان کو مخاطب کرتے ہوئے جناح صاحب نے کہا تھا:

میں آپ کو بتاؤں! میں اب بھی خود کو ہندستانی سمجھتا ہوں۔ وقتی طور پر میں نے

پاکستان کے گورنر جنرل کا عہدہ قبول کرلیا ہے، لیکن اس وقت کے انتظار میں ہوں، جب میں ہندستان جاؤں گا اور اس ملک کے شہری کی حیثیت اختیار کروں گا۔'' [ص ۳۰۰]

ڈاکٹر اجیت جاوید کی بحث کا دایرہ بہت وسیع ہے۔ انھوں نے جناح صاحب کی سیاسی زندگی کی پوری تاریخ کو کھنگال ڈالا ہے اور کانگریس کے رہنماؤں، گاندھی جی، پنڈت نہرو، آخری گورنر جنرل ماؤنٹ بیٹن وغیرہم کے رویوں کی مثالوں سے اپنے مقدمے کو خوب مظبوط بنایا ہے۔ ہم اس کی تفصیل میں نہیں جاسکتے، صرف پاکستان میں جناح صاحب کے ساتھ ان کے مریدوں اور عقیدت مندوں کے رویوں تک اپنی بحث کو محدود رکھیں گے!

اس سلسلے میں مسٹر چرچل نے جناح صاحب کے ساتھ جو توہین آمیز رویہ اختیار کیا اور مسٹر ماؤنٹ بیٹن کا اپنی کرسی سنبھالنے کے تھوڑے ہی عرصے کے بعد جس طرح طور بدلا تھا اور خصوصاً ۳۱ رمئی کے بعد انھوں نے جس طرح آنکھیں پھیرلی تھیں، وہ نہایت شرم ناک اور توہین آمیز بات تھی۔ پچھلے صفحات میں اس پر ایک حد تک بحث آچکی ہے، اس کو دہرانے کی ضرورت نہیں۔ ڈاکٹر اجیت جاوید نے لیگیوں کے بدلے ہوئے رویے کی تاریخ پاکستان کے قیام کے وقت سے شروع کی ہے۔ حال آں کہ جناح صاحب اور لیگ میں موجود ایک گروپ سے ان کی کش مکش کا سراغ ۱۹۱۶ء سے ملتا ہے جب انھوں نے لکھنؤ پیکٹ کے مطابق پنجاب میں مسلم اکثریت کو اقلیت میں تبدیل کردیا تھا۔ اس کے بعد کوئی ایسا دور نہیں آیا جب ان سے لیگ کے دایرے ہی میں اختلاف کرنے والے گروپ موجود نہیں تھے، ان میں پنجاب کے مسٹر فضل حسین، سکندر حیات خان، علامہ اقبال، سر محمد شفیع، راجہ غضنفر علی، ممدوٹ وغیرہ سے ان کی مسلسل کش مکش رہی! ۱۹۳۴ء میں پنجاب میں کوئی لیگی ان سے بات کرنے اور انھیں اپنا مہمان بنانے کو تیار نہیں تھا، مجلس احرار نے عوام سے ان کے خطاب کے لیے جلسے کا انتظام کیا۔ سندھ میں سر ابراہیم رحمت اللہ، سر عبداللہ ہارون، جی ایم سید سے مختلف ادوار میں جنگ رہی، بنگال میں فضل الحق سے ایک بار نہیں کئی بار اختلاف کا بازار گرم ہوا۔ یوپی میں راجہ سلیم پور، نواب چھتاری، نواب پیرپور، سر یامین خان حتیٰ کہ نواب اسماعیل خاں تک سے کھلی جنگ، روبرو مقابلے، واضح اختلافات، ٹسل یا مجلسی

نکتہ چینی کے دور گزر چکے تھے اور یہ صرف شخصیات نہ تھیں۔ ان کے پیچھے بڑی تعداد اور موثر گروپ تھے۔ جناح صاحب کے بڑے مخالف اور نکتہ چیں یوپی میں چودھری خلیق الزماں تھے لیکن وہ سب سے زیادہ بزدل بھی تھے، اس لیے انھیں کبھی ان کے مقابلے پر آنے اور دوبدو ہونے کی ہمت نہ ہوئی، بلوچستان اور سرحد میں ۱۹۳۷ء کے بعد بھی ایک عرصے تک لیگ کا وجود نہ تھا۔ لیکن حضرت علامہ اقبال، حاجی سر عبداللہ ہارون، نواب اسماعیل خاں اور جی ایم سید کے سوا کوئی ذاتی اغراض سے بلند نہ تھا اور کوئی اصول اور اخلاق وتہذیب نہ تھی اس لیے وہ ہمیشہ ٹوٹتے اور جڑتے رہے۔ فضل الحق سے جناح صاحب کے سخت مچیٹے رہے، سر شفیع اور علامہ اقبال نے ۱۹۲۷ء میں اور اس کے بعد بھی ان کا ڈٹ کر مقابلہ کیا لیکن سیاسی فضا بدل چکی تھی، موقع نہ تھا کہ آپس میں اختلاف کریں۔ جنوری ۱۹۳۲ء میں سر شفیع کے انتقال نے اس اختلاف کے اثرات کو ہمیشہ کے لیے مٹا دیا۔ لیکن علامہ اقبال کے ایک قطعے نے اس اختلاف کو تاریخ کا ایک یادگار واقعہ بنا دیا۔ یہ تاریخی قطعہ چوں کہ علامہ مرحوم کے کسی مجموعۂ کلام میں جگہ نہیں پا سکا ان لیے قارئین کرام کے ذوق کی تسکین اور ضیافتِ طبع کے لیے درج کیا جاتا ہے:

لندن کے چرخ نادرۂ فن سے پہاڑ پر
اترے مسیح بن کے محمد علی جناح
آغا امام ہے تو محمد علی ہے باب
اس دین میں ہے ترک سواد حرم مباح
بشریٰ لکم کہ منتظر ما رسیدہ ہست
یعنی حجاب غیبتِ کبریٰ وریدہ ہست (۱)

علامہ مرحوم کا یہ قطعہ ان کی شاعری کا ایک نادر ادب پارہ ہے۔ اسے تاریخ سے حذف اور مٹا نہیں دیا جا سکتا۔ لیکن اس قطعے کا اپنے کلام کے مجموعے میں محفوظ نہ کرنا ان کے بلند اخلاق کی بھی بڑی دلیل ہے۔ لیکن جناح صاحب ان کے اختلاف کو کبھی بھلا نہیں سکے اور

(۱) روزنامہ زمیندار۔ لاہور۔ مورخہ ۹ رنومبر ۱۹۳۴ء

جب انھیں موقع ملا ان کے تدبر کی نفی کر کے انھیں ایک شاعر کی خوبی سے متصف کیا ہے اور کسی شاعر کے مقام اور اس کے فلسفہ وشاعری کے بارے میں جناح صاحب کی رائے کی قیمت معلوم!

مسلم لیگ کے بارے جناح صاحب کی مخالفتوں کے تانے بانے بہت دور تک پھیلے ہوئے تھے، اور بعض مخالفین نے ان سے مقابلہ بھی کیا تھا۔ اس میں کسی فریق کے غلط یا صحیح موقف سے ہمیں کوئی غرض نہیں۔ ہر کسی نے ان سے بدلہ لیا تھا۔ لیکن لیگ کے رہنماؤں کا معاملہ مختلف تھا۔ ہر کسی کے مفاد اور اغراض نے انھیں ایک دوسرے کے ساتھ متحد کر دیا تھا۔ ایک دوسرے کو برداشت کرنا، ان کے اغراض کا تقاضا تھا۔ اخلاق وتہذیب کی ضرورت اور دوستی ورواداری اور سماج کی روایات نہ تھیں جن کا لحاظ کیا جاتا۔ چناں چہ لیگیوں کو جوں ہی احساس ہوا کہ اب وہ وقت آ گیا ہے کہ لیگ سے اپنے تعلقات کی قیمت اور جناح صاحب سے اپنے قرب وروابط کے جھوٹے سکوں کو بھنا لیا جائے، انھوں نے انھیں بھنا لینے میں تاخیر نہیں کی اور چوں کہ غرض مندوں کا قبیلہ بڑا تھا اور غرض ایک تھی سب نے جناح صاحب کو نظر انداز کر دیا تھا۔

پاکستان میں لوٹ مار اور قتل وخون ریزی کا بازار گرم تھا۔ لوٹ مار اور قتل وخون ریزی کی اس گرم بازاری میں ہر حرام جائز کر لیا گیا۔ حالات نے جناح صاحب کو بے بس کر دیا تھا۔ حالات کی سنگینی اور جناح صاحب کی حالت زار پر تبصرے کے ذریعے سمجھانے کے بجائے مناسب ہوگا قارئین کرام کو ان کے مطالعے کی دعوت دی جائے۔

قارئین کرام ڈاکٹر اجیت جاوید کی تحقیق اور اس کے حاصلات کا مطالعہ فرمائیں اور ان کے حسن کاوش اور سادہ وسنجیدہ اسلوبِ تحریر سے لطف اندوز ہوں۔ اس سے آگے ان کی تحریر شروع ہوتی ہے۔ (ا۔س۔ش)

''اب جناح صاحب'' خود اپنی جگائی (ہوئی) قوتوں کے سامنے بے بس اور مجبور تھے۔ (خودغرض اور) جنونی لوگوں نے پاکستان بننے تک ان کو برداشت کیا تھا۔ اب ان کو جناح کی ضرورت نہیں تھی۔ ان کی مقامی اساس بھی نہیں تھی۔ (انھوں نے کراچی کی نہیں)

ممبئی کی خدمت انجام دی تھی۔'' (اور ایک تاریخ رقم کی تھی)۔ [ص ۹۷۔۲۹۶]

کیوں کہ وہ ممبئی والے تھے۔ جناح گورنر جنرل پاکستان، سپریم کمانڈر افواجِ پاکستان، صدر دستور ساز اسمبلی اور صدر مسلم لیگ تھے۔ اس لیے مخالفین حاسدین کے سینوں پر سانپ لوٹ رہے تھے۔

''اب وہ اخباری پروپیگنڈے اور جسمانی حملے کے نشانے پر تھے (یعنی ان کی جان کے لیے بھی خطرہ تھا۔) جناح صاحب نے انھیں تقسیم سے پہلے استعمال کیا تھا۔ انھوں نے پاکستان بننے سے قبل ان کی باتوں کو برداشت کیا تھا۔ اب انھوں نے ارادہ کر لیا تھا کہ وہ ان کے پسندیدہ اقدامات کو ناکارہ کر دیں گے اور سخت رکاوٹیں کھڑی کریں گے۔ پاکستان میں جناح اور ان کے ہم خیال جدید ترقی پسند اور سیکولر لوگوں کی رجعت پسندوں کو کوئی ضرورت نہیں تھی۔ ان حالات میں جناح کی حالت قابلِ رحم تھی۔ دستور ساز اسمبلی میں ان کی تقریر نے ایسا ''نفرت کا طوفان اٹھایا کہ (ان کے قریبی پیروکاروں میں بھی) اس کا ازالہ کرنے کے لیے ان کو سب کے سامنے نماز پڑھنی پڑی۔ یہ ایسا کام تھا جو اپنی سیاسی زندگی میں انھوں نے نہیں کیا تھا۔[1] ان کی تقریروں کے بہت سے حصے اکثر پاکستانی اخباروں نے نہیں چھاپے۔'' [ص ۲۹۷]

فاضل مصنفہ ڈاکٹر اجیت جاوید نے رجعت پسندوں کی اصطلاح اکثر جگہ علمائے دین اور مذہبی ذوق رکھنے والوں کے لیے استعمال کی ہے۔ مجھے شبہ ہے کہ یہاں بھی ان کا یہی منشا ہے۔ اگر ایسا ہو تو یہ درست نہیں! جناح صاحب کے انتقال تک بلکہ اس کے بعد ایک عرصے تک خدائی خدمت گار اور احرار اسلام کے کسی اخبار یا ان کے کسی رہنما کی زبان و قلم سے کوئی دشنام تو دور کی بات ہے، کوئی اختلافی بحث چھیڑی ہی نہیں گئی۔ جمعیت علمائے ہند کا پاکستان میں وجود نہ تھا۔ جمعیت علمائے اسلام (کلکتہ) خود جناح صاحب یا ان کی لیگ کا خود کاشتہ پودا تھا۔ اس کے سب سے بڑے رہنما مولانا شبیر احمد عثمانی تھے۔ ان کے منہ پر تالا لگ گیا تھا۔ ان میں اتنی جرأت نہ تھی کہ وہ مسلم قومیت اور ملت واحدہ کے تصور کو قتل ہونے

(۱) پاکستان ایکسرے، از ہاشو کیول رامانی ص ۵

اور اسلامی نظریۂ سیاست اور اسلامی نظام حکومت کو منسوخ اور سیکولر ہونے سے بچا لیتے۔ ۱۳ر جولائی ۱۹۴۷ء کی پریس کانفرنس (دہلی) میں ان کے افکار عام ہو چکے تھے اور ۱۱ر و ۱۳ر اگست کو قانون ساز اسمبلی کے اجلاسوں میں وہ شریک تھے کتنی ہی نگاہیں حضرت عثمانی کے چہرے پر لگی اور کان ان کی زبان سے کلمۂ حق سننے کے منتظر تھے، لیکن مسلکِ سیاست، لیگ سے وفاداری اور جناح صاحب سے ذوقِ ارادت نے انھیں کچھ سوچنے اور زبان کھولنے کی اجازت ہی نہیں دی۔ ان کی سیاست نے ہندستان میں مسلمانوں کی جان و مال اور عزت و آبرو کے لیے جو مسایل اور زندگی کے لیے جو مشکلات پیدا کر دیے تھے، نیز دارالعلوم دیوبند کی تباہی کے لیے جو سرو سامان مہیا کر دیے تھے، ان کارناموں کے بعد انھیں کسی بات پر غور کرنے اور کسی مسئلے پر سوچنے کی ضرورت ہی باقی نہ رہی تھی۔ اہل حدیث تاریخ کے نئے دور میں اپنی جماعتی زندگی کے قیام کی فکر میں تھے اور ویسے بھی وہ کسی کے گناہوں کے اعداد و شمار کا شوق نہ رکھتے تھے۔ بریلی، بدایوں، لاہور وغیرہ کے بریلوی اس ذوق ہی سے نا آشنا تھے۔ جماعت اسلامی نے سبقت بالخیرات کا قدم اٹھایا ہی تھا کہ گرفتاری کا مرحلہ پیش آ گیا۔ استقامت کا قدم ڈگمگایا اور صلح و صفائی یا فرار میں عافیت تلاش کر لی۔ ''مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش'' میں جناح صاحب اور ان کی سیاست و سیرت پر بعض تعریضات و طنز تھے۔ وہ اس سے حذف کر دیے اور کتاب کا نام بدل کر کسی صراحت کے بغیر نئی تالیف کے طور چھاپ دیا اور اپنے عمل سے اپنے اس عقیدے کا اعلان کر دیا کہ کوئی اور تنقید سے ماورا ہو نہ ہو جناح صاحب ضرور تنقید سے بالا ہیں۔

بس! کہنا یہ چاہتا ہوں کہ رجعت پسند جنھوں نے جناح صاحب کو دشنام سے نوازا اور ان کے خلاف طوفانِ بدتمیزی کھڑا کیا تھا۔ وہ باہر کے لوگ نہیں، لیگ کے مفاد پرست اور خود غرض لوگ ہی ہوں گے، جنھیں جناح صاحب ہی نے سیاست کے گر سکھائے تھے اور یہ ان کے نکتہ چیں اور دشمنِ اخلاق و تہذیب، جس فصل کے برگ و بار تھے، وہ انھی کی بوئی ہوئی تھی۔ (ا۔س۔ش)

''قاید ملت لیاقت علی خاں کی بیوی (مس پنت) یو پی کی ہندو برہمن تھیں۔ ان کو

دوسری ''زارینہ'' کہا گیا۔ بدنام کرنے کے لیے یہ بھی اڑائی گئی کہ پاکستان کو برباد کرنے کے لیے وہ ہندستان کے ہاتھوں میں کھیل رہی ہیں۔ (۱)

اگر رتی زندہ ہوتیں تو ان کا بھی یہی حشر ہوتا۔ دینا نے ایک عیسائی سے شادی کی تھی اور وہ اپنے باپ کے ساتھ پاکستان نہیں گئی تھی۔ فاطمہ جناح نے ساڑی چھوڑ شرارہ وقمیص پہننی شروع کردی تھی اس لیے ان کو ''مادر ملت'' کا خطاب ملا۔ اچکن اور شلوار میں جناح کی تصویریں پاکستان میں تمام سرکاری دفتروں اور عوامی جگہوں کی زینت بنیں۔ وطن پرست اور سیکولر جناح کا ماضی دفن کردیا گیا۔ جب بھی اس کی تمنا اور یادیں جناح میں ابھرتیں تو وہ خود کو تنہا پاتے۔ کوئی ہمدردی ودلاسا دینے والا نہیں تھا۔

۱۵/دسمبر ۱۹۴۷ء کو آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس میں لیگ کو غیر فرقہ پرست قومی تنظیم بنانے کی اور اس کی رکنیت کو تمام پاکستانیوں کے لیے بلا تفریق ذات، عقیدہ، نسل اور مذہب کھولنے کی جناح نے ''ان تھک'' کوشش کی، مگر ناکام رہے۔ (۲)

بار باران کو یاد دلایا گیا کہ وہ ''باہر'' کے ہیں۔ محمد ایوب کھوڑو نے سرعام جناح کی حکم عدولی کی اور کراچی کو صوبائی انتظامیہ سے علاحدہ کرنے میں اڑچنیں ڈالیں۔ اور اپنی وزارت میں ایسا ہونے نہیں دیا۔ انھوں نے جناح کو قاید اعظم نہیں مانا اور کہا۔ مسٹر جناح سے کہنا کہ ''کراچی اب بھی میرا ہے۔'' (۳)

ان کے ہر قدم پر رکاوٹیں ڈالی جاتی تھیں حتیٰ کہ وہ آزادی کے ساتھ کوئی فیصلہ نہیں کرسکتے تھے۔ ایم ایس ایم شرما لکھتے ہیں:

''میں نے قاید سے اینی بیسنٹ کی یوم پیدایش کی میٹنگ کی صدارت کرنے کی درخواست کی لیکن انھوں نے خاموشی سے معذرت کرلی۔ انھوں نے کوئی پیغام

---

(۱) پاکستان ایکسریڈ: ہاشو کیول رامانی، دہلی، ۱۹۵۱ء، ص ۵۴

(۲) موڈرن مسلم انڈیا اینڈ دی برتھ آف پاکستان: ایس ایم اکرام، لاہور، ۱۹۶۵ء، ص ۳۱۸

(۳) Jyoti sen Gupta, Eclipse of Pakistan. Calcutta, Revco, 1963, p.III

بھی نہیں بھیجا۔ حال آں کہ انھوں نے مجھ سے ان کے بارے میں اور ہندستان کے لیے اینی بیسنٹ کی خدمات کا شاندار الفاظ میں تذکرہ کیا۔ مجھے احساس ہوا کہ جناح کھل کر ہندوؤں سے تعلق کا اظہار کرنے سے خوف زدہ تھے۔‘‘(۱)

’’وہ نہ تو فرقہ پرستوں کو اور نہ ہی ترقی پسند اقلیتی قوتوں کو خوش کر سکے۔ مارچ ۱۹۴۸ء میں ڈھاکہ یونیورسٹی کے جلسۂ تقسیم اسناد (کرزن ہال) میں انھوں نے اردو کو پاکستان کی واحد قومی زبان ہونے کا اعلان کیا۔ طلبہ نے مخالفت کی۔ انھوں نے سیکریٹریٹ کے پھاٹک پر مخالفانہ مظاہرہ کیا، جہاں جناح کیبنٹ روم میں صوبائی وزیروں سے ملاقات کر رہے تھے۔ اسکولوں اور کالجوں میں ہڑتالیں ہوئیں اور کچھ طلبہ کو گرفتار کر لیا گیا۔‘‘(۲)

’’بے عزتی، دل شکنی اور مایوسی کی خاطر انھوں نے کانگریس چھوڑ دی تھی اور پھر کبھی اس میں شامل نہیں ہوئے۔ بالکل اسی قسم کا برتاؤ اب اپنے بنائے ہوئے ملک کے لیڈروں کے ہاتھوں سہنا پڑ رہا تھا۔ یہ وہ لوگ تھے جو تقسیم سے پہلے ان کو ناخوش اور تنہا کرنے کی جرأت نہیں کر سکتے تھے اور ان کے احکامات کو آسمان سے اترا ہوا مانتے تھے۔

ہندستان میں ہندو، سکھ اور مسلمان ان سے نفرت کرتے تھے اور پاکستان میں مہاجر مسلمان انھیں کوستے تھے، جنھوں نے ہندستان میں اپنا گھر بار اس امید پر چھوڑا تھا کہ پاکستان میں جنت ملے گی۔ ان کو لگتا تھا کہ ان سے دغا کی گئی ہے۔ پاکستان کا افتتاح ہونے کے ایک ہفتہ بعد کچھ مسلمان مہاجرین خطرناک ہتھیاروں سے لیس گورنمنٹ ہاؤس میں گھس گئے۔ وہ جناح کو مارنا چاہتے تھے مگر گرفتار کر لیے گئے۔‘‘(۳)

’’بالکل اسی طرح ہندستان میں ہندو اور سکھ شرنارتھی بے حد غصے میں تھے۔ وہ مسلمانوں کو بچانے کے لیے گاندھی جی کے مشن سے ناراض تھے۔ جب کہ ان کے عزیزوں اور پیاروں کو مغربی پاکستان میں بے دردی سے قتل کر دیا گیا تھا۔

(۱) پیپس انٹو پاکستان: ص ۱۵۷

(۲) اکلپس آف پاکستان: گپتا جیوتی سین، ص ۳۵، ۱۲۴

(۳) ایم ایس ایم شرما، ص ۱۴۶

مختلف مخالف سیاسی طبقوں نے مہاجرین کو جناح کے خلاف مظاہروں کے لیے اکسایا۔ لاہور میں ۱۱ر ستمبر ۱۹۴۷ء کو ایک مظاہرے میں ''ایک مشتعل بھیڑ نے جناح کا پتلا نکالا، نعرے لگائے۔ ''جناح ہائے ہائے'' ''ممدوٹ ہائے ہائے'' ''دولتانہ ہائے ہائے۔'' مسلم نیشنل گارڈ کے رضا کاروں نے بھیڑ کو سیکریٹریٹ کے سامنے روک لیا۔ ممدوٹ نے بھیڑ کو ڈانٹ لگائی، کہا۔ ''تم پاکستان کے دشمن ہو۔'' بھیڑ میں سے ایک آدمی نے اچھل کر ان کو تھپڑ لگائے۔''(۱)

۲۵ر ستمبر ۱۹۴۷ء کو لاہور میں جناح کے خلاف ایک اور مظاہرہ ہوا۔ جناح پریشان اور مجبور تھے۔ اور اپنے مکان میں قیدی تھے۔ (۲) وہ خود کو تنہا محسوس کر رہے تھے اور شدت سے ایک دوست کی کمی کا احساس ہو رہا تھا، جس سے وہ اپنے دل کی بات کہہ سکتے۔''(۳)

پاکستان میں اقلیتوں کا اعتماد وہ پہلے ہی کھو چکے تھے۔ جنھوں نے جناح کے اس وعدہ پر بھروسا کیا تھا کہ

۱) پاکستان ایک جمہوری ملک بنے گا اور

۲) ان کے جان ومال کی پوری حفاظت کی جائے گی۔ انھوں نے اس لیے وہاں رہنے کا فیصلہ کیا تھا۔

اب انھیں جناح کے وعدے پر بھروسا کرنے کی قیمت چکانی تھی۔ ان کا بیدردانہ قتل، لوٹ کھسوٹ، عورتوں کی عصمت دری، جبریہ تبدیلی مذہب اور ضعیف وکمزور لوگوں کی بے بسی ولاچاری نے جناح جیسے فولادی انسان کو بھی رُلا ڈالا۔ ہندوؤں کے ایک رفیوجی کیمپ میں ان کی حالت زار دیکھ کر وہ بے قابو ہو گئے اور رو پڑے۔ (۴)

اسی طرح پاکستان میں اقلیتوں کا محافظ اعلیٰ خود بے بس ولاچار انسان تھا۔ ان کی

(۱) پولیٹیکل کنسپاریسیز ان پاکستان: جمنا داس اختر، ص ۸۱

(۲) ایم ایس ایم شرما، ص ۱۴۱

(۳) پاکستان. برتھ اینڈ ارلی ڈیز: سری پرکاش، ص ۵۶

(۴) ایس ایم اکرام وایم ایس ایم شرما، بحوالہ جات سابق

سرپرستی ان کے عزیز ترین دوست ڈالمیا کو حفاظت کی یقین دہانی نہیں دلاسکی ان کو پاکستان کو خیر باد کہنا پڑا۔ ایم ایس ایم شرما اور جوگندر ناتھ منڈل جلد ہی وہاں سے چلے آئے۔

''ہندو سماج کے بہترین عناصر کی حمایت وتائید کے بل پر متحدہ ہندستان میں انھوں نے پاگل ملّاؤں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا تھا۔ وہی ملّا اب اسے پیچھے ہٹنے کے لیے ڈرا دھمکا رہے تھے۔ ان کے محافظ ان کی جان کے دشمن تھے۔ پارٹی کے انتہا پسند استحصال کرنے میں لگے ہوئے تھے۔ رجعت پسندوں کے غلبے سے لوگ دکھی تھے۔ بوڑھے قاید اعظم خود ساختہ و بے ہنگم دنیا میں مجبور و بے بس قیدی تھے۔ (۱)

ہندستان لوٹ جانے کی آرزو:

ان کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ اپنے ماضی سے ناتا توڑ نہیں سکتے تھے۔ وہ ہندستان واپس آنا چاہتے تھے۔ وہ فی الحقیقت خود کو ہندستانی مانتے تھے۔ جناح جیسے شخص کے لیے یہ بڑا المیہ تھا۔ آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کی میٹنگ منعقدہ کراچی میں انھوں نے کہا:

> ''میں آپ کو بتاؤں! میں اب بھی خود کو ہندستانی سمجھتا ہوں۔ وقتی طور پر میں نے پاکستان کے گورنر جنرل کا عہدہ قبول کرلیا ہے۔ لیکن اس وقت کے انتظار میں ہوں جب میں ہندستان واپس جاؤں گا۔ اور اس ملک (بھارت) کے شہری کی حیثیت اختیار کروں گا۔'' (۲)

جناح صاحب نے یہ بھی محسوس کیا کہ گاندھی جی مسلمان مخالف نہیں تھے۔ انھوں نے کہا: ''وہ مسلمانوں کے سچے دوست ہیں اور ہندستان کے مسلمانوں کو صرف ان کی رہنمائی میں چلنا چاہیے یہی ان کا تعویذ ہے۔'' (۳)

جناح کا دل کراچی کے گورنمنٹ ہاؤس میں نہیں بلکہ ممبئی کے مالا بارہل کے مکان میں اٹکا تھا۔ سری پرکاش نے جب انھیں بتایا کہ ہندستانی حکومت ان کے مکان کو اپنی تحویل میں

(۱) پاکستان ایکسریڈ: ہاشوکیول رامانی، دہلی، ۱۹۵۱ء ص ۱۲

(۲) پیپس انٹو پاکستان: ایم، ایس، ایم شرما، ص ۱۸۵

(۳) ایضاً: ص ۱۸۳

لے رہی ہے، تو وہ سکتہ میں رہ گئے اور قریب قریب گڑگڑاتے ہوئے سری پرکاش سے کہا:

"سری پرکاش میرا دل نہ توڑو۔ جواہر لال نہرو سے کہنا میرا دل نہ توڑے۔ میں نے ایک ایک اینٹ کر کے اس کو بنایا ہے۔ ایسے مکان میں بھلا کون رہ سکتا ہے؟ (۱)

آگے کہا: تمھیں پتا نہیں کہ مجھے ممبئی سے کتنا پیار ہے۔ میں اب بھی واپس وہاں جانے کے انتظار میں ہوں۔ "کیا واقعی مسٹر جناح"! سری پرکاش نے کہا "آپ واپس ممبئی جانا چاہتے ہیں؟ میں جانتا ہوں، ممبئی آپ کی بڑی خدمات کے لیے جو آپ نے اس شہر کے لیے کی ہیں، کس قدر قرض دار ہے۔ کیا میں وزیراعظم (جواہر لال نہرو) کو بتادوں کہ آپ ممبئی جانا چاہتے ہیں؟ جناح نے جواب دیا "ہاں آپ بتادیں!" (۲)

ان کا قانونی دماغ اس کو عدالت، خود کو وکیل گردانتا تھا، جس نے مسلمان علاحدگی پسندوں کا مقدمہ لڑا، جیتا اور پاکستان دلا دیا اور اب لاکھوں کے مرنے اور بے گھر ہونے کے بعد مالابار ہل ممبئی میں اپنے گھر آنا چاہتا تھا۔ اُن کو پاکستان سے کچھ لینا دینا نہیں تھا۔ تقسیم قبول کرنے کے بعد نئی دہلی کے امپیریل ہوٹل میں منعقدہ لیگ کی جنرل کونسل کی میٹنگ میں انھوں نے اپنے ردعمل کا اظہار اس طرح کیا:

"میں نے آپ کے لیے پاکستان جیت لیا ہے۔ اب آپ جو چاہے کریں۔" (۳)

غلطی کا اعتراف:

بیمار اور اداس جناح کرب میں روتے تھے۔ "میں نے پاکستان بنا کر زبردست غلطی کی ہے۔ دہلی جا کر جواہر لال نہرو سے کہوں گا کہ ماضی کی حماقتیں بھولو اور پھر دوستی کر لو۔" (۴)

وہ لیاقت علی خان سے بھی نفرت کرتے تھے جن کے کہنے پر انگلینڈ سے وہ ہندستان

(۱) سری پرکاش، ص ۱۸۳

(۲) ایضاً: ص ۸۴

(۳) مین (Men) آئی میٹ: ایم. این رائے، دہلی، ۱۹۶۸ء ص ۳۲

(۴) دی ٹائمز آف انڈیا: ۱۱ر ستمبر ۱۹۸۸ء

لوٹے اور مسلم لیگ کی قیادت سنبھالی تھی۔ (۱)

ایک جنونی ہندو کے ہاتھوں گاندھی جی کے قتل نے انھیں شاید مزید مایوس کر دیا تھا۔ ۱۹۴۷ء سے ۱۹۴۸ء کے درمیان اُن پر چار جان لیوا حملے ہوئے۔ اُن کے حفاظتی انتظامات سخت کر دیے گئے مگر لگتا تھا کہ (اب انھیں) زندہ رہنے کی خواہش نہیں رہی تھی۔ ۲۴/اگست کو جناح نے ڈاکٹر بیش کو بتایا۔ ''میں زندہ رہنا چاہتا تھا اور اب میرے زندہ رہنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔'' ڈاکٹر نے ان کی آنکھوں میں آنسو دیکھے۔ (۲)

تقسیم ہند کے الم ناک نتائج زندگی کے آخری دنوں میں بھوت بن کر اُن پر چھا گئے تھے۔ '' (۳)

جناح ۱۱/ستمبر ۱۹۴۸ء کو وفات پا گئے۔ جناح کو کافر کہنے والے جنونی مسلمانوں نے اطمینان کی سانس لی۔ جماعت اسلامی کے امیر مولانا مودودی نے اُن کی نماز جنازہ پڑھانے سے انکار کر دیا۔ اس کے بجائے انھوں نے۔ ''نماز شکرانہ ادا کی۔ اور یوم مسرت منایا۔ '' (۴-۵)

---

(۱) جمنا داس اختر، ایضاً: ص ۸۲

(۲) جناح. کریئیڑ آف پاکستان: ہیکٹر بلیتھو، ص ۲۸۲

(۳) ایضاً

(۴) جمنا داس اختر، ایضاً: ص ۲۱۵

(۵) کہا جاتا ہے کہ جناح صاحب کا انتقال زیارت (کوئٹہ۔ بلوچستان) ہی میں ہو گیا تھا۔ کراچی ان کی میت ہی آئی تھی۔ گورنر جنرل ہاؤس کراچی میں شیعہ فرقہ کے طریقے پر ان کا غسل اور تکفین ہوئی اور شیعہ خوجہ مذہب مسلک کے مطابق ان کی نماز جنازہ پڑھی گئی، جس میں ۸، ۱۰ حضرات سے زیادہ نمازی شریک نہیں تھے۔ نماز کے بعد میت کو فوج کے حوالے کر دیا گیا۔ جس نے اپنی نگرانی میں میت کو تدفین کے مقام پر پہنچایا۔ وہاں جو صبح سے لاکھوں مسلمان جمع تھے، انھوں نے مولانا شبیر احمد عثمانی کی امامت میں نماز پڑھی۔ اس میں کوئی اور شریک نہیں ہوا تھا۔ چودھری ظفر اللہ خاں مجمع میں شامل تھے۔ نماز

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر......)

اس طرح حکمت عملی کے تحت ان کی چال (پاکستان ریزولیوشن) نے ان کو اس قدر تنگ، دم گھونٹنے والے مصیبت کے جال میں پھنسا دیا تھا کہ اس سے وہ نکل نہ پائے اور بالآخر المیہ انجام تک پہنچے۔''

[سیکولر اور وطن پرست جناح: ڈاکٹر اجیت جاوید، ۲۰۰۶ء: ص ۳۰۱-۲۹۶]

پاکستان نہ بنا تو کیا آسمان ٹوٹ پڑے گا

راجہ صاحب محمود آباد کی یہ روایت مختار مسعود نے اپنی تالیف لطیف **آواز دوست** میں نقل کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''جنوری ۱۹۴۷ء میں ایک روز راجہ صاحب نے دل لگی میں قایداعظم سے پوچھا:

اگر پاکستان نہ بن سکا تو پھر کیا ہوگا؟

بہ قول راجہ صاحب کے، قایداعظم نے جواب دیا: آسمان تو گرنے سے رہا!

راجہ صاحب نے کہا: میں مذاق نہیں کر رہا!

قایداعظم نے (برجستہ) جواب دیا: میں بھی مذاق نہیں کر رہا!''

میں شریک نہیں ہوئے۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کراچی میں موجود نہ تھے۔ جناح صاحب کی وفات ایک سانحہ تھا اور میرا دل قبول نہیں کرتا کہ کسی سنگ دل نے ان کی وفات پر ''نماز شکرانہ'' پڑھی ہو اور ''یوم مسرت'' منایا ہو۔ لیکن جمنا داس اختر ایک سلجھے ہوئے ذہن کے ذمے دار صحافی ہیں ان کا حوالہ غلط نہیں ہے۔ یہ حوالے کے ماخذ میں بیان کی غلطی ہے۔ اور اگر میرا یہ خیال درست ہے تو یہ انھیں دشمنانِ جناح میں سے کوئی ہوگا۔ جن کا ذکر ڈاکٹر اجیت جاوید کی کتاب کے آخری صفحات کے حوالوں میں اشارۃً وکنایۃً آیا ہے۔

(۵)

مسٹر جناح کا عہد کس مپرسی و بے بسی یا قدرت کا انتقام

مولانا ابوالکلام آزاد کا ایک قول کہیں نظر سے گزرا ہے۔ مولانا نے فرمایا:

''ہر فعل اپنی ایک تاثیر رکھتا ہے اور قدرت کا نظام ہے کہ ایک وقت آئے اور اس کا ظہور ہو۔''

یہ مولانا کی زبان سے یا قلم سے نکلے ہوئے الفاظ تو نہیں، لیکن ان کے مفہوم کا احاطہ ضرور کرتے ہیں۔ جناح صاحب ایک خاص ذوق و مزاج کے شخص تھے۔ ملک کی سیاسیات میں ان کا اپنا ایک ڈھنگ تھا۔ ان کا ایک طرزِ بیان تھا، اس کی زبان تھی۔ اس کا لہجہ تھا جس نے نوجوانوں کو بطورِ خاص متاثر کیا۔ یہ نوجوان مسلم لیگ کے کارکن بھی تھے اور کالجوں یونی ورسٹیوں کے طالب بھی تھے۔ جناح صاحب نے اپنے مخالف معاصرین کے نام بھی رکھے۔ گاندھی جی، پنڈت نہرو، مولانا محمد علی، ڈاکٹر ذاکر حسین، مولانا حسین احمد مدنی، مولانا ابوالکلام آزاد وغیرہم کے انھوں نے طنزیہ نام رکھ چھوڑے تھے۔ بیشتر اُن کی نظر میں غدار تھے۔ علمائے دین ان کے نزدیک قابلِ گردن زدنی تھے۔ انھوں نے قوم ملت کی خدمت کا کوئی کارنامہ انجام دیا ہو یا نہ دیا ہو، لیکن نوجوانوں پر انھوں نے یہ احسان خوب جتایا کہ انھوں نے مولویوں سے نوجوانوں اور مسلمانوں کو نجات دلا دی ہے!

جناح صاحب نے یہ بات ان مولویوں کے بارے میں کہی تھی جن سے ۱۹۳۷ء میں انھوں نے الیکشن میں تعاون اور مسلم لیگ کی سیاست کا رُخ بدلنے اور ان کی رائے اور مشورے کے مطابق عمل کرنے کا عہد کیا تھا اور الیکشن سے فراغت کے بعد انھیں علما کو جناح صاحب نے لیگ سے نکال دیا تھا اور اس کے بعد کامل دس سال تک وہی علمائے دین لیگ کی سیاست کا ہدف بنے رہے تھے۔ جن پر اتہام لگائے گئے تھے۔ جنھیں ہندو کا ایجنٹ اور زرخرید کہا گیا تھا۔ جن کی دین داری پر پھبتیاں کسی گئی تھیں۔ جن کی جان لینے کی کوشش کی

گئی۔ جن کی داڑھیوں کو نوچا گیا تھا، شراب ڈالی گئی تھی۔ جن کی ٹوپیوں اور پگڑیوں کو پیروں تلے روندا گیا تھا۔ جن کے جنازے پڑھے جانے اور قبرستانوں میں دفن کرنے میں رکاوٹ ڈالی گئی تھی۔ جنھیں کشمیر کی جھیل میں ڈبونے کی کوشش کی گئی تھی۔ جنھیں سفر میں علی گڑھ سے گزرتے ہوئے ذلیل کیا گیا تھا۔ جن کے منہ پر تھوکا گیا تھا۔ جس کے سامنے مسلمان نوجوانوں نے اپنے تئیں ننگا کر دیا تھا اور جن شرم ناک افعال پر بے حیائی کے قہقہے لگائے گئے تھے۔ افسوس اس کھیل میں استعمال کیے جانے والے اور انھیں استعمال کرنے اور شہ دینے والوں سے دونوں ہی کا انجام بہت بھیانک ہوا۔ اس کھیل میں اگرچہ جناح صاحب بہ ذات خود شریک نہیں تھے لیکن یہ انھیں کے طرزِ سیاست اور تربیت کا نتیجہ تھا۔ انھوں نے ادبی روایت کے مطابق ملا کی کردار کشی نہیں کی تھی بلکہ ابوالکلام اور حسین احمد کا نام لے کر ان کی کردار کشی کی تھی اور نفرت پھیلائی تھی۔ اس کے بعد کچھ کہنے کی ضرورت ہی نہ تھی۔ ڈاکٹر ضیاء الدین نے علی گڑھ کے حادثے پر افسوس و معذرت کا اظہار کیا تو ان کو جھڑک دیا تھا۔ لیگی اخبارات کی روش مسلم لیگ کی طرزِ سیاست اور جناح صاحب کے ذوق اخلاق کے عین مطابق تھی۔

میں نے اس مضمون کا آغاز مولانا ابوالکلام آزاد کے ایک قول سے کیا تھا۔ قارئینِ محترم واقعات و حوادث کا خود تجزیہ کر کے فیصلہ کیجیے کہ جناح صاحب کے ساتھ آنے والے واقعات میں کن اعمال کی تاثیر کا ظہور ہوا تھا؟ اور دونوں میں کتنا عبرت انگیز فرق بھی نظر آتا ہے۔

حضرت مولانا سیّد حسین احمد مدنی کے ساتھ سیّد پور (بنگال) بھاگل پور (بزار) گیا (بہار) اور امرتسر (پنجاب) میں جو کچھ ہوا، مولانا ابوالکلام آزاد کے ساتھ علی گڑھ (یوپی) اور سری نگر نیشنل کانفرنس کے دریائی جلوس پر مسلم کانفرنس کے لوگوں نے حملہ کیا۔ مولانا آزاد، پنڈت نہرو، عبدالغفار خان جلوس میں شریک تھے اور کشتیوں میں بہت لوگ سوار تھے۔ ان پر پتھراؤ ہوا، ایک شخص ہلاک اور بیسیوں پتھراؤ سے زخمی ہوئے۔

مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی پر کلکتہ میں قاتلانہ حملہ ہوا، مولانا ابوالوفا شاہ جہان پوری

اور مولانا محمد قاسم شاہ جہان پوری پر ان کے دوروں کے درمیان کئی بار حملے ہوئے مولانا عبدالہادی خان پر لیگ کے ایک ایسے جلوس نے حملہ کیا جس کی قیادت شاہ جہاں پور کے کریم الرضا خاں کر رہے تھے۔ پورے ملک میں جمعیت علماے ہند کے علما اور کرکن خطرات میں گھرے اور اپنی جانوں کو ہتھیلیوں پر لیے ہوئے قوم و وطن کی تحریک آزادی میں سرگرم کار تھے۔

جمعیت علماے ہند کے رہنماؤں پر قیامت ڈھائی جا رہی تھی۔ وہ جاہل مسلمان کی طرف سے تھی، جنھیں بھڑکایا جا رہا تھا۔ وہ عقل سے محروم اور تہذیب سے نا آشنا تھے۔ انھوں نے خدا کی طرف سے اپنے گناہوں کی سزا پالی تھی اور بتہ لوگوں کو متاثر و مجروح بزرگوں نے معاف کر دیا تھا۔ کتنے لوگ جو جہالت میں مبتلا ہو گئے تھے، انھوں نے خطوط لکھ کر، رسایل کی اشاعت کر کے اور اخبارات کے مضامین اور اس وقت کے مسایل پر بحث و نظر کرتے ہوئے اپنے گناہوں سے توبہ کر لی ہے لیکن جناح صاحب اور ان کے ناموس سے، ان کے عقیدت مندوں، ان کے دوستوں، ان کے پروردوں، ان کی ذات سے فایدہ اٹھانے والوں، ان کی سیاست کے شریکِ سفر اور ہم جماعت رہنماؤں نے بے وفائی کی تھی۔ ان کے جانی دشمن ہو گئے تھے۔ ان کے احسانات کے شکر گزار ہونے کے بجاے ان کی موت کے انتظار میں مصروفِ دعا تھے۔ ان کے برتاؤ سے جناح صاحب کے کرب کا کوئی اندازہ کر سکتا تھا۔ جناح صاحب ان سے دور چلے جانا چاہتے تھے لیکن قدرت نے ان پر قلب کی طمانیت اور زندگی کے عیش و عشرت کو حرام کر دیا تھا۔ ان کی موت جس کس مپرسی کے عالم میں ہوئی وہ ہر کوئی جانتا ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کے ساتھ کیا برتاؤ کیا؟ اس حقیقت سے تو کوئی پنجاب ہی کا صاحبِ کشف پردہ ہٹا سکتا ہے یا بلوچستان و سرحد کا کوئی حقایق نگار ''حقایق پس پردہ'' کے راز فاش کر سکتا ہے!

سیاسی دنیا سے ایک دور اُفتادہ گوشہ نشیں تو یہی کر سکتا ہے کہ کتابوں سے چند معلوم حقایق کو مرتّب کر دے اور یہ بات کہ اس سے کیا نتیجہ نکلتا ہے اور حاصل کیا ہے؟ قارئین پر چھوڑ دے۔

اور یہ کہ جناح صاحب نے علمائے دین کی رسوائی اور بدنامی کے لیے جو تحریک چلائی تھی خود اُن کے حق میں اس کا کیا اثر نمایاں ہوا؟

ڈاکٹر اجیت جاوید کے قلم سے:

''سال (۱۹۴۷ء) کے آخر میں کراچی میں فرقہ وارانہ فساد شروع ہو گئے۔ جناح ان سے بہت پریشان تھے۔ گل حسن جناح کے اے۔ڈی۔سی لکھتے ہیں:

''ایک دن انھوں نے مجھے بلایا اور پوچھا کہ آیا میں نے ان کے ایک ہندو دوست کو کھانا فراہم کیا ہے؟ اس کے والد کو جناح جانتے تھے۔ میں نے ''ہاں!'' میں جواب دیا اور بتایا کہ اس کا مکان بندر روڈ پر ہے جو تمام فسادات کا مرکز ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اس نے اور اس کے نوکروں نے گھر سے باہر نکلنے کی ہمت نہیں کی ہوگی۔ ان (جناح) کے دیگر خیالات کو رَفع کرنے کے لیے کہا کہ میں (گورنر جنرل) ہاؤس کی ایک کار استعمال کرتا ہوں۔ اس کے ڈرائیور کو کھانے پینے کا سامان خریدنے کے لیے اپنی جیب سے رقم دیتا ہوں تاکہ یہ اندھیرا ہونے کے بعد جب کرفیو لگتا ہے (دوست کے گھر) پہنچایا جا سکے۔ انھوں نے تیز ٹھنڈی نظروں سے مجھے دیکھا اور کہا: ''مجھے آپ پر فخر ہے۔ پاکستان کے لوگوں کی مشکل میں مدد ہونی چاہیے۔'' (۱-۲)

وہ اپنی جگائی پُرتشدد قوتوں کے سامنے بے بس و مجبور تھے۔ جنونی لوگوں نے پاکستان بننے تک ان کو برداشت کیا۔ اب ان کو جناح کی ضرورت نہیں تھی اور ان کی مقامی اساس بھی نہیں تھی۔ کیوں کہ وہ بمبئی والے تھے۔ جناح، گورنر جنرل پاکستان سپریم کمانڈر آف افواج پاکستان، صدر دستور ساز اسمبلی اور صدر مسلم لیگ اخباری پروپیگنڈا اور جسمانی حملے

---

(۱) Lt. Gen. Gul Hassan Khan, Memoirs, p. 77

(۲) اس بیان میں جس ستم رسیدہ شخصیت کی طرف اشارہ ہے وہ جناح صاحب کا بہت ہی عزیز صحافی، ایم ایس ایم شرما، ایڈیٹر ڈیلی کراچی گزٹ۔ کراچی ہے۔ ۱۱ر جولائی ۱۹۴۷ء کو جناح صاحب نے جو پریس کانفرنس دہلی میں کی تھی، اس میں سوالات کرنے اور ان کا جواب بتانے کے لیے اسے پہلے سے ریہرسل کرادی تھی۔ "Peeps into Pakistan" اس کی مشہور تالیف ہے۔ (اب۔ش)

کے نشانے پر تھے۔ جناح نے انھیں تقسیم سے پہلے استعمال کیا تھا۔ انھوں نے پاکستان بننے سے قبل ان کی باتوں کو برداشت کیا تھا۔ اب انھوں نے ارادہ کرلیا تھا کہ وہ ان کے پسندیدہ اقدامات کو ناکارہ کردیں گے اور سخت رکاوٹیں کھڑی کریں گے۔ پاکستان میں جناح اور ان کے ہم خیال جدید ترقی پسند اور سیکولر لوگوں کی رجعت پسندوں کو کوئی ضرورت نہیں تھی۔ ان حالات میں جناح کی حالت قابلِ رحم تھی۔ دستور ساز اسمبلی میں ان کی تقریر نے ایسا ''نفرت کا طوفان اٹھایا (ان کے قریبی پیروکاروں میں بھی) کہ اس کا ازالہ کرنے کے لیے ان کو سب کے سامنے نماز پڑھنی پڑی۔ یہ ایسا کام تھا جو اپنی سیاسی زندگی میں انھوں نے نہیں کیا تھا۔ [۱] ان کی تقریروں کے بہت سے حصے اکثر پاکستانی اخباروں نے نہیں چھاپے۔

قاید ملت لیاقت علی خان کی بیوی (مس پنت) یوپی کی ہندو برہمن تھیں۔ ان کو دوسری زارینہ کہا گیا۔ بدنام کرنے کے لیے یہ بھی اڑائی گئی کہ پاکستان کو برباد کرنے کے لیے وہ ہندستان کے ہاتھوں میں کھل رہی ہیں۔ [۲] اگر رتی زندہ ہوتیں تو اُن کا بھی یہی حشر ہوتا۔ جناح صاحب کی بیٹی دینا نے ایک عیسائی سے شادی کی تھی اور وہ اپنے باپ کے ساتھ پاکستان نہیں گئی تھیں۔ فاطمہ جناح نے ساڑھی چھوڑ کر شرارہ قمیص پہننی شروع کردی تھی اس لیے ان کو ''مادرِ ملت'' کا خطاب ملا۔ اچکن اور شلوار میں جناح کی تصویر میں پاکستان میں تمام سرکاری دفتروں اور عوامی جگہوں کی زینت بنیں۔ وطن پرست اور سیکولر جناح کا ماضی دفن کردیا گیا اور جب کبھی اس کی تمنا اور یادیں جناح میں اُبھرتیں تو وہ خود کو تنہا پاتے۔ کوئی ہمدردی اور دلاسا دینے والا نہیں تھا۔

۱۵ر دسمبر ۱۹۴۷ء کو آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس میں لیگ کو غیر فرقہ پرست قومی تنظیم بنانے کی اور اس کی رکنیت کو تمام پاکستانیوں کے لیے بلا تفریق ذات، عقیدہ، نسل اور مذہب کھولنے کی جناح نے ''ان تھک'' کوشش کی مگر ناکام رہے۔ [۳]

---

(۱) Hashoo Kewal Ramani, Pakisan X-Rayed, p. 5

(۲) Ibid., p. 54

(۳) S.M. Ikram, Modern Muslim India and the Birth of Pakistan, Lahore, Mohd. Ashraf, 1965, p. 318

بار بار ان کو یاد دلایا گیا کہ وہ ''باہر'' کے ہیں۔ ڈاکٹر محمد ایوب کھوڑو نے سرعام جناح کی حکم عدولی کی اور کراچی کو صوبائی انتظامیہ سے علاحدہ کرنے میں اڑچنیں ڈالیں۔ انھوں نے جناح کو قاید اعظم نہیں مانا اور کہا: مسٹر جناح سے کہنا کہ ''کراچی اب بھی میرا ہے۔''(۱)

ان کے ہر قدم پر رکاوٹیں ڈالی جاتی تھیں، حتیٰ کہ وہ آزادی کے ساتھ کوئی فیصلہ نہیں لے سکتے تھے۔ ایم۔ ایس۔ ایم شرما لکھتے ہیں:

> ''میں نے قاید سے اینی بیسنٹ کے یوم پیدایش کی میٹنگ کی صدارت کرانے کی درخواست کی، لیکن انھوں نے خاموشی سے معذرت کر لی۔ انھوں نے کوئی پیغام بھی نہیں بھیجا۔ حال آں کہ انھوں نے مجھ سے ان کے بارے میں اور ہندستان کے لیے اینی بیسنٹ کی خدمات کا شاندار الفاظ میں تذکرہ کیا۔ مجھے احساس ہوا کہ جناح کھل کر ہندوؤں سے تعلق کا اظہار کرنے سے خوفزدہ تھے۔''(۲)

جناح صاحب تو فرقہ پرستوں کو اور نہ ہی ترقی پسند اقلیتی قوتوں کو خوش کر سکے۔ مارچ ۱۹۴۸ء میں ڈھاکہ یونی ورسٹی کے جلسہ تقسیم اسناد (کرزن ہال) میں انھوں نے اُردو کو پاکستان کی واحد قومی زبان ہونے کا اعلان کیا۔ طلبہ نے مخالفت کی۔ انھوں نے سیکرٹریٹ کے پھاٹک پر مخالفانہ مظاہرہ کیا جہاں جناح کیبنٹ روم میں صوبائی وزیروں سے ملاقات کر رہے تھے۔ اسکولوں اور کالجوں میں ہڑتالیں ہوئیں اور کچھ طلبہ کو گرفتار کیا گیا۔(۳)

بے عزتی، دل شکنی اور مایوسی کی خطر اُنھوں نے کانگریس چھوڑ دی تھی اور پھر کبھی اس میں شامل نہیں ہوئے۔ بالکل اسی قسم کا برتاؤ اپنے بنائے ہوئے ملک کے لیڈروں کے ہاتھوں سہنا پڑ رہا تھا۔ یہ وہ لوگ تھے جو تقسیم سے پہلے ان کو ناخوش اور تنہا کرنے کی جرأت نہیں کر سکتے تھے اور ان کے احکامات کو آسمان سے اُترا ہوا مانتے تھے۔

---

(۱) Jyoti Sen Gupta, Eclipse of Pakistan, p. 92

(۲) M.S.M. Sharma, Peeps into Pakistan, p. 157

(۳) Jyoti Sen Gupta, Eclipse of Pakistan, pp. 35, 124

ہندستان میں ہندو، سکھ اور مسلمان ان (جناح) سے نفرت کرتے تھے اور پاکستان میں مہاجر مسلمان انھیں کوستے تھے، جنھوں نے ہندستان میں اپنا گھر بار اس امید پر چھوڑا تھا کہ پاکستان میں جنت ملے گی۔ ان کو لگتا تھا کہ ان سے دَغا کی گئی ہے۔ پاکستان کا افتتاح ہونے کے ایک ہی ہفتے بعد کچھ مسلمان مہاجرین خطرناک ہتھیاروں سے لیس گورنمنٹ ہاؤس میں گھس گئے۔ وہ جناح کو مارنا چاہتے تھے مگر گرفتار کر لیے گئے۔ (۱)

مختلف مخالف سیاسی طبقوں نے مہاجرین کو جناح کے خلاف مظاہروں کے لیے اکسایا۔ لاہور میں ۱۱رستمبر ۱۹۴۷ء کو ایک مظاہرے میں "ایک مشتعل بھیڑ نے جناح کا پتلا نکالا (اور ان کے خلاف) نعرے لگائے۔ "جناح ہائے ہائے"، "ممڈوٹ ہائے ہائے"، "دولتانہ ہائے ہائے"۔ مسلم نیشنل گارڈ کے رضا کاروں ے بھیڑ کو سیکرٹریٹ کے سامنے روک لیا۔ ممڈوٹ نے بھیڑ کو ڈانٹ لگائی، کہا: "تم پاکستان کے دشمن ہو۔" بھیڑ میں سے ایک آدمی نے اُچھل کر اُن کو تھپڑ لگائے۔" (۲)

۲۵ر دسمبر ۱۹۴۷ء کو لاہور میں جناح کے خلاف ایک اور مظاہرہ ہوا۔ جناح پریشان اور مجبور تھے اور اپنے مکان میں قیدی تھے۔ (۳) وہ خود کو تنہا محسوس کر رہے تھے اور شدت سے ایک دوست کی کمی کا احساس ہو رہا تھا، جس سے وہ اپنے دل کی بات کہہ سکتے۔ (۴)

پاکستان میں قلیتوں کا اعتماد وہ پہلے ہی کھو چکے تھے۔ جنھوں نے جناح کے اس وعدے پر بھروسا کیا تھا کہ:

۱) پاکستان ایک جمہوری ملک بنے گا اور

۲) ان کے جان و مال کی پوری حفاظت کی جائے گی۔

انھوں نے اس لیے وہاں رہنے کا فیصلہ کیا تھا۔ اب انھیں جناح کے وعدے پر بھروسا

---

(۱) M.S.M. Sharma, Peeps into Pakistan, p. 146

(۲) Jyoti Sen Gupta, Eclipse of Pakistan, p. 18

(۳) Wolpert, Jinnah of Pakistan, p. 358

(۴) Jamnadas Akhtar, Political Conspiracies in Pakistan, p. 81

کرنے کی قیمت چکائی تھی۔ ان کا بے دردانہ قتل، لوٹ کھسوٹ، عورتوں کی عصمت دری، جبریہ تبدیلی مذہب اور ضعیف و کمزور لوگوں کی بے بسی و لاچاری نے جناح جیسے فولادی انسان کو بھی رُلا دیا تھا۔ ہندوؤں کے ایک رفیوجی کیمپ میں ان کی حالتِ زار دیکھ کر وہ بے قابو ہو گئے اور رو پڑے۔ [۱] اسی طرح پاکستان میں اقلیتوں کا محافظ اعلیٰ خود بے بس و لاچار انسان تھا۔ ان کی سرپرستی ان کے عزیز ترین دوست ڈالمیا کو حفاظت کی یقین دہانی نہیں دلا سکی۔ ان کو پاکستان کو خیرباد کہنا پڑا۔ ایم ایس ایم شرما اور جوگندر ناتھ منڈل جلد ہی وہاں سے چلے آئے۔ [۲]

ہندو سماج کے بہترین عناصر کی حمایت و تائید کے بل پر متحدہ ہندستان میں انھوں نے پاگل ملاؤں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا تھا۔ وہی ملا اب اسے پیچھے ہٹنے کے لیے ڈرا دھمکا رہے تھے۔ ان کے محافظ ان کی جان کے دشمن تھے۔ پارٹی کے انتہا پسند استحصال کرنے میں لگے ہوئے تھے۔ رجعت پسندوں کے غلبے سے لوگ دکھی تھے۔ بوڑھے قاید اعظم خود ساختہ بے ہنگم دنیا میں مجبور و بے بس قیدی تھے۔ [۳]

ان کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ اپنے ماضی سے ناتا توڑ نہیں سکتے تھے۔ وہ ہندستان واپس آنا چاہتے تھے۔ وہ فی الحقیقت خود کو ہندستانی مانتے تھے۔ جناح جیسے شخص کے لیے یہ بڑا المیہ تھا۔ آل انڈیا مسلم لیگ کی میٹنگ منعقدہ کراچی (دسمبر ۱۹۴۷ء) میں انھوں نے کہا:

> "میں آپ کو بتاؤں! میں اب بھی خود کو ہندستانی سمجھتا ہوں۔ وقتی طور پر میں نے پاکستان کا گورنر جنرل کا عہدہ قبول کرلیا ہے لیکن اس وقت کے انتظار میں ہوں

---

(۱) M.S.M. Sharma, Peeps into Pakistan, p. 141

(۲) یہ اس وقت کی بات ہے جب قیام پاکستان کو ابھی ایک ماہ بھی پورا نہ ہوا تھا۔ مسلم لیگ کے سوا کسی اور طبقے کو اپنے سر پیر کی خبر نہ تھی۔ مسلم لیگ کے سوا کوئی اور جماعت نہ تھی جو جناح صاحب کے خلاف مظاہروں کو منظم کر سکتی۔ یہ صرف اور صرف مسلم لیگ تھی جو اپنے لیڈر کے خلاف تحریک چلا رہی تھی اور الزام دوسری جماعتوں کے سر تھوپ دی تھی۔ (اب ش)

(۳) Sri Prakasa, Pakistan Birth and Early Years, p. 56

جب میں ہندستان واپس جاؤں گا اور اس ملک کے شہری کی حیثیت اختیار کروں گا۔''(۱)

گاندھی جی کی مسلمان دوستی کا اعتراف:

انھوں نے یہ بھی محسوس کیا کہ گاندھی جی مسلمان مخالف نہیں تھے۔ انھوں نے کہا: ''وہ مسلمانوں کے سچے دوست ہیں اور ہندستان کے مسلمانوں کو صرف ان کی رہنمائی میں چلنا چاہیے، یہی ان کا تعویذ ہے۔''(۲)

جناح کا دِل کراچی کے گورنمنٹ ہاؤس میں نہیں بلکہ بمبئی کے مالا بارہل کے مکان میں اٹکا تھا۔ سری پرکاش نے جب انھیں بتایا کہ ہندستانی حکومت ان کے مکان کو اپنی تحویل میں لے رہی ہے تو وہ سکتے میں رہ گئے اور قریب قریب گڑگڑاتے ہوئے سری پرکاش سے کہا:

''سری پرکاش میرا دل نہ توڑو۔ جواہر لال نہرو سے کہو، میرا دل نہ توڑے۔ میں نے ایک ایک اینٹ کر کے اس کو بنایا ہے۔ ایسے مکان میں بھلا کون رہ سکتا ہے؟''(۳)

آگے کہا: ''تمھیں پتا نہیں کہ مجھے بمبئی سے کتنا پیار ہے۔ میں اب بھی واپس وہاں جانے کے انتظار میں ہوں۔'' ''کیا واقعی مسٹر جناح!'' سری پرکاش نے کہا: ''آپ واپس بمبئی جانا چاہتے ہیں؟ میں جانتا ہوں، بمبئی آپ کی بڑی خدمات کے لیے جو آپ نے اس شہر کے لیے کی ہیں، کس قدر قرض دار ہے۔ کیا میں وزیر اعظم (جواہر لال نہرو) کو بتا دوں کہ آپ بمبئی جانا چاہتے ہیں؟'' جناح نے جواب دیا: ''ہاں آپ بتا دیں۔''(۴)

ان کا قانونی دماغ اس کو عدالت، کود کو وکیل گردانتا تھا جس نے مسلمان علاحدگی

(۱) Ibid. Also see S.M. Ikram, Modern Muslim India and the Birth of Pakistan, p. 318

(۲) Hashoo Kewal Ramani, Pakistan X_Rayed, p. 12

(۳) M.S.M. Sharma, Peeps into Pakistan, p. 185

(۴) Ibid., p. 183

پسندوں کا مقدمہ لڑا، جیتا اور پاکستان دلا دیا اور اب لاکھوں کے مرنے اور بے گھر ہونے کے بعد مالا بار ہل بمبئی میں اپنے گھر آنا چاہتا تھا۔ ان کو پاکستان سے کچھ لینا دینا نہیں تھا۔ تقسیم قبول کرنے کے بعد نئی دہلی کے امپریل ہوٹل میں منعقدہ لیگ کی جنرل کونسل میٹنگ میں انھوں نے اپنے ردِّعمل کا اظہار اِس طرح کیا: ''میں نے آپ کے لیے پاکستان جیت لیا ہے۔ اب آپ جو چاہے کریں!''(۱)

بیمار اور اُداس جناح کرب میں روتے تھے: ''میں نے پاکستان بنا کر زبردستی غلطی کی ہے۔ دہلی جا کر جواہر لال نہرو سے ہوں گا کہ ماضی کی حماقتیں بھولو اور پھر دوستی کر لو۔''(۲)

جناح صاحب لیاقت علی خان سے بھی نفرت کرتے تھے جن کے کہنے پر اِنگلینڈ سے وہ ہندستان لوٹے اور مسلم لیگ کی قیادت سنبھالی تھی۔ (۳)

ایک جنونی ہندو کے ہاتھوں گاندھی جی کے قتل نے انھیں شاید مزید مایوس کر دیا تھا۔ ۱۹۴۷ء سے ۱۹۴۸ء کے درمیان اُن پر چار جان لیوا حملے ہوئے۔ اُن کے حفاظتی انتظامات سخت کر دیے گئے مگر لگتا تھا کہ زندہ رہنے کی خواہش نہیں رہی تھی۔ ۲۴ راگست کو جناح نے ڈاکٹر بیش کو بتایا: ''میں زندہ رہنا چاہتا تھا اور اب میرے زندہ رہنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔'' ڈاکٹر نے ان کی آنکھوں میں آنسو دیکھے۔ (۴) تقسیم ہند کے المناک نتائج زندگی کے آخری دنوں میں بھوت بن کر اُن پر چھا گئے تھے۔ (۵)

---

(۱) Sri Prakasa, Pakistan Birth and Early Years, p. 83

(۲) Ibid., p. 84

(۳) M.N. Roy, Men I Met, p. 33

(۴) The Times of India, September 11, 1988

(۵) Jamnadas Akhtar, Political Conspiracies in Pakistan, p. 82

باب: ۵

محمد علی جناح

ایس کے مجمدار کی تالیف

جناح اور گاندھی

کے مقدمے سے ماخوذ

آزادیٔ ہند کی جدوجہد کے دو اہم کردار
جناح اور گاندھی
ایس۔ کے۔ موجمدار

جناح اور دو قومی نظریہ

''کیا جناح کو واقعی دو قومی نظریے پر یقین تھا، جو انھوں نے مسلمانوں کے لیے الگ ریاست کی مانگ پر اتنا زور دیا؟ کیا انھیں فرقہ واریت سے کوئی ہمدردی تھی؟ کیا انھوں نے پاکستان صرف مسلمانوں کے لیے بنوایا تھا؟ کیا وہ مسلمانوں اور ہندوؤں کو الگ الگ دو خانوں میں بانٹ کر رکھنا چاہتے تھے؟ ہم ذرا ان سوالوں پر بھی غور کر لیں۔ ۷/اگست ۱۹۴۷ء کو انھوں نے دلی چھوڑ دی کہ پھر اسے کبھی نہیں دیکھا۔ انھوں نے پاکستان دستور ساز اسمبلی کے سامنے اپنی پہلی تقریر ۱۱/اگست ۱۹۴۷ء کو کی۔ اس میں انھوں نے حسب ذیل اعلان کیا:

''پاکستان کی اس ریاست میں آپ آزاد ہیں! آپ آزاد ہیں اپنے مندروں میں جانے کے لیے، آپ آزاد ہیں! اپنی مسجدوں یا کسی دوسری عبادت گاہ میں جانے کے لیے! آپ خواہ کسی مذہب یا ذات یا عقیدے سے تعلق رکھتے ہوں، اس کا اس بنیادی اصول سے کوئی تعلق نہیں کہ ہم سب کے سب ایک ہی ریاست کے شہری ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اب ہم لوگوں کو اپنے سامنے اپنا آدرش رکھنا چاہیے اور آپ دیکھیں گے کہ وقت کی رفتار کے ساتھ ہندو، ہندو نہیں رہیں گے اور مسلمان مسلمان نہیں رہیں گے! مذہبی معنی میں نہیں کیوں کہ یہ ہر شخص کے ذاتی اعتقاد کا معاملہ ہے۔ بلکہ سیاسی معنی میں، ریاست کے ایک شہری ہونے کی حیثیت سے![1]

مندرجۂ بالا اعلان جناح کی سیاست کی باطنی روح کو دکھاتا ہے۔ یہاں پرانے جناح۔ ہندو مسلم اتحاد کے بغیر موجود ہیں۔ وہ سارے ہندو فرقے سے نہیں لڑ رہے تھے۔ وہ

(۱) جناح: کری ایٹر آف پاکستان، ہیکٹر بلیتھو، ص ۱۹۷

تو گاندھی اور کانگریس سے لڑ رہے تھے جس پر گاندھی کا تسلط ہو گیا تھا۔ انھیں پورے خلوص کے ساتھ یقین ہو گیا تھا کہ گاندھی جی کانگریس کو غلط راستے پر لے جا رہے ہیں، جو افراتفری تک پہنچائے گا۔ انھوں نے اپنے آپ کو ایسے غیر موافق حالات میں پایا، جہاں نہ صرف جاہل ہندو عوام نے بلکہ ہندو دانشوروں نے بھی اپنی سمجھ بوجھ کو گاندھی واد کی قربان گاہ پر دھونی رمانے کے لیے بھینٹ چڑھا دیا تھا۔ ان حالات میں ایک فرقے واریت کو چھوڑ کر لڑنے کے لیے کوئی دوسری قوت انھیں میسر نہیں تھی۔ جیسے ہی وہ ایک ایسی ریاست قایم کرنے کے اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئے، جہاں گاندھی اور گاندھی کی کانگریس کا حکم نہ چل سکے، انھوں نے فرقے واریت کا اپنا ہر روپ ختم کر دیا جسے انھوں نے وقتی طور پر اختیار کر رکھا تھا۔

ہندستان کا بٹوارا:

اب سبھی حلقوں میں یہ تسلیم کر لیا گیا ہے کہ ہندستان کا بٹوارا سبھی متعلقہ لوگوں کے لیے سراسر برائی کا باعث ثابت ہوا۔ صرف یہی نہیں کہ اس سے ہندو مسلم مسئلے کا کوئی حل نہیں نکلا بلکہ الٹے اس نے سیکڑوں ناقابل حل مسایل پیدا کر دیے۔ ہر سمجھ دار آدمی دو قومی نظریے کو اسی طرح رد کر دے گا جس طرح خود جناح نے پاکستان کی دستور ساز اسمبلی کے سامنے اپنی پہلی تقریر میں رد کر دیا۔ دو قومی نظریے کا جواز کہاں ہے، جب کہ ہندستان اور پاکستان دونوں کی مسلم آبادی کا نوے فی صد ہندو نسل سے ہے جن کے آبا و اجداد نے تبدیل مذہب کیا تھا۔ جناح خود گجراتی ہندو نسل کے ہیں۔ علم الانسان کی رو سے مسلمانوں کی بہت بڑی اکثریت ایسی ہے جس میں ہندوؤں سے کوئی بھی فرق نہیں ہے۔ علاقائی لحاظ سے دونوں کی مادری زبان ایک ہی ہے۔ ہم لوگوں کو یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ پانچ یا چھ کروڑ مسلمان اب بھی ہندستان میں باقی بچے ہوئے ہیں۔ تقسیم سے انھیں کیا فایدہ پہنچا؟ عام لوگ تقسیم نہیں چاہتے تھے۔ انھیں سیاست سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ مگر یہی نہیں جنھیں تقسیم سے سب سے زیادہ نقصان پہنچا۔ یہ لوگ تقسیم کی منسوخی کا دل سے خیر مقدم کریں گے۔

ایک معروضی نقطۂ نظر:

اس کے ماسوا اس برصغیر کی حفاظت کے خیال سے بھی پھر مل جانے (Cofederate) کی ضرورت ہے۔ اس لحاظ سے لارڈ ویول کا طریقۂ عمل خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ انھوں نے بٹوارے کے سوال کو دفاعی نقطۂ نظر سے ایک سپاہی کی طرح دیکھا تھا اور یہ نتیجہ نکالا تھا کہ دوقومی نظریہ پر مبنی ملک کی تقسیم اپنے تمام ذیلی اور لازمی نتائج کے ساتھ ہندستان کے دفاع کو خطرناکی کے ساتھ کم زور کردے گی اور شمال ومغرب کی طرف سے حملے کا دروازہ کھول دے گی۔ سوال کے اس پہلو کو دھیان میں رکھتے ہوئے انھوں نے مرکزی اسمبلی کے ممبران کو حسب ذیل الفاظ میں مخاطب کیا تھا۔

> ”آپ جغرافیہ کو نہیں بدل سکتے۔ دفاعی نقطۂ نظر سے بیرونی دنیا سے تعلقات کی بنا پر اور بہت طرح کے اندرونی و بیرونی مسایل کے لحاظ سے ہندستان ایک فطری اکائی ہے۔ تواریخ ایسی بہت سی مثالیں پیش کرتی ہے کہ مختلف تہذیبوں یا مذہبوں کے حامل ہوتے ہونے بھی دو فرقوں اور حتی کہ دو قوموں نے بھی ایک ساتھ رہنے کا انتظام کرلیا ہے۔“

ہم عصر تواریخ نے اس شاندار سپاہی وایسرائے کے ساتھ مناسب برتاؤ نہیں کیا، جس نے ہندستان، اس کے عوام اور اس کی عظیم الشان فوج کو دو حصوں میں بانٹنے کی جواب دہی کی ذمے داری اٹھائے جانے کے مقابلے میں اپنے معزز عہدے سے ڈسمس کیے جانے کو ترجیح دی۔ کسی نے بھی، نہ گاندھی نے، نہ جناح نے اور نہ کسی اور سیاست داں نے تقسیم کی خرابیوں کو اتنا صاف ڈھنگ سے دیکھا جتنا صاف صاف ویول نے دیکھا تھا۔

ہندستان پاکستان کی دولت مشترکہ:

پچھلے انیس برسوں میں اور خاص کر حال کے مہینوں میں ملک کے اندر اور باہر جو واقعات رونما ہونے ہیں۔ وہ زور دار طریقے پر یہ مانگ کر رہے ہیں کہ ہندستان اور پاکستان کے ہندو اور مسلمان پھر سے مل جائیں۔ مشترک دفاع کے ساتھ ہندستان اور پاکستان کا کامن ویلتھ (دولت مشترکہ) بن سکتا ہے۔ لیکن سبھی اکائیوں کو پوری خودمختاری

ہو۔ ہندستان اور پاکستان کی باہمی رضامندی سے اس میں شریک اکائیوں کی از سرنو تنظیم ہوسکتی ہے، لیکن اس معاملے میں کسی طرح کی باہری مداخلت نہیں ہونی چاہیے۔ ہم لوگ آگ کے دریا سے گزرے ہیں اوراس عذاب نے ہمیں ایک سبق دیا ہے۔

ہندستان بہت سے اقلیتی فرقوں کا ملک ہے اور یہ پورے انکسار کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ اس نے اپنی اقلیتوں کے ساتھ نامناسب سلوک نہیں کیا ہے۔اوپری طور پر معلوم ہوتا ہے کہ پھر سے اتحاد (Reunion) کا کام بہت مشکل ہے۔ پھر بھی یہ ناممکن نہیں ہے، کیوں کہ ہندستان اور پاکستان دونوں ملکوں کے عوام اور عام لوگوں میں نیک خواہشات کی فراوانی ہے۔ ہم لوگوں کو سب سے پہلے عوام اور عام لوگوں کے مفاد پر اپنا دھیان دینا چاہیے اب اپنی سیاست کا پھر سے جایزہ لینے کا وقت آگیا ہے۔ خود احتسابی کے بغیر نیا تجزیہ ممکن نہیں۔

پھر سے اتحاد (Reunion) کی راہ پُر پیچ، تاریک اور دشوار گذار ہوسکتی ہے۔ لیکن ہمیں رکاوٹوں سے ہراساں نہیں ہونا چاہیے اور نہ ارض موعود کی تلاش سے ہی ہمت کھونا چاہیے۔ اگر ہندستان اور پاکستان مل جائیں اور اگر فرقہ پرستی سے احتراز کیا جائے تو ہندستان اور پاکستان کی دولتِ مشترکہ دنیا کی مضبوط ترین طاقتوں میں سے ایک ہوگی اور اس قابل ہوگی کہ دنیا کی قسمت کو بدل سکے!''

(ایس کے مجمدار کی تالیف جناح اور گاندھی کے مقدمے سے ماخوذ۔ انگریزی سے ترجمہ تقی رحیم)

باب: ٦

مسٹر محمد علی جناح اور ان کی سیاست
سر محمد یامین خان کی نظر میں

پروفیسر محمد سرور جامعی

تحریکِ پاکستان
کا
ایک باب
پروفیسر محمد سرور
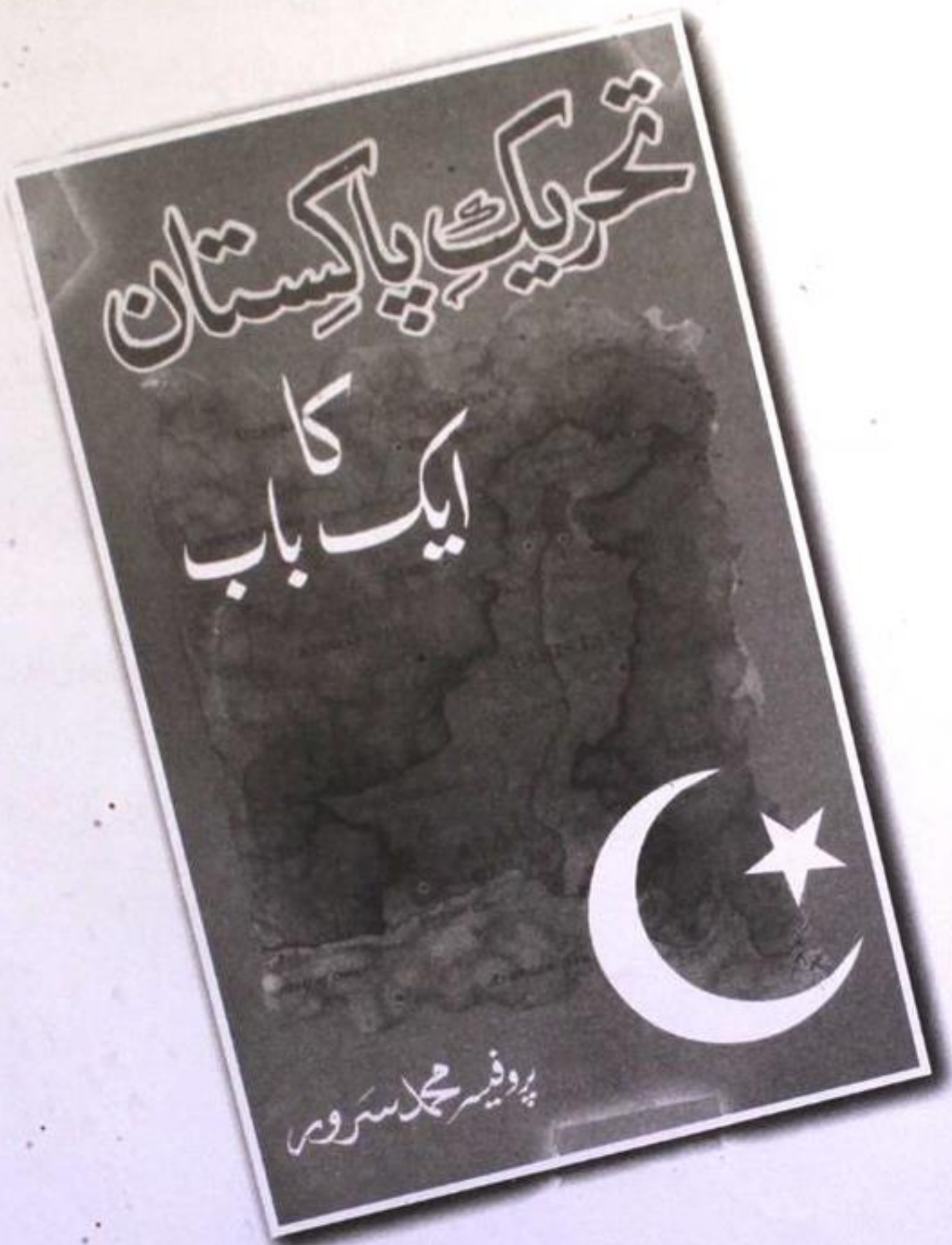
سر یامین خان اور پروفیسر محمد سرور

تعارف

سر محمد یامین خان ۲ر ستمبر ۱۸۸۶ء کو میرٹھ میں پیدا ہوئے اور ۲۷ر مارچ ۱۹۶۶ء کو کراچی میں انتقال کیا۔ والد گرامی محمد سلیمان خان تھے۔ علی گڑھ اور الہ آباد بعدہٗ لنکنز ان (انگلینڈ) سے تعلیم کا آغاز اور و اختتام ہوا۔ ۱۹۱۴ء میں بار ایٹ کی ڈگری حاصل کی اور اسی سال میں میرٹھ سے پریکٹس کا آغاز کیا اور ہندستان کی فیڈرل کورٹ کے سینئر جج ہوئے۔ ۱۹۱۶ء میں میرٹھ کے میونسپل بورڈ کے ممبر منتخب ہوئے اور ۱۹۳۲ء تک شہر میں اپنے اہل وطن کی خدمت انجام دی۔ ۱۹۲۰ء میں ہندستان کی قانون ساز اسمبلی کے رکن بنے، اس کے بعد ان کی پرواز روز بہ روز بلند سے بلند تر ہو رہی تھی اور نئے آسمان، نئی فضائیں تلاش کرتی رہی۔ وہ اپنے عہد کی سرکار دربار کی ایک نہایت پسندیدہ شخصیت تھے۔ حکومت کے دایرے میں ان کا بڑا رسوخ تھا اور ان کی رائے کی قدر اور ان پر اعتماد کیا جاتا تھا۔ علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کی ایگزیکیوٹو کے رکن تھے اور اس کے اندازِ سیاست کو اپنا لیا تھا۔ مسلم لیگ کی سیاست سے ہمیشہ رشتہ رہا۔ جناح صاحب سے تعلقات کا دایرہ اسمبلی کے ہنگاموں سے مسلم لیگ کی قالینی سیاست تک وسیع تھا۔ جناح صاحب ان پر بڑا اعتماد فرماتے تھے۔ اسمبلی کی رکنیت کے آغاز سے برٹش استعمار کے آخری نمایندے ماؤنٹ بیٹن کے عہد تک تمام وایسرایز سے ان کا بہت قریبی اور بھروسے کا تعلق رہا ہے۔ عوام کے رجحان سے لیگ کی سیاست کے انداز تک صائب رائے رکھتے تھے اپنی خوبیوں کی بنا پر وہ سرکاری حلقوں میں بڑے احترام کی شخصیت تھے۔

قریبی تعلقات اور جناح صاحب کے ان پر اعتماد کے باوجود ان کے نکتہ چیں ہمیشہ رہے، لیکن تحریک پاکستان کے آخری دور میں وہ ان کی سیاست کے شدید مخالف اور بعض مواقع پر ان کے حریف بن گئے تھے۔ سیاسی اکھاڑے کے وہ کبھی پہلوان نہیں رہے اس لیے ان کی نکتہ چینی تو ایک عادت ہی تھی، مخالفت ایک خاص دایرے سے باہر ظاہر نہ ہو سکی۔ وہ ایک بڑے ڈایری نویس بھی تھے۔ نامہ اعمال ان کی عظیم الشان خود نوشت اور مشاہدات کا مجموعہ ہے۔ اس میں انھوں نے اپنے موضوعات اور اہداف کے حالات اور ان کے بارے میں اپنے آرا و افکار پوست کندہ کر دیے ہیں ان میں ہمارے بزرگوں کی شخصیات اور ان کی سیاست بھی موضوع بنی ہے اور ان کے اپنے قاید اعظم بھی ان کی تنقید و تنقیص کا

موضوع بنے ہیں۔ وہ بہت سنجیدگی کے ساتھ اپنے ہدف کو تنقید کا نشانہ بناتے ہیں، زمانہ سازی میں انھیں کمال حاصل تھا۔ کیا سچ ہے اور کیا غلط، جو کچھ ہے نامۂ اعمال (لاہور، ۱۹۷۰ء) میں یادگار چھوڑا ہے۔ یہ شایقین مطالعہ کے لیے دل چسپ اور مؤرخین و اسکالرز کے لیے نہایت غور و فکر اور نظر و تدبر کا موضوع ہے۔ پروفیسر محمد سرور نے دور آخر میں ان کی سیاست اور افکار و خدمات پر انھیں کی زبان میں اور ان ہی کے نامۂ اعمال کے مطالب سے ایک کتابچہ مرتب کر دیا ہے کسی کو نامۂ اعمال میسر نہ آسکے تو مذکورہ کتابچہ (تحریک پاکستان کا ایک باب) جناح صاحب اور لیگ کی سیاست کا ایک بہترین آئینہ ہے۔ پروفیسر محمد سرور صاحب کے تذکرے کے ساتھ اس کے مطالعے سے لطف اندوز ہوں!

پروفیسر محمد سرور جامعی مرحوم:

سرور مرحوم بڑے نیک نفس شریف، معاملات کے صاف اور نہایت قابل انسان تھے۔ انھوں نے زندگی میں کسی کی برائی کے لیے سوچا بھی نہیں تھا، لیکن دوسروں کے ہاتھوں انھوں نے بہت دکھ جھیلے۔ وہ گجرات پنجاب کے ایک گاؤں میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گاؤں کے اسکول میں حاصل کی پھر گجرات کے آزاد مسلم ہائی اسکول میں داخل ہو گئے۔ یہ اسکول ترکِ موالات کے زمانے میں قایم کیا گیا تھا۔ اس کے بانی حضرت مولانا سید عطاءاللہ شاہ بخاریؒ تھے۔ سرور صاحب نے مولانا نصراللہ خاں عزیز، ملک حسن علی، مولوی فیض میراں وغیرہم سے علوم و تہذیب اور خدمت قوم و وطن کی تعلیم حاصل کی۔ میٹرک پاس کرنے کے بعد وہ جامعہ ملیہ اسلامیہ علی گڑھ چلے گئے۔ ۱۹۲۵ء میں جامعہ دہلی منتقل ہوئی تو سرور صاحب طلبہ کی اسی جماعت میں شامل تھے جو جامعہ کے ساتھ دہلی گئے تھے۔ دہلی کے زمانۂ طالب علمی میں انھیں ملک کے نامور قومی رہنماؤں کو بہت قریب سے دیکھنے اور سمجھنے کا موقعہ ملا اور انھیں جامعہ میں علوم و فنون کے ماہر اور بلند اخلاق اور صاحب سیرت اساتذہ سے استفادے کا موقع ملا۔ ان میں مولانا خواجہ عبدالحی فاروقی تھے جنھوں نے دارالارشاد کلکتہ میں مولانا ابوالکلام آزاد سے قرآن پڑھا تھا۔ ڈاکٹر محمد علی شاہ سندھی تھے جنھوں نے مولانا سندھی سے استفادہ کیا تھا۔ ان کے اساتذہ میں ایک نامور مولانا محمد سورتی تھے جو عربی زبان و ادب کے بہت بڑے محقق تھے۔

۱۹۲۸ء میں سرور صاحب نے بی اے آنرز کا امتحان امتیاز سے پاس کیا اسی زمانے میں کچھ عرصہ انھوں نے مولانا محمد علی کے اخبار ہمدرد میں کام کیا اور جامعہ ملیہ کے اساتذہ کی صف میں شامل ہو گئے۔ ۱۹۳۰ء میں انھیں مصر کی جامعۂ ازہر میں داخلہ مل گیا۔ جامعۂ ازہر کے اساتذہ کے علاوہ جامعۂ مصریہ کے اساتذہ اور دیگر علما و فضلا سے بھی استفاضہ کیا اور اپنے اوقات کے ایک ایک لمحے سے فایدہ اٹھایا اور عربی زبان، اس کی تاریخ و ادب ہی میں رسوخ حاصل نہیں کیا بلکہ عرب ممالک کی سیاسیات کا بھی گہرا مطالعہ کیا تھا۔ ۱۹۳۳ء میں انھوں نے تعلیم سے فراغت پائی، واپسی کے سفر میں کئی ملکوں، بیسیوں شہروں، تاریخی مقامات کی سیر و مطالعہ اور نامور شخصیات سے ملاقات کرتے ہوئے وطن لوٹے۔

کچھ عرصہ لاہور میں زمیندار سے وابستہ رہنے کے بعد دہلی تشریف لے گئے۔ جہاں انھیں جامعہ ملیہ میں ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ جس کے وہ ایک نہایت فاضل اور وفادار سپوت تھے۔ حقیقت یہ تھی کہ جب سے وہ جامعۂ ازہر اور جامعۂ مصریہ کے علما و فضلا سے استفادے اور فراغت کے بعد وطن لوٹے تھے۔ ان کی مادرِ علمی میں ان کا انتظار کیا جا رہا تھا۔ ۱۹۳۴ء سے ۱۹۳۸ء تک انھوں نے نہایت دل جمعی کے ساتھ جامعہ میں تدریسی خدمات انجام دیں، اس کے ساتھ ملک کی سیاسیات کے مطالعے، اسے سمجھنے اور غور و فکر میں بھی مصروف رہے۔

۱۹۳۸ء ہی کا واقعہ ہے مرحوم ہاشمی فرید آبادی حج سے لوٹ کر وطن پہنچے اور ڈاکٹر ذاکر حسین سے ملاقات ہوئی اور انھیں مولانا عبیداللہ سندھی مرحوم کا یہ پیغام پہنچایا کہ ان کا آخری وقت قریب آ گیا ہے۔ وہ جامعہ کے کسی استاذ یا مستعد اور پختہ فکر طالب علم کو ان کے پاس بھیج دیں تا کہ وہ اسے اپنے فکر مطالعے کے حاصلات اور تجربات سے آشنا کر دیں۔ تا کہ ان کے علم و مطالعے اور مشاہدات و تجربات کے حاصلات و نتایج ضایع نہ ہو جائیں۔ ڈاکٹر صاحب کی نظر انتخاب پروفیسر محمد سرور صاحب پر پڑی اور انھیں کے ذوقِ علمی و سیاسی اور اندازِ فکر کو مولانا سندھیؒ کے ذوق و فکر سے قریب پایا۔ انھوں نے سرور صاحب کو بلایا اور ان سے کہا کہ جامعہ سے تمھارا تعلق برقرار رہے گا تم فوراً حجاز چلے جاؤ! سرور صاحب نے ایک فرماں بردار اور سعادت مند شاگرد کی طرح ان کے مشورے اور درخواست کو حکم سمجھا اور اس کی تعمیل کے لیے فوراً تیار ہو گئے۔ اور ۱۹۳۹ء کے شروع میں مکہ مکرمہ روانہ ہو گئے۔ لیکن یہ وہ وقت تھا کہ ملک میں اور خصوصاً سندھ میں اور جماعتوں میں کانگریس اور جمعیت علمائے ہند کی طرف سے مولانا سندھی کی جلاوطنی کے خاتمے کی تحریک جو پچھلے کئی سال سے چل رہی تھی، اس کے برگ و بار پیدا ہو چکے تھے۔ تحریک کامیابی سے ہم کنار ہوئی، محمد سرور صاحب مکہ مکرمہ پہنچے تو مولانا سندھی کو وطن واپس آ جانے کی اجازت مل گئی تھی اور گورنمنٹ نے انھیں پاسپورٹ دے دیا تھا۔ مولانا سندھی وطن واپسی کی تیاری اور ضروری انتظامات میں مصروف تھے۔ ان حالات میں درس و تعلیم کا کوئی موقع نہ رہا تھا۔

مولانا سندھی سرور صاحب سے مل کر بہت خوش ہوئے اور ان سے باتیں کر کے اور ان کے خیالات سن کر انھیں سرور صاحب کے ذوقِ علمی و سیاسی اور ان میں حسنِ فہم و بصیرت پا کر نہایت مطمئن ہو گئے۔ سرور صاحب نے سوچا کہ جب کہ وہ حجاز پہنچ چکے ہیں تو کیوں نہ مصر ہوتے اور اپنے اساتذہ اور اپنے دوستوں سے ملتے ہوئے وطن واپس ہوں؟ مولانا سندھی آیندہ دنوں میں جانے والے جہاز سے وطن پہنچیں گے۔ اور جس مقصد و خدمت کے لیے سرور صاحب نے حجاز کا سفر کیا تھا، اب وہ خدمت وطن ہی میں انجام دی جائے گی۔ چناں چہ آیندہ برسوں میں اسی فیصلے پر عمل کیا گیا اور حق یہ ہے کہ سرور صاحب نے اپنی ذمے داری کو خوب نبھایا۔ مولانا سندھی کے سفر و حضر میں وہ ان کے ساتھ رہے، مولانا کو کوئی خیال آتا، کوئی نکتہ ذہن میں آتا، وہ کسی ربط و تسلسل کے بغیر سرور صاحب کو بتا دیتے، سرور صاحب کے

ذہن میں کوئی سوال آتا تو وہ مولانا سے بے تکلف پوچھ لیتے، مولانا کسی سے کوئی بات کرتے، کسی مسئلے پر گفتگو کرتے، کوئی مسئلہ سمجھاتے، سرور صاحب خاموشی اور توجہ کے ساتھ سنتے، کوئی سوال ذہن میں پیدا ہوتا تو بعد میں مولانا سے وضاحت چاہتے تھے۔ دوسرے سے مولانا کی گفتگو کے دوران کبھی مداخلت نہ کرتے تھے۔ سرور صاحب بہت جلد ان کے ذوق و مزاج سے واقف ہو گئے تھے۔ بحث و اذکار میں اس کا لحاظ کرتے تھے۔ مولانا کی طبیعت ان سے مانوس ہو گئی تھی وہ جب بھی کوئی سوال پوچھتے، مولانا ہمیشہ نہایت خوش دلی کے ساتھ ان کے سوال کا جواب دیتے اور کبھی خود ان کے دل میں کوئی بات آتی اور ضروری سمجھتے تو انھیں حقیقت سے آشنا کرتے۔

ان کا سب سے بڑا موضوع حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ، ان کے افکار اور ان کی تحریک اور وقت کے تقاضے ہوتے۔ یہ موضوع سرور صاحب کی تصنیف و تالیف اور تحقیق کا عنوان بھی بن گیا تھا۔ حضرت شاہ ولی اللہ پر مولانا سندھی کے افکار و افادات کی روشنی میں کئی اہم کتابیں تالیف کی ہیں۔ ہم یہاں ان کی تمام کتابوں پر تبصرہ تو نہیں کریں گے البتہ مختلف علمی دائروں میں ان کی کتابوں کے صرف نام ہی گنا سکتے ہیں۔ حضرت شاہ ولی اللہ پر انھوں نے جو کتابیں مرتب کیں۔ ان میں سے: شاہ ولی اللہ اور ان کا فلسفہ اور شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک، دو کتابیں یک سر مولانا عبید اللہ سندھی کے افکار و افادات اور ان کے مطالعے کے حاصلات پر مشتمل ہیں۔ انھیں ترتیب کا حسن اور مطالعے کی دل کشی کے سانچے میں سرور صاحب نے ڈھال دیا ہے۔ البتہ ارمغان شاہ ولی اللہ میں حضرت شاہ صاحب کے افکار و افادات اور خصوصیات کو سرور صاحب نے اپنے ذوق کے مطابق تالیف کیا ہے۔ شاہ صاحب کی شخصیت و سوانح افادات کا عطر کشید کر کے ان کے حسن و بو کا گلدستہ بنایا ہے۔ اس کی ایک بڑی صفت یہ ہے کہ فکر ولی اللہی کا وقت کے تقاضوں سے رشتہ جوڑ دیا ہے۔ مولانا عبید اللہ انور اس کتاب کے بڑے عاشق تھے۔ ان کا بیان ہے کہ "ارمغان شاہ ولی اللہ" اپنے موضوع پر بے نظیر کتاب ہے، جسے شاہ ولی اللہ کی کتابوں کا خلاصہ اور نچوڑ کہنا چاہیے اور علوم قرآنی کے طلبہ کے لیے تو وہ ایک نعمت ہے۔"

پروفیسر محمد سرور کا دوسرا اہم موضوع تصنیف و تالیف ان کے اپنے استاذ مولانا عبید اللہ سندھی تھے۔ اس حقیقت سے ان کے مخالفین کو بھی جرأتِ انکار نہ ہو گی کہ مولانا سندھی حضرت امام الہند شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے بہت بڑے محقق تھے۔ مولانا سندھی نے حضرت شاہ صاحب کا بہت عمیق مطالعہ کیا تھا اور ان کے علم کے سمندر سے جو قیمتی موتی نکالے تھے ان کا کوئی حقیقی اندازہ شناس نہ تھا۔ ان کے مخالف ان کی تعبیر و تاویل میں نکتہ چین ہوئے اور صرف اپنے عدم فہم کا اظہار کر سکے۔

پروفیسر سرور صاحب نے مولانا سندھی کو اپنی تحقیق کا موضوع بنایا، ان کے خصائص علمی، حسن و کمالات فکر، ان کے مقام خدمات کی جستجو کو اپنا مقصد بنایا اور ان کے دفاع کو اپنا فرض قرار دیا اور بالواسطہ یہ خدمت حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے فکر کے تحفظ و فروغ کی تھی جس کے تعارف و تشہیر کا سب

سے بڑا کارنامہ ان کے استاذ مولانا عبید اللہ سندھی نے انجام دیا تھا۔

سرور صاحب مرحوم نے سب سے پہلے مولانا کی دو اہم کتابوں کو اپنی توجہ کا مرکز بنایا۔ اس راہ کا دوسرا قدم ''مولانا عبید اللہ سندھی - حالات تعلیمات اور سیاسی افکار'' اور ''مولانا عبید اللہ سندھی اور ان کے افادات و ملفوظات'' نیز ''کابل میں سات سال'' مولانا سندھی کے خطبات و مقالات اور دیگر تاریخی تحریرات کی تلاش اور پھر ترتیب و تدوین، بعدۂ ان کی اشاعت کا سروسامان کیا تھا ان کاموں کے علاوہ ان کی چند اور تالیفات بھی نہ صرف مشہور ہیں جو اگرچہ مولانا سندھی یا حضرت شاہ ولی اللہ کے متعلق تو نہیں، لیکن ان کا ایسی شخصیات سے ہے جنھیں اگر کسی مکتب فکر سے وابستہ کرنا ضروری ہو تو ان کے لیے ولی اللہی مکتب فکر کے سوا کوئی اور مکتب فکر نہیں ہوسکتا۔ میرا اشارہ مولانا محمد علی رام پوری مالک و مدیر کامریڈ و ھمدرد. اور مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی امیر جماعت اسلامی ہند و بعدۂ پاکستان کی طرف ہے۔ ان حضرات کے متعلق تالیفات سے سرور صاحب کے انداز فکر و اسلوب تحریر ولی اللہی مکتب فکر کے فروغ و فایدے کا موجب تو ہوسکتا ہے، ولی اللہی مکتب فکر کو نقصان کسی صورت میں نہیں پہنچ سکتا۔

ان کی ایک مختصر لیکن اہم کتاب جو نہ صرف سیاست کے باب میں ہے، بلکہ تاریخ تحریک پاکستان کے ایک دور سے تعلق رکھتی ہے۔ یہ کتاب تحریک پاکستان کا ایک باب انھوں نے سر یامین خان کی تالیف ''نامۂ اعمال'' سے ان کی معلومات، مشاہدات اور ان افکار سے مرتب کی ہے اور اس طرح کہ گویا انھوں نے اپنے ذوق کے مطابق عبرت و بصیرت کے موتی چن لیے ہیں۔ یہ کتاب ان کی زندگی کے آخری دور کی یادگار ہے۔ جون ۱۹۷۵ء میں سندھ ساگر اکادمی - لاہور نے شایع کیا تھا۔ ۱۹ر ستمبر ۱۹۸۳ء کو انتقال ہوگیا۔

سرور صاحب نہایت شریف، سچے اور سادہ شخصیت کے مالک تھے۔ وہ ایک فکر، صائب الراے اور دین و مذہب اور سیاست میں اپنی راے رکھتے تھے، لیکن نہ تو وہ کبھی کسی مذہبی بحث میں الجھے، نہ کسی دینی معاملے میں اپنی راے سے دخل دیا اور ایک سیاسی مبصر ہوتے ہوئے بھی انھوں نے کبھی عملی سیاست کے میدان میں قدم نہیں رکھا۔

پروفیسر محمد سرور صاحب کا مذکورۂ بالا کتاب ایک اہم سوانحی، تاریخی، اور سیاسی خصوصیات سے معمور تالیف ''نامۂ اعمال'' کی تلخیص ہے۔ جس کا مصنف مسٹر محمد علی جناح کا معاصران کا ہم فکر، ہم ذوق اور ان سے تعلقات و روابط اور دوستی کا مدعی تھا۔ اس کی تالیف کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ اور یہ تلخیص اسی تالیف کا نہایت مفید و موثر سرمایۂ انتخاب ہے۔

قارئین کرام اس کے مطالعے سے لطف اندوز اور مفصل مطالعے کے لیے اصل تالیف سے رجوع فرمائیں۔ (ا۔س۔ش)

(۱)

قایداعظم نے گروپ اسکیم مان لی!

۲۳ / مارچ ۱۹۴۶ء کو برطانیہ کی نئی لیبر حکومت کا مقرر کردہ کیبنٹ مشن دہلی آیا اور ایک طویل گفتگو کے بعد اس نے کانگریس اور مسلم لیگ دونوں سے ہندستان کو آئینی طور پر تین گروپوں میں تقسیم کرنے کی اسکیم منوالی۔ اس کے تحت کل ہندستان کے لیے ایک یونین گورنمنٹ اور مجلس قانون ساز ہوتی۔ جس کے سپرد امور خارجہ، دفاع، مواصلات اور بنیادی حقوق ہوتے، باقی اختیارات صوبوں کے پاس رہتے، جنھیں تین گروپوں میں تقسیم کیا جاتا۔ ایک شمال کے مسلم اکثریت، دوسرا مشرق کے مسلم اکثریت اور تیسرا گروپ ہندو اکثریت کے صوبوں کا ہوتا۔

۶ / جون ۱۹۴۶ء کو اس اسکیم پر غور کرنے کے لیے دہلی میں آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کا اجلاس ہوا۔ سر یامین اس کی روداد یوں پیش کرتے ہیں:

> ''... مجھ کو یہ بات ناپسند تھی جو کچھ دنوں سے وجود میں آگئی تھی کہ کارروائی شروع ہونے سے قبل قصیدہ خوانی ہو اور لیڈر کو مغل بادشاہ بنایا جائے اور ممبران درباری ہوں... اس سے پارٹی کے لیڈر کا دماغ خراب ہو جاتا ہے اور وہ اپنے آپ کو بجائے پارٹی کا ایک فرد سمجھنے کے پارٹی سے بہت بالاتر اور اس کا حاکم سمجھنے لگتا ہے جو اسلامی جمہوریت کے بالکل متضاد ہے۔''

سر یامین خان کا کہنا ہے کہ میں نے اس اسکیم کی مخالفت کی اور کہا:

> ''... مسلم کلچر کے دو بڑے صوبوں (یوپی اور بہار) کو، جن کی آبادی ایک کروڑ چالیس لاکھ ہے، ہم ہندوؤں کے رحم و کرم پر چھوڑتے ہیں۔ مسلم تہذیب و تمدن کی حفاظت کی بابت زبانی جمع خرچ کرتے ہیں، لیکن ان مسلم تہذیب کے صوبہ جات کو ان کے حوالے کرتے ہیں، جو اس اسکیم کے تحت آپ کی ہر چیز کو جس

کے تحت تحفظ کے واسطے لڑ رہے ہیں، تباہ و برباد کر دیں گے۔ نہ جدا نمایندگی رہے گی اور نہ جدا انتخاب، اس لیے کوئی شخص منہ سے اسلام کے تحفظ کا نام نکالنے والا نہ ہوگا، نہ اردو زبان ہوگی، نہ آپ کی مذہبی تعلیم، نہ یوم نجات آپ پہلے کی طرح منا سکیں گے۔ بمبئی، مدراس اور سی- پی مسلم تہذیب کے گہوارے نہیں ہیں، اس لیے وہاں کے مسلمان تو زیادہ تباہ نہ ہوں گے۔ ہم یوپی کے مسلمان ہر قسم کی قربانی دینے کو تیار ہیں۔ اگر ہماری قربانی سے کوئی فایدہ ہو، لیکن اس اسکیم میں ہم تباہ اور پنجاب و بنگال کا کوئی فایدہ نہیں، بلکہ کمیونل ایوارڈ سے بھی ان کو کم مل رہا ہے...۔''

سر یامین لکھتے ہیں:

''ساری کونسل حیران تھی کہ میں مسلم لیگ پارٹی کا سیکریٹری اپنی پارٹی کے لیڈر سے اختلاف کر رہا ہوں۔ میں نے کہا: یہ پارٹی کا سوال نہیں، بلکہ مسلمانوں کی موت و زیست کا سوال ہے۔''

موصوف کے نزدیک مسلمانوں سے مراد بہ قول ان کے صرف یوپی اور بہار کے مسلمان ہیں جو کہ مسلم تہذیب کے حامل ہیں اور سچ پوچھیے تو پاکستان کی تحریک دراصل انھی کے لیے شروع کی گئی تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ ۱۹۳۷ء میں مسلم لیگ کا جو احیا ہوا اور اس کا لکھنؤ میں پہلا اجلاس کیا گیا تو اس کے تمام روح رواں اور محرک یوپی کے زمین دار اور تعلقے دار تھے، جن کی زمین داریاں کانگریس کے حکومت میں آنے کی وجہ سے خطرے میں پڑ گئی تھیں۔ اس میں چودھری خلیق الزماں جو ۱۹۲۰ء سے کانگریس میں تھے، اور مسلم لیگ کے ٹکٹ پر منتخب ہوئے تھے، انھیں یوپی کی کانگریسی وزارت میں نہیں لیا گیا تھا، ان کے ترجمان بن گئے۔ ادھر پنجاب کے سر سکندر، آسام کے سر سعد اللہ اور بنگال کے فضل الحق ان کے ساتھ شامل ہو گئے، ان کی اپنی مقامی ضرورتیں تھیں۔ اس زمانے میں مولانا شبیر احمد عثمانی نے اس حدیث: ''من قتل دون ماله فهو شهید.'' (جو اپنے مال کی حفاظت کرتا ہوا مارا جائے، وہ شہید ہے) کے حوالے سے زمینداری کی حمایت کا فتویٰ دیا اور مولانا

ابوالاعلیٰ مودودی بڑے زور شور سے اپنے رسالے ترجمان القرآن میں یہ لکھتے رہے کہ مسلمانوں کی تمام تہذیب وتمدن یو۔پی کے مسلمان زمین داروں کی وجہ سے قایم ہے۔اگر کانگریس نے ان کی زمین داریاں ختم کردیں تو پھر اس تہذیب وتمدن کا کیا ہوگا؟ یہ تہذیب وتمدن خالصتاً یوپی کے اونچے طبقوں کی تھی۔

اس میں شک نہیں کہ پنجاب اور اسی طرح بنگال میں آخر میں مسلم لیگ کی تحریک مسلمانوں کی عوامی جدوجہد بن گئی، لیکن مسلم اقلیت کے صوبوں میں مسلم لیگ تحریک شروع سے آخر تک سر یامین جیسے لوگوں کے زیر اثر رہی، جو انگریز گورنروں سے ملتے اور ان سے ہدایات لیتے۔ اس طرح صوبہ سرحد اور سندھ کی لیگ، وہاں کے انگریز گورنروں اور مسلمان سرکاری افسروں کی ساختہ پرداختہ تھی اور آخر تک رہی۔ بے شک قاید اعظم نے مسلم لیگ کو انگریزی سرکار کے کارندوں کے اثر ورسوخ سے نکالنے کی کوشش کی، لیکن جب اس کی اوپر کی قیادت سروں، خان بہادروں، اور سرکار کے متوسلین پر مشتمل تھی تو وہ اس کے اثر سے کیسے آزاد ہو سکتی تھی۔

چناں چہ جیسے ہی جنگ عظیم قریب الختم ہوئی اور برطانوی حکومت کو ملک کی سب سے بڑی سیاسی پارٹی کانگریس سے مصالحت کی ضرورت پڑی۔ اس نے مسلم لیگ کے مطالبات سے بے رخی برتنی شروع کردی، اس پر سر یامین قسم کے نواب، سر، خان بہادر سراسیمہ ہو گئے۔

اس گروپ اسکیم کو تسلیم کرنے کے سلسلے میں قاید اعظم نے لیگ کونسل میں یہ استدلال پیش کیا۔ سر یامین خان لکھتے ہیں:

"...ہم بہت مشکل سے انگریزوں سے یہ مراعات حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ ورنہ وہ تو بالکل کانگریس کے ہاتھ میں تھے، اگر آپ اس کو منظور نہ کریں گے تو کیبنٹ مشن اور وایسرائے سب اختیارات کانگریس کے سپرد کردیں گے۔ چوں کہ انگلینڈ کی لیبر گورنمنٹ کانگریس کی طرف دار ہے اور وایسرائے شروع ہی سے متحدہ ہندستان چاہتا ہے۔ اگر کمیونل ایوارڈ پر ہی ایک

کانسٹی ٹیونٹ اسمبلی بنی تو اس میں بھی آپ اقلیت میں ہوں گے اور (کانگریس) جو چاہے گی، آئین بنائے گی۔"

کونسل مسلم لیگ کے ارکان درباری لوگ ہیں:

کونسل نے گروپ اسکیم کی منظوری دے دی اور سر یامین کی بات سنی ان سنی کر دی گئی، اس پر موصوف بڑے چراغ پا ہوئے۔ لکھتے ہیں:

"کونسل مسلم لیگ جس میں زیادہ تر مجمع جوشیلے مسلمانوں کا ہے، لیکن ان میں آئین کی اہمیت سمجھنے کی عقل نہیں، نہ وہ کیبنٹ مشن کی اسکیم سمجھ سکے ہیں۔ بعض نے تو پڑھی تک نہ تھی۔ بیشتر تو اس خیال سے آئے تھے، جیسے درباری لوگ دربار میں شریک ہونے جاتے تھے۔ اور اس کو عزت سمجھتے تھے کہ وہ بھی کرسی دار ہیں اور دربار میں گورنر کی اسپیچ پر عمل کرنا فخر سمجھتے تھے۔ اس قسم کے مجمع میں یہ ہمت کہاں تھی کہ وہ قاید اعظم کی رائے میں کچھ چوں و چرا کرتا، لہٰذا ریزولیوشن پاس ہوگیا۔"

سر یامین صرف اسی لکھنے پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ یوں دہائی مچاتے ہیں:

"امپیریل ہوٹل نئی دہلی کی سیڑھیوں سے جب اترنے لگے تو بہت لوگ میرے گرد جمع ہوگئے، میں نے کہا کہ آپ نے اپنے مطالبۂ پاکستان کو گڑھے میں ڈال کر دفن کر دیا... اس سے زیادہ مراعات تو ہم ہندوؤں سے دوستی کے ذریعے حاصل کر لیتے۔ ۱۹۴۰ء سے جس اصول سے لڑ رہے تھے، وہ ختم کر دیا۔

جس وقت میں زور زور سے کہہ رہا تھا، قاید اعظم نیچے اترے لیکن بجائے اس کے کہ اپنی کامیابی کی بشاشت ان کے چہرے پر ہو، سنجیدگی اور پریشانی عیاں تھی۔ ساری کونسل حیران تھی کہ میں مسلم لیگ کا سیکریٹری اپنی پارٹی کے لیڈر سے اختلاف کر رہا ہوں۔ بہار کے ممبر اسمبلی نعمان نے مجھ سے کہا کہ مجھے نہیں معلوم کہ میں اپنے صوبے کو کتنا نقصان پہنچا رہا ہوں۔"

۳؍جون کا تقسیم ملک کا فیصلہ:

۳؍جون ۱۹۴۷ء کو برعظیم کی تقسیم کے فیصلے کا اعلان ہوا۔ ۹؍جون کو اسی امپیریل ہوٹل، نئی دہلی میں اسی کی منظوری دینے کے لیے کونسل مسلم لیگ کا اجلاس ہوا۔ اتفاق سے راقم الحروف (محمد سرور) اس اجلاس میں موجود تھا اس کا تمام وکمال وہی نقشہ تھا جو سریامین نے اس کے ایک سال پہلے کے اجلاس کا کھینچا ہے۔ اکثر ارکان درباری قسم کے لوگ تھے جو آئینی پیچیدگیوں کو سمجھے بغیر قرارداد کی حمایت کر رہے تھے۔

مولانا حسرت موہانی نے اٹھ کر مخالفت کی تو انھیں ''ہوٹ'' کر دیا گیا۔ پیرزکوڑی (صوبہ سرحد) نے بڑی پر جوش تقریر کی۔ جس میں کہا کہ میں قاید اعظم کے حکم پر، یاد نہیں رہا کہ دس ہزار کہا یا ایک لاکھ، رضا کار میدان میں لے آؤں گا۔ بنگال کے ایک دو ارکان نے بھی مخالفت میں آواز اٹھائی، لیکن پیرزکوڑی جیسے درباری قسم کے لوگوں نے ان کی آواز دبادی۔ پاکستان کی سرحدوں کے بارے میں عوام کو تو کبھی کچھ بتایا ہی نہیں گیا تھا۔ اس اعلان سے اور مسٹر جناح کے اُسے منظور کرنے سے بہ قول سریامین ''بہت لوگوں کے آنسو نکل آئے۔'' انھیں اس طرح کی تقسیم کا خیال تک نہ تھا۔

۳؍جون ۱۹۴۷ء کے ذیل میں سریامین اس تقسیم ملک کے فیصلے پر یوں تبصرہ فرماتے ہیں ماؤنٹ بیٹن ۳۱؍مئی کو لندن سے لوٹے تھے۔

ماؤنٹ بیٹن (وایسرائے) کا اعلان...ہوا۔ پھر رات کو مسٹر نہرو اور مسٹر جناح کے اعلان ریڈیو پر ہوئے... مسٹر جناح نے مسلمانوں کو پیغام دیا کہ انھوں نے اس کو منظور کر لیا ہے۔ غالباً وایسرائے ان کی منظوری لے کر لندن گئے تھے۔ (۱)

---

(۱) ۳؍جون کے اعلانِ تقسیم ملک کے بعد ہندستان کی گورنر جنرلی سے فراغت سے پہلے ماؤنٹ بیٹن کے سفرِ لندن کا کوئی سراغ نہیں ملتا۔ ہندستان پاکستان میں قیام کے دور میں انھوں نے صرف ایک ہی سفر مئی ۱۹۴۷ء میں کیا تھا۔ اسی سفر میں انھوں نے اپنے بنائے ہوئے تقسیم ملک کے پلان کی منظوری برطانیہ کے وزیر اعظم، برطانوی کابینہ کے بعض ارکان، مسٹر لی چرچل وغیرہ سے حاصل کی تھی اور اپنا پلان منظور کروا کر لوٹے تھے۔ (ا۔ ش)

...شملہ پر مسلمانوں میں ہیجان پھیل گیا۔ یہ بھی افواہ یہاں آئی ہے کہ جس وقت وایسرائے کو منظوری دینے مسٹر جناح اس کے لندن جانے سے قبل لیگ کی طرف سے جارہے تھے تو مسٹر حسین شہید سہروردی نے یہ کہہ کر سینہ پیٹ لیا تھا ہائے میرا بنگال ہائے میرا بنگال![1]

پنجاب کے مسلمان اور خاص کر شملہ کے، اس امید میں تھے کہ صرف انبالہ کمشنری علاحدہ کی جائے گی اور بعینہٖ پنجاب مسلمانوں کا رہے گا... مگر اس اعلان سے اور مسٹر جناح کے اس کو منظور کرنے سے بہت لوگوں کے آنسو نکل آئے...

قاید اعظم نے غالباً ورکنگ کمیٹی کے مشورے سے (باؤنڈری) منظور کر لی ہے۔ اب اس میں گڑبڑ کرنا بے کار ہے اور کونسل میں چل کر کون آئے گا جو اس ادھورے پاکستان کی منظور دینے آئے۔ جو آئیں گے ان سے قاید اعظم کہہ دیں گے کہ بس یہ ملتا ہے، لینا ہے تو لو، ورنہ یہ بھی جائے گا۔ اس کے بعد کون مخالفت کرے گا۔

اس لیے میں نے تو ارادہ کر لیا کہ میں نہ جاؤں گا چوں کہ میں ایمان دارانہ طور پر اس تقسیم کو غلط سمجھتا ہوں... اور تعجب کرتا ہوں کہ قاید اعظم کیوں کر پھندے میں پھنس گئے۔

مسلم لیگ کونسل کے اس اجلاس منعقدہ ۱۰/ جون ۱۹۴۷ء میں البتہ خاکساروں کے ایک جتھے نے تقسیم ملک کے خلاف احتجاجی مظاہرہ کیا۔ سید نور احمد لکھتے ہیں: جلسے کی کارروائی شروع ہونے سے پہلے خاکساروں کے ایک جتھے نے زبردستی ہال میں داخل ہونے کی کوشش کی۔ پولیس آگئی تو پوچھ گچھ پر خاکساروں نے بتایا:

---

(۱) لندن کا آخری سفر جناح صاحب نے وایسرائے ہند لارڈ ویول کے عہد میں اواخر ۱۹۴۶ء میں برطانوی وزیر اعظم لارڈ اٹیلی کی دعوت پر کیا۔ اس سفر میں نواب زادہ لیاقت علی خاں، جواہر لال نہرو، بلدیو سنگھ مسلم لیگ، کانگریس اور اقلیت کے نمایندے شریک تھے۔

آزاد بنگال کی تحریک، اس کے سہروردی کی کوشش کی سرگرمی کامیابی کی امید و مسرت اور ناکامی کی فسردگی و ماتم کا دور لارڈ ماونٹ بیٹن کی وایسرائے شپ کی بہت تھوڑی مدت کی تگ و دو تھی۔ اس انجام کی روداد زیر نظر تالیف کے آخری صفحات میں مطالعہ کیجیے۔ (ا س. ش)

''ہم اپنے امیر کے حکم سے اس جلسے کے حاضرین کو یہ بتانے آئے تھے کہ مسلمان اس پلان کو منظور نہیں کرتے۔''

کونسل نے پلان کی منظوری دے دی۔ مسٹر جناح نے بیان دیا اور کہا:

''ہم مغربی و مشرقی پاکستان کے درمیان راستہ لیں گے۔''

۱۰ر جون ۱۹۴۷ء۔ میں نے مسٹر جناح کو اس پر مبارک باد لکھی کہ آپ کے اس بیان سے یہاں مسلمانوں میں جان پڑی۔ چوں کہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے یہ طے کرنے کے بعد یہ بیان دیا ہوگا۔

۱۱ر جون ۱۹۴۷ء۔ سردار پٹیل کا بیان اخبارات میں چھپا کہ مسٹر جناح کا بیان کہ پاکستان کے دونوں حصوں کے درمیان راستہ ملے گا۔ احمقانہ ہے۔ یہ نہایت سخت الفاظ تھے، جس پر مسلمانوں کو شملہ میں بڑا غصہ آیا۔

آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے اجلاس منعقدہ ۱۴ر جون نے بھی تقسیم کی منظوری دے دی۔ بہ قول سید نور احمد اس کی زیادہ تر مخالفت کانگریسی مسلمانوں نے کی۔ پٹیل نے اس کا جواب دیا اور کہا: کابینہ مشن پلان گیا، اچھا ہوا۔ اب ۳/۴، بلکہ ۴/۵ ہندستان کانگریس کے زیر اقتدار ہوگا اور کوئی اندرونی مخالفت نہیں ہوگی۔ ہم یکسوئی سے کام کرسکیں گے۔

سر یامین اور ان جیسے اور بھی بہت سے سر، خان بہادر، نواب اور مسلمان سرکار پرست افراد نہ گروپ اسکیم سے خوش تھے، نہ ۳ر جون ۱۹۴۷ء کی تقسیم سے۔ سوال یہ ہے کہ آخر وہ کیا چاہتے تھے۔

مارچ ۱۹۴۶ء میں کیبنٹ مشن آیا تھا۔ ۱۱ر اپریل ۱۹۴۶ء کو سر یامین خان نے جو اس وقت مرکزی اسمبلی میں مسلم لیگ پارٹی کے سیکریٹری تھے، مشن کے ارکان کو ایک نوٹ بھیجا، جس میں حسب دستور ہندو اکثریت کی زیادتیوں کا رونا رویا گیا۔ اور ہندوؤں اور مسلمانوں میں باہمی دوری پر روشنی ڈالی گئی۔ لکھا:

''...سوائے صوبہ سرحد، سی پی، اڑیسہ اور مدراس کے سب جگہ ۵۰ فیصدی نشستیں مسلمانوں کی اور ۵۰ فیصدی غیر مسلموں کی صوبائی اسمبلیوں میں جداگانہ

انتخابات سے ہوں اور ۵۰ فیصدی مسلمان ۵۰ فیصدی غیر مسلم وزیر ہوں، لیکن ان چار صوبوں میں، جہاں مسلمان یا ہندو بہت اقلیت میں ہیں... یہاں اقلیت کو ۲۵ فیصدی ممبر اور وزارت اور اکثریت کو ۷۵ فیصدی دی جائیں۔ کمشنری انبالہ کو پنجاب سے نکال دیا جائے۔

ان اصولوں کو ماننے کے بعد کانسٹی ٹیوٹ اسمبلی بنائی جائے، جو آئین کو بنائے... اگر یہ نامنظور ہے۔

''تو چھ صوبے ہندستان سے جدا کر کے پاکستان علاحدہ بنا دیا جائے۔ جس میں بنگال، آسام، پنجاب، سندھ، صوبہ سرحد اور بلوچستان شامل ہوں اور چیمبر آف پرنس اپنی ریاستوں کا ایک جدا آئین بنالیں اور پاکستان اور ہندستان سے تعاون کریں۔''

معلوم نہیں سر یامین نے یہ نوٹ قاید اعظم کے مشورے سے لکھا اور ان کی منظوری لی یا نہیں، چناں چہ اسے کہاں تک ان کا خیال سمجھنا چاہیے، لیکن جہاں تک خود قاید اعظم کا تعلق ہے، انھوں نے آخر وقت تک ان کے ذہن میں پاکستان کا جو تصور یا نقشہ تھا۔ اس کی کبھی حدود کا تعین نہیں فرمایا اور اسی پر زور دیتے رہے کہ کانگریس یا ہندو مسلمانوں کو ایک علاحدہ قوم مانیں اور ان کا حق خود ارادیت تسلیم کریں۔ باقی پاکستان عملاً کن علاقوں پر مشتمل ہوگا۔ اس کی وضاحت نہیں کی اور اسے ہمیشہ مبہم رکھا۔

[تحریک پاکستان کا ایک باب: ص ۹۲-۱۰۱]

(۲)

مولانا ابوالکلام آزاد اور مسلم لیگ

پروفیسر محمد سرور لکھتے ہیں:

انھی دنوں جب کہ مرکز میں کابینہ بن گئی تھی مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی جامعہ نگر اوکھلا دہلی میں میرے ہاں چند دن قیام فرما رہے۔ موصوف مولانا ابوالکلام آزاد سے ڈیرہ دون میں مل کر آئے تھے۔ وہ مولانا آزاد سے بہت قریب تھے۔ احرار میں ہوتے ہوئے وہ ذہناً کانگریسی تھے۔ جنگ کے دوران وہ مولانا آزاد کے جیل کے ساتھ بھی رہے۔ فرمانے لگے میں نے مولانا سے پوچھا:

''حضرت! مسلم لیگیوں کا یہ سب زور شور حکومت کی نظر التفات کا رہین منت ہے۔ ذرا مسلم لیگ کو اپوزیشن میں رہنے دیجیے، پھر دیکھیے وہ کتنے پانی میں ہے اور کون کب تک اس کے ساتھ رہتا ہے۔''

مولانا لدھیانوی نے بتایا کہ میں نے مولانا سے عرض کیا کہ کانگریس کی اب حکومت ہے اور اگر وہ کچھ توجہ کرے تو بہت سے لوگ ہمارے ساتھ آجائیں گے۔ مسلم لیگ تو بس حکومت کا سایہ ہے۔

مولانا لدھیانوی کہنے لگے کہ میں نے دیکھا کہ مولانا میری ان باتوں سے کچھ خوش نہیں، میں سٹپٹا سا گیا، وہ کچھ توقف کے بعد فرمانے لگے:

''مولوی صاحب! بات یوں نہیں، اس ٹوٹے ہوئے دھاگے کو جوڑنا ہی پڑے گا۔ مسلم لیگ کو آخر کار کابینہ میں لانا ہوگا۔''

انھی دنوں پنجاب اور دوسرے صوبوں سے کئی مسلمان سیاسی کارکن و رہنما جو مسلم لیگ کے ستائے ہوئے تھے، دہلی پہنچے اور کوشش کی کہ مولانا آزاد اور دوسرے رہنماؤں سے سرکاری طور پر حوصلہ افزائی ہو تو مسلم لیگ کے خلاف جتھہ بندی کی جائے، لیکن مولانا آزاد

حسب دستور اپنی استعاراتی و تمثیلاتی زبان میں یہی اشارے کرتے رہے کہ مسلم لیگ کو کابینہ میں لانا ہی ہوگا۔

سید نور احمد کے الفاظ میں:

''اس مرحلے پر قاید اعظم محسوس کر رہے تھے اور عبوری حکومت کا مورچہ کانگریس کے ہاتھ میں چھوڑ دینا نقصان دہ ہوگا۔ وہ اپنی ٹیم عبوری حکومت میں داخل کرنا چاہتے تھے، لیکن راستے میں کئی مشکلات تھیں۔''

مسلم لیگ کو کابینہ میں شامل کرنے کی غرض سے پھر وایسرائے قاید اعظم اور نہرو کے مابین لمبی چوڑی خط و کتابت ہوئی آخر ۲۵ / اکتوبر ۱۹۴۶ء کو مسلم لیگ کے ارکان کابینہ کا اعلان کر دیا گیا۔

قاید اعظم کی ڈکٹیٹری:

سر یامین لکھتے ہیں:

''ورکنگ کمیٹی سے مسٹر جناح نے یہ اختیار اپنے لیے لے لیا تھا کہ وہ چاہیں جس جس کا نام وایسرائے کو... دے دیں...''

جو پانچ آدمی لیے گئے ان کے نام یہ تھے: لیاقت علی خان، عبدالرب نشتر، راجہ غضنفر علی، چندری گر اور منڈل (اچھوت لیڈر)۔

سر یامین کے بہ قول مسٹر جناح کے اس انتخاب پر لوگ ناراض تھے۔ اور اس پر طرح طرح کی چہ میگوئیاں کی گئیں۔ لکھتے ہیں:

''... مسلم لیگی حلقوں میں غم و غصہ منڈل کے لیے جانے پر بے حد تھا اور اکثر لوگوں نے کہا کہ قاید اعظم کو کیا ہوگیا؟ انھیں کس نے یہ حق دیا تھا کہ وہ لیگ کے باہر کے آدمی کو جو اچھوت قوم کا ہے، اس کو لیگ کا نمایندہ بنائیں۔

بعض زیادہ غصے میں تھے اور کہتے تھے کہ ''قاید اعظم ڈکٹیٹر بن گئے ہیں۔'' اور چندری گر کو محض اس لیے لیا ہے کہ بمبئ شہر میں لوگ خوش رہیں...''

مسلم لیگ کابینہ میں شامل تو ہوگئی، لیکن اسے کانگریس کی شرطوں پر شامل ہونا پڑا اور محکمے بھی اپنی مرضی کے نہ ملے۔'' [ص ۱۲۶-۱۲۴]

(۳)

مولانا ابوالکلام آزاد اور علی گڑھ یونی ورسٹی

(انٹیرم گورنمنٹ کے قیام کے بعد) مرکز میں کانگریس برسراقتدار آچکی تھی اور پھر جیسے ہندستان کے اندر مسلم لیگ اور پاکستان تحریک کا زور بڑھتا گیا۔ کانگریس کے اندر پٹیل گروپ زیادہ سے زیادہ طاقت ور ہوتا گیا تھا۔ اس زمانے میں جس کا یہ ذکر ہے۔ پٹیل کانگریس اور مرکزی حکومت پر بالکل چھائے ہوئے تھے اور ملک کی تقسیم اور پاکستان کا قیام بالکل یقینی نظر آرہا تھا۔ ظاہر ہے علی گڑھ کا شہر ہندستان میں تھا اور علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کا جو مرکز کی امداد سے چلتی تھی، مرکزی حکومت ہی سے سابقہ پڑتا۔

مولانا آزاد کی بہ حیثیت وزیر تعلیم یہ کوشش تھی کہ علی گڑھ یونی ورسٹی بچ جائے اور اس پر ہندو فرقہ پرستوں کی طرف سے جو یلغار متوقع تھی، اس سے وہ محفوظ رہے۔ اس کے پیش نظر کہتے ہیں، پہلے وہ نواب اسماعیل خان کو وہاں کا وائس چانسلر لائے اور پھر ڈاکٹر ذاکر حسین خان کو۔

مولانا ابوالکلام کی سوچ اور عمل تو ان خطوط پر تھا اور مسلم لیگی قیادت نے ان کے ساتھ اس وقت بھی جو سلوک روا رکھا، اس کا بیان سریامین کی زبان سے سنیے:

”۱۹ر مارچ ۱۹۴۷ء: مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنی رہائش پر ایک لنچ دیا، جس میں مجھے، نواب اسماعیل خان اور ڈاکٹر ضیاالدین احمد کو جو مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ سے تعلق رکھتے ہیں، مدعو کیا۔ اور چوں کہ یہ وزیر تعلیم ہیں اور ترکی سے وفد آیا ہے اس کو مدعو کیا ہے۔ لیگ پارٹی کے وہپ سیٹھ حاجی عبدالستار نے اعتراض کیا کہ ہم مولانا آزاد کے یہاں نہ جائیں۔ ڈاکٹر ضیاء الدین نے کہا کہ وہ مسلم یونی ورسٹی کے وائس چانسلر ہیں، اور یونی ورسٹی کا سارا دارومدار گورنمنٹ کی امداد پر ہے اور مولانا آزاد وزیر تعلیم ہیں اور ہمیں ان کی ذات سے تعلق نہیں بلکہ ہم تو

وزیر تعلیم کے یہاں جارہے ہیں۔ سیٹھ عبدالستار نے کہا کہ مسٹر لیاقت علی خان کا خیال تھا کہ ہم نہ جائیں۔ نواب اسماعیل خان نے جو کمیٹی آف ایکشن کے چیئرمین ہیں، لیاقت علی خان کی رائے سے اتفاق نہ کیا۔ لہٰذا

۳/اپریل ۱۹۴۷ء: ڈاکٹر ضیاء الدین احمد چوں کہ مسلم یونی ورسٹی سے عشق رکھتے ہیں اوراس کا چلنا بغیر گورنمنٹ کی مدد کے ممکن نہیں لیکن مولانا ابوالکلام آزاد کے ممبر تعلیم ہوجانے سے ان سے تعاون ضروری ہے، جس کو لیاقت علی خان اور قاید اعظم پسند نہیں کرتے اوراس کو ایک قسم کا ذاتی معاملہ بنالیا ہے۔ قاید اعظم اس کو اپنی ذاتی شکست سمجھتے ہیں کہ ابوالکلام آزاد اگز یکٹو کونسلر ہو گئے۔ اس لیے ڈاکٹر صاحب بڑی مشکل میں ہیں اور چاہتے ہیں کہ کچھ دن کو وایس چانسلری سے علاحدہ ہوجائیں۔ اب لیاقت علی خان نہ تو نواب اسماعیل خان کو نہ ڈاکٹر صاحب کو چاہتے ہیں۔''

لارڈ ماؤنٹ بیٹن سے ملاقات:

سر یامین ۱۱/اپریل کو ماؤنٹ بیٹن سے ملے اس ملاقات کی تفصیلات سنیے۔ تقسیم ہندستان کا اعلان ۳/جون کو ہوا۔ کوئی تین ہفتے بعد۔

''[ماؤنٹ بیٹن] مجھ سے کہنے لگا کہ میں جلداز جلد ہندستان کے معاملے کو طے کرنا چاہتا ہوں۔ اگر مسلم لیگ پنجاب اور بنگال کو تقسیم کرنے پر رضا مند ہوگئی تو تقسیم کرکے مسلمان اکثریت کے حصے کو پاکستان بنادوں گا اور اگر لیگ رضا مند نہ ہوئی تو میں ہر صوبے کو جدا جدا آزادی دے دوں گا اور ہر صوبے کو اختیار ہوگا کہ وہ چاہے جس دوسرے صوبے سے مل جائے۔

میں نے کہا کہ آپ نے مسلم لیگ اور کانگریس کے لیڈروں سے اس پر گفتگو کرلی یا نہیں، بولے: میں کر رہا ہوں اور میرا مشیر مینن تقسیم کی اسکیم بنارہا ہے۔

وایسرائے نے سر یامین کو اپنے مشیر ریفارمس کمشنر مینن سے ملنے کو کہا۔ موصوف اس سے ملے اور جب اس نے بتایا کہ ''وہ مسلم لیگ کے ریزولیوشن ۲۳/مارچ

۱۹۴۰ء کی بنا پر غور کر رہا ہے۔'' تو انھوں [سر یامین] نے ''اس ریزولیوشن کے اصل مفہوم'' پر ایک لمبی تقریر کر ڈالی۔ اور کہا کہ مسلم اکثریت کے مسلسل علاقوں سے مراد اضلاع نہیں، بلکہ دیہات اور دیگر علاقے ہیں۔ اگر بیچ میں کوئی غیر مسلم اکثریت کا علاقہ آجائے تو اس کا اور کہیں معاوضہ دے دیا جائے۔ مسلمان کل پنجاب کے علاوہ اس سے ملحق مسلم اکثریت کے یوپی کے علاقے اور علی گڑھ بھی چاہتے ہیں، جو ہمارا تعلیمی مرکز ہے۔

...مگر یہ مدراسی چالاک اور قابل ہے اور کم زور پاکستان اور طاقت ور ہندستان بنانا چاہتا ہے، اس لیے ٹالنے کے واسطے بولا کہ وایسرائے تو ان دو صوبوں کی تقسیم چاہتے ہیں...''

۱۲/اپریل: میں نے اسمبلی میں لیاقت علی خان کو اپنی گفتگو کمشنر مینن سے سنائی اور کہا کہ آپ سب مل کر یہ زور دیں کہ اس کو اس عہدے سے علاحدہ کیا جائے اور اس کی جگہ یورپین ہو... لیاقت علی خان نے وعدہ تو کیا، لیکن معلوم ہوا کہ وہ گھبراتے ہیں۔ (غالباً قاید اعظم سے؟)

۱۳/اپریل: شام کو مسلم لیگ پارٹی کی میٹنگ ہوئی۔ سر یامین لکھتے ہیں:

''... پارٹی کے سب ممبروں نے قاید اعظم سے دریافت کیا کہ ہم کو بتایئے پاکستان ملنے یا نہ ملنے کی کیا صورت ہے؟ میں نے وایسرائے سے گفتگو کا حال بتایا۔ قاید اعظم نے کہا کہ ''آپ یہ گفتگو کرنے کیوں گئے۔''

سر یامین نے کہا کہ

''میں تو ہر وایسرائے سے ہر سیشن میں کم از کم ایک دفعہ ملاقات کرتا ہوں اور مسلمانوں کے معاملات میں ان کی مدد چاہتا ہوں۔ ہندستان بھر سے مسلمان مجھے خط لکھتے ہیں۔

آپ نے آج تک کسی مسلمان کا کوئی کام نہیں نکالا۔ اگر وہ آپ کو لکھتا ہے تو آپ بھی مجھی کو لکھتے ہیں۔ اس لیے میں وایسرائے اور اگزیکٹیو کونسلروں سے دوستی

رکھتا رہا ہوں اور جب وایسرائے نے خود قصہ تقسیم بنگال و پنجاب کا نکالا اور پوچھا تو میں نے لیاقت علی خان کو اور آپ کو متنبہ کر دیا کہ مسٹر مینن کے ذریعے کیا اسکیم بن رہی ہے تاکہ آپ آگاہ ہو جائیں اور عین وقت پر دھوکا نہ کھائیں اور سب لوگوں سے مشورہ لیجیے تاکہ سب آپ کی مدد کر سکیں۔ (اس معاملے کو) صرف اکیلے اپنے اوپر نہ چھوڑیے کہ کہیں دھوکا نہ کھائیں۔"

سر یامین اس پر یہ اضافہ کرتے ہیں:

"اس کے بعد سب نے ان سے کہا کہ آپ بتائیں کہ صورت ہے کیا؟ اس پر قاید اعظم ایک دم کھڑے ہو گئے اور ڈرامائی طور پر یہ کہتے ہوئے کہ پاکستان لیں گے، ان شاء اللہ! کمرے سے چلے گئے۔"

۱۵/اپریل ۱۹۴۷ء: پنجاب کے وزیر اعظم خضر حیات نے استعفا دے دیا۔ راول پنڈی میں سکھ مسلم فساد ہوئے۔ سیکھ پٹے، اور ان کے مکانوں کو آگ لگی، دہلی میں سکھ دو دو تلواریں لے کر نکلتے ہیں سنگھٹن نے خوب ہتھیار جمع کیے ہیں اور تغلق آباد کے پاس ان کا اڈا ہے، مسلمانوں پر حملے کرتے ہیں، اس قسم کے واقعات روز ہوتے ہیں مسلمانوں کے پاس سوائے ڈنڈے کے کوئی ہتھیار نہیں۔ [ص ۱۵۱-۱۴۸]

(۴)

مسٹر جناح کے دہلی مکان کا فروخت اور مسلمانوں پر اس کا اثر

اس عنوان کے تحت سر یامین اپنے نامۂ اعمال میں ۴ر لغایت ۸ر اگست ۱۹۴۷ء کی روداد لکھتے ہیں:

موصوف ریلوے انکوائری کمیٹی کے ممبر تھے، کمیٹی کے دوسرے ممبروں کے ساتھ جنوبی ہند کا طویل دورہ کرنے کے بعد وہ اوایل اگست میں واپس دہلی پہنچے۔

دہلی میں آن کر عجیب تغیر پایا۔ وایسرائے نے جلدی مچا کر تمام دفاتر کو تقسیم کی وجہ سے مجبور کیا ہے اور وہ رات دن کام کر رہے ہیں۔ افسروں اور ملازمین سے دریافت کیا گیا ہے کہ آیا وہ پاکستان جائیں گے یا ہندستان میں رہیں گے۔

یوں تمام مسلمان سرکاری ملازم عجب چہ کنم میں ہیں۔ ان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ اگر پاکستان گئے تو ان کی ترقی کے دروازے تو بند نہ ہو جائیں گے۔ معلوم نہیں کہ ہندو سرکاری ملازم ادھر سے کس تعداد میں آئیں گے اور پاکستان کی مالی حالت کیا ہوگی؟ غلام فاروق تو ہندستان میں رہیں گے اور ان کے بھائی پاکستان جائیں گے۔

سب سے بڑا اور اہم یہ واقعہ ہے کہ قاید اعظم محمد علی جناح نے اپنی کوٹھی سیٹھ ڈالمیا کے ہاتھ اس سے کئی گنا قیمت پر فروخت کر دی، جس قدر میں خریدی تھی۔ سیٹھ ڈالمیا کی سیمنٹ فیکٹری کراچی میں ہے، جس کو پاکستان کا دار السلطنت مقرر کیا جا رہا ہے۔ وہاں ایک کوٹھی قاید اعظم نے سنا ہے کہ کسی پارٹی سے خریدی ہے اور خود دہلی سے کراچی منتقل ہو رہے ہیں۔ اس نے تمام دہلی میں ہل چل مچا دی ہے اور سوداگروں میں کھلبلی پڑ گئی ہے۔

اب تک تو سب اس خیال میں تھے کہ پاکستان علاحدہ ہو جائے گا تو اِدھر کے آدمی

اِدھر اور اُدھر کے آدمی اُدھر رہیں گے اور قاید اعظم جن کی صحت خراب ہے، وہ سیاست سے کنارہ کش ہو کر بمبئی میں قیام کریں گے اور پاکستانیوں پر پاکستان چھوڑ دیں گے مگر قاید اعظم کے پاکستان جانے (کے فیصلے سے) سے رنگ بدل گیا اور لوگ حیران ہوئے کہ ایسا کیوں ہوا۔ اُدھر کے آدمی اِدھر اور اِدھر کے اُدھر بھاگیں گے۔

ایک طرف تو یہ افراتفری اور سراسیمگی پھیل رہی تھی اور دوسری طرف ریاست الور میں مسلمان مارے جا رہے تھے، دہلی کی فضا خراب تھی اور پنجاب میں مسلمانوں اور ہندوؤں سکھوں کے درمیان خونیں معرکے ہو رہے تھے۔

راقم الحروف (محمد سرور) ان دنوں دہلی میں تھا۔ ریاست الور سے جان بچا کر بھاگنے والے مسلمان جامع مسجد کے سامنے ڈیرے ڈالے پڑے تھے۔ گوڑگانوہ کے میو بھی پٹ پٹا کر برابر آ رہے تھے اور کوئی ان کا پرسان حال نہ تھا۔ دہلی میں روز وارداتیں ہوتیں۔ فرقہ پرست اخبار آگ لگا رہے تھے۔ لوگ سہمے ہوئے تھے۔ سر یامین لکھتے ہیں:

> ''...قاید اعظم کے جانے سے مسلمانوں کے پیر اُکھڑنے لگے۔ میں نے ۸/ اگست کو لیاقت علی خان کو فون کیا اور دریافت کیا کہ آپ کا کیا ارادہ ہے۔ آیا آپ بھی پاکستان جائیں گے جب کہ آپ پاکستان کے باشندے نہیں ہیں اور نہ چندری گر ہیں۔ اگر آپ گئے تو یہاں کی فضا بہت خراب ہو جائے گی، اگرچہ میں جانتا ہوں کہ آپ نے ذاتی طور پر کانگریس والوں سے ایک قسم کی رنجش پیدا کر لی ہے۔ تاہم جو اوروں کا حشر ہو گا وہی آپ کا ہونا چاہیے اور اگر آپ یہاں سے چلے گئے تو نتیجہ خدا معلوم کیا ہو؟ لیاقت علی خان نے کہا کہ انھوں نے ابھی تک کوئی فیصلہ نہیں کیا...''

سر یامین کو ریلوے کمیٹی کے ساتھ دورے پر جانا تھا، اس لیے ان کی مزید ملاقات یا گفتگو لیاقت علی خان سے نہ ہو سکی۔ بعد میں لیاقت علی کراچی چلے گئے۔ (۱)

(۱) جناح صاحب ۷/اگست ۱۹۴۷ء کو پاکستان تشریف لے آئے تھے۔ ۱۱/اگست کو اسمبلی کا پہلا اجلاس

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر......)

۹ راگست ۱۹۴۷ء کو سریامین اجمیر پہنچے وہاں درگاہ میں سیکڑوں زخمی پناہ گزین تھے جنھیں ریاست الور سے نکالا گیا تھا، ان کے لیے چندہ جمع ہو رہا تھا۔

اپنے اس دورے کے دوران میں وہ وسط ہند کی ایک چھوٹی سی ریاست جاورہ گئے اور وہاں کے نواب کو وہی باتیں کہیں جو وہ نظام حیدر آباد اور نواب بھوپال سے کہہ چکے تھے۔ لکھتے ہیں:

''میں نے کہا کہ آپ ان تمام سقوں اور میواتیوں کو جو ریاست الور سے نکالے ہوئے اجمیر میں پناہ گزین ہیں، اپنی ریاست میں لے لیجیے۔ یہ مسلمان آپ کے واسطے جان دیں گے۔ انھیں کاشت کے لیے زمین دیجیے۔''

بے چارہ نواب بڑا سیدھا اور شریف طبع آدمی تھا: کہنے لگا کہ آپ یہ سب باتیں وزیر اعظم کو سمجھا دیجیے۔ میں نے کہا:

''وہ دہلی گئے، میں بمبئی جا رہا ہوں۔ وقت نکل جائے گا آپ ریاست کی آبادی

ہوا تھا۔ جس میں جناح صاحب گورنر جنرل پاکستان اور لیاقت علی خان وزیر اعظم پاکستان ہونے کے باوجود اسپیکر اور اسسٹنٹ اسپیکر کے مثل تھے۔ اسپیکر کی حیثیت ہاؤس کے ایک عام رکن کے برابر ہوتی ہے۔ لیکن انصاف و دیانت کا حلف اٹھانے کی وجہ اس کا احترام کیا جاتا ہے اور اسی طرح اسمبلی کے ارکان وزیر اعظم کا انتخاب بھی علم، قابلیت اور تجربے کی بنیاد پر ہوتا ہے۔

لیکن جنرل ملک کی سب سے بڑی قابلِ احترام شخصیت اور با اختیار شخصیت ہوتی ہے، جو اسمبلی کو توڑ سکتی ہے۔ وزیر اعظم اور اس کی کابینہ کو ڈِس مس کر سکتی ہے۔ اس کو عوام کے منتخب ممبر اکثریت کے ووٹوں سے ملک کے گورنر جنرل کا عہدہ بناتے ہیں اور اعتماد کے اس درجے پر اور اس اختیار کے ساتھ اسے خاص مقام پر بٹھاتے ہیں کہ ملک کے ووٹوں سے قایم شدہ اسمبلی اور قایم شدہ حکومت بھی توڑ دی جا سکتی ہے۔ عوام کی خدمت اور انتظامیہ کی رہنمائی کا ایسا شوق تھا کہ اپنی عزت کی پروا نہ کی لیکن نہ تولے جس لیٹو کے اراکین نے نہ تو ان کا اسمبلی میں بیٹھنا اور ان کی رہنمائی کو گوارہ کیا اور نہ وزیر اعظم آفس میں لیاقت علی کاں کو ان کا وجود اوع اپنی تربیت پسند نہ تھا۔ سب نے اپنے اوپر عدم اعتماد کا اظہار سمجھا۔ جناح صاحب حکومت اور لیگ ہر دو دایروں میں ان کے اپنے تھے لیکن سب ان سے بیزار تھے۔ (ا س ش)

آدھے سے زیادہ مسلمان کر لیجیے ورنہ آیندہ آپ کو اور مشکلات پیش آئیں گی۔
ہندو رعایا اس وقت تو وفادار ہے، لیکن نہ معلوم آیندہ کیا ہو؟''

قایداعظم کے عزایم:

ایس۔ ایم۔ ایس شرما نام سے جنوبی ہند کا رہنے والا ایک ہندو جرنلسٹ تھا، جسے ۱۹۱۷ء سے قایداعظم تک رسائی حاصل تھی۔ تقسیم ملک کے وقت وہ کراچی کے اخبار ڈیلی گزٹ کا ایڈیٹر تھا۔ کراچی کے ہندو مسلم فساد کے بعد وہ ہندستان چلا گیا۔ فسادات کے دوران قایداعظم نے اس کے بال بچوں کی حفاظت کا انتظام کرایا تھا۔

ہندستان جا کر شرما نے Peeps in to Pakistan نام کی کتاب لکھی، جس میں ایک جگہ اس نے ایک واقعہ بیان کیا جو نیچے درج کیا جاتا ہے۔ اس کتاب میں قایداعظم کی کافی تعریف ہے۔

پریس کانفرنس سے پہلے شرما کی ریہرسل:

۳/جون ۱۹۴۷ء کے بعد کا ذکر ہے ایک دن کراچی میں مجھے یوسف ہارون نے فون کیا اور کہا کہ قایداعظم ممنون ہوں گے اگر تم اس کانفرنس میں خود موجود ہو، جو قایداعظم کراچی تشریف لانے سے پہلے دہلی میں کر رہے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ تم انھیں پریس کانفرنس سے نصف گھنٹہ پہلے ملو۔ وہ اس پر اصرار کرتے ہیں۔ وہ تمھارے مشکور ہوں گے۔
شرما نے لکھا ہے کہ ''مسٹر جناح کے دروازے میرے لیے کھلے ہوتے تھے۔''

''میں حسب ارشاد مسٹر جناح سے پریس کانفرنس سے نصف گھنٹہ قبل ان کی کوٹھی ''۸۰۔ اورنگ زیب روڈ'' میں ملا۔ وہ بڑی اچھی طرح سے پیش آئے اور ہاتھ ملانے کے بعد بغیر کسی خاص تمہید کے مجھ سے اصل موضوع پر جو ان کے دل میں تھا، بات شروع کردی۔ مسٹر جناح کا رویہ بہت شفقت کا تھا۔

کہنے لگے: ''تم کراچی میں بدستور رہنا اور ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان زیادہ اچھے، زیادہ خوش گوار اور پائیدار تعلقات قایم کرنے میں میری مدد کرنا۔ اس سلسلے میں انھوں نے کچھ اور باتیں کیں اور پھر وہ اس مسئلے پر آئے، جس کے

بارے میں وہ مجھے اپنے اعتماد میں لینا چاہتے تھے۔ کہنے لگے کہ ''اب جب کہ میں نے پاکستان حاصل کرلیا ہے، مجھے اب ہندوؤں کے خلاف کسی قسم کا کوئی غصہ نہیں رہا۔ فی الواقع اب میں پھر اپنے پرانے اور مشہور ''ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان صلح کرانے والے سفیر'' کے تاریخی کردار کی طرف لوٹنا چاہتا ہوں۔'' انھوں نے تجویز کیا کہ ''جس طرح میں کئی سال تک ہندستان میں اقلیتوں کے حقوق کا علم بردار رہا۔ اب میں پاکستان میں ان کے حقوق کا محافظ بننا چاہتا ہوں۔''

''سنو، میرے عزیز!'' مسٹر جناح ذرا بلند آواز سے بولے: ''میں اپنے آپ کو پاکستان میں ہندو اقلیت کا Protector General (جنرل محافظ) بنا رہا ہوں۔ میں اس کام میں تمھاری مدد چاہتا ہوں۔ تم اس میں انکار نہیں کر سکتے۔

میں یہ سن کر ہکا بکا رہ گیا۔ اگرچہ میں انھیں مسز اینی بیسنٹ کی عنایت سے ۱۹۱۷ء سے جانتا تھا، لیکن میں ان کی طرف سے اس قسم کی فیاضی کے یک بارگی اقدام کے لیے تیار نہ تھا۔ جب کہ وہ گزشتہ کئی سالوں میں ہندوؤں کے بہترین افراد کو اپنے توہین آمیز جملوں کا نشانہ بنا چکے تھے۔

جیسے انھوں نے میرے خیالات کا اندازہ کرلیا ہو، قبل اس کے کہ میں کچھ کہتا، وہ خود ہی بولے اور مجھے جواب دینے کا موقع نہ دیا۔

''کیا میں نے کبھی سی آر وجیا را گوا چاریہ، پنڈت مدن موہن مالویہ، سچدا نند سنہا اور سی پی راما سوامی کے خلاف کبھی ایک لفظ کہا؟ حال آں کہ یہ سب مجھے جان سے مارنے کے لیے مجھ پر سنگ باری کرتے رہے، یہ میرے ذاتی دوست تھے، میں ان کا کبھی جواب نہ دوں گا۔''

آخر میں مسٹر جناح نے مجھ سے کہا اور اپنی بات یوں ختم کی:

''میرے عزیز! تم آج پریس کانفرنس میں موجود رہنا اور جو تم پریشان کن سوال کر سکتے ہو کرنا۔ میں ان کا مناسب جواب دینا چاہتا ہوں۔ چناں چہ میں نے

اُن کے سامنے اپنے سوالات پیش کیے اور اس طرح پریس کانفرنس سے پہلے ہماری Rehearsal (مشق) سی ہوگئی۔''

شرما لکھتے ہیں:

''اس شام کو میں گاندھی جی کے پاس پہنچا اور جو کچھ میری مسٹر جناح کے ساتھ گفتگو ہوئی تھی، پوری ایمان داری سے میں نے اس کا ایک ایک لفظ ان سے کہا، گاندھی جی سن کر بڑے خوش ہوئے۔''

آئین ساز اسمبلی میں قاید اعظم کی تقریر:

کراچی پہنچ کر ۱۱/اگست ۱۹۴۷ء کو پاکستان آئین ساز اسمبلی میں قاید اعظم نے جو تقریر کی تھی وہ شرما کے اس بیان کی پوری تائید کرتی ہے۔ اس تقریر میں انھوں نے کہا تھا کہ

''ایک دن آئے گا جب مسلمان مسلمان نہ رہے گا اور ہندو ہندو نہ رہے گا، مذہبی اعتبار سے نہیں۔ کیوں کہ مذہب تو ایک انفرادی و ذاتی مسئلہ ہے، بلکہ سیاسی اعتبار سے یہ سب پاکستانی ہوں گے۔''

قاید اعظم اور پاکستان کی افسر شاہی:

قاید اعظم نے اپنی ۱۱/اگست کی اس تقریر میں ایسے ہی مدبرانہ، اعلیٰ اور بلند سیاسی افکار وجذبات کا اظہار کیا تھا، لیکن پاکستان کی افسر شاہی نے ان کی اس تقریر کو تقریباً سنسر کر دیا اور وہ پاکستان میں اب تک مشتہر نہیں ہو سکی۔ یہاں تک کہ قاید اعظم کی مطبوعہ تقاریر میں سے اسے حذف کر دیا۔

ہندستان کی آزادی:

اس عنوان کے تحت سر یامین نے ۱۵/اگست یوم جمعہ کا ذکر کیا ہے:

''آج ہندستان کو آزادی ملی۔'' پھر چودھری خلیق الزماں کا ذکر ہے کہ وہ سازش کے ذریعے مسلم لیگ اسمبلی پارٹی کے لیڈر مقرر ہو گئے اور انھوں نے اپنی وفاداری جتانے کے لیے کانگریس کا جھنڈا بلند کیا اور وفاداری کا حلف اٹھایا اور کہا کہ اب ہم ہندستانی ہیں اور آیندہ ہم کوئی فرقہ وارانہ سوال نہیں اٹھائیں

گے...''

سر یامین لکھتے ہیں کہ

''بہت سے مسلم لیگیوں کو جو پاکستان نہیں گئے، لیکن پاکستان بننے میں اپنی جان کی بازی لگا چکے ہیں، یہ بیان احمقانہ معلوم ہوا۔''

یہاں موصوف نے چودھری خلیق الزماں کو بڑی جلی کٹی سنائی ہیں۔ ۱۵/ اگست کو سر یامین بمبئی میں تھے۔ دوسرے دن وہاں وہ تاج محل ہوٹل کے شان دار جلسے میں مدعو کیے گئے اور ماؤنٹ بیٹن اور وزرا سب آئے۔

وہاں بڑی جوشیلی تقریریں انگریزوں کے خلاف ہوئیں اور ان کے جانے کی خوشی منائی گئی۔ ایک شخص نے تو یہ شعر پڑھا:

کس کا سر تم کاٹ کر لائے تھے شاہ ظفر کے سامنے

تمام شہر میں کل ۱۵/ تاریخ سے مزدوروں کے بھرے ہوئے ٹرک تمام سڑکوں پر چکر لگا رہے ہیں، جن میں ہندو اور مسلمان مزدور ہیں اور سب مل کر کہتے ہیں ہندو مسلم بھائی بھائی۔ اور گلے مل کر دکھاتے ہیں تمام کارخانوں کے مزدور آپس میں متفق ہیں۔

یہاں سر یامین نے سردار سلیمان مٹھا کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ وہ بڑے سوداگر ہیں اور بمبئی کے شیرف رہ چکے ہیں۔ اور ان کی برادری میمن کے علاوہ بھی ممبئی کے بہت غنڈے ان کے ہاتھ میں ہیں۔ ان کی کوٹھی آغا خان کی کوٹھی کے سامنے ہے۔

یہ وہی سلیمان مٹھا ہیں جنھوں نے غالباً ۱۹۱۵ء میں بمبئی میں منعقد ہونے والے مسلم لیگ کے اجلاس کو غنڈوں کے ہاتھوں تتر بتر کرایا تھا۔ اس وقت مسلم لیگ مسٹر جناح کی قیادت میں کانگریس کے قریب جا رہی تھی....

سر یامین اپنا سرکاری دورہ کرتے ہوئے یوپی آئے وہاں کے ایک شہر کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں: (یہ آگرہ کا ذکر ہے)

''سب لوگ عجیب الجھن میں مبتلا ہیں اور پریشان ہیں کہ آیندہ مسلمانوں کا یو۔پی میں کیا حشر ہوگا؟ ہر شخص اس پر معترض ہے کہ لیاقت علی خان اور چندری

گر پاکستان کیوں گئے اور ان کو اس طرف رہنا چاہیے تھا جب کہ ان لوگوں نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے تعلقات کشیدہ کرائے۔

اب مسلمانوں کو کس مپرسی کی حالت میں چھوڑ کر جانا اور اپنی جان بچانا اور عزت بڑھانا کس طرح ایک لیڈر کا فعل ہوسکتا ہے۔ اِدھر چودھری خلیق الزماں کا بیان وفاداری اور جھنڈا کشائی ہر ایک کی زبان پر ہے۔''

چودھری خلیق الزماں کے بیان نے ہندستان کے مسلمانوں میں پہلے ہی ہیجان پیدا کررکھا تھا کہ ایک اور مسلم لیگی لیڈر سید اشرف احمد بیرسٹر میرٹھ نے جو بہت جوشیلے اور جارحیت پسند قسم کے مسلم لیگی اور یوپی اسمبلی کے ممبر تھے۔ ایک بیان دے ڈالا ہے۔ جس میں بہ قول سر یامین انھوں نے کہا:

''اب ہم ہندستان کے باشندے ہیں اور اگر پاکستان والے ہندستان سے لڑے تو ہم پاکستان سے لڑیں گے۔''

بعد میں وہ بھی کراچی پہنچ گئے۔

اس سے بہت لوگ یہ سمجھنے لگے کہ مسلم لیگ اب ختم ہوجائے گی اور یہ لیڈر جو کل تک ہم کو جوش دلا کر ہندوؤں سے لڑاتے تھے۔ اب یہ دم دبا کر بھاگ نکلے اور کانگریس کی خوشامد میں لگ گئے۔ ہندوؤں کے دل میں چھوٹی چھوٹی بات بیٹھ جاتی ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ مسلمان دھوکا دیں گے۔

اس میں شک نہیں کہ ۱۵ر اگست کے بعد ہندستان کے مسلم لیگی لیڈروں کا رویہ تو کافی بدل گیا تھا، لیکن مسلمان نوجوان جو ۱۹۴۰ء سے پاکستان کے حق میں بڑے جارحانہ اور اشتعال انگیز قسم کے نعرے لگانے کے عادی ہوگئے تھے، وہ اب بھی اسی روش پر قایم تھے۔ سر یامین لکھتے ہیں:

دس بارہ نوجوان بے وقوف لڑکوں نے ۱۴ر اگست کو غازی آباد (یوپی) کے اسٹیشن پر گھیرا بنا کر ناچتے ہوئے ہندوؤں کو چڑانے کے لیے گا گا کر کہا تھا:

''ہنس کے لیا ہے پاکستان، لڑ کے لیں گے ہندستان۔''

یہ اُن (ہندوؤں) کے دل میں گھر کر گیا ہے اور لڑکوں کی باتوں کو کل مسلم قوم کی بات سمجھتے ہیں۔''

یہاں یہ یاد رہے کہ پاکستان ۱۴ راگست ہی کو قیام عمل میں آیا تھا۔

۱۵ راگست کے بعد سریامین کا لہجہ بدل جاتا ہے۔ مثلاً انھیں اودھ کے ایک ہندو تعلقہ دار ملتے ہیں۔ وہ ان کو وزیر اعلیٰ پنت سے ملنے کا کہتے ہیں، جو یوپی کی وزارت میں ایک مسلمان کو لینا چاہتا ہے۔ سریامین نے کہا کہ میرے لیے صوبائی وزارت کم تر ہے۔ میں اسے منظور نہیں کر سکتا۔

سریامین لکھتے ہیں کہ ستمبر ۱۹۴۷ء میں یوپی کی صوبائی مسلم لیگ کا اجلاس جس کے صدر نواب اسماعیل خاں تھے، لکھنؤ میں بلایا گیا۔ اس میں نہ تو خود صدر آئے اور نہ چودھری خلیق الزماں اور بعض دوسرے لیڈر جو لکھنؤ میں موجود تھے شریک ہوئے، اس کا ذکر سریامین یوں کرتے ہیں:

''شام کی چائے کے بعد دونوں (سید اعزاز رسول اور بیگم اعزاز رسول) کہنے لگے کہ وہ میٹنگ میں نہ جائیں گے۔ چوں کہ چودھری خلیق الزماں شرکت نہیں کریں گے ور ان سے بھی کہہ دیا ہے کہ وہ بھی نہ جائیں، میں نے کہا دنیا کیا کہے گی کہ لیگ کا زور تھا تو آپ لوگ ہندستان کے کسی کونے میں بھی مسلم لیگ کا جلسہ ہوتا تھا تو جاتے تھے۔ اب رنگ بدلا ہے تو آپ سید اعزاز رسول جو صوبائی لیگ کے سیکریٹری اور آپ قدسیہ بیگم اعزاز رسول، لکھنؤ تک میں جلسے میں شریک نہ ہوں۔ جب کہ میں اپنی جان پر کھیل کر یہاں آیا ہوں۔''

لیگ کا جلسہ اور خلیق الزماں کا رویہ:

سریامین یوپی کی اس مسلم لیگی قیادت کا، جو مسلم لیگ کے نئے دور کی اصل محرک تھی اور جس نے اکتوبر ۱۹۳۷ء میں بڑے زور شور سے اسی لکھنؤ میں لیگ کا اجلاس منعقد کرایا تھا اور اس میں باہر کے صوبوں کے ممتاز لیڈروں اور وزیر اعظموں کے علاوہ یوپی کے تمام مسلمان تعلقے دار اور زمین دار بڑے جوش و خروش سے جمع ہوئے تھے۔ رونا یوں روتے ہیں اس

اجلاس کے روح رواں یہی تعلقے دار تھے۔

نواب اسماعیل خان صدر یو پی لیگ جس کے نام سے جلسہ بلایا گیا، وہ موجود نہیں۔ راجہ محمود آباد جن کے مکان پر جلسہ کا نوٹس گیا، وہ عراق میں ہیں۔ سید اعزاز رسول جواب تک سیکریٹری تھے اور ان کی بیگم صاحب جو کانسٹی ٹیوٹ اسمبلی کی ممبر لیگ کے ٹکٹ پر ہیں اور چودھری خلیق الزماں جنھوں نے خفیہ طور پر اپنے آپ کو مسلم لیگ پارٹی کا کانسٹی ٹیوٹ اسمبلی میں لیڈر منتخب کرایا... سب میٹنگ سے غائب!... یہ گروہ ان لوگوں کا ہے جنھوں نے لیگ کو اپنی اغراض حاصل کرنے کے لیے آلۂ کار بنایا تھا اور اب مصیبت کے وقت منہ چھپا رہے ہیں اور کانگریس کو یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ وہ اب لیگ سے تعلق منقطع کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن اس کی وجہ سے کانگریس ان کو حقارت کی نظر سے دیکھے گی۔

مسلمانوں کو اُلو بنایا گیا تھا!

اس قیادت کو جلی کٹی سنانے کے بعد سر یامین کو یہاں اپنے طبقے مسلمان زمینداروں کا خیال آجاتا ہے کہ ''اب وہ اپنی ہندو رعایا کا کیسے مقابلہ کر پائیں گے۔ موصوف کا کہنا تھا کہ ۱۹۳۷ء سے پہلے یو پی میں انھیں کی حکومت تھی۔ لکھتے ہیں:

> ''میں حیران تھا کہ یا اللہ ان مسلمان لیڈروں کو کیا ہو گیا ہے۔ انھوں نے صوبے کے مسلمانوں کو اپنی پولی ٹیکل نمود حاصل کرنے کے لیے گیارہ سال سے اُلو بنایا۔ سبز سرخ باغ دکھائے۔ اب ان کو منجدھار میں چھوڑ کر علاحدہ ہو گئے۔ آیندہ نسلیں ان کو کیا کہیں گی اور موجودہ مظلوم ان کو کس نظر سے دیکھیں گے۔''
>
> یو پی کے ۸۴ لاکھ مسلمان جو لیگ کی آواز پر لبیک کہتے تھے، ان کا کیا حشر ہو گا؟ یہ سب ہندوؤں کے رحم و کرم پر چھوڑے جا رہے ہیں ان کی آواز گم کی جا رہی ہے۔ ان زمینداروں کا کیا ہو گا؟ جن کو حکومت کے اقتدار سے لیگ نے اتارا اور اور خود کچھ حاصل نہ کیا کانگریسی انھیں خوب مزا چکھائیں گے۔''

[ص ۶۳-۱۵۲]

(۵)

مسٹر جناح کے کھوٹے سکے

یہ راتوں رات مسلم لیگ کا اس طرح بھٹا کیوں بیٹھا؟

''قایداعظم کو یہ عام شکایت تھی اور اکثر وہ اس کا ذکر بھی کرتے تھے کہ میں کیا کروں میرے پاس تو کھوٹے سکے ہی ہیں میں انھیں میں گھرا ہوا ہوں!''

سر یامین نے یوپی کے مسلم لیگی لیڈروں کے بارے میں جو یہ لکھا ہے، دوسرے صوبوں کے اکثر لیگی لیڈروں پر بھی یہی بات صادق ہو سکتی ہے۔

چند لیگی رہنما اور پاکستان کا تصور:

ریاست حیدرآباد کے شاہد حسین رزاقی نے جو نواب بہادر یار خان سے بہت قریب رہے ہیں، مطبوعات نوائے وقت کے ہفت روزہ اخبار ''قندیل''۔ لاہور مورخہ ۳۱/ دسمبر ۱۹۵۵ء میں ''شیر بنگال'' فضل الحق کا ایک واقعہ لکھا ہے: موصوف وہ بزرگ ہیں جنھوں نے ۲۳/ مارچ ۱۹۴۰ء کو مسلم لیگ کے اجلاس لاہور میں وہ قرارداد پیش کی تھی۔ جسے بعد میں قرارداد پاکستان کا نام دیا گیا۔ شاہد حسین رزاقی لکھتے ہیں:

> ''موصوف تحریک پاکستان کے زبردست حامی رہے ہیں۔ ایک مرتبہ قایداعظم نے (نواب) بہادر خان (نظام نے ان کا نوابی کا خطاب واپس لے لیا تھا) کو بمبئی بلایا۔ اسی دوران وہاں یوم پاکستان منایا گیا، جس میں مسلم لیگ کے کئی رہنماؤں نے شرکت کی۔ شام کو جلسہ ہونے والا تھا۔ ناشتے کے بعد (نواب) بہادر خان، لیاقت علی خان اور چند دوسرے قایدین گفتگو میں مصروف تھے۔
>
> اتنے میں ایک ''متلون مزاج'' لیڈر جو اللہ کے فضل سے مسلم لیگ کے ممتاز رہنماؤں میں شمار کیے جاتے تھے، کمرہ میں داخل ہوئے۔ ایک صاحب غالباً راجہ صاحب محمود آباد نے دریافت کیا کہ جلسے میں آپ تقریر کریں گے یا نہیں؟ تو

انھوں نے کہا: کیسا جلسہ؟ (نواب) بہادر خان نے اس جواب پر اظہارِ حیرت کیا کہ اتنے زور شور سے یومِ پاکستان منایا جا رہا ہے اور ان حضرت کو اس کی خبر تک نہیں جس پر اُن لیڈر صاحب نے عجیب انداز میں کہا:

''پاکستان احمقوں کا خواب!''

(نواب) بہادر خان کو یہ جواب سخت ناگوار ہوا اور انھوں نے کہا کہ ''پاکستان کے متعلق قرارداد پاکستان کے محرک کی زبان سے یہ الفاظ کس قدر نامناسب اور عجیب معلوم ہوتے ہیں؟ لیڈر صاحب نے جواب دیا کہ قرارداد پیش کرنے کا مقصد یہ نہیں کہ میں اس کو حماقت نہ سمجھوں۔ کون بے وقوف ایسا ہے جو اس خواب کو حقیقت سمجھتا ہے، لیاقت علی خان نے (نواب) بہادر خان کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھا اور لیڈر صاحب باہر چلے گئے۔

اس کے بعد جلسے میں جب یہی لیڈر صاحب تقریر کرنے لگے تو پاکستان کے لیے خون کا آخری قطرہ تک بہانے پر تیار ہو گئے۔ جلسے کی صدارت قایداعظم فرما رہے تھے۔ (نواب) بہادر خان نے ان سے تقریر کی اجازت لی اور ان لیڈر صاحب کی خوب خبر لے ڈالی!

قایداعظم کو مخاطب کر کے بہادر خان نے کہا: ''قایداعظم! میں دیکھ رہا ہوں کہ آپ کی آستین میں کچھ سانپ پل رہے ہیں۔ مجھے اندیشہ ہے کہ آپ کے ہاتھوں کو مصروف پا کر یہ ڈس نہ لیں۔ وقت آ گیا ہے کہ آپ اپنی آستیں جھٹک دیں۔''

اب سندھ کے ایک لیڈر سر غلام حسین ہدایت اللہ کا سنیے:

ایس ایم ایس شرما نے جس کا پہلے ذکر آ چکا ہے، اپنی کتاب میں سر غلام حسین کے متعلق بھی اس قسم کا ایک واقعہ لکھا ہے۔ کہتا ہے کہ جب مارچ ۱۹۴۶ء میں کیبنٹ مشن آیا تو سر غلام حسین کو جو اس وقت سندھ کا وزیر اعظم تھا، مشن کو ایک میمورنڈم پیش کرنے کا کہا گیا۔ اس نے مجھے بلایا اور اس بارے میں گفتگو کرنے کے بعد کہا:

''دیکھنا شرما! اس پاکستان کو بننے نہیں دینا اور جناح کو زک ملنی چاہیے۔ براہ کرم میرے لیے یہ میمورنڈم تیار کر دو۔''

شرما لکھتا ہے کہ وہاں سے اٹھ کر میں پی این مہتا کے پاس گیا۔ وہ کراچی میں سندھیا جہاز راں کمپنی کے کرتا دھرتا تھے اور سردار پٹیل اور دوسرے کانگریسی لیڈروں سے ان کے قریبی روابط تھے۔ چناں چہ کراچی میں موصوف کو ان کا نمائندہ سمجھا جاتا تھا۔ میں نے ان کی مدد سے میمورنڈم تیار کیا اور مسٹر غلام حسین کے حوالے کیا۔

سر غلام حسین کا ایک اور واقعہ بھی اس نے بیان کیا ہے۔ ۳/ جون ۱۹۴۷ء کے بعد جب پاکستان کے قیام کا فیصلہ ہو گیا اور یہ طے پایا کہ کراچی نئی مملکت کا دارالحکومت ہوگا تو میں اتفاق سے سر غلام حسین کے ہاں گیا۔ میں نے دیکھا کہ وہ غصے سے لال پیلے ہو رہے ہیں اور ان کو اپنے اوپر قابو نہیں ہے۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ وہ سسکیاں لینے کو ہیں۔ مجھ سے کہنے لگے:

''میں نے از روئے مروّت کراچی کو پاکستان کا دارالحکومت بنانے کی پیش کش کی تھی۔ مسٹر جناح نے سچ مچ اسے دارالحکومت بنانے کا فیصلہ کر لیا ہے۔'' اس کے لیے سندھی مجھے معاف نہیں کریں گے۔

شرما نے محمد ایوب کھوڑو کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ آخر تک یہ کہتے اور مانتے رہے کہ ''پاکستان کا مطالبہ محض ہندوؤں سے کوئی قابل عزت سمجھوتا کرنے کے لیے دباؤ کے طور پر کیا گیا ہے۔ ہندستان کی تقسیم کرنا بہت بڑی غلطی ہوگی۔ آزادی کے بعد سندھ کے گورنر اور وزیر اعلیٰ یہی غلام حسین اور کھوڑو بنے۔

ایک لیگی کا اپنے لیڈر سے برتاؤ:

ستمبر ۱۹۴۷ء کے پہلے ہفتے سے دہلی میں مسلمانوں کا قتل عام اور ان کے مکانوں اور دکانوں کی لوٹ مار شروع ہوگئی... خود سر یامین اور ان کے کنبے کو جان بچانے کے لیے دوسری جگہ پناہ لینی پڑی اور جب وہاں بھی ہندو فرقہ پرستوں کے حملے کا خطرہ پیدا ہوا تو انھیں دوسرے گھروں سے نکالے گئے مسلمانوں کی طرح دہلی کے پرانے قلعے میں جانے

کے لیے کہا گیا۔ لکھتے ہیں:

''انھوں نے پرانے قلعہ جانے سے انکار کردیا۔ چناں چہ سرکاری بس کمشنر پاکستان کی کوٹھی سے باہر سڑک کی پٹری پر اسباب اتار کر چل دی۔ کافی انتظار کے بعد مغرب کے قریب انھیں کوٹھی کے اندر آنے دیا گیا کہ وہ رات یہاں گزار کر صبح ہی کہیں اور چلے جائیں۔''

خود ان کے الفاظ میں:

''میں بڑی مشکل سے اس کمرے میں پہنچا، جہاں زاہد حسین (پاکستان کے ہائی کمشنر) فرش پر قالین پر بیٹھے تھے۔ نہایت بے رخی سے ملے اور کھانے کی میز بچھوائی... میں اٹھ کر جب دروازے کے پاس پہنچا تو کہا کہ آپ بھی کھا لیجیے، میں نے شکریے کے ساتھ انکار کر دیا اور کہا کہ میرے ساتھ بیوی، بچے اور بھائی ہیں، میں ان کے بغیر نہیں کھا سکتا۔ کھانے کا کوئی سامان تو تھا نہیں...''

اسی سلسلے میں گاندھی جی کے کردار کا یوں ذکر کرتے ہیں:

''اب ۱۰ ستمبر کو مہاتما گاندھی بھی دہلی آ گئے اور کانگریسی وزرا کو خاص کر سردار پٹیل کو بہت شرمندہ کیا... اور کہا کہ وہ مرن برت فوراً شروع کرتے ہیں اگر یہ قتل و خون فوراً بند نہ ہوا۔ تم لوگوں نے مسٹر جناح کا قول سچ کر دکھایا۔''

ایک کانگریسی کا سر یامین خان کے ساتھ رویہ:

مصیبت کے دنوں میں سر یامین رفیع احمد قدوائی کے ہاں پہنچے۔ انھوں نے دیکھا تو اندر بلا لیا اور پہرہ داروں کو ہدایت کردی کہ جب بھی وہ آئیں اندر آنے دیں۔ قدوائی صاحب نے حالات سنے تو سر یامین لکھتے ہیں:

''...نہایت حوصلے سے کہا کہ آپ لوگ یہاں میرے یہاں آجایئے تو کھانے کی تکلیف نہ ہوگی۔ ایک کمرہ آپ کو دے دیا جائے گا۔ میں نے کہا کہ میں تو اپنے یہاں رہوں گا۔ وہ اپنے گھر منتقل ہو چکے تھے، لیکن میرے بھائی معہ اپنے بال بچوں کے آپ کے یہاں دن چھپے آجایا کریں گے اور صبح کو واپس ہو جائیں

گے۔'' (ان دنوں نئی دہلی بھی محفوظ نہیں تھا)

رفیع احمد قدوائی اور ان کی بیوی نے یہ ہرگز گوارا نہ کیا کہ رات کو کھانا کھا کر آئیں، بلکہ اپنے یہاں کھلایا اور صبح کو چائے دی!

سر یامین خاں قدوائی صاحب کے حسن اخلاق سے بہت متاثر ہوئے، لکھتے ہیں:

''میں نے دل میں کہا کہ اس شخص کا ذاتی اخلاق اس سے جو زاہد حسین کا تھا، کس قدر جدا ہے، قدوائی پولی ٹیکل خیالات میں ہمیشہ سے میرے خلاف ہیں، لیکن پرائیوٹ زندگی میں ان کا اخلاق کتنا اعلیٰ ہے۔ برخلاف اس کے زاہد حسین کس قدر روکھے اور طوطا چشم ہو گئے۔''

قدوائی صاحب کا ایک پرائیویٹ سیکریٹری ایک ہندو کایستھ نوجوان تھا۔ جو اُن کے ساتھ رہتا ہے اور کھاتا ہے اور مثل ان کے خاندانی فرد کے سمجھا جاتا ہے۔ اور ان کو نوکر چاکر ''جے نرائن میاں'' کہتے ہیں۔

... یہ بہت کام کا آدمی اور بہت بااخلاق ہے، مجھ سے کہا کہ ''جب مجھ کو'' کسی کو ہوائی اڈے پر بھیجنا ہو، اس کو حکم کر دوں!

ان دنوں دہلی کے مسلمانوں پر جو کچھ گزری اور سر یامین اور ان جیسے اور بڑے بڑے سربرآوردہ حضرات کو جن مصایب اہانتوں اور ذلتوں کا سامنا کرنا پڑا، سر یامین نے ان سب واقعات کو جو بڑے ہی لرزہ خیز اور دردناک ہیں، بیان کیا ہے۔ انھیں پڑھ کر انسان کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اس سلسلے کا صرف ایک واقعہ سر یامین کی زبان سے سنیے:

''پرانے قلعہ میں بہت لوگ بھیج دیے گئے تھے... اگلے دن (کچھ کپڑوں کے بنڈل اور کھانے کا سامان لے کر) موٹر میں اندر قلعے میں گیا۔ شروع میں دیکھا کہ کرنل رحمان جو بھوپال میں نواب صاحب کے معالج تھے اور اب دہلی میں آ گئے تھے اور مسٹر جناح کے معالج تھے، اور فیروز شاہ روڈ پر ایک بڑی کوٹھی لے کر اس میں دو ماہ ہوئے سارا نیا فرنیچر لگایا تھا، چار بانس گاڑ کر اس پر چادر باندھی ہے اور نیچے ایک پلنگ کی دری بچھائے اس پر بیٹھے ہیں۔ میں ان کے

پاس گیا تو انھوں نے بتایا کہ آٹھ دس ہندو اور سکھ گھر میں پستول لیے گھس آئے اور کہا کہ اسی وقت یونہی جیسے بیٹھے ہو نکل جاؤ۔ سب چیزیں چھوڑ دو صرف بیٹھنے کو یہ پلنگ کی دری اور ایک چادر لانے دی۔ جوتا بھی صرف یہ چپل پہنے تھا اور یہاں بھیج دیا گیا۔ مین نے کھانے کو دینا چاہا تو صرف ایک ڈبہ فورس کا لیا۔''

ان دنوں دہلی میں مولانا آزاد تک محفوظ نہ تھے۔ سر یامین لکھتے ہیں:

''گاندھی کے آنے سے تھوڑا سا امن ہوا ہے مگر تشدد ہر طرف جاری ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد کو میں نے دیکھا کہ چند بندوقچیوں کی حفاظت میں سیکریٹریٹ جارہے ہیں حال آں کہ بڑی ڈینگ ہانکتے تھے۔''

[تحریک پاکستان کا ایک باب، ص:۱۷۰-۱۵۶]

(۶)

مولانا ابوالکلام آزاد کا منصوبہ

مولانا ابوالکلام آزاد چاہتے تھے کہ پاکستان سے ہندوؤں اور سکھوں کا ہندستان میں آنا اور ہندستان سے اُدھر کو مسلمانوں کی ہجرت بند ہو۔ اس کے لیے انھوں نے قایداعظم کے پاس ایک ڈیپوٹیشن بھیجنے کا سوچا۔ یہاں پہلے نواب اسماعیل خان کا نام تجویز ہوا۔ سر یامین لکھتے ہیں:

''میں نے ان کا نام تجویز کیا تھا۔ نواب اسماعیل خان نے کہا کہ آپ کو معلوم ہے کہ میرے تعلقات جناح صاحب سے کافی کشیدہ ہیں۔ میں نے کہا یہ تو مجھ کو معلوم ہے، لیکن یہ تو قومی معاملہ ہے۔ انھوں نے معذرت کی اور کہا کہ ایسی صورت میں ان سے کسی کام کے واسطے کہنا میرے لیے ممکن نہیں۔''

اس سلسلے میں مولانا آزاد نے چودھری خلیق الزماں کو بھی لکھنؤ سے بلوا بھیجا تھا۔ سر یامین کو چودھری صاحب سے یہ شکایت رہی کہ ان کی سیاست سے یوپی کے مسلمان زمینداروں کے وقار کو بڑا دھکا لگا تھا۔ اب یہاں انھی کے حوالے سے چودھری صاحب کے کراچی مشن کا ذکر کیا جاتا ہے۔ وہ خلیق الزماں کے بدترین دشمن ہیں۔

دو دن بعد میں مولانا ابوالکلام آزاد کے یہاں گیا۔ میں نے کہا کہ خلیق الزماں کو کراچی کب بھیج رہے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ وہ کراچی جانے پر راضی ہیں، لیکن پہلے لکھنؤ جائیں گے۔ پھر اس کے بعد کراچی جائیں گے۔ چند باتیں جو وہ (چودھری صاحب) چاہتے ہیں، وہ مشکل ہیں مگر مجھ کو (یعنی مولانا کو) ان باتوں کے بتانے سے انکار کر دیا۔

جناح صاحب کے بارے میں خلیق الزماں کے خیالات:

اس کے بعد سر یامین رفیع احمد قدوائی کی کوٹھی گئے۔ وہاں ان کی خلیق الزماں سے ملاقات ہوئی۔ لکھتے ہیں:

زنان خانے کے وسیع برآمدے میں مونڈھے پر بیٹھے ملے۔ ایک گھنٹہ باتیں ہوئیں، جس میں قاید اعظم کی بابت وہ خراب الفاظ استعمال کیے، جن کو تحریر کرنا خلاف تہذیب ہے۔ لب لباب یہ تھا کہ ایک خود سر شخص ہم سب کو تباہ کر کے پاکستان ادھورا لے کر وہاں کا گورنر جنرل بن بیٹھا اور یہاں کشت و خون جاری کرا گیا۔ کیبنٹ مشن پلان بہت اچھی تھی۔ اس کو طرح طرح سے ٹھکرا دیا اور مسلمانوں کو کہیں کا نہ چھوڑا۔ یہاں مسلمانوں کا آیندہ حال بہت تاریک ہے اور مصیبتیں بھگتیں گے۔ ہم نے بہت زور دیا کہ کیبنٹ پلان منظور کر لو مگر اس کو ٹھکرا کر بٹا ہوا پنجاب اور بٹا ہوا بنگال لے کر کل قوم کو مصیبت کے گڑھے میں ڈال دیا۔ جس کا نتیجہ یہ فسادات اور کشت و خون ہے۔''

سر یامین لکھتے ہیں کہ میں نے ان کی مخالفت کی اور کہا کہ

''سارا قصور ان مسلمانوں کا ہے جو خود غرض اور قوم فروش ہیں اور کانگریس اور ہندو مہا سبھا کے آلہ کار بنتے ہیں۔''

خود ان کے الفاظ میں:

''چند روز قبل تک صوبہ سرحد میں کانگریس کے وفادار کتنے موجود تھے۔ اور یہاں آج بھی ہیں مسلمانوں میں قوم فروشوں کی کمی نہیں ہے۔''

غرض خلیق الزماں کراچی پہنچ گئے کہ بہ قول سر یامین کے، بجائے مسٹر جناح کو سمجھائیں۔ مالی فایدہ وہاں دیکھ کر وہیں رہ پڑے۔ حال آں کہ قاید اعظم کی مرضی کے بالکل خلاف تھا۔ قاید اعظم نے انھیں آڑے ہاتھوں لیا تھا۔

یامین خان کی جلی کٹی:

خلیق الزماں نے تو قاید اعظم کی بابت ''خلاف تہذیب'' باتیں کی ہیں، لیکن جب سر یامین کو پھر اپنے نام کے ساتھ ''سر'' کا خطاب لگانے کی ضرورت محسوس ہوئی تو قاید اعظم کو جلی کٹی سنانے میں انھیں مطلق باک نہیں ہوتا۔

نائٹ ہڈ کی واپسی ۔۔۔ صرف دکھاوا:

۸ر فروری ۱۹۴۸ء میں میرٹھ میں بہت سے شرنارتھی جمع ہو گئے گو ضلع مجسٹریٹ بڑا

مستعد تھا، لیکن پھر بھی حفاظتی تدابیر کرنا ضروری ہو گیا۔ لکھتے ہیں:

"میں صرف پانچ ہتھیاروں سے ... اسی وقت مستثنیٰ رہ سکتا ہوں جب اپنے آپ کو "سر" کہلوانا شروع کر دوں۔ چوں کہ نائٹ ہڈ گورنمنٹ کا عطیہ خطاب نہیں بلکہ یہ بادشاہ کا عطا کردہ اعزاز ایک رسم کے تحت دیا جاتا ہے اور اس کی واپسی صرف اسی طرح ہوتی ہے کہ بادشاہ کو واپس کیا جائے اور بادشاہ اس کو منظور کر کے گزٹ میں چھاپے اور اس فہرست سے نام کاٹ دیا جائے جو نائٹ ہڈ پانے والوں کی ہے۔ ایسا کرنے میں بادشاہ کی توہین ہوتی ہے اور ہر ممبر اسمبلی حلف اٹھا چکا تھا کہ وہ بادشاہ اور اس کے جانشینوں کا وفادار رہے گا اس لیے یہ خطاب کسی نے بادشاہ کے یہاں واپس نہیں کیا تھا۔ صرف آل انڈیا مسلم لیگ کے ریزولیوشن کی پاس داری میں اپنے آپ کو "سر" کے لقب سے کہلوانا بند کر دیا تھا..."

اس کے بعد موصوف نے اس ریزولیوشن کو غلط بتایا ہے اور لکھا ہے کہ "اس کے نتیجے میں مسلم لیگ کو منہ کی کھانی پڑی۔"

قاید اعظم اور بادشاہ کی ملازمت:

"... بہ ہر حال احتجاج اسی وقت ختم ہو گیا جس وقت مسلم لیگ گورنمنٹ میں داخل ہو گئی اور اس کے وزرا نے بادشاہ کی وفاداری کا حلف اٹھا لیا لیکن ۱۴ر اگست ۱۹۴۷ء کو مسٹر ایم اے جناح نے بادشاہ کی ملازمت بہ طور گورنر جنرل پاکستان اختیار کر کے بادشاہ کی وفاداری کا حلف اٹھا لیا اور اُس ریزولیوشن کو نظر انداز کر دیا، جو قاید اعظم صدر مسلم لیگ کی قیادت میں ۳۱ر جولائی ۱۹۴۶ء کو پاس ہوا تھا۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ اب مسلمان اس کے پابند نہیں..."

پھر بہ قول ان کے یہ کہ "وہ آل انڈیا مسلم لیگ ہی ختم ہو گئی، جس نے یہ ریزولیوشن پاس کیا تھا اور مسلم لیگ کے قاید اعظم نے بادشاہ کی ملازمت منظور کر کے حلف وفاداری اٹھا لیا۔ لہٰذا اس بادشاہ کا عطیہ اعزاز خطاب "سر" جس کو میں نے اپنے نام کے شروع میں حذف کر دیا تھا، دوبارہ جاری کرتا ہوں۔[1] [تحریک پاکستان کا ایک باب، ص ۱۷۸-۱۷۴]

(حاشیہ اگلے صفحے پر......)

(۱) **استدراک (ا۔س۔ش):**

سر یامین خان نے چودھری خلیق الزماں کے پاکستان آنے کے فیصلے کے بارے میں جو بات مولانا ابوالکلام آزاد سے منسوب کی ہے۔ چودھری صاحب نے اسے گاندھی جی کا ایما قرار دیا ہے اور مولانا آزاد کو بیچ سے بالکل نکال دیا ہے۔ انھوں نے اسی میں اپنی شان محسوس کی۔ قارئین کرام کچھ بھی رائے قایم کر سکتے ہیں۔ چودھری صاحب نے گاندھی جی سے ملاقات، گفتگو اور فیصلۂ سفر پاکستان کے لیے ایک ڈرامائی انداز اختیار کیا ہے۔ اس کا لطف تو "شاھراہ پاکستان" کے مطالعے ہی میں اٹھایا جا سکتا ہے، خلاصے میں اس کا لطف نہیں آ سکتا۔ مختصراً بیان کرنا میری مجبوری ہے۔ چودھری صاحب بیان کرتے ہیں کہ تقسیم کے بعد راج گوپال اچاری کے ذریعے گاندھی جی نے ان سے ملاقات کی خواہش کی، پھر وہ بنگال کے گورنر ہو کر چلے گئے، تو مسز نائڈو گورنر یوپی نے اپنے شوہر مسٹر نائڈو کو تار دیا کہ تم گاندھی جی کی خواہش سے چودھری صاحب کو مطلع کرو اس حکم کی تعمیل میں مسٹر نائڈو اپنی بیٹی مس پدمجا نائڈو کے ساتھ چودھری صاحب سے ملاقی ہوئے اور انھیں وہ تار پڑھ کر سنایا اور چودھری صاحب نے گاندھی جی سے ملاقات کا وعدہ کر لیا۔ پھر مس پدمجا نائڈو بنگال کی گورنر ہو کر چلی گئیں۔ ۲۹ ر ستمبر ۱۹۴۷ء کو چودھری صاحب اپنے بڑے اور چھوٹے بھائی کو ساتھ لے کر لکھنؤ کے ایروڈرم روانہ ہوئے جو انھیں کے گاؤں میں واقع تھا۔ پھر تھوڑی دیر میں ہوائی جہاز آیا اور وہ دلّی روانہ ہو گئے۔ دلّی میں رفیع قدوائی کے یہاں قیام کیا۔ دوسرے دن گاندھی جی سے ملاقات ہوئی۔ گاندھی جی سے ان کی یہ ملاقات نو برس بعد ہوئی تھی۔ گاندھی جی چودھری صاحب کو دیکھ کر کھڑے ہو گئے اور انھیں گلے سے لگا لیا۔ پھر وہ فرش پر بیٹھ گئے۔ پھر گاندھی جی نے تپائی سے ایک خط اٹھا کر چودھری صاحب کو دیا کہ اسے پڑھو! یہ خط ان کے بیٹے رام داس گاندھی نے باپ کو لکھا تھا اور مسلمانوں کی حمایت کا انھیں طعنہ دیا تھا۔ چودھری (خلیق الزماں) صاحب یہ خط پڑھ کر بہت متاثر ہوئے اور گاندھی جی سے سوال کیا کہ اب وہ اس کا کیا جواب دیں گے۔ گاندھی جی نے فرمایا:

"میں اس مسئلے میں اپنی جان کی بازی لگا دوں گا، مگر میں مسلمانوں کا ہندستان میں سڑکوں پر رینگنا کبھی گوارا نہ کروں گا۔ ان کو بہ اطمینان سڑکوں پر چلنا نصیب ہونا چاہیے۔"

اس دو صفحے کی ڈرامائی تفصیل کے بعد چودھری صاحب مطلب کی بات زبان پر لاتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

"میں نے کہا: گاندھی جی یہ بہت بڑا اولوالعزم ارادہ ہے۔ اس کے حصول میں میں آپ کی کیا معاونت کر سکتا ہوں؟ انھوں نے جواب دیا کہ اگر سندھ سے ہندوؤں کا اخراج روکا جا سکے تو میرا کام ہندستان میں آسان ہو جائے! میں نے کہا: گاندھی جی! جب سے مسٹر جناح اپنے ساتھیوں کے ساتھ پاکستان گئے ہیں، اس وقت سے آج تک میں نے ان سے کوئی خط و کتابت نہیں کی ہے اور نہ کوئی پیغام سلام بھیجے ہیں۔ مگر اس معاملے کے متعلق ان کی پالیسی وہاں جا کر ہی معلوم کرنی پڑے گی۔ انھوں نے (یعنی گاندھی جی نے) کہا: مسئلہ بہت اہم ہے اور جلد فیصلے کا محتاج ہے! میں نے اسی لیے تم کو بلایا ہے کہ تم جا کر پاکستان کی حکومت سے بات چیت کرو اور اگر ممکن ہو تو یہیں سے کراچی چلے جاؤ! میں نے اسے منظور کر لیا۔ (شاھراہ پاکستان: ص ۹۲-۱۰۹۰)

(۷)

مولانا ابوالکلام آزاد کا سیاسی مسلک، طرزِ فکر اور پاکستان

پروفیسر محمد سرور نے اپنی کتاب کے اس آخری باب کو جو ''اختتامیہ'' کے عنوان سے ہے، مولانا ابوالکلام آزاد کے مسلک سیاسی اور ان کے طرزِ فکر کے خصایص کے تعارف اور پاکستان کے لیے کی نیک خواہشات، حالات کی اصلاح، انتخاب کی روایت کی پابندی، جمہوریت کے قیام، ترقی اور استحکام، انتہا پسندی سے گریز، آمریت سے پیچھا چھڑا لینے کی فکر اور پاکستان کے تجربے کو کامیاب بنانے کا ہدف پا لینے کو لازم قرار دینے کے مقصد بحث کی ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد کے سیاسی افکار پر انھوں نے الہلال کے اجرا (۱۹۱۲ء) سے بحث کا آغاز کیا ہے اور ان کی وفات (۲۲ر فروری ۱۹۵۸ء) تک ان کے افکار اور ارتقا کے عمل اور خدمات قومی و ملّی کا جایزہ لیا ہے۔

یہ تمام تذکار زیر نظر تالیف کے موضوع سے نہایت مناسبت رکھتے ہیں۔ پروفیسر مرحوم کے قلم سے یہ باب بہت عبرت انگیز اور بصیرت افروز ہے، مطالعہ فرمایئے۔ وہ لکھتے ہیں:

مولانا آزاد کا الہلال کا دور ۱۹۱۲ء میں شروع ہوا۔ اس وقت مولانا ترکی کی عثمانی خلافت اور عالم اسلام کے اتحاد کے زبردست حامی تھے۔ گو وہ سر سید اور اس کے جانشینوں کی اس پالیسی کے سخت مخالف تھے کہ ''ہر حال میں حکومت برطانیہ کے وفادار رہو'' لیکن ان کی یہ سیاسی دعوت خالصاً اسلام و قرآن کے نام سے تھی اور وہ قرآن کے اس ارشاد: وَانتم الاعلون کے مطابق مسلمانوں کی قومی و ملّی برتری پر بہت زور دیتے تھے۔ مولانا کے معترضین کو شکایت ہے کہ ۱۹۲۰ء میں جب وہ کانگریس میں شریک ہوئے اور اپنے اس پرانے مسلک سے بتدریج دور ہٹتے گئے۔ یہاں تک کہ انھوں نے اس سرزمین میں ایک آزاد اسلامی مملکت پاکستان کے قیام کی سب سے بڑھ کر مخالفت کی اور اس طرح بہ قول ان

کے اسلام سے غداری کی!

عجیب بات یہ ہے کہ الھلال کا یہ مخصوص دور اس وقت صرف اسلامی ہند تک محدود نہ تھا۔ ۱۹۱۲ء سے کچھ پہلے سے لے کر دوسری جنگ عظیم کے خاتمے تک پوری دنیاے اسلام بالخصوص مصر اور ترکی میں اس قسم کی روچل رہی تھی۔ مسلمانوں کے اہلِ فکر اور سیاست دان یورپی اور خاص کر برطانوی سامراج کی یلغار کو جو اسلامی دنیا کے خلاف بڑے زوروں سے ہو رہی تھی، مسلمان عوام کے اسلامی اور بین الاسلامی جذبات کو بروے کار لا کر روکنے کا سوچتے تھے۔ اس زمانے میں مصر میں ''حزب الوطن'' اور ترکی میں ''حزب اتحاد و ترقی'' و ''نوجوان ترک'' اپنی اپنی ملکی و قومی سیاست کو اس طرح اسلامی اور بین الاسلامی رنگ میں پیش کر رہی تھیں اور ان کے ہاں قوم، وطن، اسلام اور اتحاد اسلام سب ایک ہی غیر منقسم وحدت بن گئے تھے۔ مصر کی ''حزب الوطن'' کے ایک مشہور لیڈر نے کہا تھا کہ دنیا کے کسی حصے کا مسلمان جب سرزمین مصر میں قدم رکھتا ہے تو وہ مصری بن جاتا ہے۔

الھلال کا یہ دور جہاں تک کہ دنیاے اسلام کا تعلق ہے، بہت حد تک پہلی جنگ عظیم میں ختم ہو جاتا ہے۔ اس جنگ میں ہندستان اور برطانیہ کی دوسری مقبوضات کے مسلمان اس کی فوجوں میں بھرتی ہو کر عثمانی خلافت کے خلاف لڑے۔ عراق، جزیرۂ عرب اور شام کے عربوں نے بہ حیثیت ایک قوم کے اپنے ترک حکمرانوں کے خلاف بغاوت کی اور برطانوی فوجوں کے ساتھ مل کر ان سے باقاعدہ جنگ کی۔ چناں چہ ۱۹۱۸ء میں جیسے ہی جنگ ختم ہوئی، ترکی میں مصطفیٰ کمال، مصر میں سعد زغلول، ایران میں رضا خاں پہلوی اور تیونس، الجزائر اور مراکش وغیرہ میں وہاں کے رہنماؤں کی قیادت میں قومی سطح پر اپنے اپنے ملک کو اجنبی تسلط سے آزاد کرانے کے لیے جدو جہد شروع ہوگئی۔ انھی دنوں ہندستان سے مولانا محمد علی کی زیر قیادت ایک خلافت وفد یورپ، برطانیہ بھیجا گیا۔ مولانا محمد علی نے لکھا ہے کہ

> ''ہم جب وہاں اپنے بعض ترک دوستوں سے ملے تو انھوں نے کہا کہ اگر آپ واقعی ترکوں کی مدد کرنا چاہتے ہیں تو واپس جائیے اور سب سے پہلے اپنے اہلِ

وطن کے ساتھ مل کر انگریزوں کو اپنے ملک سے نکالیے۔ یہ ہماری حقیقی مدد ہوگی۔''

۱۹۲۰ء میں مولانا محمد علی، مولانا آزاد اور مسلمانوں کے دوسرے بے شمار سیاسی رہنما و کارکن کانگریس میں گئے اور شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ کے ارشاد پر جو مالٹا میں برطانیہ کی قید سے رہا ہو کر ہندستان پہنچے تھے، علماے دیوبند بھی اس میں شریک ہو گئے۔ مولانا حسین احمد مدنی اپنی خود نوشت سوانح نقش حیات میں لکھتے ہیں:

''حضرت شیخ الہندؒ ہندستان آئے تو ان کے جذبۂ حریت اور انگریز دشمنی میں کوئی کمزوری یا کمی نہ تھی، بلکہ ہندستانی مارشل لا، رولٹ ایکٹ کے نفاذ، جلیاں والہ باغ وغیرہ کے واقعات اور ترکی مملکت کی تقسیم اور ''معاہدۂ سیورے'' اور ترکوں کے ساتھ انتہائی بے انصافیوں نے اس آگ کو اور بھی بھڑکا دیا تھا... دوسرے لیڈروں سے خلوت وجلوت میں باتیں ہوئی تو آپ نے بھی عدم تشدد کا پروگرام ہندستان کو آزاد کرانے کے لیے ضروری قرار دیا اور پھر اسی طریقے پر تمام خلافت کمیٹی اور کانگریس کی تجویز کردہ باتوں کی موافقت کی۔''

اس کے بعد جیسے جیسے دن گزرتے گئے، براعظم ایشیا و افریقہ میں یورپی سامراج کے خلاف قومی بنیادوں پر آزادی کی تحریکیں اٹھتی گئیں اور خاص کر اسلامی دنیا میں تو ان کے ساتھ ساتھ بعض ملکوں، آزاد اور کہیں نیم آزاد قومی حکومتیں بھی بن گئیں۔ ۱۹۲۴ء میں مصطفیٰ کمال نے عثمانی خلافت ختم کر دی۔ ۱۹۲۶ء میں مولانا محمد علی اور ان کے رفقا نے شاہ ابن سعود کو جو نیا نیا حجاز پر قابض ہوا تھا، حجاز میں ایک بین الاسلامی طرز کی حکومت کے قیام پر راضی کرنے کی سرتوڑ کوشش کی، جس میں وہ بری طرح ناکام ہوئے۔ ایران میں ایک آزاد قومی حکومت بن گئی اور اس طرح عراق اور مصر میں بھی نیم آزاد سی قومی حکومتیں وجود میں آئیں۔ یہ دور قومی جدوجہد آزادی کا تھا۔

مولانا آزاد کی ان سب حالات و واقعات پر نظر تھی اور وہ دیکھ رہے تھے کہ دنیا کی محکوم اور نو آزاد قوموں کا قافلہ کس سمت بڑھ رہا ہے۔ انھیں یقین ہو گیا تھا کہ ایشیا اور افریقہ میں

قومی اور کسی مخصوص مذہب سے ناوابستہ یعنی سیکولر سیاست کا دور آرہا ہے، جس میں ہر ملک کے سب لوگوں کو مذہبی و نسلی تنگنائیوں سے بلند ہوکر قومی سطح پر آزادی کے لیے لڑنا ہوگا۔ ۲۲ر مارچ ۱۹۴۲ء کو لاہور میں جمعیت علمائے ہند کے ایک جلسے میں تقریر کرتے ہوئے انھوں نے کہا:

"میرے سینے میں ایک انگیٹھی دہک رہی ہے۔ میں وہی حرارت آپ کے اندر پیدا کرنا چاہتا ہوں میرا ایمان اور میرا اسلام مجھے پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ ان حالات میں میرے لیے صرف ایک فرض رہ گیا ہے اور وہ یہ کہ انگریزوں کی حکومت کے خلاف جو چولھا دہک رہا ہے، اس میں لکڑیاں ڈال دوں، میں کوئی ایسا سوال نہیں اٹھانا چاہتا جس سے تیسری طاقت کے ہاتھ مضبوط ہوں۔"

اس سے کافی عرصہ پہلے مولانا نے اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے:

"افسوس! تم میں کوئی نہیں جو میری زبان سمجھتا ہو۔ تم میں کوئی نہیں جو میرا اشناسا ہو۔ میں سچ سچ کہتا ہوں کہ میں تمھارے اس پورے ملک میں ایک بے یار و آشنا غریب الوطن ہوں۔" نیز

"تم بارش کے وجود سے انکار تو نہیں کرتے، مگر منتظر رہتے ہو کہ پانی برسنے لگ جائے تو اقرار کریں، لیکن میں ہواؤں میں پانی کی بو سونگھ لینے کا عادی ہوں اور صرف بادلوں ہی کو دیکھ لینا میرے علم کے لیے کافی ہوتا ہے۔"

غرض ۱۹۲۰ء کے بعد کے تغیرات سے مولانا آہستہ آہستہ اس نتیجے پر پہنچ گئے کہ مذہبی بنیاد پر سیاست کرنے کا یہ زمانہ نہیں۔ اب سیاست قومی اور سیکولر بنیادوں پر ہونی چاہیے اور یہ کہ اس زمانے میں مذہب کا نام لے کر مذہبی جذبات سے اپیل کر کے اور انھیں بھڑکا کر ایک نئی مملکت کے قیام کی تحریک چلانا وقت کے خلاف جانا ہے اور اس کے نتائج کبھی اچھے نہیں نکل سکتے۔ اس طرح وہ نام نہاد اسلامی حکومت کے بھی حق میں نہ تھے۔ مولانا کو اس بات پر اتنا یقین تھا کہ وہ ان کا ایمان اور عقیدہ بن گئی تھی۔ چناں چہ مملکتِ پاکستان کے وجود میں آنے کے بعد بھی وہ نظری طور پر اپنے اس یقین پر برابر جمے رہے اور جو بھی

پاکستان سے ان سے ملنے جاتا، وہ اس سے اپنی رائے کا بلا تکلف اظہار کرتے۔ اس بارے میں نظریاتی طور پر انھوں نے کبھی مصالحت نہیں کی۔

لیکن پاکستان بہر حال قایم ہو چکا تھا اور عوام کے ووٹوں سے قایم ہوا تھا۔ پھر کانگریس نے، جس کے وہ ممتاز لیڈر تھے، اس کے قیام کی منظوری دی تھی۔ ظاہر ہے اس صورت میں مولانا کے لیے اسے ماننے کے سوا کوئی چارہ نہ رہا تھا۔ چناں چہ انھوں نے فقہ کے مشہور اصول کے مطابق کہ اجماع خواہ غلط ہو، اسے ماننا ضروری ہوتا ہے، پاکستان کو عملاً مانا اور جہاں تک ممکن تھا اہل پاکستان میں سے جو بھی ان سے ملتا وہ اُسے اس کے بارے میں اچھے مشورے دیتے رہے۔

برعظیم کی آزادی کے وقت شمالی ہند کے مسلمانوں، ہندوؤں اور سکھوں پر جو قیامت ٹوٹی اور خاص کر دہلی کے مسلمان جس قتل و غارت کا نشانہ بنے، اس کا تذکرہ کیا جا چکا ہے۔ دہلی کے حالات قدرے معمول پر آئے تو مولانا ابوالکلام آزاد جامع مسجد تشریف لے گئے اور مسلمانوں سے خطاب کیا۔ مولانا نے فرمایا:

> ''میں نے ہمیشہ سیاسیات کو ذاتیات سے الگ رکھنے کی کوشش کی ہے اور کبھی اس پُر خار وادی میں قدم نہیں رکھا۔ یہی وجہ ہے کہ میری بہت سی باتیں کنایوں کا پہلو لیے ہوتی ہیں، لیکن آج مجھے جو کہنا ہے، میں اسے بے روک ہو کر کہنا چاہتا ہوں۔ متحدہ ہندستان کا بٹوارا بنیادی طور پر غلط تھا۔ مذہبی اختلافات کو جس ڈھب سے ہوا دی گئی۔ اس کا لازمی نتیجہ یہی آثار و مظاہر تھے، جو ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھے اور بد قسمتی سے بعض مقامات پر ابھی تک دیکھ رہے ہیں۔ پچھلے سات برس کی روداد دہرانے سے کوئی خاص فایدہ نہیں اور نہ اس سے کوئی اچھا نتیجہ نکل سکتا ہے۔ البتہ ہندستان کے مسلمانوں پر مصیبتوں کا جو ریلا آیا ہے، وہ یقیناً مسلم لیگ کی غلط قیادت کی فاش غلطیوں کا بدیہی نتیجہ ہے۔''

راقم الحروف ۱۱/ اگست ۱۹۴۷ء تک دہلی میں تھا۔ کبھی کبھار لاہور بھی آنا ہوتا تھا۔ دونوں جگہ سیاسی دانش وروں اور اہل قلم سے ملاقاتیں ہوتیں۔ ان میں سے اکثر کہتے کہ کس

خیال خام میں ہو، انگریز نہیں جائے گا۔ وہ ایسی چال چلے گا کہ کانگریس کو بالکل مات ہو جائے گی۔ بڑے اونچے حلقوں میں یہ مثال دی جاتی تھی کہ ہندستان کی سیاست کی مثال ایک مثلث کی ہے۔ جس کے تین ضلع ہیں۔ ان میں سے دو مل کر تیسرے کو ہمیشہ شکست دے سکتے ہیں، بے شک بات یہ صحیح تھی، لیکن اندرون و بیرونِ ہند کے حالات انگریز کو نکلنے پر مجبور کر رہے تھے۔ چناں چہ آخراُسے نکلنا پڑا۔ مولانا آزاد اس طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:

"انگریز کی بساط تمھاری خواہش کے برخلاف الٹ دی گئی اور راہ نمائی کے وہ بت جو تم نے وضع کیے تھے، وہ بھی دغا دے گئے۔ حال آں کہ تم نے یہی سمجھا تھا کہ یہ بساط ہمیشہ کے لیے بچھائی گئی ہے اور انھی بتوں کی پوجا میں تمھاری زندگی ہے۔ تمھارے گروہ نے جو سات کروڑ انسانوں کا ایک غول تھا، ملک کی آزادی کے بارے میں وہ رویہ اختیار کیا جو صفحہ ہستی سے محو ہو جانے والی قوموں کا شیوہ ہوتا ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ وقت نے تمھاری خواہشوں کے مطابق انگڑائی نہیں لی۔ بلکہ اس نے ایک قوم [۱] کے پیدائشی حق کے احترام میں کروٹ بدلی ہے اور یہی وہ انقلاب ہے جس کی ایک کروٹ نے تمھیں بہت حد تک خوف زدہ کر دیا ہے۔"

مولانا نے تقریر کے شروع میں بڑے دکھ اور درد کے ساتھ مسلمانوں سے یوں شکوہ کیا:

"مجھے بے اختیار پچھلے چند سالوں کی بھولی بسری کہانیاں یاد آ جاتی ہیں۔ تمھیں یاد ہے میں نے تمھیں پکارا اور تم نے میری زبان کاٹ لی۔ میں نے قلم اٹھایا اور تم نے میرے ہاتھ قلم کر لیے۔ میں نے چلنا چاہا تم نے میرے پاؤں کاٹ دیے۔ میں نے کروٹ لینی چاہی اور تم نے میری کمر توڑ دی۔ حتیٰ کہ پچھلے سات سال کی تلخ نوا سیاست جو تمھیں داغ جدائی دے گئی ہے، اس کے عہد شباب میں بھی میں نے تمھیں خطرے کی ہر شاہراہ پر جھنجوڑا لیکن تم نے میری صدا سے نہ

(۱) یعنی ہندستان میں بسنے والی قوم جس میں اکثریت ہندوؤں کی تھی۔

صرف اعراض کیا بلکہ غفلت وانکار کی ساری سنتیں تازہ کر دیں۔ سچ پوچھو تو اب میں ایک دور افتادہ صدا ہوں، جس نے وطن میں رہ کر بھی غریب الوطنی کی زندگی گزاری ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ مقام جو میں نے پہلے دن اپنے لیے چن لیا تھا، وہاں میرے بال و پر کاٹ دیے گئے ہیں یا میرے آشیانے کے لیے جگہ نہیں رہی، بلکہ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ میرے دامن کو تمھاری دست درازیوں سے گلہ ہے، میرا احساس زخمی ہے اور میرے دل کو صدمہ ہے۔ سوچو تو سہی تم نے کون سی راہ اختیار کی۔ کہاں پہنچے اور اب کہاں کھڑے ہو!''

مولانا کو کانگریس کا ''شو بوائے'' کہا گیا۔ انھیں ان کے ہم مذہبوں نے اسلام اور مسلمانوں کا دشمن بتایا اور کہا کہ وہ کانگریس کے زرخرید ہیں اور اس کے اشارے پر چلتے ہیں لیکن عین اس وقت جب ہندستانی مسلمان خوف و ہراس میں راہ فرار اختیار کر رہے تھے اور اپنی تمام وسعتوں کے باوجود زمین ان پر تنگ ہو گئی تھی، مولانا نے اپنی اس تقریر میں انھیں یوں مخاطب کیا:

''تیسری طاقت اپنے گھمنڈ کا پشتارہ اٹھا کر رخصت ہو چکی ہے۔ جو ہونا تھا وہ ہو کر رہا ہے۔ سیاسی ذہنیت اپنا پچھلا سانچا توڑ چکی اور اب نیا سانچا ڈھل رہا ہے۔ میں تمھیں یہ نہیں کہتا کہ تم حاکمانہ اقتدار کے مدرسے سے وفاداری کا سرٹیفکیٹ حاصل کرو اور کاسہ لیسی کی وہی زندگی اختیار کرو، جو غیر ملکی حاکموں کے عہد میں تمھارا شعار رہا ہے۔ میں کہتا ہوں جو اُجلے نقش و نگار تمھیں اس ہندستان میں ماضی کی یادگار کے طور پر نظر آرہے ہیں، وہ تمھارا ہی قافلہ لایا تھا۔ انھیں بھلاؤ نہیں۔ انھیں چھوڑو نہیں۔ ان کے وارث بن کر رہو اور سمجھ لو کہ اگر تم بھاگنے کے لیے تیار نہیں تو پھر تمھیں کوئی طاقت بھگا نہیں سکتی۔

آؤ! عہد کرو کہ یہ ملک ہمارا ہے اور ہم اس کے لیے ہیں۔ اس کی تقدیر کے بنیادی فیصلے ہماری آواز کے بغیر ادھورے ہی رہیں گے۔''

اور آخر میں مولانا نے فرمایا:

''عزیزو! میرے پاس تمھارے لیے کوئی نیا نسخہ نہیں ہے۔ چودہ سو برس پہلے کا پرانا نسخہ ہے، وہ نسخہ جس کو کائنات انسانی کا سب سے بڑا محسن لایا تھا اور وہ نسخہ ہے قرآن کا یہ اعلان: لا تھنوا ولا تحزنوا وانتم الاعلون ان کنتم مؤمنین۔''(۱)

اس کے بعد ۲۷/دسمبر ۱۹۴۷ء کو مولانا آزاد نے لکھنؤ میں مسلمانوں کی ایک کل ہند کانفرنس سے خطاب کیا اور کہا کہ

''اس ملک میں ایک بڑی تعداد ان عزیزوں کی ہوگی، جو مجھ سے اختلاف رکھتے تھے، لیکن حالات کی تبدیلی نے ان کی رائے کا رخ بھی موڑ دیا ہے۔ پچھلے دس برس کے واقعات کی نوعیت ایسی ہے کہ ان میں بہت سے لوگوں کے لیے ملامت کا رنگ و روغن بھی ہے لیکن میں آج کسی مسلمان کی ملامت کے لیے نہیں آیا، ملامت کس کو کریں؟ اپنے بھائیوں کو، اپنے عزیزوں کو، آخر کس دیوار سے سر ٹکرائیں اور کیوں؟''

پاکستان بن گیا تو اس کے بارے میں بھی مولانا کا یہی رویہ رہا۔ وہ اس ملک اور اس میں بسنے والے مسلمانوں کا ہمیشہ بھلا چاہتے رہے آخر کو وہ ان کے بھائی اور عزیز ہی تو تھے۔ ان کا برا کیسے چاہتے اور اس سلسلے میں کس کو ملامت کرتے۔ بے شک تقسیم ہند کا انھیں دکھ تھا اور سخت دکھ۔

غالبًا اوایل ۱۹۵۸ء کا ذکر ہے، موجودہ صدر پاکستان چودھری فضل الٰہی جو اس وقت مغربی پاکستان اسمبلی کے اسپیکر تھے، کسی کانفرنس میں دہلی گئے۔ واپسی پر بڑی گرم جوشی و شوق سے راقم الحروف سے انھوں نے مولانا سے اپنی ملاقات کا یہ واقعہ سنایا۔ چودھری صاحب نے بتایا:

''میں نے مولانا سے ملاقات کا وقت لیا۔ ان کی علمی عظمت اور بلند شخصیت کا دل

(۱) ترجمہ: اور (دیکھو!) نہ تو ہمت ہارو، نہ غمگین ہو، تم ہی سب سے سر بلند ہو، بہ شرطے کہ تم سچے مومن ہو۔ (۱۳۹:۳)

پر رعب تھا۔ اسی شش و پنج میں کہ بات کیسے شروع کروں گا۔ بیٹھا تھا کہ مولانا اوپر سے اُترے اور بیٹھتے ہی خود ہی بات شروع کر دی۔ فرمانے لگے کہ بھائی میں تو ملک کی تقسیم کے خلاف تھا۔ بہر حال اب جو پاکستان بن گیا ہے، اسے ٹھیک کیجیے اور اچھی طرح چلائیے۔''

پھر کہنے لگے کہ

''تقسیم کے بعد سہروردی یہاں رہنا چاہتے تھے۔ میں نے انھیں مشورہ دیا کہ ہندستان میں آپ کچھ نہیں کر پائیں گے۔ آپ کے بارے میں یہاں بڑی غلط فہمیاں ہیں۔ پاکستان جائیے، وہاں کچھ کیجیے۔ وہ گئے لیکن افسوس ہے وہ کچھ نہ کر سکے۔''

پھر فرمایا:

''آپ نے مرزا سکندر کو صدر مملکت بنا کر اچھا نہیں کیا۔ سرکاری افسروں کا مملکت کے اعلیٰ پبلک مناصب پر فائز ہونا آج کی دنیا میں اچھا نہیں سمجھا جاتا۔''

پھر کہنے لگے کہ

''حالات کو سدھارنے کا صرف ایک ہی طریقہ ہے۔ ملک میں انتخابات کرائیے، بار بار کرائیے، اس سے عوام میں سیاسی شعور پیدا ہوگا اور ان کے اندر اچھے برے کی تمیز پیدا ہوگی۔''

ان دنوں پاکستان میں بڑی اتھل پتھل ہو رہی تھی۔ آئے دن وزارتیں بدلتی تھیں اور چودھری صاحب اس سے بڑے بددل تھے۔ راقم الحروف کو بتانے لگے کہ اصلاح احوال کے متعلق میری مایوسی دیکھ کر مولانا نے فرمایا:

''نہیں نہیں انتخابات کرائیے، حالات ٹھیک ہو جائیں گے۔ مایوس ہونے کی ضرورت نہیں۔ انتخابات ہی اس کا علاج ہیں۔''

اس واقعے سے چند سال پہلے مولانا غلام رسول مہر دہلی گئے۔ وہ اپنی کتاب ''سید احمد شہید'' کے مواد کی تلاش میں وسط ہند کی ریاست ٹونک جانا چاہتے تھے۔ مہر

صاحب مولانا آزاد کے ہاں ٹھہرے۔ مولانا نے ان سے کہا:

''جہاں تک مطلوبہ مواد کا تعلق ہے، وہ میں یہاں دہلی میں منگوا رکھوں گا۔ فی الحال آپ واپس پاکستان جائیں اور وہاں کے اربابِ اقتدار سے ملیں اور میری طرف سے یہ پیغام دیں کہ میری ساری عمر کلکتہ میں گزری ہے، میں جانتا ہوں کہ بنگال والے اپنی بنگالی زبان کے معاملے میں کس قدر حساس ہیں۔ آپ مشرقی بنگال میں اردو کو قومی زبان بناتے بناتے کہیں اس حصہ ملک سے ہاتھ نہ دھو بیٹھیں۔''

وہ یہ دن تھے، جب اردو اور صرف اردو کو پاکستان کی واحد قومی زبان بنانے کا سروں پر جنون سوار تھا۔ چناں چہ اس کے بعد زبان کے مسئلے پر وہاں طلبہ پر گولی چلی اور اس جدوجہد کی ابتدا ہوئی۔ جس کا انجام آج بنگلہ دیش ہے۔

مہر صاحب واپس لاہور آئے۔ یہاں سردار عبدالرب نشتر سے جو پنجاب کے گورنر تھے، ملے اور مولانا آزاد کا انھیں پیغام پہنچایا لیکن اس کا کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ گو سردار نشتر نے مولانا کی بات بڑی توجہ سے سنی۔ (۱)

بہر حال یہ معلومات تو صرف راقم الحروف کی ہیں۔ یہاں کے اور اصحاب بھی مولانا سے ملتے رہے اور مولانا ہمیشہ ان کو اس قسم کے مفید مشورے دیتے رہے۔ بالکل شروع میں

---

(۱) مولانا غلام رسول مہر مرحوم نے یہ داستان خاکسار کو بھی سنائی تھی، جس میں نشتر صاحب نے فرمایا تھا: ''مہر! تم جانتے ہو مجھے گورنر کیوں بنایا گیا؟ پھر خود ہی اس کا جواب دیا کہ صرف اس لیے کہ میں عوام سے دور رہوں۔ وہ یہ پسند نہیں کرتے کہ میں عوام سے گھلوں ملوں! یہ کسی مخلص اور ہمدرد کی بات پر غور کرنے والے نہیں۔ انھیں اپنے مفاد سے زیادہ کوئی بات عزیز نہیں!''

مولانا مہر نے فرمایا کہ ان کے اور گورنر کے درمیان ایک لمبی چوڑی میز حایل تھی۔ اس پر آمنے سامنے بیٹھ کر سنجیدگی کے ساتھ، آہستہ آواز میں کوئی بات چیت نہیں کر سکتے تھے۔ نشتر صاحب نے فرمایا:

''انھیں تو یہ بھی گوارا نہیں کہ ہم ایک چھوٹی سی میز پر قریب قریب بیٹھ کر چائے پیتے ہوئے، صلاح و مشورے کی کوئی بات کریں۔'' (ا۔س۔ش)

نواب زادہ خورشید علی خان سے مولانا نے یہی باتیں کی تھیں۔

اب آخر میں ایک تحریری شہادت بھی سن لیجیے:

ایس ایم اکرام، سی ایس پی سیکریٹری اطلاعات حکومت پاکستان نے اپنی کتاب Modern Muslim India and the Birth of Pakistan میں مولانا ابوالکلام آزاد کے بارے میں لکھا ہے:

پاکستان اور اس کے لیڈروں کے متعلق مولانا کا رویہ پُر وقار اور ایک مدبر سیاست دان کا تھا۔ (مولانا) عبدالماجد دریابادی جو کسی اعتبار سے بھی مولانا آزاد کے دوست اور مداح نہیں تھے۔ ۱۹۴۸ء میں ان سے اپنی ایک نجی ملاقات کا جس میں دوسروں کے علاوہ خان عبدالغفار خان کے ایک صاحب زادے بھی موجود تھے ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''۱۹۴۸ء تھا کہ آل انڈیا ریڈیو مشاورتی کمیٹی کے ممبر کی حیثیت سے دہلی جانا ہوا۔ مولانا (آزاد) اسی تپاک اور گرم جوشی سے ملے کہ جیسے پہلے کسی زمانے میں ملتے تھے۔ وزارت ہند کی اونچی کرسی کوئی فرق اس میں پیدا نہ کرسکی۔ دوپہر کے لنچ پر بلایا اور اسی روز پشاور کے خان عبدالغنی (فرزند خان عبدالغفار) بھی مدعو تھے۔ ملاقاتوں اور گفتگوؤں میں وہی زور وشور، وہی طلاقت لسانی، وہی جامعیت، ہمہ گیری، سننے والا حیران و ششدر، خوش خلقی، انسانی ہمدردی، مرنجاں مرنجی میں پہلے سے کہیں آگے بڑھے ہوئے، تعلّیٰ و ترفع کے بجائے پیکر تواضع بنے ہوئے۔ شرافت نفس اور عالی ظرفی کا یہ عالم کہ اپنے مخالفین خصوصاً مسلم لیگ کے لیے گلہ شکوہ کا شایبہ بھی زبان پر نہیں۔ سب کا ذکر یکساں خوش دلی ہے۔ بلکہ پاکستان کے حق میں بجائے شکایت وشماتت، طنز وتعریض کے الٹا کلمۂ خیر! اور کچھ اس قسم کے الفاظ کہ اب جب کہ وہ بن چکا ہے، ہم سب کی فلاح و بہبود اسی میں ہے کہ وہ طاقت ور بنے۔ سیاسی لیڈروں میں اس ظرف کی مثال نادر ہی ملے گی۔'' (یہ اقتباس براہِ راست صدقِ جدید لکھنؤ ۱۴/ مارچ ۱۹۵۸ء سے ہے۔ مصنف کی انگریزی کتاب سے ترجمہ نہیں کیا گیا)۔

یہاں ایک اور اقتباس مولانا ابوالکلام آزاد کی خود اپنی کتاب سے دیا جاتا ہے۔ جو ان کی وفات کے کچھ عرصے بعد شایع ہوئی تھی۔ [۱] اس کتاب میں جہاں مولانا نے سرزمین ہند میں ایک علاحدہ مسلم مملکت کے تصور پر سخت تنقید کی اور مسلم لیگی قیادت کی غلطیاں گنائیں، وہاں اس معاملے میں کانگریسی قیادت نے پے در پے جو ٹھوکریں کھائیں ان کا بھی مفصل ذکر کیا ہے اور تقسیم ملک کا ذمہ دار مسلم لیگ کے ساتھ ساتھ کانگریس کو بھی مساوی طور پر قرار دیا ہے۔ یہ سب کچھ لکھنے کے بعد مولانا اپنی اس کتاب کا اختتام ان الفاظ پر کرتے ہیں۔ لکھتے ہیں:

> ''مسٹر جناح اور ان کے ساتھی یہ سمجھنے سے قاصر رہے کہ جغرافیائی صورت حال ان کے لیے ناموافق ہے۔ مسلمان سارے برصغیر میں کچھ اس طرح بکھرے ہوئے تھے کہ ایک سمٹے ہوئے علاقے میں ان کی الگ ریاست بنانا ناممکن تھا۔ مسلمانوں کی اکثریت کے علاقے شمال مشرق اور شمال مغرب میں تھے۔ یہ دونوں علاقے کسی مقام پر بھی ایک دوسرے سے متصل نہیں ہیں۔ یہاں کے باشندے مذہب کے سوا ہر لحاظ سے ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں۔ یہ کہنا عوام کو ایک بہت بڑا فریب دینا ہے کہ صرف مذہبی یگانگت دو ایسے علاقوں کو متحد کر سکتی ہے جو جغرافیائی، معاشی، لسانی اور معاشرتی اعتبار سے ایک دوسرے سے بالکل جدا ہوں۔ اس میں شک نہیں کہ اسلام نے ایک ایسے معاشرے کے قیام کی کوشش کی جو نسلی، لسانی اور معاشی اور سیاسی حد بندیوں سے بالاتر ہو، لیکن تاریخ شاہد ہے کہ شروع کے چالیس برسوں کو، یا زیادہ سے زیادہ پہلی صدی کو چھوڑ کر اسلام کبھی سارے مسلمان ممالک کو صرف مذہب کی بنیاد پر متحد نہ کر سکا۔''

مشرقی اور مغربی پاکستان کے مابین جو قدرتی جغرافیائی بُعد ہے اس کے آگے چل کر کیا

---

(۱) ہماری آزادی: ابوالکلام آزاد (انڈیا ونس فریڈم کا اُردو ترجمہ) از پروفیسر محمد مجیب - دہلی ۱۹۶۱ء
پہلا انگریزی ایڈیشن جنوری ۱۹۵۹ء

نتائج نکل سکتے ہیں مولانا کو نومبر ۱۹۵۷ء ہی میں جب کہ اس کتاب کا مسودہ تیار ہوا پورا احساس تھا۔ فرماتے ہیں:

''یہ صورت اس وقت تھی اور اب بھی ہے۔ کون اس کی توقع کر سکتا ہے کہ مشرقی اور مغربی پاکستان کے اختلافات دور ہو جائیں گے اور یہ دونوں علاقے ایک قوم بن جائیں گے۔ (۱) خود مغربی پاکستان کے اندر سندھ، پنجاب اور سرحد اپنے اپنے جداگانہ مقاصد اور مفاد کے لیے کوشاں ہیں۔'' (۲-۳)

یہ تو بہر حال پاکستان کے اپنے داخلی معاملات ہوئے لیکن جہاں تک ہندستان اور پاکستان کے باہمی تعلقات کا سوال ہے، اس بارے میں مولانا کا موقف بڑا واضح اور مثبت تھا۔ لکھتے ہیں:

''بہر کیف اب تو جو کچھ ہونا تھا ہو چکا۔ پاکستان کی نئی ریاست ایک حقیقت ہے۔ اب دونوں ریاستوں کا مفاد اسی میں ہے کہ یہ ایک دوسرے کے ساتھ دوستانہ تعلقات بڑھائیں اور اشتراک عمل سے کام لیں۔ اس کے خلاف کوئی پالیسی اپنائی گئی تو وہ نئے اور بڑے مصائب و آلام کا باعث بن سکتی ہے۔ کچھ لوگ سمجھتے ہیں کہ جو کچھ ہوا وہ اٹل تھا۔ اس کے برعکس دوسرے لوگوں کو یقین ہے کہ جو کچھ ہوا برا ہوا اور اس سے بچنا ممکن تھا۔ ہم آج نہیں کہہ سکتے کہ دونوں میں کون درست ہے، یہ تو واقعات ہی سے ثابت ہو سکے گا کہ آیا تقسیم کو قبول کرنا

---

(۱) ان خنلافات کا جو نتیجہ نکلا، وہ تاریخ کا ایک ناقابل انکار واقعہ ہے جس پر ۴۰ سال گزر چکے ہیں تفصیل کی ضرورت نہیں۔

(۲) ہماری آزادی: ص ۲۵۴۔

(۳) ۱۹۷۱ء کے حادثے سے بچا ہوا ''مغربی پاکستان'' جواب ''کل پاکستان'' ہے اس وقت تاریخ کے جس نازک دور سے گزر رہا ہے، جن خطرات میں گھرا ہوا ہے اور پاکستان کا ہر شخص کسی وقت بھی کسی الم ناک حادثے کے وقوع کے خوف سے لرز رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ اسے ہر قسم کے آفات و حوادث سے اپنے حفظ و امان میں رکھے۔ آمین

عقل اور مصلحت کی بات تھی؟۔''

مولانا آزاد کی پوری کتاب پڑھ کر یہ تاثر ہوتا ہے کہ خود مولانا ان لوگوں میں سے تھے، جنھیں یقین تھا کہ جو کچھ ہوا برا ہوا اور اس سے بچنا ممکن تھا۔

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ اسلام کے بنیادی تصورات اور اس کی دعوت کی عمومی نوعیت نیز ہندستان کی اسلامی سیاست کے بارے میں مولانا آزاد کی سوچ اور مسلک اپنے تمام ہم عصر مسلمان رہنماؤں سے اس قدر الگ کیوں تھے؟ جہاں تک اول الذکر کا تعلق ہے بات یہ ہے کہ مولانا کا اسلام کا تصور عالم گیر اور ہمہ گیر انسانی تھا، اپنے اکثر و بیشتر معاصرین کی طرح گروہ بندی اور فرقہ پرستی کا نہ تھا۔ ان کی کتاب ''ہماری آزادی'' کے انگریزی ایڈیشن کے مرتب ہمایوں کبیر دیباچہ میں لکھتے ہیں:

''(مقصد) جو مولانا آزاد کو دل سے عزیز تھا، یہ مقصد تھا ہندستان کی مختلف دینی جماعتوں میں مفاہمت پیدا کرنا اور اسے فروغ دینا اور دنیا کی قوموں میں بہتر مفاہمت پیدا کرنے کی راہ میں اس قومی منصوبے کو پہلا قدم بنانا۔ وہ یہ بھی چاہتے تھے کہ ہندستانی اور پاکستانی ایک دوسرے کو دوست اور پڑوسی سمجھیں۔''

ملکی سیاسیات کے متعلق مولانا کے نظریہ وعمل کی تشکیل میں ایک تو ان کا دین اسلام کے بارے میں یہ جو جامع تصور تھا، اس کا بڑا دخل تھا۔ دوسری بات جو اس معاملے میں مولانا کو اپنے تمام معاصرین سے ممتاز کرتی ہے، وہ تھی ان کی اسلامی دنیا کے اندر ماضی قریب میں رونما ہونے والے انقلابی تغیرات اور ان کی جدید قومی وسیاسی واجتماعی تحریکوں سے اوروں سے زیادہ واقفیت۔ چناں چہ جہاں ان کے بعض ہم عصر آخر تک نام نہاد اتحاد اسلام کے شان دار خیالی امکانات کے شاعرانہ تصورات میں الجھے رہے اور بعض جیسا کہ مثال کے طور پر مولانا محمد علی تھے وطنی قومیت اور مافوق وطنی اسلامیت کی حدود کا یقین نہ کر پائے اور اس کی وجہ سے اُن کی سیاست کو کبھی ثبات نصیب نہ ہوا، وہاں مولانا آزاد پہلی جنگ عظیم سے قبل ہی اس حقیقت کو پا گئے تھے کہ آج اس دور میں اسلام اور مسلمانوں کا سب سے بڑا دشمن مغربی سامراج ہے اور ساری قوتیں اسی سے لڑنے پر مرکوز ہونی چاہئیں۔ اپنی خداداد ذہانت اور

مصر، ترکی اور ایران کی قومی تحریکات کے مطالعے سے وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ اس سامراج سے صرف قومی و وطنی بنیادوں پر ہی جنگ کی جا سکتی ہے۔ بے شک اس میں مذہبی جذبہ بڑا کام دے سکتا ہے، لیکن یہ مذہبی جذبہ فرقہ پرستانہ نہ ہونا چاہیے۔ کیوں کہ جہاں مذہبی فرقہ پرستی آئے گی۔ غیر ملکی سامراج اور ملکی استبداد کے خلاف عوام کا محاذ کمزور ہوگا اور محکوم خود آپس میں لڑنے لگ جائیں گے۔

۱۹۲۶ء کا ذکر ہے۔ ہندستان میں فرقہ وارانہ فضا بے حد خراب تھی۔ مولانا آزاد، پنڈت موتی لال نہرو اور بعض دوسرے رہنماؤں نے مل کر ''انڈین نیشنل یونین'' نام کی ایک جماعت بنانے کی تجویز کی۔ اس سلسلے میں اعلان کیا گیا کہ ''ہندستان کی ترقی اور آزادی کا صرف یہی ایک ذریعہ ہے کہ ہندستان کی تمام جماعتیں ایک مشترکہ اور متحدہ قومیت پیدا کریں۔ (۱)

انھی دنوں دہلی میں ایک اجتماع میں تقریر کرتے ہوئے مولانا نے کہا:

حضرات! میں نے آپ کا اس قدر وقت در و دیوار کی فکر میں لے لیا۔ حال آں کہ ابھی یہ بات باقی ہے کہ ہماری جدوجہد کی بنیاد کا کیا حال ہے! میرا اشارہ ہندو مسلم اتحاد کی طرف ہے۔ یہ ہماری تعمیرات کی وہ پہلی بنیاد ہے جس کے بغیر نہ صرف ہندستان کی آزادی کی وہ تمام باتیں جو کسی ملک کے زندہ رہنے اور ترقی کرنے کے لیے ہو سکتی ہے، محض خواب وخیال ہیں۔ صرف یہی نہیں کہ اس کے بغیر ہمیں قومی آزادی نہیں مل سکتی۔ بلکہ اس کے بغیر ہم انسانیت کے ابتدائی اصول بھی اپنے اندر پیدا نہیں کر سکتے۔ آج اگر ایک فرشتہ آسمان کی بدلیوں سے اتر آئے اور دہلی کے قطب مینار پر کھڑے ہو کر یہ اعلان کر دے کہ سوراج چوبیس گھنٹے کے اندر مل سکتا ہے، بہ شرطے کہ ہندستان ہندو مسلم اتحاد سے دست بردار ہو جائے تو میں سورج سے دست بردار ہوں گا کیوں کہ اگر تاریخ کے ملنے میں تاخیر ہوئی، تو یہ ہندستان کا نقصان ہوگا، لیکن اگر ہمارا اتحاد جاتا رہا تو یہ عالم

(۱) روزنامہ ہمدرد۔ دہلی۔ ۶ / اکتوبر ۱۹۲۶ء

انسانیت کا نقصان ہے۔ [1]

برصغیر کی آزادی سے ایک برس قبل سے لے کر اعلان آزادی کے بعد چند مہینوں تک اس سرزمین میں جو کشت وخون ہوا اور انسانوں نے ایک دوسرے کو جس بے دردی سے قتل کیا اور ان کی جائیدادیں جلائیں اور لوٹیں۔ پھر ان ستائیس برسوں میں پاکستان اور ہندستان کے درمیان جس طرح تین جنگیں ہو چکی ہیں۔ کیا یہ سب ہول ناک واقعات اس امر کا ایک ٹھوس ثبوت نہیں کہ ہندستان کے مسلمان اور ہندو لیڈروں میں سے مولانا ابوالکلام آزاد ہی کی ایک واحد شخصیت تھی، جس نے بہت پہلے عالم انسانیت کے اس عظیم نقصان کو دیکھ لیا تھا جو آگے چل کر ہندوؤں اور مسلمانوں کے تصادم کے نتیجے میں ہوگا۔ مولانا نے آخر وقت تک اس خوف ناک تصادم کو روکنے کی پوری کوشش کی۔ مسلمان تو ان کی بات کیا سنتے، وہ تو انھیں اپنا ازلی دشمن اور دائرۂ اسلام سے خارج سمجھتے تھے۔ سب سے بڑا سانحہ یہ ہے کہ کانگریسی قیادت بالخصوص گاندھی جی اور پنڈت جواہر لال نے بھی (آخر میں) ان کی بات نہ سنی۔

مولانا کو آخری وقت تک یہ امید رہی کہ مسلم لیگ سے مصالحت ہو سکتی ہے اور یہ کہ کیبنٹ مشن پلان جسے مسلم لیگ تسلیم کر چکی تھی، مسئلے کا حل ہے لیکن اس دوران میں سردار پٹیل پوری طرح کانگریس پر حاوی ہو چکے تھے۔ چناں چہ ایک طرف انھوں نے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو پنجاب اور بنگال کی اپنی حسب منشا تقسیم پر راضی کر لیا۔ اور دوسری طرف

---

(۱) اس مقام پر (اقتباس کی جگہ) مرحوم پروفیسر محمد سرور نے محمد عثمان فارقلیط کے مرتبہ "افکار آزاد" ص ۹۶ کے حوالے سے مولانا آزاد کی ایک تحریر نقل کی تھی۔ یہ تحریر دراصل کانگریس کے اسپیشل اجلاس۔ دہلی، ۱۵ر دسمبر ۱۹۲۳ء، جو مولانا ابوالکلام آزاد کی صدارت میں ہوا تھا اور مولانا نہایت بلند پایہ، فکر انگیز، بسیط، وقت کے حالات و مسایل کا جامع اور رہنما خطبۂ صدارت پیش کیا تھا۔ یہ اقتباس اس سے لیا گیا، لیکن "افکار آزاد" میں تلخیص کی بنا پر نہ مکمل رہا تھا نہ مؤثر تھا۔ خاک سار نے اقتباس کے متن کو "خطبات ابوالکلام آزاد" (ناشر ایم ثناء اللہ خان اینڈ سنز۔ لاہور) کے متعلقہ مکمل پیراگراف سے بدل دیا ہے۔ مولانا کے خطبات کا یہ مستند ایڈیشن ہے۔ (ا۔ س۔ ش)

گاندھی جی اور جواہر لال نے ان کے سامنے ہتھیار ڈال دیے۔...

مولانا آزاد اپنی کتاب ھماری آزادی میں لکھتے ہیں:

میں نے دیکھا کہ گاندھی جی کھلم کھلا تقسیم کی موافقت تو نہیں کر رہے ہیں لیکن ان کی مخالفت میں پہلی جیسی شدت نہ تھی! اس سے بھی زیادہ حیرانی اور دکھ مجھ کو اس بات سے ہوا کہ اب وہ بھی وہی دلیلیں پیش کرنے لگے تھے جو میں سردار پٹیل کی زبانی سن چکا تھا۔ تقریباً دو گھنٹے تک میں ان کی منت سماجت کرتا رہا، لیکن اس کا کوئی اثر نہ ہوا۔''

آخر ناامید ہو کر میں نے کہا:

''اگر آپ کا یہی نظریہ ہے تو مجھے ہندستان کو عذاب سے بچانے کی کوئی امید نظر نہیں آتی۔ گاندھی جی نے میری بات کا کوئی جواب نہ دیا۔''[1] [تحریک پاکستان کا ایک باب، ص ۲۲۴-۲۰۷]

(۱) ھماری آزادی: ص ۳۷۴

باب: ۷

ڈاکٹر فرخ ملک میں انقلابِ فکر

جھروکے
(یادوں، تجربوں اور تبصروں کا حسین امتزاج)
حصہ پنجم
ڈاکٹر فرخ ملک

(۱)

افکار جدید پر ایک اُچٹتی نظر

ڈاکٹر فرخ ملک امرتسر کے ایک ایسے خاندان سے تعلق رکھتے تھے جن کے ننھیال اور ددھیال دونوں خاندانوں کے کئی بزرگ سیاسی ذوق سے آشنا تھے۔ ڈاکٹر فرخ نے امرتسر کی فضا میں اپنے بچپن سے جوانی تک وقت گزارا تھا، جس کے شب و روز سیاسی ہنگاموں سے بھرے ہوئے تھے۔ چوں کہ امرتسر سکھوں کا ایک مذہبی شہر اور ان کی سیاست کا سرگرم مرکز تھا۔ اگرچہ مرتسر میں سکھوں کی اکثریت نہ تھی۔ ہندو ان سے کئی گنا زیادہ اور مسلمان اقلیت میں تھے۔ پنجاب میں امرتسر لاہور کے بعد سیاست کا سب سے بڑا مرکز تھا۔ کانگریس، اکالی دل، ہندو مہاسبھا، مسلم لیگ، جمعیت علمائے ہند، مجلس احرار اسلام ہند، خاکسار جماعت کی سیاسی سرگرمیاں اور اس کے ساتھ مذہبی جوش و خروش سے امرتسر کی صبحیں اور شامیں روز بازار عالم کا نقشہ پیش کرتی تھیں۔

ڈاکٹر فرخ ملک کے آنگن سے لے کر گلیوں اور سڑکوں تک سیاست کا بازار گرم رہتا تھا۔ ان کے دادا مجلس احرار اسلام کے رکن تھے۔ ان کے والد کانگریس کے ممبر تھے اور پھر اس کے فارورڈ بلاک کے سرگرم مجاہد تھے۔ ان کی خلیا ساس ہیمبرگ میں تھیں اور نازی پارٹی کی سرگرم رکن رہی تھیں۔ ڈاکٹر فرخ اپنے سب بزرگوں کے اخلاص و ایثار سے متاثر تھے لیکن خود انھیں خاکسار کے سرفروشوں کی وردی، بیلچے کی چمک اور چپ و راست کی سرگرم پریڈوں نے متاثر کیا تھا اور ایک سرگرم بیلچہ بردار بن گئے تھے۔ وہ مسلم لیگ کے پرجوش نعروں، کانگریس کی سرگرمیوں، ہندو مسلم بھائی بھائی، جھنڈا اُونچا رہے ہمارا! احرار کے جلسوں کی خون گرمانے والی تقریروں سے بھی متاثر ہوئے۔ آخر میں وہ لیگ کے نعروں اور اس کے جلسوں جلوسوں اور مسٹر محمد علی جناح کی شخصیت سے متاثر ہوئے اور ۱۹۴۷ء کے وسط تک پہنچتے پہنچتے ہندو سکھ اور مسلمان کشیدگی اور جلد ہی بدلے ہوئے تیوروں، خشمگی اور دشمنی

کے عملی اظہار، قتل وخونریزی کے واقعات اور مسلح مقابلوں نے ان کی توجہ کو اپنی طرف کھینچ لیا اور وہ مسلمانوں کی جان و مال کے تحفظ کے لیے سرگرم کار ہو گئے۔ بالآخر انھیں امرتسر چھوڑنا پڑا اور اپنے ساتھ امرتسر کی قتل گاہ سے مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد کو بحفاظت بچا کر لاہور نکال لے آگئے۔ اب ان کی خدمات کا بڑا میدان مصیبت زدہ اور ترک وطن کرنے والوں کی آباد کاری کا تھا۔ یہ دَور اُن کی بھرپور جوانی کا تھا۔

اس دوران انھوں نے انسانی زندگی کا بہت قریب سے مطالعہ کیا تھا۔ ماضی کی سیاست، مسلم لیگ کی کارگزاریوں، اس کے طرزِ سیاست اور اس کے نتائج، نیز اس کے رہنماؤں کی سیرتوں اور رویوں کو دور و نزدیک سے دیکھ کر، دوسروں کی زبانی سن کر اور کتابوں میں پڑھ پڑھ کر، وہ بہت مغموم و مایوس ہوئے تھے۔ وہ بہت بُرے اور خطرناک حالات سے گزر کر لاہور پہنچے تھے، لیکن انھوں نے اپنی آنکھیں ہر دور میں کھلی رکھی تھیں۔ جن حالات و مناظر پر نظر پڑی اس کی ایک تصویر ذہن میں نقش ہو گئی تھی۔ جوں جوں حالات میں سکون پیدا ہوا ہنگاموں سے دور ہوتے گئے اور وقت کے مسایل و افکار سے نجات ملی۔ ذہن و دماغ نے اپنا کام شروع کر دیا تھا۔ اگرچہ اس وقت کے آنے میں نصف صدی گزر گئی لیکن اس کے بغیر چارہ بھی نہ تھا۔ اب ایک ایک واقعہ اپنے اپنے پس منظر کے ساتھ لفظوں کے سامنے گزرنے لگا۔ دل کدورت سے صاف تھا اور اچھے برے کا فیصلہ کر سکتا تھا۔ آنکھوں پر پڑے ہوئے پردے ایک ایک کر کے اٹھ رہے تھے اور معلوم ہونے لگا تھا کہ ہم نے کہاں کہاں ٹھوکر کھائی اور کہاں کہاں کس نے ہمیں دھوکا دیا!

اب ڈاکٹر فرخ ملک کے سامنے ایک نئی دنیا تھی۔ کانگریس، جمعیت علماے ہند، احرار، خاکسار کا تختہ اُلٹ گیا۔ سیاسی میدان میں ان کی کوئی سرگرمی باقی نہ رہی تھی۔ اب صرف مسلم لیگ میدان میں تھی لیکن اب اس کے لیے بھی وہ مقام آگیا تھا جہاں تاریخ اپنا تخت عدالت بچھاتی ہے اور افراد و قوم کے بارے میں فیصلہ کرتی ہے اور اس کا مقام متعین کرتی ہے۔ تاریخ پاکستان کی تالیف و ترتیب کے لیے قدرت نے جن اہلِ قلم کو توفیق بخشی تھی، ان میں ایک خوش نصیب ڈاکٹر فرخ ملک بھی تھے۔ وہ لکھتے ہیں:

''سال ہا سال سے کئی ایک کتابوں میں بابا جی (قاید اعظم) کی مختلف داستانیں چھپتی رہیں۔ ہم پڑھتے بھی رہے اور بہت کچھ سنتے بھی رہے۔ میں ان کا عاشق ہونے کی صورت میں کسی بھی ایک خبر پر، جو بابا جی کی شان میں گستاخی کے مترادف ہو، کبھی یقین نہیں کرتا تھا۔ لہٰذا میں نے ہمیشہ بابا جی کا نہ صرف دفاع کیا بلکہ ہر غلطی کی Justification بھی دیتا رہا۔ پچھلے دو تین سالوں میں کچھ ایسے مسودے اور دستاویزات میری نظر سے گزریں، جن کے پڑھنے کے بعد سوچتے سوچتے اور بار بار سوچتے ہوئے مجھے 180 ڈگری پر گھومنا پڑا اور یہ احساس ہوا کہ ہمارے ساتھ، قوم کے ساتھ اور اسلام کے ساتھ کیسے کیسے مظالم ڈھائے گئے اور ہمیں کس طرح دھوکا دیا گیا۔ یہ سب کچھ جاننے کے بعد مجھے اتنا دکھ ہوا اور ہے، اور شاید قبر تک رہے گا۔ میں اسے بیان نہیں کرسکتا۔ لہٰذا اس وقت مجھے اپنی خالہ ساس کی یہ بات بار بار یاد آتی ہے کہ ''جس وقت انسان کے اعتماد کو ٹھیس پہنچتی ہے تو وہ دکھ انسان کی زندگی کا سب سے بڑا دُکھ ہوتا ہے۔'' لہٰذا میں آل انڈیا مسلم لیگ، پاکستان اور سب بابوں وغیرہ پر تبصرہ کرنے پر مجبور ہو گیا ہوں۔'' [جھروکے: جلد۵، ص۱۲]

''تقسیم ہند کے پیشتر میں امرتسر ڈسٹرکٹ اسٹوڈنٹس فیڈریشن کا جنرل سیکرٹری تھا اور خواجہ رفیق شہید صدر تھے۔ میرا یہ نعرہ نہ صرف امرتسر بلکہ جالندھر اور لاہور میں بھی کافی مشہور تھا: ''فخر ایشیا، پیکر حریت، دیوارِ اسلام، شہنشاہِ پاکستان، حضرت قاید اعظم محمد علی جناح!''

اس کا جواب لوگ ''زندہ باد'' سے دیتے تھے۔

لے کے رہیں گے پاکستان، دینا ہی پڑے گا پاکستان، ہمارا ایمان پاکستان، جان ہماری پاکستان، چھین کے لیں گے پاکستان، اسلام کا قلعہ پاکستان اور پاکستان کا مطلب کیا؟ لا الٰہ الا اللہ!

جب میں یہ نعرے لگاتا تھا تو میری آواز کی گونج دور دور تک سنائی دیتی تھی۔ لوگوں کی طرف سے اس کا جواب بھی فلک بوس ہوتا تھا۔

مجھے قاید اعظم کے ساتھ اتنا عشق تھا کہ میرے سامنے ان کی شان میں گستاخی کا

مطلب یہ ہوتا تھا کہ آ بیل مجھے مار! میں ایسے شخص کو اتنا زوردار گھونسا مارتا تھا کہ اس کو چکر آ جاتا تھا۔ اگر کوئی میرے بزرگوں کی شان میں گستاخی کرتا تو شاید میں اس لیے اس کی پٹائی نہ کرتا کہ وہ صرف میرے ماں باپ ہیں جبکہ بابا جی (جناح صاحب) تو پوری قوم کے مائی باپ ہیں!

جس وقت مجھے یہ پتا چلا کہ بابا جی (قاید اعظم) کے قتل میں لیاقت علی کان صاحب بھی شامل ہیں، تو میں نے گوال منڈی، نسبت روڈ کے تمام مجاہدین کو اکٹھا کیا۔"

ڈاکٹر فرخ ملک نے لیاقت علی خان کو قتل کر دینے کا فیصلہ کر لیا تھا لیکن غور و فکر کے بعد انھوں نے سوچا کہ یہ بابا سے محبت کا صحیح طریقہ نہیں ہے۔ اس لیے اس فیصلے پر عمل سے باز آ گئے، لیکن ان کے اس بیان سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ لیاقت علی خاں کے موجب قتل ہونے کا خیال بدلا تھا۔

جناح صاحب نے ہندستان کی سیاست میں حصہ لینے کے لیے آل انڈیا کانگریس کے پلیٹ فارم کا انتخاب کیا تھا۔ ابتدا میں ۱۵ برس تک وہ پوری دل جمعی کے ساتھ اس کی سرگرمیوں میں حصہ لیتے تھے۔ برطانیہ میں دادا بھائی نوروجی کے حلقے میں ہندستانی طالب علموں کی جو جماعت موجود تھی، ان میں جناح صاحب بھی تھے۔ انھوں نے ان طالب علموں سے راہ و رسم پیدا کر لی تھی اور نہ صرف انگلینڈ میں ان کے دوستوں کا حلقہ پیدا ہو گیا تھا، بلکہ ہندستان آنے کے بعد یہاں بھی سیاسی سرگرمیوں کے آغاز سے "لے جس لیٹو کونسل" میں پہنچنے تک دوستوں کا یہ حلقہ قایم رہا اور سیاسی دایرے میں بھی اچھی گزرتی رہی۔ پیشہ وارانہ دایرے میں بھی ان کے دوستوں کا ایک حلقہ پیدا ہو گیا تھا لیکن ۱۹۱۳ء میں گاندھی جی کے افریقہ سے ہندستان آ جانے کے بعد جوں جوں گاندھی جی نے کانگریس کی سیاست میں رسوخ پیدا کیا، جناح صاحب کے عروج کا ستارا گہنانے لگا۔ دونوں رہنماؤں کے طرزِ فکر اور اندازِ سیاست میں ایک کشمکش شروع ہو گئی۔ اب کانگریس میں چند عمر رسیدہ بزرگ اور دوست ہی نہیں ان کے ایک حریف کا بھی اضافہ ہو گیا تھا۔ ان کا وہ حریف گاندھی تھا اور ان کے ذوق و مزاج اور عادات و خصایل میں ان سے بالکل مختلف تھا۔ انھوں نے مسز اینی

بیسنٹ کی ہوم رول لیگ کا رُخ کیا۔ گاندھی جی وہاں بھی پہنچ گئے اور انھیں ٹکنے نہ دیا۔ تحریک خلافت سے انھیں ذرا بھی دل چسپی نہ ہوسکتی تھی۔ گاندھی جی نے کانگریس کو خلافت کمیٹی سے ملایا، جناح صاحب نے ہر چند اس اتحاد کو توڑنے کی کوشش کی لیکن کچھ بن نہ سکا۔ خود ہی کنارہ کش ہونا پڑا۔

انھیں ۱۹۲۹ء تک ۱۹۲۳ء میں مولانا محمد علی اور ابوالکلام آزاد کا کانگریس میں رسوخ پانا بھی گوارا نہ تھا۔ ۱۹۲۷ء مین سایمن کمیشن کا ہندستان آنا جناح صاحب کو پسند نہ تھا لیکن سر محمد شفیع اور علامہ اقبال نے ان سے اتفاق نہ کیا اور لیگ ہی دو ٹکڑوں میں بٹ گئی۔ نہرو کمیٹی (پنڈت موتی لال نہرو) کے قیام سے انھیں اختلاف نہ تھا لیکن تشکیل کی صورت سے اختلاف تھا، اس کی رپورٹ سے ان کا اختلاف اور بڑھا، اور ایسا ہوا کہ اجلاس سے اٹھ گئے۔ اتفاق کی کوئی صورت نہ نکل سکی، اس کے باوجود کوششیں جاری رہیں۔

اس کے بعد کلکتہ کانگریس کا اجلاس، اجلاس مسلم لیگ کلکتہ، خلافت کمیٹی کا اجلاس کلکتہ، آل پارٹیز کلکتہ کنونشن، مسلم آل پارٹیز کانفرنس دہلی، جس میں جناح صاحب کے چودہ نکات منظور ہوئے۔ مسلم لیگ کے اجلاس دہلی ۱۹۲۹ء وغیرہ اجلاسوں میں کوشش کی گئی کہ ہندو کمیٹی کی رپورٹ کا متبادل تلاش کیا جائے، اگرچہ ایک حلقے میں جناح صاحب کے ۱۴ نکات کا پروپیگنڈا بہت کیا گیا لیکن وہ نہرو کمیٹی کا متبادل نہ ہوسکا۔ کانگریس، حریت پسند جماعتیں اور نیشنلسٹ رہنماؤں نے ۵/دسمبر ۱۹۲۹ء میں کانگریس کا سالانہ جلسہ ہوا، کیوں کہ سایمن کے چیلنج کے جواب میں موتی الل نہرو نے دستور بنایا تھا۔ گورنمنٹ نے اسے ماننے سے انکار کردیا۔ اس لیے کانگریس نے اسے تو ایک طرف کیا اور جنوری ۱۹۳۰ء سے سول نافرمانی کی تحریک کا آغاز کردیا۔ جناح صاحب حالات سے مایوس اور دل گرفتہ ہوکر برطانیہ چلے گئے تھے۔ دسمبر ۱۹۳۰ء میں انھوں نے گول میز کانفرنس (انگلینڈ) میں شرکت کی لیکن اس کا کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ مولانا محمد علی نے کانفرنس کے انڈین نمایندوں کی بدخدمتی کا ایک خط میں ماتم کیا ہے۔ جس میں جناح صاحب بھی شامل ہیں۔

جناح صاحب کی ہندستان واپسی:

جناح صاحب کی ہندستان واپسی کے سلسلے میں حضرت علامہ اقبال، بیگم رعنا لیاقت علی، بنت شاہ نواز اور کئی حضرات کے نام آئے ہیں، لیکن ڈاکٹر فرخ ملک نے اسباب سفرِ ہند کا انکار کر دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''آپ (یعنی جناح صاحب) ۱۹۳۰ء میں ہندستان کے مسلمانوں کو تنہا چھوڑ کر مدر کنٹری انگلینڈ (Mother Country England) چلے گئے تھے اور (وہیں پہلی اور) دوسری کانفرنس میں بھی شرکت کی۔ تقریباً چار سال وہاں پر رہے۔ پھر آپ کو ایک حکم نامہ ملا اور آپ کو واپس ہندستان دھکیل دیا گیا۔ جب کہ بہانہ علامہ اقبال کے خطوط کو بنایا گیا۔ حقیقت یہ تھی کہ علامہ کی صحت خراب ہو گئی تھی اور انگریزوں کو اپنے مقاصد پورے کرنے کے لیے ایک ایسے مسلمان لیڈر کی ضرورت تھی جو انگریزوں کا صحیح معنوں میں وفادار ہو! اسی وجہ سے انھوں نے علامہ صاحب سے آپ کو خطوط لکھوائے اور آپ فوراً لوٹ آئے۔''

(جھروکے: ج۵،ص۵۰)

(۲)

ایک منصف کا بیانِ شہادت

ڈاکٹر فرخ ملک لکھتے ہیں:

''لاؤ تو قتل نامہ ذرا میں بھی دیکھ لوں
کس کس کی مہر ہے سر محضر لگی ہوئی؟

مرحوم جسٹس شیخ دین محمد کو یہ اعزاز بھی حاصل ہوا کہ وہ پنجاب باؤنڈری کمیشن کے مقتدر رُکن بنے۔ ۳/جون ۱۹۴۷ء کے اعلان کے مطابق پنجاب اور بنگال کو تقسیم ہونا تھا۔ ۴/جون ۱۹۴۷ء کو ریڈکلف کی صدارت میں جو اجلاس ہوا اُس میں ریڈکلف نے تمام اراکین کو کہا کہ وہ از خود کسی کو اپنا لیڈر منتخب کریں۔ چناں چہ کمیشن کے فاضل ارکان جسٹس منیر، جسٹس تیجا سنگھ اور جسٹس میر چند مہاجن نے متفقہ طور پر شیخ دین محمد کو یہ اعزاز بخشا۔ باؤنڈری کمیشن کی کارروائی کے دوران شیخ دین محمد مرحوم کی دوررس اور بصیرت افروز نگاہوں نے یہ بھانپ لیا کہ کمیشن کا یہ بظاہر غیر جانب دار صدر ریڈکلف اصل میں ہندستان کا گماشتہ ہے اور وہ نہایت چالاکی اور پرکاری سے کام لیتے ہوئے ایسے حالات پیدا کر رہا ہے کہ وادیٔ کشمیر ہندستان کی آغوش میں آ گرے۔ جب ریڈکلف نے اس خواہش کا اظہار کیا کہ وہ امرتسر اور گورداس پور کے اضلاع پر پرواز کرنا چاہتا ہے تو مسٹر جسٹس دین محمد صاحب اور مسٹر جسٹس منیر احمد صاحب سمجھ گئے کہ اس کے جی میں کچھ اور ہی بات آ گئی ہے اور وہ گورداس پور کے مسلم اکثریتی ضلع کی چیر پھاڑ کر کے اور پٹھان کوٹ ہندستان کو دے کر ہندستان سے کشمیر کے الحاق کے لیے راستہ ہموار کرنا چاہتا ہے۔ چناں چہ انھوں نے مسٹر جسٹس منیر احمد سے مشورہ کرنے کے بعد بابا قایداعظم سے ملاقات کی اور ان سے کہا کہ ریڈکلف کی ذہنی کیفیت ایک غیر جانب دار اور بے لاگ جج کی سی نہیں ہے اس لیے ہم اس کے طرزِ عمل کے خلاف احتجاج کے طور پر اپنے عہدوں سے مستعفی ہونے کے لیے تیار ہیں۔

جب بڑے بابا جی (جناح صاحب) نے اس رائے کا اظہار کیا کہ محض اس علاقے پر پرواز کے ارادے کی بنیاد پر ریڈکلف کے خلاف مثبت طور پر جانب داری کا الزام لگانا درست نہ ہوگا تو دونوں ججوں نے اس رائے کے سامنے سر جھکا دیا۔ اس کے چند ہی دنوں بعد کمیشن کے سامنے مسلم لیگ کا میمورنڈم آیا تو یہ دونوں جج صاحبان یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ جس پٹھان کوٹ کو بچانے کے لیے وہ استعفے دینے پر اُتر آئے تھے، مسلم لیگ کی قیادت نے اسے خود ہی چاندی کی طشتری میں رکھ کر ہندستان کے سامنے پیش کر دیا۔ مسلم لیگ کی قیادت نے سر ظفر اللہ کے ذریعے یہ مؤقف اختیار کیا کہ مغربی پنجاب اور مشرقی پنجاب کی حدود کا تعین کرنے کے لیے ضلع کو نہیں، تحصیل کو یونٹ قرار دینا چاہیے۔ نہ صرف یہ بلکہ واضح الفاظ میں لکھ دیا تھا کہ پٹھان کوٹ کی تحصیل ہندستان کو دے دی جائے اور فیروز پور اور جالندھر کی دو تحصیلیں پاکستان میں شامل کر دی جائیں (بعد میں یہ دو تحصیلیں بھی پاکستان میں شامل نہ ہوسکیں) گویا جہاں تک پٹھان کوٹ کا تعلق تھا وہ متنازع فیہ علاقہ نہ رہا اور فریقین اسے ہندستان میں شامل کرنے پر متفق ہو گئے۔ جسٹس دین محمد مرحوم کی رائے تھی کہ جس قیمت پر پٹھان کوٹ میں تحصیل حوالے کی جا رہی ہے وہ اگر مل بھی جائے تو یہ سراسر گھاٹے کا کاروبار ہے۔ چناں چہ انھوں نے بڑے بابا جی کو دو تین ٹیلیفون کیے مگر کوئی جواب نہیں ملا، اس کے بعد پھر بابا جی سے ملاقات کی کوشش کی مگر اس میں بھی ناکام رہے تو مسٹر لیاقت علی خان سے ملے اور کہا کہ خدا کے لیے کچھ کرو، تاکہ گورداس پور اور پٹھان کوٹ ہندستان میں شامل نہ ہو سکیں، مگر لیاقت علی خان نے بڑی لاپروائی سے جواب دیا کہ اب مسلم لیگی قیادت نے جو فیصلہ کر دیا ہے اس کا کچھ نہیں ہو سکتا، لہٰذا آپ جائیں اور زیادہ پریشان نہ ہوں۔ حال آں کہ لیاقت علی خان کو پتا تھا کہ گورداس پور اور پٹھان کوٹ کشمیر کے راستے ہیں اور اس طرح کشمیر بھی ہمارے پاس نہیں رہے گا۔ اس کے باوجود یہ سب کچھ جان بوجھ کر کیا گیا۔ (۱)

سیّد نور احمد اپنی کتاب مارشل لا سے مارشل لا تک میں لکھتے ہیں:

---

(۱) ہفت روزہ قومی دلیر گوجرانوالہ، ۲۵ فروری ۱۹۶۸ء

''لیاقت علی خان نے ان کی بات سن کر کہا کہ ضلع گورداس پور کی تحصیلوں کے معاوضے میں غالباً ہمیں بھی کچھ مل رہا ہے۔'' اس پر جسٹس دین محمد نے کہا کہ مجھے اندیشہ ہے کہ ہمیں یہ معاوضہ بھی نہیں ملے گا۔ بہرحال اب آخری وقت میں جب پاکستان کا سالم ہاتھی تمام خطروں کے سیلاب کو عبور کر کے کنارے پر آ پہنچا تھا، اس ہاتھی کی دُم کے ایک سرے کی خاطر کوئی نیا سوال اٹھانے کا موقع نہیں رہا تھا۔ لیاقت علی خان وغیرہ نے یہ سب کچھ پٹھان کوٹ کی ساری اہمیت کو جانتے ہوئے خود کیا تھا۔ بہرحال ریڈکلف نے ستلج پار کے کچھ علاقے، جہاں مسلمان اکثریت میں تھے، پاکستان کو دے دیے۔ مگر بعد میں ماؤنٹ بیٹن نے اپنی پوزیشن سے ناجائز فایدہ اٹھاتے ہوئے ان علاقوں کو پاکستان سے نکلوا دیا۔''

سیّد نور احمد کچھ بھی کہیں لیکن یہ حقیقت ہے کہ مسٹر جسٹس دین محمد مرحوم مدت تک بعض نجی محفلوں میں اس دل خراش صورتِ حال کی تفاصیل بیان کرتے رہے اور انھیں آخری دم تک پاکستان کے اس عظیم نقصان کا، جو تحصیل گورداس پور اور پٹھان کوٹ کے جانے کی وجہ سے ہوا، قلق رہا اور وہ ریڈکلف، ماؤنٹ بیٹن اور مسلم لیگی قیادت کی اس بندر بانٹ پر کڑھتے رہے۔ وہ انھیں منظرِ عام پر اس لیے نہ لائے کہ اس سے بعض قومی مصالح کو صدمہ پہنچنے کا اندیشہ تھا اور دوسری وجہ یہ ہے کہ وہ کمیشن میں جج کے عہدے پر فائز تھے اور جج کا یہ منصب نہیں ہوتا کہ وہ کسی ایک فریق میں نمایاں دلچسپی لے۔''

[جھروکے (حصہ پنجم): لاہور، ۲۰۱۱ء، ص ۶۱-۵۹]

ایک اور موقعے کی روداد بیان کرتے ہوئے ڈاکٹر فرخ ملک نے لکھا ہے:

''اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد میں نے جسٹس دین محمد سے ریڈکلف کمیشن میں سر ظفر اللہ کی تعیناتی کے متعلق پوچھا کہ ان کو کمیشن میں تعینات کس نے کیا تھا۔ اس پر انھوں نے بتایا کہ جس وقت سر ظفر اللہ نے گورداس پور کی تقسیم ضلع وار نہیں بلکہ تحصیل وار کرنے کے لیے کہا تو اس پر میں نے انھیں ریٹائرنگ روم میں بلوایا اور پوچھا کہ تم کن کے احکامات کے تحت تحصیل وار بانٹ کا منصوبہ پیش کر رہے ہو؟ تو جواب میں سر ظفر اللہ نے کہا کہ ''جن کی میں نمایندگی کر رہا ہوں اور جنھوں نے میری یہاں تقرری کی ہے۔'' میں سر ظفر اللہ کی یہ

بات سن کر آگ بگولا ہو گیا اور بے نقط کی سنا ڈالیں لیکن ظفر اللہ صاحب ٹس سے مس نہ ہوئے۔ اس کے بعد جسٹس دین محمد صاحب نے بابا جناح اور لیاقت علی خان صاحب کو بھی ٹیلیفون کر کے رابطہ (Contact) کرنے کی کوشش کی لیکن جب ٹیلی فون کالز بھی نہیں سنی گئیں تو پھر جسٹس صاحب خود دہلی گئے جہاں پر بابا جی نے ان سے ملنے سے انکار کر دیا اور کہا کہ آپ لیاقت علی خان سے ملاقات کریں۔ جب ان کی ملاقات لیاقت علی خان سے ہوئی تو اُنھوں نے (جسٹس دین محمد) گورداس پوری والی سازش کا نواب زادہ صاحب پر انکشاف کیا اور یہ بھی بتایا کہ ہندستان اسی راستے سے کشمیر میں داخل ہوگا تو اس پر نواب زادہ صاحب نے فرمایا کہ ''کوئی بات نہیں اس کے عوض وہ ہمیں دریاے بیاس کے کنارے کی کچھ تحصیلیں دے رہے ہیں اور مسلم لیگی مجلس عاملہ نے یہ فیصلہ مان لیا ہوا ہے۔ لہٰذا اس پر اب آپ کو مزید تکلیف کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔''

جسٹس دین محمد صاحب وہاں سے روتے ہوئے واپس آ گئے۔

ان کے خاندان کے لوگوں نے مجھے بتایا کہ انھیں ساری زندگی اس بات پر افسوس رہا اور انھوں نے ساری زندگی بابا جی کو ''مسٹر جناح'' کہا ہے۔ جب بھی بابا جی کا نام آتا تو وہ اسے مسٹر جناح ہی کہتے!''

[جھروکے (جلد پنجم)، ص ٦٧]

(۳)

لاہور میں جناح صاحب کی زمین اور پاکستان کے غیر ملکی سفرا و وزرا

ڈاکٹر فرخ ملک لکھتے ہیں:

میں نے خواجہ غلام نبی لون سے، جن کے پاس ہر قسم کی معلومات ہوتی ہے، بابا جی کی زمین کے متعلق بات کی۔ لون صاحب کا بنگلہ حسین چوک اور فردوس مارکیٹ کے درمیان واقع ہے۔ انھوں نے مجھے بتایا کہ نہ صرف بابا جی بلکہ بے بے جی کی بھی زمینیں ہیں۔ میرے استفسار پر انھوں نے بتایا کہ انھوں نے جو پلاٹ خریدا تھا اُس زمین کی ملکیت مس فاطمہ جناح کی تھی اور بیع نامہ (Sale Deed) پر اُن کے اٹارنی کے دستخط ہیں، جو کہ for & on behalf of Miss Fatima Jinnah ہیں۔ اس کے بعد میں ان زمینوں والے خیالات کا سالہا سال تک جایزہ لیتا رہا۔ کہا جاتا ہے کہ یہ تمام زمینیں جواہر لعل نہرو کی بیوی کملا نہرو کی تھیں۔ جس نے تقسیم ہند سے پہلے اپنے مسلمان مزارعوں میں بھگوان کے نام پر بانٹ دی تھیں۔ کچھ مزارعوں نے زمین کا انتقال کروالیا اور کچھ نامعلوم وجوہات اور مخدوش حالات کی وجہ سے انتقال نہ کرواسکے۔ پاکستان بننے کے بعد ان زمینوں کو جن کا انتقال نہ ہوسکا تھا، انھیں متروکہ جایداد قرار دے دیا گیا اور یہ متروکہ جایدادیں مشرقی پنجاب سے آئے ہوئے ان مہاجرین کو الاٹ کی جاتی تھیں جن کی زمینوں کا تمام ریکارڈ لاہور آ گیا تھا۔

''ہندستان اور پاکستان نے ایک معاہدے کے تحت تمام تارکین وطن کی جایدادیں دو مختلف Custodians کی سپرد داری میں دے دی تھیں۔ ان Custodians کو Custodians of Evacuaee Property کہا جاتا ہے۔ جو لوگ اپنا ملک چھوڑ کر

لیگ کی ورکنگ کمیٹی یا کونسل میں لے جانے اور ان کے ارکان سے ڈس کس کرنے کی ضرورت بھی نہیں سمجھی اور اس لیے کشمیر میں فوج بھیجنے سے انکار پر جنرل گریسی کی حکم عدولی پر جواب طلبی کی انھوں نے ضرورت بھی نہیں سمجھی تھی اور نہ بعد میں اس ترقی دی جانے میں اس کی حکم عدولی مانع ہوئی تھی!

جناح صاحب نے ۱۹۳۴ء میں ہندستان آنے کے بعد اگست ۱۹۴۷ء تک برٹش استعمار کی جو خدمات انجام دی تھیں، اور ہندستان کے حریت پرستوں، جاں نثاروں، قوم پروروں اور کل ہندستان کے اتحاد کو توڑنے میں جو کردار ادا کیا تھا اور جس طرح برٹش استعمار کی خطروں میں گھری ہوئی ناؤ کو کامیابی کے ساحل سے ہم کنار کیا، وہ ایک بہت بڑا کارنامہ تھا۔ پاکستان کی گورنر جنرلی ان کے اسی کارنامے کا صلا تھا جو انھیں دیا گیا تھا۔ دستور ساز اسمبلی کا صدر ہونا گورنر جنرل کے ماتحت منصب تھا اور افواج کا سپریم کمانڈر ہونا محض ایک ضابطے اور رَسم کی بات تھی۔ جناح صاحب نے ۱۱/اگست کی تقریر سے جو سیاست کا رُخ بدلا تھا، اور اسے کوئی سمجھا نہ تھا یا جناح صاحب کو ٹوکنے کی جرأت نہ کرسکا تھا، تو یہ پاکستان کی تاریخ کا پہلا معرکہ تھا اور جناح صاحب کے سوا کوئی اور اسے انجام نہ دے سکتا تھا۔ اگر اس معرکے میں اس موقعے پر ایک رُکن بھی کھڑا ہو جاتا اور پوائنٹ آف آرڈر (نقطۂ اعتراض) کا نعرہ بلند کر کے پوچھ لیا جاتا کہ حضرت! یہ آپ کیا فرما رہے ہیں؟ یہ نہ بھولیے کہ بزم میں تماشائی ہی نہیں اہلِ نظر بھی ہیں! مجھے یقین ہے کہ اگر تاریخ پاکستان کے پہلے عظیم الشان تاریخ اجلاس میں یہ نعرہ حق بلند کر دیا جاتا تو بہت بابرکت ثابت ہوتا۔ پاکستان کے حالات آج کے حالات سے بالکل مختلف ہوتے!

آزادی کے بعد ہندستان اور پاکستان، دو یکساں درجے کی ڈومینیں تھیں اور دونوں برطانوی دولت مشترکہ کے نظام میں شامل تھیں۔ ہندستان اور پاکستان کے دونوں گورنر جنرل لارڈ ماؤنٹ بیٹن اور مسٹر محمد علی جناح یکساں مرتبے کے مالک تھے۔ جناح صاحب شہنشاہِ برطانیہ اور اس کے ولی عہدوں اور جانشینوں کے وفادار تھے۔ وہ برطانوی شہنشاہیت کے ملازم تھے۔ وہ پاکستان میں کسی کے سامنے کسی مسئلے میں جواب دہ نہ تھے۔

انھیں برطانوی دولت مشترکہ کے تمام ممالک میں بہ شمول حدودِ برطانیہ کے حقوق حاصل تھے۔ کسی ملک کی کسٹوڈین کسی ایسے مرتبے کے شخص کی پراپرٹی کی طرف نظر اُٹھا کر بھی نہ دیکھ سکتی تھی۔ ہندستان میں جناح صاحب کی ایک کوٹھی دہلی میں تھی، اسے انھوں نے دہلی سے پاکستان آتے آتے خود فروخت کر دیا۔ خرید وفروخت کی ضابطے کی کارروائی جواہر لال نہرو سے درخواست کر کے پچھلی تاریخوں میں مکمل کروائی تھی۔ ممبئ میں ان کی مشہور مالا بارہل کی کوٹھی آخر تک ان کی رہی تھی۔ اس کا ذکر ایک اور جگہ پر آ چکا ہے۔ ایک کوٹھی جناح صاحب نے، جو ممبئ ہاؤس کے نام سے تھی، اپنی بہن کے نام کر دی ہے۔ وہ فاطمہ جناح کے نام رہی اور اس کا کرایہ وہ کراچی میں وصول کرتی رہیں۔ اگر اس کے تبادلے میں ایوی کیو پراپرٹی کے قواعد کے تحت موہٹا پیلس پر قبضہ کیا گیا تھا تو یہ فعل یقیناً خلافِ قانون ہے۔ اسے کسی ٹرسٹ میں تبدیل کرنے یا حکومت کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

غاصبانہ قبضے اور چوری کے مال کو زکوۃ دے کر یا خیرات کر کے حلال نہیں کیا جا سکتا۔ اسے مالک کو لوٹانا ہوگا۔ اگر وارث موجود نہ ہو تو حکومت اپنی تحویل میں لے لیکن ہمارے سامنے مثال موجود ہے کہ جناح صاحب کے انتقال کے بعد ان کی ممبئ کی پراپرٹی فاطمہ جناح کو ملی اور ان کے بعد ان کے وارث کو۔ اس اصول کے مطابق موہٹا پیلس کو اس کے ورثا کو تلاش کر کے ان کے حوالے کر دیا جاتا۔ اس کے بعد پیش آمدہ حالات کے مطابق!

دیگر معاملات مثلاً فلیگ ہاؤس اور بہاول پور ہاؤس کے معاملے، بڑھیا کی زمین پر قبضے کا قصہ! اگر یہ صاف معاملات ہیں اور شکوک وشبہات نہیں ہیں تو ان مسایل کو صاف ہو جانا چاہیے۔ کوئی چیز ان کے ورثا کے قبضے میں ہے یا کسی چیز کو کلاً یا جزواً ٹرسٹ بنا دیا گیا ہے، تو حقایق کی روشنی میں ان کا فیصلہ ہونا چاہیے!

حصہ دوم

محمد علی جناح

مطالعے کے چند دیگر پہلو

(ا س . ش)

باب: ۱

محمد علی جناح اور پاکستان!

سودے بازی یا اصولی مانگ:

سر محمد یامین خان نے اپنی آپ بیتی ،نامۂ اعمال میں یکم مارچ ۱۹۳۹ء کی ایک دعوت کی روداد لکھی ہے۔ یہ دعوت سر ضیاء الدین خان نے کی تھی اور اس میں مسٹر محمد علی جناح، چودھری ظفر اللہ خان، سید محمد حسین اور صاحبِ نامۂ اعمال کو مدعو کیا گیا تھا۔ اس روداد کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ مسٹر جناح نے پاکستان کو مسلم لیگ کا کریڈ کب، کن حالات، کس پس منظر میں بنایا تھا اور اس کا مقصد کیا تھا؟ نامۂ اعمال کا یہ ''سولھواں باب'' ہے اور اس کا عنوان ہے ''پاکستان کو مسلم لیگ اپنا اصول بنائے'' اور ذیلی عنوان ہے ''پاکستان کا خیال''۔ سر یامین خاں لکھتے ہیں:

''ڈاکٹر ضیاء الدین احمد نے لنچ پر مجھ کو، مسٹر جناح، سر ظفر اللہ خاں، سید محمد حسین بیرسٹر الہ آباد کو بلایا۔ میرے ایک طرف مسٹر جناح بیٹھے تھے اور دوسری طرف سر ظفر اللہ خاں۔ مسٹر جناح کے دوسری طرف سید محمد حسین تھے اور سر ظفر اللہ خاں کے دوسری طرف ڈاکٹر سر ضیاء الدین احمد۔ لنچ کھانے میں سید محمد حسین نے چیخ چیخ کر جیسی کہ ان کی عادت ہے کہنا شروع کیا کہ چودھری رحمت علی کی اسکیم کہ پنجاب، کشمیر، صوبہ سرحد، سندھ و بلوچستان ملا کر بقیہ ہندستان سے علاحدہ کردیے جائیں۔ ان سے پاکستان اس طرح بنتا ہے کہ پ سے پنجاب الف سے افغان یعنی صوبہ سرحدی۔ ک سے کشمیر۔ س سے سندھ۔ تان بلوچستان کا آخیر ہے۔ چوں کہ سید محمد حسین زور زور سے بول رہے تھے سر ظفر اللہ خاں نے آہستہ سے مجھ سے کہا کہ اس شخص کا حلق بڑا ہے مگر دماغ چھوٹا ہے۔ سر ظفر اللہ خاں ان کی مخالفت کرتے رہے کہ یہ ناقابل عمل ہے۔ مسٹر جناح دونوں کی تقریر

غور سے سنتے رہے۔ پھر مجھ سے بولے کہ اس کو ہم کیوں نہ اپنا لیں اور اس کو مسلم لیگ کا کریڈ بنائیں ابھی تک ہماری کوئی خاص مانگ نہیں ہے۔ اگر ہم اس کو اٹھائیں تو کانگریس سے مصالحت ہو سکے گی۔ ورنہ وہ نہیں کریں گے۔ میں نے کہا کہ مغربی علاقے کے واسطے یہ کہہ رہے ہیں۔ مشرقی علاقے کا کیا ہوگا؟ مسٹر جناح نے ذرا غور کیا اور بولے کہ ہم دونوں طرف کے علاقوں کو علاحدہ کرنے کا سوال اٹھائیں گے۔ بغیر اس کے کانگریس قابو میں نہ آئے گی۔ میں نے کہا ابھی کئی دن ہوئے کہ بھائی پرمانند نے یہی اندیشہ ظاہر کیا تھا اور آپ نے جواب ٹھیک دیا تھا۔ اگر بارگیننگ یعنی سودے بازی کے لیے یہ مسئلہ لیگ کا کریڈ یعنی اصولی مانگ بنا کر اٹھایا جائے تو پھر ہٹنا مشکل ہوگا۔ مسٹر جناح نے کہا کہ ہم کانگریس کا ردعمل دیکھیں گے۔ اس پر یہ معاملہ ختم ہوگیا۔ چوں کہ یہ کھانے کی میز کی گفتگو تھی۔''(۱)

قراردادِ لاہور پر پہلا ردعمل:

قرارداد لاہور پر پہلا ردعمل مسٹر محمد علی جناح کے سیکریٹری مرزا راشد علی بیگ کا آیا انھوں نے جناح صاحب کے ساتھ ان کے سیکریٹری کی حیثیت سے کام کرنے سے انکار کردیا۔ مسٹر بیگ نے ۱۹۳۴ء سے ۱۹۴۰ء تک تقریباً چھ برس کام کیا تھا۔ ان کی رائے کے مطابق جولائی ۱۹۴۶ء کے پہلے ہفتے تک جناح صاحب کے رویے میں ایک لچک تھی اور وہ ایک کم زور مرکز کے ساتھ متحدہ ہندستان کو قبول کر سکتے تھے۔ ۷رجولائی کو لیگ کونسل نے وزارتی مشن پلان کو منظور کرلیا تھا۔ لیکن ابھی ایک ہفتہ نہیں گزرا تھا کہ پنڈت جواہر لال نہرو کے ایک بیان سے متاثر ہو کر جناح صاحب نے پلان کی منظوری واپس لے لی اور اپنے مطالبۂ پاکستان پر لوٹ گئے۔ ذیل کے اقتباس کی آخری سطروں میں بیگ صاحب نے اسی طرف اشارہ کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''کیا میں نے استعفاء دینے میں کچھ جلد بازی کی؟ یہ سوال میں نے اپنے آپ

(۱) نامۂ اعمال، ص۲۶-۲۵۷

سے کئی بار پوچھا ہے۔ ایک انگریز ''پنڈرال مون'' نے، جو پنجاب کے مسلمان لیڈروں سے کافی قریب اور ان کا معتمد تھا، اپنی کتاب ''ڈوائڈ اینڈ کویٹ'' میں لکھا ہے:

''نجی طور سے جناح نے لاہور میں ایک دو لوگوں سے کہا کہ یہ ریزولیوشن محض ایک شاطرانہ چال ہے اور یہ امر کہ وہ چھ برس بعد تقسیم سے کچھ کم پر بھی راضی نظر آتا تھا۔ یہ ظاہر کرتا ہے کہ ۱۹۴۰ء میں وہ حقیقتاً اس مسئلے میں پر آخری فیصلہ کن موڑ پر نہیں پہنچے تھے۔ اس لیے ایک حد تک یہ ایک شاطرانہ چال بھی ہو سکتی تھی جس کا مقصد کانگریس سے ایسی رعایتیں حاصل کرنا ہو جو پارٹنر شپ کو گوارا بنا دیں۔ یہ امر واقعہ ہے کہ ریزولیوشن کے نتائج پر مجوزہ آزاد ریاستوں کی ہیئت ترکیبی پر، اور ان کے باہمی روابط کے بارے میں، اس مرحلے پر پوری طرح غور وخوض قطعی نہیں کیا گیا تھا۔ ان میں بعض امور بعد میں صاف ہوئے لیکن جناح صاحب پاکستان کے واقعی خدوخال کی وضاحت دینے کے سلسلے میں بہت زیادہ مشتاق نہیں رہتے تھے۔ حتیٰ کہ ۱۹۴۷ء تک بھی اس بارے میں کچھ شکوک رہے کہ بالآخر جناح صاحب اپنے تصورات کو عملی جامے میں کس انداز پر دیکھنا پسند کریں گے''۔

مون کا اس نتیجے پر پہنچنا کہ قوی امکان ہے کہ ریزولیوشن محض سودا بازی کے نقطۂ نظر سے منظور کیا گیا ہو، اس میں ان بیانات سے خاصی مطابقت ہے جو لاہور سے واپسی پر لیگی دوستوں نے میرے سامنے رکھے۔ ''تم بھی عجیب عقل مند آدمی ہو جو ریزولیوشن پر سنجیدگی سے غور کرنے بیٹھ گئے۔ ان لوگوں نے مجھ سے کہا۔ تمھیں یہ نہیں معلوم کہ ہندو تو بنیے ہیں اور بنیا صرف یہی زبان سمجھ سکتا ہے''۔ اور خود جناح صاحب! ان کے مقصد کی غیر لچک داری اور ارادے کی پختگی وغیرہ کے بارے میں بہت کچھ لکھا جاتا رہا ہے، لیکن ۱۹۴۶ء کی جولائی کے پہلے ہفتے تک کی صورت حال یہ تھی کہ وہ ایک غیر متحدہ مرکز (یونین سینٹر) قبول

کرنے کے لیے پوری طرح آمادہ تھے۔ آخری فیصلہ تو جولائی (۱۹۴۶ء) ہی کے دوسرے ہفتے میں انھوں نے کیا کہ پاکستان سے کم اب کچھ بھی نہیں! اور اس کے اسباب تھے جن پر پھر گفتگو ہوگی''۔ (۱)

☆ ''پاکستان جناح کے لیے سودے بازی کی جگہ تھی، جہاں وہ کانگریس سے حساب برابر کرنا اور اُس کے لیڈروں کو زمین چٹانا چاہتے تھے۔ ان لیڈروں نے اُن کی واحد نمایندگی پر سوال اٹھائے تھے اور سیاسی طور پر اُن کو ختم کرنے کی کوشش کی تھی۔ پنجاب کے مسلمان لیڈروں کے معتمد پینڈریل مون اپنی کتاب ''تقسیم کرو اور چلے جاؤ'' (انگریزی) میں رقم طراز ہیں کہ جناح نے ایک یا دو لوگوں کو لاہور میں پرائیویٹ طور پر بتایا تھا کہ پاکستان کا ریزولیوشن ایک ''حکمتِ عملی کی چال تھی اور سچائی اتنی ہے کہ چھ سال بعد تقسیم کے بدلے وہ بہت کم پر سودا کرنے کو تیار تھے اور ۱۹۴۶ء میں وہ پاکستان کے لیے اتنے پابند نہیں تھے کہ اُس کو چھوڑا نہیں جاسکتا تھا''۔ (۲)

☆ ''۲۸/ اگست ۱۹۴۲ء کو کانجی دوار کا داس نے جناح سے ۹۰ منٹ کی ملاقات کے بعد یہی رائے قایم کی کہ ''جناح پاکستان کے لیے نہیں سوچ رہے تھے۔ جناح نے تصور میں بھی نہ سوچا تھا کہ کبھی پاکستان وجود میں آئے گا''۔ (۳)

مسٹر محمد علی جناح کی اس طرز سیاست کو مدبرانہ سیاست کا نام نہیں دیا جاسکتا۔ انتقامی سیاست کی شکل ہے۔ کسی بات کے اثبات کے لیے دلیل اور معقول جواب سے معذور اور کھسیا جانے کی علامت ہے۔ ان کا یہ اندازِ فکر اور طرزِ عمل بعد کی ان کی پوری سیاست پر چھایا ہوا نظر آتا ہے۔ یہ ان کی مدبرانہ سیاست اور ایک سیاست داں کے متحملانہ رویے کی مثال نہیں! جیسا کہ اس سلسلۂ بحث کے مختلف اظہارات و بیان سے ثابت ہوجاتا ہے۔

☆ کانجی دوار کا داس نے جناح سے جب پاکستان کی تفصیلات کے متعلق سوال کیا تو

---

(۱) محمد علی جناح: مرزا راشد علی بیگ، خدا بخش لائبریری جرنل، شمارہ ۱۰۳، ۱۹۹۶ء، ص ۲۲، ۲۳

(۲) Divide and Quit: P.21

(۳) Tow Years to Freedom. P.78

انھوں نے لجاجت آمیز لہجے میں جواب دیا:

''عزیزی کانجی! میں نے کانگریس سے دوستی کا ایک نہایت مختصر اظہار مانگا تھا۔ جو مجھے نہیں ملا۔ اگر کانگریس اظہار کرتی تو کسی بھی مسئلے کا حل مشکل نہیں ہوتا''۔

بہ قول کانجی جناح کانگریس سے معقول شرایط پر معاملات طے کرنا چاہتے تھے۔ لیکن کانگریسی لیڈر جیل میں تھے۔ کانجی مزید لکھتے ہیں:

''اگر جناح پاکستان چاہتے اور ان کو اپنی جیت کا یقین ہوتا تو ۱۹۴۰ء کے اوایل میں اپنے پرانے مکان پر نئے سرے سے تعمیر پر لاکھوں روپے کیوں خرچ کرتے!''(۱)

☆ اپنے پرانے (بمبئی والے) مکان کی تعمیر اشارہ کرتی ہے کہ وہ جانتے تھے کہ ان کی پاکستان کی مانگ نہیں مانی جائے گی۔ نومبر ۱۹۴۵ء تک وہ نہیں جانتے تھے کہ انھیں ممبئی چھوڑ کر کراچی میں آباد ہونا پڑے گا۔ ۵رنومبر ۱۹۴۵ء کو کانجی سے ایک دلچسپ ملاقات ہوئی۔ میں نے ان سے پوچھا کہ کیا انھیں علم ہے کہ موتی لال سیتلواد نے قانون ساز اسمبلی کے لیے بمبئی کی دو میں سے ایک سیٹ پر الیکشن لڑنے کا کانگریس کا دعوت نامہ قبول کرلیا تھا۔ (موتی لال سیتلواد ابھی حال ہی تک ہندستان کے اٹارنی جنرل تھے۔'' لیکن پیشکش واپس لے لی گئی کیوں کہ انھوں نے کانگریس کی رکنیت کے لیے آمادگی ظاہر نہیں کی تھی۔ جناح نے بتایا کہ وہ اس کے بارے میں جانتے ہیں اور اضافہ کیا کہ ''موتی لال کے ساتھ کام کر کے خوشی ہوتی۔'' اس سے مزید اس یقین کو تقویت ملتی ہے کہ ''جناح پاکستان کے بارے میں سنجیدہ نہیں تھے۔''

☆ جناح ہندستان چھوڑنے کے متعلق نہیں سوچ رہے تھے کیوں کہ اپنی وصیت (۳۰ مئی ۱۹۳۹ء) میں کافی بڑی رقم علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے لیے، پچاس ہزار ممبئی یونیورسٹی کے لیے، پچیس پچیس ہزار روپے ممبئی کی انجمن اسلام اسکول اور دہلی کے اینگلو عربک اسکول کے لیے وصیت کیے تھے۔ اس عرصے میں انھوں نے وصیت میں کوئی تبدیلی نہیں کی''۔

(۱) کانجی دوارکاداس، ٹین ایرس ٹو فریڈم: بمبئی، ۱۹۶۸ء، ص ۱۴۸

☆ ''یہاں تک کہ ۱۹۴۵ء کے خاتمے تک اُن کے ذہن میں پاکستان بننے کا خیال تک نہ تھا۔

ستمبر ۱۹۴۵ء میں کراچی کی پریس کانفرنس میں ایک مسلمان صحافی کے بار بار پوچھنے پر انھوں نے کہا ''پاکستان نظریے کی تعریف اور تشریح کرنے سے قبل میں اس کا مطالعہ کرنا چاہتا ہوں''

☆ ''سر آغا خان بھی اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ ''میں خود اس پر یقین رکھتا ہوں کہ ۱۹۴۶ء کے آخر تک جناح کے ذہن میں اپنے نصب العین کی کوئی واضح صاف اور مکمل تصویر نہیں تھی''۔

☆ راج گوپال آچاری نے گاندھی جی کے اشارے پر پاکستان کی واضح تصویر کشی کی۔ انھوں نے اخبار سوراج میں لکھا کہ ''جناح حقیقت میں پاکستان کے متمنی نہیں تھے۔''

☆ ایسا لگتا ہے کہ اپنے بُنے ہوئے جال سے نکلنے کے لیے وہ کسی باعزت راستے کی تلاش میں تھے۔ ۲۴ر اپریل ۱۹۴۳ء کو گاندھی جی نے جیل سے جناح کو ایک خط لکھا لیکن انگریز دونوں میں صلح صفائی نہیں چاہتے تھے۔ جب جناح کو اس کے بارے میں پتا چلا تو انھوں نے مسلم لیگ کے دہلی اجلاس میں کہا:

''اگر مسٹر گاندھی مسلم لیگ سے کوئی سمجھوتا کرنا چاہتے ہیں تو مجھ سے زیادہ کوئی اور اس کو خوش آمدید نہیں کہے گا۔ میں ان کو بتانا چاہتا ہوں کہ یہ ہندو اور مسلمانوں کے لیے عظیم ترین دن ہوگا۔ اگر مسٹر گاندھی کی یہی خواہش ہے تو مجھے براہِ راست لکھنے سے انھیں کیا چیز روک رہی ہے؟ وایسرائے کے پاس جانے کا کیا فایدہ؟''(۱)

علامہ مشرقی کی سیاست:

☆ ''مسلم علاحدگی پسند عناصر جناح صاحب کی نیت پر شبہ کرتے تھے۔ وہ پاکستان کی مانگ سے ان کے پھر جانے کا خطرہ محسوس کرتے تھے۔ انھوں نے ان کو دھمکی دی۔ ۲۷ر جون ۱۹۴۳ء کو حیدر آباد منطقہ کے خاکسار تحریک کے سالار اعلا محمد احمد نے جناح کو دھمکی

(۱) پیپس انٹو پاکستان: ایم ایس ایم شرما، پٹنہ، ۱۹۵۴ء، ص ۱۲-۱۱۱

بھرے خط میں کہا:

''اگر آپ نے گاندھی جی سے بات کی تو ہم میں سے کچھ لوگ اپنی جانوں کی پروا نہ کرتے ہوئے آپ جیسے لوگوں کو اپنی گولیوں کا نشانہ بنانے سے نہ چوکیں گے۔ کیوں کہ آپ میں لیڈر بننے کی خواہش تو ہے مگر لوگوں کی بھلائی و بہبودی کا خیال نہیں۔''

☆ ''علامہ مشرقی خاک سار تحریک کے لیڈر نے ۱۲ر جون ۱۹۴۳ء کو اپنے پیروکاروں سے کہا کہ پاکستان کے قیام میں جناح سب سے بڑی رکاوٹ ہیں۔ وہ ان (جناح) پر گاندھی جی سے ملنے کے لیے دباؤ ڈالیں اور وہ (جناح) ان (گاندھی جی) کو پاکستان کا مطالبہ تسلیم کرنے کے لیے راضی کریں۔''(۱)

کیبنٹ مشن کی آمد:

☆ جناح کانگریس سے فیصلہ کرنا چاہتے تھے۔ رام کرشن ڈالمیا'' کچھ اقتباسات اور یادیں۔'' (انگریزی) میں لکھتے ہیں:

''کیبنٹ مشن کی ہمارے ملک میں آمد پر جناح صاحب کانگریس کے کسی ذمے دار لیڈر سے میرے مکان پر ملاقات کے لیے تیار ہوگئے۔ وہ چاہتے تھے کہ صوبوں کو اندرونی خودمختاری ملے اور مرکز کے پاس تین اہم شعبے دفاع، رسل ورسایل اور خارجہ رہیں۔ ان شرایط کی بنیاد پر وہ فرقہ وارانہ مسئلے پر بات چیت اور اس کے حتمی فیصلے کے لیے راضی تھے۔''

''راجندر بابو سے طویل بات چیت کے دوران میں نے ان سے درخواست کی کہ وہ پنڈت جی اور سردار پٹیل سے جن سے میں مل چکا تھا۔ مشورہ کرلیں لیکن اچانک ایک دن کسی اخبار میں پڑھا کہ ڈالمیا کی گفتگو کی اہمیت نہیں ہے۔''(۲)

---

(۱) پولیٹیکل کنسپا یریسیز اِن پاکستان، جمنا داس اختر، دہلی، بحوالہ سیکولر اور وطن پرست جناح: ص ۲۸۲

(۲) بہ حوالہ، سیکولر اور وطن پرست جناح: ص ۸۳-۲۸۲

☆ جناح کی سیاست کے سبب فرقہ پرستی کا جن بوتل سے باہر آ گیا تھا اور اب اسے واپس بوتل میں قید کرنا ممکن نہیں تھا۔ برائن لیپنگ کے بہ قول جناح پاکستان نہیں چاہتے تھے، وہ اپنی کتاب ''سامراج کا خاتمہ'' (انگریزی) میں لکھتے ہیں:

''انھوں نے تصور پاکستان کو نعرہ بنا کر عوامی حمایت حاصل کرنے کے لیے استعمال کیا۔ وہ ہندستان کے مستقبل کی جن اسکیموں سے اتفاق نہیں کرتے تھے، پاکستان کے خیال کو انھیں رَد کرنے کے لیے استعمال کیا۔ جب صاف طور پر انھیں لگا کہ برطانیہ نے چلے جانے کا فیصلہ کرلیا ہے تو انھوں نے کڑی سودے بازی ترک کردی تا کہ مسلم لیگ کو مسلم اکثریتی علاقوں میں اختیارات مل سکیں اور ہندستان کی مستقبل کی حکومت میں ان کو اعلیٰ مقام حاصل ہو جائے۔'' جناح نے کیبنٹ مشن کی اسکیم کو مان لیا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ متحدہ ہندستان میں ایک اہم رول کی تلاش میں تھے، نہ کہ پاکستان نام کی علاحدہ اسلامی ریاست کا قیام'' اس لیے جناح، لیاقت علی خاں اور ان کی مسلم لیگ نے پاکستان کی مانگ چھوڑ دی اور شاید جناح دل سے پاکستان نہیں چاہتے تھے۔

کانگریس اور پاکستان:

پاکستان بنانے کا فیصلہ کن عزم جناح نے نہیں بلکہ کانگریسی لیڈروں نے اٹھایا تھا۔ انھوں نے جلد ہی محسوس کرلیا کہ کیبنٹ مشن کی اسکیم تسلیم کر کے جناح نے لڑائی جیت لی ہے۔ اور مجوزہ اختیارات کی تقسیم میں غیر متناسب بڑے حصے کے ساتھ کمزور مرکز بھی قبول کرلیا ہے۔ جناح کے رہتے ہوئے متحدہ ہندستان پر اثر پذیر حکومت کرنے کا ان (کانگریسی لیڈروں) کا خواب شرمندہ تعبیر نہیں ہوسکتا تھا۔''(۱)

''کیبنٹ مشن اسکیم تسلیم کرنے سے جناح کا مقصد پورا ہوتا تھا'' جمنا داس کے بہ قول:

☆ ''۱۹۴۷ء میں بھی، ان کو یقین نہیں تھا کہ کانگریس کبھی تقسیم ہند کو مان لے گی۔''

☆ جناح کو کیبنٹ مشن تجاویز کے بہانے قدم پیچھے ہٹانے کا موقع ملا تھا۔ مسلم لیگ کونسل میں کیبنٹ مشن کی تجاویز کو مان لیا گیا تھا اور پاکستان کے مطالبے کو واپس لے لیا گیا

---

(۱) اینڈ آف ایمپایر: ۱۹۸۵ء، ص ۶۶، بحوالہ سیکولر اور وطن پرست جناح: ص ۲۸۳

تھا۔ جناح نے اعلان کیا تھا کہ ''کیبنٹ مشن تجاویز کو تسلیم کر کے انھوں نے ''پوری طرح بااختیار آزاد ریاست پاکستان کی قربانی دی ہے۔'' کانگریس نے منصوبے کو رد کر دیا اور گاندھی جی نے اسے مطالبۂ پاکستان تسلیم کر لینے سے بھی زیادہ بُرا قرار دیا۔ اس طرح یہ منصوبہ ترک ہو گیا۔ سی۔ ایچ۔ سیتلواد، مجاہد آزادی اور تقسیم ہند کے عینی گواہ، ملک کی تقسیم کے لیے کانگریس کو ذمے دار قرار دیتے ہیں۔ وہ ''ہندستان تقسیم ہو گیا۔'' (انگریزی) میں لکھتے ہیں:

''اس روشن سچائی کو چھپانے کی کوشش فضول ہے کہ حالات کے دباؤ نے کانگریس کو ہندستان کی تقسیم ماننے پر مجبور کیا تھا اور کانگریس نے ہونی کے سامنے سر جھکا دیا تھا۔ حالات خود کانگریس کے پیدا کردہ تھے اور جس سے ایک مرتبہ بچا جا سکتا تھا اس کو کانگریس نے اپنے کرتوت کی بنا پر ہونی بنا لیا تھا۔ متحدہ ہندستان کا پیارا، تحفہ ان کی گود میں تھا لیکن اپنی سیاسی کج فہمی کے سبب انھوں نے اسے پھینک کر اپنی پہنچ سے دور کر دیا۔... مسلم لیگ نے کیبنٹ مشن کی متحدہ ہند اسکیم کے دونوں حصوں کو مان لیا تھا لیکن کانگریس نے سودا کرنے کے سنہری موقع کو کھو دیا۔''(۱)

☆ راج موہن گاندھی کہتے ہیں:

''پاکستان جناح کا بے لچک مقصد نہیں تھا۔ اگر کانگریس کیبنٹ مشن کے منصوبے پر مدبرانہ غور کرتی تو پاکستان وجود میں نہ آتا۔

☆ ایچ۔ ایم۔ سیروائی بھی اس خیال سے اتفاق کرتے ہیں، وہ کہتے ہیں:

''دلایل سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ کانگریس تقسیم چاہتی تھی۔ جناح تقسیم کے خلاف تھے۔ انھوں نے بہترین ترجیحات میں اسے دوسرے نمبر پر رکھا تھا۔ جناح کانگریس کے ساتھ کسی مفاہمت پر پہنچنا چاہتے تھے۔

☆ ۱۹۴۳ء میں انھوں نے فیصلہ کیا تھا کہ اگر گاندھی جی سے مفاہمت نہیں ہوتی، تو ان

(۱) انڈیا ڈیوائیڈڈ: بحوالہ سیکولر اور وطن پرست جناح: ص ۲۸۴

کو کم از کم وی۔ ڈی۔ ساورکر سے بات کرنی چاہیے۔ وہ سمجھوتے کے لیے بے انتہا کوشاں تھے۔ انھوں نے ہندو مہاسبھا کے لیڈر ساورکر سے خفیہ تعلق قایم کیا اور اس کے لیے حکومت ہند میں وزیر صحت ڈاکٹر ہیمن داس ودھوانی سے رسائی کی۔ جناح کے قریبی صحافی ایم۔ ایس۔ ایم۔ شرما کو اس کی بھنک ملی۔ انھوں نے اس مجوزہ ملاقات کے بارے میں جناح سے دریافت کیا اور کہا کہ اس اہم خبر کو وہ "دی ڈیلی کراچی گزٹ" کی دوسرے دن کی اشاعت میں دینے جا رہے ہیں۔ جناح نے ایم۔ ایس۔ ایم۔ شرما سے اسے شایع نہ کرنے کی درخواست کی اور اسی وقت یہ بھی کہا۔ لیکن آپ کو یہ صلاح دینے کی آزادی ہے کہ "حالات کا دوبارہ جایزہ لینے کے لیے میری اور ساورکر کی ملاقات ملک میں بحالی امن کے مفاد میں ہے۔"

میٹنگ جناح کے مکان مالابار ہل پر ہونی طے ہوئی لیکن اسی دن یعنی ۲۶ر جولائی ۱۹۴۳ء کو جب جناح ساورکر کے استقبال کی تیاری میں مصروف تھے خاک سار پارٹی کے جان باز دستہ کا عمر رفیق صابر مزنگوی ایک تیز دھار چھرا لے کر جناح کو قتل کرنے کی نیت سے آن پہنچا۔ جناح حملے سے بچ گئے لیکن کچھ زخم آئے۔ اس حملے نے جناح اور ساورکر دونوں کو سہما دیا اور ملاقات نہ ہو سکی۔

سری پرکاش لکھتے ہیں:

☆ پاکستان کا مطالبہ محض سودے بازی تھا، تا کہ غیر منقسم ہندستان میں مسلمانوں کو مزید حقوق و مراعات حاصل ہو جائیں۔ ایک انگریز اخبار نویس نے جو ایک مشہور انگریزی اخبار کا نمایندہ کراچی میں تھا، خود مجھ سے کہا کہ "پاکستان بن جانے سے مسٹر جناح کو ایک دھکا لگا۔ درحقیقت وہ قیام پاکستان نہیں چاہتے تھے اور جب پاکستان بن گیا تو وہ نہیں جانتے تھے کہ کیا کریں۔ اس کے انتظام میں انھیں بڑی دقتوں کا سامنا تھا۔"(۱)

☆ برطانوی حکومت کے خفیہ ریکارڈ میں بھی ایسا ہی درج ہے۔ سرکاری ہیڈ کوارٹر میں خفیہ محکمے کے ڈایریکٹر نے اپنی تفصیلی رپورٹ میں اس رائے کا اظہار کیا:

---

(۱) پاکستان قیام اور ابتدائی حالات: ص ۵۶۔ ۵۵۔ نیز دیکھیے ص ۱۳۶

''جناح کا حقیقت میں پاکستان بنانے کا ارادہ نہیں ہے۔ انھوں نے کانگریس سے مراعات حاصل کرنے کے لیے اسے پروپیگنڈا ہتھیار کی صورت میں استعمال کیا ہے۔''

☆ لارڈ ماؤنٹ بیٹن بھی اس کی تائید کرتے ہیں وہ اپنی ریکارڈ شدہ گفتگو میں کہتے ہیں۔

''وہ مجھے اس آدمی کی یاد دلاتے ہیں جس نے اپنی اسکیم کے کسی ایک آئیٹم کی میکانکی صلاحیت کے بارے میں غور نہیں کیا۔ ان کو زوردار جھٹکا اس وقت لگے گا جب وہ نیچے زمین پر آئیں گے۔''(۱)

کانگریس کا تقسیم قبول کرنا جناح کے لیے ایک زبردست جھٹکا تھا۔ ان کی زبان بند ہوگئی اور جب لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے ان سے پوچھا تو انھوں نے تائید میں سر ہلا دیا۔ وہ اپنی سیاست کا خود شکار ہوگئے۔ کہا جاتا ہے کہ تقسیم منظور کرنے کے بعد وہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن سے ملے اور کہا کہ

''وہ پاکستان نہیں چاہتے۔ وہ متحدہ ہند میں کانگریس اور برطانوی حکومت سے باعزت معاملات طے کرنا چاہتے ہیں''۔

لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے جناح کو جھڑک دیا اور کہا کہ متبادل کے لیے بہت دیر ہوچکی ہے''!(۲)

☆ جے این ساہنی کے بہ قول:

''جناح نے ماؤنٹ بیٹن کو اس بے عزتی کے لیے معاف نہیں کیا۔ شاید اسی واقعے کی وجہ سے وہ ماؤنٹ بیٹن کو ہندستان اور پاکستان کے مشترکہ گورنر جنرل کی حیثیت میں لینے کے لیے تیار نہیں ہوئے بلکہ خود پاکستان کا گورنر جنرل بننے کا فیصلہ کیا۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے برطانوی سرکار کو یقین دلایا تھا کہ جناح مشترکہ گورنر جنرل بنائے جانے پر تیار ہو جائیں

(۱) دی گریڈ ڈیوایڈ: ایچ وی ہڈسن، کراچی، ۱۹۶۹ء، ص ۲۲۹

(۲) پیپس انٹو پاکستان: ایم ایس ایم شرما، ص ۱۴۷

گے اور وہ ایمان داری کے ساتھ ایسا سوچتے بھی تھے۔ مگر جناح کا فیصلہ ان کی ذاتی بے عزتی تھا۔ صرف اتنا ہی نہیں وہ ماؤنٹ بیٹن اور ان کی بیوی لیڈی ایڈوینا کے استقبال کے لیے کراچی ہوائی اڈے پر بھی نہیں گئے، جب وہ برطانوی حکومت کے خاتمے کا شاہی اعلان کرنے اور پاکستان کے نئے گورنر جنرل کو حلف دلانے کراچی پہنچے تھے۔ جناح پیچھے نہیں ہٹ سکتے تھے اور اس طرح پاکستان بن گیا۔ مغرور جناح عوام کے سامنے اس عظیم غلطی کو تسلیم بھی نہیں کر سکتے تھے۔''(۱)

☆ جناح کے ہم عصر اور ریڈیکل ڈیموکریٹک لیگ کے لیڈر ایم۔ این۔ رائے کی رائے کو ڈاکٹر اجیت جاوید نے ان کی کتاب Men Imet کے حوالے سے نقل کیا ہے:

''محمد علی جناح کو سب سے زیادہ بدنام اور مقہور کیا گیا۔ اس تجربے سے وہ دکھی و برہم تھے اور عناد کے اس احساس کے پیش نظر انھوں نے ایک ایسے مقصد کو حاصل کرنے کی کوشش کی جس کے حصول کے بعد ان کی پوزیشن بہت مشکل ہوگئی۔ جناح خواب دیکھنے والوں کے معنی میں آدرش وادی نہیں تھے۔ وہ عملی شخص تھے جن کو بہت زیادہ تیز ذہن اور اوسط سے زیادہ ذہانت عطا ہوئی تھی۔ ایسا شخص اپنی غیر متوقع کامیابی کے جلو میں آنے والی مشکلات کو ان دیکھی نہیں کر سکتا۔ اپنی زندگی کے آخری دور میں سیاست ان کے لیے جوا تھی اور کیوں کہ وہ پوکر کے کھیل میں بڑی رقموں کو داؤ پر لگا چکے تھے۔ اس لیے اب وہ پیچھے ہٹ نہیں سکے تھے۔ ان کو قدرتاً تلخ انجام تک پہنچنا ہی تھا۔ تلخ اس لیے کہ کامیابی کے بھوت نے جب وہ امکان کے پاس پہنچا ہو تو شاید ان کو خوف زدہ کر دیا ہوگا۔ لیکن پیچھے ہٹنے میں بہت دیر ہو چکی تھی۔ یہ اس آدمی کا معاملہ ہے جو طاقت کی سیاست میں اس طرح الجھ گیا ہو کہ پھر اس سے باہر نہیں نکل سکتا اور حیرانی اس بات پر ہے کہ طاقت کی سیاست کی شروعات میں اس کے دل میں اس کے لیے کوئی لالچ نہیں تھا۔''

(۱) The Lid off. p.290

وہ آگے لکھتے ہیں:

''حقیقت میں مسلمانوں کے لیے ہوم لینڈ ایک سنہرا خواب تھا۔کوئی بھی علاقائی تقسیم ان میں سے کروڑوں کو نازک پوزیشن میں ضرور چھوڑ دیتی، جہاں ان کو اجنبی جانا جاتا۔ان کی وفاداری کو اس ملک کے لیے جہاں ان کو رہنا تھا مشتبہ مانا جاتا۔جناح جیسے ذہین آدمی کو اپنی مانگ کے ان الم ناک نتائج کے بارے میں پہلے سے غور کرنا چاہیے تھا۔اس لیے میں یقیناً ان آدمیوں میں سے ہوں جو یہ سوچتے ہیں کہ وہ حقیقتاً ہندستان کی تقسیم نہیں چاہتے تھے۔جواری کے مانند جس کو خود پر کچھ زیادہ ہی اعتماد ہو انھوں نے بڑا داؤں چل دیا۔ان کو یقین تھا کہ دوسری پارٹی ان کی شرایط پر سمجھوتا کرلے گی۔اگر ایسا ہوتا تو سب کے حق میں بہتر ہوتا۔لیکن دوسری پارٹی کا رویہ تھا، یا تو سب، یا کچھ نہیں! جناح کو بہ مجبوری کامیابی کی دوسری تلخ انتہا تک جانا پڑا جس سے وہ خوف زدہ تھے اور جس کو وہ جھیل نہ سکے۔''(۱)

☆ جناح نے اپنی ناخوشی، غصہ اور کرب کراچی کے اپنے چہیتے بڑے ہندو صنعت کار کے سامنے انڈیل دیا:

''دیکھو! میں نے یہ ناہنجار پاکستان کبھی نہیں چاہا تھا۔اس کو سردار پٹیل نے زبردستی میرے سر منڈھ دیا۔اور اب وہ چاہتے ہیں کہ میں بے عزتی کے ساتھ ہاتھ کھڑے کردوں اور ہار مان لوں۔''(۲)

---

(۱) سیکولر اور وطن پرست جناح: ص ۸۷۔۲۸۶

(۲) Some Nots and Reminiscences: سیٹھ رام کرشن ڈالمیا، ممبئی، ۱۹۴۸ء، بحوالہ: سیکولر اور وطن پرست جناح: ص ۲۸۷

باب: ۲

نئی قومی اسمبلی اور عبوری حکومت میں لیگ کی شرکت

بالآخر کئی وضاحتوں اور شرطوں کے بعد طے پا گیا کہ مسلم لیگ نئی دستور ساز اسمبلی میں شریک ہوگی اور عارضی حکومت میں کانگریس سے تعاون کرے گی۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ

''وعدوں پر عمل نہیں ہوا۔ ۲۳/اکتوبر کو جناح نے وایسرائے سے ملاقات کی تو وہ بری طرح فرقہ واریت میں ڈوبے ہوئے تھے۔ وہ نہرو کے لیے بہت تلخ تھے جیسا کہ نہرو ان کے لیے تھے۔[۱] دراصل محکمہ جات کی تقسیم کے مسئلے پر شدید بحران تھا۔''

''نئی منتخب اسمبلی کا اجلاس ۲۹/اکتوبر ۱۹۴۶ء کو ہوا۔ پنڈت جواہر لال نہرو اور نواب زادہ لیاقت علی خاں اگلی سرکاری بنچوں پر ساتھ ساتھ بیٹھے ہوئے تھے لیکن دونوں تمام دن ایک دوسرے سے نہیں بولے۔ یہاں تک کہ ان کے چہروں پر خفیف سا تبسم بھی نمودار نہ ہوا۔ عدم اعتماد اور تخویف کا ماحول تھا۔''[۲]

نہرو کے خلاف ہنگامہ:

''پنڈت جواہر لال صوبہ سرحد اور قبایلی علاقوں کے دورے پر گئے تو مسلم لیگ نے وہاں ان کے خلاف زبردست احتجاجی مظاہرے کیے۔ ان پر خشت باری ہوئی اور پنڈت جی کو زخم بھی آئے۔ ڈاکٹر خان صاحب کی کابینہ کے بعض وزرا نے الزام لگایا کہ اس شرارت کے ذمے دار مقامی افسران ہیں۔ باچا خان کا کہنا ہے کہ یہ واقعات ان علاقوں میں پیش آئے جہاں کے پولیٹیکل ایجنٹ مسلمان تھے۔ جہاں ہندو پولیٹیکل ایجنٹ تھا اس علاقے میں کوئی ناخوش گوار واقعہ پیش نہیں آیا۔''[۳]

---

(۱) وایسرائز جونل: ص ۳۶۲

(۲) جناح آف پاکستان: وول پرٹ، ص ۲۹۴

(۳) آپ بیتی: باچا خان، ص ۱۰

جناح صاحب کا غیر مصالحانہ رویہ:

وایسرائے نے دستور ساز اسمبلی کا اجلاس ۹ر دسمبر کے لیے طلب کرلیا اور ممبروں کو ایجنڈا جاری کیا۔ ۲۲ر نومبر کو جناح نے اعلان کر دیا کہ مسلم لیگ کا کوئی نمایندہ دستوریہ کے اجلاس میں شریک نہیں ہوگا۔

وسط نومبر میں مسٹر جناح نے غیر ملکی اخبار نویسوں کو انٹرویو دیتے ہوے صاف کہہ دیا کہ ''ان کے خیال میں ہندستان کے فرقہ وارانہ مسئلے کا حل، پاکستان اور ہندستان، کا قیام ہے۔ اس کے علاوہ جو بھی انتظام ہوگا وہ مصنوعی اور غیر فطری ہوگا۔ عبوری مخلوط حکومت کے بارے میں سوال کا جواب دیتے ہوئے انھوں نے کہا مسلم لیگ کے وزرا وہاں پاسبان کے طور پر موجود ہیں جن کا کام مسلمانوں کے روزمرہ مفادات کی نگہداشت کرنا ہے۔

جب ان سے پوچھا گیا کہ آپ عبوری مخلوط حکومت کو چھوڑنے پر تیار ہیں تو انھوں نے جواب دیا: میں نے کہہ دیا ہے۔ ''یہ ہم پر مسلط کی گئی ہے۔ موجودہ انتظام کی میں تائید نہیں کرتا۔''(۱)

لندن سے بلاوا:

اس صورت حال کو دیکھتے ہوئے سیکریٹری آف اسٹیٹ نے وایسرائے کو فوراً لندن پہنچنے کے لیے کہا اور کانگریس اور لیگ کے دو دو نمایندوں کو ساتھ لانے کی ہدایت کی، تاکہ نئی صورت حال کو پیش نظر رکھ کر کوئی راستہ نکالا جاسکے۔ وایسرائے کی خواہش پر سکھوں کے نمایندے بلدیو سنگھ کو بھی ساتھ چلنے کی دعوت دی گئی۔ نہرو نے پہلے یہ دعوت نامنظور کر دی جب کہ جناح نے منظور کرلی۔ وزیر اعظم برطانیہ مسٹر ایٹلی نے نہرو سے بذریعہ تار ذاتی طور پر استدعا کی تو نہرو اور بلدیو سنگھ جانے پر رضامند ہوگئے۔ اب مسٹر جناح نے اپنا پہلا فیصلہ تبدیل کرلیا۔ نواب زادہ لیاقت علی خان وایسرائے کے ساتھ کراچی آئے تاکہ جناح کو منا سکیں اسی اثنا میں وزیر اعظم ایٹلی نے جناح کو بھی بذریعہ تار لندن آنے پر بااصرار کہا تو وہ آخری لمحات پر لندن جانے کے لیے جہاز پر سوار ہوگئے۔

---

(۱) روزنامہ ڈان، دہلی: ۱۵ر نومبر ۱۹۴۶ء

وزیراعظم برطانیہ مسٹر ایٹلی نے جناح اور لیاقت علی خان سے ملاقات کی جناح نے آئین ساز اسمبلی میں شمولیت کو بے سود قرار دیا انھوں نے پاکستان کو اپنا نصب العین قرار دیا۔ جو برطانوی دولتِ مشترکہ میں شامل ہوگا۔ انھوں نے کانگریس کے ساتھ کسی بھی معاہدے کے امکانات کو مسترد کر دیا۔

۷/اپریل کو ماؤنٹ بیٹن نے بہت کوشش کی کہ مسٹر جناح کابینہ مشن منصوبے پر رجوع کرلیں اور آئین ساز اسمبلی میں شامل ہوجائیں، لیکن وہ اپنے سابقہ موقف پر قایم رہے۔ (۱)

ان کے نزدیک ہندستان کو سرجیکل آپریشن کی ضرورت تھی اس کا اظہار انھوں نے ملاقات میں ماؤنٹ بیٹن سے کر دیا تھا۔ (ایضاً: ص ۳۹۔ ۱۳۸) ماؤنٹ بیٹن نے تقسیم ہند کے حق میں مسٹر جناح کے دلایل سن کر کہا تھا:

''ان کا اطلاق تو پنجاب اور بنگال کی تقسیم پر بھی ہوتا ہے''۔

ماؤنٹ بیٹن کا جواب سن کر جناح پریشان ہوگئے تھے اور کہا:

''یہ کانگریس کی گیدڑ بھبکی ہے (۲) میں اس سے مرعوب نہیں ہوں گا''۔ (۳)

دراصل مشن منصوبے کے استرداد اور آئین ساز اسمبلی میں مسلم لیگ کی عدم شمولیت پر کانگریس نالاں تھی۔ پنجاب کے خون ریز فرقہ وارانہ فسادات اس پر مستزاد تھے (۴) اب کانگریس کے نزدیک پنجاب اور بنگال کی تقسیم ناگزیر ہوگئی تھی۔

---

(۱) ٹرانسفر آف پاور: ج ۱۰، ص ۱۴۹

(۲) ایضاً: ص ۶۰۔ ۱۵۹

(۳) لیکن ثابت یہ ہوا کہ کانگریس نے جو تیر پھینکا تھا وہ نشانے پر لگا۔ جناح صاحب کے پاس اس کا کوئی تدارک نہ تھا۔

(۴) گورنر پنجاب ایون جینکنز نے وایسرائے کو لکھا تھا کہ پنجاب کے تقریباً سب اضلاع میں فرقہ وارانہ کشیدگی پائی جاتی ہے۔ لاہور۔ امرتسر۔ ملتان اور راولپنڈی کے بڑے شہر اس کے اہم مراکز ہیں۔ یہ وبا

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر......)

ماؤنٹ بیٹن پلان کی منظوری:

۳ / جون ۱۹۴۷ء کو ماؤنٹ بیٹن نے تقسیم ہند کا منصوبہ پیش کر دیا۔ جسے اس نے ہندستان کی رائے عامہ کے لیڈروں سے گفتگو اور مشورے کے بعد تیار کیا تھا اور اسے برطانوی قوم کی تائید حاصل تھی [1] اس منصوبے کے مطابق بنگال اور پنجاب کے ہندو اکثریتی علاقے ہندستان میں چلے گئے۔ صوبہ سرحد اور صوبہ آسام کے ضلع سلہٹ کے لیے استصواب رائے کی شرط عاید کی گئی کہ عوام کی رائے کے مطابق ان علاقوں کے مستقبل کا فیصلہ ہو۔ ماؤنٹ بیٹن جناح کی طبیعت سے واقف تھا اس نے حفظِ ماتقدم کے طور پر چرچل سے جناح کے نام ''ذاتی پیغام'' حاصل کرنے میں کامیابی حاصل کر لی۔ (اُس نے لکھا تھا:) ''اگر تم نے یہ پیش کش دونوں ہاتھوں سے قبول نہ کی تو یہ پاکستان کے لیے زندگی اور موت کا مسئلہ ہوگا''۔ ماؤنٹ بیٹن جانتا تھا کہ چرچل کے الفاظ کی جناح کے نزدیک بڑی قدر و منزلت ہے اور یہ مقام کسی اور کو حاصل نہیں۔ چرچل نے تقسیم کی راہ میں آخری رکاوٹ

دیہاتوں تک سرطان کی طرح پھیل رہی ہے اور کوئی موجودہ قوت اس پر قابو نہیں پا سکتی (جینکنز کا خط مورخہ ۱۰ / مارچ ۱۹۴۷ء۔ ٹرانسفر آف پاور، جلد ۹ صفحہ ۹۱۲) ۵ / مارچ کو برطانوی پارلیمنٹ میں ہندستان کی صورت حال پر بحث کرتے ہوئے کرپس نے اسے بدقسمتی سے تعبیر کیا تھا کہ عین اس وقت جب مسلم لیگ کراچی کے اجلاس میں آئین ساز اسمبلی میں شمولیت کے مسئلے پر نظر ثانی کرنے والی تھی، پنجاب میں فرقہ وارانہ فساد پھوٹ پڑا۔ (ہاؤس آف کامنز کی کارروائی۔ ۵ / مارچ ۱۹۴۷ء سیریز صفحہ ۵) سردار سورن سنگھ نے گورنر کو مطلع کر دیا کہ ان کی جماعت مسلم لیگ کے ساتھ مخلوط حکومت میں شامل ہونے کا ارادہ نہیں رکھتی۔ (جینکنز کا خط ویول کے نام ۳ / مارچ ۱۹۴۷ء) بحوالہ ٹرانسفر آف پاور، جلد ۹، صفحہ ۸۳۲) کانگریس اور اکالی پارٹی نے ۱۱ / مارچ ۱۹۴۷ء کو پورے پنجاب میں ''اینٹی پاکستان ڈے'' منانے کا اعلان کر دیا۔ (وول پرٹ، ص ۳۱۰)

(۱) نہرو کا خط ویول کے نام ۹ / مارچ ۱۹۴۷ء، ٹرانسفر آف پاور، جلد ۹، صفحہ ۹۰۰-۸۹۹) پنڈت جواہر

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر......)

کو بھی دور کر دیا[1] چناں چہ جب جناح نے پلان کی منظوری تحریری طور پر دینے سے انکار کیا تو وایسرائے نے کہہ دیا۔

''اگر آپ کا رویہ یہی ہے تب کانگریس اور سکھوں کے لیڈر قطعی قبولیت سے صبح کے اجلاس میں انکار کر دیں گے اس سے منصوبہ درہم برہم ہو جائے گا اور آپ اپنے پاکستان سے ہاتھ دھو بیٹھیں گے[2]

جناح نے یہ سن کر بظاہر کاندھوں کو جھٹکا، لیکن آخر کار ماؤنٹ بیٹن کے پیش کردہ طریقے پر اتفاق ہو گیا اور اگلے روز جناح نے سر کو ہلکی سی مثبت جنبش دے کر منصوبے کو منظور کر لیا۔

جناح صاحب اور تقسیم کے دلایل:

جب تقسیم ہند کے اصول طے پا گئے تو ان کا اطلاق پنجاب اور بنگال پر بھی ہونا تھا۔ مسٹر جناح آسام کا مسلم آبادی والا علاقہ تو ریفرینڈم کے ذریعے پاکستان میں شامل کرنے کے حق میں تھے، لیکن پنجاب اور بنگال کے ہندو اکثریتی علاقوں کو ہندستان کو دینے کے لیے تیار نہ تھے۔ اب ان میں یہ نئی تبدیلی رونما ہوئی تھی۔ چناں چہ ان کے حصول کے لیے انھوں نے ماؤنٹ بیٹن کو جو دلایل دیے وہ انتہائی حیران کن اور تعجب انگیز تھے اور دل چسپ پہلو یہ ہے کہ یہ دو قومی نظریے سے متصادم تھے اور ان کی اساس سیکولر تھی جو کانگریس ہندستان کو متحد رکھنے کے لیے پیش کرتی تھی۔ اس پر ماؤنٹ بیٹن کو بھی بڑی حیرت ہوئی اس نے جناح کی

لال نہرو نے ۱۸؍اپریل ۱۹۴۷ء کو آل انڈیا اسٹیٹس پیپلز کانفرنس میں تقریر کرتے ہوئے پیش کش کر دی تھی کہ مسلم لیگ اگر پاکستان چاہتی ہے تو لے سکتی ہے۔ بہ شرطے کہ وہ ہند کے ایسے علاقوں پر دعوے چھوڑ دے جو پاکستان میں شامل ہونا نہیں چاہتے۔'' اس وقت تو جناح صاحب نے یہ بات تسلیم نہیں کی تھی، لیکن بعد میں تقسیم کی بنیاد اسی پر ہوئی۔

(۱) ٹرانسفر آف پاور، ج ۱۰، ص ۹۴۵-۴۶ چرچل سے ماؤنٹ بیٹن کی ملاقات کا ریکارڈ ۲۲؍مئی ۱۹۴۷ء نیز دیکھیے: تحریک پاکستان اور انتقال اقتدار: مرتبہ محمد فاروق قریشی، ص ۶۱۷ و ۶۵۷

(۲) مشن ود ماؤنٹ بیٹن، ص ۳-۱۰۲

گفتگو سن کر کہا:

''آپ نے ہندستان کو متحد رکھنے کے لیے لاجواب دلایل فراہم کیے ہیں۔''(۱)

پنجاب اور بنگال کی تقسیم کا مسئلہ نیا تو نہیں تھا البتہ اس میں شدت اب اس لیے آ گئی تھی کہ ہندستان کی تقسیم ناگزیر ہو گئی تھی۔ ورنہ قراردادِ لاہور کے پیش نظر مسلم لیگ کو اس پر اعتراض کرنے کا کوئی حق نہیں پہنچتا تھا۔ چودھری خلیق الزمان نے تو تب ہی کہا تھا:

''ہم نے اپنے عرضی دعویٰ میں آدھا پنجاب اور آدھا بنگال چھوڑ دیا ہے''۔

مسٹر جناح انبالہ ڈویژن اور امرتسر تک کا علاقہ چھوڑ دینے کا عندیہ پہلے ہی دے چکے تھے۔ (۳-۲)

خلیق الزمان یہ بھی کہتے ہیں:

''مسلم لیگ کی طرف سے مکمل پاکستان کا مطالبہ ہی نہیں ہوا تھا۔''(۴)

چودھری صاحب سے پوچھا جانا ''چاہیے'' تھا کہ پھر انھوں نے پر جوش تائید کیوں اور کس چیز کی تھی!

---

(۱) فری ڈم ایٹ مڈ نائٹ: ص ۱۱۹، سرکاری رپورٹوں میں ''سر کی جنبش کا ذکر ہے۔ کیا اس کا کوئی اور ذریعہ بھی ہے کہ جناح صاحب نے واقعی سر کو جنبش دی بھی تھی!''

(۲) وایسرایز جرنل ص ۲۱۵۔

(۳) نوابزادہ لیاقت علی خان نے اکتوبر ۱۹۴۲ء میں ہندو مہاسبھا کے سیکرٹری راجہ مہاشیوادیال کے ساتھ انبالہ ڈویژن چھوڑ دینے کی حامی بھری تھی۔ اب صرف جالندھر ڈویژن کا مسئلہ باقی رہ گیا ہے، جس پر مسلم لیگ اور مہاسبھا کے درمیان مفاہمت ہوئی ہے، اس پر دونوں فرقوں کے درمیان معاملہ بغیر کسی مشکل کے طے پا جائے گا۔ اس میٹنگ میں مسلم لیگ اور مہاسبھا کے درمیان مرکز اور صوبوں میں مخلوط حکومت تشکیل دینے کے امکانات کا بھی جایزہ لیا گیا۔ (پاتھ وے ٹو پاکستان: ص ۲۸۶)

(۴) شاہراہِ پاکستان: ۱۰۵۲

باب: ۳

لیاقت علی خاں بہ مقابلہ جناح

مسٹر ماؤنٹ بیٹن ۲۳/مارچ ۱۹۴۷ء کو دہلی پہنچے تھے۔ ۲۴/مارچ کو انھوں نے برٹش دور کے آخری وائسرائے کی حیثیت سے حلف اٹھایا۔ انھوں نے پندرہ دنوں کے اندر جناح صاحب سے چند ملاقاتوں کے بعد ہی یہ بات اپنے ذہن میں بیٹھالی کہ جناح اپنے مزاج کی سختی اور فکر کی پختگی میں موڑی جانے والی شخصیت نہیں۔ ان کو متاثر کرنا اور ان سے ان کی مرضی کے خلاف کوئی بات منوالینا مشکل ہی نہیں ناممکن ہے۔ ۱۰/اپریل تک وہ ایک دوسری شخصیت کا انتخاب کر چکے تھے۔ یہ نواب زادہ لیاقت علی خاں تھے۔ ماؤنٹ بیٹن کے مطابق ان میں نرمی اور لوچ تھی۔ ۱۰/اپریل کو ان سے ملاقات میں وہ انھیں اعتماد میں لے چکے تھے اور یہ یقین حاصل کر لیا تھا کہ اگر ان سے جناح صاحب کے خلافت کوئی رازدارانہ بات کہی جائے تو وہ ہرگز جناح صاحب پر ظاہر نہیں کریں گے۔ اور خود ماؤنٹ بیٹن کی درخواست سے ظاہر ہوتا ہے کہ انھوں نے جو بعض باتیں کہی تھیں وہ ۱۹۴۷ء اگست تک ظاہر نہیں کی تھیں۔ لیکن ان کے بدلے ہوئے رویے کا اظہار قیام پاکستان کے بعد کے دنوں میں جناح صاحب پر ہو گیا تھا وہ ان سے نالاں ہو گئے تھے اور زیارت میں قیام کے دنوں میں جب لیاقت علی خاں جناح صاحب کی مزاج پرسی کے لیے گئے تو ان کی واپسی کے بعد جناح صاحب نے اپنی بہن فاطمہ جناح کے سامنے بے ساختہ یہ کہہ دیا کہ نواب زادہ یہ دیکھنے آئے تھے کہ وہ کتنے دنوں کے مہمان ہیں۔ پاکستان کے دنوں میں جن حالات نے جناح صاحب کو لاچار اور بے بس اور مجبور کر دیا تھا اس کی سب سے زیادہ ذمے داری لیاقت علی خاں پر آتی ہے۔ لیکن اس بحث کی یہاں ضرورت نہیں۔ قارئین کرام لیاقت علی خاں کے بارے میں ماؤنٹ بیٹن کی رائے پڑھیے اور سر دھنیے! مسٹر اسٹینلے وولپرٹ لکھتے ہیں:

''ماؤنٹ بین نے جناح کے مقابلے میں لیاقت علی خاں کو معاملات طے کرنے کے

لیے کہیں زیادہ آسان پایا، وہ اس طرح کہ وہ اپنی شائستگی اور معقولیت میں نہرو سے زیادہ ملتے جلتے تھے۔ انھوں نے ۱۰/اپریل کی رات دو گھنٹے تک لیاقت سے ملاقات کی اور انھیں اعتماد میں لے لیا![1]

۱۰/اپریل کی رات کو لیاقت علی خان سے دو گھنٹے تک ہونے والی ملاقات کی تفصیل محمد فاروق قریشی نے ٹرانسفر آف پاور میں ماؤنٹ بیٹن پیپرز کے حوالے سے اپنی کتاب تحریکِ پاکستان اور انتقالِ اقتدار میں درج کر دی ہے۔ یہ روداد ماؤنٹ بیٹن نے ۱۹/اپریل ۱۹۴۷ء کو ۴ بج کر ۱۰ منٹ تا ۶ بج کر ۱۰ منٹ کے دورانیے کی مرتب کر کے فایل میں شامل کی تھی۔ ملاحظہ ہو: ڈاکومنٹ نمبر ۱۷۸۔ وہ لکھتے ہیں:

''تب میں نے لیاقت علی خان سے کہا کہ اب میں اس پوزیشن میں ہوں کہ میں ان کو بتا سکوں کہ ہندستان کا مسئلہ حل کرنے کے بارے میں میں نے ذہنی طور پر کس طرح کام کرنے کی ابتدا کی ہے، لیکن میں ان کو اس کا خاکہ اسی صورت میں بتا سکتا ہوں اگر وہ میرے ساتھ وعدہ کریں کہ وہ میری پیشگی اجازت کے بغیر اس کو کسی پر ظاہر نہیں کریں گے۔ انھوں نے بلا تامل میری شرط قبول کر لی، لیکن انھوں نے استدعا کی اس کا ذکر مسٹر جناح سے کرنے کی اجازت ہونی چاہیے۔ میں نے جواب دیا: ''میری رضا مندی ہوگی تو سہی، لیکن اس وقت اور اس مرحلے پر نہیں البتہ بعد میں۔''

پھر میں نے ان کو سارے متبادل منصوبوں سے آگاہ کیا جن پر ہم غور و خوض کر چکے تھے۔ میں نے پاکستان کے قیام سے ابتدا کی اور ان کو بتایا کہ اس صورت میں پنجاب، بنگال اور آسام بھی مکمل طور پر تقسیم کی زد میں آئیں گے۔ میں نے ان سے کہا کہ مجھے اس میں شک نہیں ہے کہ ہندستان کے رہنما اور عوام ایسی ہیجانی کیفیت میں ہیں کہ وہ سب میرے تیار کردہ منصوبے کو منظور کر کے بہ خوشی خودکشی کے لیے تیار ہو جائیں گے۔ میری باتیں سن کر انھوں نے اپنا سر اثبات میں ہلایا، اور کہا: ''مجھے اندیشہ ہے کہ ہر کوئی اس منصوبے کو قبول

---

(۱) ماؤنٹ بیٹن، لیاقت علی خاں کے انٹرویو کا ریکارڈ: ۱۰/اپریل ۱۹۴۷ء، ٹرانسفر آف پاور، جلد نمبر۱۰، ص ۳۳۱-۳۳۲ بہ حوالہ جناح - بانی پاکستان (وولپرٹ)، ص ۳۲۰

کر لے گا کیوں کہ سب کی ذہنی کیفیت کچھ ایسی ہی ہو چکی ہے۔''

میں نے ان کو بتایا کہ میں یہ سلوک اسی صورت میں کرسکتا تھا اگر میں ہندستان کا دشمن ہوتا یا مجھے اس کے برے بھلے سے کوئی تعلق نہ ہوتا تو اہلِ ہند کی اس غیر معمولی ذہنی کیفیت سے فایدہ اٹھاتے ہوئے میں، ان پر ہندستان کو تقسیم کرنے کا منصوبہ مسلط کر دیتا اور اس طرح جون ۱۹۴۸ء میں یہاں سے رخصت ہونے سے پہلے پورے ملک کو انتہائی انتشار میں پھنسا دیتا۔

تب میں نے کابینہ مشن منصوبہ کا تذکرہ چھیڑا اور انھوں نے فوراً کہا کہ کابینہ مشن منصوبہ پر گفتگو کرنا بالکل بے سود ہے۔ لیگ کو ''کابینہ مشن'' کے الفاظ سے ہی چڑ ہے۔ میں نے ان سے پوچھا اگر میں ''ماؤنٹ بیٹن پلان'' تیار کروں جو کہ کم وبیش کابینہ مشن منصوبہ سے ملتا جلتا ہو تو کیا اس کے منظور کیے جانے کے بہتر مواقع ہیں؟ انھوں نے جواب دیا کہ مجھے یقین ہے کہ نفسیاتی طور پر فریقین میں اس کو قبول کرنے کے زیادہ امکانات ہیں بہ مقابلہ اس پلان کے جس کے ساتھ ''کابینہ مشن'' چپکا ہو۔

یہ روداد خاصی مفصل ہے، اس سے آگے وہ لکھتے ہیں:

میں نے ان سے کہا کہ ہمارے خیال کے مطابق ان کا لیڈر (مسٹر جناح) عملی اقدار سے بالکل ناآشنا تھا اور انھیں حقایق سے آشنا بنانے کے لیے ہم کو کتنی محنت کرنا پڑی۔

لیاقت نے یہ کہہ کر مجھ کو حیرت زدہ کر دیا: ''اگر آپ کا عملہ تقسیم کی صحیح اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی دشواریاں مسٹر جناح کے سامنے پیش کریں گے تو وہ ہر حال میں اس پر ضرور توجہ دیں گے کیوں کہ ان کو اس کا اندازہ نہیں ہوگا۔'' (ص ۳۲-۳۲۷)

اسٹینلے وول پرٹ لکھتے ہیں:

''لیاقت کے ساتھ اس گفتگو نے ہندستان کی المناک قسمت پر مہر لگا دی۔ لیاقت نے دکھ کے ساتھ یہ تسلیم کیا کہ جناح بھی اس تہری تقسیم کے منصوبے کو قبول کرلیں گے۔ ماؤنٹ بیٹن نے یہ جو کچھ کہا تھا اس میں وہ مخلص تھے، کیوں کہ ماؤنٹ بیٹن اتنی سمجھ رکھتے تھے کہ اندازہ کرسکیں کہ برصغیر کو جو مذہبی تفرقوں کا شکار تھا محاذ آرا قومی حصوں میں کاٹ دینے کے

کیا ہول ناک اثرات ہوں گے۔ بلاشبہ وہ ان خطرات اور پریشانیوں کو بہت اچھی طرح جانتے تھے جو فوج کو تقسیم کرنے، بیرونی دستوں کو اور غیر جانب دار لیڈروں کو واپس بلانے اور ملک کو جاہل، بدگمان، خوفزدہ اور توہم پرست عوام پر چھوڑ دینے سے ہوں گے، جب وہ خود لڑ بھڑ کر معاملات طے کرلیں گے۔ ایک دوسرے کو چیریں پھاڑیں گے اور اپنے خوف اور بدگمانی کا بدلہ پڑوسی گاؤں اور شہری علاقوں میں لیں گے۔ انھوں نے درحقیقت محسوس کرلیا تھا کہ ''بدترین خدمت جو میں ہندستان کی کرتا، اگر میں اس کا دشمن ہوتا یا اس کی قسمت سے مکمل طور پر لاتعلق ہوتا''، ٹھیک وہی تھی جو ان خوف ناک الفاظ کے کہنے کے چند ماہ بعد، انھیں کرنا تھی۔ وہ یہ کرنا نہیں چاہتے تھے۔ یقیناً اس کے بالکل مخالف تھے، وہ وہاں ہندستان کو بچانے، اس کے زخم بھرنے، تقسیم کی تلوار چلانے کی نہیں بلکہ امن کی پیش کش کرنے گئے تھے۔ وہ اور لیڈی ماؤنٹ بیٹن ہندستان اور ہندستانیوں سے محبت کرتے تھے۔ وہ اپنی زندگیاں داؤ پر لگانے کے لیے تیار تھے، اور انھوں نے حقیقتاً ایسا کیا بھی، روزانہ ان جذباتی، سیماب فطرت، زیادہ تر افلاس زدہ لوگوں کی خدمت کے لیے وقف ہو گئے تھے۔ اس کے سوا کوئی دوسرا حل بھی نہیں تھا۔

گاندھی کے ''پاگل منصوبے'' کی واحد دوسری صورت کا مطلب اس سرزمین اور ان تمام لوگوں کو جن سے ماؤنٹ بیٹن کو سب سے زیادہ محبت تھی، بشمول نہرو، جناح کے حوالے کر دینا ہوتا، جنھیں انھوں نے ''نفسیاتی مریض'' سمجھا تھا۔ اس کے لیے صرف تقسیم ہی مناسب حل رہ گیا تھا، لیکن پاکستان کا قیام اپنی دلیل کی بنیاد پر پیش کیے جانے والے مسئلے کی قطعی منطق کی رو سے پنجاب اور بنگال کی تقسیم کا بھی مطالبہ کرتا تھا۔ اس کے ''بہترین خادم'' نے، جسے برطانیہ نے شاید ہی کبھی ہندستان بھیجا ہو، جلد ہی خود کو ''بدترین خدمت میں جو وہ کرسکتا تھا''، انجام دیتے ہوئے پایا اور اس رات لیاقت کے جانے کے بعد، ماؤنٹ بیٹن نے یہ لکھتے ہوئے، اس امید سے تسلی حاصل کرنے کی کوشش کی، ''مجھے یہ تاثر ملا ہے کہ لیاقت علی خاں اس ''پاگل پاکستانی'' کے مقابلے میں ایک زیادہ معقول حل کی تلاش میں میری مدد کا ارادہ رکھتے ہیں''۔ ایک برطانوی صحافی نے جس نے اس وقت جناح سے

ملاقات کی تھی، وائسرائے کے ذاتی سیکریٹری کو ان کی ''انتہائی پریشان ذہنی کیفیت'' کی رپورٹ دی۔ جس کی وجہ سے جارج ایبل نے ماؤنٹ بیٹن کو یہ مشورہ دیا، ''یہ ممکن ہے کہ مسٹر جناح بیمار ہوں لیکن زیادہ قرینِ قیاس یہ ہے کہ وہ واقعات کے اثرات سے ذہنی طور پر حیرت میں ہیں''۔ ڈپٹی پرائیوٹ سیکریٹری آئن اسکاٹ نے بھی یہی تاثر لیا کہ مسٹر جناح بلاشبہ پیش آنے والے واقعات اور حالات کے تصور سے خاصی بڑی مشکل کا شکار ہو رہے ہیں۔ انھوں نے محسوس کیا کہ اس عمل کو اپنا وقت لینے دینا چاہیے، ایک نفسیاتی لمحہ ایسا بھی آئے گا جس میں اس کا فایدہ اٹھایا جاسکے گا۔''[۱] یہ تمام کی تمام خوش خیالیاں تھیں۔ ان میں سے کسی بھی ''ہوشیار'' حکمت عملی نے کام نہیں کیا۔''[۲]

نوٹ: اس صفحے پر ''نفسیاتی مریض'' اور ''پاگل پاکستانی'' دو جملوں کے موصوف علیہ ''مسٹر محمد علی جناح'' ہیں اور ''انتہائی پریشان کن ذہنی کیفیت'' کا مطلب بھی جناح صاحب کے مفروضہ و مبینہ ''ذہنی اختلال'' یا ''پاگل پن'' کی رپورٹ کی طرف ہے اور ''بہترین خادم'' سے اشارہ ''مسٹر ماؤنٹ بیٹن'' کی طرف ہے۔

---

(۱) برطانوی صحافی نے جناح صاحب کی صحت کے بارے میں وائسرائے ماؤنٹ بیٹن کے پرائیوٹ سیکریٹری کو جو ''انتہائی پریشان ذہنی کیفیت کی رپورٹ'' پہنچائی تھی۔ جس پر مسٹر ماؤنٹ بیٹن نے اپنے اسٹاف کے ایک رکن جارج ایبل اور اپنے ڈپٹی پرائیوٹ سیکریٹری مسٹر آئن اسکاٹ سے مشورہ بھی کیا تھا اور اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ مسٹر جناح اختلالِ ذہنی اور دیوانگی کی جس کیفیت میں مبتلا ہیں، انھیں ان کے حال پر چھوڑ دو اور اس کے منطقی انجام کو پہنچنے دو۔ ہمیں جو کرنا ہے، اس کا وقت آئے گا اور ہم اس لمحے سے فایدہ اٹھائیں گے۔ اس کا واضح اور مختصر مفہوم یہ ہے کہ مسٹر جناح کو اپنی موت مرجانے دو۔ وہ لمحہ آرہا ہے جس سے ہم فایدہ اٹھائیں گے۔

(۲) جناح — بانی پاکستان از وول پرٹ: ص ۵۹۔۳۵۸

باب: ۴

ایک سازش-جناح صاحب کے خلاف!

میں نے یہ نہیں لکھا کہ مسٹر اور نواب کی ملاقات میں کسی سازش کی بنیاد ڈالی گئی تھی۔ سازش کی بنیاد تو لارڈ ویول کے ابتدائی عہد میں لیاقت ڈیسائی معاہدے کی شکل میں پڑ چکی تھی۔اس وقت تو مسٹر ماؤنٹ بیٹن اس پر پڑی ہوئی مٹی کو ہٹا رہے تھے کہ اگر بدلے ہوئے حالات میں اس پر تعمیر کی ضرورت پیش آجائے تو عمل کا قدم اٹھانے میں ایک لمحے کی تاخیر نہ ہو!

میرے ذہن میں یہ سوال کیوں آیا؟ شاید اس لیے کہ سر یامین خان نے تاریخ کی ایک حقیقت سے پردہ ہٹا دیا ہے اور اس حقیقت کو اس کے پس منظر کے ذکر اور اطراف کے بیان کے ساتھ رقم کر دیا ہے۔ یہ داستان آپ سر یامین خان کے بیان کی روشنی اور پروفیسر محمد سرور مرحوم کے الفاظ میں پڑھیے (۱) وہ لکھتے ہیں:

۱۸/ اکتوبر کو لارڈ ویول وایسرائے ہو گئے۔ لارڈ لن لتھگو شریف آدمی تھے، چلے گئے۔ نئے وایسرائے نے ۱۷/ فروری ۱۹۴۴ء کو اسمبلی و کونسل آف اسٹیٹ کے مشترکہ اجلاس سے خطاب کیا اور باتوں کے علاوہ یہ بھی کہا کہ لڑائی کے بعد ہم ملک کو آزادی دے دیں گے۔ اور

> ''...دفاع، امورِ خارجہ اور بہت سے اندرونی و بیرونی اقتصادی معاملات کے لیے ہندستان ایک یونٹ ہے اور جغرافیائی حالت بدلی نہیں جاسکتی، بہت سے

---

(۱) اگر کوئی محترم قاری اس سازش کے پس منظر، وقوع اور اطراف کا تفصیلی مطالعہ کرنا چاہیں تو انھیں نامۂ اعمال جلد دوم کے صفحہ ۹۰۶، ۹۰۷، ۹۲۹ تا ۹۳۲ اور صفحہ نمبر ۹۵۸ تا ۹۶۱ کا مطالعہ فرمائیں! خاکسار (ا-س-ش) نے صفحات کی تنگی کی وجہ سے پروفیسر محمد سرور کی تالیف ''تحریک پاکستان کا ایک باب'' میں ان کی تلخیص کو اخذ کر لیا ہے۔

ملکوں میں مختلف مذہبوں اور قوموں کے لوگ مل کر رہتے ہیں۔''

اس سلسلے میں اس نے بہت سے ملکوں کی مثالیں دیں کہ وہ مختلف ہونے کے باوجود باہم متحد ہیں۔ اور آخر میں کہا:

''آیر لینڈ میں بے شک پاکستان بنا ہوا ہے۔ وہ ابھی تک ایک نہیں ہوئے، تم لوگوں کو اختیار ہوگا، جیسا چاہو آئین بناؤ، لیکن جغرافیائی حالت کو تبدیل نہیں کرسکتے۔...''

سریامین لکھتے ہیں:

''اس اسپیچ نے مسلم لیگ کو متنبہ کردیا کہ گنگا کس طرف بہے گی اور جمنا میں کتنا پانی ہے!

یکم اپریل ۱۹۴۴ء کو قاید اعظم محمد علی جناح تو بہت بیمار ہونے کے بعد دہلی سے ممبئی اور وہاں سے ملیر [کراچی] چلے گئے، یہاں بھولا بھائی ڈیسائی اور نواب زادہ لیاقت علی خان کے درمیان یہ طے ہوا کہ موجودہ گورنمنٹ کو نکالا جائے اور اس کی یہ صورت ہو کہ لیگ اور کانگریس متحد ہو کر حکومت بنائے۔

بھولا بھائی نے کہا کہ وہ مہاتما گاندھی سے مل کر اس کی منظوری حاصل کرلیں گے، تب یہ اسکیم وایسرائے کے سامنے پیش کی جائے گی۔

یہ واقعہ ہے کہ اس وقت یہ بات زیر بحث نہیں آئی تھی کہ قاید اعظم کی بھی منظوری لیاقت علی خان حاصل کریں گے۔

چوں کہ لیاقت علی کا خیال ڈاکٹروں کی رائے کی وجہ سے یہ تھا کہ قاید اعظم صرف چند دن کے اور مہمان ہیں اور اب ان کو اس کی تکلیف دینے کی ضرورت نہیں۔''

یہ سب امور سریامین کے گھر پر طے ہوئے تھے اور معاہدے پر لیاقت علی خان نے دستخط کردیے تھے بعد میں مہاتما گاندھی نے اس پر دستخط کردیے۔

لیاقت ڈیسائی معاہدے کا راز قبل از وقت اخبارات میں افشا ہوگیا۔ قاید اعظم کو خبر ہوئی تو انھوں نے لیاقت کو ڈانٹ کر کہا کہ میری اجازت کے بغیر یہ معاہدہ کیسے کیا گیا؟

سر یامین خان لکھتے ہیں:

''...لیاقت علی خان کو محسوس ہو گیا تھا کہ ڈاکٹروں کی رائے کہ قاید اعظم چند دن کے اور مہمان ہیں، غلط نکلی۔ اس لیے لیاقت علی نے بیان دے دیا کہ یہ غلط ہے کہ ان کا اور بھولا بھائی ڈیسائی کا معاہدہ ہو گیا ہے۔''(۱)

اس بیان کے بعد یہ کہنے کی ضرورت نہیں رہ جاتی کہ سازش کے اس جرم میں صرف لیاقت علی خان اور سر یامین خان ہی نہ تھے، جن کے گھر کے خفیہ خانوں میں اس سازش کے ابتدا تا انتہا مراحل طے پائے تھے! لیاقت ڈیسائی معاہدہ ون ٹو ون گفتگو سے تو طے نہ پایا ہوگا۔ اس میں لیگ کے کئی رکن اور بھی شریک رہے ہوں گے، ان کو اس جرم سے کیوں کر بری کیا جا سکتا تھا؟ یامین خان جیسی حیثیت کے اور مسٹر محمد علی جناح کے جس درجے اعتماد کی شخصیات تھے، اس کا اندازہ پروفیسر مرحوم کے بیان سے لگایا جا سکتا ہے، جو درحقیقت انھی کے الفاظ و معلومات قطعی ہیں:

''یہ یاد رہے کہ سر محمد یامین خان مرکزی اسمبلی میں مسلم لیگ پارٹی کے سیکریٹری تھے اور اس کے لیڈر مسٹر جناح کی غیر موجودگی میں پارٹی کے نمایندہ و ترجمان ہوتے تھے۔ یقیناً ان کی یہ باتیں پارٹی کے نقطۂ نظر کی نمایندگی کرتی تھیں۔''(۲)

میں نہیں چاہتا کہ کوئی محترم قاری سرور صاحب کے بیان پر شک کریں کہ انھوں نے کوئی جملہ یا اسلوب بدل نہ دیا ہو جس کا مفہوم پر اثر پڑا ہو۔ آپ سر یامین خان کے الفاظ ہی میں ان کا بیان پڑھیے اور اس کے مفہوم سے لطف اُٹھایئے۔ سر یامین خان لکھتے ہیں:

''میں مسلم لیگ پارٹی کا سیکریٹری ہوں اور قاید اعظم چوں کہ اسمبلی سے غیر حاضر رہتے ہیں، ساری پالیسی مسلم لیگ کی میں ہی چلاتا ہوں اور مسلم لیگ پارٹی کے پچھتر فیصد ممبر بالکل میرے ساتھ ہیں اور بقیہ بھی میرے ہی ساتھ ہیں اور پچیس

(۱) تحریک پاکستان کا ایک باب: محمد سرور، لاہور، سندھ ساگر اکادمی، ۱۹۷۵ء: ص ۸۵، ۸۶، نیز ملاحظہ فرمایئے: نامۂ اعمال ص ۱۶۹

(۲) ایضاً: ص ۸۷

سال کا سنٹرل لے جس لیجر کا تجربہ ہے، اس لیے قاید اعظم نے مجھ سے کہا ہے کہ میں روزانہ ان کے پاس آؤں اور وہ مجھ سے مشورہ کرتے ہیں۔ اس لیے شملہ بھر میں یہ مشہور ہو گیا ہے کہ پانچ مسلمانوں میں سے ایک میں ضرور ہوں گا!...''

آخری جملے میں اشارہ اس طرف ہے کہ وایسرائے نے جناح صاحب سے انٹیرم گورنمنٹ میں مسلم لیگ کی نمایندگی کے لیے جو فہرست طلب کی ہے اس میں سر یامین خان لے جس لیٹو کونسل میں مسلم لیگ پارٹی کے سیکریٹری ہونے کی بنا پر اس زعم میں مبتلا تھے کہ وہ ان کو ضرور نام زد کریں گے۔ حال آں کہ پارلیمنٹری کی حیثیت سے ان کا کوئی مقام ہو اور یہ محض مفروضہ نہیں انھیں اس کا واقعی علم و تجربہ اور ایک خاص سوسایٹی میں وہ بڑے صاحب رسوخ تھے، لیکن پبلک لیڈر کی حیثیت سے وہ خود ہی اپنے آپ کو کچھ سمجھنے لگے تھے۔ بنگال و یوپی کے خواجہ ناظم الدین اور نواب اسماعیل خان کے اور پنجاب و بمبئی و بہار کے متعدد ممبران کے مقابلے میں وہ کوئی حیثیت نہ رکھتے تھے۔ پبلک لیڈر کی خوبیوں سے وہ دور تھے۔ مذکورۃ الصدر بنگال و یوپی کے رہنماؤں کی بعض خوبیوں کی بنا پر لیگ اور بیرون لیگ کے حلقوں میں ان کا حکومت میں لیا جانا قطعی تھا اور اسی یقین کی بنا پر ان کے دوستوں نے مسرت کے اس موقع پر دہلی کے امپیریل ہوٹل میں ان کے لیے ڈنر کا انتظام کیا تھا اور ہار پھول لے کر آئے تھے کہ ہوٹل میں خوش خبری سنیں گے اور مبارک باد دیں گے۔ اعلان ہوا تو سب کی امیدوں پر پانی پھر گیا۔ چندریگر، عبدالرب نشتر، راجہ غضنفر علی اور جوگندر ناتھ منڈل کا تو کسی کو تصور بھی نہ تھا۔ یامین خان تو اپنی خوش فہمی میں مبتلا ہو گئے اور مگر لیگ میں ان کا کوئی گروپ نہ تھا جو ان سے صدمے اور افسوس کا اظہار کرتا اور ان کے غم میں شریک ہوتا، لیکن انھوں نے اپنی ڈایری ''نامہ اعمال'' میں جناح صاحب کو برا بھلا کہہ کر اپنی بھڑاس نکال لی۔ یامین خان کے ''نامہ اعمال'' میں ان کی مایوسی اور غصے کا اچھا نقشہ موجود ہے۔ جو محترم قارئین اس کے مطالعہ و نظارہ سے لطف اندوز ہونا چاہیں، وہ ۲۵/ اکتوبر ۱۹۴۶ء کے ضمن میں صفحہ نمبر ۱۱۹۶ تا ۱۱۹۹ کا مطالعہ فرمائیں!

کتنے افسوس اور شرم کی بات تھی کہ جناح صاحب اپنی صحت اور کم زوری کی وجہ سے ہمیشہ سے لاغر اور کم زور تھے اور طبیعت کے اضمحلال نے انھیں اور بھی لاغر کر دیا تھا۔ تبدیلی آب و ہوا کے لیے شملہ و کشمیر کے زیادہ ٹھنڈے علاقوں اور دہلی میں ٹھہرنے اور ممبئی جیسے ہنگاموں سے معمور شہر کا رخ کرنے کے بجائے اگر ان پر بیماری کا حملہ ہوا ہوتا تو وہ ممبئی اپنے معالج سے رجوع فرماتے نہ کہ ملیر کے موسم کا رخ کرتے! درحقیقت وہ ملیر (کراچی) کے معتدل موسم میں دنیا سے الگ تھلگ آرام کرنے کے لیے خاموشی سے تشریف لائے اور دہلی میں ان کی شدید علالت کی شہرت ہوگئی۔ کسی ناواقف اور غیر نے نہیں، جناح صاحب کے دوست، متبع اور صبح و شام کے حکم برداروں نے انھیں موت و حیات کی کش مکش میں مبتلا اور صبح و شام میں ان کے اس دنیا سے رخصت ہو جانے کا گمان کر لیا اور بجائے اس کے کہ محبت و عقیدت انھیں بہترین معالجے کے لیے تنبیہ کرتی یا ان کی تکفین و تدفین کی فکر انھیں بے قرار کرتی، ان کی موت کے آرزومند اور ان کی جانشینی کے خواہاں، ان کے خلاف سازش میں مبتلا ہو گئے۔ وہ تو بھلے کوئی حادثہ پیش نہیں آ گیا۔ ورنہ کسی صبح کو اس مظلوم رہنما کی تجہیز و تکفین کی خبریں، آں مرحوم کے غم میں آنسوؤں سے بھرے رومالوں کی تصویریں، میت کے ماتمی جلوس اور جلسوں کے انتظامات، مقبرے کی تعمیر کے منصوبے کی خبریں چھپتیں اور سر یامین خان کی جانشینی اور لیاقت علی خان کی نمایندگی کے بارے میں وصیت نامہ بھی چھپ جاتا!

باب: ۵

ماؤنٹ بیٹن پلان کی منظوری اور چودھری رحمت علی

ایک عبرت ناک شکست!

لیگ کے رہنما نے پاکستان کو بطور ہتھیار کے، کامیابی سے استعمال کیا تھا، لیکن جب انھیں پاکستان ملا تو وہ صدمے میں ڈوب گئے۔ وہ ناخوش اور مجبور تھے۔ پاکستان ان تمام سیکولر مسلمانوں کی ہار تھی جو اپنے ہندو اور سکھ بھائیوں کے شانہ بشانہ متحدہ ہندستان کی آزادی کے لیے لڑے تھے۔ پاکستان ریزولیوشن کے بعد بھی یہ جدوجہد جاری رہی۔ آزاد ہند فوج متحدہ ہندستان کی آزادی کے لیے لڑی تھی اور اس کے تین ممتاز افسر، شاہنواز، گوربخش سنگھ ڈھلون اور پی کے سہگل، ہندستان کے تین بڑے فرقوں کے افراد تھے۔ شاہی ہندستانی بحری فوج کی بغاوت نے بھی اسی ایکتا کا مظاہرہ کیا۔ اس میں نسل، مذہب اور ذات کا کوئی سوال نہیں تھا۔ ایم۔ ایس۔ خاں کو بتیس ہزار ہڑتالیوں نے ایک رائے سے نیتا چنا تھا۔

کیا مسٹر جناح نے واقعی سر ہلایا تھا؟

مسٹر ماؤنٹ بیٹن نے جناح صاحب کو خوف زدہ کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی، لیکن جناح صاحب کے پائے استقامت کو وہ متزلزل نہ کر سکے۔ بالآخر وہ ناز و غمزے سے کام لینے پر مجبور ہو گئے اور گذارش کرتے ہی بنی کہ اگر زبان سے اعتراف میں تکلف ہے تو قلم سے لکھ کر رضامندی ظاہر کر دو! اگر یہ بھی منظور نہیں تو خدارا بالکل انکار تو نہ کرو، سر کے اشارے ہی سے ہاں کر دو تا کہ میری آبرو رہ جائے! جناح صاحب نے بھی سوچا ہو گا کہ اب یہ خوشامد پر اتر آیا تو اسے کیا ستانا، جان لینا تو غرض بھی نہ تھی، گزارش کو مان ہی لینا چاہیے۔ سر کے اشارے سے اثبات و اعترافِ محبت کر لینا چاہیے۔ لیکن محبت کے اعتراف کی ادا کچھ ہو، رسوائی تو حصے میں آئی ہی! جیت تو ماؤنٹ بیٹن ہی کی ہوئی! (ا۔س۔ش)

اس روداد کے بیان میں زبان ماؤنٹ بیٹن کی اور قلم وول پرٹ کا استعمال ہوا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''اس رات گیارہ بجے جناح واپس آئے۔ انھوں نے صوبوں کی تقسیم کے خلاف اپنے ورکنگ کمیٹی کے احتجاج کو پہنچانے میں آدھا گھنٹہ صرف کیا... پھر میں نے ان سے صاف صاف پوچھ لیا کہ کیا ان کی ورکنگ کمیٹی منصوبے کو قبول کر لے گی۔ انھوں نے جواب دیا کہ وہ ''پرامید'' ہیں۔ پھر میں نے ان سے دریافت کیا کہ کیا وہ اسے قبول کرنے کا ارادہ رکھتے تھے، جس پر انھوں نے جواب دیا کہ وہ ذاتی طور پر میری حمایت کریں گے۔ انھوں نے آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کو اسے قبول کرنے پر آمادہ کرنے کے لیے اپنی پوری کوششوں کو استعمال کرنے کا وعدہ کیا۔... آخر میں میں نے ان سے دریافت کیا کہ کیا وہ محسوس کرتے تھے کہ میں وزیراعظم کو پیش قدمی کرنے اور اعلان کرنے کا مشورہ دینے میں حق بہ جانب ہوں گا، جس پہ انھوں نے بہت یقین سے جواب دیا ''ہاں!''

ماؤنٹ بیٹن نے اگلی صبح صلاح ومشورے کے لیے اپنے عملے سے ملاقات کی اور انھیں (جناح کو) منصوبے کو تحریری طور پر قبول کرنے پر رضامند کرنے کی اپنی بے فایدہ کوششوں کے بارے میں بتایا۔ لیکن ''دباؤ کی کوئی بھی حد'' انھیں کونسل کے اجلاس سے پہلے اسے قبول کرنے پہ راضی نہیں کر سکی!

پھر ماؤنٹ بیٹن نے جناح کو یاد دلایا کہ کانگریسی جماعت اس خصوصی حربے کے بارے میں شدید طور پر شبھے کا شکار تھی، جو وہ ہمیشہ استعمال کرتے تھے، جس میں وہ انتظار کرتے تھے جب تک کہ کانگریسی جماعت کسی منصوبے کے بارے میں کوئی پختہ فیصلہ کر لیتی تھی، اور پھر وہ اپنے لیے یہ حق مخصوص کر لیتے تھے کہ مسلم لیگ کے لیے جو بھی فیصلہ موزوں ہو وہ کیا جائے۔... ماؤنٹ بیٹن کی کہی ہوئی کوئی بات بھی انھیں ہلا نہیں سکی۔ اگر آپ کا... رویہ یہی ہے تو کانگریسی جماعت کے رہنما اور سکھ صبح اجلاس میں حتمی منظوری سے انکار کر دیں گے، اس کا انجام

انتشار ہوگا اور آپ اپنے پاکستان کو کھو دیں گے، شاید ہمیشہ کے لیے!'' جو ہونا ہے، ہوگا!!'' ان کا کندھے جھٹکتے ہوئے واحد ردعمل تھا۔'' جناح صاحب! میں آپ کو اس تمام کام کو برباد کرنے کی اجازت دینے کا ارادہ نہیں رکھتا جو اس سمجھوتے کے لیے ہو چکا ہے۔ کیوں کہ آپ مسلم لیگ کے لیے منصوبے کو قبول نہیں کریں گے، میں خود آپ کی طرف سے بات کروں گا... میری صرف ایک شرط ہے، اور وہ یہ کہ صبح جب میں اجلاس میں کہوں کہ جناح صاحب نے مجھے یقین دہانیاں کرائی ہیں، جو میں نے قبول کر لی ہیں اور جنھوں نے مجھے مطمئن کر دیا ہے، آپ اس سے کسی حال میں بھی اختلاف نہیں کریں گے، اور یہ کہ جب میں آپ کی طرف دیکھوں تو آپ اثبات میں سر ہلائیں گے۔...'' جناح کو اس تجویز کے لیے جواباً سر ہلانا تھا۔ اور باضابطہ اعلان ۳/ جون کی رات کو کیا گیا۔ بھوپال، نیپال اور ایک درجن ریاستوں کے وزرائے اعظم منصوبے کی اپنی اپنی نقول، اس سے پہلے کہ اسے دنیا کے سامنے نشر کیا جاتا، حاصل کرنے کے لیے وائسرائے کے ساتھ ان کے بیضوی دفتر میں جمع ہوئے۔ ۷/ بجے رات آل انڈیا ریڈیو نے عوامی اعلان جاری کیا جسے پہلے وائسرائے نے کیا پھر نہرو، جناح اور بلدیو سنگھ کی تقریروں نے اس کی تقلید کی۔ [۱]

مسلمانوں کا شدید ردعمل:

''جناح کو جو ایک وقت جن طاقتوں کی نمائندگی کرتے تھے۔ سیکولرازم کا پیغامبر اور ہندو مسلم اتحاد کے سفیر کے خطابات سے نوازا گیا تھا، اب انھیں کی طرف سے ان کو بہتات میں نفرت ملی۔ فرقہ پرستی اور انتشار کا پیغمبر کہا گیا۔ وہ ہیرو تھے جو بعد میں ولین (Villain) بن گئے۔ ان کو قاتل اعظم کا نام بھی دیا گیا۔ مسلمان فرقہ پرستوں اور علاحدگی پسندوں کی نظروں میں پاکستان بننے سے وہ ہیرو نہ بن پائے۔''

(۱) جناح بانی پاکستان از اسٹینلے وول پرٹ: ۶۷۔۳۶۶

چوہدری رحمت علی کا غصہ:

رحمت علی جیسوں نے ان پر بڑی تلخ نکتہ چینی کی، ان کو غدار کہا۔ جناح نے ان (رحمت علی) کا آدرش، ان کی دلیلوں اور نام (لفظ پاکستان) کو ان کا نام لیے بغیر اپنالیا تھا۔ رحمت علی نے ۹/جون ۱۹۴۷ء کو ایک پمفلٹ شایع کیا جس میں جناح کو خصوصی طور پر نشانہ بنایا گیا تھا۔

''غیر یقینی بات بالآخر ہوگئی۔ زندگی اور موت کی کشمکش میں ملت کے ساتھ سیاہ ترین غداری کی گئی ہے۔ مسٹر جناح اور بعد کو مسلم لیگ کا ۳/جون ۱۹۴۷ء کے برطانوی منصوبے کو مان لینا ملت کے لیے بڑی افسوس ناک، شرم اور دردناک کرب کی بات ہے۔ اس سے برطانیہ بنیا گٹھ جوڑ کو تحقیر آمیز مسرت کا احساس ہوا ہے۔ جناح کا برطانوی منصوبے کو تسلیم کرنا جوڑا کی مانند دغا بازی ہے۔ انھوں نے ملت کے اعتماد کو دھکا پہنچایا ہے اور اسے شکست وریخت سے ہم کنار کردیا۔''[1]

رحمت علی نے آگے لکھا:

''جناح مسلمانوں کی دردناک قسمت کو خوش قسمتی بتا کر مسلمانوں کو بیوقوف بنا رہے ہیں اور اپنی دغا بازی کو نعمت قرار دے رہے ہیں۔ ان کو اس کا ذرا بھی احساس نہیں ہے کہ وہ اسلام کی بربادی کے دکھ میں شرم ناکی کا اضافہ کر رہے ہیں۔ اور ملت کے کھلے رِستے زخموں پر نمک مل رہے ہیں۔ ان کے جرایم کی سیاہی کوئی سفیدی مٹا نہیں سکتی۔ اور اس کے نتایج اس قدر تباہ کن ہیں کہ ملت ان کو بھول نہیں پائے گی۔ ان کی کوششیں اتنی بھاری اور کھردری ہیں کہ تاریخ ان سے دھوکا نہیں کھا سکتی۔''[2]

رحمت علی نے مزید کہا: ''ہماری تمام امیدیں خاک میں مل گئیں۔ یہ سب صرف ایک

---

(۱) رحمت علی. اے بایو گرافی: کے کے عزیز، وین گارڈ پبلی کیشنز، لاہور، ص ۲۶۲

(۲) ایضاً: ص ۲۶۲

شخص کی بیوقوفی اور احمقانہ عمل کی بنا پر ہوا۔ وہ غدار اعظم جناح ہے۔"[1]

رحمت علی چوہدری کا غصہ سب سے زیادہ تھا، غصہ کرنا اچھی بات نہیں اور یہ کسی مسئلے کا حل بھی نہیں۔ لیکن یہ غصہ جناح صاحب کے افعال و اقدامات کے خلاف ردِ عمل تھا، اور اگر ایک مدبّر کے بہ قول ہر فعل اپنی ایک تاثیر رکھتا ہے تو یہ کیوں کر ممکن ہے کہ فعل کا ظہور تو ہو، اس کی تاثیر ظاہر نہ ہو!

حقیقت یہ ہے اور ہم اس سے انکار نہیں کر سکتے کہ جناح صاحب کی آخری دس سالہ سیاست میں علامہ اقبال کا تصور اور چوہدری رحمت علی کے پاکستان کا خاکہ بہ طور بنیاد کے کام کر رہا تھا۔ ضروری تھا کہ اس کا اعتراف کیا جاتا۔ لیکن انھوں نے کبھی اس کا نام نہیں لیا، صرف ایک بار فرینک موریس کے ایک سوال کے جواب میں بہت سادہ اور شریفانہ انداز میں یہ کہہ کر اسے رد کر دیا:

"میرے عزیز! کیا تم نہیں جانتے کہ اقبال سیاست داں نہیں ہیں۔ وہ ایک شاعر ہیں اور شاعر خواب دیکھتے ہیں۔"

الفاظ و اسلوب سے قطع نظر اقبال اور ان کے فکر و تدبر پر یہ گہرا طنز تھا۔ اقبال کا مقام اس سے بہت بلند تھا! رحمت علی چوہدری کے تصور کے ساتھ بھی ان کا رویہ فروتر تھا۔ رحمت علی چوہدری نے ۱۹۳۳ء میں جناح صاحب کو لندن کے والڈروف ہوٹل میں بلیک ٹائی ڈنر پر مدعو کیا تھا۔ اس دعوت میں آئسٹر اور ڈرائی واین (ایک قسم کی فرانسیسی شراب) کا انتظام کیا گیا تھا۔ ڈنر کا مقصد جناح صاحب کو ہم خیال بنا کر پاکستان تحریک کی باگ ڈور ان کے سپرد کرنی تھی لیکن انھیں اپنے مقصد میں سخت ناکامی کا سامنا ہوا تھا۔ جناح صاحب نے پاکستان کی تجویز کی مخالفت کی تھی۔[2] انھوں نے رحمت علی کی تجویز کو احمقانہ قرار دیا تھا۔[3] رحمت علی نے ایک تصور پیش کیا تھا، اس پر غور کرنا تھا اور اس کے بعد اسے قبول کرنا

(۱) ایضاً، ص ۵۲۴

(۲) ایضاً، ص ۱۷۶

(۳) ایضاً، ص ۳۷

تھا یا رد ہی کر دیتے۔ اور جب اس پر چلے تو بھولے سے نام نہ لیا۔ حال آں کہ یہ رحمت علی کا تصور تھا۔ اسی کی بدولت وہ مسلمانوں کے سب سے بڑے رہنما بنے اور ''قایداعظم'' کہلائے تو ان کے مجوزہ منصوبے کے عنوان (پاکستان) کے حوالے سے انھوں نے چوہدری کے منصوبے کا نام ہی استعمال نہیں کیا تھا۔ بلکہ اس کے دلایل، جواز اور شہرت سے بھی فایدہ اٹھایا تھا۔ لیکن خود رحمت علی کا نام اپنی زبان و قلم پر کبھی نہیں آنے دیا۔ اور ان کے جانشینوں نے تو اس سرزمین پر جو ان کے باپ دادا کا وطن تھا، ان کی جنم بھومی تھی اور جن کا نام انھیں کا دیا ہوا تھا، ان کی زندگی کو دشوار بنا دیا تھا۔ انھیں وطن سے نکلنا پڑا تھا اور دیارِ غیر میں عالمِ غربت ہی میں ان کا انتقال ہوا۔

رحمت علی چوہدری کو سب سے زیادہ چوٹ لگی تھی۔ اس لیے آہ بھی سب سے زیادہ بلند ان کے منہ سے نکلی اور سینہ کوبی بھی سب سے زیادہ ان کے حصے میں آئی۔

جناح صاحب کی رجعت قہقری:

نہرو اور پٹیل کے بعد گاندھی جی کو بھی ماؤنٹ بیٹن کا شکار ہونے میں دیر نہ لگی۔ یہی وجہ تھی کہ مولانا آزاد کے بہ قول پٹیل اور نہرو جناح سے بھی زیادہ تقسیم ملک کے مؤید بن گئے تھے، اور مولانا ابوالکلام آزاد نے جب یہ مشورہ دیا تھا کہ انتقال آزادی کے عمل کو دو تین برس کے لیے روک دیا جائے تو دراصل یہ تجویز اس بات کی غماز تھی کہ اس واہمے یا حقیقت کا جواب مولانا کے پاس بھی نہ تھا۔ اس لیے انھیں بھی سپر انداز ہونا پڑا تھا۔

جن حضرات کی ۲رجون ۱۹۴۷ء، اس کی شب اور ۳رجون کو اعلان آزادی کے اعلان کی کارروائی پر نظر ہے، وہ جانتے ہیں کہ ماؤنٹ بیٹن پلان یعنی تقسیم ملک کے فارمولے کے مطابق تین حصوں میں ملک کی آزادی کو قبول کرنے کے لیے جناح صاحب ہرگز تیار نہیں تھے۔ ماؤنٹ بیٹن نے جناح صاحب سے پلان دھمکی اور جبر سے منوایا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس صورت میں پاکستان کے مطالبے سے انھوں نے رجوع کر لیا تھا۔ ماؤنٹ بیٹن کا پلان جس میں تقسیم کا زہر ملا ہوا تھا، انھیں ہرگز منظور نہیں تھا۔ یہی وجہ تھی کہ

☆ انھوں نے بنگال و آسام کو تقسیم سے بچانے کے لیے حسین شہید سہروردی کو اجازت

دے دی تھی اور وہ اسی منصوبے کو کامیاب بنانے کے لیے سرگرم عمل ہو گئے تھے اور

☆ شاید اسی لیے جناح صاحب نے پاکستان کی قومی اسمبلی سے سہروردی صاحب کا نام خارج کر دیا تھا کہ شک وشبہ سے دور ہو کر متحدہ بنگال کے لیے وہ کام کر سکیں۔

☆ چودھری خلیق الزماں کو یوپی میں اور مسٹر چندریگر کو بمبئی میں مسلمانوں کی قیادت کے لیے حکماً چھوڑا تھا اور

☆ مسلم لیگ کو ہندستان پاکستان کے دو ٹکڑوں میں تقسیم کر دینے کے لیے ۱۵/دسمبر ۱۹۴۷ء تک انتظار کیا تھا۔ اور حالات سے مایوس ہو کر لیگ کونسل کے اجلاس منعقدہ خالق دینا ہال (کراچی) میں ہندستان کے لیگیوں کو حالات کے مطابق اپنی جدید تنظیم کی اجازت دی تھی۔ لیکن

اب وہ وقت بہت دور جا چکا تھا جب لیگ اور کانگریس کے کسی ایک متحدہ فارمولے پر کام کرنے کا امکان ہو۔ اب اگر جناح صاحب تقسیم نہیں چاہتے تھے،

تو انگریز ملک کو تقسیم کرنے کا اور کانگریس جناح صاحب کو اپنے حدود سے نکال دینے اور ان سے پیچھا چھڑا لینے کا فیصلہ کر چکی تھی۔ جناح صاحب کا قابل اعتماد صحافی ایم ایس ایم شرما لکھتا ہے کہ تقسیم ملک کے اعلان کے بعد ماؤنٹ بیٹن سے ملے اور کہا

"وہ پاکستان نہیں چاہتے! وہ متحدہ ہند میں کانگریس اور برطانوی حکومت سے باعزت معاملات طے کرنا چاہتے ہیں۔"

لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے جناح کو جھڑک دیا اور کہا:

"متبادل کے لیے بہت دیر ہو چکی ہے!"(۱)

---

(۱) Peeps into Pakistan: Page 147

بحوالہ سیکولر اور وطن پرست جناح: ص ۸۶-۲۸۵

اس حقیقت کے انکشاف کے بعد بہ قایمی ہوش وحواس کون کہہ سکتا ہے کہ پاکستان جناح صاحب نے بنایا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ جناح صاحب بازی ہار چکے تھے۔ اب ان کے پاس چلنے کے لیے کوئی چال نہ تھی۔ اس دوران ان کی زبان سے کوئی نئی بات نہ نکلی تھی۔ شکست کے احساس نے ان میں غصہ اور جھنجلاہٹ بھر دی تھی۔ جب ان سے کہا گیا کہ مسلم اکثریت کے جس اصول پر وہ کسی صوبے کو پاکستان بنانا چاہتے ہیں ٹھیک اسی اصول پر ہندو اکثریت کے اضلاع اور تحصیلات کو ان سے الگ کیوں نہ کر لیا جائے؟ تو اس کا کوئی جواب ان سے نہ بن پڑا تھا! اس منطق میں وہ ماؤنٹ بیٹن سے مات کھا گئے تھے۔ جناح صاحب نے پاکستان کے مطالبے کو سودے بازی کی ایک چال کے طور پر آگے بڑھایا تھا۔ ماؤنٹ بیٹن نے بھی ضلعے یا تحصیل کی سطح پر کسی قوم کی اکثریت واقلیت کی بنیاد کو تقسیم ملک کے عمل کو روکنے اور تقسیم ملک کے مطالبے سے دست بردار ہو جانے کے لیے ایک چال ہی چلی تھی کہ وہ اپنے مطالبۂ تقسیم پر غور کریں۔ لیکن کانگریس کو ماؤنٹ بیٹن کی یہ چال ایسی بھائی کہ اس نے اسے اپنا اصول بنالیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ جناح صاحب اپنی مانگ کے اصول کو ثابت نہ کر سکے اور اپنا مقدمہ ہار گئے۔ کانگریس نے ان کی چال یا جھوٹ موٹ کے مطالبے کو اپنی سیاست کا ایک اصول بنالیا اور وہ بازی جیت گئی۔

جناح صاحب اپنی تمام ذہانت اور قابلیت کے باوجود پاکستان کی وضاحت کرنے اور صوبوں کو ضلع اور تحصیل کی بنیاد پر تقسیم سے بچانے کے لیے کوئی دلیل پیش کرنے سے قاصر رہے تھے۔ جناح صاحب کو اپنے مقصد کے حصول میں سخت ناکامی کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ ماؤنٹ بیٹن اپنی بنائی ہوئی اسکیم کو زبردستی ان کے سر منڈھنے میں کامیاب ہو گیا تھا اور جناح صاحب مسلمانوں کے لیے اپنے تصورِ پاکستان کے عشر عشیر کو بھی حاصل نہ کر سکے۔ کانگریس بھی اپنے تصور کے مطابق متحدہ ہندستان کو حاصل نہ کر سکی جیسا کہ وہ چاہتی تھی لیکن اپنے مستقبل میں لیگ کے عدم تعاون سے پیدا ہونے والی مشکلات اور بے جا مداخلت کے خطرات سے اپنے ملک اور حکومت کو اس نے ہمیشہ کے لیے بچا لیا۔ (ا۔س۔ش)

ہندستان میں لیگ کونسل کا آخری اجلاس:

''آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کا اجلاس میں ۹/۱۰ر جون ۱۹۴۷ء کو نئی دہلی کے عالیشان امپیریل ہوٹل میں منعقد ہوا۔ کوئی ۲۲۵ کے قریب مندوبین اس پُر تکلف عظیم الشان بال روم میں جمع ہوئے۔

ابتدا میں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ شاید لیگ کی کونسل بھی جون کے اس گرم دن ماؤنٹ بیٹن کے تقسیم کے منصوبے پر اپنے تاریخی اجلاس کے دوران میں مہذب گوشۂ تنہائی کی خاموشی وسکون سے لطف انداز ہوگی۔ لیکن زیادہ دیر نہیں۔ ہر صوبے سے مخالف جنگجو مسلمان قدامت پسند اور پنجاب کی تقسیم سے سب سے زیادہ نقصان اٹھانے والے زبردست جاگیردار اور ان کے ساتھ سر برآوردہ تاجر برادری جنھیں کلکتہ کو اپنے ہندو حریفوں کے حوالے کردینے کے خیال سے بھی نفرت تھی، انھوں نے بال روم کے اندر غصے میں بھرے، فیصلے کے خلاف نعرے لگائے اور اسے ''دھوکے بازی'' اور ''پاکستان کے لیے المیہ'' کہا۔

خاکساروں کا حملہ:

خاکسار ''بیلچے یا نوکدار پھاوڑے لہراتے ہوئے ''تیزی کے ساتھ باغ میں سے گزرتے ہوئے، ہوٹل کے لاؤنج میں داخل ہوئے... اور یہ چلاتے ہوئے کہ ''جناح کو پکڑو!'' آدھی سیڑھیوں تک چڑھ گئے جو اس بال روم تک جاتی تھیں جہاں جناح صاحب کونسل کا اجلاس کر رہے تھے۔ جب تک کہ... لیگ کے نیشنل گارڈز ان کو روک سکیں اور انھیں واپس جانے پہ مجبور کرسکیں۔

آنسو گیس کا استعمال اور گرفتاریاں:

پولیس کو افراتفری ختم کرنے کے لیے آنسو گیس کا استعمال کرنا پڑا۔'' کوئی پچاس قتل کے ارادے سے آئے ہوئے خاکساروں کو گرفتار کیا گیا اور لاؤنج میں موجود ہوٹل کے مہمان ''گرتے پڑتے بھاگے'' جب کہ وہ جو ڈائیننگ ہال میں تھے آنسو گیس کے ہال میں پھیلنے پر آنسو بھری آنکھوں کے ساتھ کھانے کے لیے بیٹھے۔

اجلاس کی کارروائی:

جناح نے پہلی منزل پر ہونے والے ہنگاموں سے متاثر ہوئے بغیر اجلاس کی کارروائی جاری رکھی۔ کچھ مظاہرین کو جو کمرۂ اجلاس میں داخل ہونے میں کامیاب ہو گئے تھے، جلد ہی باہر نکال دیا گیا۔ ہوٹل کی بالائی ترین منزل پر مسلم لیگ، نیشنل گارڈز اور خاکسار مظاہرین کے درمیان تصادم ہوا... انھوں نے فرنیچر توڑ دیا اور کھڑکی کے شیشے چکنا چور کر ڈالے... چند ایک لوگوں کو زخم بھی آئے۔'' صبح کی خبروں نے رپوٹ دی۔

پرشکوہ بال روم کے اندر، جناح کو ایران کے حکمرانوں کے ایرانی انداز میں ''شہنشاہِ پاکستان'' (حقیقی معنوی میں شہنشاہِ پاکستان) کا خطاب دیا گیا لیکن انھوں نے فوری طور پر اس خطاب کو قبول کرنے سے انکار کیا اور اپنے حمایتوں پر اسے نہ دہرانے پر زور دیتے ہوئے اصرار کیا، ''میں پاکستان کا شہنشاہ نہیں، اس کا سپاہی ہوں۔'' اگرچہ کونسل کے اجلاس میں باہر والوں کا داخلہ منع تھا لیکن ولبھ بھائی پٹیل نے اس کی کارروائی پر شارٹ ہینڈ نوٹس کی ایک نقل، جو اندازہ ہے کانگریس کے ایک جاسوس سے لی گئی تھی!'' اجلاس کے اختتام کے فوراً بعد ماؤنٹ بیٹن کو بھجوائی۔

لیگ کی کونسل نے قاید اعظم ایم اے جناح کو مکمل اختیار دیا کہ وہ منصوبے کے بنیادی اصولوں کو ایک سمجھوتے کے طور پر قبول کر لیں اور مکمل اختیار کے ساتھ یہ ان پر چھوڑ دیا کہ وہ منصوبے کی تفصیلات کو ایک غیر جانبدارانہ اور منصفانہ انداز میں طے کریں۔'' (بہ شمول سمجھوتا)...

لیگیوں کا غضب ناک ردِعمل:

جوشیلے مسلمان اس بات پر اور بھی غصے میں تھے کہ منصوبے کو قبول کرنے میں جناح پاکستان کے ابتدائی مطالبے سے کتنا ہٹ گئے تھے اور کیمبرج میں رحمت علی کی پاکستان قومی تحریک نے اس کی مذمت ''تمام ملت (مسلمان فرقے) سے ''عظیم ترین دھوکے'' کے طور پر کی اور لکھا:

''جناح صاحب نے اس سے اب مکمل طور پر غداری کی، اس کا سودا کر لیا اور اسے

ٹکڑے ٹکڑے کر دیا، جن کے برطانوی منصوبے کو قبول کرنے کے اقدام نے اس کی تمام اقوام اور ممالک کی بنیادوں کو ہلا ڈالا اور برصغیر میں رہنے والے دس کروڑ مسلمانوں کے مستقبل کو تباہ کر ڈالا... جب تک اسے ختم نہیں کیا جاتا یہ ہمیشہ کے لیے پاک قوم کی زندگی کو اپاہج کر دے گا، دنیا میں ملت کے وجود کو کمزور کر دے گا، اور ساری دنیا میں اپنے بھائیوں کی آزادی کو مصلحت کی قربان گاہ پر چڑھا دے گا... ہم آخر تک جنگ جاری رکھیں گے... نہ ہم کبھی میدان چھوڑیں گے نہ ہتھیار ڈالیں گے... یہ ہم سے کبھی نہیں کہا جائے گا کہ جب ملت کے لیے سب سے بڑی جنگ اور سب سے بڑی غداری کے درمیان انتخاب کرنے کا وقت آیا... تو ہم نے بھی غداروں کی تقلید کی اور غداری کا انتخاب کیا... ملت زندہ باد۔'' (۱)

''اعلان کردہ منصوبے کے بعد عبوری حکومت کی کابینہ کے پہلے اجلاس میں جواہر لال کی ہمشیرہ مادام پنڈت کے بہ طور ایک سفیر تقرری نے نہرو اور لیاقت کے درمیان ایک جھگڑے کی شکل اختیار کر لی۔ جب اس موقع پہ ماؤنٹ بیٹن نے بہ آواز بلند کہا ''معزز حضرات اگر پہلی گفتگو ایک ایسے شرم ناک منظر کی شکل اختیار کرتی ہے تو پھر ہم ایک پر امن

---

(۱) آل انڈیا مسلم لیگ کے کونسل کے اجلاس کی یہ روداد اسٹینلے وول پرٹ کی ''جناح آف پاکستان'' کے اردو ترجمے ''جناح - بانی پاکستان'' سے ماخوذ ہے۔ یہ کتاب اور اس کا ترجمہ دونوں آکسفورڈ یونی ورسٹی پریس کی مطبوعات ہیں اور کراچی سے ۱۹۸۹ء اور ۱۹۹۸ء میں شایع ہوئی تھیں۔ انگریزی متن کا پہلا ایڈیشن ۱۹۵۴ء میں نیویارک سے شایع ہوا تھا۔

کراچی سے اس کی اشاعت اور اس کی تصاویر کی فراہمی میں سب سے زیادہ خالد شمس الحسن نے سعی کی تھی۔ مذکورہ بالا لیگ کونسل کے اجلاس کی روداد کی تالیف میں مؤلف نے ذیل کے اخبارات اور کتب سے استفادہ کیا ہے:

۱۔ مورننگ هیرالڈ، ۱۰؍جون ۱۹۴۷ء

۲۔ مورننگ نیوز، ۱۱؍جون ۱۹۴۷ء

۳۔ فاؤنڈیشن آف پاکستان: جلد دوم، سید شریف الدین پیرزادہ، کراچی ۱۹۷۷ء

۴۔ ماؤنٹ بیٹن کی پرسنل رپورٹ نمبر ۹، ۱۳؍جون ۱۹۴۷ء

۵۔ چودھری رحمت علی: کے کے عزیز، حصہ اول

ہیکٹر بلیتھو کی کتاب (انگریزی) کا نام ''جناح - کری ایٹر آف پاکستان'' اور اسٹینلے

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر......)

تقسیم کے ہوجانے کی کیا امید کر سکتے ہیں۔“(۱)

تاریخی پریس کانفرنس:

انھوں نے نئی مملکت کے طرزِ حکومت کے بارے میں تمام شبہات و شکوک کا ازالہ کرنے کی کوشش کی۔ ۱۳؍جولائی ۱۹۴۷ء کو اورنگ زیب روڈ۔ نئی دہلی میں اپنی کوٹھی کے عقبی صحن میں ایک پریس کانفرنس کی، جس میں ہر اخبار کا نمایندہ نامہ نگار موجود تھا، کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے انھوں نے کہا۔ ”اقلیتیں چاہے کسی بھی فرقے کی کیوں نہ ہوں، ان کی زندگیاں اور جائیدادیں محفوظ رہیں گی۔ عبادت کرنے کی آزادی میں کسی قسم کی مداخلت نہیں ہوگی۔ اُن کے مذہب، عقیدے، زندگی، جائیداد اور کلچر کی مکمل حفاظت کی جائے گی۔ ان کو بلا امتیاز ذات، رنگ، مذہب اور مسلک پاکستان میں شہریت کے پورے اختیارات حاصل ہوں گے۔“ مزید کہا: ”جب تک مجھے اختیارات حاصل ہیں اُن کو کسی قسم کا خوف کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔“

ایک صحافی کے سوالات اور ان کے جواب:

”ایم ایس ایم شرما نے جناح سے پوچھا۔ ”ماضی میں آپ نے ہندستان اور پاکستان کے درمیان تبادلۂ آبادی کی بات کہی تھی اور ایسا لگتا ہے کہ تقسیم ملک کے بعد بڑی تعداد میں یہاں سے مسلمان وہاں اور وہاں سے ہندوؤں کے یہاں آنے کا سلسلہ شروع ہو جائے گا!“

جناح نے جواب دیا۔ ”آپ غلطی پر ہیں ”تبادلۂ آبادی کی پرانی مانگ اب ناکارہ ہوگئی۔ اس میں اب کوئی دم نہیں رہا۔ سب نے بھائیوں کی طرح تقسیم کو قبول کیا ہے۔ کوئی تلخی نہیں ہے۔ اب تبادلہ آبادی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ پاکستان کے ہندو پاکستان میں اور ہندستان کے مسلمان ہندستان ہی میں رہیں گے“، انھوں نے زور دے کر کہا۔

وولپرٹ کی کتاب کا نام ”جناح آف پاکستان“ ہے۔ بولیتھو کی کتاب کے اردو ترجمے کا نام ”جناح – بانی پاکستان“ ہے جو انگریزی کا صحیح ترجمہ ہے۔ اور اس کے اردو ترجمے کا نام بھی یہی ہے، لیکن اتفاق کہ وول پرٹ کی کتاب کا اردو ترجمہ بھی ”جناح – بانی پاکستان“ کے نام ہی سے چھپا ہے۔

(۱) جناح – بانی پاکستان (۲): ص ۳۶۸-۳۷۰

دوسرا سوال: ''اقلیتوں کے ساتھ کیا سلوک ہوگا؟'' ''بہت فیاضانہ'' انھوں نے کہا: ''ہندستان کا رویہ خواہ جیسا بھی ہو۔ حال آں کہ میں امید کرتا ہوں کہ کانگریس عدل کرے گی۔ ہم پاکستانیوں نے فیصلہ کیا ہے کہ ہم ہندوؤں اور اقلیتوں کے ساتھ فیاضانہ سلوک روا رکھیں گے۔ میں آپ کو دکھاؤں گا کہ اقلیتوں کے ساتھ کیسا برتاؤ کیا جانا چاہیے۔''

تیسرے سوال کے جواب میں انھوں نے کہا کہ ''وہ پاکستان میں ہندو اقلیت کو وہ سب حقوق دیں گے جو وہ مسلمانوں کے لیے ہندستان میں مانگتے رہے ہیں۔''

جناح صاحب کے جوابات اصولاً بالکل درست تھے، لیکن ان میں مستقبل کی بصیرت بالکل نہ تھی، دراصل حالات کے جس تسلسل میں قومی وملی زندگی کا یہ سفر طے کیا گیا تھا، اس کے ردعمل اور نتائج کو بالکل نظرانداز کردیا گیا تھا۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ نہ تو جناح صاحب اپنی زندگی ہی میں وہ مقصد حاصل کرسکے اور نہ ان کے جانشینوں میں کوئی اس مقام کو حاصل کرسکا۔ میرے خیال میں کوئی ایک شخص بھی اس فکر سے اور اس کے نتائج کی اہمیت سے آگاہ نہ تھا! خود جناح صاحب کی زندگی میں جس طرح شرما صاحب کو پاکستان سے بھاگنا پڑا، وہ اس بات کا بین ثبوت ہے۔

ہندستان سے جناح صاحب کی روانگی:

''دینا نے اپنے باپ کے ساتھ پاکستان جانے سے انکار کردیا۔ ان کی پیاری بیوی رُتی کی قبر پیچھے ہندستان میں رہ گئی۔ انھوں نے آخری بار رُتی کی قبر کی زیارت کی۔ ''ہمیشہ کی طرح، تنہا، بالکل خاموش صبح سویرے سورج کی روشنی میں محمد علی جناح بمبئی کے قبرستان کے ایک گوشے میں ایک سادہ پتھر کی قبر کے پاس پہنچے، یعنی اپنی خوابوں کی دھرتی پاکستان روانہ ہونے سے پہلے انھوں نے پھولوں کا ایک گلدستہ قبر پر رکھا۔ وہ قبر جس کو وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ہندستان میں چھوڑے جارہے تھے۔''

''ہندستان سے رخصت ہونے سے پہلے انھوں نے اپنی آخری اپیل میں ہندوؤں اور مسلمانوں سے کہا کہ ''ماضی کو دفن کردیں۔'' ہندستان کے لیے کامیابی اور خوش حالی کی تمنا کا اظہار کیا۔ (ایضاً)

باب: ۶

جناح صاحب کا پاکستان میں ورود

اس طرح مسلم مفاد کا واحد نمائندہ ۷/اگست ۱۹۴۷ء کو بہ حفاظت عازم پاکستان ہوا اور پانچ کروڑ مسلمانوں کو خاک وخون میں تڑپنے کے لیے اپنے پیچھے چھوڑ گیا۔" چار گھنٹے کے سفر کے بعد وہ کراچی پہنچ گئے۔ لیکن وہ اداس اور بجھے بجھے تھے۔ لیفٹنٹ جنرل گل حسن خاں کراچی کے ماری پور ہوائی اڈے پر استقبال کے لیے موجود تھے۔ بعد میں یہ جناح کے اے۔ڈی۔سی۔ مقرر ہوئے، لکھتے ہیں:

"ہوائی جہاز کا دروازہ کھولا گیا اور قاید اعظم شیروانی، شلوار اور مشہور جناح ٹوپی میں اس سے برآمد ہوئے۔ دروازے میں کھڑے ہو کر آس پاس نظریں ڈالیں۔ جب وہ اترنے والے تھے ہوائی جہاز کی طرف بھگدڑ مچی۔ ارادہ بدل دیا۔ داہنا پیر ریمپ پر سے پیچھے ہٹایا، دروازے کے بیچوں بیچ کھڑے ہو کر ہاتھ کی چھڑی گھمائی۔ یہ بتانے کے لیے کہ استقبال میں بہتر نظم ہونا چاہیے۔"

پولیس نے لوگوں کو سنبھالا اور اس کے بعد ہی جناح نیچے اترے۔ گل حسن خان آگے تحریر کرتے ہیں:

"سیدھے قدموں سے وہ آہستہ چل رہے تھے، انھوں نے مسلمانوں کے لیے ایک علاحدہ وطن حاصل کرنے کی سمت میں تاریخی کامیابی حاصل کی تھی۔ اس کے باوجود انھوں نے کسی جذبے کا اظہار نہیں کیا اور یہ عظیم استقبال بھی ان کو متاثر نہ کر سکا۔"(۱)

سیکولر اسٹیٹ کا قیام:

اب چوں کہ ان کو پاکستان حاصل ہو چکا تھا اس لیے انھوں نے اس کو ایک مثالی ملک بنانے کی کوشش کی۔ سچے معنوں میں ایک جمہوری اور جدید ریاست جہاں ہندوؤں اور

(۱) میمائرز: لیفٹنٹ جنرل گل حسن خاں، کراچی، ۱۹۹۳ء، ص ۷۰ تا ۷۷

مسلمانوں میں ایکتا ہو اور جہاں اقلیتوں کو عدل کے ساتھ حقوق حاصل ہوں۔

''وہ نئی مملکت کو اسلامی اصولوں پر نہیں بنانا چاہتے تھے۔''

سچائی تو یہ ہے کہ اس بات کو انھوں نے ملاؤں کو پہلے ہی بتا دیا تھا۔ ۱۹۴۴ء میں احرار نے مسلم لیگ کی حمایت کرنے کی پیش کش کی، بشرطے کہ وہ ریاست پاکستان کو اسلامی اصولوں پر بنانے کی یقین دہانی کرائیں۔ جناح نے ان کی پیش کش کو مسترد کر دیا تھا۔ پاکستان جانے سے پہلے جناح نے اس کو دوہرایا تھا۔ بہ قول اسکندر مرزا:

''ہم سب کے دہلی چھوڑنے سے پہلے میں نے ایک دن قایداعظم سے کہا:

''جناب ہم سب پاکستان جانے کے لیے تیار ہیں لیکن وہاں حکومت کی کیا صورت ہوگی۔'' ؟ کیا وہاں اسلامی حکومت ہوگی؟'' فضول بات!'' انھوں نے جواب دیا۔ ''ہم وہاں جدید طرز کی حکومت بنائیں گے۔''(۱)

دو قومی نظریے کی تدفین:

''پاکستان دو قومی نظرے پر بنا تھا جس کو جناح نے خود ترک کر دیا۔ انھوں نے دستور ساز اسمبلی میں کہا کہ ہندو اور مسلمان دو قومیں نہیں ہیں، دو فرقے ہیں۔''(۲)

کتنا بڑا انقلاب آ گیا تھا، ان کے خیالات میں۔ دسمبر ۱۹۳۹ء میں جب انھوں نے اپنے سیکریٹری مرزا راشد علی بیگ سے صوبوں میں کانگریسی وزارتوں کے استعفے پر یوم نجات ومسرت پر بیان لکھوایا تھا تو صاحب قلم نے ہندوؤں اور مسلمانوں کو دو فرقے بتایا تھا تو جناح صاحب نے دونوں لفظوں کو ان کے محلِ استعمال میں کھرچ کھرچ کر ''دو قوموں'' کے جملے سے بدل دیا تھا۔ آج خود اس کے برعکس پاکستان میں مختلف مذاہب رکھنے والوں کو الگ الگ قومیں نہیں فرقے تسلیم کرتے ہیں! یا للعجب:

''۱۱ر اگست ۱۹۴۷ء کو پاکستان دستور ساز اسمبلی کا افتتاح کرتے ہوئے انھوں نے اعلان کیا:

---

(۱) سیکولر اور وطن پرست جناح: ص ۲۹۰

(۲) ایضاً: ص ۲۹۵

''مملکت پاکستان میں تم آزاد ہو اپنے مندروں میں جانے کے لیے، اپنی مسجدوں میں جانے کے لیے یا کسی بھی عبادت گاہ میں جانے کے لیے۔ تمھارے مذہب، عقیدے یا مسلک کا اس بنیادی اصول سے کوئی تعلق نہیں ہے کہ ہم سب ایک مملکت کے برابر کے شہری ہیں۔ میرا خیال ہے کہ ہمیں اس آدرش کو نظروں کے سامنے رکھنا ہے۔ وقت گزرنے پر ہندو ہندو نہ رہے گا اور مسلمان مسلمان نہ رہے گا۔ یہ مذہبی تناظر میں نہیں ہے، کیوں کہ مذہب فرد کا انفرادی معاملہ ہے۔ یہ بات مملکت کے شہریوں کے سیاسی تناظر میں کہی گئی ہے۔''

''جناح نے سات کروڑ عوام سے برداشت کا مادہ پیدا کرنے کی اپیل اردو میں نہیں بلکہ انگریزی میں کی۔ ان میں صرف دس فیصدی خواندہ تھے اور وہ بھی صرف اپنی زبان میں۔ [۱] انھوں نے محمد اسمٰعیل (آف مدراس) کی قیادت والی ہندستانی مسلم لیگ سے کہا:

''ہندستانی مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ اپنے ملک کے وفادار رہیں۔'' [۲]

ہندو مسلمان... برابر کے شہری:

۱۹۴۸ء میں ڈھاکہ میں جناح نے خصوصی طور سے اقلیتوں کے ساتھ منصفانہ و بہتر سلوک کا یقین دلایا۔ (پاکستان) دستور ساز اسمبلی میں حزب مخالف کے لیڈر اور پرانے کانگریسی مسٹر سرس چندر چٹوپادھیاے سے جناح نے کہا:

''دو باتیں آپ لوگوں کو بتادیں:

۱) ڈریں نہیں اور

۲) پاکستان چھوڑ کر نہ جائیں!

کیوں کہ یہ ایک جمہوری ریاست بنے گا اور ہندوؤں کے بھی وہی حقوق ہوں گے جو مسلمانوں کے!

ڈھاکہ میں ۱۲؍مارچ ۱۹۴۸ء کو عام جلسے سے خطاب کرتے ہوئے انھوں نے کہا:

''پاکستان میں ہم اقلیتوں کے ساتھ منصفانہ برتاؤ کریں گے۔ ان کی زندگیاں

---

(۱) ہیکٹر بلیتھو: ص ۱۹۷

(۲) ایم ایس ایم شرما: ص ۱۷۳

اور جائیدادیں پاکستان میں ہندستان کے مقابلے میں کہیں زیادہ محفوظ ہوں گی۔
ہم امن، قانون، نظم ونسق قایم کریں گے اور بلا تفریق ذات، عقیدہ اور فرقہ،
پاکستان کے ہر شہری کو حفاظت اور تحفظ فراہم کریں گے۔''(۱)

اقلیتوں کے محافظ:

انھوں نے ہندستان کے پاکستان میں پہلے سفیر سری پرکاش کو بتایا کہ ان کا پاکستان کو ایک جدید سیکولر ریاست بنانے کا ارادہ ہے۔ ان کی کسی سے کوئی مخاصمت نہیں تھی۔ حقیقت میں وہ اپنے پرانے ہندو مسلم ایکتا کے رول کی طرف دوبارہ جانا چاہتے تھے۔ انھوں نے یقین دلایا کہ جس طرح سالوں تک وہ ہندستان میں اقلیتوں کے چیمپین رہے، اسی طرح پاکستان میں بھی اقلیتوں کے مفاد کی نگرانی کرتے رہیں گے۔

''میرے عزیز دوست! بلند آواز میں انھوں نے ایم۔ ایس۔ ایم۔ شرما سے کہا:'' اب میں پاکستان میں ہندو اقلیت کا پروٹیکٹر (محافظ) جنرل بننے جارہا ہوں۔ مجھے آپ کی مدد پر بھروسا ہے۔ انکار نہ کرنا۔''(۲)

ایم ایس ایم شرما روزنامہ گزٹ آف کراچی کے ایڈیٹر تھے۔ تقسیم ہند کے بعد اخبار کو ہوشنگ این ای ڈین شا سے رام کرشن ڈالمیا نے خرید لیا۔ جناح نے سنا کہ ایم۔ ایس۔ ایم۔ شرما دہلی میں ہیں تو انھیں بلایا اور کہا ''بہت اچھی خبر ہے'' اور یہ انھوں نے تین چار مرتبہ کہا'' میں آپ کو ڈالمیا کے لیے فایدہ مند بنادوں گا۔ کراچی میں ٹھہرے رہو۔''

ایم ایس ایم شرما کو یقین دلانے کے لیے انھوں نے دلیل دی۔

''کیا میں نے کبھی ایک لفظ وجے راگھو چاریئر، پنڈت مالویہ، سچدانند سنہا یا سی۔ پی۔ راما سوامی کے خلاف کہا ہے؟ یہ سب مجھے سنگ سار کرنے کی کوشش میں لگے ہیں۔ یہ میرے ذاتی دوست ہیں۔ میں ان کو جواب نہیں دوں گا۔

---

(۱) سیکولر اور وطن پرست جناح: ص۹۶۔۲۹۳

(۲) پیپس انٹو پاکستان: ص۱۳۵

جناح صاحب کا استقبالیہ:

''ہندستان کے یوم آزادی یعنی ۱۵/اگست ۱۹۴۷ء کو انھوں نے استقبالیہ دیا جس میں بھیم سین سچر، کرن شنکر رائے، نہچل داس، ایس سی وزیرانی، مسٹر جسٹس مہاجن، ایم ایس ایم شرما اور دیگر معزز مہمانوں نے شرکت کی۔

حسن شہید سہروردی، بنگال کے سابق وزیر اعلیٰ اور ہندو مسلم اتحاد کے مبلغ بھی کراچی آئے۔ ان کی تجویز تھی کہ ہندستانی و پاکستانی محبان وطن ہندستان و پاکستان کے دونوں پرچم ساتھ ساتھ لہرائیں۔ جناح نے اس تجویز کو منظور کیا۔ اخبار ڈیلی گزٹ (کراچی) کی عمارت پر یہ دو جھنڈے ۱۵/اگست ۱۹۴۷ء کے دن ساتھ ساتھ لہرائے گئے۔

جناح نے پاکستان اقلیتی ایسوسی ایشن بنانے کی تجویز رکھی۔ اس خیال کو ہیمن داس ودھوانی نے عملی جامہ پہنایا۔ وہ اس ایسوسی ایشن کے صدر اور ایم۔ ایس۔ ایم۔ شرما نائب صدر بنائے گئے۔

مہاتما گاندھی کے چیلے نارائن ملکانی گاندھی جی سے مشورہ کرنے کے بعد دہلی سے لوٹے اور انھوں نے اقلیتی بورڈ قایم کرنے کا منصوبہ پیش کیا جس کے دو صدر مقام ہوں، دہلی اور کراچی میں''! (۱)

پاکستان کے بانی اور ان کا اسٹینوگرافر:

تحریک پاکستان کے اذکار میں جناح صاحب کی طرف سے مسلم لیگ کے ممبروں کو کوئی خاص توجہ نہیں دی گئی۔ جب مسلم لیگ کے ایک ممبر اسکندر مرزا نے لیگیوں کے بارے میں ہمدردی کے ساتھ غور کرنے کو کہا، کیوں کہ ان کی کوششوں سے پاکستان وجود میں آیا تھا تو جناح نے ذرا ترشی سے کہا۔

''آپ سے کس نے کہا کہ مسلم لیگ نے پاکستان بنایا؟ میں پاکستان کو اپنے اسٹینوگرافر کے ساتھ لے کر آیا ہوں۔'' (۲)

---

(۱) سیکولر اور وطن پرست جناح: ص ۹۲-۲۹۰

(۲) فیکٹس آر فیکٹس: ولی خان، ص ۱۱۰

ہندستان سے برابری:

☆ جوگندر ناتھ منڈل (شیڈولڈ کاسٹ) کو جناح نے دستور ساز اسمبلی کا چیئر مین چنا۔ بعد میں وہ پاکستان کے وزیر قانون مقرر ہوئے۔ ہندستان میں ڈاکٹر بی آر امبید کر ہندستان کی دستور ساز اسمبلی کی ڈرافٹ کمیٹی کے صدر منتخب ہوئے تھے اور اس کے بعد ہندستان کے پہلے وزیر قانون چنے گئے۔

☆ گاندھی جی نے ۳۰ رجنوری ۱۹۴۸ء کی صبح اپنی وصیت دوبارہ تحریر کی اس میں انھوں نے کانگریس کو توڑنے اور اس کو لوک سیوک سنگ میں تبدیل کرنے کی صلاح دی تھی۔ جناح نے کراچی میں آل انڈیا مسلم لیگ کی میٹنگ میں یہی صلاح دی، کیوں کہ اس (مسلم لیگ) نے اپنا مقصد حاصل کرلیا ہے، اس لیے اس کو ختم کر دیا جائے۔ [1]

بادشاہ خان سے ملاقات:

☆ سیکولر پاکستان بنانے کے لیے جناح نے خدائی خدمت گار پارٹی کے رہنما بادشاہ خان سے مدد مانگی۔ خدائی خدمت گار پارٹی انڈین نیشنل کانگریس کی متحدہ ہندستان میں اتحادی تھی۔

جناح نے کہا:

> ”خان صاحب میں جانتا ہوں کہ آپ باکردار اور ایمان دار شخص ہیں۔ پاکستان کی تعمیر میں مجھے آپ جیسے ایمان دار لوگوں کی ضرورت ہے اور اِس وقت میں چوروں اور لفنگوں میں گھرا ہوں، اس لیے ان غریب مسلمانوں کے لیے کچھ نہیں کرسکتا جنھوں نے بڑی تکلیفیں اٹھائی ہیں۔“

انھوں نے مزید کہا:

> ”میں لوگوں کی کم سمجھی کا شکار ہوں۔ میں یہ خون خرابہ نہیں چاہتا تھا۔ میں امن چاہتا ہوں۔ یقین کیجیے میں عوام الناس کے لیے کچھ کرنا چاہتا ہوں۔“ [2]

---

(۱) ایم ایس ایم شرما: ص ۱۸۵

(۲) پاکستان ایکسریڈ: رامانی، ہاشو کیول، ص ۴۸، ۴۹

انھوں نے خان صاحب سے مسلم لیگ میں شامل ہونے کی اپیل کی تا کہ اُن کی پوزیشن مضبوط ہو سکے لیکن وہ (بادشاہ خان) اس کے لیے تیار نہ ہوئے، کیوں کہ مسلم لیگ سیکولر پارٹی نہیں تھی۔ جناح نے تب کہا:

''میں خود مسلم لیگ کو نیشنل لیگ میں تبدیل کرنے کی فکر میں ہوں جس کا دروازہ ہر وفادار پاکستانی کے لیے کھلا ہوا ہو، لیکن مجھ پر پاگل ملاّ اور انتہا پسند حملے کر رہے ہیں۔ اُن کا مقصد میرے لیے مشکلیں پیدا کرنا ہے۔ اسی لیے میں چاہتا ہوں کہ آپ اور آپ کے ساتھی مسلم لیگ میں شامل ہو جائیں تا کہ میں ان خطرناک عناصر کو نکال باہر کرسکوں۔''(۱)

لیکن خان صاحب نے جناح کی پیش کش مسترد کر دی اور کہا کہ وہ سماجی خدمت کرنا چاہتے ہیں۔ خان نے اپنے نظریے کے متعلق کہا۔

''ایک سماجی طور سے پسماندہ قوم میں ہوش مند سیاسی فہم پیدا نہیں ہوتا اور بغیر عمدہ سیاسی فہم کے جمہوریت ممکن نہیں۔ اس لیے میں سماجی سرگرمیوں میں خود کو لگانا چاہتا ہوں۔''

بادشاہ خان کہتے ہیں کہ جناح پر'' گہرا اثر ہوا۔ انھوں نے کرسی سے اٹھ کر مجھے گلے لگا لیا اور وعدہ کیا کہ جس چیز کی بھی مجھے ضرورت ہوگی وہ مہیا کر دیں گے۔'' انھوں نے دو لاکھ چرخوں کا (جس کا وہ پہلے مذاق اڑاتے تھے) بادشاہ خان کی سماجی سرگرمیوں کے لیے آرڈر دیا۔''(۲)

دونوں بڑوں کے مابین نہایت اخلاص کے ساتھ پاکستان اور اہل پاکستان کی خدمت کا یہ فیصلہ ہو گیا تھا۔ لیکن لیگیوں نے خصوصاً خان عبدالقیوم خان نے اسے سبوتاژ کر دیا۔ سرحد کے دورے میں بادشاہ خان کے مکان پر جا کر ان سے ملنا اور تعلقات کو پختہ کرنا اور خدمت قوم و وطن کو مستحکم بنانا، جناح صاحب کے پروگرام کا حصہ تھا۔ لیکن قیوم خان اور ان

(۱) ایضاً

(۲) تھرون ٹو دی وولف عبدالغفار خان : پیارے لال، کلکتہ، ۱۹۶۶ء ص ۹۹، ۱۰۰

کے ساتھی مانع ہوئے اور جناح صاحب کے ذہن میں یہ بات ڈالی کہ بادشاہ خان سے ان کے مقام پر جا کر ملنا قومی مصالح کے خلاف ہے اور وہ اپنی سیاست میں اس سے فایدہ اٹھائیں گے۔ اس طرح پاکستان اور اہل پاکستان کی خدمت کے بہترین امکانات سازش کی نذر ہو گئے۔

لیگ کی صدارت:

''انھوں نے سابق کانگریسی خلیق الزماں کو مسلم لیگ کا صدر مقرر کیا۔ اپنا ذاتی محافظ ایک پارسی انسپکٹر ایف۔ سی۔ ہنسوٹیا کو بنایا۔ سرکاری افسروں کے اس اعتراض پر کہ ہنسوٹیا غیر مسلم ہے، اس کو ہٹانے سے انکار کر دیا۔''(۱)

جناح صاحب کا طرزِ عمل:

''بنیادی طور سے جناح سیاست داں تھے۔ انھوں نے مذہبی اور رجعت پسند ملاؤں کا کانگریس سے انتقام لینے کے لیے ساتھ دیا تھا لیکن جب ان پڑھ، معصوم لوگ اُن کو مذہبی لیڈر سمجھتے تو وہ غصہ ہوتے، چڑ جاتے اور جز بز ہو جاتے تھے۔ سندھ کے ایک چھوٹے قصبے میں گاؤں والوں کے ایک جلوس نے اُن کا استقبال کیا۔ انھوں نے ''مولانا محمد علی جناح زندہ باد'' کے نعرے بلند کیے۔ جناح کو بُرا لگا اور انگلی سے مجمع کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ ''مجھے مولانا کہنا بند کرو۔ میں تمھارا مذہبی لیڈر نہیں ہوں۔ میں سیاسی لیڈر ہوں۔ مجھے مسٹر جناح کہو، مولانا نہیں! کیا تم سمجھتے ہو؟''(۲)

''اکتوبر ۱۹۴۷ء میں ایک لاکھ سے زاید لوگوں کے عوامی جلسے کو خطاب کیا۔ انھوں نے تقریر اردو میں شروع کی مگر دو منٹ ہی بولے ہوں گے کہ انگریزی میں بولنا شروع کر دیا۔ بھیڑ نے شور مچایا ''اردو، اردو'' لیکن انھوں نے کہا کہ اخبار والوں کے لیے انھیں انگریزی میں بولنا پڑ رہا ہے۔ صحافی اگلی صف میں بیٹھے تھے۔ اتنا کہہ کر وہ انگریزی میں بولنے لگے حال آں کہ مجمع میں زیادہ تر لوگ ان پڑھ تھے۔''(۳)

---

(۱) لیفٹیننٹ جنرل گل حسن خاں: ص ۷۵ (۲) ہیکٹر بلیتھو: ص ۲۱۳

(۳) لیفٹیننٹ جنرل گل حسن خاں: ص ۸۰

باب: ۷

تقسیمِ ملک میں عجلت! چہ معنی دارد؟

تحریک آزادی ہند پاکستان کا یہ ایک اہم موضوع ہے۔ ملک کے آخری وائسرائے لارڈ ماؤنٹ بیٹن انتقال اقتدار کے انتظامات کے لیے ہندستان پہنچے تو اس کی آخری حد ۵؍ جون ۱۹۴۸ء تھی۔ یہ بات انھوں نے ایک بار نہیں، کئی بار اپنی زبان سے دہرائی اور اس وقت کی دستاویزات میں موجود ہے۔ لیکن ابھی تین مہینے گزرے تھے کہ ۳۱؍ مئی ۱۹۴۷ء کو لندن کے سفر سے لوٹے تو یہ ایک سوا سال کی مدت سکڑ کر صرف ڈھائی مہینے رہ گئی تھی! حال آں کہ پہلے شبہ تھا کہ انتقال اقتدار کے تمام امور سوا سال کی مدت میں بھی کیوں کر انجام پاسکیں گے! اس بات کو ایم جے اکبر مولف "ہندستان اپنے حصار میں" کے سوا کسی اور مورخ یا مبصر نے موضوع نہیں بنایا۔ حال آں کہ یہ ایک اہم موضوع ہے۔ اب یہ بات قطعی واضح ہوگئی ہے کہ تقسیم ملک کے منصوبے سے نہ تحریکِ پاکستان کے بانی متفق تھے اور نہ کانگریس کے رہ نماؤں میں سے کوئی راضی تھا۔ اب چوں کہ استعمار کی مصلحت تقسیم میں ٹھہری تھی، اس لیے یہ بھی طے کرلیا گیا تھا کہ یہ عمل اس تیز رفتاری کے ساتھ انجام دیا جائے کہ خوب وزشت کی بحث اور غور وفکر کی کسی کو مہلت ہی نہ ملے اور فہم وبصیرت کی آنکھ کھلے تو معلوم ہو کہ سب کچھ ختم ہو چکا ہے۔ چناں چہ ٹھیک یہی واقعہ پیش آیا۔ تقسیم کا مطالبہ جناح صاحب نے کیا اور اب انھی نے اپنے مطالبے سے رجوع کرلیا تھا۔ ڈاکٹر اجیت جاوید رقم طراز ہیں:

"کانگریس کا تقسیم قبول کرنا جناح کے لیے ایک زبردست دھچکا تھا۔ ان کی زبان بند ہوگئی اور جب لارڈ ماونٹ بیٹن نے ان سے پوچھا تو انھوں نے تائید میں سر ہلا دیا۔ وہ اپنی سیاست کا خود شکار ہو گئے تھے کہا جاتا ہے کہ تقسیم منظور کرنے کے بعد بھی وہ لارڈ ماونٹ بیٹن سے ملے اور ان سے کہا کہ وہ پاکستان نہیں۔ متحدہ ہند

میں کانگریس اور برطانوی حکومت سے باعزت معاملات طے کرنا چاہتے ہیں۔
لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے انھیں جھڑک دیا کہ متبادل کے لیے بہت دیر ہو چکی ہے۔''(۱)

جناح۔ ماؤنٹ بیٹن ملاقات کا یہ واقعہ ۳؍جون ۱۹۴۷ء کے اعلان کے بعد کا ہے۔ اس موقع پر جناح صاحب کے بدلے ہوئے جن خیالات کا اظہار ہوا، اس کو ماؤنٹ بیٹن نے پہلے ہی محسوس کر لیا تھا۔ اسی لیے انھوں نے مئی کے تیسرے ہفتے کے آغاز میں لندن جاتے ہوئے لیاقت علی خاں سے کہہ دیا تھا کہ وہ زیر نظر منصوبے سے اتفاق کی ایک تحریر لکھ کر بھیج دیں۔ اس قسم کی کوئی تحریر انھوں نے پنڈت جواہر لال نہرو اور سردار بلدیو سنگھ سے حاصل نہیں کی تھی۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ انھیں جناح صاحب کے پھر جانے کا خطرہ تھا۔ اس بات کا بھی قوی امکان ہے کہ لیاقت علی خان جناح صاحب کے بدلتے ہوئے خیالات سے واقف تھے لیکن انھیں اپنے لیڈر سے اتفاق نہ تھا۔ اور اسی لیے انھوں نے ماؤنٹ بیٹن کے سیکریٹری سے مل کر یہ سازش کی کہ یہ اظہار خود جناح صاحب سے لیا جائے اور اخبار میں چھپوا بھی دیا جائے۔ لندن سے واپسی کے بعد ۳۱؍مئی سے ۳؍جون ۱۹۴۷ء تک ماؤنٹ بیٹن اور جناح صاحب میں منصوبے کی منظوری کے لیے اصرار و گریز کی جو کشمکش ملتی ہے، اس کا پس منظر یہی ہے کہ اب جناح صاحب تقسیم ملک کے مطالبے سے رجوع کر چکے تھے اور ماؤنٹ بیٹن ہندستان کی تقسیم کا فیصلہ کر چکے تھے۔

ایم جے اکبر نے تقسیم ملک میں عجلت کا جو تجزیہ کیا ہے، اس میں غور و فکر کے لیے کئی اہم نکات ہیں لیکن کیا جناح صاحب پر یہ الزام آ سکتا ہے کہ انھیں اس لیے جلدی تھی تا کہ وہ زندگی کے آخری دور میں اس کے اقتدار سے لطف اندوز ہو سکیں! اگر وہ اس بات کے خواہاں بھی ہوتے تو اس کے لیے انھیں الزام نہیں دیا جا سکتا تھا۔ سوچنے کی اصل بات یہ ہے کہ انگریزوں کو کیا جلدی تھی؟ وہ تو اقتدار چھوڑ رہے تھے۔ ان کے ہاتھ سے تو سونے کی چڑیا

(۱) سیکولر اور وطن پرست جناح: ص ۸۶۔۲۸۵۔ بہ حوالہ پیپس اِن ٹو پاکستان: ص ۴۷

نکل رہی تھی۔ انھیں تو اپنے اقتدار کی مدت کو طول دینا چاہیے تھا!

اب آپ کو ایم جے اکبر کے افکار و خیالات سے استفادہ کرنا چاہیے اور ممکن ہو تو پورے چار صفحے کے اس مضمون کے مطالعے سے اپنے ذوق کی تسکین کا سروسامان کیجیے۔

(ا۔س۔ش)

"۲۰ رفروری ۱۹۴۷ء کو وزیر اعظم کلیمنٹ ایٹلی نے بالآخر برطانیہ کے اقتدار کے خاتمے کا اعلان کیا۔ آخری سامراجی لارڈ ویول کو ہٹایا اور بتایا کہ جون ۱۹۴۸ء تک لارڈ ماؤنٹ بیٹن اس سلسلے کی اختتامی تقریبات کی سربراہی کریں گے۔ آخری تاریخ کے آنے میں ابھی ایک سال سے زاید کی مدت باقی تھی۔ حالات کی نزاکت کے پیش نظر لارڈ ماؤنٹ بیٹن، مدت میں مختصر سی مزید توسیع کے لیے نہایت آسانی سے درخواست کر سکتے تھے۔ مگر انھوں نے التوا یا تاخیر کے بجائے بے حد جلدی کی۔ ان کی اس جلد بازی کی کوئی منطقی وضاحت آج تک نہیں ہو پائی ہے۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن کا عذر یہ رہا ہے کہ اگر انھوں نے انتقال حکومت میں ذرا بھی تاخیر کی ہوتی تو اس کی قیمت اس سے کہیں زیادہ ہوتی جو دینی پڑی۔ مگر یہ محض ایک مفروضہ ہے۔ بہ ہر حال یہ سمجھ میں آنا مشکل ہی نظر آتا ہے کہ اس صورت میں اور ابتری ہی ہوتی۔ کیوں کہ نہ صرف ملک ہی تقسیم ہوا تھا بلکہ چند ہفتوں کے اندر ہزاروں انسانی جانیں اس تقسیم کی نذر ہو گئی تھیں، اور اسی کی وجہ سے جنگوں (قتل و غارت) کا ایک ایسا سلسلہ شروع ہو گیا تھا جو اب بھی ختم نہیں ہو پایا ہے۔ یہ کہا جاتا رہا ہے کہ انگریزوں نے انتقال حکومت میں اتنی جلدی اس لیے دکھائی کہ وہ ایک ایسی بات جانتے تھے جو ان کے اور خود جناح صاحب کے علاوہ کوئی تیسرا نہیں جانتا تھا، اور یہ بات یا یہ راز تھا پاکستان کے خالق جناح صاحب کا دق کا مرض، اپنی آخری حدود پر پہنچ چکا تھا، اور اگر وہ پاکستان کے قیام کے منصوبے کے اعلان سے پہلے مر جاتے تو شاید ایک الگ ملک کے مطالبے کی تحریک دم توڑ دیتی۔ اس اندازِ فکر کا جواز موجود تھا۔ جیسا کہ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں کہ مسلمان ووٹروں نے مسلم لیگ کی حمایت کبھی نہیں کی۔ اور پاکستان کی تحریک نے صرف چوتھی دھائی کے وسط میں اس وقت تقویت حاصل کی جب جناح صاحب خوف و ہراس کی

فضا بنانے میں پورے طور پر کامیاب ہو گئے، انگریزوں کے خلاف اس نے نہ تو کوئی تحریک خود چلائی اور نہ ہی کسی ایسی تحریک میں شرکت کی۔ اپنے سارے جوش و خروش اور غم و غصے کو کانگریس کے لیے محفوظ رکھا جو نو آباد کاروں کی مخالفت بدستور جاری رکھے ہوئے تھی۔ دوسری طرف جناح صاحب ہر ہر موقع پر انگریز کے ساتھ تعاون کر رہے تھے۔ چناں چہ جب کانگریس وزارتوں نے استعفے دے دیے تو جناح صاحب نے اعلان کیا کہ ۲۲ نومبر ۱۹۳۹ء کو ''یوم نجات'' منایا جائے گا۔ جنگ کے زمانے میں بنگال جیسے اہم صوبے میں لیگ کو حکومت کا وہ مزا مل گیا جس سے وہ ۱۹۳۷ء میں محروم رہی تھی۔ جناح صاحب کو اس بات کا موقع ملا کہ وہ ریاستی مشینری کو اپنے پروپیگنڈے کے لیے ہتھیار کی طرح استعمال کریں۔ ۱۹۳۷ء میں مسلم لیگ نے ''ہندو کانگریس سے اسلام کو خطرہ'' کے نعرے کو اپنی مہم کا موضوع بنایا تھا جسے بہ ہر حال مسلمانوں نے مسترد کر دیا تھا۔ اب انگریزوں نے فیصلہ کیا اور انتہائی اہم اور تشویش ناک فیصلہ، یعنی انتخابات میں شکست کھائے ہوئے ان ہی جناح صاحب کو ہندستانی مسلمانوں کی واحد نمائندہ آواز بننے کا حق دینے کا فیصلہ۔ ۱۹۴۶ء کے اوائل میں جب جنگ سے تھکے ہوئے اور نڈھال انگلستان نے ہندستان کے مسئلے کا حل ڈھونڈنا شروع کیا تو جناح صاحب کو اس بات پر پورا اعتماد تھا کہ اگر برصغیر تقسیم نہ کیا گیا تو وہ ہندستان میں سول وار کی دھمکی تو دے ہی سکیں گے۔ ۱۶/اگست ۱۹۴۶ء کو یوم راست اقدام کے ذریعے بنگال میں شہید سہروردی کی مسلم لیگی حکومت نے یہ بات ثابت کر دی کہ برسر اقتدار لیگ کیا کچھ کر سکتی ہے۔ کلکتہ خوف ناک فسادات کی لپیٹ میں آ گیا۔ لیگ کے مسلح کارکنوں نے بڑے پیمانے پر ہندوؤں پر حملے شروع کر دیے۔ ان کے جواب میں ہندوؤں نے بھی ویسی ہی شقاوت اور بربریت کا مظاہرہ کیا۔ یہ سول وار کی دھمکی کے سچ ہونے کا ایک انتباہ تھا۔ قتل و آتش زنی کا دور دورہ ہوا۔ دلوں میں خوف و ہراس بیٹھ گیا، اور یہی وہ غیر فطری ماحول تھا جس میں مسلم لیگ نے اپنے ووٹوں کی تعداد میں اضافہ کرنے کا اہتمام کر لیا۔ فروری ۱۹۴۷ء کو آزادی کا اعلان ہو گیا۔ مارچ میں ماؤنٹ بیٹن آئے۔ اپریل کے آغاز میں ماؤنٹ بیٹن نے جناح صاحب سے چھ ملاقاتیں کیں۔ ۱۰/اپریل کو برطانیہ نے تقسیم کو منظور

کرلیا۔ یکم مئی کو کانگریس نے ہتھیار ڈال دیے، اور اس کی ہائی کمان نے نہرو کو ایک منقسم ہندستان کی آزادی کو مان لینے کا اختیار دے دیا۔ گاندھی جی نے بڑی بے چارگی کے ساتھ، جو کچھ ان کے چاروں طرف ہو رہا تھا، اس میں معنویت پیدا کرنے کی کوشش کی، مگر ناکامی کا منہ دیکھا۔ انھوں نے کانگریس سے، ایک متحدہ ہندستان میں جناح صاحب کو برسر اقتدار آنے دینے کی اپیل تک کی۔ مگر قتل و غارت گری اور بربریت کے اس بے نظیر دور دورے میں انسانیت اور سمجھ داری کی بات کون سنتا۔

۲/ جون کو ایک گول میز کانفرنس میں تقسیم کے فیصلے پر مہر تصدیق ثبت ہوئی۔ کانفرنس میں نہرو، سردار پٹیل اور اچاریہ کرپلانی نے کانگریس کی نمایندگی کی۔ مسلم لیگ کی طرف سے جناح صاحب لیاقت علی خاں اور سردار عبدالرب نشتر شریک ہوئے۔ برطانیہ کے ترجمان ماؤنٹ بیٹن، لارڈ اسمے اور سر ایرک میویل تھے۔ ۴/ جون کو لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے ہندستان کے وائسرائے کی محض دوسری پریس کانفرنس کو خطاب کیا اور اعلان کیا کہ ۱۵/ اگست کو حکومت منتقل ہو جائے گی۔ صرف دو ماہ باقی تھے۔ سرحدوں کے تعین کا سب سے دشوار کام ابھی تک شروع بھی نہیں ہوا تھا۔ وکیل سر سیسل ریڈ کلف (Sir Cycil Redcliffe) کو لندن سے بلایا گیا کہ وہ ایک ایسے برصغیر کے دل پر نشتر چلائیں جسے انھوں نے کبھی دیکھا بھی نہیں تھا۔ مُلّا ایک ملک حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔

جناح صاحب اس خوش فہمی میں مبتلا رہے کہ چوں کہ انھوں نے ۱۹۳۳ء کے ایک ناممکن خواب کو ممکن بنا کر دکھا دیا تھا، وہ اسے ایک نظریہ دینے میں کامیاب ہوں گے۔ مگر پاکستان ان لبرل اصولوں کی خاطر وجود میں نہیں آیا تھا، جن کو جناح صاحب خود اس وقت تک مانتے رہے تھے، جب تک کہ ان پر ایک ضد نہیں مسلط ہوئی تھی۔ ملاؤں نے جو کام کافی برسوں پہلے شروع کیا تھا، اس کی تکمیل میں جناح صاحب آخری مگر انتہائی موثر ہتھیار تھے۔ تاریخ نے آج یہ بات ثابت کر دی ہے کہ

☆ کون تھا جس نے حقیقتاً پاکستان کے خیال کی تشکیل کی اور

☆ مذہب کے نام پر بنے ہوئے اس ملک میں کون حکومت کرنے والا تھا۔

☆ ۱۹۴۷ء کے بعد پانچ سال کے اندر اندر لیاقت علی خاں کے قتل سے جناح صاحب کا سیکولرزم ختم ہوا۔

☆ اگلی دہائی میں ایوب خاں نے جناح صاحب کی جمہوریت کو دفن کیا اور

☆ ۲۵ برس کے اندر پاکستان تباہ ہو چکا تھا، تو پھر

۱۴ راگست کو جناح صاحب نے کیا بات ثابت کی! سوائے اس کے کہ انھوں نے یہ بھی نہ جانا کہ اپنی زندگی کے آخری دس برسوں میں انھوں نے کیا کیا تھا؟

۱۹۴۷ء کے بعد کچھ عرصے تک مُلّاؤں کو پاکستان میں اپنے اقتدار اور تسلط کو قایم کرنے کے لیے جدوجہد کرنا پڑی [1] لیکن آخر میں بہ ہر حال وہی ہوا۔

یہ صورتِ حال کب تک چلے گی یہ ایک دوسری کہانی ہے۔

(ہندستان اپنے حصار میں/ مصنف ایم جے اکبر:

پٹنہ، خدابخش لائبریری جرنل، ص ۳۰ تا ۳۳)

---

(۱) اس جملوں میں مصنف نے جن لوگوں کی طرف مُلّا کہہ کر اشارہ کیا ہے، وہ اکھاڑ پچھاڑ بیوروکریسی کی تھی جو سیاست دانوں کو نچا رہی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ مذہبی ذوق رکھنے والوں کا سیاست میں کبھی کوئی موثر کردار نہیں رہا۔ بلاشبہ جو تھوڑی بہت محب وطن اور قوم پرور جماعت سرگرم نظر آتی ہے، ان میں چند علمائے دین بھی تھے۔ مثلاً مفتی محمود! اگر ان پر اور ان جیسے علما پر یہ پھبتی کسی گئی ہے تو یہ بڑے ظلم، حقیقت سے ناآشنائی اور پاکستان کی سیاست میں علمائے دین خصوصاً جمعیت علمائے اسلام کے کردار سے عدم واقفیت کی بات ہوگی۔ ملاؤں کی جو خصوصیات تنگ نظری، انتہائی پسندی، بے بصیرتی، وقت کے تقاضوں سے عدم واقفیت، ضد، ہٹ دھرمی، وغیرہ وغیرہ بیان کی جاتی ہیں، بھلا ان سے مفتی محمود کا کیا تعلق تھا۔ ان کی سیاست نے ثابت کر دیا کہ وہ وقت کے سب سے بڑے مدبر، صاحب بصیرت، روشن خیال اور وقت کے تقاضوں سے واقف شخص تھے۔ (ا۔س۔ش)

باب: ۸

پاکستان ناگزیر تھا!

پس منظر اور پیش منظر پر ایک نظر:

مرزا راشد علی بیگ لکھتے ہیں:

''کچھ دن ہوئے میں نے لیونارڈ موسلے کی اہم کتاب ''برٹش راج کے آخری ایام'' پڑھی تو اس سے مجھ پر یہ تاثر ہوا کہ پاکستان کا قیام ایک بنیادی غلطی تھی، کہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے بڑی مہارت کے ساتھ ''بل ڈوز'' کیا کہ یہ تنہا ایک فرد، جناح کا کارنامہ تھا جو اس کے قیام کے سال بھر کے اندر ہی مر گیا اور یہ کہ اگر تقسیم جناح کے انتقال تک ٹل سکتی، تو پاکستان کا پورا تصور اس کے ساتھ ساتھ مر گیا ہوتا۔''

''ایک زمانے میں میں شاید ان خیالات کی تائید کرتا، کیوں کہ جیسا کہ میں نے پہلے لکھا ہے، میں اگرچہ جناح صاحب کے ساتھ مل کے کام کر رہا تھا لیکن میں ''تصورِ پاکستان'' کا اس درجے مخالف تھا کہ جس دن پاکستان ریزولیشن پاس ہوا، میں نے مسلم لیگ سے استعفاء دے دیا۔ اس وقت مجھے اس بات سے بھی بے حد مایوسی ہوا کرتی تھی کہ ہندستانی قوم پرستی عملاً ہندو حب الوطنی کے ہم معنی تھی۔ لیکن میرے اندر کا بنیادی لاادریہ (اغناسطی) مذہبی ریاست کے تصور سے بھاگتا تھا۔ یہ بھی تھا کہ میں اسے حل سے زیادہ فرار سمجھتا تھا اور آخری بات یوں تھی کہ میں کبھی نہیں سمجھتا تھا کہ یہ چلنے والی اسکیم ہے۔''

''لیکن بعد کے تجربے اور فکر نے میرے سوچنے کے انداز کو بدل دیا ہے کہ اگر تقسیم نہ ہوئی ہوتی تو کیا ہندو اور مسلمان ساتھ رہ سکتے اور قریب رہ کے ہندستان کی ترقی کے لیے کام کر سکتے؟ میں نہیں سمجھتا کہ جداگانہ انتخابات کے نتیجے میں دو جداگانہ، غیر مفاہمانہ پارٹیوں کے وجود کے ہوتے ایسا ممکن ہو سکتا، اور یہ افسوس ناک صورت حال جہاں تک سمجھ میں آتا ہے، غیر معینہ مدت کے لیے چلتی

رہتی۔“

یہ پورا سلسلہ ناگزیر نہیں تھا، یہ میں پہلے کچھ نہ کچھ کہہ چکا ہوں، اور اب پھر دوہراتا ہوں، مشترکہ انتخابات سے یہ عین ممکن تھا کہ ایک واقعی قومی اور سیکولر پارٹی وجود میں آجاتی۔ لیکن وقت کے ہندو زعما مسلمانوں کے مطالبات کو قبول کرنے کا کوئی راستہ نہیں نکال سکے۔ پھر بھی ایک مرحلہ پر مخلوط حکومتیں، مشترک کوشش سے مقصد کی یک جہتی پیدا کرنے میں خاصی کامیاب ہوجاتیں۔ جس کے نتیجے میں بڑی حد تک ہم آہنگی پیدا ہوجاتی، لیکن کانگریس نے یہ تجویز بھی قطعیت کے ساتھ رد کردی تھی اور ایسی کوئی بنیاد نہیں جس کی بنا پر ہم کہہ سکیں کہ کانگریس اپنا رویہ بدل لیتی۔ یہ مان لینے کی بھی کوئی معقول وجہ موجود نہیں کہ کانگریس کبھی بھی مسلمانوں کی ایک معقول تعداد کی حمایت حاصل کرکے اپنے اس دعوے کو سچ کر دکھانے کے قابل ہوپاتی کہ وہ ایسی پارٹی ہے جو تمام فرقوں کی نمائندہ ہے۔ کانگریس نے جو مسلم عوام رابطہ تحریک چلائی تھی وہ بری طرح ناکام ہوچکی تھی۔ جس کا وضاحت کے ساتھ اندازہ ۱۹۴۵ء اور ۱۹۴۶ء کے انتخابات کے نتائج سے ہوا تھا۔“

۱۹۴۵ء میں مرکزی قانون ساز اسمبلی کے انتخابات میں گویا ایک ایک مسلم نشست مسلم لیگ نے جیت لی۔ قوم پرست مسلمانوں میں بہتوں کی تو ضمانت تک ضبط ہوگئی۔ صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات میں مسلم لیگ کا ریکارڈ اس طور پر تھا:

آسام: تقریباً ساری کی ساری نشستیں مسلم لیگ کو۔

سندھ: ۲۸ نشستیں مسلم لیگ کو اور صرف ۴ قوم پرست مسلمانوں اور دوسرے گروپوں کو۔

صوبہ سرحد: ۱۷ مسلم لیگ کو ۱۹ کانگریس کو۔

پنجاب: ۸۶ مسلمان نشستوں میں سے ۷۵ مسلم لیگ کو ۴ آزاد امیدوار بھی کامیاب ہوکر لیگ میں آگئے۔

بہار: ۴۰ مسلمان نشستوں میں سے ۳۴ مسلم لیگ کو

یوپی: ۶۶ مسلمان نشستوں میں سے ۵۴ مسلم لیگ کو

بمبئی: ساری کی ساری ۳۰ مسلمان نشستیں مسلم لیگ کو

مدراس: ساری کی ساری ۲۹ مسلمان نشستیں مسلم لیگ کو

سی پی: ۱۴ مسلمان نشستوں میں سے ۱۳ مسلم لیگ کو

اڑیسہ: ساری کی ساری ۴ مسلمان نشستیں مسلم لیگ کو

بنگال: ۱۱۹ مسلمان نشستوں میں سے ۱۱۳ مسلم لیگ کو

توضیح بالا سے یہ صاف اندازہ ہوجاتا ہے کہ کانگریس کا یہ دعویٰ کہ وہ دونوں فرقوں کی نمایندہ ہے۔ حقیقت سے کہیں زیادہ ایک آرزومندانہ خیال کی حیثیت رکھتا تھا۔ اس لیے اس کا قوی امکان ہے کہ پاکستان بننے سے پہلے جو صورت حال تھی وہ غیر متعین مدت تک چلتی رہتی۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ صورت حال کچھ بدتر ہی ہونے کے امکانات تھے۔ کیوں کہ جداگانہ انتخابات سے دونوں کے درمیان خلیج وسیع تر ہوتی جارہی تھی۔ لیگ اپنی ساخت ہی میں فرقہ پرست تھی اور کانگریس کو اپنے نصب العین اور تمام تر دعووں کے باوجود ایسا ہونا پڑتا۔ مسلم لیگ کی فرقہ پرستی ہندوؤں میں ہندو فرقہ پرستی کے سوا اور کس چیز کی پرورش کرسکتی تھی اور کانگریس کے کئی عمومی نشستوں پر مقابلے کے لیے ہندو مہاسبھا کا سامنا روز بروز بڑھتا جارہا تھا۔ پھر چوں کہ ووٹ دینے والوں کی اکثریت پس ماندہ اور ذات پات کے بندھن میں جکڑی ہوئی تھی اس لیے کانگریس سیاسی طور سے حد درجہ احمق جماعت ہوتی اگر وہ ایسے امیدوار کھڑے نہ کرتی جو جیت کے امکان رکھتے تھے۔ نتیجتاً یہ دائیں بازو والی ہندو جماعت میں بدلتی جاتی (کہ منتخب شدہ ہندو فرقہ پرست محض اس لیے کہ وہ کانگریس کے ٹکٹ پر آیا ہے خود بخود سیکولر تو نہ ہوجاتا) اور پھر خلیج غالباً بڑھتی ہی چلی جاتی۔ کانگریس ہندو اکثریت کے صوبوں میں حاکم ہوتی اور مسلم لیگ مستقل تلخ مخالفوں میں، جس کا الٹا سلسلہ مسلم اکثریت کے صوبوں میں ہوتا۔ ایسی صورت حال سے بدنظمی، لامرکزیت، انارکی، حتیٰ کہ خانہ جنگی تک کی نوبت آجاتی، اور وہ سب کچھ ہوگزرتا جو چرچل گروپ کے برطانوی سامراج پسند پیش گوئیاں کرتے رہتے تھے۔

ایک سوال اور اس کا جواب:

یہ سوال ہو سکتا ہے کہ آخر حالات اس ناگزیر منزل تک کیسے آ پہنچے، ہندو مسلمان اور انگریز سبھی تھوڑے ملزم ہیں۔ پاکستان، ایک فرد کا کارنامہ ہرگز نہیں ہے اور جناح صاحب کو تن تنہا پاکستان کا خالق وہی کہہ سکتا ہے جو مثلاً جنگ عالم گیر کی فتح کا سہرا تنہا چرچل کے سر باندھ دے! نہ پاکستان بنتا نہ جنگ جیتی جاسکتی اگر ان دونوں کو اپنے مددگاروں کا غیر متزلزل اعتماد حاصل نہ ہوتا، مزید برآں کسی ''یک نفری شو'' کے بجائے یہ ایک باقاعدہ سمپوزیم تھا، جس نے ایسے حالات پیدا کیے جن کے سبب پاکستان وجود میں آگیا۔ اس کے لیے سب سے زیادہ ذمے دار ہندو ہیں اور یہ اپنی تنگ نظری کے سبب یا تنگ خوئی کے سبب جو ان کے ذات پات کے سسٹم میں رچی ہوئی ہے۔ یہ تنگ ذہنی جو مسلمانوں کو دایرے سے خارج قرار دیتی ہے، اور آخر کار ہر اقلیت اسی ساز پر ناچتی ہے جو اکثریت چھیڑتی ہے! اگر اکثریت سیکولر ہوگی تو اقلیت بھی سیکولر ہوگی، اگر اکثریت فرقہ پرست ہے تو اقلیت کو بھی اپنے بچاؤ کے لیے ایسا ہی ہونا پڑتا ہے۔

مسلمان نہ تو یہ بھول سکتے تھے کہ وہ اس ملک کے حکمراں رہ چکے ہیں اور نہ اس بات کو فراموش کر سکتے تھے کہ ہندوؤں نے زندگی کے ہر میدان میں مسلمانوں کو بہت پیچھے چھوڑ رکھا تھا۔ اگر چہ ان میں سے ۹۵ فیصدی ہندو سے مسلمان ہوئے تھے لیکن یہ سب اپنے آپ کو مغل عظمت کا براہِ راست وارث سمجھتے تھے اور شاہی زوال پر آنسو بہاتے اور افسوس کرتے رہتے تھے۔ اسی رویے کا براہِ راست نتیجہ تھا کہ یہ مغل زوال کے بعد اپنے خیموں میں بند پڑے رہے، تاآں کہ سرسید نے ۱۸۷۵ء میں علی گڑھ (اسکول) قایم کر کے انھیں جگایا۔ اس درمیان میں ''ہندو'' جو اس قسم کے کسی پدرم سلطان بود کے چکر میں نہ تھے، وہ اتنا آگے بڑھ گئے تھے کہ مسلمان ان کے برابر پہنچ ہی نہیں سکتے تھے، اور اس صورت حال سے، جو خود ان کی اپنی پیدا کردہ تھی، یہ مسلمان کسی طرح ساز کرنے پر آمادہ بھی نہ تھے۔ ان کی نظر میں کوئی ہندو کبھی بھی ان سے زیادہ ذہین یا اہل ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ زیادہ چالاک یا Wily بھلے ہی ہو، کوئی ہندو بزنس مین بھی مسلمان سے بہتر نہیں ہو سکتا تھا۔ بنیادی ذہنیت کی الگ بات

ہے۔ نتیجتاً ان کی شکست خوردگی اور مایوسی، تلخی میں اور تلخی نفرت میں داخل ہوتی چلی گئی۔

انگریزوں نے لارڈ منٹو کے زمانے سے ان مزاجی اختلافات بلکہ تقسیموں کو اپنے مقصد کے لیے استعمال کیا، اور پاکستان اگر غیر متوقع چیز بھی تھا تو بھی جداگانہ انتخابات کی آخری ہیئت اس کے علاوہ اور کیا بن سکتی تھی۔

ہندوؤں نے زمین جوت کے تیار کی، منٹو نے بیج ڈالا، جناح نے فصل کاٹی۔ (۱)

جیسے تینوں پارٹیوں (انگریز، ہندو، مسلمان) کے رویے کچھ کم نقصان دہ ہوں، جو ہندو اور مسلمان تعصّبات ایک دوسرے کو اور کمک دیتے رہے، جتنا زیادہ مسلمان ہندو سے بدکتا، اور ڈرتا، اتنا ہی وہ انگریز کی طرف جھکتا جاتا اور جتنا زیادہ وہ انگریز کی طرف جھکتا گیا، اتنا ہی ہندو اس کی طرف سے تلخی محسوس کرتا... حتیٰ کہ اس منزل کو پہنچ گیا جب ملک کے سامنے تقسیم سب سے کم درجے کی برائی رہ گئی تھی۔'' (۲)

---

(۱) محمد علی جناح: از مرزا راشد علی بیگ، پٹنہ، ۱۹۹۶ء، ص ۳۹-۲۹

(۲) متن کی عبارت کے تسلسل میں پڑھیے:

اور ہندو اکثریت اور مسلم اکثریت کے علاقوں کی اقلیتوں نے اس کی سزا بھگتی۔ خصوصاً دہلی، یوپی، بہار وغیرہ سے ترکِ وطن کرنے اور نہ کرنے والے دونوں سزا بھگت رہے ہیں اور پاکستان ہندستان دونوں کی حکومتیں آپس کے تعلقات درست نہیں کرتیں کہ سفر کی سہولتیں پیدا ہوں اور ان کے عذاب کم ہوں۔

(ا۔س۔ش)

باب: ۹

پاکستان جناح نے حاصل کیا؟

۲۱ / مارچ ۱۹۴۷ء کو ماؤنٹ بیٹن کراچی پہنچے اور ۲۲ / کو دہلی پہنچ کر لارڈ ویول وائسرائے ہند سے ملاقات کی۔ ۲۳ / مارچ کو لارڈ ویول نے کابینہ کے اجلاس سے آخری خطاب کیا۔ ۲۴ / کی صبح کو ماؤنٹ بیٹن نے ہندستان کے نئے وائسرائے کی حیثیت سے حلف اٹھایا اور اسی وقت سے برٹش استعمار کے نئے اور آخری دور کا آغاز ہو گیا اور اس کے ساتھ ہی اسٹاف میٹنگز، کانگریس، لیگ اور ریاستوں کے نمائندوں، صوبوں کے گورنروں، فوج و انتظامیہ کے اہم حکام، صوبائی حکومت کے اعلیٰ عہدے داروں وغیرہم سے ملاقاتوں کا ایک ختم نہ ہونے والا سلسلہ شروع ہو گیا۔

بہ ظاہر وائسرائے کے سامنے کابینہ مشن پلان پر کانگریس اور لیگ کو متفق کرنے کی ترجیح تھی۔ جسے کانگریس نے پہلے ہی منظور کر لیا تھا اور لیگ نے اس سے اتفاق کر کے رد کر دیا تھا۔ اصل مسئلہ یہی تھا کہ اس کو قبول کرنے پر سب کو راضی کر لیا جائے اور انتقال اقتدار کے انتظامات پر توجہ دی جائے۔ لیکن عجیب بات یہ ہے کہ اس کے لیے ماؤنٹ بیٹن کی کوششوں کا نتیجہ آنے سے پہلے پٹیل اور نہرو کو انھوں نے تقسیم ملک کی اسکیم پر راضی کر لیا تھا اور لیگ کو اس کی مانگ دے کر اس کی مداخلتوں سے کانگریس کے لیے آزاد ہند کے اقتدار کا راستہ صاف کر دیا تھا۔ اس کے لیے ماؤنٹ بیٹن نے آزادی ہند کی کسی سابقہ اسکیم پر سب کو متفق کرنے کے بجائے اپنی الگ اسکیم تیار کی تھی۔

ماؤنٹ بیٹن کے واقعی عزائم کیا تھے وہ کس پارٹی سے مخلص تھا اور کس کا مخالف تھا۔ اس بارے میں آخر تک نہ صرف ہر دو جماعتوں میں اتفاق نہ تھا بلکہ کسی ایک جماعت کے تمام اہل بصیرت و تدبر بھی متفق نہ تھے، لیکن انتقال اقتدار کی دستاویزات (ٹرانسفر آف پاور کی آخری تین جلدوں (نمبر ۱۰ تا ۱۲) کے مطالعے کے بعد اس راز سے پردہ ہٹ جاتا

ہے۔ خصوصاً پاکستان کے حوالے سے تمام دستاویزات کی ایک جلد میں تدوین (بعنوان "تحریک پاکستان اور انتقال اقتدار" ترجمہ وترتیب محمد فاروق قریشی، لاہور، ۱۹۹۱ء) کے بعد کوئی شبہ نہیں رہا کہ وہ متحدہ ہندستان کے تصور پر جماعتوں کے اتفاق کا ہرگز عقیدہ نہیں رکھتا تھا۔ اس کا اپنا منصوبہ تھا، جس پر وہ اول روز سے عمل پیرا تھا اور جس کو کامیاب بنانے کے لیے آہستہ آہستہ قدم بڑھا رہا تھا۔ اس کی ہندستان آمد اور حلف وفاداری پر پورے دو مہینے بھی نہیں گزرے تھے کہ وہ ایک فیصلے پر پہنچ چکا تھا۔ سہ روزہ زمزم. لاہور کا ایک اندراج ہے:

> "لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے ہر چند کوشش کی کہ کیبنٹ مشن پلان قبول کرنے پر مسلم لیگ کو دوبارہ آمادہ کرلیا جائے، لیکن وہ اس میں قطعی ناکام ہوگئے۔ اب وہ تقسیم ہند کے اپنے پلان پر فریقین کی رضامندی حاصل کر کے ۱۸ رمئی کو لندن روانہ ہوگئے ہیں۔ تاکہ برطانوی حکومت سے اس کی منظوری حاصل کرسکیں۔"(۱)

کیبنٹ مشن پلان کے بعد یہ تقسیم کا پلان کیا تھا، جس پر کانگریس نے بھی اتفاق کرلیا تھا؟ یہ منصوبہ کیا تھا؟ اُس وقت اس کی تفصیلات سامنے نہیں آئیں، کانگریس اور لیگ کے چند لیڈروں کو دکھایا گیا تھا۔ انھوں نے اسے پڑھا تھا لیکن اسی وقت ان سے واپس لے لیا گیا۔ اس کی نقل کسی کو نہیں دی گئی تھی اور اس کی منظوری تک اس پر گفتگو کرنے سے منع کردیا گیا تھا۔ اور ان کے زبانی "اوکے" کردینے پر اعتبار کرلیا گیا اور یقین حاصل کرلیا گیا تھا کہ منظوری کے بعد کسی حیل وحجت کے بغیر اسے تسلیم کرلیا جائے گا۔ یہ منصوبہ لے کر ماؤنٹ بیٹن ۱۸ رمئی کو لندن روانہ بھی ہوگئے۔ لیکن معلوم نہیں کسی نے ماؤنٹ بیٹن کے کان بھرے یا خود اس کے اپنے چالاک دماغ میں یہ بات آئی کہ اس زبانی معاہدے کے ایفا میں جناح صاحب پر کیوں کر اعتبار کیا جاسکتا ہے؟ جب کہ حال ہی میں انھوں نے کیبنٹ مشن پلان کو لیگ کونسل کے اجلاس میں منظور کرانے اور اس کی منظوری کے اعلان کے ایک ماہ کے بعد کونسل سے مشورہ کیے بغیر اسے سرِ بازار رد کردیا تھا اور کسی نے ان کا کچھ بگاڑ نہیں لیا تھا،

---

(۱) سہ روزہ زمزم. لاہور: ۲۳ رمئی ۱۹۴۷ء ص ۳

اس لیے ان سے تحریری منظوری لے لینی چاہیے تاکہ سند رہے اور بہ وقت ضرورت کام آئے!'' چناں چہ جاتے جاتے لیاقت علی خاں سے کہہ گئے کہ میرے سیکریٹری کو اپنی تحریری رائے سے مطلع کر دیں۔ لیکن یہ ڈیکلریشن لیاقت علی خان سیکریٹری مسلم لیگ سے نہیں لیا گیا، بلکہ جناح صاحب صدر مسلم لیگ سے ماؤنٹ بیٹن کے سیکریٹری نے، انھیں اپنے دفتر میں بلا کر لیا اور حاصل کردہ تحریر لندن بھیج دی گئی۔ اگر چہ یہ ایک رازدارانہ عمل تھا اور جناح صاحب کو یہی بتایا گیا تھا کہ یہ اشاعت کے لیے نہیں ہے، لیکن دوسرے ہی دن یہ بات اخبار میں آگئی!

جیسے کہ لندن روانگی سے پیشتر وایسرائے ماؤنٹ بیٹن نے لیاقت علی خان سے کہا تھا کہ لیگ پنجاب اور بنگال کی تقسیم کے بارے میں اپنی رضامندی سے میرے سیکریٹری کو مطلع کردے، وہ مجھے لندن بھیج دے گا۔ ۲۲ رمئی کو قایداعظم نئی دہلی میں وایسرائے کے سیکریٹری سے ملے۔ دونوں کے درمیان ملاقات میں کیا طے ہوا؟ وایسرائے کے سیکریٹری نے کیا کہا اور کیا سنا؟ یہ سب صیغۂ راز میں رہا۔ البتہ سول اینڈ ملٹری گزٹ۔ لاہور نے دوسرے دن انکشاف کیا کہ مسٹر جناح سے ملاقات کا مقصد ماؤنٹ بیٹن کے دستوری پلان پر مسٹر جناح کے دستخط حاصل کرنا تھا۔ اس گفتگو کے درمیان وایسرائے کے سیکریٹری نے کہا کہ مسٹر جناح نے بنگال اور پنجاب کی تقسیم سے اتفاق کر لیا ہے۔[1]

جناح صاحب نے جو کچھ بھی کیا تھا اور اس وقت جو کچھ کر رہے تھے، وہ اس کے لیے ورکنگ کمیٹی کا اجلاس بلانے کی زحمت بھی گوارا نہ کرتے تھے۔ وقت کی رفتارِ سیاست اتنی تیز تھی کہ ضابطے کی کارروائی اس کا ساتھ نہیں دے سکتی تھی۔ لیکن کوئی بات کوئی فیصلہ چھپا نہ رہ سکتا تھا۔ لیاقت علی خان کو تو علم ہوتا ہی تھا۔ دوسروں کے کانوں میں بھی خفیہ سے خفیہ بات کی بھنک پہنچ جاتی تھی۔ سریامین خان تو لیگ کی ورکنگ کمیٹی کے ممبر اور کونسل کے رکن تھے۔ اس کے علاوہ ان کے ذرایع معلومات، جماعتی، سرکاری، غیر سرکاری بہت سے تھے، ان سے یہ بات کیوں کر چھپی رہ سکتی تھی۔ انھیں پتا چل گیا تھا اور بعض تفصیلات کے ساتھ وہ لکھتے ہیں:

---

(۱) روزنامہ آزاد۔ لاہور: ۲۳ رمئی ۱۹۴۷ء

"شملہ میں ایک اخباری نامہ نگار (مسٹر شرما) نے مجھے یہ خبر سنائی کہ پنجاب کی تقسیم کا معاملہ انگریز گورنر سر ایوان جیکسن کی اسکیم کے مطابق طے پا چکا ہے۔" یعنی سترہ ضلعے پاکستان کو اور بارہ ضلعے ہندستان کو ملیں گے۔ یہ سن کر مجھے حیرت ہوئی کہ قاید اعظم اس پر کیوں کر رضامند ہو سکتے ہیں۔ یہ تو اقتصادی نقطۂ نظر سے بالکل غلط ہے اور کمشنری جالندھر کو کیوں کر چھوڑ سکتے ہیں۔ یہاں کے مسلمان لاہور کے علاوہ بہت تعلیم یافتہ ہیں اور اس سے ملحق کپورتھلہ ریاست میں پچھتّر فی صد مسلمان ہیں۔

اور مالیر کوٹلہ ریاست مسلمانوں کی ہے اور وہاں کی آبادی سب مسلمان ہے! یہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ قاید اعظم نواب مالیر کوٹلہ سے مشورہ کیے بغیر، ایسی تقسیم کو منظور کریں گے؟"

لیکن حقیقت یہی تھی۔ نامہ نگار کی اطلاع درست نکلی، اور وہ خدشہ بھی صحیح نکلا جو کسی نے ماؤنٹ بیٹن کے دماغ میں ڈالا تھا یا خود ان کے دل میں پیدا ہوا تھا۔

حیرت کی بات یہ ہے کہ پنجاب و بنگال کی تقسیم کے ساتھ تقسیم ملک کا نیا منصوبہ لے کر ماؤنٹ بیٹن ۱۸ر مئی ۱۹۴۷ء کو انگلینڈ گئے۔ اسی روز ان کے سکریٹری کو جناح صاحب نے اپنا ڈیکلیریشن دیا۔ لیکن یامین خاں کو پنجاب کی تقسیم کے فیصلے اور جناح صاحب کی منظوری کی اطلاع ایم ایس ایم شرما۔ ایک معروف صحافی اپریل میں دے چکا تھا۔ تقسیم کی جناح صاحب کی منظوری کی پہلی خبر "سول اینڈ ملٹری گزٹ" (لاہور) میں ۱۸/اپریل ۱۹۴۷ء کو نکل چکی تھی جسے سہ روزہ، زمزم. لاہور نے ۲۳/اپریل کو شایع کیا تھا اور ۱۹/اپریل کو اس فیصلے کے خلاف خضر حیات خاں کا بیان بھی آچکا تھا۔

سوال یہ ہے کہ جناح صاحب نے تقسیم پنجاب کا یہ معاہدہ کس کے ساتھ کیا تھا؟

ماؤنٹ بیٹن مئی کی آخری تاریخ کو لندن کے سفر سے لوٹے تھے اور ۲/جون کو انھوں نے کانگریس اور لیگ کے رہنماؤں سے ملاقات کی تھی۔ وہ رہنماؤں سے اپنے پلان کی فوراً منظوری چاہتے تھے اور اگلے روز وہ براعظم ہند پاکستان کے غلامی سے چھٹکارے کا اعلان کر دینا چاہتے تھے۔ لیکن جناح صاحب نے مسلم لیگ کونسل کی منظوری کے بغیر ذاتی طور پر اس کی منظوری دینے سے صاف انکار کر دیا۔ اگر چہ وہ اپنی ذاتی رائے کا اظہار ۲۳/مئی کے

ڈیکلیریشن میں کر چکے تھے۔ اگلے ۲۴ گھنٹے انھوں نے کس کرب میں گزارے جناح صاحب کسی طرح اس ذمے داری سے بچ نکلنا چاہتے تھے اور ماؤنٹ بیٹن نے کس طرح انھیں اپنی گرفت میں لے رکھا تھا، انھوں نے جناح صاحب سے ''ہاں'' کہلوانے کے لیے کیا کیا جتن نہ کیے تھے اور بالآخر کس طرح انھوں نے ان کی منظوری حاصل کی تھی مگر وہ بھی سر کی ایک جنبش کی حد تک! وہ ''ہاں'' کا ایک سادہ لفظ زبان سے نہ کہلوا سکے تھے۔ دنیا نے انھیں ان کے نصب العین میں عظیم الشان کامیابی پر ''مبارک باد'' دی ہے۔ لیکن ان کا رویہ ثابت کرتا ہے کہ انھوں نے اپنے مقصد میں شرم ناک شکست کھائی ہے۔ اور ''پاکستان'' انھوں نے اپنے تدبر سے اور مصائب جھیل کر حاصل نہیں کیا تھا۔ زبردستی ان کے سر منڈھا گیا تھا۔ گزشتہ چوبیس گھنٹوں میں ماؤنٹ بیٹن نے ان کی جتنی بے عزتی کی تھی اس کی کوئی مثال تحریک آزادی کے آغاز کے بعد سے تاریخ سیاسیات ہند میں شاید ہی کسی بڑے یا چھوٹے رہنما کے حصے میں آئی ہو! یہ روداد چوں کہ تاریخ کے حوالے سے بیان کی جارہی ہے۔ اس لیے اس پر کسی تبصرے کی ضرورت نہیں۔ البتہ یہ بتا دینا ضروری ہے کہ جو کچھ پیش کیا جارہا ہے۔ وہ کسی نادر اور نایاب ماخذ سے نہیں بلکہ قارئین کرام اور شائقینِ محترم ذیل کی کتب میں سے کوئی بھی اٹھالیں، کم و بیش کے فرق سے ان کا خلجان دور اور ذوق کی تسکین ہوجائے گی۔

۱) اسٹینلے وول پرٹ کی کتاب ''جناح آف پاکستان'' آکسفورڈ یونی ورسٹی پریس۔ کراچی، ۱۹۸۹ء: ص ۳۱۔ ۳۲۶، اشاعت بہ ایں صراحت، "Printed by Permission of Govt. of Pakistan."

۲) جناح کری ایٹر آف پاکستان: ہیکٹر بلیتھو (گورنمنٹ آف پاکستان کے زیر اہتمام لکھوائی گئی اور ایک کمیٹی کی نظر ثانی کے بعد چھپوائی گئی)، ۱۹۵۴ء، ص ۸۲۔ ۲۸۰۔

۳) تحریک پاکستان اور انتقال اقتدار: محمد فاروق قریشی، فکشن ہاؤس۔ لاہور، ۱۹۹۷ء (موضوع سے متعلق سیاسی تاریخی دستاویزات کے اس مجموعے میں ٹرانسفر آف پاور کی جلد نمبر ۱۰ کے ڈاکومنٹ نمبر ۵۱۳ تا نمبر ۵۶۰ اور جلد نمبر ۱۱ کے

ڈاکومنٹ نمبر ۲ تا نمبر ۱۳۰ میں یہ روداد پھیلی ہوئی ہے۔

۴) محمد فاروق قریشی کی دوسری تالیف ''ابوالکلام آزاد اور قوم پرست مسلمانوں کی سیاست'' مکتبۂ فکرودانش، لاہور ۱۹۹۰ء ص ۵۳۵ تا ۵۳۹، مختصراً یہ داستان بیان ہوئی ہے۔

۵) آدھی رات کی آزادی، لیری کولنس ودامنک لیپیر/ اردو تلخیص وترجمہ: سعید سہروردی سری نگر کشمیر (تاریخ ندارد) ص ۳۴۔ ۱۲۹۔ (۱)

۲ رجون ۱۹۴۷ء: صبح کا وقت، ہندستان کے سات لیڈروں نے وایسرائے کی مطالعہ گاہ میں قدم رکھا۔ وہ سات لیڈر اس مسودے کا جایزہ لینے آئے تھے، جس کے لیے لارڈ ماؤنٹ بیٹن خود لندن جاکر ایٹلی حکومت اور ونسٹن چرچل کی رضامندی حاصل کر کے لوٹے تھے۔ اس مسودے کی بنیاد پر ملک کو دو ٹکڑوں میں بانٹ کر ایک ٹکڑا ہندستان کو اور ایک ٹکڑا پاکستان کو دیا جانا تھا۔

صرف ۴۸ گھنٹے قبل وایسرائے لندن کی منظوری حاصل کر کے دہلی واپس آئے تھے۔ کمرے کے درمیان رکھی گول میز کے چاروں طرف لیڈر ایک ایک کر کے بیٹھنے لگے۔ کانگریس کی نمایندگی کر رہے تھے، نہرو، پٹیل اور صدر کی حیثیت سے آچاریہ کرپلانی۔

مسلم لیگ کے نمایندے تھے، جناح، لیاقت علی خان اور سردار عبدالرب نشتر۔

لارڈ ماؤنٹ بیٹن دیوار کی طرف بیٹھے تھے۔ ان کے دو مشیر ساتھ تھے، لارڈ اسمے، اور ایرک میویل۔ سرکاری فوٹو گرافر اس تاریخی موقعے کی تصویریں بڑی تیزی کے ساتھ لے رہا تھا۔

سب کے چہروں پر گہری سنجیدگی تھی، فضا پر گہرا سناٹا چھایا ہوا تھا، وایسرائے بن کر دہلی آنے کے بعد ماؤنٹ بیٹن نے پہلی بار بند کمرے میں لیڈروں سے الگ الگ ملنے اور دوستانہ انداز میں بات کرنے کے بجائے کھلی گول میز کانفرنس کا اہتمام کیا تھا، اس کے

---

(۱) زیرنظر روداد کا متن خاک سار نے مرتب کیا ہے۔ اور مذکورہ بالا تمام متون خاک سار کے پیش نظر رہے ہیں، لیکن اس متن کی تیاری میں آدھی رات کی آزادی سے خاص طور پر استفادہ کیا ہے۔ ذیلی عنوانات زیرنظر ومطالعہ کتاب میں اضافہ ہیں۔

باوجود ماؤنٹ بیٹن نے طے کیا تھا کہ جو کچھ کہا جانا ہے وہ خود کہیں گے۔ اگر ہر آدمی کو بولنے کا موقع دیا گیا تو یہ مجلس شور مچانے کا مقابلہ بن جائے گی۔ ماؤنٹ بیٹن اس خطرے سے دور رہنا چاہتے تھے۔

انھوں نے مختصراً یہ بتایا کہ تقسیم کی اس تجویز کے بارے میں انگلستان کے کس لیڈر سے کیا بات ہوئی؟ انھوں نے بار بار اس پر زور دیا کہ ہمیں اس پر انتہائی عجلت سے کام کرنا ہے، وقت بہت کم ہے۔ ہر شخص کو اس تجویز میں کوئی نہ کوئی ایسا حصہ ضرور مل جائے گا جس سے اسے اتفاق نہ ہو، لیکن غور کرتے وقت ہمیں حصوں کے بجائے مجموعی طور پر تجویز ذہن میں رکھنا چاہیے۔ تب ہی تجویز کا مقصد ابھر کر ہمارے سامنے آئے گا اور ہم فضول بحثوں میں الجھنے کی بجائے تیزی سے آگے بڑھ سکیں گے۔

''کل صبح میں آپ سے پھر ملنا چاہوں گا۔'' وائسرائے نے کہا

''اس سے پہلے آدھی رات تک اگر آپ تینوں پارٹیاں مجھے یقین دلا دیں کہ آپ اسے قبول کرنے کو تیار ہیں تو آخری سمجھوتے کی بنیاد بن جائے گی۔ اس کے بعد میری تجویز یہ ہے کہ اس بات کی خبر دنیا کو دینے کے لیے آل انڈیا ریڈیو سے اعلان کر دیا جائے۔ ادھر لندن ریڈیو سے کلیمنٹ ایٹلی ہمارے فیصلے کی منظوری کا اعلان کر دیں گے۔

ماؤنٹ بیٹن نے اپنی بات ختم کی، کمرے پر سکوت طاری ہو گیا۔

اس سکوت کو ماؤنٹ بیٹن نے توڑا۔

حضرات! میں آدھی رات تک آپ کے ردِعمل کا انتظار کروں گا۔

کانگریس نے پلان منظور کر لیا:

کانگریس نے اپنا پیغام بھجوا دیا کہ انھیں ملک کے بٹوارے کی تجویز منظور ہے۔ سکھوں کی منظوری بھی وائسرائے کو حاصل ہو چکی تھی۔ معاملہ اگر اٹکا تو کہاں اٹکا؟ محمد علی جناح پر، یہ معلوم ہوتا تھا کہ جناح کا بھی آج مون برت ہے!

مسٹر جناح کا منظوری سے گریز:

برس ہا برس سے جناح نے جو خواب دیکھے تھے ان کے پورے ہونے میں اب صرف

اتنی دیر تھی کہ وہ ''ہاں'' کہہ دیں۔ لیکن نہ جانے وہ کون سی پراسرار وجہ تھی جس کی بہ دولت وہ تقسیم کی اس تجویز پر ہاں نہیں کہہ پا رہے تھے۔ ان کی ساری زندگی ''نہیں'' کہنے میں گزری تھی اور ''نہیں'' ان کے دماغ میں اس حد تک بیٹھ چکی تھی کہ اب جب سب کچھ ان کے حق میں تھا تو جناح کے ہونٹوں سے ''ہاں'' نہیں نکل رہا تھا۔

ان کا ایک ہی کہنا تھا کہ تقسیم کے اس مسودے پر جب تک مسلم لیگ کی کونسل میں غور نہیں ہو جاتا، میں اکیلا اسے منظور نہیں کر سکتا اور کونسل کے اراکین کو دہلی بلانے کے لیے کم سے کم ایک ہفتے کا وقت چاہیے۔

اس وقت تک جناح کے ساتھ جتنے مذاکرات ہوئے تھے ان میں وائسرائے کو ہمیشہ مایوسی ہوئی تھی۔ اب ان کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا۔ جناح پاکستان چاہتے تھے، وہ ان کو دیا جا رہا تھا۔ کانگریس نے مان لیا۔ سکھوں نے اسے حلق سے نیچے اتار لیا۔ عین وقت پر جناح کی طرف سے اڑنگا ڈالنے کا کیا مطلب...؟

جناح صاحب کی ضد:

کانگریس اور سکھوں کو اگر ذرّہ برابر شبہ ہوا کہ جناح صرف اس لیے ٹال مٹول کر رہے ہیں کہ انھیں اپنی ایک آدھ شرط منوانی ہے تو سمجھوتے کی اتنی بڑی عمارت جو اتنی پریشانیوں کے بعد کھڑی کی گئی ہے، اسے زمین دوز ہونے میں ایک لمحہ بھی نہیں لگے گا۔

جناح اپنی بات پر اڑے ہوئے تھے!

''مگر مسلم لیگ کی طرف سے میں اکیلا کیسے حامی بھر سکتا ہوں۔ میں تنہا تو مسلم لیگ نہیں ہوں؟''

ماؤنٹ بیٹن کے لیے اپنی مایوسی اور غصے کو دبانا مشکل ہو گیا۔ انھوں نے صفائی سے کہا:

''دیکھیے مسٹر جناح! دنیا میں آپ کہیں بھی جایئے اور کچھ کہیے، مجھے کوئی سروکار نہیں۔ لیکن کم سے کم میرے سامنے ایسا مت کہیے کہ ''آپ ہی مسلم لیگ نہیں ہیں۔''

جناح اپنی ضد سے ہلے نہیں:

''یہ معاملہ قانون کا ہے اور میں غیر قانونی ہاں نہیں کہہ سکتا۔''

ماؤنٹ بیٹن کی دھمکی:

اب ماؤنٹ بیٹن نے اپنے تیور بدل لیے:

''مسٹر جناح! اب میں آپ سے ایک خاص بات کہنے جا رہا ہوں، اس ٹال مٹول سے پاکستان کا آپ کا خواب ہمیشہ کے لیے ٹوٹ سکتا ہے، میں نہیں چاہتا کہ اتنا زبردست نقصان آپ صرف اس لیے اٹھائیں کہ آپ کے منہ سے ایک چھوٹا سا لفظ ''ہاں'' نہیں نکل سکا، جس چیز کو پانے کے لیے آپ نے اپنی تمام عمر داؤ پر لگا دی، اسے آپ پانے سے پہلے پھینک دینا چاہتے ہیں۔ میں آپ کو ایسا نہیں کرنے دوں گا۔ میرا ارادہ یہ ہے کہ اس تجویز کو آپ کی طرف سے میں خود منظور کر دوں۔''

''کس طرح؟'' جناح نے حیرت سے پوچھا!

''کل جب جلسہ ہوگا تو میں یہ کہوں گا کہ کانگریس کا جواب چند برائے نام ترمیمات کے ساتھ مل گیا ہے، جن کے بارے میں انھیں مطمئن کر دوں گا۔ سکھوں نے تجویز منظور کر لی ہے۔ اس کے بعد یہ کہوں گا کہ کل رات مسٹر جناح کے ساتھ میری بہت طویل دوستانہ گفتگو ہوئی۔ ہم نے تجویز کی باریکیوں پر تفصیل سے غور کیا اور مسٹر جناح نے مجھے ذاتی طور پر پورا یقین دلایا کہ تجویز انھیں پسند ہے۔ اس جملے کے ساتھ میں آپ کی طرف گھوم کر دیکھوں گا اور مجھ سے نظر ملنے کے بعد میں نہیں چاہتا کہ آپ کچھ بولیں، میں یہ بھی نہیں چاہتا کہ کانگریس آپ کو کچھ بولنے کے لیے مجبور کرے۔ آپ کو صرف ایک کام کرنا ہے، مجھ سے نظر ملنے کے ساتھ آپ کو سر ہلا کر ہاں کہہ دینا ہے۔ اگر آپ نے ایسا نہ کیا تو سارا معاملہ چوپٹ ہو جائے گا۔ کانگریس اور سکھوں کے دل میں آپ کے متعلق شکوک پیدا ہوں گے اور وہ اس تجویز کی حمایت سے دست بردار ہو جائیں گے، پھر میں آپ کی کوئی مدد نہیں کر سکوں گا۔ سب خاک میں مل جائے گا۔ یہ دھمکی نہیں ہے میری پیشین گوئی ہے۔''

مسٹر جناح کو ہاں کہنی پڑی!

چناں چہ ہندستان کو تقسیم کرنے کی تجویز کے لیے وایسرائے نے جو جلسہ کیا تو انھوں نے تینوں پارٹیوں کا تجویز منظور کرنے کے لیے شکریہ ادا کیا اور جناح کی طرف گھوم کر دیکھا، وہ لمحہ ماؤنٹ بیٹن کے لیے جان لیوا تھا۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ اس وقت اس کے دل کی دھڑکن بند ہوگئی ہے۔

جناح کا چہرہ جذبات سے عاری تھا، اس کی ہر شکن نہیں! نہیں! کہہ رہی تھی۔ لیکن جناح نے بہت دھیرے سے اپنا سر ہلا کر ''ہاں'' کہہ دی۔ سر کی وہ جنبش اتنی خفیف تھی کہ وہاں موجود افراد کو بہ مشکل اس کا اندازہ ہوسکا، لیکن جناح کے سر کی اس ہلکی سی جنبش سے ایک نیا ملک وجود میں آ گیا۔ پاکستان!

جو تاریخی فیصلہ اس وقت کیا گیا تھا اس کی دھار چھری کی طرح ہر لیڈر کے دماغ میں بیٹھنے لگی۔ جو چوٹ انھیں لگی تھی، اس کی شدت کا انھیں صحیح اندازہ بھی نہ ہوسکا تھا کہ ماؤنٹ بیٹن نے اشارہ کر کے ہر لیڈر کے سامنے میز پر اس دستاویز کی ایک ایک نقل رکھوا دی جو سنگل اسپیس میں ٹائپ ہونے کے باوجود ۳۴ صفحات پر پھیلی ہوئی تھی۔ آخری نقل وایسرائے کے سامنے رکھی گئی۔

چرچل کا مشورہ—خوف زدہ کریں...!

۱۸ رمئی ۱۹۴۷ء کو لارڈ ماؤنٹ بیٹن لندن کو روانہ ہوئے تھے۔ ۲۲ رمئی کو برطانوی حکومت میں اپوزیشن لیڈر مسٹر چرچل سے ملاقی ہوئے جب انھوں نے جناح صاحب کے رویے، ان کی ضد اور عدم تعاون کی تفصیل بتائی تو مسٹر چرچل نے انھیں جناح صاحب کو خوف زدہ کرنے اور دھمکی سے کام نکالنے کا مشورہ دیا۔ اور خوف زدہ کرنے کے لیے پہلا قدم یہ بتایا کہ تمام برطانوی آفیسر واپس بلا لیں اور فوجی یونٹ بغیر برطانوی افسروں کے ان کے حوالے کریں اور ان پر یہ حقیقت واضح کریں کہ پاکستان کا نظام برطانوی افسروں کے بغیر نہیں چل سکتا۔ ٹرانسفر آف پاور کی جلد نمبر ۱۰ کا ڈاکومنٹ نمبر ۵۱۳ میں جو ماؤنٹ بیٹن اور چرچل کی ملاقات کی رُوداد پر مشتمل ہے، بیان کیا گیا ہے۔ ماؤنٹ بیٹن کہتے ہیں:

''میں نے ان سے (مسٹر چرچل سے) پوچھا: ''اگر مسٹر جناح اپنی ضد پر اڑے رہتے ہیں تو میں کیا قدم اٹھاؤں؟ انھوں نے دیر تک غور کرنے کے بعد کہا:

پہلے تو آپ انھیں خوف زدہ ضرور کریں! تمام برطانوی آفیسر واپس بلالیں اور فوجی یونٹ بغیر برطانوی افسروں کے ان کے حوالے کریں اور ان پر یہ حقیقت واضح کر دیں کہ پاکستان کا نظام برطانوی افسروں کے بغیر چلانا کس قدر ناممکن ہوگا!

میں نے ان سے اس قسم کی پالیسی اختیار کرنے پر اتفاق کیا، لیکن کہا کہ ہم اس حقیقت سے پہلو تہی نہیں کر سکتے کہ آخر کار میں نہ صرف تہدید آمیز رویہ اختیار کرنے کا مجاز ہوں بلکہ مجھے اس دھمکی کے نتیجے میں یہ اختیار بھی حاصل ہوگا کہ میں ڈومینین اسٹیٹس دیے بغیر اقتدار منتقل کر دوں! میں نے ان کی توجہ اس نکتے کی طرف مبذول کرائی کہ اگر میں نے یہ قدم نہ اٹھایا تو جناح صاحب اپنے موقف پر غیر معینہ مدت تک ڈٹے رہ سکتے ہیں اور اس صورت میں ہمیں شاید ہندستان اور پاکستان دونوں سے ہاتھ دھونے پڑیں۔''(۱)

مان لیں ورنہ...!

اسی روداد کے آخری پیراگراف میں اس خط کا ذکر آیا ہے، جو چرچل نے مسٹر جناح کے لیے دیا تھا۔ ماؤنٹ بیٹن بیان کرتے ہیں:

''مسٹر چرچل نے مندرجہ ذیل پیغام مسٹر جناح کو پہنچانے کی ذمے داری مجھے سونپی ہے، اس میں کہا گیا تھا: ''اگر تم نے اس پیش کش کو قبول نہ کیا تو یہ موقع ہمیشہ کے لیے ہاتھ سے نکل جائے گا۔''(۲)

چرچل کے مشورے اور محمد علی جناح کے نام ان کے خط کا ذکر ۳۱ر مئی ۱۹۴۷ء کو وائسرائے کی اسٹاف میٹنگ میں بھی آیا ہے۔ چوں کہ چرچل کے مشورے کے مطابق جناح صاحب کو خوف زدہ کرنے کے عملی مشورے اور خط، دونوں ہی سے کام لینا تھا، اس لیے میٹنگ کے ایجنڈے میں یہ مسئلہ شامل تھا۔ ایجنڈے کے آئیٹم نمبر ۷ کا مضمون یہی مسئلہ

---

(۱) **تحریک پاکستان اور انتقال اقتدار**: ترجمہ و ترتیب محمد فاروق قریشی، لاہور، ۱۹۹۷ء ص ۱۷-۶۱۶

(۲) ایضاً ص ۳۱۷

ہے۔ ضروری ہے کہ یہ بات قارئین کرام کو معلوم ہو کہ پس پردہ مشورے کی مجلسوں میں اور خفیہ میٹنگوں میں مسٹر محمد علی جناح کو گھیرنے، پھانسنے اور راہ راست پر لانے کے لیے کیا کیا سازشیں ہوئی تھیں۔ ہمیں تعجب تھا کہ ۳/جون کو مسٹر جناح جیسی قومی اور صف اول کی سیاسی شخصیت کے ماؤنٹ بیٹن کا توہین آمیز حد تک سخت رویہ کیوں تھا؟ وایسرائے کی چونتیسویں اسٹاف میٹنگ کا روداد نویس لکھتا ہے:

اسٹیفورڈ کرپس کی تجویز!

انتہائی خفیہ

''۳۱/مئی ۱۹۴۷ء کو وایسرائے ہاؤس نئی دہلی میں صبح گیارہ بجے کی میٹنگ کے شرکا ایڈمرل ویسکاؤنٹ لارڈ ماؤنٹ بیٹن آف برما، سرجے کول ویل، لارڈ اسمے، سر دی مویل، مسٹر ایبل، راؤ بہادر وی پی مینن، کیپٹن بروک مین، مسٹر ڈی اسکاوٹ، مسٹر کیبل جانسن، لیفٹیننٹ کرنل ایرسکن کروم۔''(۱)

آئٹم نمبر ۷

''وایسرائے نے یاد دلایا کہ سر اسٹیفورڈ کرپس نے کابینہ کی میٹنگ میں تجویز پیش کی تھی کہ اگر یہ محسوس ہونے لگے کہ مسٹر جناح منصوبے کو مسترد کر دیں گے تو اس صورت میں انھیں یہ کہہ کر خوف زدہ کیا جا سکتا ہے کہ نظریۂ تقسیم پر عمل درآمد سے سکھ زیادہ فایدے میں رہیں گے۔ لارڈ اسمے نے رائے دیتے ہوئے کہا کہ اس قسم کی دھمکی منصوبے کی ساری بنیاد ہلا کر رکھ دے گی اور مسٹر جناح دھمکی سے مرعوب نہیں ہوں گے۔

وایسرائے نے کہا کہ ایک اور امکان یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مسٹر جناح کو یہ دھمکی دی جائے کہ سرحد میں ریفرنڈم گورنر جنرل نہیں بلکہ صوبائی حکومت کرائے گی، اگر وہاں گڑبڑ ہوئی تو اس کی ذمے داری مسلم لیگ پر ہو گی۔ لارڈ اسمے نے اس سے اتفاق کیا کہ اس دھمکی سے مسٹر جناح کے مرعوب ہونے کا امکان ہے۔ لیکن مسٹر ایبل کی رائے تھی کہ مسٹر جناح کو دھمکانا کسی طرح بھی درست نہ ہو گا۔

وایسرائے کی رائے تھی کہ مسٹر جناح پر قابو پانے کے لیے بہتر طریقہ یہ ہو گا کہ وہ ظاہر

(۱) تحریک پاکستان اور انتقال اقتدار، ص ۶۵۲

کریں کہ ان کے "جذبات کو ٹھیس" پہنچی ہے اور اس سلسلے میں کسی قسم کی دھمکی سے کام نہ لیا جائے۔ اس سے سب نے اتفاق کیا۔

وایسرائے نے کہا کہ ان کا ارادہ یہ بھی ہے کہ وہ مسٹر جناح کو مسٹر چرچل کا پیغام پہنچائیں کہ منصوبہ منظور کرنا ان کے لیے "زندگی اور موت کا مسئلہ" ہے (ڈاکومنٹ نمبر ۵۱۳ جلد دہم) وایسرائے نے کہا کہ وہ مسٹر جناح کو اجازت دے دیں گے کہ وہ یہ پیغام اپنی ورکنگ کمیٹی کو بھی پہنچا دیں لیکن اس امر کو ملحوظ رکھا جائے کہ یہ اخبارات میں شایع نہ ہو۔"(۱)

۲۲ رمئی کو چرچل سے ماؤنٹ بیٹن کی ملاقات اور ۳۱ رمئی کی وایسرائے کی اسٹاف میٹنگ کی رودادوں سے چوں کہ کسی مصنف نے استفاضہ نہیں کیا تھا۔ اس لیے یہ بات عام قارئین تک بھی نہ پہنچ سکی۔ مسٹر جناح کے نام چرچل کے خفیہ خط کا ذکر ایک دو مصنفین نے سرسری طور پر کیا ہے۔ اور اس کے مکمل مضمون تک ان کی رسائی بھی نہیں ہو سکی۔ ذیل کے دو جملے ہی ان کی دسترس میں آئے ہیں۔ چرچل نے لکھا تھا:

"This is a mater of life and death for Pakistan. if you do not accept this offer with both hands".(۲)

اوکسفورڈ کے اردو ترجمے کے الفاظ یہ ہیں:

"یہ پاکستان کے لیے زندگی اور موت کا معاملہ ہے۔ اگر آپ نے اس پیش کش کو دونوں ہاتھوں سے قبول نہیں کیا۔"

چرچل کے الفاظ جیسا کہ ماؤنٹ بیٹن بہ خوبی واقف تھے، جناح کے لیے کسی اور جیتے جاگتے انسان کے الفاظ کے مقابلے میں زیادہ اہمیت رکھتے تھے۔ تقسیم کے راستے کی آخری رکاوٹ بھی اب دور ہو چکی تھی۔ چرچل کی حمایت کے ساتھ یہ ماؤنٹ بیٹن کے منصوبے کے لیے بھرپور آغاز تھا، جسے نئی کیڑے کھائی، بدحال، افلاس زدہ، گتھم گتھا تلخ ریاستوں کو برطانوی دولت مشترکہ میں لے کے آنا تھا۔"(۳)

---

(۱) تحریک پاکستان اور انتقال اقتدار، محمد فاروق قریشی، ص ۵۷-۶۵۶

(۲) جناح آف پاکستان، اسٹینلے وول پرٹ: کراچی، ۱۹۸۹ء، ۳۲۶

(۳) ایضاً (اردو ترجمہ) کراچی، ۱۹۹۸ء، ص ۳۶۵

باب: ۱۰

دوست کا مشورہ یا دشمن کی دھمکی!

کہا گیا ہے کہ مسٹر چرچل سے جناح صاحب کے دوستانہ تعلقات تھے اور دونوں میں دوستانہ مراسلت کا رشتہ قایم تھا۔ یہ بات مسٹر جناح کے ایک بیان ہی سے اخذ کی گئی ہے، لیکن ان کے نام مسٹر چرچل کے زیرِ نظر خط کے مضمون اور طرز تحریر سے تو یہ بات ہرگز ثابت نہیں کی جاسکتی کہ ایک دوست کا محبانہ اور مخلصانہ مشورہ ہے اور اگر کوئی خوش فہمی میں مبتلا ہے تو وہ چند صفحے پیچھے دیکھے کہ یہ وہی دوست ہے جو ماؤنٹ بیٹن سے خفیہ گفتگو میں اسے خوف زدہ کرنے اور پاکستان کے لیے برطانوی افسروں کا تعاون واپس لے لینے کی دھمکی دینے کا مشورہ دے رہا ہے۔ اور وہ مقام بھی زیادہ دور نہیں ہے جہاں مسٹر ماؤنٹ بیٹن اس مشورے پر عمل کرتے دکھائی دیتے ہیں!

تعجب ہے کہ بہ زعم خود دنیا کی ایک اعلیٰ تہذیب جو عدالت کے کسی ملزم کو بھی مسٹر فلاں اینڈ فلاں کے بغیر اس سے تخاطب کو گوارا نہ کرتی ہو اور ''یور سنسیر لی'' کے بغیر کسی کے نام خط مکمل کرنا خلاف تہذیب خیال کرتی ہو، اس کی ایک نمایندہ شخصیت القاب و آداب اور خاتمہ خط کی روایت کو نظر انداز کر دے اور نہ صرف کسی عام شخص کو بلکہ اپنے خط میں اپنے دوست کو ''مسٹر جناح'' اور ''یور سنسیر لی'' لکھنا بھول جائے یا اس سے گریز کرے! افسوس کے آج کوئی مسلم لیگی برٹش کے اس بدتہذیب استعمار کے جبر کا اعتراف کرنے والا ہے، نہ مسٹر جناح کی بے بسی میں ان کا کوئی غم گسار!

جناح صاحب سے مسلم لیگ کی بے وفائی:

مسٹر جناح نے حالات کا ڈٹ کر مقابلہ کیا، لیکن استعمار نے انھیں اپنا فیصلہ ماننے پر مجبور کر دیا۔ یہ بیان گزر چکا ہے اور حقیقت اظہر من الشمس ہے کہ ۳رجون ۱۹۴۷ء کو انھوں نے ماؤنٹ بیٹن پلان دنیا کے سیکڑوں اخبارات کے ہزاروں نمایندوں اور بے حد و شمار شرکا

کی موجودگی میں بھی اپنی زبان سے منظوری نہیں دی تھی۔ ایسے عالمی اجتماع میں صرف سر کی معمولی سی جنبش کو دل و دماغ کی منظوری نہیں کہا جاسکتا اور نہ اس کے لیے انھیں مطعون کیا جاسکتا ہے۔ یہ ماؤنٹ بیٹن کی کس درجے شرم ناک دھمکی تھی کہ اگر وہ اسے منظور نہیں کریں گے تو ان کی طرف سے وہ خود اعلان کر دے گا۔ جناح صاحب یہ سن کر اور اس کی اس بے ہودہ جرأت کو دیکھ کر ہکا بکا رہ گئے تھے۔ دراصل یہ ایک سازش تھی۔ جناح صاحب کو گھیر لیا گیا تھا۔ یہ ایک کھلی دھاندلی اور نہایت ظالمانہ جبر تھا۔ کیسی دیدہ دلیری تھی کہ مقدمے کا ایک فریق اپنا فیصلہ یہ کہہ کر منواتا ہے کہ اگر تم نے یہ فیصلہ قبول نہ کیا تو میں تمھاری منظوری کا خود اعلان کر دوں گا۔ اور کہتا ہے کہ اگر تم زبان سے اس فیصلے کا بالالفاظ اعلان نہ کرو تو اس کو نہ بھولنا کہ جب میں تمھاری طرف دیکھوں تو تم سر کو جنبش دینا۔ میں اسے بھی کافی سمجھ لوں گا، ورنہ تمھاری اور تمھارے پاکستان کی خیر نہیں! اس کے علاوہ بھی ماؤنٹ بیٹن کی تنبیہ کا بہت مفہوم ہے اس لیے کہ یہ یک طرفہ بیان ہے، جناح صاحب کا اعتراف نہیں اور جو واقعہ پیش آیا، وہ اس کی تنبیہ کے مطابق تھا، نہ کہ جناح صاحب کی ہٹ یا ضد ٹوٹی تھی؟ جناح صاحب پر تقسیم ملک کا الزام نہیں لگایا جاسکتا! اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اعلانِ تقسیم اور اس کی منظوری ماؤنٹ کی زبان سے نکلے ہوئے الفاظ کے مطابق ہوئی تھی۔

مجھے یقین ہے کہ ۳۱ رمئی کے بعد جناح صاحب جس کرب سے گزر رہے تھے، اس سے مسلم لیگ اور ان کے یمین و یسار کی دنیا بے خبر نہیں ہوسکتی تھی۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس دنیا نے جناح صاحب سے محبت کا رشتہ ختم کر دیا اور عقیدت کا دامن چھوڑ دیا تھا۔ لیگیوں نے برٹش استعمار کے منصوبے کے مطابق پاکستان قبول کر لینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ جب کہ جناح صاحب نے کٹے پھٹے پاکستان کو لینے سے انکار کیا اس دور کی جنگ جناح صاحب نے تنہا لڑی تھی۔ کسی لیگر نے ان کا ساتھ نہیں دیا۔ اگر مسلم لیگ چاہتی تو ۳ رجون سے پہلے برٹش حکومت کے رویے کے خلاف احتجاج کر سکتی تھی اور ۳ رجون کے بعد جناح صاحب کی منظوری کو خلاف ضابطہ قرار دے کر تحریک چلا سکتی تھی۔ اگر پوری جماعت کو اس میں ملوث نہ کیا جاتا تو لیگ کونسل کے چند ممبر بھی اس نکتے کو اٹھا سکتے تھے کہ کونسل کی منظوری کے بغیر کوئی

فیصلہ مؤثر نہیں ہوسکتا۔ اس سے جناح صاحب کو سپورٹ ملتی اور حکومت پلان واپس لینے پر مجبور ہو جاتی۔ یوپی، بہار کے وہ حضرت جنھوں نے کونسل کے فیصلے کے خلاف ادھم مچایا تھا، اگر وہ بھی لیگ کونسل سے احتجاجاً استعفے دے کر مسئلے کو دنیا کے سامنے لے آتے تو حالات بدلنے کی امید کی جاسکتی تھی، لیکن انھوں نے یہ بات نہ سوچی اور کونسل میں ایک گروہ ایسا تھا جس نے پاکستان کے نام پر سندھ کے ریگستان کا حصہ بھی قبول کر لینے کا فیصلہ اور اپنے رویے سے صورت حال پلٹنے کے امکان کو ختم کر دیا تھا۔ یہ چند ایسی باتیں ہیں جو لیگ کی مبینہ سازش کی طرف اشارہ کرتی ہے۔

انگریز نے انیسویں صدی کے شروع ہوتے ہوتے مشرق و جنوب میں کئی علاقوں پر قبضہ کر لیا تھا اور شمال و مغرب اور وسط ہند میں حکم اسی کا چلتا تھا۔ ۱۸۵۷ء میں اس نے شمال و مغرب اور وسط ہند پر بھی اپنا پورا تسلط قایم ہو گیا۔ اس نے یہ سفر ۱۷۵۷ء میں بنگال میں سراج الدولہ کی شکست سے شروع کیا اور ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے بعد ۱۸۵۸ء کے آخر تک ہندستان کے چپے چپے پر نیز مشرق میں جزائر انڈمان اور مغرب میں ایران و افغانستان تک اس کے تسلط کا دایرہ وسیع ہو گیا، اس کے علاوہ ہند و بیرون ہند اس کے اطراف میں جو ریاستیں اور ممالک تھے وہ انگریز بہادر کے زیرنگیں یا باج گزار تھے۔ ان کی گرفت سے کوئی آزاد نہ تھا۔

بیسویں صدی کے آغاز تک کرۂ ارضی پر برٹش اقتدار کا دایرہ سب سے وسیع تھا۔ اس کی حکمرانی میں سورج غروب نہ ہوتا تھا۔ ۱۹۱۴ء کے آغاز تک اس کے حدود اقتدار کی وسعتوں کی کوئی نہ رہی تھی۔ جنگ عظیم اول کے آغاز سے جنگ عظیم دوم کے اختتام (۱۹۱۴ء تا ۱۹۴۵ء) تک حالات نے اسے اتنا لاچار کر دیا تھا کہ اس کے لیے افریقہ سے مشرق بعید کے ممالک تک اپنے مقبوضات پر اس کے لیے حکمرانی کرنا ناممکن ہو رہا تھا۔ جنگ عظیم ثانی میں اس کی حیثیت ظاہری فاتح کی تھی، لیکن حالات نے اسے اس درجے لاچار کر دیا تھا کہ وہ اپنے مقبوضات کو جلد سے جلد چھوڑ کر بھاگ جانا چاہتا تھا۔ ہندستان میں بھی اس کی یہی حالت تھی۔ اب اس کی درخواست تھی کہ سیاسی رہنما کوئی صورت نکالیں اور ملک کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لیں، اپنا اقتدار سنبھالیں اور اس کا پیچھا چھوڑیں۔ آزادی دینے کے لیے

اِس کی بے چینی کا یہ عالم تھا کہ دو برس کے اندر یکے بعد دیگرے تین اقدام کیے، شملہ کانفرنس کا انتظام کیا، کیبنٹ مشن بھیجنا اور اس کی ناکامی پر لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو بھیجا کہ جلد کسی طرح اقتدار سے پیچھا چھڑائیں۔ ماؤنٹ بیٹن مارچ ۱۹۴۷ء میں ہندستان آئے اور اعلان کیا کہ اہل ہند کسی فارمولے پر متفق ہو جائیں وہ ایک سال کے اندر ہندستان کی آزادی اہل ہند کے حوالے کر دینا چاہتے ہیں۔ جب ایک فارمولے پر اہل ہند کا اتفاق ہوگیا تو ۳ رجون کو آزادی کا اعلان کیا اور اس وقت یہ اعلان کیا کہ ہندستان پاکستان کو یہ آزادی ڈھائی ماہ کے اندر سپرد کر دی جائے گی۔ کیا کسی نے یہ سوچا کہ اب آزادی کے سپرد کرنے میں یہ عجلت اور بے صبری کیوں تھی۔ واقعہ یہ تھا۔

معلوم ہے کہ کانگریس ہندستان کی تقسیم ہرگز نہیں چاہتی تھی اور اب جناح صاحب کو بھی عقل آگئی تھی اور وہ بھی اسی خیال کی طرف مایل ہو گئے تھے کہ ملک کی تقسیم جس طرح ہو رہی تھی، ہندستان کے سیاسی مسئلے کا حل وہ نہیں ہے۔ انھوں نے جان لیا تھا کہ اس سے کچھ حاصل کرنے کے بجائے سب کچھ ہاتھ سے نکل جائے گا اور ایک مسئلہ حل نہیں ہوگا اور دس مزید مسئلے پیدا ہو جائیں گے۔ اور اگر جناح صاحب نے پاکستان کے نام پر ملک کی تقسیم سے رجوع کر لیا اور اپنے سابق دوستوں سے جا ملے تو برطانیہ کا نیا منصوبہ خاک میں مل جائے گا۔ اور اس کی نہ صرف عزت آبرو خاک میں مل جائے گی بلکہ اس کا ردِعمل اس کے مفادات کے ساتھ اس کے وجود کا نام و نشان بھی مٹ جائے گا۔ اگر مسلم لیگ صبر و استقامت اور اپنے لیڈر سے وفاداری پر قایم رہتی تو آزادی کے حصول میں ایک دو سال کی تاخیر ہو جاتی لیکن پاکستان اس کے مطابق حاصل ہوتا۔ اس میں کوئی شبہ نہ تھا۔ جناح صاحب کے بدلتے ہوئے خیالات کا ماؤنٹ بیٹن کو بالکل صحیح اندازہ تھا۔ مئی میں انگلینڈ روانہ ہوتے ہی اندازہ ہوگیا تھا۔ اور اس بات کا اندازہ بھی کہ کچھ لوگ مسٹر جناح اور کانگریس کی لیڈر شپ کو باہم ملانے کی کوشش کر رہے ہیں اس خطرے کو روکنے کے لیے اس نے پٹیل کو پہلے اپنے قابو میں کیا۔ نہرو پر جال پھینکا، گاندھی کو شیشے میں اتارنے کی کوشش کی، مینن کی چالاکی اور ذہانت سے کام لیا۔ اپنے منصوبے کو ایک میٹنگ میں دکھایا ضرور

لیکن اس کی نقل کسی کو نہ دی کہ اس پر کسی کو زیادہ غور و فکر کا موقع نہ ملے، نہرو کے خیالات میں اس نے رسوخ حاصل کر لیا تھا، لیکن جناح صاحب پر اسے کامل اعتماد نہ تھا اور خطرہ موجود تھا کہ وہ اس پلان سے پلٹ جائیں گے۔ اس لیے جناح صاحب سے ڈیکلریشن لینا ضروری سمجھا اور لندن روانہ ہونے پر اپنے سیکریٹری کو تاکید کر گیا وہ ڈیکلریشن پر جناح صاحب کے دستخط لے۔ مزید اطمینان کے لیے جناح صاحب کے ڈیکلریشن کو شایع بھی کرا دیا اور پوری کوشش کی کہ جناح صاحب کو ان کے زبانی وعدے کے ساتھ تحریر (ڈیکلریشن) کی رنجیر میں بھی جکڑ لیا جائے۔ لندن میں ماؤنٹ بیٹن نے چرچل سے اپنے خطرے کا اظہار کیا، انھوں نے اس کی ترکیب بھی بتا دی اور ماؤنٹ بیٹن کی درخواست پر ان کے اطمینان کے لیے خط بھی لکھ دیا۔ ماؤنٹ بیٹن ۳۰ر مئی کو ہندستان لوٹے اور ۳۱ر کو جناح صاحب سے ملاقات کی تو محسوس ہوا ان کا وہم جناح صاحب کی شکل میں ان کی گردن دبوچ لینے کے لیے اپنے ہاتھ بڑھا رہا ہے۔ جناح صاحب نے ان کے فارمولے کی افادیت تسلیم کرنے سے انکار کر دیا، اگلے چند دنوں کے اندر ماؤنٹ بیٹن نے جناح صاحب کو اپنی راہ پر لانے کے لیے اپنی شخصیت، دلایل، دھونس، خطرات و نقصانات کی تصویر کشی اور آخر میں چرچل کا خط اور اس کی تاثیر، تمام حربے اختیار کر لیے، لیکن جناح صاحب ٹس سے مس نہ ہوئے۔ انھوں نے ماؤنٹ بیٹن کے تمام داؤں جھوٹے کر دیے تھے، لیکن اب ان کے پاس صرف ایک داؤں تھا جس کی ہلاکت خیزی سے وہ بہ خوبی واقف تھے۔ اب مسٹر ماؤنٹ بیٹن کی تمام ذہانت اور کوشش اس پر مرکوز تھی کہ جناح صاحب کو وہ داؤں استعمال کرنے کا موقع نہ دیا جائے اور جناح صاحب اپنی ذات کو الگ کر کے اب اسی امر کے منوانے پر اپنی تمام صلاحیتیں صرف کر رہے تھے۔ وہ داؤں تھا جناح صاحب کی منظوری سے پہلے لیگ کونسل کی منظوری مسلم لیگ کے دستور کے ضوابط کے مطابق (اور تمام جماعتوں کے ضوابط میں بنیادی اور اہم فیصلوں کے لیے) طریقہ کار یہی ہوتا ہے کہ وہ کسی تجویز، فیصلے، منصوبے اور ورکنگ کمیٹی کی رائے کے بارے میں اس کا فیصلہ آخری اور قطعی ہوتا ہے حتی کہ صدر کی خواہش اور رائے کو بھی وہ نظر انداز کر سکتی ہے۔

جناح صاحب کی پوری کوشش یہ تھی کہ ماؤنٹ بیٹن پلان کو کونسل کے ذریعے ناکام بنا دیں۔ ماؤنٹ بیٹن اپنی تمام صلاحیتیں جناح صاحب سے معاملہ طے کرنے میں صرف کر رہے تھے۔ چوں کہ لیگ کی تاریخ میں کئی اہم فیصلوں میں اس قسم کی بے ضابطگی کی مثالیں موجود تھیں کہ وقت کی تنگی یا کسی اور مجبوری سے جناح صاحب نے پہلے قریبی کے مشورے سے فیصلہ کر دیا تھا۔ بعد میں کونسل نے اس کی توثیق کر دی تھی۔ ماؤنٹ بیٹن نے اس سے استدلال کیا تھا لیکن جناح صاحب نے اس کی پروا نہیں کی۔ انھوں نے پوری مضبوطی کے ساتھ اس اصول کو پکڑ رکھا تھا۔ اور اس وقت جب کہ جناح صاحب کی مرضی کے خلاف ۳/جون کے اعلان آزادی کی تقریب کا اہتمام کیا گیا تھا، اس موقع پر بھی جناح صاحب اس اصول پر پوری استقامت کے ساتھ ڈٹے رہے۔ انھوں نے اپنی زبان سے پلان کی منظوری کا اظہار نہیں کیا، لیکن ماؤنٹ بیٹن نے اس سے آگے بڑھ کر حالات سے مقابلے کی تیاری کی تھی۔ اور اگر چہ جناح صاحب نے پلان کی منظوری نہیں دی تھی، لیکن ان کا حریف بازی جیت گیا۔

جناح صاحب نے اس کے بعد بھی اپنی کوشش سے منہ نہیں موڑا تھا۔ ۳/جون کے اعلان کے بعد بھی ماؤنٹ بیٹن سے ملے اور اس سے کہا کہ میری رائے میں یہ فیصلہ درست نہیں، تقسیم ملک ہندستان کے سیاسی مسئلے کا حل نہیں ہے۔ مجھے برٹش گورنمنٹ اور نہرو، گاندھی اور کانگریس کے رہنماؤں سے معاملہ طے کرنے اور کسی باعزت فیصلے تک پہنچنے کی مہلت دیجیے، ماؤنٹ بیٹن نے انھیں جھڑک دیا اور کہا وہ وقت گزر گیا ہے۔ (دیکھیے سیکولر اور وطن پرست جناح: ص ۲۸۶، بہ حوالہ پیپس اِن ٹو پاکستان، ایم ایس ایم شرما: ص ۱۷۴)

جناح صاحب نے کونسل کے اجلاس میں بھی کہا کہ انھوں نے پلان منظور نہیں کیا ہے۔ کونسل کے ممبران پوری آزادی کے ساتھ پلان کے حق یا اس کے ردّ میں فیصلہ کر سکتے ہیں۔ لیگ کے سیکریٹری لیاقت علی خان نے کونسل کے اجلاس کی جو رپورٹ ماؤنٹ بیٹن کو پیش کی تھی اس میں جناح صاحب یہ الفاظ منسوب کیے ہیں:

''منصوبہ کونسل کے سامنے پیش کیا جا رہا ہے تاکہ کونسل اگر اسے قبول کرنا چاہتی ہے تو وہ ایسا کر سکتی ہے اور اس کے خلاف بھی فیصلہ دے سکتی ہے۔''

کسی ممبر نے اس موقع سے فایدہ اٹھانے کی ہمت نہیں کی۔ حال آں کہ یہ اظہار رائے کا اچھا موقع تھا کہ کٹے پھٹے پاکستان کو قبول کرنے سے انکار کر دیا جائے۔

وول پرٹ کی تحقیق کے مطابق ۴۲۵ اور محمد فاروق قریشی کی تحقیق کے مطابق ۴۸۶ ممبران اجلاس میں شریک ہوئے تھے، لیکن افسوس کہ ان ہی ارکان کو بولنے کا موقع دیا گیا جو پیدا ہی اس لیے ہوئے تھے کہ خواہ ان کا کوئی دفتری حاکم ہو یا سیاسی لیڈر ہو، اس کی ہاں میں ہاں ملائیں۔ افسوس کہ ان میں مولانا حسرت موہانی جیسا اور کوئی نہ تھا جو ان کے ساتھ سچائی کا اور حق کا ساتھ دیتا اور ان کے ساتھ شانہ ملا کر کھڑا ہو جاتا! اگر ایک مرتبہ بھی یہ بات اخبارات میں آ جاتی تو حکومت گھٹنے ٹیکنے پر مجبور ہو جاتی۔ مسلم لیگ کے احتجاج کے خلاف وہ سخت ایکشن نہیں لے سکتی تھی۔ دنیا کو معلوم ہو جاتا کہ مسلم لیگ ایک اصول و ضابطے کی جماعت ہے۔ جناح صاحب کو قوت حاصل ہوتی اور ماؤنٹ بیٹن کو جرأت نہ ہوتی کہ انھیں ترچھی نظر سے دیکھے اور ان پر دھونس جمائے اور کسی ایسی بات پر مجبور کرے جو ان کی رائے کے خلاف ہو! دنیا کی حکومتیں ان کا ساتھ دیتی اور عالمی پریس کی قوت اور وزن جناح صاحب کے مؤقف کو حاصل ہوتا، لیکن معلوم ہے کہ مسلم لیگ نے اپنے رہنما کی تائید سے کنارہ کشی اختیار کیے رکھی!

لیاقت علی خان نے ماؤنٹ بیٹن سے کہا تھا کہ جناح صاحب پاکستان کے نام پر ریگستانِ سندھ کا ایک ٹکڑا لینے پر بھی راضی ہو جائیں گے۔ مجھے اس بات سے خوشی ہوئی کہ جناح صاحب کے رویے، ان کی رائے کی سچائی اور سیرت کی پختگی نے لیاقت علی خان کی اس رائے کو غلط ثابت کر دیا۔ جناح صاحب کے خلاف مسلم لیگ کے اس رویے کو سازش کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے!

تاریخ و سیاست کے مبصرین جناح صاحب کے مخلص اور مدبرین کی آرا کے مطابق جناح صاحب ایک مدت سے اپنی تجویز سے دست بردار ہونے کے موقع کی تلاش میں تھے۔ ایک مدبر کے بہ قول وہ اپنے ہی بنے ہوئے جال میں پھنس گئے تھے اور اس سے نکلنے

کے لیے کسی باعزت فیصلے کے موقعے کی تلاش میں تھے، ان کی خواہش کے مطابق اگر لیگ کونسل ماؤنٹ بیٹن پلان کو رد کر دیتی تو جناح صاحب کے لیے اپنے بنے ہوئے جال سے نکلنا آسان ہو جاتا لیکن اسے ان کے متبعین و محبین ہی نے ان پر بند کر دیا تھا۔

ایم جے اکبر کی رائے:

ہندستان کے ایک سیاسی مدبر ایم جے اکبر جناح صاحب کے متعلق کیسی غلط فہمی میں مبتلا ہیں! حال آں کہ یہ وقت ان پر طنز و تعریض اور طعن و تشنیع کا نہیں، ان سے اظہارِ ہم دردی کا تھا، بہ ہر حال جب ہم موافق مخالف کتابوں کا مطالعہ کرتے ہی ہیں تا کہ افکار و مسایل کی جڑ کو پہنچ کر حقیقت کا سراغ لگا سکیں تو پھر ایم جے اکبر کی رائے کا مطالعہ بھی کیوں نہ کر لیا جائے۔ (ا۔س۔ش)

''۱۴ر اگست ۱۹۴۷ء کو محمد علی جناح نے ہندستانی مسلمانوں کے پیدایشی حق کو ایک پیالہ سالن کے بدلے بیچ دیا۔ یہ اصرار کرتے ہوئے کہ مذہب اور قومیت دونوں جزو لاینفک ہیں۔ انھوں نے ایک ایسے ملک کا مطالبہ کیا اور حاصل کر لیا۔ جس کے دو بازو ایک دوسرے سے ایک ہزار میل دور تھے۔ یہ جناح صاحب کی خود پسندی تھی کہ وہ سمجھتے تھے کہ مذہب اور قوم کے مترادف ہونے کا ان کا نظریہ، جغرافیائی اور ثقافتی فاصلے کو کم کر دے گا، اس بات کی شہادتیں کہ اسلام ایک جدید قوم کو ایک دوسرے سے منسلک کرنے کے لیے کافی نہیں تھا! [اس کی نظیریں] ساری دنیا میں ملتی ہیں اور سب سے زیادہ خود عرب دنیا میں۔ ایک مذہب، ایک زبان اور پھر بھی درجنوں قومیں! مگر جناح صاحب نے اس برصغیر کے مسلمانوں کے ذہن میں یہ بات خوب اچھی طرح بٹھا دی کہ وہ گاندھی کی سرزمین پر مساوی حیثیت کے شہریوں کی طرح زندہ نہیں رہ سکتے۔ اور یہ کہ انھیں خود اپنے ایک وطن کا مالک ہونا چاہیے۔ اگرچہ اس کے بنانے کی قیمت بہت ہوگی۔ ان کے نظریے کے تضادات پاکستان کے خیال کی منظوری کے فوراً بعد ہی ایک ایک کر کے سامنے آنے لگے تھے۔ ان کے خیالات کے ریکارڈ پر ایک نظر ڈالنے سے پتا چل جاتا ہے کہ انھیں خود بھی، جو کچھ انھوں نے کیا تھا اس پر شبہ ہونے لگا تھا۔ ظاہر ہے کہ وہ ان شبہات کو بہ آواز بلند ظاہر کرنے کے موڈ میں نہیں تھے، انھیں تو فتح و کامرانی کا بھرم رکھنا تھا مگر ان سوالوں کی تعداد بڑھتی جا رہی تھی

جن کے جواب نہیں تھے یا ان کے جواب دیے نہیں جا سکے تھے۔

سب سے اہم اور سیدھا سادا سوال یہ تھا کہ اگر جناح صاحب صحیح تھے تو وہ چار کروڑ مسلمانوں کو ''ہندو'' انڈیا میں چھوڑ کر کیسے جا سکتے تھے؟ غالباً مشکل یہ تھی کہ پاکستان ان علاقوں میں بنا تھا جہاں ہندوؤں سے تحفظ کی ضرورت نہ ہونے کے برابر تھی کیوں کہ یہ سارے علاقے مسلمانوں کی اکثریت والے علاقے تھے۔ اگر ضرورت تھی تو مغربی پنجاب، سندھ، مشرقی بنگال اور صوبہ سرحد میں ہندوؤں کو مسلمانوں سے تحفظ کی تھی۔ جناح صاحب نے اس الجھے سوال کا جواب ۱۱/ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو پاکستانی فوج کے افسروں کو خطاب کرتے وقت دینے کی کوشش کی۔ ''ہندستان میں اپنے مسلمان بھائیوں کے لیے میری یہی نصیحت ہے کہ وہ جس ریاست میں ہوں اس کے ساتھ بغیر کسی جھجک اور تکلف کے اپنی وفاداری کا اظہار کریں۔'' ایک ہندو اکثریت والی ریاست میں وفاداری پر ان کا اصرار دس سال بعد ہندستانی مسلمانوں کے لیے یکسر نا قابل قبول تھا۔ ۱۱/ اکتوبر والی یہ نصیحت تقریباً بے کار اور ناحق تھی۔''(۱)

حکومت برطانیہ نے پاکستان کے تصور کو وجود بخشا:

''۲۴/ جنوری ۱۹۴۹ء پاکستان کے ہائی کمشنر مقیم برطانیہ مسٹر حبیب اللہ نے سنیچر کے دن یہاں کہا ہے کہ حکومت برطانیہ نے انتہائی تدبر اور ہوش مندی سے کام لے کر میرے ملک پاکستان کو وجود کا جامہ پہنایا تھا۔ انھوں نے کہا ہم آپ سے مخصوص سلوک کا مطالبہ نہیں کرتے۔ بس یہ چاہتے ہیں کہ ہمارے ساتھ ویسا ہی سلوک کریں، جیسا کہ دولت مشترکہ کے دوسرے ملکوں کے ساتھ کیا جاتا ہے...''

میں سمجھتا ہوں کہ افراد اور خاندانوں کی طرح قوموں کو بھی آزمایش سے گزرنا پڑتا ہے، جس سے ان کے اوصاف اجاگر ہو جاتے ہیں۔ ہمیں دوست دشمن کی پہچان ہوتی ہے اور ہمارے دوستوں کی فہرست میں ان انگریزوں کا شمار ہوتا ہے جو ہمارے مؤید اور حمایتی نہیں۔ (۲)

(۱) ہندستان اپنے حصار میں: ص ۱۲-۳۱۱

(۲) قومی آواز- لکھنؤ: ۲۶/ جنوری ۱۹۴۹ء

باب: ۱۱

چند دیگر اہم معلومات

جناح صاحب کا حلفِ وفاداری:

۱۴ اگست ۱۹۴۷ء: سہ پہر کو ایک شان دار تقریب میں مسٹر محمد علی جناح نے پاکستان کے پہلے گورنر جنرل کی حیثیت سے پاکستان کے دارالحکومت کراچی کی ایک پرشکوہ تقریب میں حلف اٹھایا۔ یہ حلف ہز ایکسی لینسی لارڈ ماؤنٹ بیٹن وایسرائے ہند نے ان سے لیا۔ حلف کی عبارت یہ ہے:

''میں محمد علی جناح قانون کے مطابق قایم ہونے والے پاکستان، دستورحکومت سے سچی عقیدت اور وفاداری کا عہدِ مصمم کرتا ہوں کہ میں پاکستان کے گورنر جنرل کی حیثیت سے ''شہنشاہ معظم جارج ششم'' (شہنشاہ برطانیہ) اور ان کے ولی عہدوں اور جانشینوں کا ''وفادار'' رہوں گا۔''(۱)

گاندھی جی کا بیان:

۱۵ ستمبر ۱۹۴۷ء: گاندھی جی نے ایک بیان میں کہا ہے:

''ہندوؤں اور سکھوں کے لیے سیدھا اور صحیح راستہ اب یہی ہے کہ جن مسلمانوں کو ترکِ وطن کرنا پڑا ہے، انھیں وہ واپس لائیں۔ اگر یہ کر ڈالنے کی ہمت انھیں ہو گئی تو یہ ہر پہلو سے قابل داد ہوگا اور پناہ گزینوں کا اہم اور دشوار مسئلہ بڑی حد تک از خود حل ہو جائے گا۔ خود پاکستان والے بلکہ ساری دنیا ان کی قایل ہو جائے گی۔''

گاندھی جی نے مزید کہا:

''مجھے معاف کیا جائے! میں پہلا الزام تو ہندوؤں اور سکھوں پر رکھوں گا ان میں

(۱) روزنامہ پاکستان۔ لاہور کا ہفتہ وار ایڈیشن، تصویر پاکستان: ۱۳ اگست ۱۹۹۳ء، ص ۱۱

اتنی جان نہ تھی کہ منافرت کے سیلاب کو روک دیتے۔‘‘(۱)

پاکستان کے فسادات:

ستمبر ۱۹۴۷ء: جناب سری پرکاش پہلے انڈین ہائی کمشنر برائے پاکستان اپنی یادداشتوں میں لکھتے ہیں:

’’ہندستان میں یہ شکایت تھی کہ پاکستان کا سلوک ہندوؤں کے ساتھ بہت خراب ہے اور پاکستان کا یہ کہنا تھا کہ ہندستان کا رویہ مسلمانوں کے ساتھ برا ہے۔ مجھے اس کا احساس تھا کہ یہ بھی میرے فرائض میں ہے کہ پاکستان کے ہندوؤں کی نگہداشت کروں اور ہندستان کے مسلمانوں کے بارے میں جو چرچا پاکستان میں ہے، اس کی اطلاع اپنی حکومت کو دوں۔ مجھے خبر ملی کہ سندھ میں کچھ ہندوؤں کے ساتھ بُرا برتاؤ کیا گیا۔ میں نے فوراً وزارتِ امور خارجہ کو لکھا کہ اس کی تحقیقات کی جائے۔ مجھ کو یہ روکھا جواب ملا کہ یہ پاکستان کا گھریلو معاملہ ہے اور مجھے اس میں دخل دینے کا کوئی حق نہیں۔ میں نے جواب میں لکھا کہ آئینی نقطۂ نظر سے وزارت کا کہنا بالکل حق بہ جانب ہے، لیکن میں پاکستان کی وزارت کو یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ اگر اس کو مسلمانانِ ہند کے ساتھ نازیبا سلوک کی خبر ملے تو بلا تامل مجھ کو خبر دی جائے اور میں یقین دلاتا ہوں کہ میں مکمل جانچ کر کے واقعات سے ان کو مطلع کروں گا۔ اس خط کا اثر بہت اچھا ہوا۔ اگرچہ اس سے کوئی خاص نتیجہ نہیں نکلا، لیکن ہمارے روابط بہتر ہو گئے اور پھر اگر میں کسی معاملے میں تحقیقات کرانا چاہتا تھا تو کوئی اعتراض نہیں ہوتا تھا۔ بے شمار شکایات کی تحقیقات کرا کے میں نے خود حکام متعلقہ کو اطلاعات بہم پہنچائیں۔ ان حکام میں نواب زادہ لیاقت علی خان کا بھی شمار ہے۔ یہ شرافت کا نمونہ تھے اور جملہ معاملات پر مجھ سے خلیقانہ اور دوستانہ انداز میں گفتگو کرتے تھے۔

پاکستانی ہائی کمشنر متعین ہندستان نے میرا ذکر بہت اچھے الفاظ میں کیا۔ ہمارے مشترک احباب سے انھوں نے کہا کہ ’’سری پرکاش ہائی کمشنر ہندستان متعین پاکستان ہیں۔ لیکن ایسا نظر آتا ہے کہ وہ ہندستان میں پاکستان کے ہائی کمشنر ہیں۔‘‘ بہ مقتضائے بشریت

(۱) صدق. لکھنؤ: ۲۶ رستمبر ۱۹۴۷ء: ص ۷

یہ سن کر مجھے بے حد مسرت ہوئی۔ اس ریمارک کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ جو لوگ پاکستان چلے آئے تھے ان میں سے چند حضرات کی شادیاں ہندستان میں رہ جانے والے مسلمانوں سے میرے توسط سے طے ہوئیں۔ (۱)

ہندستان پاکستان کی نجات۔ جناح صاحب کا دائمی مسلک:

میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ ہندستان [بہ شمول پاکستان و بنگلا دیش] کی نجات غیر فرقہ پرستانہ مسلک میں ہے اور یہی وہ عقیدہ ہے جو میں ماضی میں رکھتا تھا، جو آج بھی ہے اور جو مستقبل میں بھی رہے گا اور جسے میں دل سے عزیز رکھتا ہوں۔

۱۹۳۶ء میں دیال سنگھ کالج یونین۔ لاہور میں خطاب کرتے ہوئے۔ بہ حوالہ ''جناح وہ جنھیں میں جانتا ہوں''

پاکستان بھارت تعلقات اور مسٹر جناح کا بیان:

۲۵/ اکتوبر ۱۹۴۷ء: گورنر جنرل پاکستان نے رائٹر کے نمائندے کو جو انٹرویو ۲۵/ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو دیا تھا، اس میں انھوں نے کہا تھا:

''پروفیسر ڈاکٹر گیڈگل نے اپنے ۹/ اکتوبر کے بیان میں یہ سچی بات کہی ہے کہ نئی انڈین یونین کی موزوں اور مناسب تعبیر صرف یہ ہے کہ یہ ایک ہندو ریاست ہے یا ہندو قومی ریاستوں کا وفاق ہے۔ وہ کہتا ہے کہ انڈین یونین کو ہندو ریاست کہنا اس بنا پر درست ہے کہ یہی اس کے مزاج کا سب سے نمایاں اور بالاتر پہلو ہے۔

۱۱/ مارچ ۱۹۴۸ء کو قاید اعظم محمد علی جناح سے سوئٹزرلینڈ کے ایک اخبار نویس نے انٹرویو لیا، اس نے قاید اعظم سے متعدد سوالات پوچھے، ایک سوال یہ بھی تھا کہ کیا کوئی ایسی امید ہے کہ پاکستان اور بھارت اپنے بنیادی اختلافات اور جھگڑے پُر امن ذرایع سے طے کر لیں؟

قاید اعظم نے اس سوال کے جواب میں کہا کہ شرط یہ ہے کہ بھارتی حکومت غرور اور برتری چھوڑ دے اور پاکستان سے مساوی سطح پر معاملہ طے کرے، نیز حقایق کا پورا اعتراف

---

(۱) پاکستان۔ قیام اور ابتدائی حالات: ۸۷-۸۶

کرے۔

نامہ نگار نے قایداعظم سے ایک اور سوال کیا کہ آیا بھارت اور پاکستان دونوں بین الاقوامی امور میں کسی یک ساں پالیسی پر عمل کر سکتے ہیں اور اپنی بری اور بحری سرحدوں کے دفاع کے لیے دوش بہ دوش کھڑے ہو سکتے ہیں؟ اس سوال کے جواب میں بانی پاکستان نے کہا:

''ذاتی طور پر اس باب میں کوئی شبہ نہیں کہ ہمارے اپنے مفادات کا تقاضا یہ ہے کہ پاکستان اور ہندستان بین الاقوامی امور و مفادات میں باہمی تعاون کے ذریعے بڑا اہم کردار ادا کر سکتے ہیں۔ اسی طرح پاکستان اور ہندستان دونوں کے لیے یہ امر بھی بڑی اہمیت کا حامل ہے کہ بیرونی حملے کی صورت میں یہ اپنی برّی اور بحری سرحدوں کے تحفظ کے لیے دوستانہ طریق پر تعاون کریں، مگر سارا دارومدار اس امر پر ہے کہ بھارت اور پاکستان خود اپنے اختلافات پہلے طے کر لیں۔ گھر کا اندرونی نظم و نسق بہتر ہوگا، جب ہی ہم بین الاقوامی امور میں عظیم کردار ادا کرنے کے قابل ہو سکیں گے۔''(۱)

مسٹر جناح نے کابینہ پلان پہلے منظور کر لیا تھا پھر پنڈت نہرو کے ایک بیان کو بہانہ بنا کر اس کی منظوری واپس لے لی تھی۔ حال آں کہ انھوں نے یہ منظوری لیگ کے حلقوں کی بے چینی، اخبارات کی تنقید اور بمبئ وغیرہ کے مسلمان سرمایہ داروں کی پریشانی اور احتجاج سے مجبور ہو کر واپس لی تھی۔ وہ کنفیڈریشن کے نظریے اور اس کی اہمیت کے مخالف نہ تھے۔ چناں چہ اسی انٹرویو میں انھوں نے

۱- بین الاقوامی امور (خارجہ پالیسی) اور ۲- دفاع

دو امور میں ہندستان سے تعاون اور یک ساں پالیسی کے اختیار کے امکان کو تسلیم کر لیا ہے۔ اب اگر دونوں حکومتیں ایک تیسرے درجے کے مسئلے ''رسل و رسایل'' میں ایک پالیسی پر عمل پیرا ہو جائیں اور اس طرح کا تعاون کر لیں کہ دونوں ملکوں کی خودمختاری پر آنچ نہ آئے

(۱) روزنامہ کوھستان. لاہور: ۲۵/دسمبر ۱۹۶۸ء بہ حوالہ گفتارِ قایداعظم، مرتبہ احمد سعید

تو کیا یہ ٹھیک کابینہ مشن پلان نہ ہو جائے گا؟ لیکن اگر کابینہ مشن پلان کی بنیاد پر یہ فیصلہ کیا جاتا تو زیادہ باعزت اور باوقار معاہدہ ہو جاتا۔

بادشاہ خان کی پشاور میں تقریر اور تلقین:

۲۲؍اکتوبر کی تاریخ تھی اور ۱۹۴۷ء کا سنہ۔ پاکستان کے شمال مغربی سرحدی صوبے پشاور میں ایک بہت بڑا جلسہ عام ہوا، اس جلسے سے خطاب کرنے والے شخص کو اپنے حق کے طور پر ہندستان میں رہنا چاہیے تھا۔ اس نے اپنی ساری زندگی، ایک سیکولر ملک بنانے کے لیے لڑائی میں صرف کر دی تھی اور عدم تشدد پر ایمان رکھتا تھا۔ اسے لوگ سرحدی گاندھی کے نام سے جانتے تھے۔ وہ بادشاہ خان بھی کہلاتا تھا۔ تشدد اور بربریت کے حالیہ ننگے ناچ میں اس نے دیکھا کہ اس کی ساری زندگی کا کیا دھرا ختم ہو رہا ہے، مگر اس نے اب بھی طوفان کا رخ بدلنے کی کوشش کی۔ جلسے میں موجود پٹھانوں سے اس نے کہا:

> ''اسلام کی بنیادی تعلیمات میں سے ایک ضبط اور برداشت کا جذبہ ہے۔ اسلام کا لفظ ہی محبت اور خیر سگالی کو ظاہر کرتا ہے، جو پٹھانوں کے قوانین کی بھی خصوصیت ہے، اس لیے اگر کوئی کسی کم زور، غیر محفوظ اور بے یار و مددگار شخص کو اذیت دیتا ہے تو وہ صرف اسلام ہی کے پاکیزہ نام پر دھبا نہیں لگاتا بلکہ وہ ایک بالکل غیر پٹھانی عمل کا بھی مجرم ہوتا ہے۔''

یہ الفاظ اس دن خصوصاً بڑے دھاردار تھے۔ صوبہ سرحد اور کشمیر کی سرحدوں پر اسلام کی ایک بالکل مختلف تاویل پیش کی جا رہی تھی۔ (۱)

انتقالِ آبادی کی ہول ناکی:

اسی بیان میں پنڈت سندر لال نے ''انتقال آبادی'' کی ہول ناکی پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ وہ اسے ایک گناہ عظیم قرار دیتے ہیں۔ انھوں نے اس گناہ عظیم کی ذمے داری کسی ایک قوم، کسی ایک سیاسی جماعت یا کسی ایک رہنما پر نہیں ڈالی۔ انسانیت کو اس ہول ناک تباہی کی طرف لے جانے میں بہت سے رہنماؤں اور ان کی پارٹیوں کا حصہ تھا۔ پنڈت جی

---

(۱) ہندستان اپنے حصار میں: ایم جے اکبر، ص ۲۴۹

کے نزدیک جو اس گناہ عظیم کے مرتکب اور اس ہول ناکی کے مجرم ہیں ان پر مقدمہ چلانا چاہیے تھا۔ وہ اپنے بیان میں کہتے ہیں:

''انتقالِ آبادی کی کارروائی انسانیت کے ساتھ ایک گناہِ عظیم ہے۔ شاید اس سے تاریک تر گناہ انسانی تاریخ میں نہ ہوا ہوگا۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ اس کا ذمے دار کون ہے۔ مجھے تو اکثر خیال آتا ہے کہ کم از کم ہمارے ایک درجن چوٹی کے لیڈر جن میں سب پارٹیوں کے لیڈر شامل ہونے چاہییں اور برطانوی قوم کے سیاسی لیڈروں پر اس جرم کا مقدمہ انھیں پناہ گزینوں کے سیدھے اور غیر جانب دار نمایندوں کی عدالت میں چلایا جانا چاہیے، جن پر ان مصیبتوں کا پہاڑ ٹوٹا ہے۔''(۱)

تبادلۂ آبادی کے بارے میں ۱۳؍ جولائی ۱۹۴۷ء کی مشہور پریس کانفرنس (دہلی) میں جناح صاحب نے ایم ایس ایم شرما کے ایک سوال کے جواب میں فرمایا تھا:

''آپ غلطی پر ہیں! تبادلہ آبادی کی پرانی مانگ اب ناکارہ ہوگئی، اس میں اب کوئی دم نہیں رہا، تقسیم کو سب نے بھائیوں کی طرح قبول کیا ہے۔ کوئی تلخی نہیں ہے، اب تبادلۂ آبادی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔''

انھوں نے زور دے کر کہا:

''پاکستان کے ہندو پاکستان میں اور ہندستان کے مسلمان ہندستان میں ہی رہیں گے۔''

افسوس کہ ان کے اس حسین و معقول تصور کو انھی کے ساتھیوں نے ناکام بنادیا!

---

(۱) قومی آواز. لکھنو: ۳۰؍ نومبر ۱۹۴۷ء بہ حوالہ حیات شیخ الاسلام: ص ۱۸۸؛ شیخ الاسلام کی سیاسی ڈایری: ج ۳، ص ۵۹۸

باب: ۱۲

...اور ہندستان تقسیم ہو گیا!

مولانا ابوالکلام آزاد کا تبصرہ:

۱۴/اگست ۱۹۴۷ء: ۷/اگست ۱۹۴۷ء کو بانی پاکستان کراچی تشریف لے آئے، ۱۱/اگست کو دستور ساز اسمبلی پاکستان کا افتتاح کیا۔ وہ اس کے صدر بھی تھے۔ ۱۲و۱۳ کو بھی اس کے اجلاس ہوئے۔ ۱۳/اگست کو لارڈ ماؤنٹ بیٹن کراچی پہنچے۔ ۱۴/اگست کی سہ پہر کو انھوں نے مسٹر محمد علی جناح سے گورنر جنرل پاکستان کے عہدے کا حلف لیا۔ وہ اسی روز شام کو دہلی لوٹ گئے تھے۔ ۱۴/و۱۵/اگست کی شب میں ۱۲ بجے ہندستان کی ڈومینین کے قیام کا اعلان کیا، بعد کے حالات پر مولانا ابوالکلام آزاد نے ان الفاظ میں تبصرہ فرمایا ہے:

''ملک آزاد ہو گیا تھا لیکن عوام آزادی اور کامیابی کا پورا لطف نہ اٹھا سکے۔ دوسرے دن جب ان کی آنکھ کھلی تو انھوں نے دیکھا کہ آزادی کے ساتھ ایک بہت الم ناک حادثہ واقعہ ہوا ہے۔ ہم نے بھی محسوس کیا کہ اس منزل تک پہنچنے سے پہلے جہاں ہم ٹھہر کر آرام کر سکیں گے اور آزادی کی نعمتوں سے مستفیض ہو سکیں گے، ایک لمبا اور سنگلاخ راستہ طے کرنا ہوگا۔

کانگریس اور مسلم لیگ دونوں نے تقسیم کو تسلیم کیا تھا۔ چوں کہ کانگریس ساری قوم کی نمائندہ جماعت تھی اور مسلم لیگ کو کافی مسلمانوں کی حمایت حاصل تھی، اس لیے قاعدے کے مطابق اس کا یہ مطلب ہونا چاہیے تھا کہ سارے ملک نے تقسیم کو مان لیا ہے۔ لیکن اصل صورت حال بالکل ہی اور تھی۔

جب ہم نے تقسیم سے فوراً قبل اور فوراً بعد سارے ملک پر نگاہ ڈالی تو معلوم ہوا کہ اس فیصلے کو تسلیم کرنے کا مطلب صرف یہ ہے کہ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے ایک ریزولیشن اور مسلم لیگ کے رجسٹر میں اس کا اندراج ہو گیا ہے۔ ہندستان کے عوام نے تقسیم کو تسلیم نہیں کیا

تھا۔ ان کا دل، ان کی روح اس ظلم پر چلا اٹھی تھی۔ میں نے ابھی کہا ہے کہ مسلم لیگ کو کافی مسلمانوں کی حمایت حاصل تھی۔ لیکن مسلمانوں کا ایک کافی بڑا حصہ ایسا تھا، جس نے ہمیشہ لیگ کی مخالفت کی تھی۔ ظاہر ہے تقسیم کا فیصلہ مان کر ان لوگوں کو گہرا زخم لگا۔ جہاں تک ہندوؤں اور سکھوں کا تعلق تھا ان میں سے ہر ایک تقسیم کے خلاف تھا اور کانگریس کے تقسیم کو مان لینے کے باوجود ان کے خیالات میں ذرّہ برابر بھی فرق نہیں آیا تھا۔ اب جو تقسیم عملی حقیقت بن گئی تو خود مسلم لیگ کے بہت سے حامی اس کے بھیانک نتایج کو دیکھ کر دہشت زدہ ہو گئے تھے اور کھلم کھلا یہ کہنے لگے کہ تقسیم سے ان کی مراد یہ نہیں تھی۔

آج دس برس بعد جب ان ساری باتوں پر دوبارہ نظر ڈالتا ہوں تو دیکھتا ہوں کہ واقعات نے ہر اس بات کی تصدیق کی ہے جو اس وقت میں نے کہی تھی۔ مجھے اس وقت بھی صاف محسوس ہو رہا تھا کہ کانگریس کے لیڈروں نے تقسیم کو آزادی کے ساتھ اور کھلے دل سے نہیں مانا ہے۔ ان میں سے کچھ تو خالی غصے میں اور تنگ آ کر اور کچھ بالکل مایوس ہو کر اس پر راضی ہو گئے تھے جب دلوں پر غم اور غصے یا خوف کا جذبہ حاوی ہو جائے تو لوگوں میں حقایق پر نظر رکھ کر فیصلہ کرنے کی صلاحیت نہیں رہتی۔ جن لوگوں کے مشتعل جذبات نے انھیں تقسیم کا حامی بنا دیا تھا، وہ کیسے سوچ سکتے تھے کہ ان کے عمل کے نتیجے کیا ہوں گے؟

کانگریس کے لیڈروں میں تقسیم کے سب سے بڑے حامی سردار پٹیل تھے۔ لیکن یہ بھی تقسیم کو ہندستان کے مسایل کا بہترین حل نہیں تصور کرتے تھے۔ درحقیقت انھوں نے اپنی پوری طاقت سے تقسیم کی حمایت صرف جھنجھلاہٹ اور احساس خودداری کو ٹھیس پہنچنے کی وجہ سے کی تھی۔ انھوں نے دیکھا کہ لیاقت علی خان بہ حیثیت وزیرِ مالیات ان کی ہر تجویز رد کر کے انھیں قدم قدم پر زچ کر دیتے ہیں۔ اس لیے انھوں نے تنگ آ کر فیصلہ کیا تھا کہ اگر تقسیم کے سوا چارہ نہیں ہے تو ملک کو تقسیم ہو جانا چاہیے۔ انھیں اس کا بھی یقین تھا کہ پاکستان کی نئی ریاست میں زندہ رہنے کی صلاحیت نہ ہوگی اور وہ زیادہ دن قایم نہ رہ سکے گی۔ وہ یہ بھی سمجھتے تھے کہ پاکستان کو تسلیم کر کے مسلم لیگ کی سخت تادیب کی جا سکے گی۔ پاکستان کی ریاست تھوڑے ہی عرصے میں بیٹھ جائے گی اور جو صوبے ہندستان سے الگ

ہوئے ہوں گے، انھیں بے پناہ مشکلوں اور مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔

ملک کی تقسیم کے بارے میں عام لوگوں کے رویے کا اصل امتحان ۱۴ راگست ۱۹۴۷ء کو ہوا جب آزاد پاکستان قایم ہوا۔ اگر عوام نے تقسیم کو قبول کیا ہوتا تو پنجاب، سندھ، سرحد اور بنگال کے ہندو اور سکھ ویسی ہی خوشی مناتے جیسی کہ وہاں کے مسلمان منا رہے تھے۔ مگر ان صوبوں سے جو اطلاعات ہم تک پہنچیں، ان سے اس دعوے کا کھوکھلا پن ظاہر ہو گیا کہ کانگریس کا تقسیم کو مان لینا پوری قوم کے مان لینے کے برابر ہے۔

۱۴ راگست پاکستان کے مسلمانوں کے لیے جشن کا دن تھا، لیکن ہندوؤں اور سکھوں کے لیے سوگ اور ماتم کا! یہ کیفیت صرف عام لوگوں کی نہیں تھی بلکہ کانگریس کے اہم لیڈر بھی اسے محسوس کرتے تھے۔ ان دنوں اچاریہ کرپلانی کانگریس کے صدر تھے۔ یہ سندھ کے رہنے والے تھے۔ انھوں نے ۱۴ راگست کو ایک بیان شایع کیا کہ آج کا دن ہندستان کے لیے تباہی اور ماتم کا دن ہے۔ پاکستان کے ہندوؤں اور سکھوں نے کھلے بندوں اسی جذبے کا مظاہرہ کیا۔ یہ واقعی عجیب و غریب صورتِ حال تھی۔ ہماری قومی جماعت نے تقسیم کے حق میں فیصلہ کیا تھا لیکن سارا ملک اس کی وجہ سے دکھی ہو گیا تھا۔

یہاں یہ سوال اٹھتا ہے کہ اگر ہندستانیوں کے دلوں میں تقسیم کے خیال سے غصے اور غم کے ایسے جذبات پیدا ہوئے تھے تو انھوں نے اسے کیوں منظور کیا؟ انھوں نے اور زیادہ سختی سے اس کی مخالفت کیوں نہیں کی؟ انھیں کیا جلدی تھی کہ ایسا فیصلہ کرتے جسے تقریباً ہر شخص غلط سمجھتا تھا؟ مانا کہ ۱۵ راگست تک ہندستان کے مسایل کا کوئی مناسب حل نہیں نکل سکا تھا، لیکن اس کی وجہ سے ایک غلط فیصلہ کر لینے اور پھر ہائے ہائے کرنے کے کیا معنی؟ میں برابر کہتا رہا تھا کہ اس وقت تک انتظار کرنا چاہیے، جب تک کوئی بہتر حل سمجھ میں آئے۔ میرے بس میں جو کچھ تھا، میں نے کیا۔ لیکن بدقسمتی سے میرے دوستوں اور ساتھیوں نے میری حمایت نہیں کی۔ حقیقت سے اس عجیب چشم پوشی کا صرف ایک سبب میری سمجھ میں آتا ہے اور وہ یہ کہ غصے اور مایوسی نے ان کی آنکھوں پر پردے ڈال دیے تھے۔ غالباً ایک خاص تاریخ یعنی ۱۵ راگست کے یقین نے ان پر ایسا جادو کیا کہ انھوں نے ماؤنٹ بیٹن کی ہر بات بغیر

سوچے سمجھے تسلیم کرلی۔

حالت ایسی تھی کہ دکھ اور رنج بھی ہوتا تھا اور ہنسی بھی آتی۔ سب سے مضحکہ خیز مسلم لیگ کے ان لیڈروں کی کیفیت تھی جو تقسیم کے بعد ہندستان میں رہ گئے تھے۔ مسٹر جناح اپنے ساتھیوں کو یہ پیغام دے کر کراچی کے لیے روانہ ہو گئے کہ ''اب جو ملک تقسیم ہو گیا ہے تو انھیں ہندستان کے وفادار شہری بن کر رہنا چاہیے۔'' اس الوداعی پیغام نے ان کے اندر کمزوری اور مایوسی کا ایک عجیب احساس پیدا کر دیا۔ ۱۴ر اگست کے بعد ان میں سے بہت سے لیڈر مجھ سے ملنے آئے۔ ان کی حالت پر رحم آتا تھا۔ ان میں سے ہر ایک نے سخت افسوس اور غصے کے ساتھ مجھ سے کہا کہ جناح نے انھیں دھوکا دیا ہے اور عین وقت پر ان کا ساتھ چھوڑ دیا۔ پہلے پہل میری سمجھ میں نہ آیا کہ ان کے یہ کہنے کا کیا مطلب ہے کہ جناح نے انھیں دھوکا دیا؟ انھوں نے تو صاف صاف مسلمانوں کی اکثریت کے علاقوں کی بنیاد پر ملک کی تقسیم کا مطالبہ کیا تھا۔ اب پاکستان بن گیا تھا اور مشرق اور مغرب دونوں طرف مسلمانوں کی اکثریت کے علاقے پاکستان میں شامل ہو گئے تھے۔ پھر یہ مسلم لیگ کے نمایندے کیوں کہہ رہے تھے کہ انھیں دھوکا دیا گیا؟

ان سے گفتگو کرنے سے مجھے معلوم ہوا کہ ان کے ذہن میں تقسیم کی ایک ایسی تصویر تھی، جس کا حقیقت سے کوئی واسطہ نہ تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ لوگوں کے ذہن پاکستان بننے کے نتائج کا کوئی اندازہ کر ہی نہیں سکے تھے۔ یہ بات قطعی طور پر معلوم تھی کہ اگر مسلمانوں کی اکثریت کے صوبے پاکستان میں شامل ہو جائیں گے تو بقیہ صوبے تو جہاں مسلمان اقلیت میں تھے، ہندستان ہی میں شامل رہیں گے۔ یوپی اور بہار کے مسلمانوں کو تو تقسیم کے بعد بھی ہندستان ہی میں رہنا تھا۔ اس لیے کہ وہ اقلیت میں تھے۔ یہ بات ہے تو عجیب، مگر واقعہ یہی ہے کہ مسلم لیگ کے ان لیڈروں نے حماقت میں اپنے دل میں شاید سمجھ لیا تھا کہ پاکستان بن جانے کے بعد سارے مسلمان چاہے وہ اکثریت کے علاقے کے ہوں یا اقلیت کے، ایک قوم تصور کیے جائیں گے، اور انھیں اپنے مستقبل کے بارے میں فیصلہ کرنے کا پورا حق ہوگا۔ لیکن اب جو مسلمانوں کی اکثریت کے صوبے پاکستان میں شامل ہو گئے۔ پنجاب اور

بنگال کی تقسیم بھی ہو گئی اور مسٹر جناح کراچی کے لیے روانہ ہو گئے تو آخر کار انھیں احساس ہوا کہ ہندستان کی تقسیم سے نہ صرف یہ کہ انھیں کوئی فائدہ نہیں ہوا ہے، بلکہ اس کی وجہ سے وہ اپنا سب کچھ کھو بیٹھے ہیں۔ مسٹر جناح کا الوداعی پیغام ایک ذرا سی چوٹ تھی جس نے انھیں چت کر دیا۔ اب یہ بات ان پر واضح ہو گئی کہ تقسیم کا واحد نتیجہ یہ نکلا ہے کہ اقلیت کی حیثیت سے وہ اور بھی کم زور ہو گئے ہیں۔ اس پر طرہ یہ کہ انھوں نے اپنی نادانی کی حرکت سے ہندوؤں کے دل میں غصہ اور جلن پیدا کر دی تھی۔

مسلم لیگ کے یہ لوگ برابر کہتے رہے کہ اب وہ ہندو اکثریت کے رحم و کرم پر ہیں۔ یہ بات ایسی بدیہی تھی کہ ان واقعات پر وہ جو اظہار غم کرتے تھے، اس کی وجہ سے ان کے ساتھ کوئی ہمدردی نہیں ہوتی تھی۔ میں نے انھیں وہ بات یاد دلائی جو میں نے کیبنٹ مشن کے زمانے میں کہی تھی۔ ۱۰/ اپریل کو میں نے ایک بیان دیا تھا جس میں، میں نے ہندستانی مسلمانوں کو بہت صاف لفظوں میں آگاہ کیا تھا۔ میں نے کہا تھا کہ اگر ملک تقسیم ہوا تب ان کی آنکھ کھلے گی اور وہ دیکھیں گے کہ اکثریت والے علاقوں کے پاکستان میں شامل ہو جانے کے بعد بھی وہ ہندستان ہی میں رہیں گے، مگر ان کی حیثیت ایک ادنا اور حقیر اقلیت کی سی ہو جائے گی۔''(۱)

پچھلے صفحات میں مولانا آزاد نے مسٹر محمد علی جناح کے ایک بیان کا حوالہ دیا ہے کہ ہندستان کے مسلمانوں کو ہندستان کا وفادار شہری بن کر رہنا چاہیے۔ اس مقام پر جناح صاحب کے اصل بیان اور اس کی حقیقت پر نظر ڈال لینی چاہیے۔

''اصولاً تو یہی بات ہونی چاہیے تھی کہ پاکستان کے تمام غیر مسلم شہری پاکستان کے اور ہندستان کے تمام مسلمان اور غیر ہندو شہری ہندستان کے وفادار شہری بن کر رہتے لیکن مسٹر جناح نے یہ بات کہاں کہی تھی؟ انھوں نے تو مسلمان کو ہندستان کی ''حکومت'' کا وفادار رہنے کا مشورہ دیا تھا اور ہندستان کی حکومت کو ان کی ''اپنی حکومت'' قرار دیا تھا۔ حال آں کہ اگر وہ یہ کہتے کہ ہندستان کے مسلمانوں کو ''ہندستان'' کا وفادار رہنا چاہیے۔ تب بھی

(۱) انڈیا ونس فریڈم: ص ۳۰۳-۶

ہندستان ان کے نزدیک ''ایک خالص ہندو ریاست'' تھا۔ (رائٹر کے نمایندے کو مسٹر جناح کا بیان ۲۵/ اکتوبر ۱۹۴۷ء) اور خود مسٹر جناح اور مسلم لیگ کے دعاوی کے مطابق مسلمان ہندوؤں کے ساتھ ایک ملک میں رہ نہیں سکتے تھے۔ ان کی ریاست اور ان کی حکومت کی وفاداری کا تو سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا، لیکن مسٹر جناح نے مسلمانوں کو یہی مشورہ دیا اور حکومت کو یہ حق بھی دیا کہ وہ کسی غیر وفادار شہری کو برداشت نہ کرے۔ ۱۳/ جولائی ۱۹۴۷ء کو نئی دہلی میں ایک پریس کانفرنس میں پاکستان کی اقلیتوں کو یقین دلایا کہ ان کے مذہب، کلچر، زندگی اور جائیداد کی حفاظت کی جائے گی، وہ پاکستان کے پورے شہری ہوں گے اور اس سلسلے میں ان کے ساتھ کسی قسم کا امتیازی سلوک نہیں کیا جائے گا۔ انھیں بھی دوسروں کی طرح ان تمام ذمے داریوں کو پورا کرنا پڑے گا جو ہر شہری پر عاید ہوتی ہیں۔ اقلیتوں کو حکومت کا وفادار بننا پڑے گا اور حکومت کی اطاعت قبول کرنے پڑے گی۔ کوئی حکومت یہ برداشت نہیں کر سکتی کہ اقلیتیں حکومت کی وفادار نہ ہوں یا تخریبی اقدامات شروع کر دیں۔ کیوں کہ ہر شہری کے لیے ضروری ہے کہ وہ حکومت کا وفادار رہے۔ ایک نامہ نگار نے کہا:

''آپ کہہ رہے ہیں کہ پاکستان کی اقلیتیں حکومت کی وفادار اور اطاعت گزار رہیں، کیا آپ ہندستان کی اقلیتوں کے بارے میں بھی یہی کچھ کہیں گے؟

''مسٹر جناح نے جواب دیا: ''یہ تمام اقلیتوں کے بارے میں ہے، خواہ وہ دنیا کے کسی بھی حصے میں آباد ہوں۔ کوئی حکومت یہ برداشت نہیں کر سکتی کہ کوئی اقلیت حکومت کی وفادار نہ ہو اور حکومت کے خلاف تخریبی اقدامات شروع کر دے، تو اس کا یہ رویہ حکومت کے لیے ناقابل برداشت ہو جاتا ہے۔ میں ہر مسلمان اور ہندو شہری سے اپیل کروں گا کہ وہ اپنی اپنی حکومت کا وفادار رہے۔''

جمہوری نظام میں جو پارٹی الیکشن میں سب سے بڑی کامیابی حاصل کرتی ہے، اس کو ایک مقررہ مدت مثلاً پانچ سال کے لیے اپنے منشور کے مطابق حکومت کرنے کا قانوناً اختیار حاصل ہو جاتا ہے۔ اس پارٹی کے رہنماؤں اور کارکنوں پر تو ایک طرح کا فرض ہی ہوتا ہے کہ وہ اپنے منشور کے مطابق ملک اور قوم کی خدمت انجام دیں اور تعمیر و ترقی کے

کاموں میں اپنے مخالف گروہوں کو ساتھ لے کر چلیں اور مخالف پارٹیوں کے لیے جنھیں سیاسی اصطلاح میں حزب اختلاف کہا جاتا ہے، یہ لازم ٹھہرتا ہے کہ حزب اقتدار پر کڑی نظر رکھے اور اپنی تنقید سے انھیں راہ سے بے راہ نہ ہونے دے، ملک کے تعمیری اور افادۂ عامہ کے منصوبوں میں اس کے ساتھ تعاون کرے۔ جمہوری نظام میں کسی اقلیت کو برسر اقتدار حکومت کی تابع داری کرنے اور وفادار رہنے کا مشورہ دینا اور عدم وفاداری کے مفروضے پر حکومت کے تشدد سے ڈرانا کوئی اصول کی بات تو نہ ہوئی!

وفاداری کا مرکز حکومت نہیں وطن اور اس کا دستور ہوتا ہے۔ حکومت سے پورے اخلاص کے ساتھ تعاون کرنا چاہیے۔ اگر قوم کو آنے جانے والی حکومت کا وفادار ہونا پڑے تو یہ رعیت بن جانے کی بات ہوگی جو غلامی کی ایک قسم ہے۔ مشورہ یہ دینا چاہیے تھا کہ ہندستان پاکستان کی اقلیتوں کو اپنے اپنے ملکوں اور ان کے دستوروں کا وفادار اور حکومتوں کا معاون بالاخلاص ہونا چاہیے تھا۔ جس اخبار نویس نے یہ سوال کیا تھا، وہ ایس ایم ایس شرما تھا۔ جناح صاحب کا پسندیدہ صحافی، اسے پریس کانفرنس میں یہ سوالات کرنے کے لیے پہلے ریہرسل کرادی گئی تھی۔ (ا۔س۔ش)

باب: ۱۳

جناح صاحب کا ترکِ وطن

تقسیم ہند کے اعلان اور بنگال و پنجاب کی تقسیم کے بعد مسلمانوں کے لیے سب سے اہم واقع جناح صاحب کا ترکِ وطن تھا۔ لوگ سمجھے بیٹھے تھے کہ وہ ہندستان میں رہیں گے اور ہندستان میں رہ جانے والے مسلمانوں کی قیادت کریں گے۔ مگر وہ تو پاکستان آنے اور گورنر جنرل بننے کا فیصلہ کر چکے تھے۔ یہ فیصلہ ہوا سو ہوا، مگر اس سے بڑا فیصلہ تو ان کا دہلی کا مکان بیچ دینے کا تھا۔ اس فیصلے اور واقعے کے متعلق ہندستان کی سنٹرل اسمبلی (دہلی) میں قایداعظم گروپ کے ڈپٹی لیڈر اور آل انڈیا مسلم لیگ ورکنگ کمیٹی کے ممبر سر محمد یامین کہتے ہیں:

> ''سب سے بڑا واقعہ یہ ہے کہ قایداعظم محمد علی جناح نے اپنی کوٹھی ڈالمیا کے ہاتھ اس سے کئی گنا قیمت پر فروخت کر دی جس قیمت میں خریدی تھی۔ سیٹھ ڈالمیا کی سیمنٹ فیکٹری کراچی میں ہے، جو کہ پاکستان کا دارالسلطنت مقرر کیا جا رہا ہے۔ وہاں ایک کوٹھی قایداعظم نے سنا ہے کسی پارسی سے خریدی ہے اور خود دہلی سے کراچی منتقل ہو رہے ہیں۔ اس نے تمام دہلی میں ہل چل مچادی ہے اور سوداگروں میں کھلبلی سی پڑ گئی ہے۔ اب تک تو سب اس خیال میں تھے کہ پاکستان علاحدہ ہو جائے گا تو اِدھر کے آدمی اِدھر اور اُدھر کے آدمی اُدھر رہیں گے۔ قایداعظم کے پاکستان جانے سے رنگ بدل گیا۔ اور لوگ حیران ہوئے کہ ایسا کیوں کیا، اس کا نتیجہ کیا ہوگا؟ اُدھر کے آدمی اِدھر اور اِدھر کے اُدھر بھاگیں گے۔''(۱)

---

(۱) نامۂ اعمال حصہ دوم: ص ۲۶-۱۳۲۵

لیاقت علی خاں کا عزم:

۷/اگست ۱۹۴۷ء جناح صاحب کراچی آگئے تھے۔ سر محمد یامین خان نے ان کی روانگی کے بعد لیاقت علی خاں سے پوچھا کہ ان کا ارادہ کیا ہے اور کب جائیں گے۔ اگرچہ لیاقت علی خان کا جواب تھا کہ ابھی تک انھوں نے کوئی فیصلہ نہیں کیا۔" لیکن ۱۳/اگست کو قانون ساز اسمبلی کے پہلے اجلاس میں وہ کراچی میں موجود تھے۔ یامین خان نے لکھا ہے:

"قایداعظم کے جانے سے ہندستان کے مسلمانوں کے پیر اکھڑنے لگے۔ میں نے ۸/اگست کو لیاقت علی خان کو فون کیا اور دریافت کیا کہ آپ کا کیا ارادہ ہے؟ آیا آپ بھی پاکستان جائیں گے؟ جب کہ آپ پاکستان کے باشندے نہیں ہیں اور نہ چندری گر ہیں، اگر آپ گئے تو یہاں کی فضا بہت خراب ہوجائے گی۔ اگرچہ میں جانتا ہوں کہ آپ نے ذاتی طور پر کانگریس والوں سے ایک قسم کی رنجش پیدا کرلی ہے۔ تاہم جو اوروں کا حشر ہوگا وہی آپ کا ہونا چاہیے۔ اگر آپ یہاں سے چلے گئے تو خدا معلوم کیا ہو۔ لیاقت علی خان نے کہا کہ انھوں نے ابھی تک کوئی فیصلہ نہیں کیا۔ تاہم ایک دو روز بعد لیاقت علی خان بھی دہلی سے کراچی پہنچ گئے۔"(۱)

پاکستان کے لیے جناح صاحب کی پرواز:

۷/اگست ۱۹۴۷ء: محمد علی جناح نے آج وہ پوشاک پہنی تھی جو وہ بہت کم پہنتے تھے۔ وہ چوڑی دار پاجامے اور شیروانی میں تھے۔ آج وہ کراچی پرواز کرنے والے تھے۔ ان کی پرواز کے لیے وایسرائے نے انھیں چاندی کے رنگ کا خوب صورت ڈی سی۔۳ طیارہ پیش کیا تھا۔

ڈی سی۔۳ کی ساری سیڑھیاں چڑھنے کے بعد انھوں نے اچٹتی ہوئی نظر اس شہر پر ڈالی جہاں انھوں نے پاکستان کے خواب کو حقیقت بنانے کے لیے برس ہا برس صرف کیے تھے۔ ان کے ذہن میں یہ خیال آیا "شاید میں دہلی کو دوبارہ نہ دیکھ سکوں گا۔"

---

(۱) نامۂ اعمال: ص ۱۳۲۶

۱۰) اورنگ زیب روڈ کا ان کا مکان فروخت ہو چکا تھا۔ اسے سیٹھ ڈالمیا نے خریدا تھا۔ دل چسپ بات یہ تھی کہ جس مکان میں پاکستان کا خواب شرمندۂ تعبیر ہوا، مکان کے نئے مالک اور مکین اس مکان میں گاؤکشی کے خلاف تحریک کا صدر دفتر بنانا چاہتے تھے۔

جناح نے کراچی تک اپنی پرواز بہت خاموشی سے طے کی۔ ان کا چہرہ اس طرح پتھرایا ہوا تھا کہ کامیابی کے کسی ردعمل کی کوئی پرچھائیں ان کے چہرے پر نظر نہیں آتی تھی۔

کراچی آنے پر جناح کے اے ڈی۔ سی، سید احسان نے دیکھا کہ ہوائی جہاز کے نیچے چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں کے آس پاس ساری زمین آدمیوں سے پٹی ہوئی ہے۔ لوگوں کے سفید کپڑے دھوپ میں چمک رہے تھے۔ ایسا لگتا تھا کہ ساری زمین سفید جھیل بن گئی ہے۔

جناح کی بہن نے خوش ہو کر کہا!۔ جن! دیکھ تو!

جناح نے ٹھنڈی نظروں سے کھڑکی کے باہر دیکھا۔ جن عوام کے لیے انھوں نے پاکستان کا مطالبہ کیا تھا اور حاصل کر لیا تھا، ان کا لہراتا ہوا سمندر واقعی دل کو خوش کرنے والا منظر تھا۔

جناح نے مدھم لہجے میں کہا۔ ''ہاں!.... بہت سارے لوگ ہیں۔''

ڈی۔ سی۔ ۳، اڑان پٹی پر دوڑ کر رک گیا۔ فضائی سفر نے جناح کو اس درجے تھکا دیا تھا کہ انھیں اپنی سیٹ سے اٹھنے میں تکلف ہو رہا تھا۔ ایک ساتھی نے انھیں بانھوں کا سہارا دینا چاہا، تو جناح نے فوراً مخالفت کی۔ انھوں نے دل میں کہا کراچی تو اپنا گھر ہے، اپنے گھر لوٹتے وقت قاید اعظم کو کسی سہارے کی ضرورت پڑے؟ ناممکن!

جناح کے اندر جسمانی قوت کی کمی ضرور تھی۔ لیکن قوت ارادی نے ہمیشہ ان کا ساتھ دیا۔ اسی کے سہارے وہ تن کر کھڑے ہو گئے۔ بغیر کسی کا سہارا لیے وہ ہوائی جہاز کی سیڑھیاں اترے۔ ان کو دیکھتے ہی لوگ خوشی سے جھومنے، اچھلنے لگے۔ بھیڑ میں سے گزرتے ہوئے وہ انتظار میں کھڑی اپنی کار تک پہنچے۔ راستے میں بھی انھوں نے کسی کا سہارا نہیں لیا۔

ہزاروں کی اس بھیڑ کی زبان پر بس ایک ہی نعرہ تھا، جسے وہ پورے جوش و خروش سے

لگا رہے تھے ''پاکستان زندہ باد!''

گورنمنٹ ہاؤس کو پاکستان کے پہلے گورنر جنرل کی سرکاری رہایش گاہ بنایا گیا تھا۔ وہاں پہنچ کر پہلی بار جناح کے چہرے سے خوشی کے تاثرات ظاہر ہوئے۔ ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ انھوں نے اپنے اے ڈی۔ سی۔ سید احسان سے کہا:

''جانتے ہو؟ مجھے امید نہیں تھی کہ میں جیتے جی پاکستان کو دیکھ سکوں گا۔''(۱)

پاکستان میں جناح صاحب کا ورود:

۷راگست ۱۹۴۷ء: ۷راگست ۱۹۴۷ء کو مسلم لیگ کے صدر قاید اعظم محمد علی جناح مع اپنی ہمشیرہ اور دوسرے عملے کے پاکستان کے گورنر جنرل کا عہدہ سنبھالنے کے لیے وایسرائے کے ڈکوٹا ہوائی جہاز کے ذریعے، جسے ایک انگریز پائلٹ ڈی ڈبلیو۔ ایل چلا رہا تھا، کراچی روانہ ہوئے۔ کراچی پہنچنے پر ماری پور کے ہوائی اڈے پر مسلمانوں کے بے پناہ ہجوم نے قاید اعظم کا فلک شگاف نعروں سے استقبال کیا۔ ہوائی اڈے سے گورنمنٹ ہاؤس تک قاید اعظم کا جلوس جن بازاروں سے گزرا، ہزاروں شہریوں نے انھیں خوش آمدید کہا۔

پاکستان کی ابتدائی مالی حالت:

آزادی کے وقت ہندستان کے خزانے میں ۴۰ کھرب نقد روپے تھے اس میں سے پاکستان کو کام چلانے کے لیے ۲۰ کروڑ روپے بطور پیشگی دیے گئے تھے۔ سمجھوتے کے مطابق ۵۵ کروڑ روپے کی ادائیگی باقی تھی جس کے بعد یہ کہا جاسکتا تھا کہ پاکستان کو اس کا حصہ مل گیا، لیکن جب کشمیر کا مسئلہ کھڑا ہو گیا تو ہندستان نے کہا کہ جب تک یہ مسئلہ حل نہیں ہوگا۔ یہ ۵۵ کروڑ روپے نہیں دیے جائیں گے۔ ورنہ یہ رقم ہتھیار خریدنے میں صرف ہوگی اور وہ ہتھیار ہندستان کی فوج کے خلاف آگ اگلیں گے۔

ہندستان کی اس ضد نے جناح کو افلاس کے دروازے پر کھڑا کر دیا۔ کام چلانے کے لیے جو پیشگی رقم ملی تھی وہ ختم ہو چکی تھی۔ سرکاری ملازموں کی تنخواہوں میں کٹوتی بار بار کی جاچکی تھی۔ آخر میں جناح جیسے خود دار آدمی کے لیے شرم سے ڈوب مرنے جیسی بات تھی۔

(۱) آدھی رات کی آزادی: ص ۶۰۔۱۵۹

جناح کی حکومت نے برٹش اورسیز کارپوریشن سے مہاجرین کو لانے کے لیے ایک ہوائی جہاز چارٹر کیا تھا۔ سرکار نے کارپوریشن کو جو چیک دیا وہ واپس کر دیا گیا کیوں کہ کھاتے میں اتنی رقم نہیں تھی۔ (۱)

گاندھی جی کا پاکستان پر ایک احسان:

ماؤنٹ بیٹن نے گاندھی جی سے کہا

''ہماری حکومت پاکستان کو اس کی رقم دینے سے انکار کر رہی ہے۔ سرکار کے تمام کاموں میں یہ ایک کام ایسا ہے جو جان بوجھ کر کیا جا رہا ہے اور جو غلط ہے۔''

گاندھی جی تن کر بیٹھ گئے ''جی ہاں! یہ غلط ہے۔ بے ایمانی ہے۔ اخلاق کے خلاف ہے۔ بین الاقوامی وعدہ خلافی ہے۔''

گاندھی جی کے ہونٹوں سے الفاظ کا سیلاب نکل پڑا۔ ''ایک بار حکومت نے جو عہد کیا ہے وہ اس سے کس طرح پیچھے ہٹ سکتی ہے۔ ہندستان کا طرزِ عمل ایسا ہونا چاہیے کہ ساری دنیا کی آنکھیں کھل جائیں۔ بین الاقوامی سطح پر ہندستان کو اپنی روحانی طاقت کو پھیلانا چاہیے۔ کیا آزادی کے بعد نئے ہندستان کے اصول پست ہو جائیں گے۔ نہیں نہیں!''

گاندھی جی نے ماؤنٹ بیٹن سے کہا کہ اب وہ اپنے برت میں ایک اور نکتہ جوڑ دیں گے۔ وہ دہلی میں امن کے لیے تو برت رکھیں گے ہی ہندستان کی بین الاقوامی عزت کے لیے بھی برت رکھیں گے۔ وہ اس وقت تک غذا قبول نہیں کریں گے جب تک ہندستان پاکستان کے ساتھ معاہدے کی شرطوں کی لفظ بہ لفظ پابندی نہیں کرے گا۔

گاندھی جی کے چہرے پر مسکراہٹ کھیلنے لگی جس میں معصومیت بھی تھی اور شرارت بھی۔ انھوں نے ماؤنٹ بیٹن سے کہا ''میری بات وہ ابھی نہیں سنیں گے۔ ایک بار مجھے مرن برت شروع کرنے دیجیے۔ پھر دیکھیے۔ (۲)

---

(۱) آدھی رات کی آزادی: ۲۴۷

(۲) آدھی رات کی آزادی: ص ۵۰۔۲۴۹

حصہ سوم

تاریخِ پاکستان
کے
چند اہم حوالے

(ا۔س۔ش)

باب: ۱

سکندر حیات اور قراردادِ پاکستان

''سر سکندر حیات اور لاہور قرارداد'' کے عنوان سے جانباز مرزا نے اپنی تالیف ''کاروان احرار'' میں پنجاب اسمبلی میں سر سکندر حیات کی ایک تقریر نقل کی ہے جس سے ''قرارداد لاہور'' سے ان کے تعلق پر مفید تاریخی روشنی پڑتی ہے۔ تفصیل یہ ہے:

پنجاب اسمبلی میں مارچ (۱۹۴۱ء) کے اجلاس میں سر سکندر حیات نے ایک طویل تقریر کی، جس میں اس نے اپنی پوزیشن واضح کرتے ہوئے کہا:

''اس ہاؤس سے باہر اور ہاؤس کے اندر یہ سوال بار بار کیا جا رہا ہے کہ آیا ہماری گورنمنٹ مسلم لیگی گورنمنٹ ہے؟ میں کئی بار کہہ چکا ہوں۔ آج پھر اعلان کرتا ہوں کہ یہ مسلم لیگی گورنمنٹ نہیں، بلکہ خالص پنجابی گورنمنٹ ہے اور یہی رہے گی۔ یونینسٹ پارٹی میں خالصہ نیشنلسٹ پارٹی کا نمائندہ بھی ہے اور ایک انڈیپنڈنٹ ممبر بھی ہے۔''

''ہاؤس میں میرے دوست سردار لال سنگھ اور دوسرے ممبران نے مجھ سے سوال کیا ہے کہ پاکستان کے بارے میں میری رائے کیا ہے۔ میں یہاں پر بہ طور وزیراعظم کے نہیں، بلکہ انفرادی حیثیت سے اپنی رائے کا اظہار کروں گا۔ پاکستان کی کئی اسکیمیں ہیں۔ ایک سر اقبال کی، ایک چودھری رحمت علی کی، ایک اسکیم ایک انگریز نے بھی شایع کروائی تھی اور ایک بھائی پرمانند نے بھی شایع کی۔''

سکندر حیات سے ایک سوال:

مسلم لیگ کے لاہور ریزولیشن کو آپ نے مرتب نہیں کیا تھا؟

جواب ''جی ہاں! میں نے مرتب کیا تھا۔ لیکن مسلم لیگ نے اس ریزولیشن کا آخری حصہ کاٹ دیا تھا۔ بدیں وجہ اب وہ ریزولیشن میرا نہیں رہا۔''

آگے چل کر سکندر حیات نے کہا:

''برطانیہ سے قطع تعلق کرنا ایک مہلک غلطی ہوگی۔ کیوں کہ ہمیں پروٹیکشن کی سخت ضرورت ہے اور وہ برطانیہ سے حاصل ہوسکتی ہے۔ رہا آزادی کا سوال تو آزادی نعرے لگانے سے حاصل نہیں ہوسکتی بلکہ آزادی کو سنبھالنے کے لیے ہمیں محنت کرنی ہوگی۔ تاہم کوئی اگر کہے کہ پنجاب میں خالص مسلم حکومت ہوگی، تو میں اس سے کوئی تعلق نہیں رکھوں گا۔ یہاں اگر کوئی حکومت ہوسکتی ہے، تو وہ صرف پنجابیوں کی ہوگی۔''(۱)

نیا پاکستان اور سر سکندر:

اس اجلاس میں سکندر حیات نے ہندستان کے مستقبل کے بارے میں ایک ایسی تجویز پیش کی جو قرارداد لاہور کے بالکل برعکس تھی۔ انھوں نے کہا کہ

''ہندستان کی حکومت فیڈرل طرز پر قایم ہونی چاہیے۔ جہاں ہر یونٹ کو مکمل خود اختیاری حاصل ہو۔ البتہ مرکز کو ایک قسم کا ایجنسی سینٹر بنا دینا چاہیے، جسے فیڈریشن کے مختلف یونٹ اپنی اپنی نمایندگی کے لیے کچھ اختیار عطا کر دیں۔''

اس کے ساتھ ہی سکندر حیات نے پنجاب مسلم لیگ کو مشورہ دیا کہ میری اس تجویز کے مطابق قرارداد لاہور میں ترمیم کرانے کی کوشش کرے، چناں چہ نواب شاہ نواز خان ممدوٹ صدر پنجاب مسلم لیگ نے وہیں ایوان میں اعلان کیا کہ ''انھوں نے اس قسم کی ترمیم کا مسودہ قاید اعظم کو بھیج دیا ہے۔''

اس پر کمال یہ ہے کہ لاہور کے مسلم اخبارات (زمیندار، انقلاب، شہباز، احسان) نے اس تجویز کے خلاف ایک لفظ تک نہیں لکھا۔ البتہ ۱۳/ مارچ (۱۹۴۱ء) کے روزنامہ ''سول اینڈ ملٹری گزٹ'' نے افتتاحیہ لکھا، جس کا عنوان تھا ''نیا پاکستان اور سر سکندر''(۲)

---

(۱) سہ روزہ زم زم. لاہور: ۱۵/ مارچ ۱۹۴۱ء

(۲) ہماری قومی جدوجہد: ص ۲۶-۱۲۵۔ کاروان احرار، ج ۵، ص ۲۴، ۲۵

اخبار زمیندار لاہور مورخہ ۲۵ر مارچ ۱۹۴۱ء کا ایک مضمون جس کے خاص خاص اقتباسات درج ذیل ہیں، اس وقت کی مسلم لیگ کی ذہنیت کو بے نقاب کر دیتا ہے:

''ہم مسلم لیگی بھی اس ملک کی دوسری جماعتوں کی طرح برطانیہ ہی کی فتح چاہتے ہیں۔ ہم انگلستان کو مظفر و منصور دیکھنا چاہتے ہیں۔ ہم صدیوں سے برطانیہ کے ساتھ وابستہ ہیں اور اُس کا رویہ خواہ کتنا ہی سخت اور تند کیوں نہ ہو، اُس کے قوانین کتنے ہی مطلق العنانہ کیوں نہ ہوں، پھر بھی ہم مدتوں سے اکٹھے رہتے آئے ہیں۔'' (ص ۲، کالم ۵)

اس کے بعد ارشاد ہوتا ہے:

''مسلم لیگ ایسے وقت میں برطانیہ کو پریشان نہیں کرنا چاہتی جب کہ وہ زندگی اور موت کی کش مکش میں مبتلا ہے اور نہ فوجی بھرتی میں رکاوٹ بننا چاہتی ہے اور نہ اُس نے سول نافرمانی کا حربہ استعمال کیا بلکہ وہ غیر جانبدار رہے۔ اگرچہ اُس کی غیر جانبداری بھی جارحانہ رنگ کی نہیں۔ اُس نے کچھ ارکان کو اجازت دے دی ہے کہ اگر وہ چاہیں تو برطانیہ کی مصیبت کے وقت کام آسکتے ہیں۔ سر سکندر حیات خان وزیر اعظم پنجاب نے جو مسلم لیگ کے ایک سربرآوردہ رکن ہیں، اتنی زبردست فوجی امداد کی ہے کہ جس کی مقدرت کسی اور شخص کو نہیں ہو سکتی۔'' (ص ۷، کالم ۸)

اس کے بعد ص ۸ کالم ۱ میں فرماتے ہیں:

''اور ہم ہندی مسلمان بھی خواہ ماضی میں ہمیں کتنا ہی اختلاف کیوں نہ رہا ہو، انگریزوں کے ساتھ ہیں اور اس وقت بھی ہم تمھاری امداد کرنا چاہتے ہیں۔''

انگریزوں کا ساتھ دینے کے لیے اگر یہ کوئی معقول استدلال ہے کہ ہم سو سال تک ان کے ساتھ رہے ہیں اور اس لیے ان کا تند و سخت رویہ اور کتنے ہی مطلق العنانہ قوانین بھی برداشت کیے جا سکتے ہیں، تو اس قوم کا حق اس سے کہیں زیادہ ہے جس کے ساتھ گیارہ سو برس کے اچھے برے دن ہم نے گزارے ہیں۔ (ا۔س۔ش)

سر شاہ نواز فارمولا

۸رفروری ۱۹۴۱ء: نواب سر شاہ نواز آف ممدوٹ جو مسلم لیگ کے نام ور رہ نما تھے، کونسل لیگ کے اہم رکن تھے اور آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس لاہور مارچ ۱۹۴۰ء کے صدر استقبالیہ کمیٹی تھے۔ انھوں نے کونسل لیگ میں ۸رفروری ۱۹۴۱ء کو پنجاب کی تقسیم کے بارے میں ایک تجویز پیش کی تھی اور اگرچہ اس پر کونسل کا ردعمل معلوم نہیں ہوسکا، لیکن تجویز ایک ٹریکٹ کی صورت میں شایع ہوگئی تھی۔ اس تجویز پر محمد اسلم ملک موروث پوری نے ایک مضمون ۳۱ راکتوبر ۱۹۸۱ء کے روزنامہ جنگ لاہور میں لکھا تھا۔ اس کے اہم حصے جانباز مرزا مرحوم نے کاروان احرار، ج ۸، ص ۹۰۔۱۸۶ میں اپنے تبصرے کے ساتھ چھاپ دیے ہیں، اس کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ پنجاب کی تقسیم میں ضلع کو تقسیم کا یونٹ بنانے کے بجائے تحصیل کو تقسیم کا نقطہ قرار دینے، مسلمانان پنجاب کے خلاف ہندو انگریز سازش، تقسیم کے مسودے میں ماؤنٹ بیٹن کا ردوبدل، ہندو کی مسلم دشمنی، ماؤنٹ بیٹن کو ہندستان پاکستان کا مشترکہ گورنر جنرل بنانے سے انکار کا انتقام، کشمیر کے لیے ہندستان کو راستہ دے دینے کا الزام وغیرہ وغیرہ جو لگائے جاتے ہیں اس کی بنیاد کی پہلی اینٹ مسلم لیگ کے رہ نما نواب سر شاہ نواز آف ممدوٹ نے رکھی تھی۔"

کانگریس اور ہندو مہاسبھا کی متذکرہ بالا قراردادوں کی تائید مسلم لیگی رہ نما نواب سر شاہ نواز کی تجویز نے کردی۔ نواب سر شاہ نواز رئیس آف ممدوٹ (صدر استقبالیہ آل انڈیا مسلم لیگ کانفرنس لاہور۔ منعقدہ مارچ ۱۹۴۰ء) کی ایک تجویز جو انھوں نے مسلم لیگ کونسل کے سامنے پیش کی، اس تجویز پر ۸رفروری ۱۹۴۱ء کی تاریخ درج ہے۔

۳۱ راکتوبر ۱۹۸۱ء کے روزنامہ "جنگ" لاہور میں محمد اسلم ملک کا ایک مضمون شایع ہوا۔ جس میں مضمون نگار نے نواب سر شاہ نواز کی حسبِ ذیل تجویز نقل کی ہے:

"پنجاب میں مسلمانوں کی مجموعی تعداد ۵۷ فی صد ہے اور اتنی قلیل اکثریت سے مسلمان اس قابل نہیں ہوسکتے کہ وہ موثر طور پر ایک آزاد اور خود مختار اسلامی ریاست قایم کرنے کے قابل ہو جائیں۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے

ضروری ہے کہ وہ اپنی علاقائی سرحدوں میں مناسب طور پر ردو بدل کی جائے۔
اس لیے میں تجویز کرتا ہوں کہ انبالہ ڈویژن کو صوبۂ پنجاب سے نکال دیا جائے۔
(یعنی جو پنجاب پاکستان میں شریک ہے)۔"

اپنی اس تجویز کے دوران آگے چل کر سر نواب شاہ نواز لکھتے ہیں کہ

"مسلمانان پنجاب کے جذبات یہی رہے ہیں کہ انبالہ ڈویژن کو صوبۂ پنجاب (پاکستان میں) شامل نہ کیا جائے۔ لیکن چند مفاد پرست ایسے بھی ہیں جو نہ صرف انبالہ ڈویژن کو بہ دستور پنجاب میں شامل رکھنے پر تلے ہوئے ہیں، بلکہ وہ یہ بھی چاہتے ہیں کہ دہلی، علی گڑھ اور بلند شہر تک کا علاقہ بھی صوبۂ پنجاب میں شامل رہے۔ اس تجویز کے پس پردہ ان مفاد پرست مسلمانوں کا مقصد اپنے ہندو دوستوں کی ناراضگی سے بچنا ہے۔ [ان کا کہنا ہے کہ] انبالہ ڈویژن، صوبۂ دہلی اور علی گڑھ مسلمانوں کی فکری اور علمی میراث کا مرجع ہے لہٰذا ان کا پنجاب (پاکستان) کا جز بننا ضروری ہے۔"

سر شاہ نواز نے اس کا جواب دیتے ہوئے کہا:

"یہ درست ہے کہ اس طرح کچھ زائد رقبہ مسلمانوں کو ضرور مل جائے گا، مگر پنجاب میں مسلمانوں کی آبادی کا تناسب گھٹ کر ۵۴ فیصد رہ جائے گا۔ اور یہ عظیم تر نقصان ہے۔ باقی رہ گیا تہذیب وتمدن کا معاملہ تو کیا ایسی خوب صورت عمارات ہر جگہ موجود نہیں اور علی گڑھ یونیورسٹی مسلم پنجاب میں دوبارہ نہیں بنائی جاسکتی کہ ہم خواہ مخواہ خسارے کا سودا کریں۔"

شاہ نواز نے اسی طرح (کی رائے) بنگال کے متعلق بھی پیش کی۔ فرماتے ہیں:

"بردوان ڈویژن کو بنگال سے کاٹ دینا چاہیے تاکہ بقیہ بنگال میں مسلمانوں کو باسٹھ فیصدی کی فوقیت حاصل ہوسکے۔ جب کہ متحدہ بنگال میں مسلمان صرف اکاون فیصد ہیں۔"

مضمون نگار لکھتا ہے کہ

''ایسا محسوس ہوتا ہے کہ بنگال کے متعلق خان صاحب کا رویہ صرف برائے ردیف ہے کیوں کہ یہ انتہائی مختصر ہے جب کہ اس کے برعکس پنجاب کے صوبے پر انھوں نے پوری شرح وبسط سے روشنی ڈالی ہے۔ لہٰذا یہ قیاس ہے کہ خان شاہ نواز کی اصل دلچسپی پنجاب کی تقسیم سے ہے۔''

بہ قول مضمون نگار شاہ نواز کی یہ تجویز سات صفحات پر مشتمل تھی۔ جن میں تین صفحات میں ریاستوں کے معاملات پر بھی انھوں نے بحث کی، لکھتے ہیں:

''انڈین اسٹیٹس جو ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ واقع ہیں۔ باہم الحاق کر کے علاحدہ فیڈریشن تشکیل دیں۔ حیدرآباد (دکن) کو البتہ آزادیٔ کامل عطا ہونی چاہیے۔ تاج برطانیہ سے اس کے خصوصی تعلقات برقرار رہیں۔ صوبۂ سرحد اور بلوچستان کی ریاستوں، دیر، چترال، سوات، قلات، مکران وغیرہ کے متعلق یہ تجویز کیا کہ چوں کہ انڈین اسٹیٹس کے کسی بلاک کے نزدیک ملحق واقع نہیں ہیں۔ لہٰذا انھیں اپنا علاحدہ وطن بنانے اور ریاستوں کی بین الملکی فیڈریشن کے ساتھ الحاق کرنے کی اجازت ہونی چاہیے۔ پھر ان ریاستوں کو پاکستان کے ساتھ الحاق کا اختیار ملنا چاہیے۔''

مضمون نگار متذکرۂ بالا عبارت کے آخر میں لکھتا ہے کہ

''برطانوی حکومت نے جب انجام کار مطالبۂ پاکستان تسلیم کر لیا تو انڈین اسٹیٹس کے متعلق وہی فارمولا پیش کیا جو چھ سال قبل سر شاہ نواز نے پیش کیا تھا۔''

سر شاہ نواز نے اپنی تجویز کے آخر میں مسلمانوں کی سیاسی حیثیت پر اظہار خیال ہے۔ اُن کی رائے میں ہندستان میں چار طاقتیں ہیں۔ ہندو، مسلمان، انڈین اسٹیٹس اور برٹش گورنمنٹ، ہندو چوں کہ صرف ہندو راج قایم کرنے کے متمنی ہیں۔ لہٰذا وہ اس سے کم تر کسی بھی بات پر سمجھوتا نہیں کریں گے۔ اس لیے فطری طور پر ہندستان کی بقیہ تینوں قوتوں (مسلمان، ریاستیں اور انگریز) کو ہندوؤں کے خلاف متحد ہونا پڑے گا۔ اب رہ گیا انگریز... تو اسے صرف اس بات سے غرض ہے کہ وہ اپنے اقتدار کو کس طرح طول دے

سکتا ہے۔ لہٰذا وہ ہر اُس فریق کے ساتھ تعاون کرنے کو تیار ہے جو کہ طاقتور ہے۔ اور جو اس کے اقتدار کو طول دینے میں ممد بھی ثابت ہو سکے۔ لہٰذا مسلم لیگ اور والیانِ ریاست کو مل کر ایک متحدہ محاذ تشکیل دینا چاہیے۔ والیانِ ریاست اور مسلم لیگ کا متحدہ محاذ کس طرح قایم ہو؟ کہ لیگ والیان ریاست کے مطالبے کی تائید کرے۔ اُن کا مطالبہ اور خواہش یہ ہے کہ اُن کی وحدت اور ریاستی خود مختاری بہ ہر صورت قایم رہے۔ لہٰذا مسلم لیگ کو ریاستی حکم رانوں کی ہمدردیاں اور تعاون حاصل کرنے کی خاطر اور مجوزہ متحدہ محاذ قایم کرنے کی غرض سے ریاستی حکم رانوں کے موقف کی حمایت کرنا ہوگی۔ اور ان کے موقف کی حمایت کی بہترین صورت یہ ہے کہ مسلم لیگ ہندستان کو دو حصوں میں نہیں بلکہ تین ٹکڑوں میں تقسیم کرنے اور تین ریاستوں یا فیڈ ریشنوں کے قیام کی حمایت کرے۔ تیسری فیڈ ریشن انڈین اسٹیٹس پر مشتمل ہوگی۔

(بہ قول مضمون نگار) متذکرہ بالا تجویز کے مطالعے کے بعد فطری طور پر چند سوال ابھرتے ہیں، جن کا تسلی بخش جواب ضروری ہے۔

۱) اس دستاویز کے مطالعے سے ظاہر ہوتا ہے کہ قرار دادِ پاکستان کی منظوری کے بعد بھی مسلم لیگی زعما اس عنوان پر شد و مد کے ساتھ بحث کرتے رہے ہیں کہ آیا پاکستان کی مجوزہ اسکیم میں ہندو اکثریت کے پنجابی علاقوں کو مسلم پنجاب کے ساتھ شامل رکھا جائے یا انھیں الگ کر دیا جائے۔ لہٰذا ''پنجاب و بنگال کو تقسیم کرنے کی اسکیم کانگریس کی نہیں بلکہ خود مسلم لیگی لیڈروں کے ذہن کی پیداوار ہے۔''

۲) ریڈ کلف نے باؤنڈری کے متعلق جو ایوارڈ ۱۹۴۷ء میں دیا۔ کم و بیش یہی چیز سر شاہ نواز ۱۹۴۱ء میں پیش کر چکے تھے اور شاہ نواز کے بہ قول، ''یہ پنجاب کے اکثر و بیشتر لوگوں کی خواہش تھی کہ انبالہ ڈویژن کو پاکستان میں شامل نہ کیا جائے۔''

ریڈ کلف نے بہت حد تک یہی کچھ کیا لیکن مزید کتر بیونت کر کے ناانصافی اور زیادتی کا ارتکاب کیا۔

۳) سر شاہ نواز خان وحدت و توسیع پنجاب کے حامیوں پر مفاد پرستی کا الزام لگاتے

ہیں۔ کیا یہی الزام خود اُن پر عاید نہیں ہوتا کہ پنجاب تقسیم کرا کے وہ ذاتی اور سیاسی اغراض کی تکمیل چاہتے تھے؟ آخر وہ اغراض کیا تھیں وعلی ہذا القیاس نواب سر شاہ نواز رئیس آف ممدوٹ کی طویل تجویز کے مطالعے کے بعد بے ساختہ کہنا پڑے گا:

گلہ ہم اُن کا کرتے تھے قصور اپنا نکل آیا!

قارئین! اس تاریخی دستاویز کا مطالعہ سطحی نظر سے نہ کریں بلکہ گہرائی میں جھانک کر دیکھیں گے تو نہ صرف تقسیم پنجاب و بنگال ہی بلکہ ہمیں برصغیر کی تقسیم اور ریڈکلف ایوارڈ بھی دکھائی دے گا۔ نیز اس کے پس منظر میں کون سے محرکات تھے؟ یہ بھی قابلِ غور ہے!

نواب صاحب کی مندرجۂ بالا تجویز سے تین سوال سامنے آتے ہیں۔

(اوّل) یہ کہ ۱۹۴۰ء کے اجلاس منعقدہ لاہور (جس کے استقبالیہ کے صدر نواب صاحب تھے) اور لیگ ورکنگ کمیٹی کے ممبر بھی نیز قاید اعظم کے لاہور میں میزبان بھی! لاہور اجلاس میں جو بنیادی قرارداد منظور ہوئی کیا اس میں سالم پنجاب کا مطالبہ شامل نہیں تھا؟ اگر انبالہ ڈویژن پاکستانی پنجاب کے لیے غیر مفید تھا تو اُس وقت نواب صاحب نے اس میں ترمیم کیوں مناسب نہیں سمجھی؟ ایک سال بعد انھیں یہ تجویز پیش کرنے کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی؟

(دوم) نواب صاحب کو شبہ تھا کہ انبالہ ڈویژن کے پنجاب میں شامل رہنے سے پنجاب کے مسلمان چون فیصدی رہ جائیں گے اور دیگر اقلیتیں متحد ہو جائیں تو پنجاب میں اسلامی ریاست کامیاب نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا انبالہ ڈویژن کا الگ ہو جانا ہی بہتر ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ نواب صاحب نے ۱۹۱۶ء کے کانگریس کے ''میثاقِ لکھنو'' کا مطالعہ نہیں کیا۔ جس پر محمد علی جناح قاید اعظم نے بہ طور صدر مسلم لیگ دستخط کیے تھے۔ اس میثاق کے ذریعے پنجاب کی چھپن فیصد مسلم آبادی کو پچاس فیصد میں بدل دیا گیا تھا اور اس کے مقابل یوپی کی تیرہ فیصد مسلم اقلیت کو بیس فیصدی حقوق دے کر اپنی ستر فیصد نشستوں کا کوئی نقصان نہیں کیا۔ لیکن پنجاب کی مسلم اکثریت کو چھپن کی بجائے پچاس کی اقلیت کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔ اگر نواب صاحب انبالہ ڈویژن کو محض اس خوف سے علاحدگی کا مطالبہ کر رہے

ہیں تو انھیں میثاقِ لکھنؤ کے تحت صدر مسلم لیگ سے یہ سوال کرنا چاہیے تھا کہ انھوں نے ۱۹۱۶ء میں میثاق لکھنؤ کیوں تسلیم کیا تھا؟

یہ بات بھی سمجھنے کی ہے کہ متحدہ ہندستان کے دونوں صوبے (پنجاب اور بنگال) فرقہ وارانہ سمجھوتے میں ہمیشہ رکاوٹ رہے ہیں۔ کیوں کہ ان دونوں صوبوں میں مسلمانوں کی غالب اکثریت کے باعث غیر مسلم بہ دستور پریشان تھا اور وہ اسے مسلم راج سے منسوب کرتا رہا۔ یاد رہے ہنوز شمال مغربی صوبۂ سرحد میں اصلاحات کے نافذ ہونے کی کوئی امید نہیں تھی۔ بلوچستان میں بھی یہی حالات تھے۔ سندھ کا علاقہ صوبۂ بمبئی میں شامل تھا اور وہاں کی مسلم اکثریت بمبئی کی ہندو اکثریت کے مقابلے میں اقلیت بنی ہوئی تھی۔ لے دے کر پنجاب اور بنگال ہی ایسے صوبے تھے جن سے ہندو خائف تھا۔ لیکن ۱۹۱۶ء کے میثاق لکھنؤ نے اُن کی یہ پریشانی دور کر دی۔ یہ کانگریس کی بہت بڑی کامیابی تھی کہ اُس نے پنجاب اور بنگال کی اکثریت کا سارا مان توڑ کر رکھ دیا تھا۔

لہٰذا انبالہ ڈویژن کی پنجاب سے علاحدگی کے محرک کو ۱۹۴۰ء کے اجلاس میں مسلم لیگ کے صدر سے بات کرنی چاہیے تھی۔ ممکن ہے نواب صاحب کے تمام اندیشے دور ہو جاتے!

پاکستان کیا ہے؟

تیسرا سوال اس قدر اہم ہے کہ اس ایک سوال سے کئی سوال مزید جنم لیں گے۔ مثلاً مضمون نگار اسلم ملک اپنے مضمون کے شروع میں لکھتا ہے کہ

راقم الحروف ایک اہم تاریخی دستاویز کو پیش کرنے سے ہچکچا رہا تھا کہ قایداعظم کے کاغذات (قایداعظم پیپرس اسلام آباد) کے الٹنے پلٹنے سے محض اتفاقاً نظر پڑی تھی اس سے معلوم ہوا کہ

> "یہ دستاویز دراصل ایک نوٹ ہے جو سر شاہ نواز خان آف ممدوٹ نے غالباً ذاتی حیثیت میں قایداعظم یا مسلم لیگ ہائی کمان کو لکھا تھا۔ اس کا عنوان ہے۔
>
> "پاکستان کیا ہے؟"

مضمون نگار کی مندرجۂ بالا عبارت سے ظاہر ہوتا ہے کہ سر شاہ نواز کی تجویز مسلم لیگ

ہائی کمان کی نظروں سے گزر چکی تھی۔ مگر مصلحتاً انھوں نے اسے نہ تو مشتہر کرنا مناسب سمجھا اور نہ ہی نظر انداز کیا۔ البتہ اُسے محفوظ کرلیا۔

اس سے یہ اشکال پیدا ہوتا ہے کہ مسلم لیگ ہائی کمان کو سر شاہ نواز کی تجویز سے اتفاق تھا۔ کیوں کہ خاموشی نیم رضا کے مترادف ہے۔

۱۱رمئی ۱۹۳۱ء کو ہندو مہاسبھا نے اور ۸رمارچ ۱۹۴۷ء کو کانگریس نے تقسیم پنجاب کی تجاویز پیش کیں اور ۸رفروری ۱۹۴۱ء کو نواب سر شاہ نواز نے مسلم لیگ ہائی کمان کو تقسیم پنجاب کی تجویز دے کر کانگریس اور ہندو مہاسبھا کی تائید کردی۔

اس کے ساتھ ہی سر اسٹیفورڈ کرپس برطانوی پارلیمنٹ کو اپنی رائے دیتے ہوئے کہتا ہے کہ اگر مسلم لیگ کے دعوے کے مطابق پاکستان قایم کردیا جائے تو اس سے فرقہ واریت کا مسئلہ حل نہیں ہوگا اور مسلم لیگ اگر اس مطالبے پر اڑی بھی رہے تو اسے وہ پاکستان نہیں ملے گا جس کا وہ مطالبہ کررہی ہے۔ پنجاب میں اسے پورے انبالہ اور جالندھر ڈویژن سے دستبردار ہونا پڑے گا، اس کے علاوہ ماسوائے سلہٹ کے پورا صوبۂ آسام بھارت کے حوالے کرنا ہوگا۔ مغربی بنگال کا ایک وسیع علاقہ جس میں کلکتہ بھی شامل ہے جہاں مسلم آبادی صرف ۲۳٫۶ فیصد ہے، بھارت کو دینا پڑے گا اور ہم یہ بھی سمجھتے ہیں کہ پنجاب اور بنگال کی تقسیم وہاں کے رہنے والے دونوں مناصب کے لوگوں کو قابل قبول نہیں ہوگا۔ [1]

سر شاہ نواز کی تجویز سر اسٹیفورڈ کرپس کی برطانیہ کو آگاہی، کانگریس اور ہندو مہاسبھا کی تجاویز، قارئین ان پر غور کریں کہ یہ سارا کچھ چکر کہاں سے چلا، ان کا محرک کون ہے اور بالآخر ان کے نتائج کیا ہوئے؟ [2]

حالات پر ایک سرسری تبصرہ:

مسلم لیگ کی سیاست نے پاکستان کو حالات کے جس مقام پر لا کھڑا کیا ہے، اس پر ایک نظر ڈال لیجیے!

---

(۱) مشرق میگزین: لاہور، ۲راکتوبر ۱۹۸۱ء

(۲) کاروانِ احرار: از جانباز مرزا، جلد ۸، ص ۹۱۔۱۸۵

۱) ۱۹۳۷ء کے بعد لیگ نے سیاست کا جو طرز و انداز اختیار کیا تھا اور رفتہ رفتہ اسے اپنی سیاست کا نصب العین بنالیا تھا، اس کے دس سالہ شور و ہنگامہ، ملک کی تقسیم، ۱۹۴۶ء کے یوم راست اقدام سے شروع ہونے والے کلکتہ ونواکھالی سے شروع ہوکر اور بنگال و بہار اور دہلی و پنجاب تک پھیل جانے والے فسادات، ان کی خوں ریزی، لوٹ مار، آتش زنی، اغوا، لاکھوں انسانوں کی دربدری، تباہی و بربادی، کشمیر کے نصف صدی سے زیادہ کے جھگڑے، جس کے لیے جھگڑے، فساد، قتل وغارت گری کے الفاظ بہت معمولی ہیں، کے بعد ہم نے کیا پایا ہے؟ مرزا جان باز کے لفظوں میں:

''اگر انبالہ ڈویژن کو پنجاب سے الگ کر دیا جائے (جیسا کہ الگ کر دیا گیا)، تو پاکستانی پنجاب کا طول وعرض کیا رہ جاتا ہے؟''

۲) سوچیے کہ اس تقسیم اور جھگڑوں کی بہ دولت کون کون سے مسایل ہمارے حصے میں آئے ہیں اور جن حالات سے دونوں قومیں گزر رہی ہیں، جن کی دو نسلیں بھگتان بھگت چکی ہیں، تیسری نسل عذاب میں مبتلا ہے، ان کے لیے اس عذاب سے چھٹکارے کی کوئی مدت ہے یا نہیں؟

۳) پچھلے صفحات میں ''سر شاہ نواز فارمولا'' کے ضمن میں تقسیم پنجاب کے مسئلے میں لیگی رہنماؤں کے کردار اور باہمی اختلافات اور کش مکش کے جو واقعات مطالعے میں آئے ہیں اور جن حقایق کا انکشاف ہوا ہے، ان پر مزید روشنی اسی جلد کے آیندہ صفحات میں ''جناح صاحب کے نام خلیق الزماں کا ایک خط'' کے مضمون سے بھی پڑتی ہے۔ صاف معلوم ہوتا ہے کہ معاملہ ایسا نہ تھا کہ لیگ کے بڑے رہنماؤں کو اس کی خبر نہ ہو! وہ دامن جن کی پاکیزگی کی قسمیں کھائی گئی ہیں، وہ بھی اس معصیت سے آلودہ ہیں، لیکن اگر چودھری خلیق الزماں بروقت اس مسئلے کو اٹھانے سے معذور تھے اور انھوں نے اسے اپنی روح کا سوہان بنالینا گوارا کر لیا تھا، تو اب اسے اس سے زیادہ طول دینے کا کیا فایدہ؟ اس کے بعد انگریز ہندو سازش اور کانگریس، مہاسبھا کی مسلمان اور پاکستان دشمنی کے حوالے دینا کس حد تک جایز ہے؟ جو کچھ ہوا آپس کے صلاح ومشورے سے دیکھتی آنکھوں کے سامنے ہوا! کاش!

ہم اس سے مستقبل کے لیے سبق حاصل کریں!

متحدہ وطن کا خواب تو چکنا چور ہو گیا لیکن اگر ہندستان اور پاکستان اب بھی اپنے جھگڑے بند کر کے اتحاد کی کوئی صورت نکال لیں تو دنیا میں بہت کچھ حاصل کر سکتے ہیں؛ بر اعظم پاک و ہند کا امن، پر سکون زندگی، دونوں ملکوں کی ترقی، دونوں قوموں کی خوش حالی اور اقوام عالم میں ایک بہت اونچا اور باعزت مقام! اتحاد کل بھی ضروری تھا اور آج بھی ضروری ہے، کل۔ ہندستان میں آباد صدیوں کی ساتھی اقوام کا اتحاد مطلوب تھا، آج ان دونوں ملکوں کا اتحاد ضروری ہے، جو کبھی ایک تھے، اتحاد افراد، جماعتوں اور قوموں ہی کی ضرورت نہیں انسانیت کی ضرورت ہے!

مسلم لیگ کے غلط اندازِ سیاست نے ہندستان اور پاکستان کے مسلمانوں کو جس مقام پر لا کر کھڑا کر دیا ہے۔ وہ افسوس ناک ہی نہیں تشویش ناک بھی ہے۔ جو کچھ ہو چکا ہے، ہم اس کے اثرات کو مٹا نہیں سکتے لیکن اگر ہم آج بھی اپنے غلط اندازِ فکر کو بدلنے اور کھلے ہوئے ذہن سے کانگریس اور لیگ کے نقطۂ نظر سے الگ ہو کر تاریخ کے مطالعے کی طرف متوجہ ہوں، اپنے اندازِ فکر کو بدل لیں اور اپنے جماعتی گروہی، خاندانی مفادات کے تنگ دایرے میں سوچنے کے بجائے، قومی اور ملکی مفادات کے نقطۂ نظر سے سوچیں تو ہم اپنی آیندہ نسلوں کو اس عذاب سے ضرور بچا لیں گے جس میں ہم خود مبتلا ہیں۔

حالات میں غور و فکر کرنے والوں کے لیے حالات کے مطالعے کی اہمیت اور غور و فکر کے اور بھی کئی پہلو ہیں۔ (ا۔س۔ش)

باب: ۲

تقسیم پنجاب کی تاریخی لیگی تجویز

تقسیم پنجاب کی پہلی تجویز جس کے اصول پر ۱۹۴۷ء میں عمل ہوا، ۱۹۴۱ء میں نواب سر شاہنواز ممدوٹ نے پیش کی تھی جس کا ذکر پچھلے صفحات میں آچکا ہے۔ ۱۹۴۷ء میں جو کچھ ہوا اس وقت پنجاب کی تقسیم کے مقدمے میں مسلم لیگ کے مؤکل وہی تھے۔ اور فیصلہ باؤنڈری کمیشن انھیں کے پیش کردہ میمورنڈم کے مطابق ہوا۔ مرزا غلام نبی جانباز نے کاروانِ احرار جلد آٹھ میں، اس مقدمے میں ان کی کارگزاری، ان کے پیش کردہ میمورنڈم اس کے عواقب ونتائج پر روشنی ڈالی ہے۔ اس کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ جو کچھ سامنے آیا وہ کسی غیر کی سازش کا نتیجہ نہیں، بلکہ مسلم لیگ کے رہنماؤں ہی کا کیا دھرا تھا۔ جانباز مرزا لکھتے ہیں:

مسلم لیگ کا میمورنڈم

مسلم لیگ کی جانب سے جو میمورنڈم اس کمیشن کے سامنے پیش کیا گیا اس میں اس بات پر زور دیا گیا کہ ''باہم متصل علاقے'' کا صحیح یونٹ ''ضلع'' نہیں، بلکہ ''تحصیل'' ہے۔ اور اس اصول کی بنا پر عارضی تقسیم کے نقشے میں مندرجۂ ذیل ردوبدل کا مطالبہ کیا گیا۔

۱) ضلع گورداس پور کی تحصیل پٹھان کوٹ مشرقی پنجاب کو دے دی جائے۔

۲) ضلع امرت سر کی تحصیل اجنالہ مسلم اکثریت کی تحصیل ہے اور مسلم اکثریت کے علاقے سے متصل ہے، لہٰذا اسے مغربی پنجاب میں شامل کیا جائے۔

۳) ضلع فیروز پور کی تحصیل فیروز پور مسلم اکثریت کی تحصیل ہے اور مسلم اکثریت کے علاقے سے متصل ہے، لہٰذا اسے مغربی پنجاب کا حصہ تصور کیا جائے۔ اس سے آگے تحصیل فیروز پور سے متصل تحصیل زیرہ ہے۔ پھر اس سے متصل ضلع جالندھر کی تحصیل نکودر ہے اور اس سے متصل تحصیل جالندھر ہے اور یہ سب مسلم اکثریت کی تحصیلیں ہیں۔ لہٰذا انھیں مغربی

پنجاب میں بہ الفاظ دیگر پاکستان میں شامل کیا جائے۔

اس کے بعد ''دوسرے امور'' کی بنا پر کچھ مزید علاقے کا مطالبہ کیا گیا تھا لیکن وہ ''ضلع'' اور ''تحصیل'' کی اصولی بحث سے علاحدہ سوال تھا۔

صرف الفاظ کی منطق کے اعتبار سے یہ طرز استدلال بے شک خوش نما اور مفید معلوم ہوتا ہے۔ لیکن یہ بہت ہی سطحی بات تھی اور ''واقعات کی منطق'' کی جانب سے بالکل آنکھیں بند کر لینے کے مترادف تھی۔

یہ نکتہ قابل غور ہے کہ کیا اس بات کا کوئی عملی امکان ہو سکتا تھا کہ کوئی سرحدی کمیشن پاکستان کو ایک کاری ڈور (Corridoor) یا راستہ دے کر مشرقی پنجاب کے قلب میں تحصیل جالندھر کے علاقے پر پاکستان کا تسلط قایم کر دے۔ اور مشرقی پنجاب کی ریل کی مین لائن اور گرانڈ ٹرنک روڈ کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے بیچ کا ٹکڑا پاکستان کے قبضے میں دے دے۔ یہی حال تحصیل نکودر کا تھا۔ ایک بہ ظاہر خلاف عقل اور ناممکن العمل مطالبہ پیش کر کے یہ کہنا یا سمجھنا کہ ہم ایک تحصیل پٹھان کوٹ کو ہاتھ سے چھوڑ رہے ہیں تو پانچ زاید تحصیلوں کا مطالبہ کر رہے تھے، خود اپنے آپ کو اور دوسروں کو دھوکا دینے کے مترادف تھا۔

دوسری طرف تحصیل پٹھان کوٹ کے معنی صرف تحصیل پٹھان کوٹ نہ تھے۔ اگر مسلم لیگ خود تحصیل پٹھان کوٹ کو اصولی طور پر مشرقی پنجاب کا حصہ تسلیم کرے تو یہ سوال یقیناً اور فوراً پیدا ہوتا تھا کہ پٹھان کوٹ اور امرت سر کے درمیان ریل اور سڑک اور تار وغیرہ کا موجودہ مواصلاتی نظام مغربی پنجاب کے حوالے کر دیا جائے یا اسے موجودہ حالت میں قایم رکھا جائے؟ یہ سوال ایسا تھا جس پر ''دوسرے امور'' کا جایز اطلاق ہوتا تھا۔ اور اسے نظر انداز نہ کیا جا سکتا تھا۔ لہٰذا از خود ضلع گورداس پور کی تقسیم کا مطالبہ کرنا تحصیل گورداس پور اور تحصیل بٹالہ کے لیے سخت خطرہ پیدا کرنے کے مترادف تھا۔ اس کے علاوہ تحصیل پٹھان کوٹ کی یہ اہمیت محتاج بیان نہ تھی کہ بھارت کو ریاست جموں و کشمیر تک پہنچنے کا واحد راستہ اسی تحصیل کے ذریعے مل سکتا تھا۔ اپر باری نہری نظام کا سب سے بڑا ہیڈ ورک (مادھو پور) بھی اسی تحصیل میں تھا۔

کوئی معمولی سمجھ بوجھ کا انسان کسی متنازع مقدمے میں یہ پالیسی اختیار نہیں کرتا کہ فریق ثانی سے جوابی مراعات کی امید موہوم پر اپنے کسی جائز مطالبے سے خود ہی دست بردار ہو جائے۔ تحصیل جالندھر اور نکودر کا مطالبہ محض ہوائی چیز تھی۔ اگر عملی امکانات اور ''واقعات کی منطق'' کو پیشِ نظر رکھ کر ان دونوں باتوں کا موازنہ کیا جاتا کہ مسلم لیگ کا مقدمہ تیار کرنے والے کن چیزوں کو حاصل کرنے کے لیے کن چیزوں کو ہاتھ سے دے رہے تھے؟

صاف بات یہ تھی کہ وہ ضلع گورداس پور کی ایک تحصیل نہیں، بلکہ تین تحصیلوں کا تبادلہ ضلع فیروز پور کی دو تحصیلوں (فیروز پور اور زیرہ) کے ساتھ کرنے کی کوشش کر رہے تھے اور اس کوشش میں انھوں نے اتنا اضطراب ظاہر کیا (اور اصل وجہِ شکایت یہی تھی) کہ تحصیل پٹھان کوٹ کو بالوضاحت اور تحصیل گورداس پور اور بٹالہ کو ضمناً اپنے ہاتھ سے دے دیا اور اس کے مقابلے میں جن علاقوں کو پاکستان میں لانے کی امید باندھی گئی تھی۔ وہ بہ دستور بحث ونزاع کا موضوع بنے رہے۔

ثالث کی جانب سے بے ایمانی ایک علاحدہ سوال ہے، اس کا واقعی کوئی علاج نہ ہوسکتا تھا۔ لیکن اپنے مطالبات مرتب کرتے وقت خود مسلم لیگ کا ''میمورنڈم'' تیار کرنے والوں نے جس طرح عملاً تین تحصیلوں کو دے کر دو تحصیلیں حاصل کرنے کی تدبیر کی، اس کا مسلمانوں کے مفاد سے کیا تعلق ہوسکتا تھا؟ اسی بات سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا ''ضلع'' کے بجائے ''تحصیل'' کے یونٹ پر زور دینے کا مقصد صرف ممدوٹ اسٹیٹ کو پاکستان میں لانا تھا، قطع نظر اس بات سے کہ اس سے کشمیر پر کیا اثر پڑتا تھا اور کن دوسرے نتائج کے امکانات پیدا ہوتے تھے۔

آج اس سوال کا کوئی واضح جواب نہیں ملتا کہ مسلم لیگ کا میمورنڈم تیار کرنے کی ذمے داری کس نے کس کو سپرد کی تھی۔ اتنی بات معلوم ہے کہ مسلم لیگ کی جانب سے مؤکل کی حیثیت میں اس مقدمے کی پیروی صوبائی لیگ کے صدر نواب (سر شاہ نواز آف) ممدوٹ کر رہے تھے اور وکیل کی حیثیت سے چودھری ظفر اللہ خان تھے، لیکن چودھری صاحب نے

کمیشن کے ایک مسلمان ممبر کے استفسار پر یہ صاف کہہ دیا تھا کہ مطالبات مرتب کرنا ان کا کام نہ تھا۔ مسلم لیگ کیا چیز ہاتھ سے چھوڑنا چاہتی تھی اور کیا حاصل کرنا چاہتی تھی؟ یہ طے کرنا چودھری صاحب کے قول کے مطابق مسلم لیگ کا اپنا کام تھا۔ وہ خود وکیل کی حیثیت سے ان مطالبات کی وکالت کے فرائض سرانجام دے رہے تھے، جو ان کے مؤکل نے تیار کر کے ان کے حوالے کیے تھے۔[۱]

میمورنڈم کا ایک اقتباس:

ریڈکلف کمیشن کے نام مسلم لیگ کے میمورنڈم کا متعلقہ پیراگراف جس میں کہا گیا ہے کہ پٹھان کوٹ کی تحصیل مشرقی پنجاب کے حصے میں جائے گی۔

"10. If these principles are accepted, it will be found that, subject to considerations arising out of other factors, the Pathankot Tahsil of the Gurdaspur District, would be detached from the West Punjab and included in East Punjab. In every other Tahsil of the Gurdaspur District, and in every Tahsil of the remaining sixteen districts at present included in West Punjab, the Muslims have an overall Majority. The Ajnala Tahsil of the Amritsar District, which has a majority of Muslims in its population and is contiguous to the Lahore, Sialkot and Gurdaspur District, will be included in the West Punjab."

جسٹس دین محمد کی رپورٹ کا وہ حصہ جس میں انھوں نے اس بات پر اصرار کیا ہے کہ

(۱) روزنامہ مشرق لاہور: ۱۷ ستمبر ۱۹۶۴ء و مارشل لا سے مارشل لا تک: ص ۳۶۹

ضلع گورداس پور کو مکمل طور پر مغربی پنجاب میں شامل رہنا چاہیے۔

"Figures reveals that the Districts of Lahore, Gujranwala, Sialkot, Sheikhupura, Lyallpur, Montgomery and Multan can in no circumstances either in whole or in part be taken-out of the category of Muslim Majority area and that the District of Gurdaspur too must remain in West Punjab, even if the non-Muslims have a majority in the Pathankot Tahsil."

ترجمہ: ''اگر یہ اصول مان لیے جاتے ہیں تو اور دوسری کئی وجوہات کے پیش نظر یہ بات سامنے آئے گی کہ ضلع گورداس پور کی پٹھان کوٹ تحصیل کو مغربی پنجاب سے علاحدہ کر کے مشرقی پنجاب میں شامل کر دیا جائے گا۔ ضلع گورداس پور کی ہر دوسری تحصیل میں بہ شمول اُن سولہ تحصیلوں کے جو مغربی پنجاب میں شامل کی گئی ہیں، مسلمانوں کی واضح اکثریت ہے۔ ضلع امرت سر کی تحصیل اجنالہ جہاں مسلمانوں کی آبادی کی اکثریت ہے اور جو لاہور، سیال کوٹ اور گورداس پور کے اضلاع سے بالکل قریب تر ہے، کو بھی مغربی پنجاب میں شامل کیا جائے گا۔''

حد بندی کمیشن کا فیصلہ:

مسلم لیگ کے وکیل سر ظفر اللہ نے قاید اعظم کے حکم پر ریڈکلف کمیشن کے رُو بہ رُو پاکستان کی کیا وکالت کی؟ اس ضمن میں اُس نے شیخ بشیر احمد کو مرزائیوں کی وکالت کے لیے مقدمے میں کیوں داخل کیا؟ مرزائیوں نے مسلم لیگ (جو کہ اُن دنوں مسلمانانِ گورداس پور کی نمایندگی کر رہی تھی) کی موجودگی میں مرزائی لیڈر بشیر الدین محمود، دوران مقدمہ عدالت میں کیوں موجود رہا؟ اور مرزائیوں نے باؤنڈری کمیشن کی کارروائی کے دوران امریکا سے کیا اور کیوں لٹریچر منگوایا؟ جیسے کہ احمدی اکیڈمی ربوہ کی جانب سے شایع کردہ

ایک کتابچہ (تحریک پاکستان میں جماعت احمدیہ کی قربانیاں) کے صفحہ نمبر ۴۳پر درج ہے کہ

''باؤنڈری کمیشن نے لاہور میں اپنی کارروائی کا ۲۶ر جولائی کو آغاز کر دیا۔ مسلم لیگ کا کیس محترم چودھری ظفر اللہ صاحب نے پیش کیا۔ خود امام جماعت احمدیہ بھی تمام کارروائی دیکھنے اور سننے کے لیے عدالت میں موجود رہے اور مناسب ہدایات دیتے رہے۔ علاوہ ازیں امریکا سے باؤنڈری لٹریچر ہوائی جہاز کے ذریعے منگوایا اور لندن سے اسکول آف اکنامکس کے ایک ماہر اور ممتاز جغرافیہ دان پروفیسر اسپیٹ کو لندن سے بلوا کر اُن کی خدمات حاصل کی گئیں۔

ان کے تمام اخراجات جماعت احمدیہ نے برداشت کیے۔ بین الاقوامی باؤنڈری فیصلوں کی نقلیں اور دیگر لٹریچر چودھری مشتاق احمد باجوہ (مرزائی) امام مسجد لندن کی مساعی سے حاصل کیا گیا۔ غرض کہ باؤنڈری کمیشن میں مسلم لیگ کے کیس کو مضبوط کرنے کے لیے جو مواد مل سکتا تھا جماعت احمدیہ نے مہیا کیا۔''

باب: ۳

سر شاہ نواز کی تجویز اور لیگ کا میمورنڈم

تبصرے کی ایک نظر

ایک تجویز:

نواب سر شاہ نواز ممدوٹ نے کونسل لیگ میں پنجاب کی تقسیم کے بارے میں ایک تجویز پیش کی۔ اس پر ۸ر فروری ۱۹۴۱ء درج ہے۔ اس تجویز کی خصوصیات یہ ہیں؛

۱) پنجاب کی تقسیم میں ضلع کو تقسیم کا یونٹ بنانے کے بجائے تحصیل کی بنیاد پر تقسیم کا عمل کرنے کا مشورہ دیا گیا ہے، یہ بات انھوں نے مسلم لیگ کے میمورنڈم میں بھی بیان کی ہے۔

۲) انبالہ ڈویژن کو صوبہ پنجاب کی اس حد سے نکال دیا جائے جس پر تقسیم کا عمل کیا جائے گا!

اس کے لیے کوئی پختہ دلیل کے بجائے کہا گیا ہے کہ ''مسلمانانِ پنجاب کے جذبات یہی ہیں کہ انبالہ ڈویژن کو صوبہ پنجاب (پاکستان) میں شامل نہ کیا جائے۔''

۳) اس تجویز کو قطعاً رد کر دیا جائے کہ علی گڑھ و میرٹھ کے اضلاع کو اور دہلی کو صوبہ پنجاب میں شامل کر لیا جائے تاکہ پاکستان کا رقبہ زیادہ ہو جائے۔

نواب شاہ نواز کے پاس اس کی مخالفت کی دلیل یہ ہے کہ

☆ اس تجویز کے پس پردہ ان مفاد پرست مسلمانوں کا مقصد اپنے ہندو دوستوں کی ناراضگی سے بچنا ہے۔

ایک دوسری جگہ پر انھوں نے مفاد پرستوں کے لیے ''غدار'' کا لفظ استعمال کیا ہے۔ حال آں کہ اس تجویز کے مجوز بھی وہی مسلمان تھے جو ملک کی تقسیم کو ہندستان کے فرقہ وارانہ

مسئلے کا حل سمجھتے تھے۔ یہ بھی لیگ ہی سے تعلق رکھتے تھے۔ یہ نیشنلسٹ مسلمانوں میں سے کسی کے ذہن کی اپج نہ تھی۔

☆اس سلسلے میں نواب صاحب فرماتے ہیں:

''ان (مفاد پرست مسلمانوں) کا کہنا ہے کہ ابنالہ ڈویژن، صوبہ دہلی اور علی گڑھ مسلمانوں کی فکری اور علمی میراث کا مرجع ہیں، لہٰذا ان کا پنجاب (پاکستان) کا جزو بننا ضروری ہے۔''

نواب صاحب اس کے جواب میں فرماتے ہیں:

''یہ درست ہے کہ اس طرح کچھ زاید رقبہ (پاکستان کے لیے) مسلمانوں کو ضرور مل جائے گا مگر پنجاب میں مسلمانوں کی آبادی کا تناسب (۵۶ فیصد سے) گھٹ کر ۵۴ فی صد رہ جائے گا۔ اور یہ عظیم تر نقصان ہے۔ باقی رہ گیا تہذیب و تمدن کا معاملہ تو کیا ایسی خوب صورت عمارات ہر جگہ موجود نہیں؟ اور کیا علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی پنجاب میں دوبارہ نہیں بنائی جاسکتی کہ ہم خواہ مخواہ خسارے کا سودا کریں!''

نواب سر شاہ نواز ایسا کیوں چاہتے تھے کہ انبالہ ڈویژن کو پاکستان میں سے نکال دیا جائے اور علی گڑھ، میرٹھ، صوبہ دہلی کو پنجاب میں شامل کر کے اس کی توسیع بھی نہ کی جائے؟ اس کا فلسفہ نواب صاحب ہی کی زبان سے سینے۔ فرماتے ہیں:

''پنجاب میں مسلمانوں کی تعداد کا تناسب ۵۴ فی صد ہے۔ اتنی قلیل اکثریت سے مسلمان اس قابل نہیں ہو سکتے کہ وہ مؤثر طور پر ایک آزاد اور خود مختار اسلامی ریاست قایم کرنے کے قابل ہو جائیں۔''

اس نیک اور بلند مقصد کو حاصل کرنے کے لیے نواب صاحب ضروری سمجھتے ہیں کہ پنجاب کی علاقائی سرحدوں میں مناسب ردوبدل کی جائے۔ اس لیے ''میں تجویز کرتا ہوں کہ انبالہ ڈویژن کو صوبہ پنجاب سے نکال دیا جائے۔'' نواب صاحب نے اپنی تجویز کے آخر میں ایک عجیب بات لکھی ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

''ہندستان میں چار طاقتیں ہیں: ہندو، مسلمان، انڈین اسٹیٹس اور برٹش

گورنمنٹ!''

پھر ان چاروں طاقتوں کا تجزیہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''ہندو چوں کہ صرف ہندو راج قایم کرنے کے متمنی ہیں، لہٰذا وہ اس سے کم تر کسی بھی بات پر سمجھوتا نہیں کریں گے۔ اس لیے فطری طور پر ہندستان کی بقیہ تین طاقتوں کو ہندوؤں کے خلاف متحد ہونا پڑے گا۔

رہ گیا انگریز، تو اسے صرف اس بات سے غرض ہے کہ وہ اپنے اقتدار کو کس طرح طول دے سکتا ہے، لہٰذا وہ ہر اس فریق کے ساتھ اتحاد کرنے کو تیار ہے جو کہ طاقت ور ہو اور اس کے اقتدار کو طول دینے میں مد بھی ثابت ہو سکے۔

اس طرح مسلم لیگ اور والیان ریاست کو ملا کر ایک متحدہ محاذ تشکیل دینا چاہیے۔ مسلم لیگ والیان ریاست کا اتحاد کس طرح قایم ہو؟ (اس کی صورت یہ ہوگی) کہ لیگ اہلیانِ ریاست کے مطالبے کی تائید کرے! ان کا ''مطالبہ اور خواہش'' یہ ہے کہ ان کی وحدت اور ریاستی خود مختاری بہ ہر صورت قایم رہے۔

لہٰذا مسلم لیگ کو ریاستی حکمرانوں کی ہمدردیاں اور تعاون حاصل کرنے کی خاطر اور مجوزہ متحدہ محاذ قایم کرنے کی غرض سے ریاستی حکمرانوں کے موقف کی حمایت کرنی ہوگی۔ اور ان کے موقف کی حمایت کی صورت یہ ہوگی کہ مسلم لیگ ہندستان کو دو حصوں میں نہیں بلکہ تین ٹکڑوں میں تقسیم کرے اور تین ریاستوں یا فیڈریشنوں کے قیام کی حمایت کرے۔ تیسری فیڈریشن انڈین اسٹیٹس کی ہوگی۔''

اب قارئین کرام غور فرمائیں:

ہندو اگر ہندو راج کے متمنی ہیں تو نواب صاحب اس کے خلاف بقیہ تین قوتوں کا محاذ بنا کر کیا کریں گے؟ کیا ان کو ملیا میٹ کریں گے، یا ان کے دلوں سے ہندو راج کے قیام کی تمنا کو نکال پھینکیں گے یا انھیں ان کی اکثریت کے علاقوں میں ہندو راج قایم کر لینے کا حق دے کر انھیں اپنا دوست بنا لیں گے؟ لیکن یہ تو متحدہ محاذ کے قیام کے بغیر بھی کیا جا سکتا

ہے۔ اور اگر ان کی سزا کے لیے آپ کو انگریزوں کی مدد کی ضرورت پیش آتی تو ان کے اقتدار کو طول دینے مسلم لیگ ان کی پوری مدد کرے گی۔ کیا انھوں نے سوچ لیا ہے کہ جب ہندستان تین طاقتوں ہندو، انگریز اور ایک ریاستوں کی وحدت میں تقسیم ہو جائے گا تو پاکستان کہاں قایم ہوگا؟

اسی (تجویز) سلسلے کی کڑی ''مسلم لیگ کا میمورنڈم'' تھا جو باؤنڈری کمیشن کو پیش کیا گیا تھا، جس میں تقسیم کی بنیاد ضلع کو بنانے کے بجائے تحصیل کو تقسیم کا یونٹ قرار دیا گیا تھا۔ اسی بنیاد پر تقسیم کا عمل ہوا اور بعض مقامات پر اس اصول کو بھی نظر انداز کر دیا گیا۔ افسوس کہ مسلم لیگ صوبوں کی بنیاد پر ملک کی تقسیم کے مؤقف پر قایم نہ رہ سکی۔ اس نے ضلع کو صوبوں کی تقسیم کی بنیاد مان لیا اور نواب صاحب نے از خود تحصیل کو بنیاد بنانے پر اصرار کیا، کانگریس نے اس پر رضامندی ظاہر کر دی اور کمیشن نے اس اصول کو تسلیم کر لیا۔

افسوس کہ دنیا کی محبت، مال کے حرص اور ریاست کی ہوس نے انھیں تحصیل کی سطح لا پٹکا تھا جس سے ہزاروں لاکھوں اہل وطن اور وطن کا کتنا بڑا نقصان ان کی اس خود غرضی کی وجہ سے ہوا تھا۔ افسوس کہ انھیں اس کا بالکل احسائں نہ ہوا اور جس کی وجہ سے ان کے رہنما مسٹر محمد علی جناح کا سر شرم سے جھک گیا تھا۔

اگر مسلم لیگ کو کوئی رہنما میمورنڈم کی تیار کرنے کی ذمے داری قبول نہ کرے تو اسے قبول کرنا بھی نہیں چاہیے کہ دو اشخاص کے سوا نہ کوئی اس گناہ میں شریک تھا اور شاید کسی اور کو اس کی خبر بھی نہ تھی۔ اس کے ذمے دار صرف نواب شاہ نواز تھے۔ جنھوں نے اپنی ریاست کو بچانے کے لیے گناہ عظیم کیا تھا اور مسٹر محمد علی جناح نے ان پر اعتماد کیا تھا اور میمورنڈم پر تنقید و تحقیق کی گہری نظر نہیں ڈالی تھی۔

۱) مسٹر محمد علی جناح سے بڑھ کر برِ اعظم ہند پاکستان میں کسی سیاسی جماعت کا صدر نہیں جو اپنی جماعت پر اس درجہ چھایا ہوا کہ اس کے ایما، مشورے اور فیصلے کے بغیر اس کے بڑے سے بڑا عہدے دار جماعت کے دایرے میں سانس بھی لے سکے اور مسٹر جناح لیگ کی ورکنگ کمیٹی اور کونسل سے مشورے کے بغیر ان کو نظر انداز کر کے اور جماعت کے ضابطوں

اور منصب صدارت کے حدود کو توڑ کر اور دستوری پابندیوں کی پروا کیے بغیر فیصلے کرتے رہے۔ ان پر عمل ہوتا رہا ہے اور جماعت کے دایرے سے لے کر بیرون جماعت تک کا کوئی فرد ان پر اعتراض کرنے اور ان سے پوچھنے کی جرأت نہیں کر سکتا کہ خلاف اصول و دستور جماعت یہ قدم کیوں اٹھایا گیا؟

۲) دوسری شخصیت جو اس معاملے میں ملوث ہو سکتی ہے۔ وہی اس کی ذمے دار تھی، وہ سر شاہ نواز ہیں۔

وہ ممدوٹ کے نواب ہیں، پنجاب لیگ کے صدر ہیں، آل انڈیا مسلم کے ورکنگ کمیٹی کے رکن ہیں۔ اس کی کونسل کے ممبر ہیں۔ اس کے اجلاس لاہور کے صدر استقبالیہ ہوئے، میزبان صدر مسلم لیگ تھے۔ باؤنڈری کمیشن میں وہ مسلم لیگ کے مؤکل تھے، میمورنڈم انھیں نے پیش کیا تھا۔ مطالبات انھیں کی جانب سے تھے چودھری ظفر اللہ خان مقدمے کے وکیل اور مطالبات کو دلایل سے منوانے والے، جسٹس محمد منیر اور جسٹس دین محمد نگراں تھے، لیکن نواب صاحب کے میمورنڈم نے وکیل اور ممبران کے کام کو بہت آسان کر دیا تھا۔

غور فرمائیے کہ جو کچھ ان کی ۱۹۴۱ء کی تجویز میں تھا اسی کو میمورنڈم کے مطالبات میں مرتب کر دیا گیا تھا تو ان کے سوا عدالت میں اور کون اس کی وضاحت کر سکتا تھا؟ اوپر کی سطور میں ان کے جو مناصب گنائے گئے ہیں ان کی خصوصیات و کمالات کا دایرہ ان سے کہیں زیادہ تھا۔

صدر آل انڈیا مسلم لیگ کو ان پر سب سے زیادہ اعتماد تھا۔ وہ مسٹر جناح کے سب سے بڑے مزاج شناس تھے۔ انھیں جناح صاحب کے مزاج اور فکر و خیال میں اس درجے رسوخ حاصل ہو گیا تھا کہ وہ ان سے بات کہہ بھی سکتے تھے اور منوا بھی سکتے تھے۔ وہ جناح صاحب کی فکر رائے اور فیصلے کو پر اثر انداز ہوتے تھے۔ اس کا سب سے بڑا ثبوت مسلم لیگ کا میمورنڈم ہے۔ جو انھوں نے پوری راز داری کے ساتھ مرتب کیا، جناح صاحب سے مشورہ و منظوری کے مراحل طے ہوئے اور باؤنڈری کمیشن کے سامنے پیش کر کے اسے منوا بھی لیا ہو وہ جسٹس صاحبان حیران زدہ رہ گئے۔ جسٹس دین محمد نے بڑی مستعدی دکھائی۔ جناح

صاحب سے بد دیانتی کی شکایت بھی کی لیکن کچھ حاصل نہ ہوا، اور جناح صاحب کے بیان نے ہر نکتہ چین کو ملت کی فکر کی زحمت اٹھانے سے آزاد کر دیا تھا۔

جناح صاحب کا ایک معذرتی بیان:

۲۴/ اگست ۱۹۴۷ء کے اخبارات نے ریڈ کلف ایوارڈ کے فیصلے پر قاید اعظم محمد علی جناح کا حسب ذیل بیان شایع کیا:

"ہندستان تقسیم ہو چکا ہے۔ اسے تقسیم ہونا ہی تھا۔ یہ تقسیم آخری اور نا قابل تنسیخ ہے۔ ہمیں اس کا شدید احساس ہے۔ اس عظیم آزاد خود مختار اسلامی مملکت کے قیام میں بڑی بے انصافیاں کی گئی ہیں۔ جتنا زیادہ سے زیادہ وہ ہمیں مجبور کر سکتے تھے، کیا گیا ہے! اور آخری ضرب جو انھوں نے لگائی، وہ باؤنڈری کمیشن کا ایوارڈ ہے۔ یہ ایوارڈ غیر منصفانہ، نا قابل فہم اور گمراہ کن ہے۔ یہ ایوارڈ غلط غیر منصفانہ اور گمراہ کن سہی مبنی پر انصاف ہونے کے بجائے مبنی پر سیاست ہی سہی، لیکن ہم اس پر عمل پیرا ہونے پر اتفاق کر چکے ہیں اور اب ہم اس کے پابند ہیں۔ ایک باعزت باغیرت قوم کی حیثیت سے ہمیں اس کی پابندی کرنی چاہیے۔

یہ ہماری بد قسمتی ہی سہی اس ایک اور ضرب کاری کو ہمیں جرأت، استقلال اور ہمت کے ساتھ برداشت کر لینا چاہیے۔"(۱)

پنجاب کی غلط تقسیم اور اس میں مسلم لیگ کے صدر مسٹر محمد علی جناح اور باؤنڈری کمیشن میں لیگ کے مؤکل اور مستغیث نواب سر شاہنواز آف ممدوٹ خاص طور پر نیز لیگ کے دیگر رہنما، اصحاب صحایف و اہل قلم کی تنقید و تبصرے کا ہمیشہ نشانہ بنے ہیں۔ اس موقع پر تنقید کی آواز اتنی بلند اور تبصرے کی زبان اتنی تلخ تھی کہ جناح صاحب کو معذرت کا ایک انداز اختیار کرنا پڑا۔ حال آں کہ معذرت خواہانہ انداز بیان کا یہ بالکل صحیح موقع نہ تھا۔

۱۶/ اگست کو فریقین کو ایوارڈ کی حوالگی کے بعد بیان کی زبان، طرز بیان اور شکوہ و شکایت کا جس مسرت اور شکر گذاری کے ساتھ اظہار ہونا چاہیے تھا، وہ نہیں ہوا اس موقع پر

---

(۱) کاروان احرار: ج ۸، ص ۴۲۹

لیاقت علی خان کے بیان کا تو سراغ نہیں ملا۔ لیگ کے کسی اور رہنما کا بھی کمیشن کے فیصلے پر اس کی محنت کے اعتراف کے ساتھ شکریے اور مسرت کے اظہار میں کوئی بیان نظر سے نہیں گزرا۔ اس کی ایک وجہ یہی ہوسکتی ہے کہ بیان بعض شکایات کے اظہار کے بغیر مکمل نہ ہوسکتا تھا اور وہ ایسا کر کے مخالفین کو طعن کا موقع نہ دینا چاہتے تھے۔

باؤنڈری کمیشن کی عدالت میں تقسیم کے مسایل زیر بحث آنے کا وقت آیا تھا تو چوں کہ انبالہ ڈویژن اس سے پہلے فریقین کے اتفاق سے پنجاب کے حدود سے خارج کر دیا گیا تھا اور گورداس پور ضلع کی تحصیل پٹھان کوٹ کے دعوے سے میمورنڈم کے پیش کنندہ پہلے ہی دستبردار ہو گئے تھے۔ اور فریق ثانی نے قبول کرلیا تھا۔ تصفیہ متحدہ قرار پایا اور اسے زیر بحث لانے کی ضرورت ہی نہیں سمجھی گئی۔ میمورنڈم کی متعلقہ دفعات پڑھ کر سنا دی گئیں۔ یہ معاملہ انبالہ ڈویژن اور پٹھان کوٹ کی تحصیل تک محدود نہ تھا۔

خواجہ عبدالرحیم کے زندہ افکار:

اب اس قصے کو مولانا غلام رسول مہر کے خواجہ عبدالرحیم بیرسٹر ایٹ لا کے انٹرویو سے ایک اقتباس پر ختم کرتا ہوں۔ خواجہ صاحب کے زندہ افکار اور مہر صاحب کی زندہ تحریر و حسن و اسلوب تحریر سے قارئین کرام لطف اندوز ہوں یا کسی دیوار سے اپنا سر پھوڑ دیں۔ ریڈکلف کے فیصلے اور اس ضمن میں تمام کارروائی پر برصغیر کے معروف صحافی و محقق مولانا غلام رسول مہر مدیر روزنامہ انقلاب-لاہور، حسب ذیل انداز میں تبصرہ کرتے ہیں:

"خواجہ عبدالرحیم بیرسٹر بار ایٹ لا دلی شکریے کے مستحق ہیں کہ انھوں نے تقسیم ملک کے ایک نہایت اہم معاملے پر روشنی ڈالی ہے، یعنی یہ کہ اس میں پنجاب اور بنگال - دونوں صوبوں کے مسلمانوں سے صریح بے انصافی کے متعلق ایک اقتباس پیش کر دینے پر اکتفا کیا۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ تقسیم میں مرشد آباد، مالدہ، مندیا، دیناج پور اور جیسور کے خاصے بڑے خطے مغربی بنگال کو دے گئے۔ حال آں کہ ان میں مسلمانوں کی اکثریت تھی۔ البتہ پنجاب کے متعلق بڑی تفصیل سے بحث فرمائی، لیکن اصل حقایق کے اعتبار سے کوئی بھی چیز نئی

نہیں۔

یہ حقیقت ۱۹۴۷ء کے ہر شخص پر آشکار ہے کہ پنجاب کی سات تحصیلوں اور ایک ریاست کو "پاکستانی پنجاب" سے الگ کر کے "ہندستانی پنجاب" کو دے دیا گیا۔ حال آں کہ وہ "پاکستانی پنجاب" سے الحاق کی دونوں شرطیں پوری کرتی تھیں جو حد بندی کمیشن کے لیے تجویز ہوئی تھیں۔ یعنی ان تحصیلوں اور ریاست میں مسلمانوں کی اکثریت بھی تھی اور وہ پاکستانی پنجاب سے ملتی بھی تھیں۔ اس بے انصافی کے باعث لاکھوں مسلمان مصیبتوں کے آتش زار میں گر گئے۔ تحصیلیں یہ تھیں:

۱۔ فیروز پور، ۲۔ زیرہ ضلع فیروز پور، ۳۔ نکودر، ۴۔ جالندھر ضلع جالندھر، ۵۔ اجنالہ ضلع امرتسر، ۶۔ بٹالہ، ۷۔ گورداس ضلع گورداس پور، ۸۔ ریاست کپورتھلہ، جو جالندھر سے اس طرح ملی ہوئی تھی گویا تحصیل جالندھر ہی کا ایک حصہ تھی۔

ان تمام خطوں میں مسلمانوں کو واضح اکثریت حاصل تھی اور ان میں سے کوئی بھی علاقہ "پاکستانی پنجاب" سے الگ نہ تھا بلکہ ہر علاقہ زنجیر کی کڑیوں کی طرح ایک دوسرے سے ملا جلا تھا۔ یہ حقیقت آج بھی غیر منقسم پنجاب کا کوئی واضح نقشہ سامنے رکھ لینے سے واضح ہو سکتی ہے اور ان آٹھوں خطوں میں مسلمانوں کی اکثریت کے متعلق اطمینان کرنا چاہیں تو ۱۹۴۱ء کی مردم شماری کی روداد یں دیکھ لیں! اس مردم شماری کی بنا پر ۱۹۴۷ء کی تقسیم عمل میں آئی ہے۔"

اس انٹرویو اور اس پر تبصرے کے بعد مولانا مہر مرحوم نے مسلم لیگ کے رہنماؤں سے نو سوالاتِ لاجواب فرمائے ہیں۔ صفحات کی تنگ دامانی کی مجبوری سے یہاں انھیں نقل نہیں کیا جا رہا ہے۔ جو قارئین کرام ان کا مطالعہ کرنا چاہیں اور تاریخ کے حقائق سے اپنے ذوق مطالعہ کی تسکین چاہیں وہ اولاً ہفت روزہ لیل و نہار۔ کراچی اشاعت ۲۴ تا ۳۰ راگست ۱۹۷۰ء کا مطالعہ فرمائیں اور اگر یہ دستیاب نہ ہو تو جانباز مرزا کی تالیف کاروان احرار، جلد ۸، صفحہ ۵۲-۴۴۸ سے اپنی تشنگی مطالعہ کی آگ کو ٹھنڈا کریں۔

ایک اور انکشاف:

تقسیم ضلع گورداس پور کے متعلق دو ہفتہ قبل مال آفیسر فتح سنگھ نے اپنے پٹواری دولت رام کو اطلاع دے دی تھی کہ تین تحصیلیں ضلع گورداس پور سے الگ کر دی گئی ہیں۔ کیوں کہ مرزائیوں نے جن کی تعداد قادیان میں چودہ ہزار ہے۔ انھوں نے اپنے آپ کو مسلمانوں سے علاحدگی کا مطالبہ کیا ہے۔(۱)

مسلم لیگ نے اپنے میمورنڈم میں پٹھان کوٹ تحصیل کو کیوں بھارت کے حوالے کیا؟ جب کہ کشمیر جانے کے لیے صرف یہی ایک راستہ تھا۔

نواب سر شاہ نواز پیشتر سے اپنی ایک تجویز کے ذریعے پاکستانی پنجاب سے انبالہ ڈویژن الگ کرنے کا خود مطالبہ کر چکے ہیں۔

ان شواہد کی موجودگی میں مسٹر ریڈکلف نے ۱۷/اگست ۱۹۴۷ء کو تقسیم پاکستان اور بنگال کا فیصلہ سنایا۔ لیکن اس کا اعلان ۱۹/اگست کے اخبارات میں شایع ہوا۔

دہلی۔ ۱۹/اگست: باؤنڈری کمیشن کی رپورٹ شایع ہوگئی ہے۔ اس کے ایوارڈ کی رو سے پنجاب کے مغربی یعنی پاکستانی علاقے میں ملتان اور راول پنڈی کے تمام ڈویژن شامل رہیں گے اور لاہور ڈویژن کے اضلاع گوجراں والا، شیخوپورہ اور سیال کوٹ شامل ہوں گے۔ مشرقی پنجاب میں جالندھر اور انبالہ ڈویژن پورے کے پورے شامل ہوں گے اور لاہور ڈویژن کا ضلع امرت سر شامل ہوگا۔ لاہور ڈویژن کے ضلع گورداس پور کو دو نئے صوبوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ گورداس پور کے ضلع میں شکر گڑھ تحصیل جو دریائے راوی کے مغرب کی طرف واقع ہے، مغربی پنجاب کا حصہ ہوگی۔ جب کہ پٹھان کوٹ، گورداس پور اور بٹالہ تحصیلیں جو دریائے راوی کے مشرق کی طرف ہیں، مشرقی پنجاب کا حصہ ہوں گی۔ ضلع لاہور کی تحصیل چونیاں اور تحصیل ساری، دونوں مغربی پنجاب میں شامل ہیں۔ قصور تحصیل دونوں نئے صوبوں میں تقسیم ہوگئی ہے۔ اور حد فاصل اُس گاؤں سے ہے جہاں بالائی باڑی دوآب نہر تحصیل میں ملی ہے اور یہ لائن کھیم کرن ریلوے اسٹیشن تک گئی ہے اور

---

(۱) روزنامہ ویر بھارت لاہور

یہاں سے یہ حد دریائے ستلج کے کنارے موضع مستیکے تک گئی ہے۔

''مؤلف کاروان احرار نے بنگال کی تقسیم کا حال بھی تفصیل سے بیان کیا ہے کہ لیکن اس تفصیل میں اس بات کا پتا نہیں چلتا کہ کیا صحیح ہے اور کیا غلط؟ اور بنگلا دیش کے قیام کے بعد اس خطے کے حالات سے ہماری دل چسپی بھی پہلے جیسی نہیں رہی۔ اس لیے اس تفصیل کو یہاں حذف کر دیا گیا ہے۔ جو حضرات اس بات کے تفصیلی مطالعے کے شائق یا ضرورت مند ہوں انھیں کاروانِ احرار کی جلد ہشتم سے رجوع کرنا چاہیے۔''

(ا۔س۔ش)

ریڈکلف ایوارڈ:

۱۶/اگست ۱۹۴۷ء: ڈسپیچ باکس سے کاغذات نکالنے کا وقت آ گیا تھا۔ دونوں مٹیلا لفافے ماؤنٹ بیٹن کے ہاتھ میں تھے۔ ہر لفافے میں برصغیر کے نئے نقشوں کا ایک ایک سیٹ تھا۔ اس کے ساتھ تقریباً دس ٹائپ شدہ صفحات پر مشتمل ایک مسودہ تھا۔ یہ انگلستان کی طرف سے ہندستان کو دی جانے والی آخری دستاویز تھی۔

ماؤنٹ بیٹن نے نہرو اور پاکستان کے وزیر اعظم لیاقت علی خان دونوں کو ایک ایک لفافہ دیتے ہوئے کہا کہ آپ دونوں الگ الگ کمروں میں بیٹھ کر ان نقشوں کا مطالعہ کیجیے اور تقریباً دو گھنٹے بعد مشترکہ جلسے کے لیے واپس آ جائیے۔

دونوں لیڈر جب واپس آئے تو ان کے چہرے پر غصے اور بے زاری کے آثار تھے۔ یہ حال دیکھ کر ماؤنٹ بیٹن کو یقین ہو گیا کہ سر ریڈکلف نے اپنا تکلیف دہ کام مکمل غیر جانب داری کے ساتھ انجام دیا ہے۔ اسی لیے دونوں لیڈر یک ساں برہم ہیں۔

بٹوارے کی لکیر کھینچتے وقت مسٹر ریڈکلف کو جن باتوں کو ذہن میں رکھنے کی ہدایت کی گئی تھی، ان سب باتوں کا اس نے بڑی ایمان داری سے لحاظ رکھا تھا۔ اِکے دُکے جھگڑوں کو چھوڑ کر اس نے سب سے زیادہ اہمیت اس بات کو دی تھی کہ آبادی کی اکثریت کا مذہب کیا ہے؟

چناں چہ بنگال اور پنجاب کے بٹوارے کی جو لکیر اس نے کھینچی وہ تقریباً ویسی ہی تھی

جیسی متوقع تھی۔ تکنیکی لحاظ سے صحیح لیکن عملی نقطۂ نظر سے تباہ کن!...

جیسا کہ شروع سے ظاہر تھا کہ بٹوارے کی لکیر نے سکھوں کو سب سے زیادہ متاثر کیا۔

جہاں جہاں ریڈکلف نے کسی وجہ سے آبادی کی اکثریت کے مذہب کا لحاظ نہیں رکھا تھا، وہاں بٹوارے کی لکیر نے جھگڑے کھڑے کیے۔ پنجاب کے شمال میں ایک چھوٹا سا گاؤں ہے، گورداس پور۔ وہاں ریڈکلف نے راوی ندی کی حد کو بٹوارے کی سرحد مانا، جس کی وجہ سے گورداس پور اور اس سے ملحق کئی مسلمانوں کے گاؤں ہندستان میں آگئے۔ اگر ایسا نہ کیا جاتا تو پاکستان کا ایک چھوٹا سا حصہ خنجر کی شکل میں ہندستان کے اندر آجاتا، یہ بات ریڈکلف نے مناسب نہیں سمجھی۔

لیکن ریڈکلف کا یہ وہ فیصلہ تھا جس کے لیے پاکستان کے لاکھوں لوگوں نے ریڈکلف کو کبھی معاف نہیں کیا۔ اگر ریڈکلف نے گورداس پور پاکستان کو دے دیا ہوتا تو جناح کو ایک چھوٹا سا گندا شہر ہی نہ مل جاتا بلکہ اس کے ساتھ ہی وہ سوغات مل جاتی جسے جنت نظیر کہا جاتا ہے۔ گورداس پور ہندستان کو ملا۔ اگر وہ نہ ملتا تو کشمیر سے آمد و رفت کا کوئی راستہ ہندستان کے پاس نہ ہوتا۔ ایسی صورت میں کشمیر کے ہندو راجہ ہری سنگھ کے پاس پاکستان سے انضمام کے علاوہ کوئی چارہ نہ ہوتا۔ ریڈکلف کے دل میں جانب داری یا شرارت کا جذبہ نہ ہوتے ہوئے بھی اس نے بٹوارے کی لکیر جس طرح کھینچی اس کی وجہ سے کشمیر کی کنجی گورداس پور ہندستان کے ہاتھ میں آگئی۔ اس بنیاد پر کشمیر پر دعویٰ جتانے کی خواہش ہندستان کے دل میں جاگ سکتی تھی۔

ریڈکلف زبردست حفاظتی انتظامات کے ساتھ انگلستان واپس جارہا تھا۔ اس کے ساتھ کام کرنے والے آئی سی ایس افسروں نے اس کی آخری خدمت یہ کی کہ ریڈکلف کے ہوائی جہاز کی مکمل تلاشی لی گئی تاکہ یہ اطمینان ہو جائے کہ اس میں کوئی بم تو نہیں چھپا ہے۔

ریڈکلف کو بہ خوبی یہ معلوم تھا کہ اس نے جو سرحدیں قایم کی ہیں ان کی وجہ سے مصیبتیں آئیں گی اور خون خرابے کی نوبت آئے گی۔ وہ بے حد اداس تھا۔ لیکن وہ اپنے آپ کو الزام نہیں دے سکتا تھا۔ بٹوارے کی لکیر جہاں سے بھی گزرتی انجام وہی ہونا تھا۔

ریڈکلف کے تقرر کے وقت نہرو اور جناح دونوں نے یقین دلایا تھا کہ اس کے فیصلے نہ صرف وہ آخری مانیں گے بلکہ اسے بہ خوبی عملی جامہ پہنانے کی کوشش کریں گے۔ لیکن فیصلہ ہو جانے کے بعد اس کے جو حصے ان لیڈروں کو پسند نہیں آئے انھوں نے کڑی نکتہ چینی شروع کردی۔

لندن لوٹ کر ریڈکلف نے وکالت شروع کردی، لیکن بہ طور احتجاج اس نے دو ہزار پاؤنڈ کی وہ رقم قبول کرنے سے انکار کردیا جو سرحدیں قایم کرنے کے لیے اس کا محنتانہ مقرر ہوا تھا۔

ریڈکلف نے جو سرحدیں قایم کی تھیں، وہ شایع ہو چکی تھیں اور اس کے ساتھ ہی انسانی تاریخ کی سب سے بڑی ہجرت کا سلسلہ بھی شروع ہوگیا، بے سہارا لوگوں کی ٹولیاں پگڈنڈیوں سے، نہروں کے کنارے، کھیتوں کی منڈیروں سے، سڑکوں اور ریلوے لائنوں سے چل پڑیں۔

جن مسلمانوں نے پاکستان کے قیام پر خوشی کے مارے آسمان سر پر اٹھالیا تھا انھیں معلوم ہوا کہ ان کے گاؤں ہندستان میں رہ گئے ہیں۔ جن سکھوں نے ہندستان کی آزادی کا جشن منایا تھا، انھیں اچانک یہ پتا چلا کہ جن کھیتوں کو وہ پیڑھیوں سے جوتتے چلے آئے ہیں، وہ اب پاکستان کا حصہ بن چکے ہیں اور اب انھیں جلد از جلد اپنا گھر بار چھوڑ کر ہندستان جانا ہے۔ کیوں کہ پاکستان میں اب ان کے لیے خطرہ تھا۔

بٹوارے کی حدیں قایم کرنے کی عجلت کے بارے میں ریڈکلف نے جن خطرات کی طرف اشارہ کیا تھا، ان کا بھیانک روپ سامنے آرہا تھا۔ کئی نہریں ایسی تھیں کہ جو ایک ملک سے نکلتی تھیں، لیکن ان کی دیکھ بھال کا دفتر دوسرے ملک میں تھا۔ کئی مقامات ایسے تھے جہاں بٹوارے کی لکیر گاؤں کے بیچ سے ہو کر گزرتی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ گاؤں کی کچھ جھونپڑیاں ایک ملک میں رہ گئیں اور کچھ دوسرے ملک میں چلی گئیں۔ ایک دو بار ایسا بھی ہوا کہ بٹوارے کی لکیر نے کسی مکان کو بیچ سے کاٹ دیا، صدر دروازہ ایک ملک میں اور پچھواڑا دوسرے ملک میں۔ پنجاب کے سارے جیل خانے پاکستان میں آگئے اور وہاں کا

واحد پاگل خانہ بھی۔

پاگل خانے میں جو ہندو اور سکھ مریض تھے انھوں نے اپنے ڈاکٹروں سے گڑگڑا کر کہا کہ ہمیں ہندستان روانہ کر دیجیے۔ ورنہ مسلمان کسی وقت بھی ہمیں قتل کرنے کے لیے آسکتے ہیں۔

ان ڈاکٹروں نے جو ان کی حفاظت کے ذمے دار تھے یہ جواب دیا:

"کیا دیوانوں کی سی بات کرتے ہو، کیا پاگلوں کو قتل کرنے کے لیے بھی کوئی آسکتا ہے، آپ لوگ بلاوجہ خطرے کا تصور کر رہے ہیں۔"

بعد کے واقعات سے یہ ثابت ہوا کہ ہوش مند ڈاکٹروں کی بہ نسبت پاگل مریض کے پاس کہیں زیادہ دوراندیشی تھی۔ (۱)

(۱) آدھی رات کی آزادی: ص ۸۸۔۱۸۵

باب: ۴

تقسیم پنجاب سے مسٹر جناح کی رضامندی

۲۲ رمئی ۱۹۴۷ء جیسے کہ لندن روانگی سے پیشتر وایسرائے لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے لیاقت علی خان سے کہا تھا کہ لیگ پنجاب اور بنگال کی تقسیم کے بارے میں اپنی رائے سے میرے سیکریٹری کو مطلع کر دے، وہ مجھے لندن بھیج دے گا۔ ۲۲ رمئی کو قایداعظم نئی دہلی میں وایسرائے کے سیکریٹری سے ملے۔ دونوں کے درمیان ملاقات پر کیا طے ہوا؟ وایسرائے کے سیکریٹری نے جواب میں کیا کہا؟ یہ سب صیغۂ راز میں رہا، لیکن سول اینڈ ملٹری گزٹ لاہور نے دوسرے روز انکشاف کیا کہ وایسرائے کے سیکریٹری سر ایرک میویل نے سول اینڈ ملٹری گزٹ کے نمایندے کو بتایا کہ مسٹر جناح سے ملاقات کا مقصد ماؤنٹ بیٹن کے دستوری پلان پر مسٹر جناح کے دستخط حاصل کرنا تھا۔ اس گفتگو کے دوران وایسرائے کے سیکریٹری نے کہا کہ مسٹر جناح نے بنگال اور پنجاب کی تقسیم سے اتفاق کر لیا ہے۔(۱)

جناح صاحب کی تقسیم رضامندی سے سر یامین کا اختلاف:

مسلم لیگ ورکنگ کمیٹی کے ممبر سر محمد یامین خاں اپنی کتاب "نامۂ اعمال" حصۂ دوم کے صفحہ ۱۲۹۱ پر لکھتے ہیں:

"شملہ میں ایک اخباری نامہ نگار (مسٹر شرما) نے مجھے یہ خبر سنائی کہ پنجاب کی تقسیم کا معاملہ انگریز گورنر سر ایون جینکس کی اسکیم کے مطابق طے پا چکا ہے۔ یعنی پانچ ضلع پاکستان کو اور بارہ ضلع ہندستان کو ملیں گے۔

یہ سن کر مجھے حیرت ہوئی کہ قایداعظم اس پر کیوں کر رضامند ہو سکتے ہیں، یہ تو اقتصادی نقطۂ نظر سے بالکل غلط ہے اور کمشنری جالندھر کو کیسے چھوڑ سکتے ہیں؟ یہاں کے مسلمان لاہور کے علاوہ بہت زیادہ تعلیم یافتہ ہیں اور اس سے ملحق کپور

---

(۱) روزنامہ آزاد: لاہور، ۲۳ رمئی ۱۹۴۷ء

تھلہ ریاست میں پچھتر فیصد مسلمان ہیں اور مالیر کوٹلہ ریاست مسلمانوں کی ہے اور وہاں کی آبادی سب مسلمان ہے۔ قایداعظم نواب ممدوٹ سے مشورہ کیے بغیر ایسی تقسیم کو کیسے منظور کریں گے؟''

لیکن بعد میں نامہ نگار کی اطلاع درست نکلی۔

باب: ۵

جناح صاحب کے دو مطالبے...

صرف ایک قابلِ غور ٹھہرا!

مسٹر جناح کا مطالبۂ راہ داری:

۲۲؍مئی ۱۹۴۷ء رائٹر کے حوالے سے قایداعظم محمد علی جناح کا ایک بیان شایع ہوا، جس میں مطالبہ کیا گیا کہ مشرقی ومغربی پاکستان کو ملانے کے لیے آٹھ سو میل کا راستہ ملنا چاہیے۔(۱)

مسٹر محمد علی جناح کے اس بیان پر مسلم لیگ ورکنگ کمیٹی اور لیگ کونسل کے رکن چودھری خلیق الزماں نے ان الفاظ میں تبصرہ کیا:

''ماؤنٹ بیٹن کی عدم موجودگی میں مسٹر جناح کا ایک بیان اخبارات میں شایع ہوا کہ وہ پاکستان کے دونوں حصوں کے لیے ایک گزرگاہ چاہتے ہیں۔ برٹش گورنمنٹ تو اس پر کیا توجہ دیتی خود مسلم لیگ والوں نے اس کو ایک سیاسی شوشہ سمجھ کر کوئی اہمیت نہ دی۔ جب ہم پنجاب کا بٹوارا منظور کر چکے تھے۔ تو گزرگاہ کون دیتا؟''(۲)

عہدِ لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے مؤلف کیمبل جانسن نے اس بیان پر یہ تبصرہ کیا ہے:

''جناح نے سیاست کی فضا میں زبردست بم پھینکا جو موقع محل کے لحاظ سے موزوں اور مناسب ثابت ہوا۔ انھوں نے مطالبہ پیش کیا کہ مغربی اور مشرقی پاکستان کو ملانے کے لیے آٹھ سو میل طویل قطعۂ زمین دیا جائے۔ اس نوعیت

(۱) روزنامہ زمیندار لاہور: ۲۳؍مئی ۱۹۴۷ء

(۲) شاہ راہِ پاکستان: ص ۱۰۴۹

کے مطالبے کو پیش کرنے کا فن غالباً انھوں نے اسٹالن سے سیکھا ہے۔''(۱)

یہی مؤلف اس بیان پر ہندستان ٹائمز کے اداریے کا ایک جملہ نقل کرتا ہے جو بہت تیکھا ہے، حقیقت پر مبنی ہے، لیکن اشتعال انگیز بھی نہیں۔ اخبار لکھتا ہے:

''پاکستان کے وجود کا انحصار اگر اس قطعۂ زمین پر ہے تو پاکستان ہرگز وجود میں نہیں آسکتا۔''(۲)

پنڈت نہرو نے زور دے کر کہا: کانگریس اس کی خواہش مند ہے کہ ہندستان میں قیام امن کی خاطر کوئی سمجھوتا ہو جائے۔ خواہ وہ ان معاملات کو ناپسند ہی کیوں نہ کرتی ہو! ان کی یہ بھی رائے ہے کہ لاقانونیت ختم کرنے کی غرض سے کوئی نہ کوئی سمجھوتا ہونا چاہیے۔ خواہ یہ تقسیم ملک کی صورت ہی میں ہو! انھوں نے مسٹر جناح کا پاکستان کے دونوں حصوں کے درمیان راستے کا مطالبہ مسترد کر دیا۔ کیوں کہ یہ بے معنی تخیل ہے۔(۳)

گورنر جنرل میں بنوں گا!

''جناح صاحب نے ماؤنٹ بیٹن کو بتایا کہ پاکستان کے پہلے گورنر جنرل وہ خود بننا چاہتے ہیں! لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے کہا، لیکن یہ آپ کی بھول ہے! ہندستان اور پاکستان دونوں نے انگلستان کے نمونے کا جو جمہوری نظام اختیار کیا ہے، اس میں حکومت کے سارے اختیارات وزیر اعظم کے ہاتھ میں ہوتے ہیں۔ گورنر جنرل تو برائے نام اختیارات کا مالک ہوتا ہے۔ اس دلیل کا جناح صاحب پر کوئی اثر نہ ہوا انھوں نے سرد مہری کے ساتھ جواب دیا: پاکستان کا گورنر جنرل میں بنوں گا اور وزیر اعظم کو وہی کچھ کرنا ہوگا جو میں کہوں گا!''(۴)

بلاشبہ ایسا ہی ہوا، لیکن بہت تھوڑا عرصہ! جب تک وہ اٹھنے بیٹھنے، کچھ چلنے پھرنے

(۱) عہدِ لارڈ ماؤنٹ بیٹن: ص ۱۲۵

(۲) عہدِ لارڈ ماؤنٹ بیٹن: ص ۱۳۶

(۳) تحریکِ پاکستان اور انتقال اقتدار: محمد فاروق قریشی، لاہور، ۱۹۹۷ء ص ۶۵۲

(۴) آدھی رات کی آزادی: ص ۱۴۲

اور لوگوں سے ملنے جلنے کے قابل رہے اور کراچی میں تھے۔ حکومت میں وہی ہوتا تھا، جو وہ چاہتے تھے۔ لیکن جب وہ زیارت چلے گئے جس کے بعد ان کی میت ہی کراچی آئی۔ سب کی نظریں ان کی طرف سے پھر گئیں اور سب کا کعبۂ مقصود لیاقت علی خان بن گئے۔ لیاقت علی خان ایک بار ان کی عیادت کے لیے زیارت تشریف لے گئے تھے، لیکن بہ قولے جناح صاحب نے اپنی سوگوار بہن سے فرمایا تھا کہ یہ دیکھنے آئے تھے کہ کتنے دنوں کی زندگانی اور ہے۔ ان کی حالت پر آنسو بہانے والی بہن اور ان کی صحت کی پروا کرنے والے معالج کے سوا کوئی نہ تھا۔ لیکن دوائیں جو نسخوں میں لکھی جاتی تھیں، وہ کراچی اور لاہور کے بازاروں میں دستیاب نہ تھیں۔ معالج نے جناح صاحب کے آخری ایام کے شب و روز پر جو کتاب لکھی تھی، شاید اس میں کسی ناقدری کا ذکر بھی تھا۔ کتاب بازار سے اٹھالی گئی۔ ایک عرصے کے بعد جب غم و اندوہ کے آنسو بہ دمِ سرد ہو گئے تو بعض ضروری تبدیلیوں کے بعد کتاب بازار میں آگئی تھی۔ اب وہ بھی نایاب ہے۔

باب: ۶

ہندستانی مسلمان اور مسٹر جناح!

جناح صاحب اور ہندستانی مسلمانوں کی رہنمائی:

۱۳/ جولائی ۱۹۴۷ء: لیگی رہنماؤں نے ایک ایک کر کے فیصلہ کرلیا کہ وہ نئے قایم ہونے والے ملک پاکستان جائیں گے۔ سوال یہ تھا کہ پھر ہندستانی مسلمانوں کی رہنمائی کون کرے گا۔ مسٹر جناح نے چودھری خلیق الزماں سے کہا کہ وہ ہندستان میں رہ کر مسلمانوں کی رہنمائی کریں گے، لیکن یہی بات انھوں نے مسٹر آئی آئی چندری گر سے بھی کہی۔ چودھری صاحب چوں کہ خود پاکستان فرار ہو جانے کا فیصلہ کر چکے تھے اس لیے چاہتے تھے کہ ان کے بجائے کوئی اور اس ذمے داری کا بوجھ اٹھائے! ان کی خواہش تھی کہ نواب محمد اسماعیل خان کو یہ ذمے داری سونپی جائے۔ پھر چودھری صاحب مسٹر چندری گر کے حق میں دست بردار بھی ہوگئے۔ لیکن ۱۳/ جولائی کو کانسٹی ٹیونٹ لیگی ارکان کا جو جلسہ ہوا اس میں منتخب چودھری صاحب ہوگئے۔ جوڑ توڑ اور رازداروں سے پردے کی کہانی تو معلوم نہیں ہوسکی۔ چودھری صاحب کے قلم سے دوسری تفصیلات یہ ہیں:

''صوبہ یوپی سے کانسٹی ٹیونٹ اسمبلی کی آٹھ نشستوں میں سے ۷ مسلم لیگ کو ملیں گی۔ ایک رفیع احمد قدوائی کو۔

(۱) نواب اسماعیل خان (۲) مولانا حسرت موہانی (۳) مسٹر عزیز احمد خان (۴) نواب قزلباش (۵) مسٹر رضوان اللہ (۶) بیگم اعجاز رسول (۷) خلیق الزماں۔

دوسرے صوبوں کے مسلم اقلیتی نمایندوں کی تعداد حسب ذیل تھی۔ مدراس ۴، بمبئی ۲، بہار ۵، مشرقی پنجاب ۴، مغربی بنگال ۴۔

۱۱/ جون ۱۹۴۷ء کو ہم نے کانسٹی ٹیونٹ اسمبلی میں لیڈر کے انتخاب کے لیے نواب اسماعیل خان کی صدارت میں جلسہ کیا، مگر چوں کہ اس میں بہت سے ممبران شریک نہیں ہوئے تھے۔ لہٰذا ۱۲/ جولائی کے لیے جلسہ ملتوی کر دیا گیا۔ جب ۱۲/ جولائی کو جلسہ ہوا تو وہ

بھی بہ روایت ۱۳؍ جولائی کے لیے ملتوی ہو گیا۔

۱۲؍ جولائی کی شام کو میں چندری گر کے یہاں بیٹھا تھا کہ کچھ اور مسلم ممبران کانسٹی ٹیونٹ اسمبلی آ گئے اور تجمل حسین بہار کے ایک صاحب نے مجھ سے کہا کہ میں خود مسلم پارٹی کی لیڈری منظور کر لوں۔ میں نے انھیں جواب دیا کہ میں نواب اسماعیل خان کی تائید کرتا ہوں اور آپ بھی انھیں کی تائید کریں۔ جب صبح ۱۳؍ جولائی کو ویسٹرن کورٹ میں جلسہ ہوا تو مجھ سے کہا گیا کہ چندری گر صاحب بھی ایک امیدوار ہیں اور آپس میں مصالحت کی گفتگو ہے، لہٰذا جلسہ ۳ بجے شام کے لیے ملتوی کر دیا جائے۔ میں نے اس کو بہ خوشی منظور کر لیا۔ (یہ ملحوظ خاطر رہے کہ چندری گر صاحب کا اس وقت تک پاکستان منتقل ہونا طے نہیں ہوا تھا)۔ چندری گر صاحب نے مجھے بتایا کہ جناح صاحب نے ان سے کہا ہے کہ مسلم لیگ پارٹی کی قیادت قبول کر لوں جس سے ان کو بڑی خوشی ہوگی۔ میں نے کہا کہ میں خود نواب اسماعیل خان کی تائید کر رہا ہوں، اور اس آخر وقت میں ردوبدل کا نتیجہ کیا ہوگا کہ نواب صاحب سے میرے تعلقات خراب ہوں گے۔ انھوں نے کہا کہ جناح صاحب سے میں ٹیلی فون ملاؤں اور آپ خود ان سے بات چیت کر لیں۔ کچھ دیر سوچنے کے بعد میں نے ان سے کہا کہ آپ ٹیلی فون نہ ملائیں میں ان کو ناخوش نہ کروں گا، لنچ کے بعد دوبارہ جلسہ ہوا اور میں مسلم انڈیا کا لیڈر منتخب ہو گیا۔"(۱)

مسٹر جناح کی ہندستانی مسلمانوں کو نصیحت:

۱۱؍ اکتوبر ۱۹۴۷ء: ۱۱؍ اکتوبر کو پاکستانی فوج سے خطاب کرتے ہوئے پاکستان کے گورنر جنرل مسٹر محمد علی جناح نے ہندستانی مسلمانوں کو نصیحت کی:

> "ہندستان میں اپنے مسلمان بھائیوں کے لیے میری یہی نصیحت ہے کہ وہ جس ریاست میں ہوں اس کے ساتھ بغیر کسی جھجک اور تکلف کے اپنی وفاداری کا اظہار کریں۔"(۲)

---

(۱) شاہراہِ پاکستان: ص ۵۷-۱۰۵۶

(۲) ہندستان اپنے حصار میں: ایم جے اکبر۔ خدا بخش لائبریری۔ پٹنہ: ص ۱۲-۳۱۱

باب: ۷

پاکستان کا طرزِ حکومت

مسٹر جناح کی صفائی:

۱۳؍جولائی (۱۹۴۷ء) کی نئی دہلی میں پریس کانفرنس میں مسٹر جناح نے سوالات کے جواب دیتے ہوئے کہا:

"اقلیتیں خواہ کسی فرقے سے تعلق رکھیں، ان کے حقوق کی حفاظت کی جائے گی۔ان کا مذہب، ان کے عقیدے ہر طریقے سے محفوظ رہیں گے۔ان کی جان و مال کی حفاظت کی جائے گی۔ عبادت کی آزادی میں کسی قسم کی مداخلت نہ کی جائے گی۔ انھیں مذہب، عقیدہ، جان، مال اور تمدن کے سلسلے میں تحفظ حاصل ہوگا۔ وہ بلا امتیاز مذہب وملت اور نسل ورنگ ہر حیثیت سے پاکستان کے باشندے ہوں گے۔انھیں جس طرح حقوق ومراعات حاصل ہوں گی اسی طرح ایک شہری کی حیثیت سے ان کی ذمے داریاں بھی ہوں گی۔انھیں حکومت کے معاملات میں حصہ لینا ہوگا اور جس وقت تک اقلیتیں حکومت کی وفادار رہیں گی اور اس سے سچا تعلق رکھیں گی، انھیں اس وقت تک اور جب تک میرا اختیار باقی ہے کوئی اندیشہ نہ کرنا چاہیے۔"

ایک سوال کے جواب میں کہ پاکستان میں دینی حکومت ہوگی یا دنیاوی؟ مسٹر جناح نے فرمایا:

"آپ ایک مہمل سوال پوچھ رہے ہیں۔ میں نہیں جانتا کہ دینی حکومت سے آپ کا کیا مطلب ہے۔خدا کے لیے آپ لوگ اپنے دماغوں سے خرافات نکال دیجیے۔"(۱)

(۱) قومی آواز: ۱۵؍جولائی ۱۹۴۷ء، بہ حوالہ علماے حق اور ان کے مجاھدانہ کارنامے: ص ۳۵-۳۳۴

پاکستان کا مطلب کیا؟ نعرے سے جناح صاحب کی بریت!

۱۹۴۷ء میں ۱۵ دسمبر کو آل انڈیا مسلم لیگ کی کونسل کا آخری اجلاس خالق دینا ہال کراچی میں ہوا تھا۔ اس اجلاس کے حوالے سے ذوالفقار علی بھٹو دور کے پنجاب کے وزیر تعلیم ملک غلام نبی ایم اے نے جو خود بھی کونسل کے ممبر تھے، ایک مضمون روزنامہ نوائے وقت لاہور میں لکھا تھا۔ اس میں وہ لکھتے ہیں:

''پاکستان مسلم لیگ کونسل کی آخری میٹنگ خالق دینا ہال کراچی میں ہوئی تھی جس میں قاید اعظم بڑے ہی لاغر اور کم زور دکھائی دے رہے تھے۔ جب ایک بزرگ نے ان سے سوال کیا کہ

قاید اعظم! ہم قوم سے یہ کہتے آئے ہیں کہ پاکستان کا مطلب کیا؟ لا الہ الا اللہ! اس پر قاید اعظم نے فرمایا کہ

''یہ درست ہے کہ یہ نعرہ تمام مسلمانوں کی زبان پر ہے اور یہ ان کے دل کی آواز ہے۔ لیکن یہ نعرہ میں نے ایجاد نہیں کیا اور نہ ہی میری ورکنگ کمیٹی نے یا کونسل نے کوئی ایسا ریزولیشن پاس کیا۔'' (۱-۲)

حد بندی کمیشن کی کارگزاری:

۷/اگست ۱۹۴۷ء: مزید برآں باؤنڈری کمیشن جو اختلافی اور نزاعی حدود کے تصفیے کے لیے مقرر کیا گیا تھا، بدقسمتی سے وہ ایسے فیصلے کے تلاش کرنے میں کامیاب ہوا جو مخصوص طور پر مسلمانوں کے لیے اشتعال انگیز تھا۔

پنجاب خفیہ پولیس کے کمشنر ''مسٹر جین کنس Jenkins نے برطانوی خفیہ پولیس کے افسر اعلا کو ۷/اگست ۱۹۴۷ء کو پنجاب کلب لاہور سے ایک خفیہ خط لکھا تھا جو کسی صورت سے

---

(۱) کاروانِ احرار: جلد ۸، ص ۲۳

(۲) یہ بات مجھے پروفیسر جان عالم (استاذ شعبۂ اردو جناح کالج۔ کراچی) نے بتائی کہ یہ سوال کرنے والے مشہور لیگی رہنما منظر عالم صاحب ایڈوکیٹ مسلم لیگ کونسل کے رکن تھے جو پروفیسر موصوف کے بڑے بھائی تھے۔ (ا۔س۔ش)

لندن میں پکڑ لیا گیا اور اخبارات میں شایع کرا دیا گیا۔

مسٹر جین کنس اس خط میں تحریر فرماتے ہیں:

"اُمید یہی ہے کہ حد بندی کمیشن کے فیصلے سے مسلمانوں میں بے چینی بڑھ جائے گی۔ اگر ایسا ہوا تو میرے خیال میں مسلمان برطانوی حفاظت کے زمرے میں رہنا پسند کریں گے۔"

اس خط پر تبصرہ کرتے ہوئے پاکستان ٹائمز نے لکھا تھا، پنجاب کے سابق گورنر سر ایوان جین کنس کے رویے پر مزید روشنی ڈالنے کی ضرورت نہیں۔ اس خط سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ہماری بہت سی مشکلات کا سرچشمہ ہمارے یہ سابق حکمران ہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جب برطانوی حکام انتقال اختیارات کے سلسلے میں ہمارے لیڈروں سے بات چیت کر رہے تھے تو یہ برطانوی افسر ہمارے ملک میں خفیہ ایجنٹوں کا جال بچھا کر سازش کی تیاری کر رہے تھے۔

مسٹر جین کنس کو کس طرح معلوم ہوا کہ حد بندی کمیشن کا فیصلہ مسلمانوں کے لیے بے چینی کا موجب بنے گا؟ کیا ہم یہ سمجھیں کہ حد بندی کا فیصلہ پہلے ہی کیا جا چکا تھا۔ غیر منصفانہ فیصلے سے ہی پاکستان اور انڈیا کے درمیان ناخوش گوار تعلقات پیدا کیے جا سکتے تھے اور مسلمانوں کے ساتھ اس لیے ناانصافی کی گئی کہ وہ کم زور پارٹی تھے اور اشتعال کے نتیجے میں جب دوسری مصیبتوں سے پریشان ہوں تو لامحالہ انگریز کو یاد کریں اور ان کی مدد کے محتاج ہو کر شاطرانِ برطانیہ کے پھندے میں دوبارہ پھنس جائیں۔ (۱)

گورداس پور کی علاحدگی:

تقسیمِ ضلع گورداس پور کے متعلق دو ہفتہ قبل مال آفیسر فتح سنگھ نے اپنے پٹواری دولت رام کو اطلاع دے دی تھی کہ تین تحصیلیں گورداس پور سے الگ کر دی گئی ہیں۔ کیوں کہ مرزائیوں نے جن کی تعداد قادیان میں چودہ ہزار ہے، انھوں نے اپنے آپ کی مسلمانوں

(۱) نیا دور، انصاری وغیرہ وخطبہ صدارت جمعیت علمائے ہند، اجلاس ممبئی ۱۹۴۸ء، صفحہ ۱۲

سے علاحدگی کا مطالبہ کیا ہے۔ [(۱)]

مسلم لیگ نے اپنے میمورنڈم میں پٹھان کوٹ تحصیل کو کیوں بھارت کے حوالے کیا؟ جب کہ کشمیر جانے کے لیے صرف یہی ایک راستہ تھا۔

نواب سر شاہ نواز پیشتر سے اپنی ایک تجویز کے ذریعے پاکستانی پنجاب سے انبالہ ڈویژن الگ کرنے کا خود مطالبہ کر چکے ہیں۔ [(۲)]

---

(۱) روزنامہ ویر بھارت. لاہور

(۲) کاروانِ احرار: جلد ۸، ص ۴۱۲

حصہ چہارم

چند فکر انگیز مضامین

اور

قابلِ غور مسایل

(ا۔س۔ش)

باب: ا

پاکستان کے بارے میں:

انگریز، قادیانی اور لیگیوں کے تصورات

انگلستان کا سفیر اور تقسیم ملک کی وکالت:

سری پرکاش نے مختلف سفیروں سے پاکستان کے حوالے سے بات کی۔ ان سفیروں سے ملاقاتوں کی تفصیل سے قطع نظر کرتے ہوئے ان کی برطانوی سفیر سے گفتگو کو پیش کیا جاتا ہے۔ وہ برطانوی سفیر کے حوالے سے اپنی گفتگو یوں پیش کرتے ہیں:

ایک دوسرے سفیر نے جو کچھ کہا وہ بھی بتا دینا چاہتا ہوں تا کہ قارئین اس رائے سے بھی واقف ہو جائیں۔ یہ انگلستان کا نمائندہ تھا۔ باتیں کرتے کرتے تقسیم ملک کا ذکر چھڑ گیا۔ میں نے اظہار افسوس کیا کہ انگریزوں نے تین سو برس میں جو کچھ کیا تھا، ملک کا بٹوارا کر کے اس پر پانی پھیر دیا۔ انھوں نے اس ملک کی وہی ہیئت کر دی تھی جو ہمارے قومی احساس میں مضمر تھی۔ ہمالیہ سے لے کر راس کماری تک انھوں نے اس برصغیر کو ایک متحدہ شکل دے دی۔ قانون اور امن و امان کا دور دورہ ہو گیا اور عوام کی بے اطمینانی سکون و اطمینان سے بدل دی۔ لیکن خود انگریزوں نے یہاں سے رخصت ہوتے ہوئے ملک کے دو ٹکڑے کر کے اپنے ہاتھوں اپنے کارناموں کو ملیا میٹ کر دیا۔

میں نے کہا کہ جہاں تاریخ انگریزوں کے کارناموں کو سراہے گی، وہاں اس تقسیم ملک کو کبھی معاف نہ کرے گی۔ یہ سب سن کر اس نے جواب دیا:

> ''برطانوی باشندے اس کو کبھی نہیں برداشت کر سکتے کہ بے بس مسلمانوں کی اقلیت کو بے رحم ہندوؤں کی اکثریت کے رحم و کرم پر چھوڑ جائیں۔ اس لیے جب ہم نے اس ملک کو چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا تو یہ بالکل مناسب کام تھا کہ ملک

کے دو ٹکڑے کر کے مسلمانوں کے لیے ایک گھر بناتے جائیں۔''

میں نے کہا کہ

''تقسیم کے وقت متحدہ ہندستان میں مسلمانوں کی آبادی ایک چوتھائی سے زیادہ تھی۔ تقسیم ہو جانے پر بھارت یعنی تقسیم شدہ ہندستان میں ان کی تعداد دسواں حصہ ہوگئی۔ اگر یہ فرقہ جو آبادی کا پچیس تیس فیصد تھا اکثریت سے ڈرتا اور پریشان تھا تو دسواں حصہ بن جانے پر تو وہ اور زیادہ خوف زدہ ہو جائے گا۔ یہ تو کسی کے وہم وگمان میں بھی نہیں آسکتا تھا کہ مسلمانوں کا ایک ایک فرد اپنی ہر چیز چھوڑ کر دوسرے خطے میں چلا جائے۔ بٹوارا کرنے والوں کا اور خاص کر انگریزوں کا یہ فرض تھا کہ وہ سمجھ لیتے کہ جو مسلمان ہندستان میں رہ جائیں گے ان کی آبادی کا تناسب ہندوؤں سے بہت زیادہ کم ہو جائے گا۔ تقسیم کرنے والے کی منطق ہی سے یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ اس حالت میں مسلمانوں کے لیے خطرہ بڑھ جائے گا۔ میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ ان مسلمانوں کے لیے انگریزوں نے کیا بندوبست کیا۔''

اس کا جواب یہ ملا کہ

''میں سیاسی آدمی نہیں بلکہ ایک ڈپلومیٹ ہوں۔ اس لیے اس مسئلے پر کوئی رائے دینے سے قاصر ہوں۔''

سری پرکاش نے جو سوال ایک برٹش ڈپلومیٹ سے کیا اور وہ لاجواب ہوا اس سوال کا جواب کسی لیگی اور پاکستانی رہنما کے پاس بھی نہ تھا۔ تحریک پاکستان کے سب سے بڑے رہنما نے تو ہندستان کی مسلم اقلیت کو پاکستان کی مسلم اکثریت پر قربان کر دینے اور انھیں رائٹ آف کر دیے جانے کا اعلان فرما دیا تھا۔

آج بھی کسی لیگی کے پاس اس کا جواب نہیں کہ اگر ایک اقلیت کو دوسری اکثریت کے مفاد پر قربان کر دیا جا سکتا ہے اور سیاست وتدبر اسی کا نام ہے۔ تو اب پاکستان کے تیرہ کروڑ کو ہندستان کے بیس کروڑ مسلمانوں کے مفاد پر کیوں نہ قربان کر دیا جائے؟

اس سے آگے سری پرکاش اس برٹش ڈپلومیٹ کے تذکرے کو آگے بڑھاتے ہوئے لکھتے ہیں:

میں نے اس کا پیچھا نہ چھوڑا اور اپنے مزید شکوک کا اظہار کیا میں نے کہا:

''اگر ہندستان سے رخصت ہوتے ہوئے آپ کو اس کی بڑی فکر تھی کہ یہاں کے ہر فرقے کا تحفظ کر دیا جائے تو میں یہ پوچھتا ہوں کہ آپ نے والیان ریاست کے لیے کیا انتظام کیا؟ برٹش انڈیا میں ہر ہندو اور مسلمان آزادی کا طلب گار تھا لیکن کسی والی ریاست نے اپنی انفرادیت برقرار رکھنے کے لیے کبھی بھی برطانیہ سے علاحدگی نہیں چاہی۔ حتیٰ کہ ملکی مفاد کو ٹھکراتے ہوئے انھوں نے ہمیشہ انگریزوں کا ساتھ دیا۔ فرماں روائے انگلستان کے ساتھ ان کی خاص وابستگی تھی۔ آپ لوگ ان کو بے دست و پا بنا کر چل دیے۔ آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ حیدرآباد اور کشمیر میں کیا ہوا۔ انھوں نے کتنے معاہدے کر کے خود کو آپ سے کتنا وابستہ کر رکھا تھا۔ آپ نے ان کے لیے کوئی بندوبست کیوں نہیں کیا؟''

اس نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا اور بات ختم ہوگئی۔ میں نے اس سے اس قسم کے سوالات کرنے کی معافی چاہی۔

''میں اس کو بالکل ماننے کے لیے تیار نہیں ہوا کہ بٹوارا اٹل تھا۔ کم از کم میں تو یہی دیکھ رہا ہوں کہ بٹوارے سے ہندو، مسلمان اور دوسرے فرقے جو اس ملک میں بسے ہوئے ہیں، سب ہی کو نقصان پہنچا۔ صرف اتنا ہی نہیں، بلکہ بلند نظری اور دلکش نصب العین برباد ہو گیا۔ ہم کوشاں تھے کہ اپنے ملک میں سماج کو ایسا بنائیں گے کہ مختلف مذاہب میں باہمی رواداری کی فضا پیدا ہو جائے۔ یہ آرزو ایک خواب و خیال بن کر رہ گئی۔ میرا ذاتی خیال تو بالکل یہی ہے۔ میری سمجھ میں یہ بالکل نہیں آتا کہ یہ مصایب کا پہاڑ جو ہم پر ٹوٹ پڑا ہے، کیسے ہٹایا جا سکتا ہے؟ اگرچہ مسٹر جناح نے مجھ سے کہا تھا کہ پاکستان بنتے ہی تمام شکایتوں کا خاتمہ ہو جائے گا اور ہماری تمام مشکلات و معاملات کا حل نکل آئے گا، لیکن میری نظروں

کے سامنے تو یہ ہے کہ نہ صرف پرانے جھگڑے جوں کے توں ہیں بلکہ ایسی نئی نئی پیچیدگیاں پیدا ہو گئی ہیں جن کا کوئی حل نظر نہیں آتا۔ باہمی تلخیاں اور منافرت روز افزوں ہے اور کسی کو بھی نہ تو سیاسی سطح پر کوئی فائدہ پہنچا ہے نہ اخلاقی بنیاد پر!''

اس حقیقت پسندانہ بیان کی روشنی میں اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ تحریک کے رہنما اور پاکستان کے بانی کے تدبر کے خلاف تاریخ نے کتنا سنگین فیصلہ کیا ہے!

سری پرکاش صاحب مزید لکھتے ہیں:

''ان حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہمارے لیڈروں نے بٹوارا مانا ہی کیوں؟ ہر ایک جانتا ہے کہ مہاتما گاندھی اس تقسیم کے مخالف تھے۔ خود مجھ سے انھوں نے کہا کہ

''میری زندگی بھر کی محنت ایک گندے نالے میں پھینک دی گئی۔''

وہ فرقہ وارانہ اتحاد کے حامی تھے اور اس کے لیے انھوں نے اپنی جان کی بازی بھی لگا دی تھی لیکن اس کے نتیجے میں فرقے وارانہ اختلاف کی بنیاد پر دو بلکہ تین حصوں میں ملک کا بٹوارا ہو گیا...''

''یہ واضح ہو کہ اس وقت انگریز کانگریسی اور مسلم لیگی لیڈروں سے گفت و شنید کر رہے تھے۔ انھوں نے ملک کے دو حصے کر کے ایک کانگریس کو اور دوسرا مسلم لیگ کو دے دیا اور خود چلتے بنے۔ دراصل انگریزوں نے ہمارے مطالبۂ سوراج کا انتقام لیا۔ ہمارے رہنماؤں نے اس فیصلے کو تسلیم کر لیا۔ یقیناً وہ لوگ جو میرے ہم خیال ہوں گے، ان کے دماغ میں یہ سوال پیدا ہوتا ہوگا کہ ان لیڈروں نے ایسا کیوں کیا۔''(۱)

شرانگیز کی فتنہ سامانی:

ولبھ بھائی پٹیل تو ماؤنٹ بیٹن کے آنے سے پہلے ہی بٹوارے کو ماننے کے لیے تیار بیٹھے تھے۔ دراصل پٹیل پر دو بار دل کا دورہ پڑ چکا تھا اور وہ یہ جان گئے تھے کہ وہ زیادہ دن

---

(۱) پاکستان – قیام اور ابتدائی حالات: صفحہ ۲۶-۱۲۴

چلنے والے نہیں۔ جو تھوڑی بہت عمران کی باقی رہ گئی تھی۔ اسے فضول بحث بازی میں صرف کرنے کے بجائے وہ نئے ہندستان کی بنیاد ڈالنے میں لگانا چاہتے تھے۔ ان کی دلیل سیدھی سادی تھی ''جناح کو پاکستان دے دو۔ فرق کیا پڑے گا۔ پانچ سات سال سے زیادہ یہ پاکستان چلنے والا نہیں۔''

''مسلم لیگ خود ہندستان کا دروازہ کھٹکھٹائے گی کہ حکومت کی باگ ڈور آپ لوگ ہی سنبھالیے۔''

جہاں تک نہرو کا سوال تھا، گاندھی جی سے وہ گہری عقیدت رکھتے تھے، لیکن لارڈ اور لیڈی ماؤنٹ بیٹن کے ساتھ ان کی جو نئی دوستی ہوئی تھی اور ذہنی یگانگت کا جو رشتہ قایم ہوا تھا، اسے چھوڑ کر الگ ہو جانا بھی نہرو کو ناممکن معلوم ہو رہا تھا۔ گاندھی جی کے اصول ان کے دل میں بسے ہوئے تھے لیکن ان کا دماغ ماؤنٹ بیٹن کا ساتھ دینے کو مچل رہا تھا۔ نہرو کا دل کہتا تھا کہ ملک کا بٹوارا نہیں ہونا چاہیے۔ لیکن دماغ بار بار پوچھتا تھا کہ بٹوارا نہ ہو تو کیا؟ بٹوارا نہیں تو کیا؟

ماؤنٹ بیٹن نے یہ اندازہ کر لیا کہ انھیں نہرو کے ذہن میں جگہ مل گئی ہے۔ پھر کیا تھا! انھوں نے اپنی جگہ مستقل کرنے کی کوشش شروع کر دی۔ ان کی دلیلوں کو رد کرنا نہرو کے لیے مشکل ہوتا جا رہا تھا۔

ایک دلیل بڑے معرکے کی تھی؛

جناح کو رخصت کرنے کے بعد ہندو اکثریت کے علاقوں میں مضبوط مرکزی حکومت قایم ہو سکے گی۔ اگر مرکز مضبوط نہ ہوا تو جس اشتراکی نظام کو نہرو ہندستان میں قایم کرنے کا خواب دیکھ رہے تھے وہ کس طرح پورا ہو سکتا تھا؟

اس دلیل نے آخر نہرو کو بھی اس شخص کے خلاف کھڑا کر دیا جس کے نقش قدم پر وہ برسوں سے چلتے آ رہے تھے۔ [یہ اشارہ گاندھی جی کی طرف ہے۔ (ا۔س۔ش)]

نہرو اور پٹیل کو اپنا ہم خیال بنانے کے بعد ماؤنٹ بیٹن کو کانگریس ہائی کمانڈ کو اپنی طرف کرنے میں کیا دقت ہو سکتی تھی۔ نہرو کو یہ اختیار دیا گیا کہ وہ جا کر وایسرائے کو مطلع

کردیں کہ انتہائی خلوص کے ساتھ ملک کو ایک رکھنے کی خواہش رکھنے کے باوجود کانگریس پارٹی ملک کی تقسیم کو منظور کرلے گی۔ بشرطے کہ پنجاب اور بنگال پورا پورا کسی ایک ملک کو نہ ملے بلکہ دونوں ملکوں کو آدھے آدھے ملیں۔

جس بزرگ (گاندھی) کے سہارے وہ لیڈر اپنی کامیابی کی منزل (آزادی) کو پہنچے تھے، اسی کو انھوں نے اکیلا چھوڑ دیا۔ (1)

اس میں کوئی شک نہیں کہ ولبھ بھائی پٹیل عارضی حکومت میں لیگ کے رویے سے عاجز آچکے تھے اور بلاشبہ وہ اس انداز میں سوچنے لگے تھے کہ لیگ کی مانگ پوری کرکے اور انھیں ان کا پاکستان دے کر پیچھا چھڑالینا چاہیے۔ لیکن اس انداز فکر پختہ خیال میں تو ماؤنٹ بیٹن ہی نے بدلہ تھا۔ صوبے کی بنیاد پر ملک کی تقسیم کے بجائے ضلع کی بنیاد پر تقسیم ملک کا تصور ماؤنٹ بیٹن نے جناح صاحب سے گفتگو میں پیش کیا تھا، جو بعد میں کانگریس کا مطالبہ بن گیا اور اس کا شاخسانہ تھا کہ جب تقسیم کا وقت آیا تو تحصیل ہی نہیں گاؤوں کی آبادی کو اس طرح تقسیم کیا گیا کہ ایسی مثالیں سامنے آئیں کہ گھر کا ایک حصہ پاکستان میں ہے تو اس کا دروازہ ہندستان میں کھلتا ہے۔ اس قسم کے معاملات میں کس کا ذہن فتنہ ساز اور دستِ تظلم کام کررہا تھا۔ لیکن اس نے جس آلۂ کار سے یہ کام لیا تھا، وہ ریڈکلف تھا اور اس کے خلاف کچھ کہنے میں تکلف اس لیے ہے کہ اس کا نام جناح صاحب نے اپنی واقفیت اور اعتماد کی بنا پر کیا تھا۔ اور اس معاملے میں جناح صاحب اس معاہدے کے پابند تھے کہ ریڈکلف تقسیم کی جو لکیر بھی ڈال دیں گے، اس کو تسلیم کرنے کے کانگریس اور لیگ دونوں پابند ہوں گے۔ یہی وجہ تھی کہ تقسیم کی نگرانی اور پاکستان کے مفاد کے دفاع کے ایک رکن جسٹس دین محمد بھی تھے۔ انھوں نے جب بعض غلط کاریوں کی طرف جناح صاحب کو توجہ دلائی تو مسٹر جناح نے فرمایا تھا کہ اپنے ہی سکے کھوٹے ہوں تو دوسرے کا کیا شکوہ کریں؟ ضابطے اور اخلاق کی یہی مجبوریاں مانع ہوئیں اور عمل کا قدم نہ اٹھایا جاسکا۔ (ا۔س۔ش)

اسٹینلے وولپرٹ لکھتے ہیں: ”جناح کو اس دن وائسرائے کے دفتر میں نہرو اور پٹیل کے

---

(1) آدھی رات کی آزادی: ص۳۔۱۰۲

علاوہ لیاقت اور بلدیو کے ساتھ ایک نئی "تقسیم کونسل" میں شرکت کے لیے مدعو کیا گیا جس نے سرحدوں کے تعین کے کمیشنوں کے قیام کا کام سرانجام دیا۔ ہائی کورٹ کے چار ججوں کو جن میں سے دو کو کانگریس نے اور دو کو لیگ نے منتخب کیا تھا، پنجاب اور بنگال کی تقسیم کے لیے الگ الگ کمیشنوں میں شامل کیا گیا۔ جناح نے سرحدوں کے تعین کے ان کمیشنوں کی صدارت کے لیے برطانیہ کے نامور بیرسٹر سر سائرل ریڈکلف کو تجویز کیا گیا۔ ریڈکلف، جنھوں نے کبھی ہندستان کا دورہ بھی نہیں کیا تھا اور اس کے مسایل پر کبھی برملا کسی راے کا اظہار نہیں کیا تھا، متفقہ طور پر منظور کیے گئے اور جلد ہی وہ اپنے مطلوبہ فیصلہ کن ووٹ کی طاقت سے جسے انھیں بار بار استعمال کرنا پڑا، لاکھوں ہندوؤں، سکھوں اور مسلمانوں کی قسمت کا فیصلہ کرنے والے تھے۔ نہرو نے بعد میں ان کی کنزرویٹو پارٹی سے قریبی وابستگیوں کی بنا پر ریڈکلف کے بارے میں شدید خدشات کا اظہار کیا اور زور دیا کہ ان کے بجاے وفاقی عدالت آخری ثالث کے طور پر یہ خدمات انجام دے، لیکن جناح ثابت قدمی سے اس کے مخالف رہے۔" اندازہ کیا جاسکتا کہ ریڈکلف کا نام پیش کرنے، متفقہ طور پر منظور کر لیے جانے اور پھر پنڈت نہرو کی مخالفت پر اپنی راے پر ڈٹ جانے کے بعد اب ریڈکلف کی دیانت پر حرف لانا ان کے لیے بہت مشکل بلکہ ناممکن ہوگیا تھا!

ظفراللہ خاں اور تحریک پاکستان:

سری پرکاش سر ظفراللہ خاں کے حوالے سے لکھتے ہیں:

مجھے یاد ہے کہ اسمبلی کے پہلے اجلاس (۱۹۳۷ء) میں ایک پمفلٹ بہ عنوان پاکستان ممبروں کو ملا۔ یہ کیمبرج سے بھیجا گیا تھا اور جہاں تک میرا حافظہ کام دیتا ہے لکھنے والے کا نام رحمت علی تھا۔ اس میں یہ تجویز پیش کی گئی تھی کہ ایک علیحدہ ریاست بنام "پاکستان" قایم کی جائے۔ "پ" سے مراد "پنجاب"، "الف" سے "افغانستان"، "ک" سے آزاد ریاست (کشمیر) اور دو ہندستانی صوبے "س" سے (سندھ و سرحد) اور افغانستان سے "تان" اس میں شامل کیے گئے تھے۔ اس وقت مشہور معروف سر ہنری کریک ہوم ممبر تھے۔ وہ اس کو پڑھ کر خوب ہنسے، اور اگر میرا حافظہ غلطی پر نہیں ہے تو مسٹر جناح اور زیادہ ہنسے۔" لیکن جوں

جوں زمانہ گزرتا گیا حالات بدلتے گئے، اور جیسا کہ میں آگے چل کر بتاؤں گا انگریز اور مسلمان دونوں ہی قیام پاکستان کے حامی ہو گئے۔ ملک میں فرقہ وارانہ کشیدگی بڑھتی گئی اور فسادات نے ہندستان کی فضا کو پراگندہ کر دیا۔ (مرکزی) اسمبلی کو ۱۹۳۷ء میں ختم ہونا تھا لیکن اس کی مدت میں توسیع کر دی گئی۔ اس طرح یہ اسمبلی ۱۹۴۵ء تک قایم رہی۔"(۱)

اوایل ۱۹۳۹ء میں ایک موقع پر قیام پاکستان کے بارے میں میری ان کی گفتگو ہو رہی تھی۔ وہ (ظفر اللہ خاں) کہنے لگے۔ "جناح بیوقوف ہیں۔ اگر پاکستان بن گیا تو نسبتاً مسلمانوں کا ہندوؤں سے زیادہ نقصان ہوگا" آٹھ سال کے بعد جب میں ان سے کراچی میں ملا تو ان کی گفتگو یاد دلائی اور پوچھا کہ اب آپ کی کیا رائے ہے؟ بولے کہ آج بھی اسی رائے پر قایم ہوں۔ (۲) یہ تو میں نہیں کہہ سکتا کہ سرکاری سطح پر میرے اور ان کے تعلقات خوش گوار تھے لیکن دعوتوں اور پارٹیوں میں ان سے میری ملاقات ہمیشہ دوستانہ ماحول میں ہوتی تھی۔....

وایسرائے کی کونسل کے قادیانی ممبر ہونے کی حیثیت سے یہ منتخب کمیٹیوں کی صدارت کیا کرتے تھے۔ اسی نوعیت کی ایک میٹنگ میں کانگریسی ممبروں نے بے شمار ترمیمات پیش کی تھیں۔ جلسے کے اختتام پر انھوں نے مجھ سے کہا کہ "آپ کے کانگریسی ممبران بہت تیار ہو کر آتے ہیں۔" انھوں نے کہا کہ "مسلم لیگی ممبران بھی یہاں اسی غرض سے ہیں مگر وہ اتنی تیاری کر کے نہیں آتے ہیں۔" میں یہ بیان کر دینا مناسب سمجھتا ہوں کہ جو مسلمان حضرات بڑے بڑے عہدوں پر فایز تھے، مثلاً سر عبدالرحیم، سر سلطان احمد، سر مرزا اسماعیل، نواب چھتاری، ان سب کو تحریک پاکستان کے مفید ہونے میں شک تھا۔ لیکن ان کی رائے کے باوجود پاکستان بن گیا۔ عام مسلمان اس کے نتایج سمجھے بغیر اس کے حامی تھے۔ (۳)

---

(۱) پاکستان — قیام اور ابتدائی حالات، ص ۱۴

(۲) پاکستان — قیام اور ابتدائی حالات، ص ۹۰

(۳) کتاب کے متن پر ذیل کا حاشیہ خود مصنف (سری پرکاش) کے قلم سے ہے۔ مطالعہ فرمائیے:

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر......)

مسلم لیگی اور عقیدۂ پاکستان:

سری پرکاش مسلم لیگی لیڈر ایوب کھوڑو کے حوالے سے اپنی یادوں کو یوں تازہ کرتے ہیں:

ایک موقع پر جب میں اور چیف منسٹر مسٹر کھوڑو ایک ہی موٹر میں ہم سفر تھے، انھوں نے مجھ سے کہا کہ پاکستان میں آنے والا ہر مسلمان شہر ہی میں بسنا چاہتا ہے اور ان اندرونی مقامات میں قیام کرنا اس کو گوارا نہیں۔ اگر وہ یہاں آباد کاری کریں اور زراعت میں لگ جائیں تو ان کو بڑا نفع ہو کیوں کہ ان زمینوں کے مالک ان کو چھوڑ کر چلے گئے ہیں اور کھیت وغیرہ بے کار پڑے ہیں۔

میں نے اور مسٹر کھوڑو نے یہ دورہ بہت دور تک کیا اور باہم دل کھول کر باتیں کرتے رہے۔ انھوں نے کہا کہ دراصل نہ تو کوئی تقسیم ملک کا حامی تھا، نہ مستقل پاکستان کا خواہاں۔ وہ کہنے لگے کہ میں خود مسلم لیگ کے اندرونی حلقے کا ممبر تھا اور اصل واقعہ مجھے اچھی طرح معلوم ہے۔ پاکستان کا مطالبہ محض سودے بازی تھا تاکہ غیر منقسم ہندستان میں مسلمانوں کو مزید حقوق و رعایت حاصل ہو جائیں۔ ایک انگریز اخبار نویس نے جو ایک مشہور انگریزی اخبار کا نمائندہ کراچی میں تھا۔ خود مجھ سے کہا کہ ''پاکستان بن جانے سے مسٹر جناح کو ایک دھکا لگا۔ درحقیقت وہ قیام پاکستان نہیں چاہتے تھے، اور جب پاکستان بن گیا تو وہ نہیں جانتے تھے کہ کیا کریں۔ اس کے انتظام میں ان کو بڑی دقتوں کا سامنا تھا۔'' واقعہ اور اصلیت جو بھی ہو میں ان باتوں کا ذکر کر رہا ہوں جو مختلف لوگوں سے دوران گفتگو میرے کانوں میں پڑیں۔ (۱)

''میرے ایک دوست نے پاکستان کے ایک اردو اخبار کا وہ تراشا مجھے بھیجا جس میں لکھا تھا کہ جب سر محمد ظفر اللہ کی توجہ میرے آرٹیکل (مطبوعہ ہندستان ٹائمز) کی طرف منعطف کرائی گئی تو انھوں نے کہا کہ ''سری پرکاش نے سفید جھوٹ بولا ہے۔ مسٹر جناح میری بڑی قدر کرتے ہیں، میں ایسے گستاخانہ الفاظ ان کی شان میں استعمال ہی نہیں کر سکتا ہوں۔'' یہ بھی کہا کہ ''میری اور سری پرکاش کی ملاقات ہی نہیں ہوئی تھی''۔ مگر مجھے اپنے حافظے پر اس بات چیت کا پورا اعتماد ہے۔'' (پاکستان- قیام اور ابتدائی حالات، ص ۸۹)

(۱) پاکستان- قیام اور ابتدائی حالات، ص ۵۵، ۵۶

باب: ۲

پاکستان، ہندستان کے مسلمان اور کشمیر

مرزا راشد علی بیگ کی منطق:

''پوچھا جا سکتا ہے کہ پاکستان کے قیام کے بعد ہندستان میں جو مسلمان باقی رہ گئے ان کا کیا سلسلہ رہا؟ کیا انھیں پہلے سے زیادہ بڑی ہندو اکثریت کے رحم و کرم پر بے آس و بے سہارا نہیں چھوڑ دیا گیا؟ واقعہ یہ ہے کہ پاکستان کے خالقوں نے پانچ کروڑ مسلمانوں کو ادھر چھوڑ دیا، پہلے انھیں جوش جنوں کی انتہا تک لے گئے اور پھر ان سبھوں کو حالات سے اپنے آپ نبٹنے کے لیے تنہا چھوڑ کے سرحد پار کر گئے! کانگریس کے لیڈر اپنی رواداری اور عقیدے کی صلابت کے لیے ہزار ہدیہ ہائے تبریک کے مستحق ہیں۔ جو بغیر ادنیٰ جھجک یا تلخی کے ہندستان میں باقی ماندہ مسلمانوں کے لیے مساوی حقوق اور مواقع کے حصول کے لیے ہر ممکن اقدام کے لیے سینہ سپر ہو گئے، ان مسلمانوں کے لیے جن کے خونی رشتے، شادی بیاہ کے رشتے اور ماضی قریب کے سیاسی رشتے اور قدریں ان لوگوں کے ساتھ تھیں جنھوں نے ملک کی تقسیم پر اصرار کیا تھا، اور جو سرحد پار کر لینے کے بعد جیسا کہ ہندو پاک آویزش میں ظاہر ہوا، وہ ہندستان کے بدترین نکتہ چیں ہی نہیں دشمن بن گئے۔''

قیام پاکستان کے اثرات:

''مگر وہ سوچیں کہ مسلمانوں کے تو 'دونوں میٹھے' رہے کہ خدا بھی ملا اور وصال صنم بھی میسر آ گیا! پاکستان میں انھوں نے کسی غیر مسلم کو کوئی ذمے داری کی یا اہم رتبے کی جگہ نہیں دی، لیکن ہندستان میں وہ سیکولرازم اور جمہوریت کے نام پر اپنا حصہ رسد بھی حاصل کرتے رہے۔ اس کے لیے بڑی ہمت اور ذہنی بلندی درکار تھی کہ ہندو ہی دوسرے ہندوؤں کو اس بات کے لیے راضی و مطمئن کرتے رہیں کہ ہندستان کے لیے ایک ہندو ریاست برپا کرنا غلط چیز ہے، جب کہ ایک مسلم ریاست جسے خود کانگریس نے قبول کیا تھا بالکل ٹھیک ہے۔

جواہر لال نہرو، حکومت ہند اور کانگریس کا یہ بہت بڑا کام تھا کہ وہ پاکستان کی دینی ریاست کے مقام پر ایک اثر انداز اور مد مقابل ہندو ریاست کی تخلیق کے لیے ہندو آبادی کے خاصے طاقتور عناصر کا، جن میں پاکستان سے آئے ہوئے لاکھوں درماندہ شرنارتھی بھی شامل تھے، دباؤ جھیل جائیں اور اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہ ہوں۔"

بُرا اثر:

"مسلمان ہندستانیوں پر پاکستان کے قیام کا اثر برا اور اچھا دونوں طرح پڑا۔" برا اثر یہ تو ہوا ہی کہ تقسیم کے نتیجے میں خود ہندستان کے اندر دلوں کی نرمی سختی میں تبدیل ہوئی۔ لیکن سب سے بڑھ کے یہ ہوا کہ یہاں جو مسلمان باقی رہ گئے ان کی صورت حال کچھ اس طرح کی تھی جیسے وہ ایک طویل جنگ لڑا ہوا ایک ملک ہو، جس کے سارے شاندار اور جاندار جوان معرکہ میں کام آ چکے ہیں! سیاسی لیڈروں، فوجی افسروں، انتظامیہ کے اعلیٰ عہدے داروں، ڈاکٹروں، انجینئروں اور دوسرے پیشوں میں ماہروں کی اکثریت پاکستان میں خلا کو پُر کرنے کے لیے اُدھر پہنچ گئی۔ پاکستانی لیڈروں کا یہ بھی طریقہ رہا ہے کہ ہندستان کی مسلم دشمن پالیسی کے ثبوت میں وہ اس امر کو بھی لاتے ہیں کہ دیکھیے ہندستان میں ممتاز (عہدوں پر مسلمانوں کی کتنی کمی ہے۔ اس حقیقت کو وہ بھول جاتے ہیں کہ ہندستان کے سینیر مسلمان بڑی تعداد میں پاکستان چلے گئے ہیں اور حکومت ہند اپنی ساری نیک خواہشات کے باوجود سینیر مسلمان سازی پر تو قادر نہیں۔ لیکن اس کا یہ مطلب یقیناً نہیں کہ جو کچھ اب تک ہوتا رہا ہے، اس سے زیادہ ممکن نہ تھا۔"

اچھا اثر:

پاکستان کے قیام کا اچھا اثر یہ ہوا کہ اس کے ساتھ مسلم لیگ چلی گئی، یہ کہ مسلمان پرابلم کمیونٹی نہ رہے، نہ انتشار پھیلانے والی، مزید برآں، جداگانہ انتخابات کا سلسلہ بھی نہیں رہا، جو دونوں فرقوں میں فرقہ واریت کو ہوا دیتا تھا۔ آخری بات یہ کہ سیکولرازم رفتہ رفتہ جڑیں پکڑتا جا رہا ہے۔

لیکن مسلمانوں میں ماضی کا دھندلکا ہنوز ختم نہیں ہوا ہے، جس کے نتیجے میں وہ شکست

خوردہ اور افسردہ سے رہتے ہیں۔ یہ بات بے بنیاد بھی نہیں۔ یہاں تک کہ مسلم لیگ کا پہلا چہرہ بھی بھوت پریت کی مانند کبھی کبھی سامنے آتا رہتا ہے، جن سنگھ کی بڑھتی ہوئی طاقت ان کے وسوسوں اور اندیشوں میں اور اضافہ کرتی ہے۔

ایک ٹریجڈی ان کے ساتھ یہ ہے کہ جب کبھی سیکولرازم میں کہیں اندوہ ناک رخنہ پڑتا ہے تو مسلمان اس پر اعتراض کرتے ہیں تو انھیں فرقہ پرست قرار دے دیا جاتا ہے، ذات پات کی بات البتہ غیر قانونی قرار دی جا چکی ہے اور شرم ناک بھی سمجھی جاتی ہے۔ ہندوؤں میں جو چھوا چھوت اور بچا بچا پن تھا وہ کمزور ہوتا جاتا ہے۔ بنیے کی جگہ کوآپریٹو سوسائیٹیاں بنتی جا رہی ہیں، اور تعلیم کا پھیلاؤ اور بڑھتی ہوئی مفاہمت کے نتیجے میں مسلمان، بتوں کے پردے میں چھپے ہوئے آدرشوں کو بھی سمجھنے لگے ہیں۔''

ایک الزام:

''پاکستان جن حالات میں کٹ کے ایک الگ ملک بنا، وہ اپنی جگہ پر، لیکن خیال یہ تھا کہ ہندستان کے پانچ کروڑ مسلمان دونوں ملکوں کے درمیان ایک مضبوط رشتے کا کام دیں گے، لیکن اس کے برخلاف پاکستان اپنے آپ کو ان کا سب سے بڑا دشمن ہونے کا ثبوت دیتا رہا ہے۔ اس وقت بھی جب وہ یہاں کے مسلمانوں کی خستہ حالی پر بڑا پریشان ہوتا ہے۔ اس پریشانی کا اظہار کرنا اس لیے ہے کہ ہندوؤں کو ذلیل کرنے کے لیے اس کے پاس گویا ایک ہتھیار ہے، اس لیے نہیں کہ اسے مسلمان کی بہتری کا کوئی بڑا خیال ہے۔

اگر واقعی ایسا خیال ہوتا ہے تو اسے اس کا بھی خیال آنا چاہیے تھا کہ مسلمان ہندستانی سیکولرازم سے سب سے زیادہ مستفیض ہونے والے لوگوں میں ہیں اور اس لیے جس حد تک پاکستان کی سکت ہے، اسے اپنے مقدور بھر یہاں کے سیکولرازم کو مضبوط تر کرنے میں مدد کرنی چاہیے تھی۔''(۱)

پاکستان میں کبھی ہندستانی مسلمانوں کی حالت زار پر کوئی آواز اٹھتا ہے، تو اس لیے نہیں کہ وہ ان کا بڑا غم خوار یا ہمدرد ہے بلکہ بہ قول مصنف وتبصرہ نگار اس لیے کہ وہ ہندستان کو

---

(۱) ان ڈفرنٹ سیڈلز (دو کشتیوں کی سواری): از مرزا راشد علی بیگ، ص ۴۰۔۴۱

بدنام یا رسوا کرنا چاہتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ کسی پاکستانی فرد یا حکومت کو ہندستانی مسلمانوں کے مصائب و آلام میں کسی ہمدردی کا اظہار کرنا یا کسی سے کوئی شکوہ کرنا ہی نہیں چاہیے!

اس لیے کہ بانی پاکستانی مسٹر محمد علی جناح نے جب ماؤنٹ بیٹن کی داب دھونس سے پاکستان تسلیم کرلیا تھا تو بس تسلیم کرلیا تھا اور اس کے تمام لوازم بھی مان لیے تھے اور یہ اعلان کردیا تھا کہ اقلیتیں دونوں ملکوں میں اپنی اپنی حکومتوں کی وفادار رہیں گی۔ اور ان کی خیریت بھی اسی میں ہے کہ وہ اپنی حکومتوں کی مخالفت اور انھیں ستانے اور ان کے سامنے مسایل کھڑے کرنے سے باز رہیں! یہ بات انھوں نے ۱۳؍ جولائی ۱۹۴۷ء کو دہلی کی پریس کانفرنس میں نہایت واضح الفاظ میں پاکستانی اقلیت کو مخاطب کر کے کہی تھی۔ اور پھر ایک سوال کہ ''ہندستان کی مسلم اقلیت کے بارے میں آپ کی رائے کیا ہے؟''

اس اصول میں انھوں نے مسلمانانِ ہند کو بھی شامل کرلیا تھا کہ ''انھیں بھی اپنی حکومت کا وفادار رہنا چاہیے'' اور زور دے کر یہ بات کہی تھی کہ ''کوئی حکومت اپنی مخالفت برداشت نہیں کرسکتی!'' چوں کہ بانی پاکستان کا یہ بہت اہم اور تاریخی بیان تھا، اس لیے اس کو ان مباحث کے بعد مکمل طور پر مرتب کردیا ہے۔

جناح صاحب نے ۱۳؍ جولائی ۱۹۴۷ء کو جو اصول اقلیتوں کے بارے میں بیان کیا تھا، اس سے صاف یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اب اقلیتوں کا مسئلہ وجود میں آنے والی دونوں حکومتوں کا ذاتی اور اندرونی مسئلہ ہے اب وہی اس مسئلے سے نمٹیں گی اور وہ خود ہندستان کی مسلم اقلیت کے تحفظ اور فلاح و بہبود کی ذمے داری سے سبک دوش ہوتے ہیں۔

نہایت قابل غور مسئلہ:

لیکن جب انھوں نے آئی آئی چندریگر اور چودھری خلیق الزماں کو ہندستان میں مسلمانوں کی رہنمائی کے لیے وہیں ٹھہرنے کا حکم دیا تھا تو گویا جناح صاحب ہندستان کے مسلمانوں کی دیکھ بھال کو اپنی ذمے داری سمجھتے تھے اور جب خلیق الزماں کے پاکستان چلے آنے پر ان سے سخت ناراضگی کا اظہار کیا اور ان کے اظہار وفاداری پر اعتراض کیا تھا تو گویا وہ مسلم لیگ کے سابقہ طرزِ سیاست کے مطابق ہندستان میں مسلمانوں کی رہنمائی کے ذمے

دار تھے اور یہ بات کسی طرح درست نہیں ہو سکتی تھی۔ اس معاملے میں لیاقت علی خاں جو پاکستان کے وزیرِ اعظم تھے اور نہ صرف اس وقت بلکہ دسمبر ۱۹۴۷ء کے اواخر تک جب کہ مسلم لیگ آل انڈیا مسلم لیگ تھی، زیادہ حقیقت پسند تھے۔ چناں چہ ۱۹۵۰ء اور ۱۹۵۱ء میں وہ دو بار ہندستان گئے اور لیاقت نہرو معاہدے کے مطابق اقلیتوں کا مسئلہ دونوں حکومتوں کی اپنی اپنی ذمے داری قرار دیا گیا۔ اس کے بعد حکومتوں نے اس پر اپنی اپنی ذمے داری کے مطابق عمل کیا ہو یا نہ کیا ہو، لیکن قانون و ضابطے کی بات یہی تھی۔

ایک بلند شخصیت:

لیکن مرزا ارشد علی بیگ کی سمجھ کے مطابق:

''جو ہوا سو ہوا، لیکن غیر منقسم ہندستان میں جناح صاحب کی موجودگی مسایل کو حل کم کرتی، پیدا زیادہ کرتی، وہ خوجہ فرقے میں پیدا ہوئے مگر خوجوں کے امام آغا خان کو ماننے سے انکار کر دیا۔ وہ معمولی حالات سے ابھرے، ایسے کہ کوئی اثر دار آدمی انھیں مدد دینے والا نہ تھا اور بڑے سخت مقابلے کے میدان میں وہ اپنی ذاتی جدوجہد سے ممبئی کے وکلاء میں بلند ترین حیثیت پر پہنچ گئے۔ باغیانہ سرشت کے ایک نوجوان مسلمان کی حیثیت سے انھوں نے تن تنہا پرانے قدامت پرست اور وفادار مسلمان لیڈروں کی مخالفت کو اپنا شیوہ بنایا۔ کانگریس کی پالیسیوں کے بعض پہلوؤں سے نا مطمئن اور غیر متفق ہوئے تو انھوں نے اس سے استعفیٰ دے دیا۔ مجلس قانون ساز میں منتخب ہونے کے بعد وہ ہمیشہ حزبِ مخالف کے ممتاز لیڈر رہے۔ کسی دوسرے کی بانسری کی لَے میں اپنی لَے ملانے کے وہ اہل ہی نہ تھے۔ وہ اسی سے مطمئن ہو سکتے تھے کہ اپنی پارٹی کے خود مختار لیڈر ہوں، اور اپنے گھر کے بلاشرکتِ غیرے مالک۔ پاکستان ہی انھیں وہ سب کچھ دے سکتا تھا، جو ان کی سرشت کے مطالبے تھے، اگر جناح صاحب پاکستان کی تشکیل کے لیے ضروری تھے، تو پاکستان جناح صاحب کی تکمیل کے لیے ناگزیر تھا۔''(۱)

''پاکستان نے اب تک جو پالیسیاں اپنائی ہیں، وہ تو مسلمانانِ کشمیر کے لیے بھی ان کی

(۱) ان ڈفرنٹ سیڈلز، ص ۴۲۔۴۳

پریشانی اور ہمدردی کو محض منافقت قرار دیتی ہیں۔ اس کے بلند بانگ اور بار بار کے دعوے ہیں کہ وہ مسلمانانِ کشمیر کو ہندو کنٹرول سے آزادی دلانے کے درپے ہے۔ لیکن تیس لاکھ کشمیر کے مسلمانوں کے لیے وہ پانچ کروڑ ہندستان کے مسلمانوں کا مستقبل داؤں پر لگانے کے لیے تیار ہے۔ یہ ہر ایک سمجھ سکتا ہے کہ پاکستان کو اس کا تو بخوبی اندازہ ہونا ہی چاہیے کہ کشمیر میں رائے شماری کے نتیجے میں ۱۹۴۷ء کے جذبات پھر ابھر سکتے ہیں۔"[1]

پاکستان کو سوچنا چاہیے!

پھر، تازہ ہند پاک آویزش کے نتیجے میں پیدا شدہ احساسات سے قطع نظر خود تاریخِ قیامِ پاکستان اور قیام کے بعد کی ساری ہولناکیاں ابھی اس قدر تازہ ہیں کہ عام ہندو کے لیے یہ بڑا مشکل ہے کہ پاکستان دشمنی کے ساتھ، تحت الشعور ہی میں سہی، وہ کسی نہ کسی حد تک مسلم دشمن بھی نہ ہو، چاہے وہ مسلمان ہندستانیوں کا پاکستان سے رشتہ بھلے ہی نہ جوڑتا ہو۔ لیکن ہندو پاکستانیوں کو ہندستان کے ساتھ ضرور جوڑتا ہے۔ نتیجہ فرقہ وارانہ فسادات کی شکل میں عیاں ہے کہ ہندو پاکستانیوں پر جو کچھ گزرتی ہے اس کا بدلہ مسلمان ہندستانیوں سے چکایا جاتا ہے۔ یہ پلٹی ہوئی شکل میں، یرغمال کے نظریے کے سوا اور کیا ہے؟ اگر اور کسی وجہ سے نہ سہی، تو ہندستان کے مسلمانوں کی بھلائی کے لیے ہی، پاکستان کو اپنی اقلیت کی طرف پوری توجہ دینی چاہیے مگر ہو یہ رہا ہے کہ وہ اس کی عین ضد پر عمل پیرا ہے۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ دبی ہوئی ہندو فرقہ پرستی کی چنگاریوں کو ہوا دینے کی ہر ممکن کوشش جاری ہے۔

یہ اپنے آپ کو اسلامی مملکت کا باشندہ کہنے والے کا ایسا مسلم دشمن رویہ آخر کیوں ہے؟ شاید وجہ یہی ہو کہ ہندستان دشمنی ہی وہ قوت ہو سکتی ہے جو پاکستان کے دونوں بازوؤں کو متحد رکھ سکتی ہے۔ اور ہندستان کے سیکولر ہونے کی صورت میں اس جذبے کو پوری حرارت وشدت نصیب نہیں ہو سکتی نہ "اسلام خطرے میں" دکھایا جا سکتا ہے۔"[2]

---

(۱) ایضاً، ص۴۲

(۲) ان ڈفرنٹ سیڈلز (دو کشتیوں کی سواری)، ص۴۲

باب: ۳

کانگریس کے رہنما اور کشمیر

گاندھی جی کا مشورہ:

محمد فاروق قریشی (ایڈووکیٹ لاہور) لکھتے ہیں:

''کانگریس اور مسلم لیگ نے تین جون کے پلان یعنی تقسیم ہند کے منصوبے پر صاد کردی، لیکن ریاستوں کا معاملہ ابھی معلق تھا۔ ۱۵؍جون ۱۹۴۷ء کو گاندھی جی نے اپنی پرارتھنا کی تقریر میں یہ پیش کش کی:

☆ ان دونوں ریاستوں (حیدرآباد اور کشمیر) کو میرا مشورہ ہے کہ جغرافیائی لحاظ سے حیدرآباد ہندستان میں شامل ہو جائے اور کشمیر پاکستان سے الحاق کرلے۔

گاندھی جی کے بیان پر ردِعمل ظاہر کرتے ہوئے مسٹر جناح نے ریاستوں کے مستقبل کے بارے میں ایک نیا دروازہ کھول دیا۔ انھوں نے اعلان کیا:

☆ ... برطانیہ کا اقتدارِ اعلیٰ ختم ہونے پر ہندستانی ریاستیں اس امر میں آزاد ہوں گی کہ وہ خواہ ہندستان کی دستور ساز اسمبلی میں شامل ہوں، خواہ پاکستان کی اور چاہیں تو کسی میں شریک نہ ہوں اور آزاد رہنا چاہیں تو یہ ان کی مرضی پر منحصر ہے۔''(۱)

سردار پٹیل اور مسئلہ کشمیر:

☆ عوامی نیشنل پارٹی کے سربراہ خان عبدالولی خان نے پاکستان کی قومی اسمبلی میں مسئلہ کشمیر پر بحث میں حصہ لیتے ہوئے انکشاف کیا کہ اس نوعیت کی پیش کش کی ایک دستاویز لندن کی لائبریری میں پڑی ہے، جس میں ہندستان کے وزیر داخلہ سردار ولبھ بھائی پٹیل نے کشمیر پاکستان کو دینے اور حیدرآباد کے ہندستان

---

(۱) روزنامہ انقلاب۔ لاہور: ۲۰؍جون ۱۹۴۷ء

میں شامل ہونے کا فارمولا پیش کیا تھا۔ شورش کاشمیری نے لکھا ہے کہ انھیں مولانا آزاد نے بتایا تھا:

''سردار پٹیل کشمیر کے مسئلے میں پاکستان کی تائید کرتے تھے کہ پاکستان کا اس پر حق ہے اور وہ پاکستان ہی کو ملنا چاہیے۔ پاکستان کو چاہیے کہ جونا گڑھ، مناودر اور حیدر آباد دکن سے دست بردار ہو جائے، ہم کشمیر چھوڑنے کے لیے تیار ہیں۔''(۲-۱)

آغا شورش کاشمیری کی تحریر کے ان الفاظ سے محمد فاروق قریشی نے اپنی تالیف میں استدلال کیا ہے۔ لیکن آغا مرحوم کی تحریر کا اس کے پس منظر کے ساتھ مطالعہ کیا جانا چاہیے کہ مسئلے کی اہمیت کا تقاضا یہی ہے، آغا صاحب لکھتے ہیں:

''پاکستان کو محسوس کرنا چاہیے کہ ہندستان کی ایک سیاسی کھیپ کو اس کے معرض وجود میں آنے پر قلق ہے۔ اگر مسلم لیگ کی لیڈر شپ گاندھی و نہرو کی جماعت سے مفاہمت کر لیتی تو پاکستان کئی خطروں سے محفوظ ہو جاتا۔ پنڈت جواہر لال نہرو جذباتی انسان ضرور ہیں وہ بسا اوقات ایک مسئلے پر ضدی ہو جاتے ہیں، لیکن انھیں استدلال کی طاقت سے منا لینا مشکل نہیں! سردار پٹیل کشمیر کے مسئلے میں پاکستان کی تائید کرتے تھے کہ پاکستان کا اس پر حق ہے اور وہ پاکستان ہی کو ملنا چاہیے، جواہر لال کو راضی کر لینا مشکل نہ تھا، وہ لازماً کشمیر پر ہندستان کے قبضے سے دستبردار ہو جاتے لیکن قاید اعظم کی رحلت کے بعد لیاقت علی بھی کسی نیشنلسٹ مسلمان سے گفتگو کرنے کے لیے تیار نہ تھے، مجھ سے سردار پٹیل نے بیان کیا کہ انھوں نے گورنر ہاؤس لاہور میں لیاقت علی کے اصرار و استفسار پر ان سے کہا تھا کہ وہ پاکستان کے وزیر اعظم ہیں اور پنڈت جواہر لال نہرو ہندستان کے وزیر اعظم ہیں۔ دونوں ہی مجاز و مختار ہیں کسی مسئلے کا حل مشکل نہیں، میں

(۱) ابو الکلام آزاد: سوانح و افکار، شورش کاشمیری، ص ۳۶-۲۳۵

(۲) ابو الکلام آزاد اور قوم پرست مسلمانوں کی سیاست، محمد فاروق قریشی، ص ۶۵۲

استدلال کے طویل چکر میں پڑے بغیر ذمے داری لیتا ہوں اور معاہدہ ابھی ہوسکتا ہے کہ پاکستان، مناودر، جونا گڑھ اور حیدر آباد دکن سے دستبردار ہو جائے، ہم کشمیر کو چھوڑ دیتے ہیں۔ وہ ریاستیں ہندستان کے حدود میں ہیں اور کشمیر پاکستان کے حدود میں ہے، سردار پٹیل نے لیاقت علی کو یہ پیش کش بھی کی کہ وہ پاکستان کی ہندو اقلیت کو روکیں میں ہندستان کی مسلم اقلیت کو روکتا ہوں اس کے بعد جو فساد برپا کرے۔ اس کے خلاف سخت سے سخت کارروائی کی جائے۔ اس سے امن دو دن میں قایم ہو جائے گا۔ لیکن لیاقت علی نے مناودر، جونا گڑھ اور حیدر آباد دکن کے بارے میں پس و پیش کیا نتیجتاً دونوں مملکتوں کے وزرائے اعظم کی پہلی کانفرنس ناکام ہوگئی، لیکن اب وہ سب چیزیں ماضی کی ہیں، آج پاکستان ہندستان کی داخلی مشکلات پر خوش ہوتا ہے اور ہندستان پاکستان کے سیاسی افتراق پر بغلیں بجاتا ہے، لیکن اس اندازِ فکر میں دونوں میں سے کسی مملکت کے لیے کوئی فایدہ نہیں۔ پاکستان اور ہندستان کی بساطِ سیاست پر عالمی طاقتیں اپنے مہرے لے کر کھیل رہی ہیں، ان طاقتوں کی ذہنی غایت دونوں کے مابین دوستی کی نیو اٹھانا نہیں بلکہ دوستی کا نام لے کر اپنے ہتھکنڈے جمانا ہے، پاکستان ہندستان کے خطرے سے خوف زدہ ہو کر عالمی طاقتوں کی چوکھٹ پر کھڑا ہے اور خود سپردگی میں ذرہ برابر عیب محسوس نہیں کرتا۔ ہندستان چوں کہ سیاستہً پاکستان کا حریف ہے، لہٰذا اس کو بھی عالمی طاقتوں کی معاونت درکار ہے دوسری جنگِ عظیم کے بعد پورے ہندستان کے دفاعی اخراجات سو کروڑ روپے تھے لیکن برعظیم کی تقسیم کے بعد ایک چوتھائی فوج پاکستان کے حصے میں چلی گئی اور تین چوتھائی ہندستان میں چلی گئی۔ اب ہندستان کی فوج کے اخراجات دو سو کروڑ ہیں، اور پاکستان کے اخراجات بھی کم سے کم سو کروڑ تک پہنچتے ہیں یہ وہ رقم ہے جو دونوں ملکوں کے عوام حکومت کے واجبات کی شکل میں ادا کرتے ہیں، وہ امداد اس کے علاوہ ہے جو دونوں ملکوں کو

ان کے عالمی دوستوں سے ملتی اور اس کی مانگ برابر رہتی ہے یہی رقم دونوں ملک اپنی ترقی وخوش حالی پر صرف کریں اور عوام پر روزمرہ کے ٹیکسوں کا بوجھ ہلکا پڑ جائے تو ہر دو ملک صحیح معنوں میں خود مختار اور آزاد ہو سکتے ہیں اور ان کے وہ خطرات بھی ٹل سکتے ہیں جو فریقین کے دلوں میں بیٹھ چکے ہیں اور دونوں مملکتیں اپنے مسایل کا حل ایک جنگ کی شکل میں دیکھ رہی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ''جنگ'' اندریں حالات پاکستان اور ہندستان دونوں کے لیے مہلک ہے۔''

اس مضمون کو ختم کرتے ہوئے آغا مرحوم نے اہل ملک کو بھی ان کا فرضِ یاد دلایا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''ہر پاکستان کا فرض ہے کہ وہ ہندستان سے دوستانہ رشتہ استوار کرنے پر سوچے۔ ابھی وہ لوگ زندہ ہیں جو ہندستان کے مزاج کی برہمی کو ٹھیک کر سکتے ہیں۔ پاکستان ایک سیاسی تجربہ ہے، پاکستان کے ارباب حل وعقد کا فرض ہے کہ اس تجربے کو کامیاب بنائیں، ادھر ہندستان کے ارباب بست وکشاد کو لازم ہے کہ پاکستان کو ایک حقیقت مان لیں اور تسلیم کرلیں کہ اب جانبین میں دوستانہ تعلقات اور اشتراک عمل ہی ان کی بقاواستحکام کا باعث ہو سکتے ہیں۔ اگر نفرت کا شعلہ بھڑکتا رہا تو دونوں ملک عالمی طاقتوں کے مقاصد کی چتا میں بھسم ہو جائیں گے۔ یاد رہے کہ سیاست کے پہلو میں دل نہیں ہوتا، کوئی سی طاقت اپنے اغراض کی خاطر تضادات سے مصافحہ ومعانقہ کرتی ہے تو اس میں آخر کار خسارا ہی ہوتا ہے۔''(۱)

محمد فاروق قریشی لکھتے ہیں:

''گاندھی جی کی پیش کش کو قبول نہ کر کے پاکستان نے نادانی سے کشمیر حاصل کرنے کا ایک موقع کھو دیا۔ پاکستان کا خیال تھا کہ حیدر آباد کا فرماں روا مسلمان ہے۔ اس لیے اس پر پاکستان کا استحقاق ہے اور کشمیر مسلمانوں کی اکثریتی آبادی

(۱) ابوالکلام آزاد، سوانح وافکار: شورش کاشمیری، ص ۲۷-۲۳۵

کا پاکستان کی حدود سے ملحق علاقہ ہے، یہ ہر حال میں پاکستان کو ملے ہی گا، لیکن خوش فہمیوں اور غیر حقیقت پسندانہ روش کے باعث نہ تو حیدر آباد کے بارے میں اندازے درست ثابت ہوئے اور نہ کشمیر ہی پاکستان کو مل سکا اور یہ مسئلہ ہنوز روزِ اول کی طرح معلق ہے۔"(۱)

میری نظر سے گاندھی جی کی پراتھنا کی دو تقریروں میں کشمیر کا تذکرہ گزرا ہے، اور کشمیر کو لینے اور حیدر آباد کے معاملے میں مداخلت نہ کرنے کی گذارش کی ہے اور وضاحت کی ہے کہ حیدر آباد پاکستان سے دور اور الگ تھلک ہے اور اس کا محل وقوع بھی ایسا ہے کہ پاکستان سے اس کا تعلق مسایل و مشکلات کا موجب ہوگا۔

ایک حوالہ اسکندر مرزا کی یادداشتوں کا نظر سے گزرا ہے۔ جب کہ وہ قیام پاکستان کے بعد سرحدی امور کے انچارج تھے۔ سردار پٹیل نے ان کی معرفت لیاقت علی خاں کو پیغام بھجوایا تھا کہ وہ حیدر آباد کے معاملے میں دخل نہ دیں۔ کشمیر پر اکتفا کریں۔

اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ قیام پاکستان کے فوراً بعد کشمیر کے تصفیے کے لیے پاکستان کے حق میں حالات بہت سازگار تھے۔ لیکن پاکستان کے وزیر خارجہ سر ظفر اللہ خاں نے جو مسلمانوں سے الگ سیاست و مذہب رکھتے تھے، حکومت کی اجازت کے بغیر معاہدۂ سیٹو میں شریک ہو کر حالات کو یک سر پلٹ دیا۔ چوں کہ امریکا سیٹو کا بانی مبانی اور سب سے اہم فیکٹر تھا۔ مشرق وسطیٰ میں اس کی پالیسی اب بھی وہی ہے اور پاکستان اس وقت کے مقابلے میں اس جال میں بہت جکڑا جاچکا ہے۔ اس لیے اس سے نجات پانے اور ہندستان سے اپنے تعلقات استوار کرنے میں بہت پیچ پڑ چکے ہیں۔ لیکن اتنی ہی شدید ضرورت یہ پیدا ہوگئی ہے کہ پاکستان جلد سے جلد اس عذاب سے نجات پائے!

کشمیر۔ گاندھی جی، پنڈت نہرو اور مولانا ابوالکلام آزادؒ:

گاندھی جی سے متعلق دو روایتیں پچھلے صفحات میں بیان کی گئی ہیں۔ ان کی تاریخی حیثیت کے بارے میں شبہ نہیں کیا جاسکتا۔ نہ انھیں وقتی جذبات کہہ نظر انداز کر دیا جاسکتا

(۱) ابو الکلام آزاد اور قوم پرست مسلمانوں کی سیاست: ص ۶۵۳

ہے۔ یہ ان کی سنجیدہ اور سوچی سمجھی رائے تھی۔ زیر مضمون میں اس حقیقت سے مزید پردہ اٹھتا ہے۔ نیز مولانا ابوالکلام آزاد کی رائے بھی پاکستان سے کشمیر کے رشتہ انسلاک حق میں تھے۔ اسی سلسلے میں پنڈت نہرو کی ابتدائی رائے کی ایک جھلک بھی نظر آجاتی ہے جو گاندھی جی اور مسٹر پٹیل اور آزاد کے آرا سے مختلف نہ تھی۔ اس تفصیل سے یہ حقیقت بھی واضح ہو جاتی ہے کہ کشمیر کے معاملہ میں کم سے کم چار بڑے اور کشمیر کی سب سے بڑی شخصیت شیخ عبداللہ کے آرا میں درجات کے فرق کے ساتھ کشمیری پاکستان سے شمولیت کے حق میں تھے، لیکن افسوس کہ وقت کے ان حالات سے فایدہ نہیں اٹھایا جا سکا۔ اس تمہید کے بعد جو داستان میں قارئین کرام کو سنانا چاہتا ہوں، اسے جنرل شاہ نواز خان آف انڈین نیشنل آرمی کے الفاظ میں پروفیسر محمد سرور صاحب کے مزید اپنے معلومات و خیالات کے اضافے کے ساتھ اپنی تالیف ''تحریک پاکستان کا ایک باب'' میں مرتب کر دیا ہے۔ سرور صاحب لکھتے ہیں:

> ''۲۹ ستمبر ۱۹۴۷ء میں شیخ عبداللہ مہاراجہ کشمیر کی قید سے رہا ہو کر دہلی پہنچے تو جنرل شاہ نواز خان اتفاق سے وہاں موجود تھے اور پنڈت جواہر لال نہرو دارالحکومت سے باہر تھے۔ شاہ نواز کو معلوم ہوا کہ شیخ صاحب دہلی تشریف لا رہے ہیں تو وہ انھیں لینے کے لیے ہوائی اڈے پر چلے گئے۔''

اس سے آگے جو واقعات پیش آئے ان کی روداد شاہ نواز کی زبانی سنیے۔ سرور صاحب لکھتے ہیں:

کشمیر پر شیخ عبداللہ کا مشورہ اور مولانا آزاد کی رائے:

> ''شیخ (عبداللہ) صاحب دہلی کے ہوائی اڈے پر پہنچے تو انھیں لینے کے لیے میں (جنرل شاہ نواز) موجود تھا۔ ہوائی اڈے سے ہم سیدھے مولانا ابوالکلام آزاد کے ہاں گئے۔ مشرقی پنجاب کا سانحہ ہو چکا تھا اور دہلی میں مولانا آزاد کی آنکھوں کے سامنے سب کچھ ہوا تھا۔ شیخ صاحب ملے تو مولانا نے پوچھا کہ کہیے کیا فیصلہ کر کے آئے۔ انھوں نے کہا کہ میں فیصلے ہی کے لیے تو آپ کے پاس

آیا ہوں اور آپ کی رائے معلوم چاہتا ہوں؟ اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد مولانا نے فرمایا:

''بھائی! ہندستان کی تقسیم کا کانگریس اور لیگ دونوں نے فیصلہ کر دیا اور پاکستان بن گیا۔ اب تو آپ کو پاکستان والوں سے بات چیت کرنا ہوگی! تاریخ کا ورق الٹا گیا۔ موجودہ ناگزیر حالات میں آپ کے لیے اس کے سوا اور کوئی صورت نہیں۔''

اس سلسلے میں مولانا آزاد نے بہت کچھ اور بھی کہا اور شیخ صاحب وہاں سے مطمئن ہو کر اٹھے۔

تقسیم ملک کے فیصلے کے بعد مولانا آزاد نے خان عبدالغفار خان کو بھی کچھ اس قسم کا مشورہ دیا تھا جو ریکارڈ میں ہے۔ مولانا مصالحت کے حق میں تھے۔

گاندھی جی کی رائے:

مولانا کے ہاں سے ہم گاندھی جی کے ہاں پہنچے۔ راستے میں اتفاق سے کانگریس کے صدر اچاریہ کوپلانی مل گئے۔ انھوں نے چھوٹتے ہی کہا کہ شیخ صاحب! آپ کب ہندستان میں شامل ہو رہے ہیں؟ شیخ صاحب کچھ بہت زیادہ بھرے ہوئے تھے۔ یہ سنا تو بس پھوٹ ہی پڑے اور کہا:

کپورتھلہ میں جو کچھ ہوا اس کے بعد آپ ہم سے ہندستان میں شامل ہونے کا کہہ رہے ہیں۔ کپورتھلہ میں مسلم اکثریت تھی اور اسے نکال دیا گیا تھا۔

اس پر دونوں میں اچھی خاصی تلخ کلامی ہوئی اور پھر گاندھی جی کے کمرے میں داخل ہوئے۔ گاندھی جی نے کوئی لگی لپٹی رکھے بغیر شیخ صاحب سے کہا:

''دیکھیے! ہم نے صدقِ دلی سے ہندستان کی تقسیم منظور کر لی ہے۔ آپ کا علاقہ اُدھر پڑتا ہے جایئے پاکستان سے جا کر معاملہ کیجیے۔''

یہاں شاہ نواز خان کا بیان ختم ہو جاتا ہے اور سرور صاحب اپنے مشاہدات اور مطالعہ و نظر کے مطابق لکھتے ہیں:

دہلی پہنچے تو لیڈروں سے مل کر اور وہاں کے حالات دیکھ کر شیخ عبداللہ کا موڈ یہ تھا کہ دہلی ہی میں انھوں نے ایک جلسے میں تقریر کرتے ہوئے کہا:

''ریاست کی ڈوگرہ حکومت کے خلاف پونچھ والوں کی بغاوت حق بہ جانب ہے۔ ان پر ظلم ہوا وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔''

دہلی سے شیخ صاحب واپس سری نگر پہنچے۔ پارٹی کے ساتھیوں سے مشورہ ہوا اور یہ طے کیا کہ پہلے مہاراجہ سے ذمے دار اسمبلی قایم کرائی جائے اور وہ ریاست کے الحاق کا فیصلہ کرے۔ اس سلسلے میں پاکستان سے بھی اخلاقی و سیاسی مدد حاصل کرنے کی ضرورت محسوس کی گئی۔ چناں چہ اس کے لیے نیشنل کانفرنس کے بعض رہنما راول پنڈی اور لاہور آئے اور بعض لیڈروں سے ملے۔

اسی دوران میں پٹھان قبایلی کشمیر میں گھس گئے اور بارہ مولا سے آگے بڑھ کر سری نگر کے ہوائی اڈے کے قریب پہنچ گئے۔ اس وقت مہاراجہ کشمیر نے ہندستان سے فوجی مدد مانگی جو اسے الحاق کی دستاویز پر دستخط کرنے کے بعد فراہم کی گئی۔

شیخ محمد عبداللہ اور بخشی غلام محمد کے ساتھ جی ایم صادق نے، جو ان دونوں کے بعد ریاست جموں و کشمیر کے وزیر اعلا بنے، ریاست کے مستقبل کے بارے میں پاکستانی رہنماؤں سے بات چیت کرنے کی کوشش بھی کی۔ موصوف ''کوئٹ کشمیر'' (کشمیر چھوڑ دو) کی تحریک کے دوران ہی شیخ صاحب کی گرفتاری کے بعد لاہور آ گئے۔ یہاں وہ میکلوڈ روڈ پر اسٹریلیا بلڈنگ میں رہنے لگے۔ وہ کمیونسٹ تھے اور غالباً ریاست کی کمیونسٹ پارٹی کے عہدے دار تھے۔ ۱۹۴۲ء کے بعد پنجاب مسلم لیگ میں میاں افتخار الدین کے ساتھ متعدد ترقی پسند مسلمان سیاسی کارکن شامل ہو گئے تھے، جن کے کمیونسٹوں سے بڑے گہرے مراسم تھے۔ اپنے قیام لاہور میں جی ایم صادق ان سے اکثر ملتے رہتے۔ اور ان کے اجتماعوں میں شریک ہوتے رہتے۔ ان میں سے ایک صاحب نے راقم الحروف کو بتایا کہ

پنڈت نہرو کی رائے:

جی ایم صادق ۱۴ را اگست ۱۹۴۷ء کو دہلی گئے اور وہاں ۱۵ را اگست کو جشن آزادی میں شریک ہوئے۔ کچھ دن دہلی میں گزار کر وہ لوٹے تو ایک ملاقات میں انھوں نے ہم سے کہا (ان صاحب نے بعض دوسرے حضرات کے بھی نام لیے جو اس وقت موجود تھے اور خیر سے آج زندہ ہیں) کہ وہ پنڈت جواہر لال نہرو سے ملے اور ان سے ریاست جموں و کشمیر کے بارے میں تبادلہ خیالات کیا۔ جی ایم صادق نے بتایا کہ پنڈت جی نے ان سے کہا ہے:

''پنجاب میں تباہی مچی ہوئی ہے۔ دہلی کے حالات بھی خراب ہیں۔ معلوم نہیں کل کو کیا ہو اور خود ہم پر کیا گزرے، ہم بچیں یا نہ بچیں۔ آپ لوگ جائیں اور پاکستانی لیڈروں سے ریاست کے بارے میں بات کریں اور ان کے ساتھ کسی سمجھوتے پر پہنچنے کی بات کریں۔''

پاکستانی رہنماؤں سے ملاقات اور ان کی شرط:

ان صاحب کا کہنا ہے کہ لاہور میں جی ایم صادق اپنے دوستوں کے ذریعے بعض پاکستانی لیڈروں سے ملے اور ان سے کہا کہ ایک تو ہمیں ریاست میں نمائندہ اسمبلی بنوانے میں مدد دیجیے اور دوسرے بتائیے کہ اگر ہم پاکستان میں شامل ہوں تو ریاست کو کیا مراعات ملیں گی؟

جی ایم صادق کو بتایا گیا کہ انھیں غیر مشروط طور پر شامل ہونا ہوگا اور دوسری باتیں شمولیت کے بعد طے ہوں گی۔ وہ سخت دل برداشتہ ہو کر لاہور سے رخصت ہوئے اور جاتے وقت اپنے دوستوں کو یہ کہتے گئے کہ اب خواہ شیخ صاحب کچھ کہیں۔ میں تو ادھر کا رخ نہیں کروں گا۔

اب جی ایم صادق کمیونسٹ تھے اور شیخ صاحب نیشنلسٹ ۱۹۵۳ء میں ایک وقت آیا کہ شیخ صاحب کا دل کچھ پسیجا اور انھوں نے پاکستان سے مفاہمت یا مصالحت کرنی چاہی۔ اس وقت یہی صادق تھے جنھوں نے عوامی سطح پر شیخ

صاحب کی مخالفت کی اور اس کے نتیجے میں شیخ صاحب کو جیل جانا پڑا اور وہ برسوں جیل میں رہے۔

ہندستان اور پاکستان میں نقطۂ نظر کا ایک بڑا اختلاف:

اس سلسلے میں عتیق صدیقی نے اپنی تصنیف ''شیخ عبداللہ کشمیر اور ہم'' (مطبوعہ ۱۹۶۷ء۔ دہلی) میں لکھا ہے:

''ریاست کے الحاق کے طریق کار پر بھی کانگریس اور مسلم لیگ میں اختلاف تھا۔ کانگریس عوام کو اقتدار اعلا تسلیم کیے جانے پر مصر تھی اور مسلم لیگ ریاستی حکمرانوں کو اقتدار اعلا مانے جانے پر اصرار کر رہی تھی۔ کانگریس نے اس اصول کو ان ریاستوں پر خصوصیت سے منطبق کرنے کا فیصلہ کیا تھا، جن کی آبادی ایک مذہب کی، اور حکمران دوسرے مذہب کا ہو۔ کشمیر اسی ضمن کی ریاستوں میں تھا۔ نیشنل کانفرنس نے تقسیم کے بعد جی ایم صادق جو اب ریاست کے وزیر اعلا ہیں، اپنا ایک نمائندہ اس غرض سے پاکستان بھیجا کہ پاکستانی اربابِ حل وعقد کو وہ اس بات پر رضا مند کریں کہ کشمیری عوام کے حق خود اختیاری کو تسلیم کر کے الحاق کے بارے میں ان کی آزادانہ رائے کا پاکستان احترام کرے۔ اس سلسلے میں صادق صاحب پاکستان کے وزیر اعظم اور دوسرے وزرا سے ملاقاتیں کیں جو بے سود ثابت ہوئیں۔'' (ریاست جموں و کشمیر پر وائٹ پیپر: ص ۱۴)

ابھی جی ایم صادق کراچی لاہور میں نیشنل کانفرنس کا مؤقف تسلیم کرانے کی کوشش میں لگے ہی تھے کہ قبائلیوں کو بھیج کر پاکستان نے ۲۲ر اکتوبر ۱۹۴۷ء کو کشمیر پر حملہ کر دیا۔ کلیم اختر نے اپنی کتاب ''شیر کشمیر'' میں (ص: ۵۷) عبدالمجید قریشی ایڈیٹر ''جمہور'' کے حوالے سے لکھا ہے کہ انھی دنوں موصوف کو شیخ عبداللہ کا حکم ملا کہ ''میں فوراً لاہور روانہ ہو جاؤں اور اس گفتگو میں حصہ لوں۔ جو لاہور میں جی ایم صادق اور مسلم لیگی حکومت میں ہو رہی ہے۔ اس

کے ساتھ ہی شیخ صاحب کی یہ ہدایت بھی بتائی گئی کہ اس گفتگو کو کسی قیمت پر ٹوٹنے نہ دوں۔

ریاست جموں و کشمیر کے الحاق اور شیخ عبداللہ کے بارے میں بے شک یہ زبانی شہادتیں ہیں لیکن ان کی تائید ایک تو سریامین کی اس تحریری شہادت سے ہوتی ہے جس کا اوپر ذکر ہوا۔ دوسرا اس سلسلے کی ایک اور تحریری شہادت سید نور احمد کی کتاب "مارشل لا سے مارشل لا تک" (اپریل ۱۹۱۹ء تا اکتوبر ۱۹۵۸ء) سے پیش کی جاتی ہے۔

سید نور احمد ۱۹۳۷ء سے ۱۹۵۳ء تک سوائے تھوڑے سے عرصے کے، پنجاب کے محکمۂ اطلاعات کے سربراہ رہے۔ ان کی کتاب کے تیسرے ایڈیشن مطبوعہ ۱۹۶۷ء سے ایک اقتباس ملاحظہ ہو "کشمیر کا الحاق" (ص: ۳۴۴) کے تحت لکھتے ہیں:

"مہاراجہ کا اس زمانے کا کشمیری وزیر اعظم پنڈت (رام چند) کاک اسے پاکستان کے ساتھ الحاق کا مشورہ دے رہا تھا۔ اقتصادی اور جغرافیائی وجوہات اسی بات کے حق میں تھیں لیکن وزیر اعظم خواہ کچھ کہے، مہاراجہ کو یہ خود بھی نظر آتا تھا کہ مسلم عوام کے مفاد کے خلاف ڈوگرہ شاہی کے مفاد کی حمایت مذہبی رشتے کی بنا پر ہندوؤں ہی سے کی جا سکتی تھی۔ اس کے ساتھ جو وعدے وعید کیے گئے ان پر راضی ہو گیا لیکن ان وعدوں کے ساتھ شیخ محمد عبداللہ کو فوری طور پر جو کچھ دینے کی گنجایش تھی، شیخ صاحب اس پر راضی نہ تھے! ان کا مطالبہ یہ تھا کہ پہلے ریاست میں عوام کی نمایندہ حکومت قایم کرو، پھر وہ حکومت عوام کی مرضی کے مطابق الحاق کا فیصلہ کرے گی۔"(۱)

---

(۱) تحریک پاکستان کا ایک باب: محمد سرور، سندھ ساگر اکادمی، لاہور، ۱۹۷۵ء: ص ۸۹-۱۸۴

وزیر اعظم ہند کا اعلان:

بھارتی وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو نے پارلیمنٹ میں تقریر کرتے ہوئے اعلان کیا تھا۔

☆ ''وہ ہر اس مسئلے کو حل کرنے کے لیے تیار ہیں، جس نے بدقسمتی سے دونوں ملکوں کے تعلقات کو تلخ کر دیا ہے۔''(۱)

۱۶/اگست ۱۹۵۳ء کو پاکستان کے وزیر اعظم بھارت کے دورے پر نئی دہلی گئے۔ چار روز تک مذاکرات کا سلسلہ جاری رہا۔ مشترکہ اعلامیہ میں کہا گیا تھا:

☆ ''کشمیر سمیت دونوں ملکوں کے باہمی مسایل پر بھرپور اور صاف صاف گفتگو ہوئی۔ دونوں ممالک کے وزراے اعظم باہمی مفادات کے پیش نظر درپیش مسایل کو جلد از جلد پُر امن اور تعاون سے حل کرنے کی خواہش رکھتے ہیں۔ ان کی یہ ٹھوس راے ہے کہ مسئلۂ کشمیر کو کشمیری عوام کی خواہشات کے مطابق یوں حل کیا جائے جس سے ان کی فلاح و بہبود کو فروغ ملے اور ریاست کے عوام کی زندگی میں کم از کم خلل پیدا نہ ہو۔ عوام کی خواہشات کو جاننے کا سب سے قابلِ عمل طریقہ منصفانہ اور غیر جانبدارانہ راے شماری ہے۔''(۲)

وزیر خارجہ پاکستان کا غلط اقدام:

اس خوشگوار صورت حال کو پاکستان کے وزیر خارجہ نے منیلا میں بیٹھ کر سبوتاژ کر دیا۔ انھوں نے ۶ ستمبر کو امریکہ کے ساتھ ''دفاعی معاہدۂ سیٹو'' میں شامل ہونے کی حامی بھر لی اور اپنی حکومت کو اعتماد میں لینے کی ضرورت تک محسوس نہ کی۔ حال آں کہ کانفرنس میں شرکت کا دعوت نامہ قبول کرتے وقت پاکستان نے دوٹوک الفاظ میں اعلان کیا تھا کہ کانفرنس میں شرکت کا دعوت نامہ قبول کرنے کا مطلب کوئی قبل از وقت عہد و پیمان نہیں ہے۔ وزراے خارجہ کے غور و فکر سے ابھرنے والے فارمولے کا پاکستان جایزہ لے گا۔ اس کی مزید شرکت کا دار و مدار اس فارمولے کے محتاط تجزیے پر ہوگا۔

---

(۱) ابوالکلام آزاد اور قوم پرست مسلمانوں کی سیاست، ص ۲۵۳

(۲) ایضاً: ص ۵۴-۲۵۳

سوال پیدا ہوتا ہے کہ پاکستان کے وزیر خارجہ سر محمد ظفر اللہ خان نے حکومت کے واضح اور غیر مبہم اعلان کے باوجود دفاعی معاہدے کی دستاویز پر دستخط کر کے پاکستان کو اس دلدل میں کیوں پھنسایا؟ اس کی وجہ یہ تھی کہ وزیر خارجہ کے دینی مسلک کو پاکستان میں پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا بلکہ عام مسلمان برہم اور متنفر ہے۔ وزیر خارجہ کو ملک میں اپنا مستقبل غیر روشن نظر آتا ہے اس لیے انھوں نے حکومت کی رائے جانے بغیر معاہدے پر دستخط کر دیے۔ اس کے عوض عالمی عدالتِ انصاف میں جج کا عہدہ حاصل کر لیا اور یہ معاہدے پر دستخط کر دینے کے صرف ایک ماہ بعد ہوا۔

بھارتی وزیر اعظم نے نئی صورت حال پر احتجاج کرتے ہوئے کہا کہ امریکہ کی جانب سے پاکستان کو فوجی امداد اور تعاون سے بھارت اور پاکستان کے مسایل متاثر ہوں گے اور خاص کر مسئلہ کشمیر! امریکی فوجی تعاون سے خطے کی موجودہ صورت حال میں وصفی تبدیلی رونما ہوگئی ہے۔ ہندستان اب کوئی خطرہ مول نہیں لے سکتا۔ جیسا کہ بھارت ماضی میں تیار ہوگیا تھا۔ بھارت کے لیے جو نیا خطرہ پیدا ہوگیا ہے اسے پیش نظر رکھتے ہوئے بھارت ریاست کشمیر میں اپنی مسلح افواج اور فوجی ساز و سامان رکھنے میں بالکل آزاد ہے۔

پاکستان کے دفاعی معاہدوں میں شامل ہونے سے ہندستان کے مطابق خطے کی سیاسی صورت حال تبدیل ہوگئی، طاقت کا توازن بگڑ گیا اور ہندستان نے استصواب رائے کرانے کے بارے میں اپنے سابقہ رویے میں تبدیلی پیدا کر لی، وگرنہ ہندستان کشمیر میں استصواب رائے کے ذریعے اس کے مستقبل کا فیصلہ کرنے کے لیے بالکل تیار تھا۔ (۱)

ایک پاکستانی سفارت کار کا بیان:

اس کی تصدیق پاکستان کے ایک سفارت کار ڈاکٹر افضل اقبال نے مولانا آزاد کے حوالے سے کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

☆ ''راجہ غضنفر علی خان ہندستان میں پاکستان کے ہائی کمشنر تھے۔ ہندستانی معاشرے کے ہر طبقے سے ان کے تعلقات قریبی اور خوشگوار تھے۔ جب

(۱) ایضاً: ۵۶-۶۵۵

پاکستان کو امریکی معاہدے کے مطابق اسلحہ کی فراہمی کا اعلان ہوا تو سرد جنگ ہمارے دروازے تک آن پہنچی، نہرو نے کشمیر میں استصواب رائے کرانے سے دست کشی اختیار کرلی۔ اس پر راجہ غضنفر علی شدید مضطرب ہوئے۔ ہندستانی کابینہ کے اراکین پاکستان ہاؤس (تقسیم سے قبل لیاقت علی خان کی رہائش گاہ ''گلِ رعنا) میں تشریف لائے۔ وہ مولانا آزاد اور ہندستان کے طاقتور وزیرِ خوراک رفیع احمد قدوائی تھے۔ سفارت خانوں کی ضیافتوں یا دیگر تقریبات میں شمولیت مولانا کا کبھی معمول نہ تھا۔ یہ واقعہ اس وقت کا ہے جب گورنر جنرل غلام محمد دہلی آئے تھے، جن کا دعویٰ تھا کہ پنڈت نہرو کے ساتھ ان کے ذاتی تعلقات بے تکلفانہ اور دوستانہ ہیں۔ مجھے یاد ہے کہ راجہ صاحب کے لیے مراسلے میں مولانا آزاد کی گفتگو کا ایک جملہ ہو بہو درج کیا گیا تھا جو کچھ اس طرح کے تاثر کا تھا۔

"Why did you do this Kashmir was falling in your lap like a ripe fruit."

''یہ آپ نے کیا کیا؟ کشمیر پکے ہوئے پھل کی طرح آپ کی گود میں گر رہا تھا۔''

آگے چل کر یہی سفارت کار لکھتا ہے:

''مولانا آزاد کا استدلال تھا کہ اس وقت پاکستان نے امریکہ سے اسلحہ حاصل کرنے کا معاہدہ کر کے غیر دانش مندی کا مظاہرہ کیا۔ اسے اس مقصد کے لیے اس وقت تک انتظار کرنا چاہیے تھا جب ایڈمرل نمٹز کشمیر میں استصواب کے منتظم کا عہدہ سنبھالتا۔۔ ان کے خیال میں پاکستان نے اہم موقعے پر فاش غلطی کا ارتکاب کیا اور ہندستان کو وعدہ سے منحرف ہونے کا موقع فراہم کردیا۔''(۱)

ایک قابل غور نکتہ:

جس بات کی طرف مرزا راشد علی بیگ نے اُوپر کے آخری پیراگراف میں اشارہ کیا

(۱) اے ڈایری آف اے ڈپلومیٹ ڈاکٹر افضل اقبال، کراچی، ۱۹۸۶ء ص ۷۶، ۷۷، بہ حوالہ ابو الکلام آزاد اور قوم پرست مسلمانوں کی سیاست: ص ۵۶-۶۵۵

ہے، یہ ایک ایسی بات ہے، جس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ جب تک ہندستان اور پاکستان کے مابین کشمیر کا تنازعہ موجود ہے، کیوں کر امید کی جا سکتی ہے۔ گزشتہ ساٹھ برس کی تاریخ ہمارے سامنے موجود ہے، حالات بد سے بدتر ہوتے جا رہے ہیں۔ کوئی ملک ہمیشہ کے لیے حالتِ جنگ میں نہیں رہ سکتا۔ جنگ کے نتیجے میں شکست کے بعد حالات کو معمول پر لانے، امن کے قیام اور ملک کی تعمیر و ترقی کے کاموں کے اجرا کے لیے وقت کے فیصلے کو قبول کرنا پڑتا ہے یا یوں کہیے کہ تاریخ کے جبر کو برداشت کرنا پڑتا ہے۔

ہندستان اور پاکستان، دونوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے طرزِ عمل اور اپنے اپنے ملک اور قوم کے مفاد اور وقت کے تقاضوں پر غور کریں۔ قیامِ امن کی ضرورت نہ صرف براعظم پاک و ہند کی بلکہ عالمِ انسانیت کی بقا اور فلاح و بہبود کی لازمی اور ناگزیر ضرورت ہے۔ اس کے لیے دلایل کے شمار و بیان کی ضرورت نہیں! نیز امن و اعتماد کے حصول میں غصہ، الزام تراشی، قوت کا استعمال وغیرہ ہرگز مفید نہیں!

اس بات کو نہ بھول جانا چاہیے کہ ایک طرف ہندستان کے سولہ کروڑ سے زیادہ مسلمانوں کی زندگی کے امن و سکون اور عزت و توقیر کا سوال ہے۔ دوسری طرف کشمیر کے ۳۰ لاکھ مسلمانوں کی زندگی یا آزادی کا مسئلہ ہے۔ یہ بات عقل میں آنے والی نہیں کہ ۳۰ لاکھ کے مفاد پر سولہ کروڑ انسانوں کے مصالح کو نظر انداز کر دیا جائے۔ پاکستان کے لیے ہندستان کے مسلمانوں اور کشمیر کے مسلمانوں میں کیا فرق ہے۔ چار کروڑ مسلمانوں کو انھوں نے ایک ہی ملک کا اندرونی مسئلہ بنا کے انھیں اسی حکومت کے سپرد کر دیا اور ۳۰ لاکھ مسلمانوں کے عشق میں پاکستان نے اپنی تعمیر و ترقی اور مستقبل کے مصالح و مفادات اور ان کے تقاضوں سے اپنی آنکھوں کو بند کر لیا ہے!

مسئلہ کشمیر کا حل اور بانی پاکستان کا فلسفۂ سیاست:

پاکستان جناح صاحب نے بنایا تھا۔ وہ تحریک پاکستان کی متفق علیہ رہنما اور تاریخِ پاکستان کی سب سے بلند مرتبہ سیاسی شخصیت تھے۔ آخر ان کے اصول و فلسفۂ سیاست کے

مطابق اس مسئلے کو حل کیوں نہیں کرلیا جاتا۔ میں نہیں سمجھتا کہ ان کی سیاسی زندگی اور اعمال سیاسیہ سے ہمیں کوئی رہنمائی نہ ملے۔ میرے علم میں دو اصول کے مطابق ان کے فیصلوں کی کئی کئی مثالیں اور قانونی زبان میں نظیریں ملتی ہیں۔ ہمیں ان سے استفادہ کرنا چاہیے!

۱) جیسا کہ جناح صاحب نے قیام پاکستان کے بعد ہندستان کی مسلمان اقلیت کے بارے میں فرمایا تھا۔ ڈاکٹر اجیت جاوید نے ایم سی چھاگلا کی خودنوشت **دسمبر کے گلاب** (Roses in december) ممبئی، بھارتیا ودیا بھون، ۱۹۷۸ء، ص ۸۰) کے حوالے سے لکھا ہے:

''ایم سی چھاگلا نے ایک مرتبہ جناح سے پوچھا، ''آپ پاکستان کے لیے لڑ رہے ہیں، جس میں مسلمانوں کے اکثریتی صوبے شامل ہوں گے، لیکن جن صوبوں میں خصوصاً یوپی میں، جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں، ان کا کیا ہوگا؟ تھوڑی دیر تک وہ میری طرف دیکھتے رہے اور پھر بولے ''وہ اپنی دیکھ بھال خود کریں۔ میری ان کے مستقبل میں کوئی دل چسپی نہیں۔'' (۱)

اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ عقل منداور اصول پسند شخص کو کسی کے پھٹے میں پاؤں نہیں ڈالنا چاہیے اور جس کا مسئلہ ہو اس کو خود اس کا حل تلاش کرنا چاہیے' اس فکر عالی اور نکتۂ تدبر میں پاکستانیوں اور کشمیریوں -- دونوں کے لیے عبرت پوشیدہ ہے۔ پاکستانیوں کے لیے سبق یہ ہے کہ کشمیریوں کو ان کے اچھے یا برے حالات پر چھوڑ دینا چاہیے۔ وہ خود اپنی مصیبت کا حل تلاش کرلیں گے!

۲) ایک طریقہ یہ ہے کہ کشمیر کے مظلوم مسلمانوں کو پاکستان کے تیرہ کروڑ مسلمانوں کے مفاد پر قربان ہو جانے کی سعادت حاصل کرنے کا موقع دیجیے۔ مسلم اکثریت کے صوبوں کے مسلمانوں کی آزادی اور مفاد پر اقلیت والے صوبوں کے قربان ہو جانے کا اصول جناح صاحب کے کئی بیانات میں آیا ہے اور اس پر انھوں نے عمل بھی کیا تھا، بلکہ ان

(۱) سیکولر اور وطن پرست جناح: ص ۲۷۹

کی فاتحہ بھی پڑھ چکے تھے۔ یہ اتنی عام بات ہے کہ اس کو دہرانے کی ضرورت نہیں۔ اس کی طرف صرف احمد آباد کی تقریر کے مختصر حوالے پر اکتفا کرتا ہوں۔ فرماتے ہیں:

''اقلیت کے صوبوں کے مسلمانوں پر جو گزرتی ہے گزر جانے دو! لیکن آؤ ہم اپنے ان بھائیوں کو آزاد کرا دیں جو مسلم اکثریت کے صوبوں میں ہیں۔''

حصہ پنجم

آزاد بنگال کی تحریک

اور

مسٹر جناح

باب: ا

آزاد و متحدہ بنگال کی اسکیم

تعجب ہوتا ہے کہ جناح صاحب نے پاکستان سے الگ آزاد متحدہ بنگال کی تجویز کو کیوں کر نہ صرف گوارا کرلیا بلکہ اس پر خوشی کا اظہار بھی کیا اور اس پر تحسین و تبصرہ بھی فرمایا۔

ماؤنٹ بیٹن کی رپورٹ کے الفاظ یہ ہیں:

''میں نے (یعنی مسٹر ماؤنٹ بیٹن نے) مسٹر جناح سے سیدھا سوال کیا کہ بنگال کو متحد رکھنے اور پاکستان سے باہر رکھنے کے مسئلے پر ان کا نقطۂ نظر کیا ہے؟''

انھوں نے (یعنی جناح صاحب نے) بلا جھجک جواب دیا۔

''مجھے اس سے خوشی ہوگی! کلکتہ کے بغیر بنگال کو حاصل کرنے کا کیا فایدہ ہے؟ بہتر ہوگا کہ بنگال متحد رہے اور آزادی حاصل کرے۔ مجھے یقین ہے کہ بنگال ہم سے دوستانہ مراسم رکھے گا!''

اور حسین شہید سہروردی جیسے مسلم لیگ کے صف اول کے مدبر کا یہ کہنا ہے کہ

''ہم بنگالی مشترکہ مادری زبان رکھتے ہیں اور ہمارے اقتصادی مفادات مشترکہ ہیں۔ بنگال کی پنجاب کے ساتھ بہت معمولی مماثلت ہے۔''

اس تحریک کو پسند کرنے والوں میں بنگال کا انگریز گورنر، کانگریس کے رہنما سرت چندر بوس، بنگال مسلم لیگ کے جنرل سیکریٹری ابوالہاشم اور دوسرے لوگ بھی تھے اور یہ سب گاندھی جی سے ایک وفد کی صورت میں ملاقاتی بھی ہوئے تھے۔ ابوالہاشم نے گاندھی جی سے کہا کہ وہ متحدہ بنگال کی حمایت مشترکہ زبان، مشترکہ ثقافت اور مشترکہ تاریخ کی بنیاد پر کرتے ہیں۔ گاندھی جی کو ان کی زبان سے یہ باتیں سن کر خوش گوار حیرت ہوئی۔

چوں کہ اس کی مزید تفصیلات آیندہ صفحات میں آرہی ہیں اس لیے یہاں ان کی تکرار سے گریز کیا جاتا ہے۔

یہ حوالہ محمد فاروق قریشی کی تالیف ابوالکلام آزاد اور قوم پرست مسلمانوں کی سیاست سے لیا گیا ہے۔ لیکن یہی حوالہ ان کی مرتبہ کتاب تحریک پاکستان اور انتقال اقتدار کے ڈاکومنٹ نمبر ۲۲۷ کے ترجمے میں اس طرح ہے:

"مسٹر سہروردی نے مجھے (یعنی ماؤنٹ بیٹن کو) بتایا کہ "بنگال کا مسئلہ (پنجاب جیسی) نوعیت کا نہیں ہے۔ بلکہ بنگال کا اس کے ساتھ دور کا بھی واسطہ نہیں ہے۔"

اوپر کے دونوں حوالوں میں اگرچہ بہت معمولی فرق ہے۔ لیکن فرق ہے اور بہت قابل غور ہے۔ اور اسی طرح اس صفحے کے پہلے حوالے کا آخری جملہ۔ یعنی بنگال کے دونوں حصوں کو ملانے کے لیے بہ مقابلہ اسلامی حکومت یا کم از کم مسلمانوں کی حکومت کے قیام کے، محض اس بات پر مطالبے سے دست بردار ہو جانا کہ وہ (مغربی ہند کے صوبہ جات پر مشتمل) اسلامی حکومت سے "دوستانہ مراسم رکھے گا" کیوں کر جائز ہو سکتا ہے؟

اور یہ بات کہ متحدہ بنگال سے شمال مغربی علاقے میں بچے کھچے پاکستان سے دوستانہ مراسم پیدا ہو جائیں گے تو جہاں تک خوش گوار اور اچھے تعلقات کی بات ہے تو وہ تو دور نزدیک کے تمام ممالک سے اچھے ہی ہونا چاہیے اور سب سے پہلے تو ہندستان اور افغانستان سے اچھے تعلقات ہونے چاہییں اور عملاً ہوا یہ کہ پاکستان کا مشرقی حصہ ہی اپنا باقی نہیں رہا۔ حقیقت یہ ہے کہ مشرقی پاکستان شروع ہی سے مغربی پاکستان کے لیے ایک ناقابل برداشت بوجھ بن گیا اور ایک دن وہ آگیا کہ اس بوجھ کو سر سے اتار پھینکا گیا۔ اور کوئی چاہے تو یہ الزام مشرقی پاکستان یا آج کے بنگلہ دیش پر الٹ دیا جائے۔ آدھے بنگال کے بجائے پورا آزاد اور متحدہ بنگال اور اس سے اچھے بھی مراسم ہمارے کس کام آسکتے تھے؟

حیرت کی بات ہے کہ اس مسئلے میں نہ صرف بنگال کے کانگریسیوں بلکہ مہاسبھائیوں کو لیگ کے رہنماؤں نے اپنے ساتھ ملا لیا اور ان کے تعاون سے ایک نئے آزاد و متحدہ بنگال کے قیام کی جدوجہد میں مصروف ہو گئے۔ لیکن یہ نہ سوچا کہ "ڈائریکٹ ایکشن ڈے" یا یوم نفیر پاکستان منا کر بنگال اور بہار کے ہزاروں خاندانوں کے لاکھوں افراد کو خوں خوار

بھیڑیوں کے حوالے کیوں کر دیا جائے؟ جس نے قتل وخون کی ندیاں بہادیں تھیں، ان کے جان ومال کو آگ میں جلا کر ہولی کھیلی تھی اور ان کی صدیوں کی مقیم زندگی کو تہ وبالا کر دیا تھا۔ اگر آزاد بنگال کے لیے ہندو مسلم اتحاد کی ضرورت تھی تو نوا کھالی میں انسانیت سوز مظالم سے ہاتھوں کو روک دیا ہوتا اور اس سے زیادہ اتحاد اور آپ کے رحم وکرم کے مستحق مغربی پنجاب اور سرحد کے ہندو اور سکھ تھے۔ اگر ایسا کیا ہوتا تو کیا تعجب کہ وہاں کے اعمال کے ردعمل کا عذاب مشرقی پنجاب، دہلی اور دیگر مقامات پر نازل نہ ہوا ہوتا! اگر ایسا ہوتا تو یقین ہے کہ ”لوٹ مار، قتل وغارت گری، آتش زنی اور انسانیت پر ظلم وستم کے داغ اہل پاکستان کے دامن پر ہرگز نہ لگتے!

اور جس طرح بنگال کی خودمختاری وآزادی اور اتحاد کے بارے میں سوچا گیا تھا۔ ٹھیک ٹھیک اسی طرح پنجاب کے تاریخی، ثقافتی، لسانی، معاشرتی زندگی کے تسلسل اور اہل پنجاب کے اتحاد کے بارے میں کیوں نہ سوچا اور اپنی شخصیت اور زندگی کے کارنامے پر داغ لگانا کیوں گوارا کر لیا اور پنجاب کا جغرافیہ نہ جانتے ہوئے بھی اس کی تقسیم کی حدوں میں انھیں مداخلت کی کیا ضرورت پیش آ گئی تھی؟ پنجاب میں مسلم اکثریت کے حصوں میں انبالہ ڈویژن، ضلع گورداس پور کی تین تحصیلیں جن میں پٹھان کوٹ کو کس کے میمورنڈم کے مطابق ہندستان کو دے کر اس کے لیے کشمیر کی راہ کس نے کھولی تھی؟ قادیان کی بستی کا اس کے گردوپیش کے ساتھ ہندستان کے ساتھ کس نے رشتہ جوڑا تھا؟ امرتسر کی تحصیل اجنالہ کا تحفہ کس نے پیش کیا تھا؟ ضلع فیروزپور کی تحصیل فیروزپور اور زیرہ اور ضلع جالندھر کی تحصیل نکودر کس نے میمورنڈم کی تھالی میں سجا کر کس کی خدمت میں پیش کی تھی؟ پنجاب خفیہ پولیس کے کمشنر مسٹر جین کنس کے پکڑے جانے والے خط کا کیا قضیہ ہے؟ میمورنڈم کس نے کس کی خدمت میں پیش کیا تھا، انبالہ ڈویژن ہندستان کو دے دینے کی تجویز کس نے پیش کی تھی۔ اب یہ راز سربستہ نہیں رہے، تاریخ کا حصہ بن چکے ہیں۔ ہندو ماؤنٹ بیٹن کی سازش کی حکایات کب تک بیان کی جائیں گی اور ریڈ کلف کو کب تک گالیاں دی جائیں گی۔ کوئی بتائے کہ جن اعلیٰ شخصیات کو ریڈ کلف کی عدالت میں پاکستان کی وکالت کا فرض سونپا گیا تھا،

انھوں نے یا ان کے معاونین نے اس سازش کا راز کب فاش کیا تھا اور اس پر لیگ کے بڑوں نے کیا ردعمل ظاہر کیا تھا؟ آخر تاریخ کے حقایق کو کب تک چھپایا جائے گا اور قوم کے بچوں کو کب تک غلط تاریخ پڑھائی جائے گی اور بالآخر اس کا انجام کیا ہوگا؟ کیا کبھی کسی نے سوچا ہے؟

ایک دن تھا کہ لاہور ریزولیشن میں جوش اسلامی سے مرعوب ہوکر ''اسٹیٹ'' کو ''اسٹیٹس'' بنایا گیا تھا تاکہ بنگال و آسام میں مسلم اکثریت کے خطے پاکستان کا بازو بن جائیں اور ایک دن قسمت نے یہ دکھایا ہے کہ بنگال کی خودمختاری، آزادی اور اتحاد کی خاطر ''اسٹیٹس'' سے ایس کو کھرچنے اور اس سے نجات پانے کا سروسامان مہیا کیا جارہا ہے۔ اگر دو قومی نظریے سے رجوع کر کے بنگال کو متحدہ قومیت کی بنیاد پر آزادی اور خودمختاری دلانا کوئی معقول اور اہلِ بنگال کی فلاح و بہبود کی بات تھی تو یہ معقول بات پنجاب کے اتحاد اور اس کے تمام باشندوں کے فلاح و بہبود کے بارے میں کیوں نہ سوچی گئی اور اگر پنجاب کا دو ٹکڑوں میں تقسیم ہونا قابلِ فخر بات تھی اور اس کے باشندوں کا فایدہ ان کی تقسیم اور ٹکڑے ٹکڑے ہوجانے میں تھا تو پھر اسی اصول کو بنگال کی نئی زندگی کے لیے کیوں نہ اصول بنایا گیا۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ مسلم لیگ کے فلسفۂ سیاسیات میں صرف ہندوؤں سے پیچھا چھڑانا شامل نہ تھا بلکہ ہندستان کے مسلمانوں سے پیچھا چھڑانا بھی مقصود تھا۔ انھیں ''اپنی حکومت'' کا وفادار رہنے کے مشورے اور ترکِ وطن پر پابندی لگا کر پورا کیا گیا تھا اور بنگال کو اس کی خودمختاری اور متحدہ قومیت کا سبز باغ دکھا کر ان سے پیچھا چھڑانے کی کوشش کی گئی تھی!

بنگال کی آزادی و خودمختاری اور متحدہ قومیت کی بنیاد پر اس کی تنظیم اور سیکولر نظام کے تحت اس کی جدید سیاسی زندگی کی تشکیل کی داستان، فکشن کی کوئی صنف نہیں۔ حقایق پر مبنی ایک حیرت انگیز اور بصیرت افروز تاریخ ہے اور اگرچہ یہ تحریکِ پاکستان ہی کا ایک حصہ ہے اور اگرچہ یہ اپنے منصوبے کے مطابق کامیابی سے ہم کنار نہیں ہوسکا لیکن قیامِ پاکستان سے پہلے ہی یہ بات اہلِ پاکستان کے دلوں میں بٹھادی گئی تھی کہ بنگال الگ ہوسکتا ہے۔ متحدہ

قومیت ایک حقیقت ہے اور آزاد بنگال کی سیکولر بنیاد پر جدید تشکیل و تعمیر بھی ہو سکتی ہے، ۱۹۷۱ء میں بنگلہ دیش کے قیام کا جو واقعہ پیش آیا اس کا بیج ۱۹۴۷ء میں بویا گیا تھا اور اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس کی آبیاری اور نشو ونما میں مسلم لیگ کے صدر اور بانی پاکستان کا بھی حصہ تھا۔ تحریک کے رہنماؤں کو آں موصوف کی آشیر باد تو ضرور ہی حاصل تھی!

آزاد اور متحدہ بنگال کی تجویز:

اب آپ اس سلسلے کے تاریخی حقایق اور ٹرانسفر آف پاور کے چند ڈاکومنٹس پر ایک نظر ڈال لیجیے۔ محمد فاروق قریشی لکھتے ہیں:

> ''دو قومی نظریے کے زبردست پشتی بان ''ڈایریکٹ ایکشن ڈے'' کے مسلم لیگی ہیرو مسٹر حسین شہید سہروردی اور بنگال مسلم لیگ کے دیگر قایدین قیام پاکستان کے لیے مصروف جہد تھے، لیکن جب قرارداد لاہور کو عملی جامہ پہنانے کا وقت قریب آیا تو یہ حضرات اس سے فرار اختیار کر گئے اور بنگال کو پاکستان میں شامل ہونے سے روکنے کی کوششوں میں مصروف ہو گئے۔ وہ چاہتے تھے کہ بنگال تقسیم ہو کر پاکستان میں شامل نہ ہو بلکہ متحد رہے اور خود مختار و آزاد ہو جائے۔ انھوں نے اس منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے بنگال کانگریس اور ہندو مہا سبھا کی حمایت بھی حاصل کر لی۔ اس سلسلے میں جو سمجھوتا طے پایا۔ اس کی خبر ایسوسی ایٹڈ پریس آف انڈیا نے (۲۴ر مئی ۱۹۴۷ء کے) اخبارات کو مہیا کی جس میں سمجھوتے کی تفصیلات درج تھیں۔''

آزاد بنگال سمجھوتے کی تفصیل:

مسٹر سرت چندر بوس اور ممتاز کانگریسی و مسلم لیگی رہنماؤں میں مذاکرات نے واضح شکل اختیار کر لی ہے۔ چناں چہ آیندہ کی صوبائی وزارت کی تشکیل اور دستور کا اصول اور شرایط طے پا گئی ہیں۔ جن کی تفصیل حسب ذیل ہے:

۱) بنگال آزاد ریاست کی حیثیت اختیار کر لے گا تو باقی ہندستان کے ساتھ تعلقات کا فیصلہ کرنے کا مجاز و مختار ہو گا۔

۲) بنگال کے آیندہ دستور میں انتخاب مشترکہ نیابت اور حق رائے دہی بالغاں کی بنیاد پر ہوگا۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کو آبادی کی بنیاد پر نمایندگی ملے گی۔

۳) جب برطانوی حکومت بنگال کی آزاد ریاست کا اعلان کر دے گی تو موجودہ وزارت فی الفور ختم ہو جائے گی اور اس کی جگہ نئی مشترکہ وزارت قایم کر دی جائے گی۔ اس میں وزیر اعظم کو چھوڑ کر مسلمانوں اور ہندوؤں کے نمایندے برابر کی تعداد میں شامل ہوں گے۔

۴) وزیر اعظم مسلمان ہوگا اور ہوم منسٹر ہندو۔

۵) پولیس اور فوج میں ہندوؤں اور مسلمانوں کو مساوی بھرتی کیا جائے گا اور تمام افسران بنگالی نژاد ہوں گے۔

جناح صاحب کی منظوری اور خوشی کا اظہار!

مسٹر حسین شہید سہروردی نے ۲۶ ر اپریل کو ماؤنٹ بیٹن سے ملاقات کی اور ان سے کہا تھا کہ اگر انھیں مناسب وقت دیا جائے تو وہ بنگال کو اس پر راضی کرالے گا کہ بنگال (تقسیم نہ کیا جائے) متحد رہے اور آزاد ہو اور وہ مسٹر جناح کو بھی اس پر آمادہ کر لیں گے کہ اس صورت میں بنگال پاکستان میں شامل نہ ہو۔ مسٹر حسین شہید سہروردی نے وایسرائے کے سامنے جس عزم کا اظہار کیا تھا اسے واقعی پورا کر دکھایا۔ مسٹر جناح اسی دن وایسرائے سے ملنے گئے تو ماؤنٹ بیٹن نے بالکل سیدھے طور پر سہروردی کی ملاقات اور تجویز کا ذکر کیا اور ان کی رائے دریافت کی۔ تو مسٹر جناح نے بغیر کسی ہچکچاہٹ کے جواب دیا:

''میں خوش ہوں گا۔ کیوں کہ کلکتہ کے بغیر بنگال کا کیا فایدہ؟'' ان کے لیے بہتر ہے کہ وہ متحد رہیں اور آزاد رہیں۔''

''یقین ہے ان کے ہمارے ساتھ دوستانہ تعلقات ہوں گے۔ ماؤنٹ بیٹن کہتا ہے کہ سہروردی نے مجھے یقین دلایا ہے کہ اگر بنگال متحد رہا اور آزاد ہوا تو وہ برطانوی دولتِ مشترکہ میں شامل ہوگا۔ اب بنگال کو راضی کرنا باقی رہ گیا تھا(۲) یہ کام مسٹر سہروردی نے ایک ماہ سے بھی کم عرصے میں کر دکھایا۔ متذکرۂ بالا

مشترکہ اعلامیہ اس کا ثبوت ہے۔''

چوہدری محمد علی نے اس پہلو پر مزید روشنی ڈالی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''وزیر اعظم بنگال حسین شہید سہروردی نے سبھاش چندر بوس کے بھائی سرت چندر بوس کی تائید سے ایک آزاد اور خود مختار بنگال کی آواز اٹھائی اور انگریز گورنر بھی اس کا حامی تھا۔ کلکتہ میں گاندھی جی سے سرت چندر بوس، سہروردی اور دوسرے لیڈروں نے ملاقات کی جن میں بنگال مسلم لیگ کے جنرل سیکریٹری ابوالہاشم بھی شامل تھے۔ موخر الذکر کی گفتگو سے گاندھی جی کو خوش گوار حیرت ہوئی کیوں وہ متحدہ بنگال کی حمایت ''مشترکہ زبان، مشترکہ ثقافت اور مشترکہ تاریخ کی بنیاد پر کر رہے تھے۔ جس نے بنگال کے ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک وحدت میں پرو رکھا تھا۔''(۳)

اور یہ بات مسلم لیگ کے نظریۂ پاکستان کے اصولِ سیاسی ''دو قومیت کے تصور'' کے سراسر خلاف تھی۔ (ا-س-ش)

دو قومی نظریے کے بنگالی علم بردار مسٹر حسین شہید سہروردی کے بارے میں ایک اور مصنف رقم طراز ہے کہ سہروردی کا موقف یہ تھا:

''... ہم بنگالی مشترکہ مادری زبان رکھتے ہیں اور ہمارے اقتصادی مفادات مشترکہ ہیں۔ بنگال کی پنجاب کے ساتھ بہت معمولی مماثلت ہے بنگال آزاد ریاست ہوگا اور اس کا فیصلہ وہ خود کرے گا کہ آیا اسے پاکستان کے ساتھ ناتہ رکھنا ہے؟ جناح متحدہ آزاد بنگال کے قیام کا کھلے دل سے خیر مقدم کریں گے۔''(۴)

تو یہ تھا مسلم لیگ کے قایدین کا اندازِ سیاست، انھی تضادات سے بھرپور سیاست کے باعث مسلمانوں کو خسارے کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ مسٹر جناح نے تو مشن سے کہا تھا۔ ''ایک مرتبہ پاکستان کا مطالبہ تسلیم کر لیا جائے تو اس کی سرحدات کے تعین پر گفتگو ہو سکتی ہے۔(۵)

☆ مسٹر جناح نے ماؤنٹ بیٹن سے ملاقات کی تو اس کا تاثر یہ تھا ''مسٹر جناح نے اپنے منصوبے کے کسی پہلو پر غور ہی نہیں کیا۔ اسے اپنی زندگی کا سب سے بڑا دھچکا اس وقت

لگے گا، جب وہ حقیقت کی دنیا میں قدم رکھے گا۔''(۶)

مسٹر شہید سہروردی کی ایک تقریر:

بنگال کے آخری وزیر اعظم کے عہدے سے سبک دوش ہوتے ہوئے ۱۲ر اگست ۱۹۴۷ء کو شہید سہروردی نے کہا تھا:

''بنگال کا تقسیم ہونا میرے نزدیک ایک تباہی اور تکلیف دہ حادثہ ہی رہے گا۔ مشرق اور مغرب ایک دوسرے سے اتنے قریب ہیں کہ یہ ناممکن ہے کہ اس تقسیم سے انھیں دھکا نہ لگے اور یہ کہ وہ یہ امید نہ پالتے رہیں کہ کبھی نہ کبھی ہم ایک بار پھر ایک ہو جائیں گے۔ مگر سیاسی بھنور کی تہ سے جو کچھ اُچھلا ہے اسے ہمیں زیادہ سے زیادہ کار آمد بنانا ہوگا... ایک ایسا وقت تو بہر حال آئے گا ہی کہ اکثریت اور اقلیت کا مسئلہ سرے سے معدوم ہو جائے گا اور ہر حصے کے ہندو اور مسلمان اس حصے کے باسیوں کی طرح، اپنے اپنے علاقے کی ترقی اور خوش حالی کے لیے مل کر کام کریں گے۔ اور مشترکہ اقتصادی اور سیاسی اصولوں پر ایک دوسرے سے تعاون کریں گے۔... خدا اس ملک پر پھر ایسے امن اور سکون کی بارش کرے جو حکومت کی قوت سے نہیں بلکہ یہاں کے عوام کی دلی خواہشات سے پیدا ہو۔''(۷)

[ابو الکلام آزاد اور قوم پرست مسلمانوں کی سیاست، محمد فاروق قریشی]

حرف آخر:

قارئین کرام غور فرمائیں!

مسٹر ماؤنٹ بیٹن نے مسٹر جناح سے سیدھا سوال کیا کہ بنگال کو متحد رکھنے اور پاکستان سے باہر رکھنے کے مسئلے میں ان کا نقطۂ نظر کیا ہے؟

ماؤنٹ بیٹن ہی کے بیان کے مطابق انھوں نے ''بلا جھجک'' جواب دیا:

''مجھے اس سے خوشی ہوگی! کلکتہ کے بغیر بنگال کو حاصل کرنے کا کیا فائدہ ہے؟ بہتر ہوگا کہ بنگال متحد رہے اور آزادی حاصل کرلے۔ مجھے یقین ہے کہ بنگال

ہم سے دوستانہ مراسم رکھے گا۔“

جناح صاحب نے غیر منقسم آزاد بنگال کی صورت میں اپنی جس خوشی، فایدے اور یقین کو دیکھ لیا تھا، یہ تینوں چیزیں انھیں غیر منقسم آزاد پنجاب کی شکل میں بھی نظر آجانی چاہیے تھیں۔ آدھا پاکستان تو وہ نہایت خوشی اور بلند خیالی، کسی بحث اور رد و کد کے بغیر چھوڑنے پر تیار ہو گئے۔ صرف ”دوستانہ مراسم“ کی زبانی یقین دہانی کی قیمت پر! اگر ایسا ہی تھا تو غیر منقسم پنجاب کے فواید و نقصانات کے بارے میں بھی سوچ لیا ہوتا۔ سر سکندر حیات مسٹر سہروردی سے گئی گزری شخصیت تو نہ تھے۔ ان کا تو اپنا فارمولا تھا۔ پنجاب میں ان کے اثرات دوسروں سے زیادہ تھے، پھر پنجاب میں ہندو اور سکھ بھی تھے۔ اس کی تقسیم کے لیے وہ کب راضی تھے۔ نفع و نقصان کا جایزہ تو سبھی کا لینا تھا۔ بنگال کے لوگوں کو اس تباہی سے بچانے کا خیال بہت دیر میں آیا۔ اب کہ فیصلے کا وقت گزر چکا تھا۔ پنجاب کے اتحاد کے فیصلے کا وقت بھی گزر چکا تھا۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تب بھی ناکامی کا خطرہ موجود تھا۔ ہندو سکھ اور مسلمانوں میں نفرتیں اور دشمنیاں اتنی بڑھ چکی تھیں کہ مار دھاڑ کے سوا کوئی کسی کی بات سننے کے لیے تیار نہ تھا، فراغ دلی کون دکھاتا اور بلند خیالی سے کون کہتا اور کون سنتا، نتیجہ ناکامی ہی نکلتا۔ لیکن دلوں کے انقلاب اور رایوں کی تبدیلی کے امکان سے تو انکار نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اگر ایسا ہو جاتا تو غور کیجیے کہ قوم کتنی تباہیوں سے بچ جاتی؟

۱۶/اگست ۱۹۴۶ء کے یوم نفیرِ پاکستان قیام پاکستان اور اس کے بعد تک بنگال و بہار، یو پی و دہلی اور پنجاب، سرحد و سندھ کے لاکھوں افراد قتل ہوئے، اغوا ہوئے، آبادیاں تباہ ہوئیں، کئی سو ریاستیں مٹ گئیں، سرحدوں کے مسایل پیدا ہوئے، پنجاب میں پانی بجلی کے لاینحل مسایل نے سر اٹھایا۔ کشمیر کا معاملہ، سو مسئلوں کا ایک مسئلہ ہے۔ آپس کی نفرتوں اور دشمنیوں نے انسانیت کا قتل عام کیا، ہر لمحہ زندگی کی بے چینیوں اور خطرات نے امن و سکون کو تہ و بالا کر دیا۔ اگر بنگال و پنجاب کے مسایل یکساں اصول اور عوام کے مفاد اور امن و سکون کی بنیاد پر طے پا جاتے تو یہ تباہی و بربادی کیوں ہوتی؟

بنگال کی عدم تقسیم اور آزادی کے مسئلے پر جناح صاحب نے اس حقیقت کو بالکل

فراموش کر دیا کہ وہ غیر منقسم اور آزاد ہو کر ہندستان میں شامل ہونے کا فیصلہ بھی کر سکتا ہے۔ پھر پاکستان سے اس کے دوستانہ مراسم کی صورت کیا ہو گی اور پاکستان کے لیے مسلم اکثریت کے علاقوں کی مانگ کے اصول کی کیا اہمیت باقی رہ جائے گی اور وہ دنیا کو کیا منہ دکھائیں گے؟ اب اگر غیر منقسم آزاد بنگال کے تصور اور جناح صاحب کے اس سے اتفاق، رضامندی و خوشی اور اس کے اصل موجبات کا علم ہو گیا تھا تو اسی سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ وہ اپنے مطالبۂ پاکستان میں خود کتنے مخلص تھے؟

جیسا کہ سہروردی صاحب ماؤنٹ بیٹن سے اپنی گفتگو میں کہہ چکے تھے کہ ''بنگال کا پاکستان میں شامل ہونا لازمی نہیں! اگر وہ متحد رہے!''

(دیکھیے! اگلے صفحات میں درج ہونے والے ''ڈاکومنٹ نمبر ۲۲۷)

حواشی: مذکورۂ بالا نمبر ۱ تا ۵ حوالوں کے مصادر بہ ترتیب حسب ذیل ہیں:

(۱) دی گریٹ ڈیوائڈ، ایچ وی ہڈسن، آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، کراچی: ۱۹۶۹ء، ص ۲۴۶

(۲) ٹرانسفر آف پاور: صفحہ ۵۳-۴۵۲، جلد دہم جناح اور وائسرائے کی ملاقات ۲۶/اپریل ۱۹۴۷ء کا ریکارڈ

(۳) ظہورِ پاکستان، (چودھری محمد علی): لاہور ۲، ۱۹۷۲ء، ص ۱۸۶)

(۴) ''دی ہندو'' پارتھا سارتھی، ص ۶۴۹، بحوالہ وول پرٹ صفحہ ۳۲۰ (اب یہ کتاب پاکستان ہی میں چھپ گئی ہے)

(۵) ٹرانسفر آف پاور صفحہ ۸۴-۲۸۳ جلد ہفتم۔ ۱۶/اپریل ۱۹۴۶ء

(۶) دی گریٹ ڈیوائڈ: ایچ وی ہڈسن، کراچی، آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، ۱۹۶۹ء، ص ۲۳۹)

(۷) ہندستان اپنے حصار میں (ایم جے اکبر): پٹنہ، ص ۳۱۲

باب: ۲

آزاد بنگال تحریک

مقاصد معاہدہ اور خاتمہ

مسلم لیگ کی تحریک کا جو خاتمہ تقسیم کی بنیاد پر ہو رہا تھا، اگرچہ اس کے لیے کوئی کانگریسی یا لیگی راضی نہ تھا، لیکن حالات جس مقام تک آ گئے تھے اس سے کسی کو مفر نہ تھا، لیکن اہل بیت اور اصحاب بصیرت کی ایک جماعت انھیں یا اس کن حالات میں نکل آئی۔

اس مقدمے کے اصولاً دو فریق تھے۔ ایک برٹش استعمار اور دوسرا اہل وطن! لیکن ملک کی دو بڑی قوموں... ہندوؤں اور مسلمانوں کے اختلافات نے انھیں کبھی ایک نہ ہونے دیا۔ دوسرا فریق آل انڈیا کانگریس اور مسلم لیگ کی تنظیموں میں تقسیم ہو گیا تھا۔

اہل بیت اور اصحابِ بصیرت گروہ میں دونوں جماعتوں کے اراکین شامل تھے لیکن اس جماعت کے اپنے منصوبے کو تکمیل تک پہنچانے اور زمین ہموار کرنے کے لیے ضروری حد تک مہلت نہیں ملی۔ لیگ کے رہنما نے اس منصوبے سے اتفاق ظاہر کیا اور کوشش کرنے کی اجازت دے دی تھی لیکن کانگریس کے ارکان کانگریس رہنماؤں کو اپنا ہم خیال بنانے میں ناکام رہے تھے۔ برٹش حکومت کے نمایندے اور تقسیم ملک پر عمل اور آمد کے ذمے دار (ماؤنٹ بیٹن) کو اس سے دل چسپی نہ تھی۔ اس نے آزادی کے اعلان کی حتمی تاریخ سے پہلے مطلوبہ نتیجے پر پہنچ جانے کی شرط لگا دی تھی۔ اس تاریخ تک یہ حاصل بھی نہ ہو سکا تھا۔ بہ ایں وجوہ یہ تحریک کامیابی سے ہم کنار نہ ہو سکی!

اس سلسلے میں سعی کی روداد اور بعض دستاویزات پیش کی جا چکی ہیں لیکن دو اہم باتیں... ایک یہ کہ اس تحریک کا بنیادی مقصد اور پیش نظر فوائد کیا تھے۔ نیز تحریک کے ہر دو قومی کارگزاروں کے مابین کیا معاہدہ قرار پایا تھا؟ یہ داستان محمد مسعود نامی حسین شہید سہروردی کے پرائیویٹ سیکرٹری نے بیان کیا ہے۔ انٹرویو نگار جناب سیّد محمد ذوالقرنین

زیدی محمد مسعود کے بارے میں لکھتے ہیں:

''جناب محمد مسعود صاحب، حسین شہید سہروردی صاحب کے پرائیویٹ سیکرٹری تھے۔ تقسیم ہند تک ان کی خدمات سرانجام دیتے رہے۔ میری ان سے ملاقات پنڈی میں اس وقت ہوئی جب قاید اعظم کا صد سالہ جشن ولادت منایا گیا تھا۔ یہ ملاقات ہوٹل انٹر کانٹی نینٹل میں ہوئی تھی۔ دسمبر ۱۹۷۶ء کی یہ بات جس کا حال نذرِ قارئین کرتا ہوں۔

جناب زیدی صاحب لکھتے ہیں:

''جناب مسعود صاحب نے متحدہ بنگال کی تحریک پر روشنی ڈالتے ہوئے فرمایا کہ اس تحریک میں سہروردی صاحب کے ہم نوا کچھ مسلم لیگی رفقائے کار بھی تھے جس میں فضل الرحمٰن اور ابوالہاشم صاحب نمایاں تھے۔ ان کے علاوہ اور بہت سے لوگ تھے۔ ادھر بنگال کانگریس پارٹی میں کرن شنکر رائے صاحب تھے جو بنگال کانگریس پارلیمانی پارٹی کے لیڈر تھے۔ سہروردی صاحب کے ان کے ساتھ پرانے تعلقات تھے۔ لہٰذا ان ہر دو حضرات نے بیٹھ کر بات کی جس میں اور حضرات بھی شریک تھے۔ جناب سرت چندر بوس بھی شامل تھے۔ یہ تحریک اس وقت زیادہ قوی ہوگئی جب بنگال کو تقسیم کرنے کا مسئلہ پیدا ہوا، دونوں طرف ایسے لوگ تھے جو بنگال کی تقسیم کو پسند نہیں کرتے تھے۔ ان حضرات کے سامنے یہ مسئلہ تھا کہ اس تقسیم کو کس طرح روکا جائے۔ ہندوؤں کی اپنی وجوہات تھیں اور مسلمانوں کے اپنے مصالح! مگر شایاما پرشاد مکرجی صاحب جو کہ مہاسبھا کے لیڈر تھے، اس تحریک کے سخت مخالف تھے۔

جب تقسیم کی تحریک تیز ہونے لگی تو اس وقت سہروردی صاحب اور ان حضرات کے درمیان ایک معاہدہ ہو گیا کہ بنگال تقسیم نہ ہو بلکہ خود مختار، آزاد ایک علیحدہ ریاست ہو جائے۔

ان لوگوں سے معاہدہ کرنے کے بعد سہروردی صاحب نے دہلی میں قاید اعظم سے آ کر اس مسئلے پر بات چیت کی۔ یہ کوئی ۹ یا ۱۰ اپریل ۱۹۴۷ء کی بات ہے۔ سہروردی صاحب

نے اپنا تمام ذہن کھول کر سارا مسئلہ قایداعظم کے سامنے پیش کیا کہ کس طرح یہ بات مسلمانوں کے لیے مفید ہوگی۔ اس پر قایداعظم نے کہا کہ ''میری دعائیں تمھارے ساتھ ہیں۔ بات چیت کو آگے بڑھاؤ لیکن کسی بات کا اس وقت تک وعدہ نہ کرنا جب تک کہ مجھ سے مشورہ نہ کرلو۔ اس لیے کہ میں یہ بات بتانا چاہتا ہوں سہروردی! کہ کانگریس اس بات پر راضی ہوگی۔ اس کے بعد اسی دن سہروردی صاحب کی ملاقات لیاقت علی خاں صاحب سے اور فضل الرحمٰن صاحب سے ہوئی۔ لیاقت علی خاں نے اس تجویز کو پسند نہیں کیا۔ پھر اسی دورے میں ان کی ملاقات لارڈ ماؤنٹ بیٹن سے ہوئی مگر انھوں نے اس مسئلے پر کوئی کمٹ منٹ نہیں کیا۔

پھر سہروردی صاحب واپس کلکتہ تشریف لائے اور کرن شنکر رائے اور گھوش صاحب دلی گئے۔ دلی سے واپسی پر کرن شنکر رائے صاحب نے بتایا کہ کانگریس اس بات کے لیے راضی نہیں ہے۔ پھر سرت چندر بوس گئے۔ انھوں نے کوشش کی مگر مرکزی کانگریس نے اس تجویز کو ناپسند کیا جس پر حقیقتاً وہ لوگ سرت چندر بوس سے سخت ناراض ہوگئے۔ بس بات وہی رہ گئی۔

اس تجویز پر جب معاہدہ ہوا تھا تو عارضی طور پر ایک دستاویز بھی تیار کی گئی تھی اس میں دس گیارہ شقیں تھیں۔ کم وبیش یہ دستاویز آئرلینڈ کے طرز De Velira کے اعلان پر تیار کی گئی تھی۔ اس دستاویز میں جو نام تجویز کیا گیا تھا وہ خودمختار سوشلسٹ ری پبلک آف بنگال تھا۔ اس وقت بنگال کی آبادی ساٹھ ملین افراد پر مشتمل تھی۔ غیر تقسیم شدہ بنگال کے ذرایع پیداوار بڑے تھے۔ ہر لحاظ سے اس کی اقتصادیات مستحکم ہوتی۔

سہروردی اور دیگر مسلم لیگی حضرات کے سامنے یہ مسئلہ تھا کہ اگر بنگال تقسیم ہو جاتا تو مشرقی بنگال کا علاقہ غیر ترقی یافتہ ہے اور یہاں پر آبادی کی اکثریت ہے زمین بھی اچھی نہیں۔ لہٰذا مسلمانوں کی اکثریت پس ماندہ ہوکر رہ جائے گی۔

دوسری طرف مشرقی بنگال کے ہندوؤں کا بنگال کانگریس پر بڑا کنٹرول تھا۔ ان کے سامنے مسئلہ یہ تھا کہ اگر بنگال تقسیم ہوگیا تو مشرقی بنگال میں ہندوؤں کی حیثیت بہت کمزور

ہو جائے گی۔ مغربی بنگال میں تناسب ہندوؤں کا زیادہ تھا۔ لہٰذا متحدہ بنگال میں اجتماعی حالت اتنی کمزور نہیں ہوگی۔ کیوں کہ ۴۴ فیصد ہندو تھے اور اقتصادی طور پر اور تعلیمی طور پر مسلمانوں سے ہندو بہت آگے تھے۔ اس واسطے ہم ان کو کنٹرول کرلیں گے۔

مسلمان جو تھے ان کے سامنے یہ مسئلہ تھا کہ ابھی ان کی تعداد ۵۴ فیصد ہے۔ آبادی مسلمانوں کی تیزی کے ساتھ بڑھ رہی تھی۔ لہٰذا توقع تھی کہ دس پندرہ سالوں میں آبادی ۶۰ فیصد ہو جائے گی۔ ظاہر ہے کہ وقت کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کی اکثریت زیادہ ہو جائے گی۔ اس طرح مسلمان اپنی اکثریت کے بل بوتے پر طاقت کو اپنے ہاتھ میں رکھ سکیں گے۔ تعلقات پاکستان کے ساتھ بہتر رہیں گے اور ہندستان کے دوسرے مسلمانوں کے ساتھ بھی اچھے رہیں گے۔ اس کا اثر بہار، یوپی، آسام کے لوگوں پر بہتر پڑے گا۔ جدید واقعات نے تو یہ بات ثابت کردی کہ وہ تجویز بہت ہی بہتر ہوتی۔"

(قاید اعظم کے رفقا سے ملاقاتیں: ۹۵-۹۳)

باب: ۳

چند اہم تاریخی ڈاکومنٹس

متعلق آزاد و متحدہ بنگال

(۱)

ڈاکومنٹ نمبر ۲۲۷

انتہائی خفیہ

۲۶/اپریل ۱۹۴۷ء

میں نے (یعنی مسٹر ماؤنٹ بیٹن نے) مسٹر سہروردی سے کہا کہ میں تقسیم کی ہر قسم کا شدید مخالف ہوں۔ میں ہر تجویز پر متحدہ ہندستان کو ترجیح دیتا ہوں۔ اگر میں ہندستان کو متحد رکھنے میں کامیاب نہ ہوسکا تو اس صورت میں میں کابینہ مشن منصوبے پر کام کروں گا۔ اگر مجھے اس میں بھی کامیابی حاصل نہیں ہوئی تو پھر میں فیصلہ صوبوں پر چھوڑ دوں گا۔ میں نے ان کو بتایا کہ مجھ سے پنجاب بنگال اور آسام کی تقسیم کا مطالبہ کیا گیا ہے۔ مجھے ان صوبوں کی تقسیم پر افسوس ہوگا، لیکن اس سے فرار اختیار نہیں کیا جاسکتا۔

مسٹر سہروردی نے مجھے بتایا کہ بنگال کا مسئلہ اس نوعیت کا نہیں ہے بلکہ بنگال کا اس کے ساتھ دور کا بھی واسطہ نہیں ہے۔ لیکن چوں کہ میرے منصوبے میں یہ شامل ہے کہ اس پر عوام کی رائے حاصل کی جائے کہ آیا صوبے کو تقسیم کیا جائے یا نہیں، اور اگر تقسیم نہ کیا جائے تو اس صورت میں پاکستان میں شامل ہوگا یا ہندستان میں یا آزاد رہنا پسند کرے گا۔ اس لیے وہ مجھے یہ بتانا چاہتے تھے کہ اگر ان کو مہلت دی جائے تو انھیں پورا یقین تھا کہ وہ بنگال کو متحد رکھنے میں کامیاب ہوسکیں گے۔ انھوں نے مجھے یہ بھی بتایا کہ وہ مسٹر جناح کو بھی اس پر راضی کرسکتے ہیں کہ بنگال کا پاکستان میں شامل ہونا لازمی نہیں، اگر وہ متحد رہے۔

میں نے ان سے کہا یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ حال آں کہ میں اس کے خلاف ہوں کہ

ہندستان کو کئی حصوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ میرا خیال ہے کہ بنگال کو تقسیم کرنے کی بجائے ایک اقتصادی وحدت کے طور پر قایم رہنے دیا جائے تو بہت بہتر ہوگا۔

میں نے ان سے استفسار کیا کہ آیا وہ بنگال کے لیے علاحدہ فوج کا مطالبہ بھی کریں گے؟ انھوں نے نہایت زوردار طور پر ''ہاں'' میں جواب دیا۔ میں نے ان کی توجہ اس نکتے کی طرف مبذول کرائی کہ فوج کو دو حصوں میں تقسیم کرنے یا اسے قومیانے میں زبردست مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا اور یہ دشواریاں اس صورت میں مزید بڑھ جائیں گی اگر فوج کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا اور جب ہم جون ۱۹۴۸ء میں ہندستان سے رخصت ہو جائیں گے تو اس کے بعد اس کام کے لیے کم از کم پانچ سال کی مدت درکار ہوگی، اس اثنا میں ان کو پورے ہندستان کے لیے ایک ڈیفنس ہیڈ کوارٹر پر انحصار کرنا پڑے گا۔ مسٹر سہروردی کو یہ منصوبہ پسند نہیں آیا اور مجھے ایسا معلوم ہوا کہ وہ فوج کی تقسیم کو بہت آسان کام سمجھتے ہیں۔ میں نے ان کو یقین دلایا کہ ان کا تاثر قطعاً درست نہیں اور میں جب تک یہاں موجود ہوں فوج کو کسی حالت میں بھی تقسیم نہیں ہونے دوں گا۔

تب انھوں نے مجھ سے کہا کہ بنگال کی فوج کی تشکیل میں برطانوی فوجی افسران مددگار ثابت ہوں گے۔ میں نے اس کے جواب میں کہا کہ یہ کس طرح ہو سکتا ہے، جب کہ ہندستان دولت مشترکہ میں شامل ہی نہیں رہے گا۔ انھوں نے مجھے جواب دیا ''میں آپ سے معذرت خواہ ہوں، بنگال ہر حال میں دولت مشترکہ میں شامل ہونے کا ارادہ رکھتا ہے۔'' میں نے ان سے کہا کہ میرا خیال ہے کہ دولت مشترکہ میں اس طرح سے شامل رہنا معقول نہیں لگتا۔ میں ذاتی طور پر بھی اس کے خلاف ہوں کہ ہندستان کا کوئی حصہ تو دولت مشترکہ میں شامل ہو اور پورا ہندستان اس میں شامل نہ ہو، کیوں کہ خانہ جنگی کی صورت میں برطانیہ کو ایک فریق کی مدد کرنا ہوگی۔ اس پر انھوں نے جواب دیا: ''میں نہیں سمجھتا آپ کس طرح ہمیں باہر پھینک سکتے ہیں، ہم نے کون سا جرم کیا ہے، جو آپ ہمیں باہر نکالنے پر مصر ہیں؟'' میں نے اعتراف کیا کہ ان کا موقف مضبوط ہے، لیکن اس کے باوجود میں اس کی تائید نہیں کروں گا۔ بہر حال وقت آنے پر ایسے واقعات میں حکومت برطانیہ کے علم میں

ضرور لاؤں گا۔

مسٹر سہروردی نے مجھ سے کہا کہ انھیں بنگال کو غیر منقسم اور آزاد رکھنے کے لیے زیادہ سے زیادہ وقت درکار ہوگا۔ میں نے ان سے پوچھا کہ انھیں کم ازکم کتنا وقت چاہیے؟ تو انھوں نے جواب دیا: کم ازکم دو ماہ اس کام کے لیے انتہائی ضروری ہوں گے! میں نے انھیں بتایا کہ یہ تو بہت زیادہ وقت ہے! کیوں ایک ماہ کے اندر اندر میں فیصلہ کرلوں گا اس کے ایک ہفتے بعد ان صوبوں میں رائے شماری ہوگی جنھیں تقسیم کرنا مقصود نہیں ہے اور جن صوبوں کو تقسیم کیا جانا ہے، ان میں تین ہفتوں کے اندر رائے شماری ہوگی۔ انھوں نے مجھ سے درخواست کی کہ نومبر تک تقسیم کا فیصلہ نہ کیا جائے۔ میں نے انھیں جواب دیا کہ اگر ہم نے اس میں زیادہ تاخیر کی تو تقسیم کا کام مکمل نہیں ہونے پائے گا کیوں کہ ہمیں جون ۱۹۴۸ء میں یہاں سے رخصت ہوجانا ہے۔

میں نے مسٹر سہروردی سے کہا کہ وہ تقسیم بنگال کے مسئلے پر اپنا مفروضہ لارڈ اسمے کو بتادیں تاکہ اگر رائے شماری کی نوبت آئے تو اسے کام میں لایا جاسکے۔ میں نے ان کو بتایا کہ میں ہنگامی صورت حال میں ان سے ملاقات کے لیے ہر وقت تیار رہوں گا۔

(۲)

ڈاکومنٹ نمبر ۲۲۸

ملاقات کا دوسرا حصہ، لارڈ اسمے سے تبادلۂ خیالات؛

"ہم نے مسٹر سہروردی سے ملاقات کی ہے۔ جو ابھی آپ سے ملاقات کے بعد آئے۔ ہمارا خیال ہے کہ انھوں نے آپ کو سمجھنے میں زبردست لغزش کھائی ہے۔ کیوں کہ انھوں نے اپنی گفتگو کے آغاز میں کچھ اس طرح کا اظہار کیا کہ معلوم ہوتا تھا کہ گویا آپ نے ان سے کہا ہے کہ اگر مسٹر جناح بنگال علاحدہ ریاست بنانے اور پاکستان میں شامل نہ کرنے کے لیے تیار ہوجائیں اور اگر مخلوط انتخاب کا اصول تسلیم کرلیا جائے تو آپ کی پوری کوشش ہوگی کہ بنگال کو ایک الگ ریاست کے طور پر قایم رکھا جائے۔

۲) ہم نے مسٹر سہروردی سے کہا کہ انھوں نے آپ کی گفتگو کا غلط ادراک کیا ہے۔ کیوں کہ اب تک تو ریاستوں کو الگ قایم کرنے کا مسئلہ دور کی بات ہے، کیوں کہ آپ کا مصمم ارادہ ہے کہ ہندستان کا اتحاد قایم رہے اور اگر یہ کسی طرح بھی ممکن نہ ہوا تو اس صورت میں آپ صوبے کے عوام کی خواہشات جاننا چاہیں گے جو وہ اپنے منتخب نمایندوں کے ذریعے ظاہر کریں گے تاکہ اس کی روشنی میں تقسیم کی جاسکے۔

۳) مسٹر سہروردی نے اپنا سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوے کہا کہ آپ نے ان سے کہا ہے کہ ان کی طرف سے بنگال کی آئین ساز اسمبلی کا موقف منصوبے کے اعلان کے بعد ایک ماہ کے اندر لازمی طور پر آپ کو معلوم ہو جانا چاہیے۔ یعنی جون کے اختتام تک۔ انھیں اس پر اس بنا پر تشویش تھی کہ انھیں وقت نہیں ملے گا کہ وہ حزب اختلاف کے ساتھ گفتگو کرسکیں اور اسے سمجھا سکیں کہ غیر منقسم بنگال کس قدر زیادہ سود مند ہے۔

۴) ہم نے انھیں بتایا کہ ہمارا خیال یہ نہیں ہے کہ آپ کی (یعنی ماؤنٹ بیٹن کی) دی ہوئی تاریخ قطعی اور بے لچک ہے اور اس سلسلے میں کئی مراحل سے گزرنا ہوگا اور مشرقی بنگال اور مغربی بنگال کے عوام کی رائے جاننا ہوگی۔ ہوسکتا ہے کہ مذکورہ تاریخ ۳۱ر جولائی یا پھر ۳۱ر اگست تک بڑھا دی جائے۔

۵) تاریخ کے تعین کی بابت یہ اظہار یہ ہمارے لیے بالکل نیا تصور تھا۔ اس لیے ہم نے ان سے کہا کہ صوبوں سے ان کی رائے دریافت کرنے کی تاریخ کا تذکرہ اعلان آزادی میں کر دیا جائے گا۔

کیا میں یہ نکتہ اگلی اسٹاف میٹنگ میں اٹھا سکتا ہوں؟

۶) طویل گفتگو کے بعد طے پایا کہ مسٹر سہروردی اپنے نوٹ اور نقشہ جات ہمیں ارسال کردیں۔ اگر ضرورت محسوس ہوئی تو ہم پھر ملاقات کرلیں گے۔

(ماؤنٹ بیٹن کا نوٹ)

''میں مسٹر سہروردی کے ساتھ اپنی بات چیت کا ریکارڈ ساتھ منسلک کر رہا ہوں۔ جس سے آپ کو معلوم ہوگا کہ مسٹر سہروردی میں بنگال کو علاحدہ ریاست بنانے اور ہندستان میں

شامل نہ کرنے کے لیے کتنا جوش و جذبہ تھا جو کہ سب غلط فہمی کا شکار ہونے کے سبب ہو سکتا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ مذاکرات کس قدر خطرناک ثابت ہو سکتے ہیں، جب کہ کوئی شخص کسی نکتے کو پوری طرح سمجھ نہیں پاتا...

ماؤنٹ بیٹن آف برما

۲۶/اپریل ۱۹۴۷ء

(۳)

ڈاکومنٹ نمبر ۲۲۹

ماؤنٹ بیٹن اور مسٹر جناح کے درمیان ملاقات کا ریکارڈ!

انتہائی خفیہ

۲۶/اپریل ۱۹۴۷ء

وائسرائے نے مسٹر سہروردی کے ساتھ ملاقات سے مسٹر جناح کو آگاہ کیا اور انھیں بتایا کہ میں مسٹر سہروردی کو بتا چکا ہوں۔ میں تقسیم کی کسی بھی صورت کا شدید مخالف ہوں، یہ خواہ ہندستان کی تقسیم ہو یا صوبوں کی، مسٹر سہروردی نے اس کے جواب میں کہا کہ بنگال کے معاملے میں ان کا خیال ہے کہ وہ بنگال کو اس شرط پر متحد رکھنے میں کامیاب ہو سکتے ہیں کہ یہ نہ تو پاکستان میں شامل ہو اور نہ ہی ہندستان میں۔ میں نے مسٹر جناح سے سیدھا سوال کیا کہ بنگال کو متحد رکھنے اور پاکستان سے باہر رکھنے کے مسئلے پر ان کا نقطۂ نظر کیا ہے؟

انھوں نے بلا جھجک جواب دیا:

''مجھے اس سے خوشی ہوگی کہ کلکتہ کے بغیر بنگال کو حاصل کرنے کا کیا فایدہ ہے۔ بہتر ہوگا کہ بنگال متحد رہے اور آزادی حاصل کرے۔ مجھے یقین ہے کہ بنگال ہم سے دوستانہ مراسم رکھے گا۔''

تب میں نے ان سے کہا کہ مسٹر سہروردی نے کہا ہے کہ اگر بنگال متحد رہتا ہے اور آزادی حاصل کرتا ہے تو اس کی خواہش ہوگی کہ وہ برطانوی دولت مشترکہ میں شامل رہے۔ مسٹر جناح نے جواب دیا: 'بالکل اسی طرح جس طرح میں نے آپ کو بتایا ہے کہ پاکستان

دولت مشترکہ میں شامل رہنے کا خواہاں ہوگا۔‘‘میں نے ان کی تصحیح کرتے ہوئے کہا: ’’نہیں، آپ نے مجھ سے کہا تھا کہ اگر پاکستان کی حکومت قایم ہوگی تو اس کا پہلا اقدام یہ ہوگا کہ وہ دولت مشترکہ میں شمولیت کی درخواست کرے گی۔‘‘انھوں نے میری گفتگو کی تصحیح کی اور کہا کہ میں نے بالکل غلط سمجھا ہے، سوال دولت مشترکہ میں شامل ہونے کے لیے درخواست گزارنے کا نہیں ہے، بلکہ اصل مسئلہ تو یہ ہے کہ ہمیں کہیں ٹھوکر مار کر دولت مشترکہ سے باہر نہ نکال پھینکا جائے۔ انھوں نے کہا کہ مسٹر چرچل نے ان سے کہا تھا: ’’آپ کو ثابت قدم رہنا چاہیے اور اپنے حقوق کا مطالبہ کرتے رہنا چاہیے کہ ہمیں دولت مشترکہ سے باہر نہ پھینکا جائے تب یقینی امر ہے کہ آپ کی درخواست قبول کرلی جائے گی۔ برطانیہ کبھی بھی اس بات کو پسند نہیں کرے گا کہ اپنے وفادار ارکان کو دولتِ مشترکہ سے باہر نکال دے۔‘‘

مسٹر جناح نے مجھے بتایا کہ انھوں نے سر اسٹیفورڈ کرپس سے استفسار کیا تھا کہ انتقال اقتدار کے لیے کس نوعیت کی قانون سازی ہونی چاہیے؟ مسٹر جناح نے استفسار کیا (یعنی مزید وضاحت چاہی) کہ کیا وہ اس پر بھروسا کر سکتے ہیں کہ یہ قانون سازی اسی طرح کی ہوگی کہ ہندستان یا اس کے حصوں کو وہی مراعات حاصل ہوں گی جو دولت مشترکہ کے دیگر ممالک کو ہیں۔ یعنی اگر وہ چاہیں تو دولت مشترکہ سے علاحدگی اختیار کرلیں اور اگر وہ علاحدہ ہونے کا اعلان نہ کریں تو اس صورت میں وہ بدستور دولت مشترکہ کے رکن رہیں گے۔ سر اسٹیفورڈ کرپس نے جواب دیا تھا کہ فی الوقت وہ اس سوال کا جواب دینے کی پوزیشن میں نہیں ہیں۔

مسٹر جناح نے کہا: ’’اس طرح انھوں نے ایک اچھے قانون دان کی طرح جواب دینے سے گریز کیا۔ لیکن یہ بالکل واضح ہے کہ آپ ٹھوکر مار کر ہمیں باہر نہیں نکال سکتے۔ ایسی کوئی روایت موجود نہیں ہے کہ سلطنت کے حصوں کو ان کی منشا کے بغیر دولت مشترکہ سے نکال دیا جائے۔‘‘

آخر میں میں نے ایک مرتبہ پھر کابینہ مشن منصوبے کا ذکر چھیڑا جو انھیں بڑا ناگوار گزرا۔

میں نے ان سے کہا ''آپ کو کابینہ مشن منصوبے پر یہ اعتراض ہے کہ مرکزی حکومت کو کانگریس اپنے ووٹوں کی اکثریت سے چلائے گی اور حکومت گروپ ''بی'' اور ''سی'' پر اقتصادی اور فوجی دباؤ ڈال کر ان کے مفادات کو نقصان پہنچائے گی۔ اس منصوبے پر یہی آپ کا اعتراض ہے نا؟''

میری باتیں سن کر انھوں نے اپنا سر اثبات میں ہلایا۔ تب میں نے ان سے کہا: ''میں نے اس پر غور کیا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ کابینہ مشن منصوبے میں یہ شق موجود ہے جس کے ذریعے آئین ساز اسمبلی میں کسی بھی بڑے فرقے وارانہ مسئلے پر دو حصوں میں رائے شماری ہوگی اور کوئی ایسی قرارداد اس وقت تک منظور نہیں ہو سکے گی، جب تک اسے دونوں فریقوں کے حاضر ممبروں کی اکثریت کی حمایت حاصل نہ ہو۔ میں نے انھیں بتایا کہ اس صورت حال میں انھیں وہی تحفظ مل جاتا ہے، جسے وہ پاکستان بنا کر مرکزی ڈیفنس کونسل میں حاصل کریں گے۔ یہ سن کر مسٹر جناح نے پرجوش لہجے میں کہا نہیں! منصوبے میں کہا گیا ہے کہ کسی بھی بڑے فرقے وارانہ مسئلے پر اختلاف رائے کی صورت میں فیصلہ کورٹ کرے گا۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ آئین ساز اسمبلی کا صدر ان کے فیصلے پر عمل درآمد کا پابند نہ ہوگا۔'' میں نے ان سے پوچھا کہ جب چیف جسٹس کے فیصلے کی پابندی نہیں ہوگی تو اس صورت میں اس کا رویہ کیا ہوگا؟ انھوں نے جواب دیا کہ آیندہ کے لیے فیڈرل کورٹ اس سلسلے میں اپنی رائے زنی سے انکار کر دے گا۔ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ کانگریس کے لیے اپنے اکثریتی ووٹ کی بنا پر من مانی کرنے کے لیے میدان کھلا ہوگا۔

انھوں نے کہا: درحقیقت کانگریس کے رہنما اس قدر بددیانت، چالاک اور مکار ہیں اور اس قدر جنون میں مبتلا ہیں کہ وہ مسلم لیگ کو نیست و نابود کر دینا چاہتے ہیں۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کی خاطر وہ ہر قسم کا قدم اٹھانے کے لیے تیار ہیں۔ ان حالات میں مسئلے کا ایک ہی حل رہ جاتا ہے کہ پاکستان کو برطانوی

دولت مشترکہ میں آزاد قوم کی حیثیت میں شامل ہونے کا موقع فراہم کیا جائے،
جس کے پاس اس کی اپنی فوج ہو اور اس بنیاد پر وہ مرکزی کونسل میں اپنے
مسایل مدلل طور پر پیش کر سکے۔''

وایسرائے کہتا ہے کہ میں ان کو اپنا فیصلہ تبدیل کرنے پر آمادہ نہیں کر سکا۔ انھوں نے مجھ
سے التجا کی کہ آیندہ انھیں کابینہ مشن منصوبے پر غور کرنے کے لیے نہ کہا جائے!

(تحریکِ پاکستان اور انتقالِ اقتدار: مرتبہ محمد فاروق قریشی، ص ۱۵-۲۰۹)

حصہ ششم

(انتظاریہ)

(۱)

ماؤنٹ بیٹن-ایک فریبی اور فتنہ انگیز!

(۱)

ماؤنٹ بیٹن میں جھوٹ اور فریب بھرا ہوا تھا۔ اس نے اپنے عزائم اور مقاصد پر، جس کے لیے وہ بھیجا گیا تھا، پردہ ڈال رکھا تھا۔ اس نے بہت سی باتیں ملک کے رہنماؤں سے، اپنے عملے کے ارکان سے، انگریز گورنروں اور فوج کے اعلیٰ عہدے داروں تک سے چھپائی تھیں۔ حال آں کہ وہ باتیں انھیں اعتماد میں لے کر بتانی چاہیے تھیں تا کہ تقسیم اور اس کے حوالے سے وہ ذہنی طور پر تیار اور ضروری انتظامات کے لیے مستعد رہیں۔ لیکن اُس نے ایسا نہیں کیا!

کابینہ مشن کی واپسی کے بعد ملک کی تقسیم کا فیصلہ کر لیا گیا تھا اور ماؤنٹ بیٹن تقسیم کا منصوبہ لے کر ہندستان آیا تھا۔ اس نے ملک کے رہنماؤں سے کابینہ مشن پلان پر متفق ہو جانے کا ناٹک رچایا لیکن پس پردہ وہ لیگ کے تقسیم کے منصوبے کے برخلاف اپنے منصوبے پر لیگ اور کانگریس کے رہنماؤں کو آمادہ کرنے کی مہم چلا رہا تھا۔ کانگریس کو توجہ دلائی کہ تقسیم کی بنیاد صوبائی حدود کے بجائے ضلعی حدود کو بنایا جائے۔ لیگ کو ڈرایا گیا کہ اگر اس اصول کو تسلیم نہ کیا گیا تو پاکستان کے قیام کا موقعہ ہاتھ سے نکل جائے گا۔ جناح صاحب سے خطرہ تھا کہ بچھائے ہوئے جال میں ان کا پھنسنا مشکل ہے۔ چناں چہ:

- لندن سے تقسیم کی منظوری لینے سے پہلے ان سے رضا مندی کی تحریر لی گئی۔
- جناح صاحب سے منصوبہ منظور کرانے کے لیے چرچل نے ماؤنٹ بیٹن کو مشورہ دیا تھا کہ انھیں پاکستان کے عمل میں برٹش ماہرین کے تعاون سے محروم کر دینے کی دھمکی دی جائے۔ وہ جانتے ہیں کہ ان کے بغیر وہ پاکستان کو چلا نہیں سکیں گے۔ [(۱)]

---

(۱) جناح صاحب نے ایسا ہی کیا۔ پنجاب، سرحد اور سندھ کے گورنروں، فوج کے سربراہ اور بہت سے دوسرے اہم منصبوں پر انگریزوں کو مقرر کر دیا۔

- اس داؤں کی ناکامی کی صورت میں مسٹر چرچل سے جناح صاحب کے نام خط لکھوایا گیا اور اگر اس طرح بھی وہ قابو میں نہ آئیں تو
- ان کی استقامت کو ضد اور ضد کو دیوانگی اور اختلال ذہنی ثابت کر کے میدان سیاست سے انھیں کک آوٹ کر دیا جائے!

جب ماؤنٹ بیٹن کو لارڈ ویول کی جگہ وایسرائے بنانے کا فیصلہ کیا گیا تھا تو انھیں چرچل نے یہ سبق پڑھا دیا تھا کہ:

> ''مسلمانوں، شیڈول کاسٹ اور راجوں کو اعلیٰ ذات کے ہندوؤں کے پنجوں سے بچائے رکھنا اور کانگریس کی مضبوط گرفت سے آزاد کروانا۔'' (پٹیل اور ہندستانی مسلمان: ص ۸۲)
>
> یہ سبق چرچل کا دیا ہوا تھا کہ آل انڈیا کانگریس تمام ہندستان کی نمایندگی نہیں کرتی، بلکہ یہ ہندو عوام کی نمایندہ جماعت بھی نہیں ہے۔'' (ایضا: ص ۶۶-۱۶۵)

جناح کے ساتھ چرچل کے خاص تعلقات تھے۔ وہ بہت خفیہ طور پر خط و کتابت کے ذریعے رابطہ قایم رکھے ہوئے تھے۔ چرچل کا جناح صاحب کے نام لکھا ہوا حسب ذیل خط اس بات کا ثبوت ہے۔ نومبر ۱۹۴۶ء میں جب جناح، کانگریس اور لیگ کے رہنماؤں نے لندن کا سفر کیا تھا تو وہ مسٹر چرچل سے ملے تھے اور بات چیت کی تھی۔ چرچل نے بات چیت کی اہمیت کا اعتراف کیا ہے اور انھوں نے جناح صاحب کی دعوت میں شریک ہونا مصلحت کے خلاف سمجھتے ہوئے معذرت کی تھی اور خط و کتابت کے لیے خفیہ پتا اور نام معلوم کیا تھا۔ خط یہ ہے:[1]

---

(۱) یہ خط رفیق زکریا کے حوالے سے ان کی تالیف سے نقل کیا گیا ہے۔

نومبر ۱۹۴۶ء میں لارڈ ایٹلی وزیر اعظم برطانیہ نے کانگریس اور لیگ کے رہنماؤں اور اقلیت کے ایک نمایندے کو وایسرائے ہند لارڈ ویول کے ساتھ لندن آنے کی دعوت دی تھی۔ ۲؍دسمبر کو مدعوین لندن

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر......)

''ڈیر مسٹر جناح!

۱۲ر نومبر (۱۹۴۶ء) کو آپ کے ساتھ ظہرانہ کھانے کی دعوت کو میں خوشی سے قبول کر لیتا لیکن میں سمجھتا ہوں کہ موجودہ حالات میں ہمارے لیے یہی بہتر ہوگا کہ ہم اپنے تعلقات کو لوگوں پر ظاہر نہ ہونے دیں۔

اس دن کی ہماری بات چیت کی میں قدر کرتا ہوں۔ میں اپنا پتا اس کے ساتھ منسلک کر رہا ہوں۔ آپ ہندستان سے میرے لیے کوئی پیغام بھیجنا چاہیں تو لوگوں کے علم میں لائے بغیر اس پتے پر ٹیلی گرام بھیج سکتے ہیں۔ میں اپنے خطوط پر ''گلمیٹ'' کے نام سے دستخط کروں گا۔ شاید آپ بھی مجھے اپنے پتے سے آگاہ کریں گے، جس پر میں آپ کو ٹیلی گرام بھیج سکوں۔ آپ کا خفیہ نام کیا ہوگا؟ مجھ پر بھروسا رکھیے۔

آپ کا مخلص

(شرح دستخط) ونسٹن چرچل''[1]

پہنچے۔ ۴ر دسمبر کو میٹنگ کا اہتمام کیا گیا۔ لیکن میٹنگ کسی نتیجے تک پہنچنے میں ناکام رہی اور کوئی متفقہ فیصلہ نہ ہوسکا۔ اسی لیے کوئی بلیٹن شایع ہوا اور نہ کوئی بیان اخبارات کو دیا گیا۔

اسی سفر کے موقع پر مسلم لیگ کے سربراہ نے چند منتخب ناموران وقت اور اپنے احباب کو ۱۲ر دسمبر کو ظہرانہ دیا تھا۔ مدعووین میں مسٹر چرچل بھی تھے۔ لیکن انھوں نے بربنائے تعلقات اور غلط فہمیاں پھیلنے کے خوف سے ظہرانے میں شرکت سے معذرت کر لی تھی۔ لیکن ان کا یہ خط دونوں رہنماؤں کے خصوصی تعلقات کا ثبوت تاریخ میں یادگار رہ گیا۔

(۱) Seshadri, H.V., The Tragic Story of Partition, p 181

(۲)

پنڈت نہرو اور سردار پٹیل نے فرقہ وارانہ تشدد کا خدشہ ظاہر کیا تھا لیکن ماؤنٹ بیٹن نے ان دونوں کو تیقن دیا تھا کہ:

''میں خود اس بات کا انتظام کروں گا کہ خون خرابہ اور فساد نہ ہونے پائے۔ میں ایک سپاہی ہوں کوئی انتظامی عہدے دار نہیں۔ اگر کہیں احتجاجی تحریک کی جھلک بھی نظر آئی تو میں اُسے شروع ہونے سے پہلے ہی قابو میں کرلوں گا۔ میں ہتھیار بند پولیس کو ہی نہیں بلکہ برّی اور ہوائی فوج کو یہ حکم دوں گا کہ وہ اس تباہی کو روکیں۔ جو شخص بھی شرارت سے ماحول کو بگاڑنے کی کوشش کرے گا، میں اُس کے خلاف ٹینکوں اور ہوائی جہازوں کا استعمال کر کے اس شورش کو ختم کردوں گا۔''(۱)

مولانا آزاد نے بھی اسی خطرے کی طرف ماؤنٹ بیٹن کو توجہ دلائی تھی اور اس کو جواب دیا تھا۔ وہ فرماتے ہیں:

''میں نے ماؤنٹ بیٹن سے یہ بھی کہا کہ وہ تقسیم کے ممکن نتائج کو بھی ذہن میں رکھیں، تقسیم کے بغیر ہی کلکتے، نواکھالی، بہار، بمبئی اور پنجاب میں فسادات ہوئے ہیں۔ ہندوؤں نے مسلمانوں پر، مسلمانوں نے ہندوؤں پر حملے کیے ہیں۔ اس فضا میں اگر ملک تقسیم ہوا تو خون کی ندیاں بہہ جائیں گی اور اس خون خرابے کی ذمہ داری انگریزوں پر ہوگی؟''

''بغیر کسی تامل کے ماؤنٹ بیٹن نے فوراً جواب دیا: ''میں اس ایک معاملے میں تو آپ کو پورا یقین دلانا چاہتا ہوں کہ فسادات اور خوں ریزی بالکل نہیں ہونے دوں گا۔ میں سپاہی ہوں، ایک بار جب تقسیم اصولاً مان لی جائے گی تو میں احکامات جاری کردوں گا کہ ملک میں کہیں فرقہ وارانہ فساد نہ ہونے پائیں اور

---

(۱) سردار پٹیل اور ہندستانی مسلمان: ۷-۸۶

اگر اس قسم کی کوئی تحریک ہوئی تو میں سخت سے سخت قدم اٹھاؤں گا اور ابتدا ہی میں فساد کو دبا دوں گا۔اس کام کے لیے میں فوجی پولیس پر بھی بھروسا نہیں کروں گا، بلکہ میں بلاواسطہ فوج اور ہوائی بیڑے سے کام لوں گا اور ٹینک اور ہوائی جہازوں کے ذریعے شرارت کرنے والوں کو کچل ڈالوں گا۔''

''لارڈ ماؤنٹ بیٹن سے گفتگو کا میرے اوپر یہ اثر ہوا کہ وہ ذہن میں تقسیم کا کوئی صاف نقشہ لے کر لندن نہیں جارہے ہیں اور انھوں نے کیبنٹ پلان کو بالائے طاق نہیں رکھ دیا ہے۔ بعد کے واقعات نے مجھے اپنی رائے بدلنے پر مجبور کیا۔ جس طریقے سے انھوں نے بعد کو عمل کیا اس سے یہ اندازہ ہوتا تھا کہ وہ فیصلہ کر چکے تھے اور لندن اسی نیت سے جارہے تھے کہ برطانوی کابینہ کو ہندستان کی تقسیم مان لینے پر آمادہ کرسکیں۔''

ماؤنٹ بیٹن نے مولانا آزاد کو جو یقین دلایا تھا اور جو صورت حال سامنے آئی تھی، اس کے بارے میں فرماتے ہیں:

''ساری دنیا جانتی ہے کہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے بہادرانہ اعلان کا نتیجہ کیا نکلا؟ تقسیم کے وقت ملک کے مختلف حصوں میں خون کی ندیاں بہیں، بے گناہ مردوں، عورتوں اور بچوں کا قتل عام ہوا۔ ہندستانی فوج تقسیم کردی گئی تھی اور بے گناہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے قتل کو روکنے کی کوئی تدبیر نہیں کی جاسکی۔اسی لیے میں نے اس سے پہلے باب میں یہ کہا تھا کہ غالباً لارڈ ویول نے جو بات کہی تھی، وہ ٹھیک تھی۔''[۱]

رفیق زکریا نے نہایت تفصیل سے اس حقیقت کو بیان کیا ہے اور بتایا ہے کہ ماؤنٹ بیٹن نے قتل وغارت گری کے انتظامات سے جان بوجھ کر کس طرح اعراض کیا ہے![۲]

ماؤنٹ بیٹن کی شخصیت، کریکٹر اور اس کے پھیلائے ہوئے فساد پر سب سے زیادہ اور

(۱) انڈیا ونس فریڈم (اُردو)، مرتبہ: ا۔س۔ش، ۱۹۹۱ء (پہلا ایڈیشن)

(۲) تفصیل کے لیے: سردار پٹیل اور ہندستانی مسلمان: ص ۸۸-۸۷

حقیقت پسندانہ روشنی ایچ ایم سیروائی نے اپنی کتاب Partition of India Legent and Reality کے باب نو اور دس میں ڈالی ہے۔ میں نے اپنی مرتبہ انڈیا ونس فریڈم (اُردو) کے حاشیے میں اس کے لب لباب کو پیش کیا تھا۔ اسی کو یہاں نقل کر دیتا ہوں۔ میں نے لکھا تھا:

''اب جو حقایق سامنے آئے ہیں اور سیروائی نے ماؤنٹ بیٹن کے مصنف زیگلر اور ٹرانسفر آف پاور کے حوالے سے اس کے کیریکٹر پر جو بحث کی ہے اس کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ ماؤنٹ بیٹن نہایت برخود غلط، نہایت مغرور، دھوکے باز، بے دھڑک جھوٹ بولنے والا، سازباز کا ماہر، غیر اخلاقی ہتھکنڈے استعمال کرنے سے گریز نہ کرنے والا شخص تھا۔ وہ نہ صرف یہ کہ مسٹر جناح کا شدید دشمن تھا، پاکستان کا بھی سخت دشمن تھا، لیکن سیروائی نے اس بات کی بھی بہ دلایل اور سختی کے ساتھ تردید کی ہے کہ وہ ہندستان کا دوست تھا۔ سیروائی نے اپنی کتاب کے نویں باب میں اس کے اس کیریکٹر پر روشنی ڈالی ہے اور اس کی غلط بیانیوں اور سفید جھوٹ کی بہت سی مثالیں دی ہیں۔ اس نے برطانوی حکومت کو بھی غلط اطلاعات فراہم کیں۔ بروقت اطلاعات نہ دیں، یا حقایق کو چھپایا۔ وہ ایک نہایت مکار اور جھوٹا ڈپلومیٹ تھا۔ اس نے فرقہ وارانہ حالات کو دُرست کرنے پر کوئی توجہ نہ کی۔ پنجاب کے متعدد سرکاری آفیسروں کی اطلاعات اور اصرار کے باوجود کوئی ایسا اقدام نہ کیا کہ فسادات کا سدباب ہو جائے۔ اس نے حالات کو بد سے بدتر ہو جانے کے لیے چھوڑ دیا تھا، ریڈکلف ایوارڈ کو چھپائے رکھا، وقت پر شایع نہ کیا اور اشتعال کو پھیلنے کے لیے نہ صرف چھوڑ دیا تھا بلکہ اغماض و اعراض سے فسادات کی آگ بھڑکانے کا سروسامان کر دیا تھا۔ اس نے مولانا آزاد کے سامنے اور ویسے بھی فسادات کو ٹینکوں، ایرفورس اور فوج کے ذریعے سختی سے دبا دینے کے عزم کا اظہار کیا تھا، لیکن جب وہ اس عزم کا اظہار کر رہا تھا تو وہ یقیناً جانتا تھا کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے۔ سولھویں باب

میں بھی اس کا بیان آیا ہے کہ فوج کے ہندستانی سپاہی اور آفیسرز کو مشرقی پنجاب کے مسلمانوں کو قتل کرنے میں شریک ہونا چاہیے، لیکن برطانوی آفیسروں نے بڑی مشکل سے انھیں روکے رکھا۔ اس کا وہ بیان ایک صریح جھوٹ ہے۔ اس کی پول خود مولانا آزاد کے بیان سے کھل جاتی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ فسادات کی روک تھام کے لیے توپ اور ٹینک تو کجا اپنے قلم تک کو جنبش نہیں دی۔

سیروائی کے مطابق تقسیمِ ملک کے نتیجے میں چھ لاکھ انسان قتل ہوئے اور تقریباً ایک کروڑ چالیس لاکھ انسان ترک وطن کرنے پر مجبور ہوئے تھے۔ یہ اعداد و شمار تقسیم کے فوراً بعد تک کے ہیں۔ اس کے بعد ۱۹۴۸ء سے لے کر ۱۹۵۱ء تک یوپی، بہار وغیرہ سے ترک وطن کا جو سلسلہ اور قتل و غارت گری کا جو بازار گرم رہا اس کے اعداد و شمار اس میں شامل نہیں۔"

رفیق زکریا نے لکھا ہے کہ ماؤنٹ بیٹن نے اس حقیقت کا بعد میں اعتراف کیا تھا کہ اگر کانگریسی رہنماؤں کو اندازہ ہوتا کہ تقسیم کے نتیجے میں یہ تباہی آئے گی تو وہ اس تقسیم کو کبھی قبول نہ کرتے! ان کا اپنے لفظوں میں بیان یہ ہے:

"اگر انھیں یہ اندازہ بھی ہوتا کہ برصغیر کی تقسیم کے اتنے تباہ کن نتائج برآمد ہوں گے تو وہ تقسیم کو کبھی قبول نہ کرتے اور ہندستان ایک متحدہ ملک رہتا۔ تاریخ میں کبھی کسی کے اعتماد کو ایسی ٹھیس نہیں پہنچائی گئی تھی اور نہ اُمیدوں کا ایسا خون کیا گیا تھا۔ سردار پٹیل بھی پنڈت نہرو اور گاندھی جی کی طرح اس صدمے سے نڈھال تھے۔ وہ اپنے آپ کو یہ تسلی دے رہے تھے کہ جسم کے سڑے ہوئے عضو کو کاٹ دینا ہی بہتر ہے لیکن وہ بھول گئے تھے کہ اس طرح جسم کی صورت بھی بگڑ جاتی ہے۔ اس کے بعد زخموں پر مرہم رکھنے سے پہلے ہی لوٹ مار، آتش زنی، جبری زنا اور قتل و غارت گری کی وارداتیں ایسی تیزی سے وقوع پذیر ہونے لگیں کہ کسی کو سنبھلنے کا موقع نہیں مل سکا۔ بہت دنوں بعد پٹیل نے تسلیم کیا تھا کہ علاج تو مرض سے بھی زیادہ خطرناک ثابت ہوا۔ نہ صرف ہندستان کے لیے بلکہ

پاکستان کے لیے بھی، نہ صرف ہندوؤں کے لیے بلکہ مسلمانوں کے لیے بھی!

پٹیل اس بات کو بھول نہیں سکے کہ پاکستان کی تخلیق ایک غلط اقدام تھا۔ یہ اقدام اس حقیقت کو نہیں بدل سکتا کہ ''ہم ایک ناقابلِ تقسیم اکائی تھے۔'' ۸ر اگست ۱۹۴۷ء کو انھوں نے اپنے صحافتی بیان میں واضح کیا تھا کہ ''تم سمندر یا دریاؤں کے پانی کو جدا نہیں کر سکتے۔ جہاں تک مسلمانوں کا سوال ہے تو ان کی جڑیں یہیں ہیں، ان کے مقدس مقامات یہیں ہیں اور ان کے تہذیبی مراکز یہاں ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ وہ پاکستان میں کیا کریں گے۔ وہ زیادہ عرصہ جدا نہیں رہ سکتے۔ وہ بہت جلد دوبارہ ہم سے آملیں گے۔''(۱)

پنڈت نہرو کو بھی کم پچھتاوا نہیں تھا۔ انھوں نے کہا تھا:

''اگر میں ان تباہ کن نتائج کا اندازہ کر پاتا تو ملک کی تقسیم کو کبھی قبول نہ کرتا۔''(۲)

افسوس کی بات یہ ہے کہ نہرو اور پٹیل کے اصرار پر گاندھی بھی مان گئے۔(۳)

تحریکِ پاکستان میں پیش پیش رہنے والے اور جناح کے نقیب حسین شہید سہروردی اور چودھری خلیق الزمان نے بھی تسلیم کیا تھا کہ ملک کی تقسیم ایک تباہ کن حادثہ تھی۔ خلیق الزمان نے اپنی کتاب ''شاہراہِ پاکستان'' (Pathway to Pakistan) میں بیان کیا ہے کہ:

''سہروردی دو قومی نظریے کی افادیت پر شک کرتے تھے اور میرے خیال میں بھی اس نظریے نے ہمیں کبھی فائدہ نہیں پہنچایا۔ لیکن تقسیم کے بعد تو یہ ثابت ہو گیا کہ یہ اقدام مسلمانوں کے لیے نقصان کا باعث بنا، بلکہ اگر دُور بینی سے کام لیا جائے تو واضح ہو جاتا ہے کہ ہر جگہ کے مسلمانوں کے لیے نقصان دہ ثابت

(۱) ایچ ایم سیروائی کی کتاب: Partition of India-Legend and Reality, p.134

(۲) ایچ وی سیشادری کی تالیف: The Tragic Story of Partition, p.10

(۳) مریم، ایلن ہیز کی تحقیق: Gandhi vs Jinnah

ہوا۔''(۱)

بہ حوالہ پیارے لال کی روایت کے مطابق ہے۔رفیق زکریا لکھتے ہیں:

''پیارے لال نے لکھا ہے کہ وہ (گاندھی جی) یکم جون ۱۹۴۷ء کی صبح کو معمول سے بھی جلدی بیدار ہو گئے تھے اور دھیمی آواز میں کہہ رہے تھے: آج میں خود کو بالکل تنہا محسوس کرر ہا ہوں۔سردار اور جواہر لال بھی یہ سمجھتے ہیں کہ حالات کا میرا تجزیہ غلط تھا اور اگر تقسیم کو قبول کر لیا گیا تو دوبارہ امن قایم ہو جائے گا۔جب میں نے وایسرائے سے کہا تھا کہ اگر تقسیم ہوئی بھی تو وہ برطانیہ کی مداخلت یا برطانوی حکومت کے زیر انتظام نہیں ہو گی تو یہ بات بھی دونوں کو پسند نہیں آئی تھی۔اگر یہ بدبخت واقعہ پیش آجاتا ہے تو آنے والی نسلوں کو یہ معلوم ہونا چاہیے کہ مجھ کو اس سے کس قدر تکلیف پہنچی تھی۔''(۲)

Merriam, Allen Hays کی کتاب Gandhi vs Jinnah سے ماخوذ

گزشتہ صفحات کے مطالعے سے یہ بہ خوبی واضح ہو جاتا ہے کہ تقسیم ملک کا تصور ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے فوراً بعد پیدا ہو گیا تھا۔ایسٹ انڈیا کمپنی کی ملک وقوم دشمنی کے خلاف اہل ہند پاکستان کی بغاوت نے انگریزوں کے دلوں پر یہ بات نقش کر دی تھی کہ انھیں دیر سویر ایک دن یہ ملک چھوڑنا ہی پڑے گا۔اس وقت سے انھوں نے سوچنا شروع کر دیا تھا کہ اس وقت کے حالات میں ہندستان سے وابستہ ان کے مفادات کے تحفظ کی صورت کیا ہو گی؟

۱۔ جان برائٹ پہلا مبصر تھا جس نے تجویز کیا تھا کہ وقت کا تقاضا اور برطانیہ کے مفادات کے تحفظ کے لیے لازم ہو گا کہ ہندستان کو پانچ حصوں میں تقسیم کر کے ایک وفاق سے الگ خودمختار ریاستیں قایم کر دی جائیں۔

۲۔ دوسرا شخص ممالک متحدہ میں ہائی کوٹ کے ایک جج مسٹر پلوڈن ہیں جنھوں نے کسی

(۱) رفیق زکریا،ص ۸۸-۸۷

(۲) چودھری خلیق الزماں کی خودنوشت: Pathway to Pakistan, p.400

مستفسر کے جواب میں لندن ایک خط لکھا تھا جو کسی طرح سنڈے گرافک کے ہاتھ لگ گیا جس میں اس نے ہندستان کی تقسیم اور شمال مغربی ہند میں کراچی کو مرکز بنانے کی تجویز کا ذکر کیا ہے۔ مدینہ بجنور نے اس خط کا ترجمہ چھاپا ہے۔ مسٹر پلوڈن لکھتے ہیں:

''مدت سے ہندستان کی صورت حالات قابو سے باہر ہو رہی ہے۔ ہم نیم پارلیمنٹری حکومت کا وعدہ کر چکے ہیں، جو برطانوی افسروں کے بغیر نہیں چل سکتی۔ برطانوی افسر زیادہ عرصے تک نہیں رہیں گے۔ سول سروس کے تمام شعبے یہاں تک ہندستانیوں سے بھر دیے گئے ہیں یا بھرے جارہے ہیں کہ آیندہ چند سال میں ان میں ڈھونڈے سے بھی انگریز کا نام نہیں ملے گا۔ میں ان حالات میں ہندستان کے مسئلے کا ایک ہی حل دیکھتا ہوں کہ اسے ہندو اور مسلمان حصوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ آئرلینڈ میں کیتھولک اور پروٹسٹنٹ کا تنازعہ ختم کرنے کے لیے ۳۵ سال کی مسلسل پارلیمنٹری جنگ کے بعد ایسا ہی کرنا پڑا تھا۔ ہندوؤں نے ہمیں ہندستان کے ساتھ کاروبار کرنے سے روک دیا ہے۔ اب ہمیں مالیہ معاف کر دینا پڑا ہے تاکہ کاشتکار زندہ رہ سکیں۔ یہ ایک نہایت ہی یاس انگیز صورت حالات ہے اور اس کا ایک ہی علاج ہے کہ اس تعفن کو پھیلنے سے روکا جائے اور قدرتی تقسیم کے مطابق ملک کے حصے کر دیے جائیں۔ اگر ہندو کاروبار تجارت نہیں کریں گے تو بمبئی کی جگہ کراچی شہر تجارتی بندرگاہ کا کام دے سکتا ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ مزید ۲۵ یا ۳۰ سال کے لیے ہندستان پر ہمارا اثر و اقتدار قایم رہے۔ اب برطانوی حکومت کے پرانے طریق کار کی طرف عود کرنا ناممکن ہے۔ ہمارے پاس اب کارکن اصحاب موجود نہیں ہیں، اب ہم دور ماضی کو قایم نہیں کر سکتے۔ نیز ہم نے اپنا کام بھی کر لیا ہے۔ کیوں کہ ہندستان میں ریلیں اور نہریں وغیرہ قایم کی ہیں۔ اب اسے ایسا طرزِ حکومت دے دو جو اس کے لیے موزوں اور قدرتی ہو۔ لیکن جب تک ہندستان میں ہمارا اثر و اقتدار قایم ہے، ہمیں تحریک مقاطعہ کو پورے زور سے روکنا چاہیے۔ خونریزی کو روکنے

اور دقیانوسی ہندو سسٹم کا سدباب کرنے کے لیے ہمیں کراچی اور دہلی سے کام شروع کرنا چاہیے، جہاں دنیا کی ایک بڑی مسلم طاقت قایم ہوگی۔ ہم خواہ کچھ کریں یہ ہو کر رہے گا، پھر کیا وجہ ہے کہ ہم اسے جلد از جلد معرضِ عمل میں نہ لائیں اور اس کے ساتھ سب سے پہلے تاجرانہ تعلقات کیوں نہ قایم کریں۔ جب بحر قزوین اور بحیرۂ روم کی طرف وسیع ملکوں کا خیال جائے تو بڑے بڑے امکانات نظر آتے ہیں۔''[1]

(۱) مدینہ بجنور: ۲۱؍اگست ۱۹۳۱ء، ج ۲۰، ش ۵۹، ص ۴

(۳)

کانگریس اور لیگ کے رہنما تقسیم ملک کے بارے میں ایک دوسرے کے متعلق خواہ کچھ کہیں، لیکن برٹش امپیریل کے مفادات کے سب سے بڑے ماہر اور محافظ مسٹر چرچل اور اس کے وفادار و آلہ کار مسٹر ماؤنٹ بیٹن تو نہایت خوش اور مطمئن تھے اور ایک عظیم کارنامہ انجام دینے کے بعد بے فکر ہو گئے تھے۔ اب کچھ بھی ہو انھیں اس کی پروا نہیں تھی۔ ہندستان ان کی خواہش اور منصوبے کے مطابق ٹکڑوں میں تقسیم ہو گیا تھا اور لیگ اور کانگریس — دونوں کی رضامندی سے! رفیق زکریا لکھتے ہیں:

''ماؤنٹ بیٹن نے کسی بھی شخص پر بھروسا نہیں کیا۔ اس نے تمام معاملات و احکامات کو خود تک محدود رکھا اور یومِ آزادی کے بعد ہی انھیں ظاہر کیا۔ یومِ آزادی بہت خوشی سے منایا گیا۔ لیکن اس کے نتیجے میں لاکھوں لوگ مارے گئے۔ یا پھر اپنا سب کچھ لُٹا کر سرحد کی دوسری طرف پہنچے۔ یہ بات ماؤنٹ بیٹن کے ضمیر پر چھوڑ دینا چاہیے۔ لیکن اس تباہی پر اُسے نہ کوئی تکلیف ہوئی اور نہ ہی احساس۔ اس کا قریب ترین مددگار الن کیمبل جانسن بھی اُس کی اس لاپرواہی پر دَنگ رہ گیا تھا۔ اس نے لکھا ہے کہ:

''جب رات کے بارہ بجے کے گھنٹے گونجے تو ماؤنٹ بیٹن اطمینان سے اپنی کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے اس کو ہر طرح کے موڈ میں دیکھا تھا۔ آج کی رات اس کے چہرے پر ایک پُر وقار متانت چھائی ہوئی تھی۔ یہ ہر چیز سے انتہائی بے تعلقی کا موڈ تھا۔ یہ شخص ایک ایسے راز کو اپنے سینے میں چھپائے ہوئے بیٹھا تھا جو آیندہ چند ہفتوں میں دس لاکھ لوگوں کی موت کا سبب بننے والا تھا اور دنیا کی تاریخ میں سب سے تباہ کن تبادلۂ آبادی کا بھی موجب بننے والا تھا۔ ایسے شخص کے لیے یہ عجیب و غریب موڈ تھا۔''

''نیوز ویک'' کے یورپی ایڈیٹر ایڈورڈ بوہر نے بھی لکھا تھا:

''جیسے ہی تقسیمِ ہند کا مسئلہ اُٹھایا گیا تھا تو یہ بات واضح تھی کہ مذہبی اور فرقہ وارانہ تناؤ کے نتیجے میں فسادات پھوٹ پڑیں گے اور قتلِ عام کو روکنے کے لیے فوج اور پولیس کے ہر سپاہی اور ہر آفیسر کی ضرورت پڑے گی اور ان سپاہیوں کو تیار کرنے کے لیے کافی وقت درکار تھا۔ برصغیر ہندستان کے تمام آرمی کمانڈروں نے وایسراے سے یہی کہا تھا۔ یہ کمانڈر چاہتے تھے کہ چند دِنوں کے لیے آزادی کی تاریخ کو آگے بڑھا دیا جائے تاکہ فوج کی ہندستانی اور پاکستانی فوج کی صورت میں تنظیمِ جدید کی جا سکے۔ اسی طرح پولیس کی بھی تقسیم کی جا سکے۔ لیکن ماؤنٹ بیٹن یومِ آزادی کی اپنی مقررہ تاریخ ۱۵؍اگست ۱۹۴۷ء پر جمے رہے اور اپنے ماتحت کمانڈروں کے مشوروں کو ٹھکرا دیا۔ اُس نے ہندستان اور پاکستان کی سرحد پر صرف پانچ ہزار سپاہیوں کو متعین کیا۔ یہ تعداد کافی نہیں تھی۔ کوئی بھی شخص کبھی یہ نہیں جان سکے گا کہ کسی تیاری کے بغیر ظالمانہ لاپرواہی سے عمل میں لائی گئی۔ برصغیر ہندستان کی اس تقسیم کی وجہ سے کتنے لوگوں کی جانیں گئیں۔ اس بے رحم اقدام کا سب سے افسوس ناک پہلو یہ ہے کہ اتنی تباہی کے باوجود بعد میں بھی ماؤنٹ بیٹن اپنی غلطی تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ وہ اپنی اس بات پر بضد تھا کہ اس رویے کے علاوہ کوئی دوسرا طریقہ ممکن ہی نہیں تھا اور یہ کہ لاکھوں لوگوں کی جان و مال کا نقصان ناگزیر تھا لیکن ہندستان کی فوج اور پولیس کے کئی عہدے دار اس سے متفق نہیں ہیں۔ وہ ماؤنٹ بیٹن کو برما کی جنگ کے ہیرو کی بجائے ایک ایسے شخص کی حیثیت سے یاد کرتے ہیں جس کے ہاتھ خون سے رنگے ہوئے ہیں۔''

پنڈت نہرو اور سردار پٹیل نے فرقہ وارانہ تشدد کا خدشہ ظاہر کیا تھا لیکن ماؤنٹ بیٹن نے ان دونوں کو تیقن دیا تھا۔ (۱)

---

(۱) یہاں اس بات پر حوالہ دینے کی ضرورت نہیں۔ اس لیے کہ اس مضمون کے شروع میں رفیق زکریا کی تالیف سردار پٹیل اور ہندستانی مسلمان کا حوالہ دیا جا چکا ہے۔

(۲)

براعظم ہند پاکستان کے دو دُشمن!

چرچل اور ماؤنٹ بیٹن!

براعظم ہند پاکستان کی تحریک آزادی کے بارے میں مسٹر چرچل کا طرزِ فکر کیا تھا اور برصغیر ہند پاکستان کی سیاست کا انھوں نے کیا تجزیہ کیا تھا، کیا وہ ہندستان کو برٹش استعمار کے پنجے سے آزاد بھی کرنا چاہتے تھے؟ اور اگر وہ آزادی دینا چاہتے تھے تو کس صورت میں؟ یہ بات رفیق زکریا نے اپنی تالیف ''سردار پٹیل اور ہندستانی مسلمان'' میں خود انھی کی زبان سے بیان کردی ہے۔ لکھتے ہیں:

''چرچل نے ۱۰ر ستمبر ۱۹۴۲ء کو کھلے عام یہ بات کہی تھی کہ:

☆ انڈین کانگریس پارٹی تمام ہندستان کی نمایندگی نہیں کرتی۔ یہ ہندو عوام کی نمایندہ جماعت بھی نہیں ہے۔ یہ ایک ایسی سیاسی تنظیم ہے جو پارٹی مشینری کے اطراف تعمیر کی گئی ہے اور چند کارخانے والوں اور مفادات حاصلہ کے حامل لوگوں نے اس کو زندہ رکھا ہے۔

☆ برطانوی ہند میں اس پارٹی کے باہر اور اس سے غیر متعلق نو کروڑ مسلمان ہیں جو اس پارٹی کے مخالف ہیں جن کو اپنے حق خودارادی کے استعمال کا حق ہے۔

☆ اس کے علاوہ پانچ کروڑ بچھڑی ہوئی ذات کے لوگ ہیں جن کو اَچھوت کہا جاتا ہے اور جو اپنی موجودگی یا اپنے سائے سے ہندوؤں کا دھرم بھرشٹ کردیتے ہیں اور اعلیٰ ذات کے ہندوؤں کو ناپاک بنا دیتے ہیں۔ اور

☆ ۹ کروڑ پچاس لاکھ لوگ ہندستان کی ریاستوں کے حکمرانوں کی رعایا ہیں۔ ان راجاؤں سے ہمارے معاہدے ہیں۔ پورے ہندستان میں ایسے لوگوں کی

تعداد ۲۳.۵ کروڑ ہے۔

☆ اس کے علاوہ ہندوؤں کی ایک بڑی تعداد سکھ اور عیسائی بھی ہندستان میں موجود ہیں، جو کانگریس کی موجودہ پالیسی کی مذمت کرتے ہیں۔

ہندستان میں یا بیرونی ممالک میں ان حقایق کو بھی نظرانداز نہیں کرنا چاہیے، کیوں کہ ان کے بغیر ہندستان کے مسئلے یا ہند، برطانیہ تعلقات کو سمجھنا ممکن نہیں ہے۔"

یہ اقتباس شفیق علی خاں کی کتاب The Two Nation Theory as a Concept Strategy and Ideology, pp.433-434 سے لیا گیا ہے۔

اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے مسٹر چرچل نے ہندستان کے آخری وایسرائے مسٹر ماؤنٹ بیٹن کو کیا ہدایات دی تھیں اور پھر ماؤنٹ بیٹن نے کیا ہتھ کنڈے استعمال کیے تھے اور کیا سازش کا جال بچھایا تھا؟

(۳)

برطانیہ اور جناح

(۱)

روشن خیال برطانیہ کا نقطۂ نظر مسٹر جناح کے بارے میں!

ایک دل چسپ خط گزشتہ ہفتے ہوائی ڈاک کے ذریعے انگلستان سے آیا ہے، جس میں ایک انگریز نے اپنے ایک ہندستانی دوست کو جو اس کے ساتھ عرصے تک بنگال میں انڈین سول سروس میں رہا ہے اور اپنی قبل از وقت پنشن سے پہلے تک ذمے دار عہدے پر سرفراز رہا ہے اور اب انگلستان میں سوشل اور تعلیمی مشاغل میں منہمک ہے۔ وہ لکھتا ہے:

''میں سمجھتا ہوں کہ ویول کی تجویز کا گر جانا حقیقتاً ایک سانحہ ہے۔ تمہاری طرح میرا بھی پختہ خیال ہے کہ ہندو مسلم اختلافات کی اکثر و بیشتر تلخیاں برطانوی پالیسی کی مرہونِ منت ہیں۔ اگر ہندستان کے برطانوی نظم ونسق نے ان دونوں جماعتوں کو متحد کرنے کی جدوجہد کی ہوتی تو وہ آج سے پچاس سال پہلے نہایت آسانی سے اسے کر سکتے تھے، اب البتہ یہ بہت ہی مشکل ہوگیا ہے، لیکن اس کے بجائے انھوں نے ان اختلافات کو ہوا دی اور انھیں بڑھنے دیا۔

میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ جناح ہندستان کا Evil Genius (ذہین شیطان) ہے۔ اس کے مطالبات احمقانہ ہیں اور زیادہ تر اس خوش فہمی پر مبنی ہیں کہ مفاہمت کے التوا میں وہائیٹ ہال اس کی خاموش پشت پناہی کر رہا ہے۔ میں امید رکھتا ہوں کہ ویول اپنے اس فریب خوردہ کو بلا کر کہیں گے کہ ''بہت اچھا! اگر تم ناموں کی فہرست دینے سے انکار کرتے ہو تو میں اپنی کارروائی کو آگے بڑھاتا ہوں اور بغیر تمہارے اس فہرست کو لے کر جو دوسری پارٹیوں نے پیش کی ہے

اپنی کونسل بناتا ہوں۔'' میں سمجھتا ہوں کہ اگر وہ (ویول) اپنی رائے میں آزاد ہوتے تو ایسا ہی کرتے، مگر مسٹر چرچل نے مطالبات کی منظوری پر جو طریق کار تجویز کیا تھا وہ یہ تھا کہ اگر کوئی ایسی مشکل پیش آئے جیسی کہ حقیقتاً پیش آئی تو فوراً قدیم سسٹم کی طرف لوٹ جائے۔ یہ بری طرح مشہور ہے کہ چرچل رعایت دینے کے بہت سخت خلاف ہے اور پرانے سسٹم کو برقرار رکھنے کے لیے جو بھی موقع حاصل ہوتا ہے، اس سے اس کو خوشی ہوتی ہے۔ ہم حقیقتاً متعجب تھے کہ اس نے ''ویول کی تجاویز'' پر کیسے دستخط کر دیے؟ غالباً اس نے اس لیے دستخط کر دیے کہ اسے یقین کامل تھا کہ جناح ہٹ دھرم ثابت ہوگا اور کانفرنس کو ناکام کر دینے کے لیے یہ ہٹ دھرمی ایک بہانہ ہو جائے گی۔ جیسا کہ تمھیں علم ہے چرچل فطرتِ انسانی کے کم زور پہلوؤں کا اندازہ لگانے میں بہت ماہر ہے اور غالباً وہ (چرچل) پوری طرح سے واقف تھا کہ اگر میں پیشتر سے کوئی اشارہ نہ کروں گا تو جناح کا کیا طرزِ عمل رہے گا۔ اب صرف ایک امید رہ گئی ہے کہ لیبر گورنمنٹ واپس آجائے۔

جہاں تک شہنشاہیت کا تعلق ہے لیبر پالیسی کے بارے میں کچھ اچھا خیال نہیں رکھتا، لیکن کم از کم شاید وہ بات چیت کا دروازہ کھولے اور ویول کو آزادی سے کام کرنے کا موقع دے۔ آج ''رینالڈ نیوز'' میں ایک زبردست مقالہ افتتاحیہ چھپا ہے، جس میں سارا اِلزام جناح پر رکھا گیا ہے اور کھلے بندوں یہ مشورہ دیا گیا ہے کہ بغیر مسٹر جناح کے اشتراک کے کونسل بنائی جائے۔ یہ اخبار لیبر پارٹی کے زیادہ روشن خیال لوگوں کا نقطۂ نظر پیش کرتا ہے۔ یہ ہے وہ مقالۂ افتتاحیہ جو ''رینالڈ نیوز'' نے لکھا ہے اور جس میں شملہ کانفرنس کی ناکامی پر تبصرہ کیا گیا ہے، جس کا اشارہ میں نے اپنے خط میں کیا ہے۔

اب وقت ہے کہ ہندستان کے بارے میں صاف گوئی سے کام لیا جائے۔ مسلم لیگ کے صدر جناح نے باوجود اس صاف حقیقت کے کہ ہندستانی مسلمانوں کا

ایک بہت بڑا حصہ کانگریس میں شریک ہے، اس مطالبے پر اڑ کر کہ مسلم لیگ ہی کو ہندستانی مسلمانوں کا واحد نمایندہ تسلیم کیا جائے، ایک بار پھر دستوری جمود کے حل کو خطرے میں ڈال دیا ہے۔ یہ صرف پہلا موقع نہیں ہے کہ جناح نے غیر مصالحانہ روش اختیار کی ہو۔ ہم کب تک اسے ہر پُر امید اقدام کو ٹھکرانے کا موقع دیتے رہیں گے؟ برطانیہ کا فرض یہ ہے کہ وہ مصالحت کی پوری کوشش کرے، لیکن اگر مصالحت کی جدوجہد ایک پارٹی کے طرزِ عمل سے کھلے بندوں توڑی جارہی ہو تو پھر برطانیہ کا یہ فرض ہو جاتا ہے کہ وہ مسلم لیگ سے کہہ دے کہ مجھے تمہارے طرزِ عمل پر افسوس ہے اور ہم اسے ہندستان کی سیلف گورنمنٹ کے حل میں مسلسل روڑے اٹکانے کی اجازت نہیں دے سکتے۔ ہم اس سے یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہم اس حل کو لے کر آگے بڑھ رہے ہیں جس کو ہم صحیح سمجھتے ہیں اور جسے ہندستانی سیاسی تحریک کی سب سے بڑی جماعت نے قبول کرلیا ہے۔ مسلم لیگ کے لیے جگہ خالی ہے، جب وہ خواہش کرے گی اسے اس کی جگہ دے دی جائے گی۔ سابقہ تجربات کی بنا پر ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ جب تک برطانیہ اس خاردار درخت کو ہاتھ نہیں لگائے گا اس وقت تک ہمیں سیلف گورنمنٹ کی جانب کسی حقیقی ترقی کا خیال ترک کر دینا چاہیے۔''(۱)

(زمزم، لاہور، ۱۹؍ستمبر ۱۹۴۵ء بحوالہ: ماڈرن ریویو، ماہ ستمبر ۱۹۴۵ء، ص ۱۳۵)

(۱) عارضی حکومت کی کیبنٹ کے لیے لیگ کے ارکان کے نام مانگے گئے تھے۔

(۲)

چرچل - جناح روابط اور ہم خیالی

روزنامہ ''ہندستان اسٹینڈرڈ کلکتہ'' نے امریکن مصنف ''مسٹر لوئی فیشر'' کا ایک بیان شایع کیا تھا۔ یہ بیان بہت طویل ہے۔ ہم اس کا اہم اقتباس ذیل میں درج کرتے ہیں:

''ونسٹن چرچل ہندستان کی آزادی کے سخت دشمن رہے ہیں۔ خود ان کی پارٹی کے بہت سے ممبر آزادیٔ ہند کے متعلق اختلاف رکھتے ہیں۔ لیکن چرچل کی شاہیت پسند پالیسی اپنی جگہ پر قایم ہے۔ مسٹر محمد علی جناح اور ان کی لیگ نے جس کے وہ صدر ہیں، گزشتہ چند سالوں میں آزادی ہند کے بارے میں کسی خلوص کا ثبوت نہیں دیا ہے۔

زمینداروں کا طبقہ جس کی لیگ کی کونسل اور کمیٹیوں میں بھاری اکثریت ہے، نئے ہندستان کی تعمیر کے خلاف ہے۔ کیوں کہ اس میں ان کا نقصان اور غریب کسانوں کا فایدہ ہے۔

اس لیے اس سے زیادہ قدرتی بات کیا ہوسکتی ہے کہ چرچل اور جناح کے درمیان گزشتہ مہینوں میں ہندستان کی قسمت سے متعلق نامہ و پیام ہوتا رہا ہے۔ اور ان دونوں نے نہایت رازدارانہ طور پر آپس میں خط و کتابت اور راز و نیاز کی باتیں کی ہیں۔

برطانوی وزارتی وفد (کیبنٹ مشن) کی تجاویز اور دستور ساز اسمبلی میں شرکت کو منظور کر لینے کے بعد مسلم لیگ کا ان تجاویز پر دوبارہ غور کرنا، اور کانسٹی ٹیوٹ اسمبلی سے مقاطعہ کا فیصلہ کر دینا چرچل کے ایک خفیہ خط کے بعد ظہور پذیر ہوا ہے۔

برطانوی مشن نے انتھک کوشش کی کہ سیاسی طاقت برطانیہ کے ہاتھوں سے

ہندستانیوں کو منتقل کر دینے کا راستہ صاف کر دے۔ مگر چرچل اور جناح دونوں
ان کوششوں کو ناکام کرنے کی سعی میں مصروف ہیں۔
مسٹر جناح کے نئے طرزِ پالیسی کا ایک پھل کلکتہ میں قتل وغارت گری کی صورت
میں ظاہر ہوا ہے۔ جو شخص اپنے پیرووں کو قابو میں نہیں رکھ سکتا وہ انھیں ضرور بے
لگام کر دے گا۔
طویل المیعاد تجاویز کو رد کر دینے میں مسٹر جناح نے انتہائی غیر ذمہ داری سے کام
لیا ہے۔ لیکن چرچل کی غیر ذمہ داری اور بھی زیادہ بڑھی ہوئی ہے۔ کیوں کہ وہ
بہت اونچے عہدے پر رہ چکے ہیں اور غالباً وہ امن وقانون کے مغربی اصول
سے واقف ہوں گے۔
شاید جناح کو معلوم نہ ہو کہ چرچل کا اثر برطانیہ میں اور ٹوری پارٹی میں بڑی حد
تک زایل ہو چکا ہے، لیکن چرچل شاید یقین کرتا ہے کہ جناح کے روڑے مزدور
حکومت کو ہندستان آزاد کرنے سے باز رکھیں گے......
درحقیقت یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کہ جناح اور اس کی مسلم لیگ (یعنی
زمینداروں کی انجمن) چرچل کی شاہیت پسند ٹوری پارٹی کی طرف جھکی ہوئی
ہے۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ ہندستان کے سمجھ دار اور روشن خیال مسلمان جناح
کی رہنمائی میں چل رہے ہیں۔''[1]

مسٹر جناح صاحب نے ایک بیان کے ذریعے اس الزام کی تردید کرنی چاہی مگر اس
تردید کو اعتراف بھی کہا جا سکتا ہے۔ مسٹر جناح کے مکمل بیان کا ترجمہ درج ذیل ہے:
''میری توجہ اس پریس نوٹ کی طرف مبذول کرائی گئی جو کہ مسٹر مائیکل فوٹ ممبر
پارلیمنٹ نے (لیبر حکومت کے سرکاری ترجمان) ڈیلی ہیرالٹ میں شایع کی
ہے کہ ایک زمانے سے میرے اور چرچل کے درمیان خط وکتابت ہو رہی ہے۔
یہ غلط اور شرارت آمیز ہے۔ میں نے مسٹر ایٹلی وزیر اعظم برطانیہ کو ۶ر جولائی

(۱) ہندستان اسٹینڈرڈ: ۲ر ستمبر ۱۹۴۶ء، ص ۴، کالم ۴ و ۵

۱۹۴۶ء کو لکھا کہ کس طرح وزارتی وفد اور وائسرائے نے مسلم لیگ کو نظر انداز کیا ہے اور اس کے ساتھ میں نے اپنے بیانات مورخہ ۲۷، ۲۸/جون مع چند دیگر ضروری کاغذات کے شامل کر دیے تھے۔ یہ خط وزارتی وفد کی روانگی کے وقت لکھا گیا تھا، کیوں کہ یہ اعلان کیا گیا تھا کہ یہ تمام معاملات پارلیمنٹ کے سامنے رکھے جائیں گے۔

اسی قسم کا ایک خط میں نے مسٹر چرچل کو بھی لکھا جس میں چند ضروری کاغذات اور تفاصیل شامل تھیں۔ اس کے بارے میں ایٹلی کو بھی مطلع کر دیا تھا۔ مجھے دونوں کے جوابات موصول ہوئے ہیں۔ پھر دونوں کو تفصیلی حالات سے مطلع کیا جو نازک صورت اختیار کرنے والے ہیں۔" (۱)

مولانا سیّد محمد میاں نے جناح صاحب کے اس بیان پر ان الفاظ میں تبصرہ کیا ہے:

"ممکن ہے بہ قول مسٹر جناح "ایک زمانہ" سے چرچل جناح خط و کتابت کا سلسلہ نہ رہا ہو۔ لیکن اس الزام کے جواب سے مسٹر جناح نے پہلو بچا لیا کہ جب کہ وسط جون میں وزارتی مشن کی تجاویز کو منظور کر چکے تھے تو اواخر جولائی میں ان سے انکار کرنا چرچل کے کسی خفیہ خط یا اشارے سے نہیں ہوا۔ علاوہ ازیں دسمبر ۱۹۴۶ء اور مارچ ۱۹۴۷ء میں پارلیمنٹ میں مسٹر چرچل نے جو تقریر کی وہ "کنزرویٹو" اور "لیگ"، "چرچل" اور "جناح" اتحادِ نظر اور قدرتی تعاون اور اشتراک کا بیّن ثبوت اور شاہد عدل ہے۔" (۲)

---

(۱) روزنامہ ہندستان اسٹینڈرڈ: ۲/ستمبر ۱۹۴۶ء، ص ۴، کالم ۵

(۲) علمائے حق اور ان کے مجاہدانہ کارنامے، لاہور، ۲۰۰۵ء، ص ۳۸-۶۳

(۵)

مسز جان گنتھر کا بیان اور اس پر تبصرہ

مسٹر جناح اور برطانیہ کا باہمی کھیل

مدینہ بجنور ۹ رستمبر ۱۹۳۱ء جلد ۲۰ نمبر ۶۹ میں بمبئی کرانیکل کے خاص نامہ نگار مقیم لندن کا مقالہ مندرجہ ذیل الفاظ میں نقل کیا گیا ہے:

''ہندستان کو ''ہندو ہندستان'' اور ''مسلم ہندستان'' میں تقسیم کرنے کی پوری کوشش کی جا رہی ہے، تا کہ اس کے بعد ہمیشہ ہندستانیوں میں جھگڑا ہوتا رہے۔''

مسز جان گنتھر امریکن ''کامن سینس'' امریکی اخبار میں طویل مقالہ لکھتی ہے، جس کا اقتباس مندرجہ ذیل ہے:

''اس برطانوی جناح باہمی کھیل کا نتیجہ ''پاکستان'' کی صورت میں نمودار ہوا ہے، اور یہ ہندستان میں مسلمانوں کی دو علاحدہ خیالی ریاستوں کا نام ہے، جن کے درمیان باقی تمام ہندستان پولینڈ کے کاریڈور (ملانے والے راستہ) کی طرح رہے گا، ابھی تک تو ذمے دار مسلمانوں نے اس کی مخالفت کی ہے، لیکن اگر اس اسکیم پر عمل کیا گیا تو ہندستان بھی بلقان بن جائے گا، جہاں خانہ جنگیوں کا غیر مختتم سلسلہ شروع ہو جائے گا۔''(۱)

مندرجہ بالا شہادتوں سے مندرجہ ذیل امور معلوم ہوئے:

(الف) پاکستان اور تقسیمِ ہندستان (مسلم ہندستان اور ہندو ہندستان) لاہور کے لیگ کے اجلاس ۱۹۴۰ء کی پیداوار نہیں ہے، بلکہ ۱۹۳۱ء یا اس سے پہلے کی پیداوار ہے۔

---

(۱) مدینہ، ۹ رجون ۱۹۴۳ء، جلد ۳۲، نمبر ۴۳

ہاں! ہندستان میں اس کی شہرت لیگ کے اس اجلاس سے ہوئی ہے، اگرچہ سر اقبال مرحوم نے الٰہ آباد کے اجلاس لیگ میں دسمبر ۱۹۳۰ء میں بھی اس کا تذکرہ مختصراً اپنے خطبے میں کیا تھا، مگر اس کو کسی نے بھی درخورِ اعتناء نہیں سمجھا اور ہنٹر کمیٹی کے سامنے بھی اس کا تذکرہ بعض لوگوں نے کیا تھا، مگر اس کو عملی حیثیت سے ناقابلِ انتظامِ سلطنت کہہ کر رَد کر دیا گیا تھا۔

(ب) چودھری رحمت علی صاحب جنھوں نے ۱۹۳۲ء میں پاکستان کے متعلق بنام ''پاکستان نیشنل موومنٹ'' اور ڈاکٹر عبداللطیف صاحب حیدر آبادی اور دوسرے مصنّفین سب کے سب اسی چشمے سے مستفید ہونے والے ہیں، جس کا منبع ٹوری انگریزوں نے ۱۹۳۱ء میں یا اس سے پہلے بنایا تھا اور اواخر ۱۹۳۱ء میں لندن میں نشوونما کی نوبت آئی!

(ج) یہ اسکیم تقسیمِ ہندستان اور علاقہ جات ہندو ہندستان اور مسلم ہندستان کسی مسلمان ہندستانی دماغ سے نہیں ہوئی ہے اور نہ لیگی دماغ سے اس کا ظہور ہوا ہے، بلکہ اس کا ظہور اور خروج برطانوی اور ٹوری دماغوں کا رہینِ منت ہے، اگرچہ بعد کو لوگوں نے اس کو بے سمجھی سے اپنا لیا ہے:

کارِ زلفِ تست مشک افشانی اما عاشقاں
از غلط تہمت بآہوئے ختن بنہادہ اند

(د) یہ ہندستان کی تقسیم صرف برطانوی مفاد کی خاطر کی گئی ہے، کیوں کہ ہندو برطانوی مصنوعات اور اس کی تجارت کا بائیکاٹ اور مقاطعہ کر رہا تھا، اور اس اسکیم کو حسبِ قوت زیادہ تر موثر بنانا چاہتا تھا، تا ایں کہ اس کی نیت یہ ہے کہ پردیسی مصنوعات کو یک قلم ہندستان میں نہ آنے دے، اور بمبئی، مدراس وغیرہ سے ایسی مصنوعات کا داخلہ اور تجارت بند کر دے یا اُن پر اتنا بھاری ٹیکس لگا دے جو باہر کی مصنوعات کو یہاں کی مصنوعات سے بہت زیادہ گراں کر دے، جیسا کہ انگلستان نے ہندستانی مصنوعات اور تجارت سے کیا تھا، یہ اسکیم یقیناً ہندستان کے عوام کی زندگی اور بھلائی کے لیے اشد ضروری ہے۔

(ہ) ۱۹۳۱ء میں مسلم نمایندوں کے لندن جانے سے پہلے یا بعد میں کوئی خفیہ پیکٹ ہوا ہے یا ہونا قرار پایا ہے، جس میں مسلم نمایندوں کی طرف سے اطمینان حاصل کیا گیا ہے کہ وہ

مسلم ہندستان (پاکستان) میں برطانوی مصنوعات اوران کی تجارت کو برقرار رکھیں گے، اوراپنے ساحلی بندرگاہوں کراچی اور کلکتہ کو برطانیہ کی تجارت گاہ بنائیں گے۔

اینول رجسٹر ۱۹۳۱ء صفحہ ۶۱ میں ہے:

''لندن کے بعض نمایندوں نے اشارہ کیا تھا کہ ان لوگوں (فرقہ وار لیڈروں) نے برطانیہ کے ٹوری لیڈروں سے خفیہ سازش کرلی تھی جن میں ممتاز ٹوری لیڈر لارڈ لائڈ، لارڈ بنفورڈ اور لارڈ سڈھنم اور دوسرے لوگ شریک تھے۔''

نیز ریوٹر یکم نومبر ۱۹۳۱ء کو تار دیتا ہے:

''معلوم ہوا ہے کہ مسلمانوں نے کانگریس کے تحفظات سے اختلاف کا اظہار کیا ہے، اس سلسلہ میں یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ مسلمانوں نے قدامت پسند انگریزوں سے بھی خفیہ معاہدہ کیا ہے کہ وہ مسلمان سے تحفظات منظور کرالیں گے، جو برطانوی اقتدار کو قایم رکھیں گے، اور کنزرویٹو انگریز، مسلم مطالبات کی حمایت کریں گے۔'' (۱)

نیز اخبار بمبئی کرانیکل کا خاص نامہ نگار مقیم لندن خبر دیتا ہے:

''شہنشاہیت پرست برطانوی مدبرین کو جب گاندھی جی کے نرم رویہ سے گاندھی جی اور والیانِ ریاست کو لڑانے میں ناکامی ہوئی تو اب وہ مسلمانوں کو اپنے مقصد کا آلۂ کار بنا رہے ہیں، انھوں نے مسلمان مندوبین کو اس لیے متحد کر لیا ہے کہ وہ کامل آزادی کے حصول میں گاندھی جی کی کوششوں کو ناکام کر دیں۔'' (۲)

(و) پاکستان کا بنانا اوراس کی تجویز، کانگریسی حکومت کا قیام اوراس کے مظالم مشہورہ سے پہلے ہی قرار پاچکی ہے، مظالم کانگریس کو اس کا باعث قرار دینا محض عوام کو بھڑکانے کے لیے ہے، کانگریس کی حکومت ۱۹۳۷ء کے اواخر میں شروع ہوتی ہے، اور پاکستان کی

(۱) مدینہ بجنور: ۵ر نومبر ۱۹۳۱ء، جلد ۲ نمبر ۷۹

(۲) مدینہ بجنور، ۲۸ر دسمبر ۱۹۳۱ء، جلد ۲۰ نمبر ۶۹

پیدائش ۱۹۳۱ء یا اس سے پہلے ہوتی ہے، اور اس کا ظہور بلکہ اس کا پروپیگنڈا، ۱۹۳۳ء سے جاری ہو جاتا ہے، چنانچہ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام سپلیمنٹ نمبر ۴ صفحہ ۱۷۴ لیڈن ۱۹۳۷ء مقالہ (ایس. وی. پاکستان) میں ہے:

''پاکستان صوبوں کے اسماء سے حروف تہجی لے کر بنایا گیا ہے، پنجاب سے ''پ'' شمال مغربی صوبہ سے (جس کے رہنے والے خصوصاً افغان ہیں) ''الف''، کشمیر سے ''کاف'' سندھ سے ''سین'' اور بلوچستان سے ''تان'' ان خطوں کا نام ۱۹۳۳ء میں چودھری رحمت علی بانیِ پاکستان نیشنل موومنٹ نے پاکستان تجویز کیا، الخ، اور اس پر اسٹیٹس مین-دہلی، ۳/ اگست ۱۹۳۳ء، ایسٹرن ٹائمز-لاہور، ۱۰/ جون ۱۹۳۴ء اور ٹریبون-لاہور، ۱۲/ اکتوبر ۱۹۳۵ء میں مفصل بحث اور تنقید ہوئی، اور اس تجویز کو حکومتِ برطانیہ اور ان صوبوں کے ہندوؤں کے لیے خطرناک دکھلایا گیا۔''(۱)

(ز) مسلم اقلیت کے صوبوں کے مظالم کو اس کا سبب قرار دینا اگر وہ پایہ ثبوت کو پہنچیں تب بھی خلافِ عقل اور خلافِ سیاست ہے!

(اولاً) اگر ان مظالم کے سبب سے پاکستان بنایا جا رہا ہے تو انہی صوبوں میں مستقبل کے تحفظ کی کوئی راہ نکالی جاتی، نہ کہ وہ صوبے اس کی وجہ سے اور خطرے میں ڈال دیے جائیں، اور مسلم اکثریت والے صوبوں کے تحفظ پر زور دیا جائے۔

(ثانیاً) اگر واقع میں یہ اسباب ہو سکتے ہیں تو یہ امر ممکنہ بعد الوقوع ہے، پاکستان کی اسکیم تو پہلے ہی سے بن چکی ہے، اور اپنے منبع سے روانہ ہو کر زعماء لیگ اور مسلم کانفرنس کے قلوب میں جاگزین ہو چکی تھی۔

(ثالثاً) یہ مظالم بطور ڈھونگ فرضی بنائے گئے ہیں، یا قصداً ان کو اُٹھوایا گیا ہے، تاکہ عوام کے جذبات کو اُبھارا جائے اور اپنی سابقہ غداری یا غلطی پر پردہ ڈال دیا جائے، اور کانگریس کو بدنام کیا جائے، تاکہ اور لوگوں میں تنفر پیدا ہو، ان مظالم کے اثبات کے لیے بابو

---

(۱) دیکھو انسائیکلوپیڈیا مذکور

راجندر پرشاد، مولانا ابوالکلام آزاد، پنڈت جواہر لال نہرو اثبات و تحقیق کے مطالبہ بذریعہ چیف جسٹس اور ججانِ فیڈرل کورٹ وغیرہ بار بار کر چکے ہیں، مگر مسٹر جناح وغیرہ نے رائل کمیشن پر ہی محول کر دیا، اور پھر کوئی وزنی اور موثر عمل اس کے لیے کرنے سے قاصر رہے۔

مسز جان گنتھر اپنے آرٹیکل میں لکھتی ہے:

''۱۹۳۸ء کا واقعہ ہے میں نے اور میرے شوہر مسٹر جان گنتھر دونوں نے ہندستان میں مسلم لیگ کے لیڈر مسٹر جناح سے تین گھنٹہ تک لنچ کے موقع پر گفتگو کی، ہم نے ان سے پوچھا کہ آپ ہمیں کوئی واضح اور قطعی مثال اُن شکایتوں کی بتایئے جو انڈین نیشنل کانگریس سے مسلمانوں کو ہیں، مگر وہ کوئی مثال پیش نہ کر سکے۔ ۱۹۴۰ء میں سر اسٹیفورڈ کرپس نے بھی اُن سے یہی سوال کیا، لیکن اس وقت انھوں نے جواب دیا اور ایک شکایت بیان کی، کرپس صاحب نے ذاتی طور پر تحقیق کرنے کا اظہار کیا تھا، مگر جب بعد کو انھوں نے نیویارک میں اس کی اطلاع دی تو اس میں انھیں کوئی اصلیت نظر نہیں آئی۔ اس کے بعد ستمبر ۱۹۴۲ء میں ہربرٹ میتھوز نے لکھا کہ مسلم لیڈر (انھوں نے مسٹر جناح کا نام نہیں لیا) کہتے ہیں کہ وہ جہنم سے نکلے ہیں، جناح انتہائی چالاک اور خشک قانون داں آدمی ہیں، کبھی وہ انڈین نیشنل کانگریس کے سرگرم بحثی قسم کے ممبر تھے، مگر پھر انھیں اپنی نجی خواہشات اور حوصلہ مندیوں کے لیے برطانویوں کے پیش کردہ مواقع میں بہ نسبت ایثار پیشہ کانگریس کے زیادہ ترقی نظر آئی، مگر پان اسلام ازم کی تمام بحث و گفتگو کے باوجود وہ ایک اچھے ہندستانی، قوم پرور اور محبّ وطن انسان ہیں۔ اگر برطانوی ان کے ساتھ کھیل رہے ہیں تو وہ بھی برطانویوں کے ساتھ کھیل رہے ہیں۔''(۱)

پروفیسر کیپلینڈ (جن کو آکسفورڈ یونیورسٹی کی طرف سے ۱۹۴۱ء میں ہندستان کے مسایل کی تحقیق کے لیے بھیجا گیا تھا اور وہ تحقیقات ختم کرنے کے بعد سر اسٹیفورڈ کرپس کے

(۱) مدینہ، بجنور، ۹رجون ۱۹۴۳ء

عملہ مشیران کے رکن ہو گئے تھے) اپنی یادداشت کے ساتویں باب ''ڈسٹرسٹ اور ڈسیونین'' میں لکھتے ہیں:

''پیر پور رپورٹ میں مندرجہ اور دیگر داستان ہائے مظالم جو کانگریس وزارتوں کی طرف منسوب کیے گئے ہیں، کوئی وزن نہیں رکھتے۔ میں نے مسٹر جناح سے ان کے سلسلے میں جس قدر گفتگو کی، میں سمجھتا ہوں وہ ان کو یا کانگریس کی اسلام دشمن روش کو نہیں ثابت کر سکے۔''

(ح) یہ اسکیم اس لیے بنائی گئی ہے کہ برطانوی اقتدار ہمیشہ تمام ہندستان پر یا کم از کم مسلم ہندستان (پاکستان) پر قایم رہے۔ ہمیشہ سے یہی اصول برطانیہ ہندستان پر قبضہ کرنے میں (اختیار) کرتا ہے، اور یہی اصول اب تک اس کی حکومت کی بقا میں کار آمد ہوا، یعنی ''ڈیوائڈ اینڈ رول'' (لڑاؤ اور حکومت کرو) اگر دو ٹکڑے ہندستان کے ہو جائیں گے تو برطانیہ کو آپس میں لڑانے اور پھر چودھری بن کر اُن کے تحفظ کے بہانے سے حکومت کرنے کا موقع ہاتھ آئے گا، مگر ایک فیڈریشن ہونے کے وقت میں ہندستان برطانیہ سے بالکل بے نیاز ہوگا، جس سے صلح کرے گا یا جنگ کرے گا، وہ بیرونی طاقت ہوگی۔ اس میں برطانیہ کی چودھراہٹ کی ضرورت نہ ہوگی، نہ امن وامان کے بہانے سے اس کو مداخلت کرنے کا موقع ہوگا۔

ڈاکٹر سر اقبال مرحوم اپنے خطبۂ اجلاس لاہور ۱۹۳۲ء میں فرماتے ہیں کہ:

''لیکن حکومتِ برطانیہ کا موجودہ رویہ مظہر ہے کہ وہ ہندستان میں غیر جانبدار ثالث کی حیثیت سے عامل رہنے کی صلاحیت نہیں رکھتی اور بالواسطہ گویا ہندستانی اقوام یعنی ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک قسم کی خانہ جنگی کی طرف لے جا رہی ہے، جو محض اس غرض سے انگریزوں نے اختیار کر رکھی ہے، کہ ہندستان میں اپنی پوزیشن کو سہولت کے ساتھ قایم رکھ سکیں۔''

چنانچہ مسٹر جناح کا مندرجہ ذیل بیان اس پر بخوبی روشنی ڈالتا ہے۔ نئی دہلی ۲۹ر فروری ۱۹۴۴ء نیوز کرانیکل لندن کی دعوت پر مسٹر جناح نے پاکستان کے مسئلے پر مندرجہ ذیل بیان

دیا ہے:

"اگر برطانوی حکومت ملک کو دو ٹکڑے کر دے تو تھوڑے عرصہ کے بعد جو ۳ ماہ سے زیادہ نہ ہوگا ہندو لیڈر خاموش ہو جائیں گے، اور جب تک دونوں ٹکڑے آپس میں امن سے نہ رہیں تب تک برطانوی حکومت کا فوجی اور خارجی کنٹرول ضروری ہے، اس صورت میں مصر کی طرح کم از کم ہم اندرونی طور پر تو آزاد ہوں گے، آج بھی اصولاً پانچ صوبوں میں پاکستانی حکومتیں مسلم لیگ کے ماتحت قایم ہیں، اور ہندو وزیر اُن میں کام کر رہے ہیں، پاکستان کی قایمی میں ۴/۳ ملک ہندوؤں کے زیر اثر ہوگا، اور ۴/ ا مسلمانوں کے، نیز پاکستان کے قایم ہونے سے دایمی امن کی امید ہے۔"(۱)

اسی بیان پر ڈاکٹر عبداللطیف صاحب حیدر آبادی جو کہ پاکستان کے بہت بڑے حامی ہیں اور اس کے متعلق مفصل کتاب لکھنے والے ہیں اور ایک عرصہ تک لیگ کے ذمے دار عہدہ دار رہے ہیں، فرماتے ہیں:

"حیدر آباد، ۴ر مارچ ۱۹۴۴ء ڈاکٹر سیّد عبداللطیف صاحب نے مسٹر جناح کے اس بیان پر تبصرہ کرتے ہوئے جو انھوں نے نیوز کرانیکل کے نمایندہ کو دیا ہے، فرمایا کہ:

اب مسلمانوں کو دیکھنا چاہیے کہ ان کے قاید اعظم ان کو کدھر لیے جا رہے ہیں؟ میں ابتدا ہی سے جانتا تھا کہ مسٹر جناح پاکستان کے لیے سنجیدہ نہیں ہیں، اب انھوں نے ظاہر کر دیا ہے کہ وہ قطعی آزاد پاکستان کے خواہشمند نہیں ہیں، وہ والیِ ملک کے بغیر ایک ایسی ریاست کے خواہشمند ہیں، اور چاہتے ہیں کہ زیر سایۂ برطانیہ ایک طویل مدت میں یہ علاقے مصر کی حقیقت تک پہنچ جائیں جو قانونی طور پر تو آزاد ہیں مگر اپنے ہر کام میں برطانیہ کے چشم و ابرو کا منتظر ہے، انھوں نے کراچی میں "تقسیم کرو اور ہندستان سے چلے جاؤ" کا نعرہ لگایا تھا، مگر اب وہ

(۱) مدینہ، بجنور، نمبر ۱۷، جلد ۳۳، مورخہ ۵ر مارچ ۱۹۴۴ء

کہہ رہے ہیں کہ اس سے ان کا مقصد ''تقسیم کرو اور رہو'' تھا، وہ چاہتے ہیں کہ برطانوی طاقت ہندستان اور پاکستان دونوں جگہ رہے، اور دفاعی و خارجی مسایل کی مالک بنی رہے۔ یہ ہے مسٹر جناح کی آئینی ترقی کے متعلق نظریہ، کیا کوئی انگریز اس کے لیے ان کا شکریہ ادا کرے گا، میرے خیال میں برطانوی رجعت پسند بھی اس پالیسی پر افسوس ظاہر کریں گے، برطانیہ نے کرپس اسکیم کی رُو سے وعدہ کیا ہے کہ جنگ کے بعد ہندستان کو متحدہ طور پر یا علاقوں کی تقسیم کے بعد مکمل طور پر آزادی حاصل ہو جائے گی، بجاے اس کے کہ مسٹر جناح اس موقع سے فایدہ اٹھاتے ہوئے دوسری جماعتوں سے اتحاد کرتے، وہ موجودہ غلامی پر ہی قانع ہیں، کیا مسلم لیگ کے عام ممبران اس روش کی تائید کریں گے۔''(۱)

مسٹر جینا اور ڈاکٹر عبداللطیف کے اسی بیان کے متعلق ''مدینہ'' لکھتا ہے:

''مسٹر جناح کے پاکستان کی آزادی کا تصور بقول ڈاکٹر عبداللطیف اس سے آگے نہیں بڑھتا کہ رفتہ رفتہ وہ مصر کی موجودہ حیثیت کو پہنچ جائے اور مصر کی موجودہ حیثیت کیا ہے؟ مسٹر دلک جیسے ہوش منداور باخبر سیاست داں کی زبان سے سنیے، آپ نے اپنی مشہور تازہ تصنیف ''ایک دنیا'' میں لکھا ہے کہ مصر تمام عملی اغراض کے لیے برطانوی سفیر سر مائکس لیمپس کا محتاج ہے، اس کی رضامندی کے بغیر کچھ نہیں کرسکتا۔ مسٹر جناح چاہتے ہیں کہ ہندستان اور پاکستان بھی اسی بالادستی کی نعمت سے بہرہ مند ہوں۔''(۲)

اجمل، بمبئی، اپنے اڈیٹوریل میں حسب ذیل بیان دیتا ہے:

''مسلمانوں کے لیے لمحہ فکریہ: مسلم لیگ کے قاید اعظم مسٹر جینا نے لندنی اخبار نیوز کرانیکل کے نمایندے کو جو رجعت پسندانہ بیان دیا ہے ہم اس سے قبل تبصرہ کر چکے ہیں، اس بیان نے پاکستان کے بارے میں مسٹر جینا اور انھی کے ساتھ

---

(۱) اجمل۔ بمبئی، جلد ۱۷، ۶ر مارچ ۱۹۴۴ء

(۲) مدینہ، ۱۳ر مارچ ۱۹۴۴ء، نمبر ۱۹، جلد ۳۳

پوری مسلم لیگ کی (کیوں کہ اس کے کرتا دھرتا مسٹر جینا ہی ہیں) پوزیشن کو حد درجے مضحکہ خیز بنا دیا ہے، اور در حقیقت انھیں بے نقاب کر دیا ہے، اس وقت ہمارے سامنے اس بیان پر ڈاکٹر سیّد عبداللطیف صاحب کی تنقید ہے، جو انھوں نے اسی بیان سے متاثر ہو کر کی ہے، ڈاکٹر سیّد عبداللطیف اُن لوگوں میں نہیں ہیں جنھیں پاکستان کا مخالف کہا جا سکے، بلکہ وہ تو اس بات کے مدعی بھی ہیں کہ پاکستان کا خیال انھی نے پہلے پیش کیا، اور کلچرل یا تہذیبی منطقوں میں ہندستان کے متعلق ایک اسکیم کے تحت وہ مرتب بھی ہیں جسے انھوں نے اپنی ایک تصنیف میں پیش بھی کیا ہے، جب ایک ایسا شخص بھی مسٹر جینا کے طرزِ عمل پر اتنی سخت تنقید کرتا ہے جتنی کہ ڈاکٹر صاحب موصوف نے کی ہے تو اسے محض سیاسی مخالفت کی بنا پر قرار دے کر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا...''(۱)

---

(۱) اجمل، بمبئی: ۷؍مارچ ۱۹۴۴ء

(۶)

پاکستان کس نے بنوایا؟

عارف میاں نے مختلف اہلِ نظر و تدبر سے ''تقسیم ملک اور قیامِ پاکستان'' کے بارے سوالات پوچھے تھے۔ ان کے جوابات ذیل میں درج کر دیے جاتے ہیں:

۱۔ میں سمجھتا ہوں کہ دخل ہوگا انگریزوں کا بھی، جناح کا بھی، لیکن پاکستان بنانے پر سب سے زیادہ زور کانگریس کی قیادت نے دیا۔ وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ اگر ہم کو ہندستان (کی آزادی) حاصل کرنا ہے تو یہ قربانی دے کر ہی حاصل کر سکتے ہیں۔ ان کو الگ کریں تو ہندستان کو آزادی ملے گی۔ (پروفیسر جمال نقوی: ص ۱۵۵)

۲۔ رضا کاظم نے ایک امریکی صحافی کے حوالے سے جس نے اکتوبر نومبر ۱۹۴۷ء میں مسٹر جناح سے ملاقات کی تھی، لکھا ہے کہ اس (صحافی) نے جناح صاحب سے کہا:

''صدی کے دو عظیم آدمیوں میں سے ہیں، ایک بسمارک تھا جس نے چیکوسلواکیا کا ملک بنایا، ایک آپ ہیں۔ آپ نے بھی ایک ملک بنایا ہے۔

جناح صاحب نے کہا:

''نہیں، پاکستان میں نے نہیں بنوایا۔ پاکستان کا سارا اعزاز (credit) کانگریس کو جاتا ہے، دوسرے نمبر پر انگریزوں کو، تیسرے نمبر پر مسلم لیگ کو اور چوتھے نمبر پر میں ہوں۔'' (ص ۱۸۲)

۳۔ ہندستان کی تقسیم سے انگریزوں کو یقیناً دلچسپی تھی۔ وہ دو ملک بنا کر جانا چاہ رہے تھے! (احمد سلیم صاحب، ص ۲۴۵)

۴۔ عارف میاں نے کانگریس اور جناح صاحب کے بارے میں سعید حسن خاں سے پوچھا تھا کہ آیا ان دونوں نے تقسیم ملک اور قیامِ پاکستان کو بہ خوشی قبول کیا تھا؟ اس کے جواب میں سیّد صاحب نے فرمایا:

''خوشی سے تو تقسیم کو جناح صاحب نے قبول کیا ہے نہ کانگریس نے! مگر دونوں نے قبول کیا!'' (ص ۳۲۵)

یہ چاروں حوالے عارف میاں کی تالیف ''برصغیر کیسے ٹوٹا'' سے ماخوذ ہیں۔

۵۔ اسی نوع کا ایک سوال احسان وائیں صاحب سے پوچھا گیا تھا۔ اس کے جواب میں انھوں نے فرمایا:

''انگریز کی ذاتی دلچسپی یہ تھی کہ انڈیا بہت بڑا ملک تھا (زور دیتے ہوئے) بہت بڑا ملک تھا۔ انگریز نے دیکھا ہوا تھا، انگریز لوٹ مار کر کے بہت امیر بھی ہوا تھا۔ وہ اس کو بطور ایک ملک مکمل آزاد کرنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ مذہب کی بنیاد پر میں یہ تقسیم کرواؤں۔ کیونکہ یہ ایسا ظالمانہ فعل ہوتا ہے کہ پھر یہ سالہا سال جنگ وجدل کا باعث بنتا ہے۔ ملک تباہ ہوتے رہتے ہیں۔ غربت گھٹا باندھ کے آتی ہے۔ لوگ برباد ہوتے ہیں۔ وہ یہ کام کر گئے۔ اور پھر یہی ہوا کہ دونوں ممالک، انڈیا اور پاکستان اپنی فوج بناتے رہے۔ غربت بڑھتی رہی۔ ہم تو بالکل برباد ہوئے۔ انڈیا بڑا ملک تھا۔ وسائل زیادہ تھے۔ بندرگاہیں تھیں، لوہا تھا، گیس تھی، پٹرول تھا، یعنی قدرتی وسایل تھے۔ جو ہمارے پاس نہیں تھے۔ ہم نے بغیر وسایل کے سارا خرچہ فوج پر کیا۔ آج تک 70 فیصد بجٹ فوج کھا رہی ہے۔ بدحالی اتنی ہے کہ مائیں بچوں کے ساتھ خودکشیاں کر رہی ہیں۔ اس نفرت، جو کہ ہندو مسلم بنیاد پر پیدا ہوئی، اس کے تحت انگریز نے ہجرت کرواتے ہوئے ان کو آپس میں لڑوایا۔ اتنے بڑے لیڈر کانگریس میں تھے! محمد علی جناح کے پاس تو ویژن ہی نہیں تھا۔ ان سب کا خیال تھا کہ ہجرت نہیں ہوگی۔ اگر مذہب کی بنا پر کسی خطے کو تقسیم کیا جائے اور لوگ مذہب کی بنیاد پر لڑ رہے ہوں تو کیسے ہو سکتا ہے کہ ہجرت نہ ہو؟ ہجرت تو ہونا تھی اور ہوئی۔ اس کے نتیجے میں بے پناہ لوگ قتل ہوئے، عورتیں اغوا ہوئیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ ادھر سے محمد علی جناح اور ادھر سے بڑے لیڈر مہاتما گاندھی، پنڈت جواہر لعل نہرو اور دوسرے ان کی ویژن کی

کمزوری تھی۔

ایک میں بات بتاؤں، بڑے دانشور کہتے ہیں، انگریز اگلے سو سال کی سوچتا تھا۔ ٹھیک ہے بڑے عقلمند ہوں گے لیکن ان کے تصور میں بھی نہیں تھا کہ چین انڈیا کے بعد آزاد ہوگا اور وہ کمیونسٹ ملک کے طور پر آہستہ آہستہ اتنی بڑی قوت بنے گا۔ اگر انھیں یہ علم ہوتا تو پاکستان کبھی نہ بنتا، انڈیا متحد ہوتا۔

احسان وائیں سے ایک سوال اور اس کا جواب:

آپ نے کہا، مسلم لیگی محمد علی جناح کے طفیلیے تھے۔ یہ بھی آپ نے کہا کہ مسلم لیگ نے پاکستان کے لیے کوئی جدو جہد نہیں کی تھی۔ کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ جناح صاحب بھی......؟

وائیں صاحب کا جواب یہ تھا:

''اس کو ہم ذرا ایسے کہہ سکتے ہیں کہ آیا انھوں نے بھی کسی کے ایما پر یہ کیا؟ تو تاریخی حوالوں سے ایسا ہی محسوس ہوتا ہے کہ انگریز چاہتا تھا کہ ہندستان کو تقسیم کرے۔''

(۷)

پاکستان مسلم لیگ کا نہیں انگریز کا پلان تھا!

نسیم حسن شاہ

لاہور (وقایع نگار خصوصی) سابق چیف جسٹس آف پاکستان جسٹس (ریٹایرڈ) نسیم حسن شاہ نے کہا کہ پاکستان مسلم لیگ نے نہیں بنایا تھا، تقسیم ہند انگریز کا پلان تھا، جس پر تمام پارٹیاں متفق ہوگئی تھیں اور پاکستان بن گیا۔ ان خیالات کا اظہار انھوں نے گزشتہ روز ایوانِ کارکنان تحریک پاکستان میں منعقدہ ایک تقریب سے خطاب کے دوران کیا۔ ان کے اس بیان پر ہال سے باہر لے جا کر انھیں سمجھایا گیا کہ وہ غیر ذمہ دارانہ بیان نہ دیں۔ لیکن وہ بدستور اپنے بیان پر اَڑے رہے، بلکہ وضاحت سے انھوں نے دوبارہ اپنا بیان مزید پیچیدہ کر لیا اور اعادہ کر گئے کہ پاکستان مسلم لیگ نے نہیں بنایا۔ تقریب کے حاضرین نے ان سے شدید اِختلاف کیا۔ لیکن وہ اپنی رائے پر مصر رہے۔

شرکا جلسہ نے ان کی رائے سے شدید اختلاف کیا۔ ایم اے صوفی نے وضاحت سے بتایا کہ نسیم حسن شاہ کی رائے خلاف واقعہ ہے۔ پاکستان مسلم لیگ نے بنایا ہے۔ [۱]

---

(۱) روز نامہ انصاف، لاہور، ۵/جون ۲۰۰۴ء، ص ۱+۶۱، ۶۲

(۸)

پاکستان

حقایق......حقایق ہیں!

خان عبدالولی خاں کی سیاست اور ذوقِ مطالعہ کا ایک خاص پس منظر ہے۔ موسم کی تبدیلی سے متاثر ہونا ان کے ذوق و مزاج کا خاصہ نہیں۔ اسی کے مطابق انھوں نے ''حقایق......حقایق ہیں!'' کی صورت میں اپنی کاوشوں کو مرتب کر دیا تھا۔ لیکن ۱۹۸۸ء موسم دوسرا تھا اور ہر کسی کو گوارا نہ ہو سکتا تھا۔ یہ تداخلِ موسم کا وقت تھا اور بعض تبدیلی موسم سے بہت جلد متاثر ہو جاتے ہیں، وہی ہوا۔ موسم کی تبدیلی کے آثار بہت سے پیدا ہو چکے تھے، لیکن اس کی تبدیلی کے آثار اتنی سست رفتار سے تھے کہ کسی کو احساس بھی نہ تھا لیکن ایک صبح اخبار آئے تو معلوم ہوا کہ موسم بدل چکا ہے اور کتنے ہی اہلِ قلم موسم کی تبدیلی سے متاثر ہو چکے ہیں اور حواس باختہ ہیں اور کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کیا وقت آ پڑا ہے۔ ایک ہنگامہ برپا ہوا اور پھر سناٹا چھا گیا۔

لیکن اب چند سال سے انھیں شخصیات اور مسایل پر ملک اور بیرونِ ملک سے جو کچھ آ رہا ہے اس پر ہنگامہ نہیں قیامت برپا ہونا چاہیے تھی۔ لیکن یہ تاریخ کا جبر ہے۔ سچائی کے سامنے کوئی سر اُٹھا نہیں سکتا۔ ثابت ہو گیا ہے کہ

حقایق......حقایق ہیں!

قافلۂ حقایق و صداقت بہت دور نکل گیا ہے...... بہت دور! حقیقت اور سچائی سے کوئی روگردانی نہیں کر سکتا۔ حقایق کو تاریخ کے طور پر پڑھو اور سب کچھ بھول جاؤ! اِلّا پاکستان کے! پاکستان کے حفظ و بقا اور ترقی میں قوم و ملت کی بقا اور عزت و آبرو کی زندگی اسی سے وابستہ ہے!

(ا۔س۔ش)

❖

وایسرائے نے یہ بات بار بار مسلمانوں کے رہنماؤں یعنی سر سکندر حیات اور مولوی فضل الحق سے کہی کہ مسلمان چیخ رہے ہیں کہ اختیارات کانگریس کو منتقل نہ کیے جائیں، یا مرکز میں انتخابات نہ کرائیں تو یہ ایک منفی (Negative) سوچ ہے اور اس میں وایسرائے اور وزیرِ ہند کو یہ مشکل درپیش ہے کہ وہاں وہ انگلستان میں پارلیمنٹ کے ممبروں کو اس بات پر مطمئن نہیں کر سکتے کہ کانگریس نے انتخابات جیت لیے ہیں تو کیوں نہ انھیں اختیار دے دیا جائے۔ وایسرائے نے یہ بات کئی بار مسلمانوں کو بتائی کہ تمھیں چاہیے کہ کوئی مثبت (Positive) اور تعمیری (Constructive) تجویز پیش کریں۔ کیوں کہ جمہوریت کا راستہ روکنے کے لیے اقلیت کو یہ اختیار دے دیں کہ وہ اکثریت کا راستہ روکے اور آئینی، قانونی اور جمہوری مطالبات کو مسترد (Veto) کر دے۔ اس بات کو مہذب دنیا کسی صورت میں قبول نہیں کرتی اور یہی بات سر سکندر حیات خان سے بھی کی ہے تو اس کے متعلق وایسرائے (اپنی رپورٹ میں) وزیرِ ہند کو لکھتا ہے:

(انگریزی)...

(ترجمہ) ''وہ (سکندر حیات) برطانیہ میں کسی قسم کی بھی تشہیر کے لیے جو تعمیری تجاویز ہیں اور ان کے لیے کیا لائحہ عمل اختیار کیا جائے، ان کے بارے میں تفصیلاً جانتا ہے اور اس کی ضرورت و اہمیت سے بھی واقف ہے۔ وہ مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی کے ۳ر فروری (۱۹۴۰ء) کے اجلاس کی کارروائی سے بھی مجھے رازداری کے ساتھ آگاہ کرے گا۔''(۱)

(۱) یہ اشارہ مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی کے اس جلسے کی طرف ہے، جس میں فارن کمیٹی کے تحت تقسیم ملک کے لیے ایک اسکیم بنانے کے لیے وایسرائے کی مرضی کے مطابق ایک سب کمیٹی بنائی گئی تھی، جس کے کنوینر کمیٹی کے چیئرمین سیٹھ عبداللہ ہارون اور سیکرٹری علی محمد راشدی تھے۔ ورکنگ کمیٹی کی یہ میٹنگ ۳ر فروری ۱۹۴۰ء کو دہلی میں لیاقت علی خاں کی کوٹھی ''گل رعنا'' میں ہوئی تھی۔

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر......)

سکندر حیات وایسرائے کو تسلی دیتا ہے کہ مسلم لیگ جب اس کے متعلق کوئی فیصلہ کرے گی تو میں تمھیں خفیہ طور پر (Confidentially) بتا دوں گا۔

چناں چہ مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی کے اس اجلاس کے بعد سکندر حیات اور مولوی فضل حق دونوں اکٹھے وایسرائے سے ملنے گئے تھے۔ وایسرائے لکھتا ہے، سکندر نے مجھے بتایا:

(انگریزی)...

(ترجمہ) ''... مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی نے ایک سب کمیٹی بنائی ہے تا کہ ایک تعمیری پروگرام مرتب کرے۔ میں نے کہا کہ مجھے یہ جان کر بے حد خوشی ہوئی اور اس کی تمام شرایط وغیرہ جاننے کا بے تابی سے انتظار کروں گا۔''

مسلم لیگ کی اس ورکنگ کمیٹی کے اجلاس کے بعد ۶رفروری ۱۹۴۰ء کو جناح صاحب نے خود وایسرائے کو اس فیصلے سے مطلع کیا۔ وایسرائے لکھتا ہے:

After the usual compliments he (Jinah) opened the proceedings by asking me what were we to do assuming that we meant Muslim League.

(ترجمہ) ''روایتی تکلّفات کے بعد مسٹر جناح نے کمیٹی کی تمام کارروائی کی تفصیل بتلائی اور مجھ سے پوچھا کہ اگر ایسی صورت مسلم لیگ میں ہو تو ہمیں کیا کرنا چاہیے۔''

خان عبدالولی خان اس ملاقات پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''یہ ایک طویل ملاقات ہے۔ وایسرائے اور جناح صاحب کے درمیان بہت سی

یہ کمیٹی چوں کہ وایسرائے کی مرضی کے مطابق قایم ہوئی تھی، اس لیے اگلے روز (۴رفروری کو) سکندر حیات خاں وزیرِ اعلیٰ پنجاب اور مولوی فضل الحق وزیرِ اعلیٰ بنگال وایسرائے ہند سے ملنے کے لیے گئے اور اسے یہ خوش خبری سنائی کہ کمیٹی قایم کر دی گئی ہے۔ وایسرائے نے کہا کہ اب اس کی کارگزاری سے مجھے مطلع کرنا۔ ۶رفروری کو مسٹر محمد علی جناح وایسرائے سے ملنے کے لیے گئے اور اسے بتایا کہ وہ کمیٹی تو بنا دی گئی۔ مسلم لیگ کے لیے اور کوئی خدمت بتایئے؟ یہ تفصیل چوں کہ آگے صفحات میں متن کا حصہ ہے، یہاں اس کے بیان کی ضرورت نہیں!

مطلب کی باتیں ہوئیں۔ کیوں کہ وائسرائے کہتا ہے کہ جناح صاحب نے خود مجھ سے سوال کیا کہ اب ہم (مسلم لیگ) کیا کریں۔ اس کا مطلب اور کیا ہو سکتا ہے کہ مسلم لیگ کا صدر خود آتا ہے اور وائسرائے سے یہ معلوم کرنا چاہتا ہے کہ اب ہمیں کیا کرنا چاہیے؟ وائسرائے نے یہ بات پھر دہرائی اور کہتا ہے کہ میں تو اس بات کی تکرار سے تنگ آچکا ہوں۔''

وائسرائے اپنی رپورٹ میں لکھتا ہے:

(انگریزی)...

(ترجمہ) ''کسی قسم کی بات طے کرنے کے خطرے کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے میں نے اپنی مجبوری ایک بار پھر دُہرائی کہ ایک ایسی پارٹی [جیسی کہ مسلم لیگ ہے] کے لیے جس کی پالیسی صرف منفی ہو، میں حکومتِ برطانیہ سے تعاون کے لیے نہیں کہہ سکتا۔''

خان عبدالولی خاں اس ملاقات کی مزید تفصیل اور گفتگو پر یہ تبصرہ کرتے ہیں:

''یہ ایک بہت ہی عجیب ملاقات ہے۔ وائسرائے جمہوریت اور منتخب وزارتوں کی بات کرتا ہے اور جناح صاحب کہتے ہیں کہ یہ لارڈ ولنگڈن کا زمانہ نہیں۔ آج کانگریس کی آٹھ صوبوں میں وزارتیں ہیں۔ کل کو اگر چاہیں تو یہی وزارتیں واپس لے سکتے ہیں۔ لیکن جناح صاحب اس بات پہ مصر ہیں کہ جب تک تم کانگریس کو دوٹوک جواب نہ دو اور بات ختم نہ کر دو، ہم تم پہ اعتبار نہیں کر سکتے۔ کانگریس کی وزارتوں کے موضوع پر جناح صاحب سے اور بات ہوئی۔ وہ ایک وزارت میں بہت دلچسپی رکھتے تھے۔ اور وہ تھی صوبہ سرحد کی وزارت! ایک گزشتہ ملاقات میں وائسرائے نے جناح صاحب کو کہا تھا کہ اگر تم کوشش کرو تب بھی صوبہ سرحد میں وزارت نہیں بن پائے گی۔ جناح صاحب نے وعدہ کیا تھا۔ میں اپنے ساتھیوں سے ملاقات کرلوں گا تو پھر بتادوں گا! پھر اس بات کے متعلق وہ کہتا ہے کہ ''میں نے اپنے ساتھیوں سے مشورہ کرلیا۔'' وہ کہتے ہیں کہ ''ہم خود سے وزارت بنانے کے قابل نہیں۔ لیکن اگر گورنر سر جارج کنگھم ان کی

مدد کرے تو پھر کام بن سکتا ہے۔"(۱)

اور پھر جناح صاحب نے اس وزارت کے بنانے کی خوبیاں اور فوائد بیان کیے کہ وایسرائے ضرور کننگھم کو بتا دے۔ وایسرائے لکھتا ہے:

(انگریزی)...

(ترجمہ) "مسٹر جناح نے مزید کہا کہ اگر ممکن ہے تو وہ یہ بات آگے بڑھانے کے لیے بہت بے چین ہیں۔ کیوں کہ سرحد میں غیر کانگریسی وزارت کے قیام سے زیادہ کانگریس کے لیے اور کوئی بات غیر سود مند اور نقصان دہ نہیں ہو سکتی اور خود ملک میں بھی اور باہر بھی ہندستان کی حقیقی صورتِ حال کی تشہیر کے لیے اس سے بہتر اور کوئی موضوع نہیں ہو سکتا۔ اس لیے اس کی زبردست خواہش ہے کہ اس مسلے کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا جائے۔"

تبصرہ ولی خان:

حقیقت بھی یہی تھی کہ مسلم لیگ اور انگریز کی مشترکہ پالیسی اور منصوبے میں سب سے بڑی رکاوٹ بھی صوبہ سرحد تھی۔ کیوں کہ اس صوبے میں ہندستان کے سب صوبوں سے مسلمانوں کا تناسب زیادہ تھا اور یہی صوبہ روس کی طرف سرحد پر بھی واقع تھا۔ وہاں جب مسلم لیگ کی بجائے خدائی خدمت گاروں کی وزارت ہو گی تو یہ بات نہ انگریز کی داخلی پالیسی میں اور نہ ہی خارجی پالیسی میں ٹھیک بیٹھتی تھی۔ مطلب یہ کہ نہ کانگریس کے خلاف اور نہ ہی انگریز کی حکومت برقرار رکھنے کے لیے یہ حکومت استعمال کی جا سکتی تھی۔ جناح صاحب کا اشارہ اس طرف تھا۔"اس صوبے میں ایک غیر کانگریسی حکومت قایم کرنا اس لیے ضروری تھا کہ ملک کے اندر اور بیرونی دنیا پر اس کا اچھا اثر پڑتا۔ تو اس لیے کننگھم کو چاہیے کہ وہ اس صوبے میں مسلم لیگ کی وزارت قایم کرے۔ حال آں کہ حالت یہ تھی کہ اس صوبے میں گزشتہ انتخابات میں مسلم لیگ کے نام سے کسی نے انتخاب ہی نہیں لڑا تھا۔

---

(۱) وایسرائے سے جناح صاحب کی ملاقات "ایک گزشتہ ملاقات" سے بعد کی ملاقات ہے، جب انھوں نے اپنے ساتھیوں سے ملاقات کر لی تھی۔ ولی خان کے اس پر تبصرے کے بعد کسی تبصرے کی ضرورت نہیں۔

اس لیے اسمبلی میں مسلم لیگ کا ایک ممبر بھی نہیں تھا۔"

وایسرائے نے جناح صاحب سے وعدہ کیا، انھیں تسلی دی کہ:

I would communicate his (Jinah) views to the Governor and he and his friends would in due course and by one means or other, be put in possession of the governor's view.

(ترجمہ) "میں مسٹر جناح کی تجاویز گورنر تک پہنچا دوں گا۔ جناح اور اس کے رفقاء مناسب وقت پر کسی نہ کسی صورت گورنر کے خیالات سے آگاہ کر دیے جائیں گے۔"

تبصرہ خان ولی خاں:

اس سے صاف یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ اس وقت مسلم لیگ اور انگریز بالکل ایک ہی مقام پر کھڑے تھے اور جس طرح جناح صاحب نے بڑی بے باکی سے یہ سوال کیا تھا کہ اب ہم کیا کریں گے، اسی طرح بے باکی سے وایسرائے نے بھی دل جمعی سے باتیں کیں۔

لیکن جناح صاحب کو بھی یہ معلوم تھا کہ انگریز کے اپنے مفادات کا تقاضا بھی یہی ہے کہ وہ اپنا گروہ مضبوط کرے۔ اس زمانے میں جناح صاحب نے وایسرائے کو یہ بھی تجویز پیش کی کہ وہ سندھ میں اللہ بخش سومرو کی وزارت توڑ دے۔ جناح صاحب وایسرائے کو کہتے ہیں:

(انگریزی)...

(ترجمہ) "لیکن وزیر اعلیٰ (سندھ) نے حال ہی میں تقاریر کی ہیں جس کی کاپی وہ مجھے بھیجے گا، کے باعث اگر وزیر اعلیٰ برسرِ اقتدار رہا تو سندھ میں صورتِ حال ناممکن ہو جاتی ہے۔ میں نے کہا کہ ان کا متن دیکھوں گا۔"

انگریز کی یہ کوشش تھی کہ وہ ہندستان کے تمام مسلمانوں کو یہ سمجھا سکیں کہ وہ انگریز سے اگر کسی بھی بھلائی کی امید کریں تو انھیں چاہیے کہ مسلم لیگ میں شامل ہو جائیں۔ وایسرائے نے نہ اس بات میں کبھی عار محسوس کی اور نہ ہی سستی۔ اس نے محسوس کیا کہ وہ یہاں تک تو

آن پہنچا اور حالات کو بھی یہاں تک پہنچا دیا ہے۔

وایسرائے نے ۲۱؍فروری ۱۹۴۰ء کو اپنے ان خیالات سے وزیر ہند کو مطلع کیا کہ:

All I can say is that if congress are set on having a fight here, they are going to have a fight not only with us, but with the Muslims (I am glad that Jinnah has made the statement).

(ترجمہ) ''اگر کانگریس یہاں مقابلہ کرتی ہے تو وہ نہ صرف ہم سے لڑے گی بلکہ مسلمانوں سے بھی لڑنا ہوگا۔ (میں خوش ہوں کہ مسٹر جناح نے اس بارے میں بیان دے دیا ہے)۔''

تبصرہ خان ولی خان:

وایسرائے کہتا ہے کہ میں نے مسلمانوں کے ساتھ اپنا سمجھوتا مضبوط کر لیا ہے اور اس مرتبہ کانگریس کی لڑائی صرف انگریز سے نہیں بلکہ مسلمانوں سے بھی ہوگی۔ میں حالات یہاں تک سازگار بنا چکا ہوں۔ اور آپ کو کیا چاہیے؟

اس وقت مسلم لیگ کی حیثیت ریت کی بوری کی تھی جو انگریزوں نے اپنے سامنے رکھ کر مورچہ بنا دیا تھا کہ اگر کانگریس کی طرف سے وار ہوگا تو وہ اس پر پڑے گا۔ اگر بوری چھلنی ہو جائے تو اس سے انگریز کا کیا بگڑتا ہے۔ اس کا مطلب تو صرف کانگریس کے وار سے اپنا بچاؤ تھا۔ اگر مسلمان اس بات پر رضامند تھا کہ انگریزوں کی غلامی کا طوق صرف اپنے گلے ہی میں نہیں بلکہ پورے ہندستان کے گلے میں ڈالے تو اس سے بڑھ کر نیکی وہ انگریزوں کے ساتھ اور کیا کر سکتا تھا۔

(۹)

پاکستان کی مختلف تاویلیں

چوں کہ انگریز نے عموماً اور وایسرائے لارڈ لنلتھگو نے خصوصاً مسلم لیگ کے رہنماؤں پر یہ بات واضح کر دی تھی کہ برطانیہ کے حکمرانوں کو منفی سیاست سے مطمئن نہیں کیا جا سکتا۔ انھیں چاہیے کہ کوئی مثبت اور تعمیری منصوبہ پیش کریں اور ایسا ہی مطالبہ سر سکندر حیات کی معرفت مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی کو بھی پیش کیا تھا۔ ہر ایک اپنی اپنی طرف سے مختلف طریقوں سے ایسا ہی منصوبہ بنانے کی فکر میں لگا ہوا تھا۔

چودھری خلیق الزماں:

وزیرِ ہند کو وایسرائے نے لکھ دیا تھا کہ چودھری خلیق الزمان نے بمبئی کے گورنر Lunweby (لملبے) کو کہا تھا کہ حکومت کو چاہیے ہندستان کو تین ڈومینین میں تقسیم کرے۔ یوں لگتا ہے کہ چودھری صاحب ہندو اور مسلم کے علاوہ والیانِ ریاست کی بھی ایک ڈومینین قایم کرنا چاہتا تھا۔

سردار اورنگ زیب کی اطلاع:

دوسری طرف سرحد کے گورنر سر جارج کنگھم نے وایسرائے کو لکھا ہے کہ جب سردار اورنگ زیب مسلم لیگ کی مرکزی مجلسِ عاملہ کے اجلاس سے آیا تو اس نے کہا کہ:

(انگریزی)...

(ترجمہ) ''مسلم لیگ ہندستان میں چھ یا سات خود مختار ریاستیں بنانے کی اسکیم پر غور کر رہی ہے اور اس انوکھی اسکیم کے پردے میں ہی اصل پاکستان کی تجویز پنہاں ہے۔''

فیروز خان نون:

اس سے بہت پہلے وزیر ہند لارڈ زٹلینڈ سر فیروز خان نون سے اپنی ایک ملاقات کا حال بیان کرتا ہے کہ میں نے اس سے تفصیلی باتیں کیں۔ اس نے کہا کہ ہندستان کا شمال

مغربی حصہ برما کی طرح ہندستان سے الگ کر کے پاکستان کے نام پر ایک الگ مملکت بنا دیں۔ وزیرِ ہند کہتا ہے کہ:

(انگریزی)...

(ترجمہ) ''اور اس نے کہا کہ اگر ایسا معاملہ ہے تو ہندستان واپس جا کر اس پر زور نہیں دے گا۔''

(یہ خط ۱۳؍دسمبر ۱۹۳۸ء کا ہے):

یہ تو مختلف منصوبے تھے۔ کیمرج کے ایک طالب علم چودھری رحمت علی کا پاکستان کا اپنا نظریہ تھا۔ سر محمد اقبال نے اپنی تجویز پیش کی۔ اب دیکھتے ہیں کہ بڑا استاد انگریز خود کیا کہتا ہے۔

انگریز کا پاکستان

چودھری ظفر اللہ خان اور اس کا منصوبہ:

جب سکندر حیات خان اور مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی سے بات نہ بنی تو انگریز نے مسلمانوں کے تمام منصوبے نامنظور کر دیے اور وایسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کے ایک ممبر چودھری ظفر اللہ کو کہا گیا کہ تم دو ڈومینین کا (یعنی ملک کی تقسیم کی بنیاد پر مبنی) ایک نقشہ پیشہ کرو۔ اس کے متعلق وایسرائے لنلتھگو ۱۲؍مارچ ۱۹۴۰ء کو وزیرِ ہند کو لکھتا ہے:

''میرے کہنے پر ظفر اللہ نے دو ڈومینین اسٹیٹس کے متعلق ایک یادداشت لکھی تھی، جو میں پہلے بھیج چکا ہوں۔ کہتا ہے، میں نے کچھ اور وضاحتیں طلب کی ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ تفصیلات میں بعد میں پیش کروں گا۔ لیکن اس (ظفر اللہ) کی یہ خواہش ہے کہ یہ بات کبھی بھی ظاہر نہ ہونے پائے کہ یہ خاکہ اُس نے پیش کیا ہے۔ اس (ظفر اللہ) نے البتہ مجھے یہ اختیار دیا ہے کہ میں جیسے چاہوں اس دستاویز کو اِستعمال کروں۔''

(انگریزی)...

(ترجمہ) "(ظفراللہ کی تیار کردہ اسکیم کی) ایک کاپی آپ کو بھیجنے کے علاوہ تین کاپیاں، ایک مسٹر جناح اور ایک سر اکبر حیدری وزیراعظم نظام حیدر آباد کے پاس جائیں گی اور چوتھی ظفراللہ خاں کو، جو یہ ماننے کو تیار نہیں کہ اس کا نام ظاہر کیا جائے کہ مسودہ اس نے تیار کیا ہے۔ اس کی یہ دستاویز مسلم لیگ کے اپنانے کے لیے تیار کی گئی تاکہ اس کی بھرپور تشہیر کی جائے۔"

آخری انڈر لائن سطور سے یہ بات قطعی طور پر معلوم ہو جاتی ہے، ۲۳ر مارچ ۱۹۴۰ء کو مسلم لیگ نے اجلاس لاہور میں جو قرارداد پاس کی تھی وہ چودھری ظفراللہ خاں قادیانی نے تیار کی تھی۔

وائسرائے وضاحت کرتا ہے کہ مسودہ تو میرے کہنے پر تیار ہوا ہے لیکن ظفراللہ چوں کہ قادیانی ہے، اگر مسلمانوں کو معلوم ہو جائے کہ یہ منصوبہ ایک قادیانی کا بنایا ہوا ہے، تو پھر وہ شک میں پڑیں گے۔ وائسرائے کس تسلی سے کھل کر کہتا ہے کہ اس کی ایک کاپی جناح صاحب کو دی گئی ہے تاکہ مسلم لیگ یہ منصوبہ اپنائے۔ اور اس کی تشہیر کرے۔ یعنی کہ یہ جناح صاحب کی پالیسی اور مسلم لیگ کی سیاست بن جائے۔ سر اکبر حیدری کو ایک کاپی اس غرض سے دی گئی ہے کہ اس کے لیے مالی امداد کی ذمہ داری ان کی تھی۔

ان تاریخوں کو ذرا غور سے دیکھیں۔ یہ خط وائسرائے نے ۱۲ر مارچ ۱۹۴۰ء کو لکھا ہے۔ منصوبہ تو پہلے ہی بھیجا جا چکا ہے اور مسلم لیگ نے یہی منصوبہ لاہور میں قراردادِ پاکستان کے نام سے اپنے سالانہ اجلاس میں منظور کر لیا اور تشہیر کی (مارچ میں سر ظفراللہ کی ایگزیکٹو کونسل کی ممبری کی میعاد ختم ہو رہی تھی۔ اسے ان خدمات کے صلے میں توسیع دی گئی)۔

مسلم لیگ کی اس تجویز کے پاس ہونے کے دو دِن بعد وائسرائے ۲۵ر مارچ ۱۹۴۰ء کو لکھتا ہے:

As congress are putting forwarded a preposterous claim (of being representative of the majority)

which they know is incapable of acceptance he (Jinnah) equally will but forwarded just as extreme a claim, of the impracticability of realizing which he is probably just as well aware, but the existence of which will:

(1) while reaffirming the Muslim attitude of hostility to congress claim,

(2) take away some, at any rate of the damaging charges which has hither-to to been leveled against them (Muslim League) that they have no constructive ideas of their own.

(ترجمہ) ''جیسا کہ کانگریس اکثریت کی نمایندہ ہونے کا مہمل دعویٰ کر رہی ہے جب کہ وہ جانتی ہے کہ مسٹر جناح کو یہ نا قابلِ قبول ہے اور وہ اس کے مقابلے میں ایسا ہی انتہا پسندانہ دعویٰ کرے گا، جس کے حصول کا نا قابلِ عمل ہونے کا انھیں بھی اتنا ہی علم ہوگا۔ مگر جس کے ذریعے وہ کانگریس کے دعوے کی مسلمانوں کی جانب سے مخالفت کا اعادہ کرنے کے ساتھ ساتھ کس حد تک ان پر عاید ہونے والے الزام سے بھی بچ سکیں گے کہ ان کے پاس اپنے کوئی تخلیقی خیالات نہیں ہیں۔''

تبصرہ خاں ولی خان:

''وائسرائے بیچارہ تو چیختا رہا کہ کوئی منصوبہ پیش کرو۔ لیکن جب دلّالوں سے پورا نہ ہوسکا تو مجبوراً اپنا منصوبہ پیش کرالیا۔ یہاں بھی اگر غور سے دیکھا جائے تو مسلمانوں سے سروکار نہیں۔ کامیابی اور کامیاب کرانے کی گنجایش نہیں۔ کہتا ہے کہ جناح صاحب کو معلوم ہے کہ یہ کام ہونے کا نہیں۔ لیکن انگریز تو اپنا مطلب نکال رہا تھا۔ ایک تو کانگریس کے خلاف مسلم لیگ کو نکالا، دوسری طرف مثبت

اور تعمیری تجویز جب دیکھتا ہوں تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ انگریز اس کٹھ پتلی کے کھیل سے کتنا خوش ہوتا ہوگا۔''

مسلم لیگ انگریز کی پارٹی:

جب مسلم لیگ نے وایسرائے کی طرف سے سر ظفر اللہ کے منصوبے کو لاہور میں قبول کر لیا تو اب انگریز کو یہ اندازہ ہو گیا کہ مسلم لیگ پر تکیہ کیا جاسکتا ہے کہ وہ انگریز کی پالیسی کو سو فی صد چلائے گی۔ اور کانگریس کے مقابلے کے لیے خود بخود تیار ہوگی۔ اب انگریز کے لیے یہ فیصلہ لازمی اور فطری تھا کہ اب وہ سوائے مسلم لیگ کے کسی اور قسم کی حیثیت بھی ماننے کے لیے تیار نہ تھا۔

انھیں دنوں میں قوم پرست مسلمانوں کا ایک بہت بڑا نمایندہ اجلاس دہلی میں ہوا۔ (۱) جس کی صدارت سندھ کے وزیر اعلیٰ اللہ بخش سومرو نے کی۔ وزیر ہند لارڈ زٹلینڈ نے اس اہم کنونشن کے متعلق وایسرائے سے پوچھا۔ وزیر ہند نے وایسرائے کے نام یہ خط مورخہ ۴ر مئی ۱۹۴۰ء میں لکھا تھا۔ وایسرائے اس کے جواب میں لکھتا ہے:

---

(۱) یہ کانفرنس ''کل ہند آزاد مسلم کانفرنس'' کے عنوان سے ۲۷ر تا ۳۰ر اپریل ۱۹۴۰ء کو دہلی میں زیر صدارت اللہ بخش سومرو وزیر اعلیٰ سندھ منعقد ہوئی تھی۔ خان بہادر شیخ محمد جان ایم ایل سی (بنگال) اس کی استقبالیہ کے صدر اور ڈاکٹر شوکت اللہ انصاری (دہلی) کانفرنس کے سیکرٹری تھے۔ ذیل کی جماعتیں کانفرنس کی داعی تھیں؛ جمیعت علمائے ہند، مجلس احرار اسلام ہند، انڈی پینڈنٹ پارٹی بہار، آل انڈیا مومن کانفرنس، کریشک پرجا پارٹی بنگال، انجمن وطن بلوچستان، آل انڈیا شیعہ پولیٹکل پارٹی۔ کانفرنس کی معاون جماعتوں میں خدائی خدمت گار، میاں افتخار الدین کی پارٹی اور دیگر حریت پسند پارٹیاں شامل تھیں۔

مذکورہ بالا کانفرنس کی شہرت اور اس کی کامیابی کے نتیجے میں برٹش حکومت کی گھبراہٹ کا اس بات سے اندازہ لگائیے کہ دہلی سے وایسرائے کی رپورٹ لندن نہ پہنچی تھی کہ انڈیا آفس سے وزیر ہند کا لیٹر دہلی پہنچ گیا کہ کانفرنس کے بارے میں حالات سے مطلع کیا جائے۔ کانفرنس کے بارے میں تفصیلی مطالعے کے لیے ''تحریک آزادی کے تین سال'' مرتبہ ڈاکٹر ابو سلمان شاہ جہان پوری مطالعہ فرمائیے۔

I attach no particular importance to the Delhi conference of the Muslims which took place a few days ago. It has been well organized and the congress press machine has written it up admireably... we both are, of course, aware that there is no important Muslims clement outside the Muslim League... indeed I am sure that Jinnah remained the man to deal with on Muslim side.

(ترجمہ) ''چند دن قبل دہلی میں مسلمانوں کی جو کانفرنس ہوئی مَیں اسے کوئی خاص اہمیت نہیں دیتا۔ لیکن یہ کافی منظّم تھی اور کانگریس پریس نے اسے کافی اُچھالا تھا اور بے حد تعریف کی تھی۔ ہم دونوں سمجھتے ہیں کہ مسلم لیگ سے باہر مسلمانوں کا کوئی خاص دھڑا موجود نہیں ہے۔ مجھے یقین ہے کہ مسٹر جناح ہی ایسا آدمی ہے جس سے مسلمانوں کے بارے میں معاملہ طے کیا جاسکتا ہے۔''

خان عبدالولی خان اس پر تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''کانگریس کا ساتھ دینے والے مسلمانوں کو برٹش حکومت کسی گنتی میں نہیں شمار کرتی تھی۔ جو اپنے ملک کی آزادی کے لیے کوششیں کرتے رہے اور قوم کو انگریز کی غلامی سے نکالنے کے لیے کانگریس سے مل کر جدوجہد کر رہے تھے۔ بلکہ انگریز تو انھیں مسلمان ماننے سے بھی انکاری تھا، جو مسلم لیگ سے باہر رہ کر اپنی تنظیم بناتے رہے۔ بلکہ یہ ہزار سے زیادہ نمایندے جو ایک منتخب وزیرِاعلیٰ کی سرکردگی میں جمع ہوئے تھے انھیں تو انگریز تسلیم ہی نہیں کر رہا تھا اور وزیرِ ہند کو کھل کر لکھتا ہے کہ ہمارا آدمی جناح ہے اور اسے تمام مسلمانوں کا نمایندہ تسلیم کرتے ہیں۔''

اس سے بھی عجیب پوزیشن خاکساروں کی تھی۔ باقی مسلمانوں پر تو اعتراض تھا کہ وہ

انگریزوں کا ساتھ نہیں دے رہے، بلکہ خاکسار نے تو امداد کی پیشکش بھی کی تھی۔ جیسے وایسرائے ۲۴ مئی ۱۹۴۰ء کو لکھتا ہے:

Meanwhile the Khaksars have formally renewed their offer to me of 50,000 men to help in war.

(ترجمہ) ''اس دوران خاکساروں نے جنگ میں پچاس ہزار آدمیوں کی پیشکش کو مجھے دوبارہ دہرایا ہے۔''

ان بیچاروں نے تو انگریز کے ساتھ جرمن کے خلاف جنگ لڑنے کی بھی پیشکش کر دی تھی۔ لیکن انگریز کہتا ہے کہ جناح کا بیان واضح ہے:

Formal statement by Jinnah that he accepts no responsibility for Khaksars or their activities that they have declined to accept his advice.

(ترجمہ) ''لیکن اس معاملے میں مسٹر جناح نے اپنے روایتی بیان میں خاکساروں سے متعلق ان کی کسی سرگرمی کے بارے میں ذمہ داری قبول کرنے سے انکار کر دیا ہے کیوں کہ انھوں نے اس کی تجویز پر غور کرنے سے انکار کر دیا ہے۔''

وایسرائے اپنے ذہن اور پالیسی میں بالکل واضح ہے کہ خاکسار چوں کہ جناح صاحب کی ہدایت نہیں مانتے اس لیے وایسرائے کہتا ہے:

That considering to present attitude of the Khaksars in the Punjab it would not be advice able for me to enter into any correspondent with them or their leaders, and I propose accordingly to leave the telegram unanswered.

(ترجمہ) ''پنجاب میں خاکساروں کے رویہ کو مدنظر رکھتے ہوئے میرے لیے ان سے اور ان کے رہنماؤں سے مزید رابطہ رکھنا مناسب نہیں اور میری تجویز ہے کہ ان کی پیشکش

کے تار کا کوئی جواب ہی نہ دیا جائے۔"

انگریز تو کھل کر یہ کوشش کر رہا تھا کہ ہر ایک ہندستانی مسلمان پر یہ بات واضح کر دے کہ انگریز سوائے جناح صاحب اور مسلم لیگ کے اور کسی کو تسلیم نہیں کرتا۔ اگر کوئی چاہتا ہے کہ انگریز اسے تسلیم کر لے تو مسلم لیگ میں شامل ہو جائے۔ کانگریس کے خلاف تو انگریز کو ایک مضبوط بہانہ ہاتھ لگا تھا کہ انھوں نے چوں کہ ہمارے ساتھ جنگ میں مدد نہیں کی، اس لیے ہم ان سے تعاون نہیں کرتے۔ لیکن خاکساروں نے تو پچاس ہزار رضا کاروں کی خدمات پیش کر دی تھیں۔ لیکن خاکسار چوں کہ جناح صاحب کی بات نہیں مانتے، اس لیے وایسرائے ہند اتنی اخلاقی گراوٹ اپنا چکا تھا کہ ان کے تار کا جواب بھی عمداً اور قصداً نہیں دیا!

لارڈ زٹلینڈ کی میعاد پوری ہوگئی۔ اس نے اپنا آخری الوداعی خط ۱۴ر مئی ۱۹۴۰ء کو لکھا۔ I.S. Amery (آئی.ایس ایمرے) نئے وزیر ہند مقرر ہوئے۔ اس نے اپنا پہلا خط ۱۶ر مئی ۱۹۴۰ء کو لکھا ہے۔

جناح صاحب کا مطالبہ اور وایسرائے کی دھمکی!

جب ہندستان کے آٹھ صوبوں سے کانگریس نے وزارتوں سے استعفے دے دیے تو صوبوں میں دفعہ ۹۳ کے تحت گورنرز کی ذاتی حکومتیں قایم ہوئیں، یعنی گورنر راج شروع ہوا۔ جناح صاحب نے وایسرائے سے درخواست کی کہ ان صوبوں میں سیاسی اور غیر سرکاری ایڈوائزر یعنی مشیر مقرر ہوں۔ یعنی مطلب یہ تھا کہ جن صوبوں میں کانگریس نے وزارتیں چھوڑ دی ہیں، وہ مسلم لیگ کی طرف سے مقرر کیے ہوئے مشیروں کے حوالے کر دی جائیں۔ اگر دیکھا جائے تو یہ ایک عجیب... مطالبہ تھا۔ یعنی جناح صاحب کے قول کے مطابق کانگریس (یعنی ہندوؤں) کے صوبوں کا اختیار بھی جناح صاحب کو سونپ دیا جاتا۔ اور ایسے حالات میں کہ اور تو چھوڑیں ان صوبوں میں ان کی کوئی حیثیت ہی نہ تھی۔ بلکہ کسی ایک صوبے میں بھی مسلم لیگ کی حکومت نہیں تھی۔ [1] لیکن جب جناح صاحب نے انگریز

کی مرضی کے خلاف مطالبہ کرنے کی جرأت کی تو وایسرائے نے انھیں ۱۰ر جولائی ۱۹۴۰ء کو لکھا:

I hope that Jinnah will not continue to press his extra agent claim.

(ترجمہ): ''مجھے امید ہے کہ مسٹر جناح اپنے بے بنیاد دعوے پر زیادہ اصرار نہیں کریں گے۔''

ساتھ ہی انھیں یہ بھی جتا دیا تھا کہ اگر وہ خاموش نہ بیٹھے اور اپنے ناروا مطالبے کو دہرایا تو مجھے اس بارے میں سوچنا پڑے گا۔ وایسرائے نے اس بارے میں ان خیالات کا اظہار فرمایا:

If he does I think myself that we may definitely have to consider whether we should continue the

---

(۱) جنگ کے مسئلے میں ملک کی رائے کو یکسر نظر انداز کر دینے، کانگریس کے کسی مطالبے پر توجہ نہ دینے اور جنگ کے بعد ملک کی آزادی کے بارے میں کسی صاف اعلان سے مسلسل گریز کے نتیجے میں کانگریس نے فیصلہ کیا کہ وہ اس قسم کے غیر واضح حالات میں ملک کو جنگ میں فریق نہیں بنا سکتی، اس لیے اس نے کانگریسی حکومتوں کو ہدایت کی کہ وہ ۳۱ر اکتوبر تک استعفے کی تجویز اسمبلی میں منظور کروا کے گورنروں کے پاس بھیج دیں۔ چناں چہ تمام صوبوں کی کانگریسی حکومتوں نے اس ہدایت پر عمل کیا۔

پنجاب میں چوں کہ یونینسٹ پارٹی کی حکومت تھی، اس سے کانگریسی ارکان کے علاحدگی اختیار کر لی، حکومت کے لیے استعفے کا سوال پیدا نہیں ہوا۔ بنگال میں مخلوط حکومت تھی اس لیے کانگریسی ارکان کے استعفے کے بعد قومی حکومت برقرار نہ رہ سکی۔ صوبہ سرحد کی حکومت کو کانگریس نے اپنے فیصلے کے مطابق پہلے ہی استعفے سے مستثنیٰ کر دیا تھا۔ اس طرح پنجاب و سرحد کے سوا تمام ملک میں جذبات بھڑکے ہوئے اور سناٹا چھایا ہوا تھا۔ جناح صاحب نے کانگریسی وزارتوں کے استعفے سے خوش ہو کر ''یومِ نجات'' منانے کا اعلان کر دیا۔ حکومت کو خطرہ پیدا ہوا کہ ملک میں فرقہ وارانہ فسادات پھوٹ پڑے گا۔ کانگریس نے اپنے کارکنوں کو یوم نجات میں کوئی رکاوٹ ڈالنے سے سختی کے ساتھ منع کر دیا تھا۔ یوم نجات بخیریت گزر گیا۔

کانگریس نے اپنے وزرا کو ۳۱ر اکتوبر ۱۹۳۹ء تک حکومت سے الگ ہونے کی حد مقرر کی تھی۔ لیکن تمام حکومتیں ۲۷ر اکتوبر ہی کو استعفے سے فارغ ہو گئی تھیں۔

effort which I so for made to keep the Muslims together whether we should not let the balance of the Muslim League as represented by Sikander Fazal ul Haq have their break with Jinnah. But I do not want to see such a break if we can reasonably avoid it.

(ترجمہ) ''اگر وہ ایسا کرتے ہیں تو مجھے سوچنا پڑے گا کہ مسلمانوں کو اکٹھا کرنے کی اب تک جو میں نے کوششیں کی ہیں ان کو جاری رکھا جائے یا نہیں۔ ہمیں اس توازن کو نہیں چھوڑنا چاہیے جو سکندر (حیات) اور فضل حق کے جناح سے ٹوٹنے سے بگڑے گا۔ میں ذاتی طور پر اس ٹوٹ کے خلاف ہوں اور ہمیں حتی المقدور کوشش کرنی چاہیے کہ یہ ٹوٹ نہ ہو۔''

انگریز جناح صاحب اور مسلم لیگ کی حیثیت اور حقیقت کو جانتا تھا۔ جیسا کہ وائسرائے ۲۸/اگست ۱۹۴۰ء کو لکھتا ہے:

(انگریزی)...

(ترجمہ) ''مجھے امید ہے کہ سکندر حیات اور فضل حق جناح کو راہِ راست پر لانے کی پوزیشن میں ہیں۔ اگر وہ ایسا نہیں کرتے تو میں اس کے بغیر ہی کام چلاؤں گا۔''

خان ولی خان جناح صاحب کے بارے میں انگریز کی بدلتی ہوئی پالیسی کے متعلق لکھتے ہیں:

''انگریز اس سے اچھی طرح واقف تھا کہ مسلم لیگ کی کوئی بنیاد نہیں، وہ انگریز کی بے ساکھیوں پر کھڑی ہے۔ سر یقیناً اوپر ہے، لیکن اگر انگریز چاہیں اور اپنی بے ساکھیاں کھینچ لیں تو مسلم لیگ اوندھے منہ گر پڑے گی۔ کہیں ٹھکانا نہ ہوگا۔ انگریز کو یہ بھی تسلی تھی کہ مسلمانوں میں کبھی بھی اسے کاسہ لیسوں کی کمی محسوس نہیں ہوگی۔ اگر ایک طرف سکندر حیات خان اور مولوی فضل حق مسلمانوں میں اپنی ایک حیثیت کے مالک تھے، کیوں کہ وہ مسلمان اکثریتی صوبوں کی منتخب حکومتوں

کے سربراہ ہیں، چناں چہ جب یہ بات پھیلی کہ انگریز جناح صاحب سے ناراض ہیں تو ہر ایک مسلمان نے اپنی خدمات پیش کرنی شروع کیں۔''

اس سلسلے میں وائسرائے سر حیدری نظام حیدر آباد کے وزیر اعظم کے متعلق ۲۹ راگست ۱۹۴۰ء کو لکھتا ہے:

(انگریزی)...

(ترجمہ) ''آپ کو یہ سن کر حیرت انگیز خوشی ہو گی کہ پچھلے دنوں ملاقات کے دوران حیدری نے مجھے اشارہ دیا کہ اگر مسلم لیگ یا مسٹر جناح کچھ گڑبڑ کریں تو بہر حال ایک نامور مسلمان موجود ہے جو ملک کو اس پیچیدہ صورت حال سے نکال سکتا ہے اور سنبھال سکتا ہے۔''

اس بیان میں سر حیدری کا اشارہ ایک نام ور مسلمان سے اپنی ہی جانب ہے۔ وائسرائے نے ان کا شکر ادا کیا اور کہا کہ آپ کے لیے وہ مقام مناسب ہے جہاں آپ موجود ہیں۔

وائسرائے کہتا ہے کہ میں نے شکریہ ادا کیا کہ نظام کی نمایندگی تمہارے لیے بہتر تھی۔ وائسرائے کو معلوم تھا کہ یہ عاشق و معشوق کے ناز نخرے سیاسی کھلاڑیوں کی عادت ہے۔ انگریز ارادتاً جناح صاحب کا صرف اس حد تک ناز اٹھا رہا تھا اور مسلم لیگ کو اتنی اہمیت دے رہا تھا اور انھیں صرف اتنی چھوٹ دینا ضروری سمجھتا تھا کہ اگر کل کو کانگریس اور مسلم لیگ کے درمیان کوئی قضیہ پیدا ہو جائے تو جناح صاحب اس مقام پر پہنچ چکے ہوں، جہاں سے ان کا واپس آنا خود ان کے لیے بھی محال ہو۔ اس وجہ سے جناح صاحب خواہ کتنی ہی ناپسندیدہ بات کرتے ہیں، انگریز دَم سادھے بیٹھا رہے گا۔ کیوں کہ اسے معلوم ہے کہ مسلم لیگ کی سب سے بڑی طاقت اور حیثیت انگریز کے اپنے ہاتھ میں ہے، جیسا کہ وائسرائے کہتا ہے کہ یا تو جناح صاحب ہماری پالیسی چلائیں گے یا پھر ان کے بغیر میں خود اپنا راستہ بناؤں گا۔ وائسرائے لکھتے ہیں:

I still think it important to hold the Muslim League together if we can do so and in those

circumstances there is nothing for it but to be patient with Jinnah, though one's patience is beginning definitely to run out.

(ترجمہ) ''اس وقت میرا یہ خیال ہے کہ مسلم لیگ کو (اپنی) گرفت میں رکھنا ہمارے لیے بہت اہم ہے۔ اگر ہم یہ کرسکیں تو موجودہ حالات میں کوئی مشکل نہیں۔ ہمیں جناح صاحب کے ساتھ متحمل مزاجی کا برتاؤ کرنا چاہیے۔ اگر چہ ان کے مزاج میں تحمل شروع ہی سے نہیں ہے۔''

اسی دوران وایسرائے کے خط مورخہ ۵ر ستمبر ۱۹۴۰ء کے مطابق جناح صاحب نے حکومتِ ہند سے یہ مطالبہ کردیا:

"That the Muslim League should be taken in to full and equal partnership with H.M. Govt. in the ruling of this country & authority share with them."

(ترجمہ) ''... مسلم لیگ کو ''ہز میجسٹی'' کی گورنمنٹ میں اس ملک پر حکومت کرنے کے سلسلے میں مکمل اور مساوی شراکت اور اختیارات میں حصہ (ملنا) چاہیے!''

اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہندستان کے تمام ہندو، سکھ، عیسائی، پارسی، اچھوت اپنی اپنی جگہ رہ جائیں گے اور ہندستان کی حکومت انگریز اور مسلم لیگ برابر کی حیثیت سے چلائیں گے۔ گویا کہ اب مسلم لیگ تمام ہندستانیوں کی نمایندگی کی دعوے دار بن گئی تھی۔

جب کہ وایسرائے کی کوشش یہ تھی کہ کانگریس کے بغیر ایک مشاورتی کونسل بنائیں۔ اس سلسلے میں اچھوت لیڈر امبیڈکر اور ہندو مہا سبھا کے لیڈر اینے (Aney) سے بات ہو چکی تھی۔ لیکن اس میں چوں کہ جناح صاحب کو مکمل اختیارات نہیں دیے جا سکتے تھے اس لیے اُس نے شمولیت سے انکار کردیا۔ اس وجہ سے یہ منصوبہ پایۂ تکمیل کو نہ پہنچ سکا۔ [1]

(۱) وایسرائے نے یہ منصوبہ اس وقت بنایا تھا جب کانگریس کے رہنما ''ہندستان چھوڑ دو'' تحریک کے

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر......)

وائسرائے نے اتنی بات پوچھ لینے کی ضرورت محسوس نہیں کی، ۱۹۳۷ء کے انتخابات میں ان کی نمائندہ حیثیت کیا تھی؟ یہ بات اسے اچھی طرح معلوم تھی، جیسا کہ ۱۹ر ستمبر ۱۹۴۰ء کو وہ خود لکھتا ہے:

He (Jinnah) is subjected to very considerable criticism for various sections of the community. He has against him the Prime Ministers of the two majority Muslim provinces, the line he has been taken is unsympathetic to large numbers of Muslims of position even in Muslim minority provinces such as Bihar & UP.

(ترجمہ) ''مسٹر جناح پر مسلمانوں کے مختلف دھڑوں کی طرف سے اعتراضات ہو رہے ہیں۔ مسلم اکثریت کے دو صوبوں کے وزرائے اعلیٰ بھی اس کے خلاف ہیں۔[1] مسٹر جناح کے نقطۂ نظر کے بارے میں مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد کا جو سوسائٹی میں مقام رکھتے ہیں،

زمانے میں سلاخوں کے پیچھے دھکیل دیے گئے تھے۔ اور ہزاروں سیاسی کارکن گرفتار کیے جا چکے تھے۔ عوام میں کہرام مچا ہوا تھا۔ صوبوں کی حکومتیں گورنروں کی صواب دید پر چل رہی تھیں۔ کانگریس کو خلاف قانون قرار دیا جا چکا تھا۔ وائسرائے چاہتے تھے کہ ملک میں موجود دوسری جماعتوں کے تعاون سے ہندستانیوں پر مشتمل ایک نام نہاد قانونی نظامِ حکومت گورنروں کے زیر سرپرستی جنگ کے خاتمے تک کے لیے قایم کرلیا جائے، تا کہ ہندستان کی سیاسی صورت حال کے بارے میں دنیا کو دھوکا دیا جا سکے۔ لیکن جناح صاحب کی اپنی بارے میں خوش فہمی یا مسلم لیگ کی حیثیت وقوت کے بارے میں غلط اندازے اور بے جا مطالبے نے وائسرائے کے منصوبے کو ناکام بنا دیا اور وائسرائے کو صورت حال نے اپنا منصوبہ ترک کر دینے اور خاموش ہو کر بیٹھ جانے پر مجبور کر دیا۔

(۱) اشارہ بنگال کے وزیر اعلیٰ مولوی فضل الحق اور پنجاب کے وزیر اعلیٰ سردار سکندر حیات خان کی طرف ہے۔

غیر ہمدردانہ رویہ ہے، بلکہ اقلیتی صوبوں میں بھی مثلاً بہار اور یوپی میں بھی یہی صورتِ حال ہے۔"

پنجاب اور بنگال کے علاوہ باقی دونوں مسلمان اکثریتی صوبوں یعنی سندھ اور سرحد میں بھی جناح صاحب کی مخالف تنظیمیں موجود تھیں۔ لیکن ان سب باتوں کے باوجود بھی وایسرائے کہتا ہے:

> Indeed I am sure Jinnah is the man to deal with on Muslim side.

(ترجمہ) "لیکن مجھے پھر بھی یقین ہے کہ جناح ہی وہ آدمی ہے جس سے مسلمانوں کے بارے میں بات چیت کی جا سکتی ہے۔"

مسلم لیگ کو قایم رکھنے کے سلسلے میں جتنی مشکلات درپیش تھیں، انگریز نے یہ فیصلہ کر رکھا تھا کہ اسے ایک ایک کر کے حل کرنا ہے۔ مثلاً پنجاب میں جہاں سر سکندر حیات کی سربراہی میں یونینسٹ پارٹی کی حکومت تھی، اس میں ہندو اور سکھ بھی شامل تھے۔ یہاں جناح صاحب اور مسلم لیگ جتنا تقسیمِ ہند کے مسئلے پر زور ڈالتے تھے، اتنی ہی پنجاب میں سکندر حیات خاں کے لیے مشکلات پیدا ہو رہی تھیں۔ چوں کہ ہندستان کے اندر غیر مسلم یہ حالات دیکھ رہے تھے تو انھوں نے یہ مطالبہ شروع کیا کہ پاکستان کے مطالبے اور تجویز کے متعلق انگریز اپنی پالیسی کا واضح اعلان کر دے۔ وایسرائے اس اعلان کی مخالفت میں یکم مارچ ۱۹۴۱ء کو لکھتا ہے:

> It should not only be a mistake but it would be very near a break of faith: were we to do anything of the sort.

(ترجمہ) "اگر ہم ایسا کوئی قدم اٹھاتے ہیں تو یہ نہ صرف غلطی ہوگی بلکہ باہمی اعتماد کو بھی دھچکا لگے گا۔"

اور اسی لیے وایسرائے اس خط میں لکھتا ہے کہ سکندر حیات آیا اور مجھے کہا کہ مسلم لیگ

کی ورکنگ کمیٹی کے ساتھ پاکستان کے مسئلے پر میرا اختلاف راے ہے اور میں اس کی کمیٹی سے استعفیٰ دے رہا ہوں۔ لکھتا ہے کہ میں نے خود اُسے نہیں کہا۔ لیکن پنجاب کے گورنر سر ہنری کریک (Sir Henry Craik) کو کہا کہ تم سکندر حیات کو استعفیٰ دینے سے منع کرو اور پھر اس کی وجہ بیان کرتا ہے:

> This is not the moment at which I want to ... any split in the Muslim League which I think is very important (tiresome as its activities may be in some ways) to maintain as a solid political entity.

(ترجمہ) ''یہ موقعہ نہیں ہے کہ میں چاہوں کہ مسلم لیگ میں انتشار ہو جب کہ میں سمجھتا ہوں کہ یہ بہت ضروری ہے کہ مسلم لیگ اپنی ٹھوس سیاسی بنیاد بنائے۔ اگرچہ بعض اوقات اس کی سرگرمیاں تکلیف دہ رہی ہیں۔''

اس کے باوجود اسے مسلم لیگ کی تنظیم میں دلچسپی کیوں ہے؟ وایسرائے لکھتا ہے:

> That is the more desirable since we are moving into the next phase of Gandhi Satyagraha campaign and any fissure in the Muslim ranks, more particularly over this vital question of Pakistan ... would be a very great encouragement to the anti-war party and might will make our position in dealing with the Satyagraha more difficult.

(ترجمہ) ''یہ جاننا اس لیے ضروری ہے کہ ہم مسٹر گاندھی کی ستیہ گرہ تحریک کے دوسرے مرحلے میں داخل ہو رہے ہیں۔ مسلمانوں کی صفوں میں کسی قسم کا انتشار اور خاص طور پر پاکستان جیسے اہم سوال پر اختلاف ہونے سے جنگ کی مخالف قوتوں کی انتہائی حوصلہ افزائی

ہوگی اور ستیہ گرہ تحریک سے نمٹنے میں ہماری پوزیشن کو مشکلات سے دوچار کردے گی۔"

ولی خان لکھتے ہیں:

"انگریز کو مسلمان سے کوئی سروکار نہیں۔ بار بار لکھتا ہے کہ پاکستان ماننے اور چلنے والی چیز نہیں۔ لیکن انگریز تو اپنے بنیادی دشمن کانگریس کے مقابلے کے لیے کسی کو ڈھونڈھ رہا تھا۔ اس لیے تمام تر توجہ مسلم لیگ پر تھی کہ اگر کبھی بھی کانگریس نے انگریز کو للکارا تو مسلم لیگ کھل کر انگریز کا ساتھ دے گی۔"

"سکندر حیات خان نے اپنے یونینسٹ ساتھیوں کی تسلی کے لیے ایک بیان دیا، جس کی طرف وزیر ہند ایمرے نے اپنے خط مورخہ ۸ر اکتوبر ۱۹۴۱ء میں اشارہ کیا ہے۔ اس بیان میں سکندر حیات خان نے تجویز پیش کی ہے کہ انگریز سرکاری اعلان کرے اور ایک مقررہ میعاد رکھے کہ اگر اس مقررہ وقت میں ہندستان کے مختلف فرقوں نے آپس میں ایک مکمل فیصلہ نہ کیا اور متفقہ آئین منظور نہ کیا تو پھر برطانوی حکومت بہ امر مجبوری ہندستان کے لیے اپنی منشا کا آئین بنادے گی۔ اس خط کے حاشیے پر وایسرائے ہند نے اپنے ہاتھ سے بہت باریک لکھائی میں لکھا ہے:

And make it perfectly certain that the Muslims would refuse to play this (the situation will have) brought us in.

(ترجمہ) اور اس بات کو یقینی بنادے کہ مسلمان اس معاملے میں ہماری مرضی کے مطابق کردار ادا کرنے سے انکار کردیں۔"

ولی خان صاحب لکھتے ہیں:

"اس سال زیادہ واضح الفاظ میں وایسرائے اپنی پالیسی کا اعلان نہیں کرسکتا تھا۔ انگریز کی صرف یہ کوشش تھی کہ مسلمان کسی صورت میں صلح اور تصفیے پر رضامند نہ ہوں۔ تاکہ اختیار انگریز کے سپرد کریں اور اسی غرض اور مقصد کو حاصل کرنے کے لیے انگریز اتنا کھل کر سامنے آیا ہے اور اس طرح سے اپنا ضمیر واضح کردیا کہ کسی قسم کے شک کی گنجایش ہی باقی نہ رہی۔

اس سلسلے میں سندھ کے وزیرِ اعلیٰ اللہ بخش سومرو کا ایک واقعہ بیان کرنے سے بات بالکل واضح ہو جائے گی۔ یہ تو پہلے بھی ذکر آ چکا ہے کہ اسی اللہ بخش سومرو کی سربراہی میں قوم پرست مسلمانوں کا ایک اجتماع دہلی میں ہوا تھا۔ لازمی بات ہے کہ وائسرائے اس پر برہم تھا۔ کیوں کہ اس کا مسلم لیگ کی پارٹی سے کوئی تعلق نہ تھا، بلکہ وہ ایک صوبے کی منتخب اسمبلی کا نمایندہ تھا اور اسی صوبے کے وزیرِ اعلیٰ کی حیثیت سے وائسرائے ہند کی ڈیفنس کونسل کا ممبر بھی تھا۔ اس کے باوجود بھی وائسرائے کا لب و لہجہ سخت ہتک آمیز تھا۔ وائسرائے کے استفسار پر اس نے کچھ تجاویز ڈیفنس کونسل کو پیش کی تھیں۔ جس کے ذریعے ان فرقہ وارانہ اختلافات کی ایک حد تک پیش بندی ہو سکے اور یہ تجویز بھی پیش کی کہ جواہر لال نہرو اور مولانا ابوالکلام آزاد کو، جو اُس وقت قید تھے، رہا کیا جائے۔ [1] تجاویز پیش کرنے کے بعد پھر وائسرائے سے پوچھا۔ اس کے متعلق وائسرائے اپنے خط مورخہ ۱۱/۱۰ اکتوبر ۱۹۴۱ء میں لکھتا ہے:

"When" he said, "am I likely to hear from you have you decided." I replied, "you will hear nothing you are not one of my advisers, but the

---

(۱) جماعتی سول نافرمانی کے دور کے بعد انفرادی سول نافرمانی (انفرادی ستیہ گرہ) کا یہ دور تھا۔ مولانا ابوالکلام آزاد پنجاب کے سفر سے لوٹ کر کلکتہ جا رہے تھے۔ الٰہ آباد کے اسٹیشن پر اُتر کر صبح کی چائے پینے کے لیے ریفریش منٹ روم کی طرف جا رہے تھے کہ سپرنٹنڈنٹ پولیس نے آداب و تسلیمات کے بعد گرفتاری کا وارنٹ پیش کیا۔ مولانا نے فرمایا:

"آپ نے مجھے یہ اعزاز دے کر عزت بخشی ہے۔ آپ مجھے اس وقت گرفتار کر رہے ہیں، جب کہ ابھی مجھے انفرادی ستیہ گرہ کا موقع بھی نہیں ملا ہے۔ آیئے چائے پی لیں. پھر چلتے ہیں!"

پولیس آفیسر تو پلیٹ فارم پر کھڑے رہے۔ مولانا چائے پی کر نکلے اور نینی سنٹرل جیل الٰہ آباد چلے گئے۔ انھیں دو سال کی سزا ہوئی تھی۔ لیکن مدت پوری ہونے سے پہلے ۴؍دسمبر ۱۹۴۱ء کو انھیں رہا کر دیا گیا۔

Prime Minister of Sind... I have not least intention of talking you how I propose to handle my business and I trust you understand that" he said, "you are very frank". I said, "I am bound to be frank this is my business and my responsibility".

(ترجمہ) جب اس نے کہا کہ میں تم سے سننا چاہتا ہوں کہ تم نے کیا فیصلہ کیا ہے۔ میں نے جواب دیا کہ تم مجھ سے کچھ نہیں سنو گے۔ تم میرے مشیروں میں سے نہیں ہو۔ تم صرف سندھ کے وزیر اعلیٰ ہو۔ میری ذرا بھی خواہش نہیں ہے کہ تمہیں بتاؤں کہ میں اپنے معاملات کس طرح چلاتا ہوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ بات آپ بھی اچھی طرح جانتے ہیں۔ اس نے کہا، آپ بہت بے باک ہیں۔ میں نے کہا کہ میں اس بے باکی کے لیے مجبور ہوں۔ یہ میرا کام اور ذمے داری ہے۔"

حقایق، حقایق ہیں: عبدالولی خان، ص ۷۳-۵۲

(۱۰)

اگلی نسل پاکستان اور بھارت — اندازِ فکر اور مستقبل؟

ڈاکٹر محبوب الحق

لاہور (مظفر محمد علی سے)

''کرپس پلان [۱] کے تحت آزادی برصغیر کی تقسیم سے بہتر ہوتی اور مجھے یقین ہے کہ اگلی نسل اس پلان پر دوبارہ غور کرے گی اور ان ممالک (پاکستان اور بھارت) کو یکجا کرنے کے متعلق سوچے گی۔''

یہ خیالات سابق وفاقی وزیر ڈاکٹر محبوب الحق کے ہیں جن کا اظہار انھوں نے بھارتی اخبار ''دسٹیٹس مین'' کو دیے گئے ایک انٹرویو میں کیا۔ جنرل ضیاء الحق کے دست راست اور ''آپریشن فیئر پلے'' کے انچارج جنرل فیض علی چشتی نے ایک خصوصی ملاقات میں بتایا کہ ڈاکٹر محبوب الحق کے ان خیالات کی روشنی میں گیارہ مارچ ۱۹۷۸ء کو ڈاکٹر مبشر حسن کی طرف سے انھیں ایک خط ملا جس میں انھیں (جنرل چشتی کو) چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر کے مشیر کی حیثیت سے مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ جنرل ضیاء کی حکومت نے ایسے خیالات کے حامل شخص کو پاکستان کی طرف سے اقوامِ متحدہ کے اہم عہدے کے لیے کیوں نامزد کیا تھا۔ جنرل فیض علی چشتی کا کہنا ہے کہ انھوں نے چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر جنرل محمد ضیاء الحق کے نام ایک مراسلے میں ڈاکٹر محبوب الحق کے خلاف کارروائی کی سفارش کی مگر جنرل ضیاء نے انھیں ڈاکٹر محبوب الحق کے خلاف کسی بھی قسم کی کارروائی کرنے سے منع کر دیا۔ جنرل فیض علی چشتی نے کہا کہ اب جبکہ ڈاکٹر محبوب الحق اپنے سابقہ ناقد ڈاکٹر مبشر حسن کی معیت میں بھارت کے دورے کرتے اور کشمیر کے بارے میں پاکستان کی اُنچاس سالہ پالیسی کے

برعکس نت نئی اور شرانگیز تجاویز پیش کر رہے ہیں۔ بہت مناسب ہوگا کہ ڈاکٹر محبوب الحق کے بارے میں ڈاکٹر مبشر حسن کے اس اہم خط کے متعلقہ اقتباسات جاری کر دیے جائیں۔

ڈاکٹر مبشر حسن نے لکھا تھا کہ بھارت کا پہلا وزیر اعظم جواہر لال نہرو قیامِ پاکستان سے دو تین سال قبل تحریری و تقریری طور پر یہ ''عظیم خواب'' دیکھا کرتا تھا کہ ''ایشیا میں چھوٹے ملکوں کے وجود کی کوئی گنجایش نہیں ہے۔'' دسمبر ۱۹۶۲ء میں اس نے واشنگٹن پوسٹ کو یہ بتایا تھا کہ ''ہماری خارجہ پالیسی کا آخری نصب العین یہ ہے کہ پاکستان کے ساتھ کنفیڈریشن کی جائے۔'' پاکستان کے مرحوم صدر جنرل محمد ایوب خان نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ ''جواہر لال نہرو نے ۱۹۶۲ء میں شیخ عبداللہ کی وساطت سے کنفیڈریشن کی تجویز پیش کی تھی۔''

بھارت پر نہرو کے خاندان کی حکومت ۱۹۷۷ء کے اوایل تک رہی۔ مارچ ۱۹۷۷ء میں جب جنتا پارٹی کی حکومت قایم ہوئی تو وزیر اعظم موراجی ڈیسائی (۲) اور وزیر خارجہ اٹل بہاری باجپائی نے سب سے پہلے جو اعلانات کیے ان میں ایک غیر مبہم اعلان یہ تھا کہ ''ہماری بدیشی نیتی (۳) وہی رہے گی جو نہرو کی تھی۔'' ڈاکٹر مبشر حسن نے یہ بھی لکھا ایک پاکستانی ''ماہر معاشیات'' ڈاکٹر محبوب الحق نے بھارت کا حسرتوں اور تمناؤں سے بھرپور دورہ کیا۔ بھارت روانگی سے قبل اس نے واشنگٹن میں ایک انٹرویو دیا جو دہلی کے اخبار ''سٹیٹس مین'' میں ''وطنی کی تیس سال بعد واپسی'' کے عنوان سے چھپا۔ انٹرویو میں محبوب الحق کے دورے کو ''یاترا'' اور بھارت کو اس کا ''وطن'' بتایا گیا۔ اس نے کہا تھا کہ ''میں نے اپنے سے عہد کر رکھا تھا کہ میں اس وقت تک بھارت نہیں جاؤں گا جب تک کہ تعلقات کا ایک نیا دور شروع نہ ہو جائے اور میں اپنی جائے پیدایش بغیر شرم محسوس کیے جا سکوں۔'' محبوب الحق نے بتایا کہ اس کے بچے پورے برصغیر کو ایک ہی تصور کرتے ہیں اور ان کے اس تصور سے اسے بہت خوشی ہوتی ہے۔ اس نے مزید کہا کہ ''میں گیارہ یا بارہ برس کا تھا جب پاکستان بھاگا تھا اس وقت مجھے معلوم نہیں تھا کہ پاکستان سے کیا مراد تھی۔ مجھے وہ لوگ یاد نہیں جنھوں نے ہمیں حملہ سے خبردار کر دیا تھا اور میرے باپ کے ہندو دوستوں نے ہماری

بھاگنے میں مدد کی تھی۔'' پاکستانی ''ماہر معاشیات'' نے مزید کہا: ''کرپس پلان کے تحت آزادی برصغیر کی تقسیم سے بہتر ہوتی اور مجھے یقین ہے کہ اگلی نسل اس پلان پر دوبارہ غور کرے گی اور ان ممالک کو دوبارہ یکجا کرنے کے متعلق سوچے گی۔'' ڈاکٹر مبشر حسن نے آگے چل کر لکھا کہ افسوس اس بات کا ہے کہ اسی محبوب الحق کو حکومت پاکستان نے اقوامِ متحدہ میں سیکرٹری جنرل کے بعد سب سے اعلیٰ عہدے کے لیے حال ہی میں نامزد کیا ہے اور چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر سے لے کر نیچے کے اعلیٰ افسروں نے اسے شرف ملاقات بخشا ہے اور اس کے مشورے سنے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے یہ ''ماہرین'' اور کسی چیز میں ماہر ہوں یا نہ ہوں وطن دشمنی کرنے میں بہت ماہر ہیں۔ ان کی سائنسی و معاشی مہارت ملک و قوم کے مفادات سے بالاتر ہوتی ہے۔ یہ لوگ بھارت جا کر نہ صرف وطن فروشی پر آمادہ ہو جاتے ہیں اور وہاں کھلم کھلا غدارانہ باتیں کرتے ہیں بلکہ واپس پہنچ کر بھی اپنی پریس کانفرنسوں میں بھارتی سامراج کی برکتوں کے گیت گاتے ہیں۔ تاریخ اور سیاسیات کے طالب علموں کے لیے ان ابن الوقت ''ماہرین'' کی ایسی باتوں کی وجوہ فہم و ادراک سے باہر نہیں ہیں۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ حالات نے پاکستان میں ایسے مٹھی بھر سیاسی عناصر کو عارضی طور پر بالادستی بخش دی ہے، جنھوں نے ۱۹۴۷ء سے قبل تحریک پاکستان کی سرتوڑ مخالفت کی تھی انھیں ان دنوں قایداعظمؒ سے لے کر تحریک پاکستان کے چھوٹے سے چھوٹے کارکن میں اسلام کی ذرا سی بھی رمق نظر نہیں آتی تھی۔ یہاں تک کہ انھوں نے یہ فتویٰ دیا تھا کہ تحریک پاکستان میں شامل ہونا ''حرام'' ہے اور قایداعظم دراصل ''کافراعظم'' ہے۔ ان منقسم مزاج سیاسی عناصر میں ایسے لوگ بھی شامل ہیں جنھوں نے مقامی شاونزم کا جھنڈا اُٹھا کر نہ صرف پاکستان کو ایک ریت کی دیوار قرار دیا تھا بلکہ اسے ایک ٹھوکر سے منہدم کر دینے کے عزم کا اعلان کیا تھا۔ ڈاکٹر مبشر حسن نے یہ بھی لکھا کہ غالباً یہی وجہ ہے کہ آل انڈیا ریڈیو کے ۹/مارچ کے نشریئے کے مطابق ہندستان کے وزیر خارجہ اٹل بہاری باجپائی نے لوک سبھا میں کہا ہے کہ ''بھارت، بنگلہ دیش اور پاکستان کے ساتھ

سرحدیں کھلی رکھنے کا متمنی ہے۔'' ڈاکٹر مبشر حسن کے خط کا اختتام ان الفاظ پر ہوتا ہے لیکن ایسا کیسے ہوسکتا ہے۔ پاکستانی عوام نے بڑی قربانیاں دے کر اپنے لیے یہ وطن حاصل کیا تھا، وہ اس کی آزادی ومختاری کا ہر قیمت پر تحفظ کریں گے۔ (۴)

(روزنامہ جنگ، لاہور: ۴ر مارچ ۱۹۹۶ء، ص ۱+۵)

حواشی:

(۱) کرپس پلان سے مراد ''کیبنٹ مشن پلان'' ہے جو ۱۶ر مئی ۱۹۴۶ء کو شایع ہوا تھا۔ اس پلان کو کانگریس اور دیگر جماعتوں نے قبول کرلیا اور مسلم لیگ نے بھی اسے مان لیا تھا۔ لیکن بعد میں اپنی رضامندی سے مسٹر محمد علی جناح نے رجوع کرلیا تھا۔

(۲) صحیح نام ''مرارجی ڈیسائی'' ہے۔

(۳) بدیشی نیتی کا مطلب خارجہ پالیسی ہے۔

(۴) کیبنٹ مشن کا پلان: یہ مشن ۲۳ر مارچ ۱۹۴۶ء کو دہلی پہنچا تھا اور لارڈ پیتھک لارنس وزیر ہند کی سربراہی میں تجارتی وفد کے صدر سر اسٹیفورڈ کرپس اور محکمہ بحریہ کے پہلے لارڈ اے وی الیگزینڈر پر مشتمل تھا۔

(۱۱)

ماؤنٹ بیٹن کا ورودِ کراچی

جب لارڈ ماؤنٹ بیٹن اپنی بحریہ کی شاندار وردی میں ملبوس، تمغے سجائے قیامِ پاکستان کا افتتاح کرنے ڈایس کی طرف بڑھا تو اُس نے دیکھا کہ وہاں صرف ایک خاص کرسی موجود تھی۔ وایسرائے نے پہلے یہ سوچا کہ یہ تو بڑی نامناسب بات ہوگی کہ جناح، جو پاکستان کا گورنر جنرل بننے جا رہا تھا، اس کے لیے ویسی ہی خاص کرسی نہ ہو جو خود اُس کے لیے ہے۔ لیکن وہ ہکا بکا رہ گیا جب جناح تیزی سے اس خاص کرسی پر جا بیٹھا اور ماؤنٹ بیٹن کو اپنے ساتھ پڑی کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ ہوسکتا ہے وہ ماؤنٹ بیٹن سے اس ذلت کا بدلہ لینا چاہتا ہو جو اُس نے اپنے ابتدائی ایام میں انگریزوں کے ہاتھوں برداشت کی تھی یا پھر اس بات کا انتقام کہ دورانِ جنگ کانگریس پارٹی کے خلاف بھرپور مدد کے باوجود انھوں (برطانویوں) نے اسے کٹا پھٹا پاکستان قبول کرنے پر مجبور کر دیا۔ لیکن زیادہ امکان یہی ہے کہ یہ اس کی بڑھاپے میں حد سے بڑھی ہوئی اختیار و اقتدار کی خواہش کا نتیجہ تھا۔ [۱]

اگر ہم کرنل الٰہی بخش...... وہ ڈاکٹر جس نے اگست ستمبر ۱۹۴۸ء میں بیماری کے آخری مراحل میں کوئٹہ کے نزدیک زیارت کے مقام پر اس کی دیکھ بھال کی تھی...... کی بات پر یقین کریں تو اس نے اپنے مریض کو یہ کہتے سنا: ''میں نے یہ (پاکستان) بنایا۔ لیکن مجھے یقین ہو گیا کہ یہ میں نے اپنی زندگی کی سب سے بڑی غلطی کی ہے۔'' اور انھی دنوں، پاکستان کا وزیر اعظم لیاقت علی خاں مریض کے کمرے سے جھڑکیاں کھا کر باہر نکلتے ہوئے بڑبڑاتا سنا گیا: ''بڑے میاں کو اب اپنی غلطی کا احساس ہوا ہے۔'' کیا یہ جناح کی قلب ماہیئت (Metamorphosis) کا آخری مرحلہ تھا؟ [۲]

(تقسیم ہند کی ان کہی کہانی / مترجمہ: پروفیسر ظفر الحسن پیرزادہ، مصنف: نریندر اسنگھ ساریلا، لاہور تخلیقات، ۲۰۱۰ء، ص ۲۱-۱۲۰)

حواشی:

(۱) یہ واقعہ خود لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے براڈ لینڈز (Broad Lands) میں اپنی وفات سے چند سال پیشتر مجھے سنایا۔ ۱۶/اگست ۱۹۴۷ء کو آخری وائسرائے نے جو رپورٹ لندن ارسال کی وہ یہ ہے: ''اگلے دن میں نے پاکستان کی آئین ساز اسمبلی سے خطاب کیا...... جناح کی خواہش تھی کہ وہ بطور صدر خود اسمبلی مرکزی (Principal) نشست سنبھالے، لیکن میں نے (اس بارے میں) بطور وائسرائے اپنے حق سے دستبردار ہونے سے انکار کردیا۔ بالآخر اسے میری بات ماننی پڑی۔''

(۲) Member of Parliament Dr. M. Hashim Kidwai's letter printed in The Times of India, 27 July 1988, on the basis of reports published in Frontier Post, Peshawar, and Muslim India, New Delhi.

حصہ ہفتم

ضمیمے

(۱)

ہندستان کی موجودہ صورتِ حال اور مسئلہ انقلاب و تعمیر

(۱۹۴۲ء)

مولانا ابوالکلام آزاد

(۲)

تو صاحبِ منزل ہے کہ بھٹکا ہوا راہی

نور محمد قریشی (ایڈوکیٹ)

(۱)

ہندستان کی موجودہ صورتِ حال اور مسئلہ انقلاب وتعمیر

(۱۹۴۲ء)

مولانا ابوالکلام آزاد رحمہ اللہ

یہ تحریر مولانا ابوالکلام آزاد نے ۶؍ اکتوبر ۱۹۴۲ء کو بصورتِ خط مرحوم عبداللہ بٹ کے نام لکھی تھی۔ اس وقت مولانا ۹؍ اگست ۱۹۴۲ء سے احمد نگر قلعے میں اسیر تھے۔ عبداللہ بٹ نے حضرت شاہ اسمٰعیل شہید کی یاد منانے کے لیے ایک سیمنار کیا تھا اور کتاب کے لیے مضامین جمع کر لیے تھے۔ ان پر مقدمہ لکھنے کے لیے مولانا ابوالکلام سے درخواست کی تھی۔ عبداللہ بٹ مرحوم نے مضامین کے مسودات بھی مولانا کو دِکھلائے تھے۔ مولانا نے نہ صرف مقدمہ لکھنے کا وعدہ کیا تھا، بلکہ اس کا موضوع بھی بتا دیا تھا کہ اس کا عنوان یہ ہوگا:

''ان فکری عوام کی مختصر تاریخ جس نے مولانا اسمٰعیل شہید کی اصلاحی اور عملی تحریک کو پیدا کیا تھا۔''

مولانا نے ابھی مقدمہ لکھنے کا آغاز بھی نہ کیا تھا کہ ۹؍ اگست کو کانگریس کے ''ہندستان چھوڑ دو'' ریزولیوشن پاس کرنے کے جرم میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے تمام ممبران کو گرفتار کر کے اور اسی روز سہ پہر کو سوا دو بجے انھیں احمد نگر لے جا کر قلعے میں محبوس کر دیا گیا۔ احمد نگر کے قلعے میں مولانا کے ساتھ کانگریس کے نو (۹) ممبر تھے، جو ممبئی سے لائے گئے تھے۔

مولانا ابوالکلام نے جیل پہنچتے ہی اپنے سامان کو دُرست کیا اور روز و شب کے اوقات کوئی تقسیم اور معمولات کے مطابق گزارنا شروع کر دیا۔ دو ہفتے نہ گزرے تھے کہ ۲۳؍ اگست کو چار بجے صبح کو اُٹھے تو عبداللہ بٹ مرحوم کی فرمایش اور اپنا وعدہ یاد آیا اور اس کے ایفا کے لیے قلم اٹھا لیا۔ اب مولانا کے پاس فرصت ہی فرصت تھی۔ کوئی امر مانع نہ تھا کہ کسی مضمون کو مختصر لکھا جائے۔ اب وہ اس کے پابند نہ تھے کہ حضرت شاہ اسمٰعیل شہید کی اصلاحی اور عملی تحریک کے صرف ان عوامل ہی کو بیان کریں جو اس تحریک کی تولید کا موجب ہوئے تھے۔ اس کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ حضرت شاہ اسمٰعیل شہید کی شخصیت، سیرت، کمالات اور خدمات میں اور اصلاح مسلمین کے

تذکار میں جو مضامین مروجہ سایز ۱۶/ ۳۰×۲۰ کے ۲۱۵ /صفحات میں سما گئے تھے۔ ان پر مقدمہ لکھنے کے لیے مولانا نے قلم اٹھایا تھا۔ وہ سرمایہ علم و تحقیق فل سکیپ سایز کے دو خطوں کی صورت میں میرے سامنے ہے۔ اس کا پہلا خط چونسٹھ (۶۴) صفحوں پر اور دوسرا خط چھیالیس (۴۶) صفحوں پر یعنی ایک سو دس صفحات پر محیط ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنے وعدے کے ایفا میں جو تحریر پیش کی ہے، وہ مرحوم عبداللہ بٹ کی تالیف کا مقدمہ نہیں بلکہ ایک مستقل اور نہایت جامع و محققانہ تصنیف ہے جو خانوادۂ ولی اللّٰہی کی تحریک کے اجرا و قیام اور اَدوار و اطراف پر محیط ہے۔ اس تحریر کا سب سے اہم اور دل چسپ حصہ وہ ہے، جہاں مولانا آزاد نے حضرت شاہ ولی اللہ، مولانا اسمٰعیل شہید اور خاندان کے دوسرے ارکان پر کسی کے اعتراض، اختلاف، انکار، نقد و رد سے بحث کی ہے اور ان کے فضایلِ جلیلہ کو نمایاں کیا ہے۔ اس سلسلے میں سیّد احمد شہید اور تحریک اصلاح و جہاد اور معرکۂ بالا کوٹ کے بعض مسایل و مباحث بھی مطالعے میں آجاتے ہیں۔

مولانا آزاد کے یہ دونوں خط ۲۳/ اگست اور ۶/ اکتوبر ۱۹۴۲ء کے لکھے گئے یادگار ہیں۔ دوسرے خط کے آخر میں ''ہندستان کی موجودہ صورتِ حال اور مسئلۂ انقلاب و تعمیر'' کے عنوان سے ایک مقالہ ہے، اس میں حضرت شاہ اسمٰعیل شہید نے آخری دور کو وقت کی ایک سیاسی تحریک سے جوڑ دیا ہے۔ یہ وہ دور ہے جب دو سال پہلے مسلم لیگ نے تقسیم ملک کا ریزولیوشن پاس کیا تھا، اگرچہ اس ریزولیوشن کے بانی مبانی یہ صفائی پیش کر رہے تھے کہ تقسیم ملک ان کا مقصود نہیں ہے۔ ان کے بیان کے مطابق وہ اس تجویز میں ملک کے ایک اہم سیاسی مسئلے کا حل ڈھونڈ رہے تھے۔ اگرچہ اس سلسلے میں ان کا کوئی وضاحتی سنجیدہ بیان اس وقت تک نہ آیا تھا اور نہ بعد میں آیا، اکثر لوگ اسے بساطِ سیاست کی ایک چال سمجھتے تھے اور لیگ کے رہنما خود اِسے ناقابلِ عمل سمجھتے تھے۔ لیکن مولانا ابوالکلام آزاد کی بصیرت اس کے پس پردہ کچھ اور ہی دیکھ رہی تھی۔

مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنے اس بیان میں کسی جماعت اور اس کے رہنماؤں کا نام نہیں لیا، نہ زبان و بیان میں کسی رہنما پر طنز و تعریض سے کام لیا اور نہ کسی کی تضحیک و تذلیل کا جملہ ہی استعمال کیا۔ قارئین محسوس کر سکتے ہیں کہ مولانا نے کس شرافت و تہذیب اور کس زبان و اُسلوب میں کس تحمل اور تدلّل کے ساتھ اپنے بیان کو اِختتام تک پہنچایا اور سامعین و قارئین کے دلوں میں اپنی بات کو اُتارنے کی کوشش کی ہے۔

مولانا آزاد ایک جگہ فرماتے ہیں؛ ہر عمل اپنی ایک تاثیر رکھتا ہے اور مشیت کا فیصلہ ہوتا ہے کہ یہ تاثیر اپنی قوت اور افعال و حالاتِ وقت کے مطابق پوری قوت کے ساتھ ظاہر ہو۔ مسلمانوں نے دیکھ لیا کہ لیگ کی سیاست اور اس کے رہنماؤں کے افعال سیاست کی تاثیر کا کس شدت کے ساتھ ظہور ہوا۔ آج قیامِ پاکستان کے بعد قوم کی تیسری نسل گزر رہی ہے اور جن حالات و مسایل سے گزر کر یہاں تک پہنچی ہے، اس کے لیے وہ ایک عذاب الٰہی سے کم نہ تھا، اور نہیں کہا جاسکتا کہ ملک سیاست کے جس بھنور میں پھنسا ہوا ہے، اس کا خاتمہ کب، کہاں، کس حالت میں ہو! اور ملک اور قوم کا کیا انجام ہو! صبح و شام حالات جس تیزی کے ساتھ بگڑ رہے ہیں، اس میں اندازہ نہیں کیا جا سکتا کہ وقت کا اونٹ کس کروٹ بیٹھے گا؟

خدارا! سوچیے، حالات کو بدلنے اور نجات پانے کی سبیل ڈھونڈیے، پاکستان، اس کے بانی، ان کے سیاسی جانشینوں اور ان کے آباؤ اجداد کی جاگیر نہیں! انھوں نے اپنے پیچھے اپنے ایمان و دیانت کا کوئی نقش نہیں چھوڑا، اخلاق و سیرت اور کیریکٹر کا کوئی معیار پیش نہیں کیا، ان کی سیاست کا کوئی اصول اور فلسفہ نہیں تھا۔ انھوں نے ہماری آپ کی رہنمائی کے لیے کوئی بلند فکر اور عزیمت و استقامت کا کوئی نمونہ پیش نہیں کیا۔ جان لیجیے کہ اب پاکستان کو بچانے کی ذمے داری آپ کی ہے۔ اب جو کچھ کرنا ہے آپ ہی کو کرنا ہے۔ آج کوئی اس حقیقت سے انکار نہیں کرسکتا کہ پاکستان میں خرابیوں، لاقانونیت، لوٹ مار، عزیز پروری، خاندان نوازی، رشوت وغیرہ کے جو چشمے پھوٹے ہیں، ان کا سرچشمہ ایک ہی تھا! لیگ نے براعظم ہند پاکستان اور اس کے عوام کے ساتھ جو بے وفائی کی، اسے بھول جایئے اور اپنے وطن اور آیندہ نسلوں کی خبر لیجیے۔ اگر ایک شخص اپنی زندگی کی بساط کے ساتھ دنیا سے گزر گیا ہے تو آپ غم زدہ کیوں ہیں! آپ اپنے فرض کو پہچانیے اور ادا کیجیے! براعظم ہند پاکستان میں ایک ہی حسین اور دل ربا نہ تھا۔ اس کی یاد کو دِل سے نکال دیجیے، اس نے آپ سے وفا نہیں کی تو آپ اس کا شکوہ نہ کریں۔ ان کے غم میں آپ اپنی جان کو کیوں کھپاتے ہیں۔ وہ پہلے بھی آپ کا نہ تھا۔ اور اب بھی اس کی یاد میں کوئی فیض نہیں! ہاں! اگر اس کے جوش محبت اور وفورِ جذبات میں آپ نے اپنے محبّ و مخلص اور خیر خواہوں کی محبت کو ٹھکرایا ہو، ان کی صداقت کو جھٹلایا ہو اور اپنے دامن کو چھڑا لیا اور رُخ پھیر لیا ہو۔ خدا نہ کرے کبھی کسی کی بے عزتی کی ہو، ان کی داڑھی نوچی ہو، اس میں شراب ڈالی ہو، اس کی ٹوپی اتاری ہو اور پیروں تلے روندی ہو، نام دھرے ہوں اور جان لینے کی کوشش کی ہو تو خدا کے حضور معافی مانگیے اور اپنے اور سب کے لیے

مغفرت کی دعا کیجیے۔ ہم اپنے بزرگوں کے لیے مراتب کی بلندی اور مغفرت کی دعا مانگتے ہیں۔ یہ اخلاف کی سعادت مندی کی علامت اور دینی روایت ہے۔ اپنی دعاؤں میں انھیں کبھی نہ بھولیے۔ یاد رکھیے کہ جس طرح نیکی پھلتی پھولتی ہے اور اُس کے اثرات پھیلتے اور فضا کو خوش گوار بناتے اور معطر کر دیتے ہیں، اسی طرح معصیت اور گناہ بھی برگ و بار پیدا کرتے ہیں اور انسانی زندگی میں نحوستیں پھیلتی ہیں اور جڑیں پکڑ لیتی ہیں۔ اور نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ انسانی زندگی مزید معصیت آلود، دشوار اور بے کیف ہو جاتی ہے۔ اس سے توبہ کے بعد نجات پائیے اور چھٹکارا حاصل کیجیے! جن بزرگوں کی طرف اشارہ ہے، اگرچہ آج وہ بھی دنیا میں موجود ہیں، لیکن ان کی سیرتوں میں بڑی کشش ہے۔ ان کے بلند افکار میں کروٹیں لیتی ہوئی زندگی اور ان کی خدماتِ قوم و وطن میں ہمارے لیے بڑا سبق ہے۔

آیئے! شیخ الہند مولانا محمود حسن، شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی، مولانا عبیداللہ سندھی، مولانا ابوالکلام آزاد زندہ ہیں۔ ان سے سبق حاصل کریں۔ ان کی زندگی کی ایک ایک کروٹ اور عملِ صالح مشعلِ راہ ہے۔ ان کی سیرتیں جگمگا رہی ہیں۔ ان کے کارنامے زندہ اور تابندہ ہیں۔ وہ اخلاق و تہذیب کی مثال اور ایمان و دیانت کا پیکر تھے۔ وہ اسلام کے سچے پیرو تھے۔ انھوں نے برِاعظم کی سیاست میں قوم کی سچی رہنمائی کی تھی۔ وہ آپ کے آزمائے ہوئے تھے۔ موت ان پر بھی طاری ہوئی، لیکن وہ اپنے اعمالِ نیک، اخلاق و سیرت، وطن دوستی اور قوم پروری، اپنے کارناموں اور پاکیزہ زندگی کے یادگار نمونے اپنے بعد آنے والوں کے لیے مثل چراغِ راہ کے چھوڑ گئے تھے۔ ان میں کوئی شخص موسم کی پیداوار نہ تھا۔ صدیوں پر پھیلی ہوئی ان کی عظیم الشان تاریخ ہے۔ ماضی میں ان کا رشتہ حجۃ اللہ البالغہ حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی سے ملتا ہے۔ بیسویں صدی میں تحریک قومی و ملّی کے فاتح باب شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن تھے۔ ان کے جانشینِ صادق شیخ الاسلام مولانا سیّد حسین احمد مدنی دورِ آخر کے مردِ میدان تھے۔ مولانا عبیداللہ سندھی اور مولانا ابوالکلام آزاد تحریک ولی اللّٰہی کے صف اوّل کے بلند پایہ رجال کار تھے۔ آیئے! ان کے طرزِ سیاست کو اپنائیں، حق میں ان کی پیروی کریں۔ ملک اور قوم کی بھنور میں پھنسی ہوئی کشتی کو نکالیں، اپنا فرض ادا کریں اور دنیا میں پاکستان اور اس میں بسنے والی قوم کا نام روشن کریں۔

(ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہان پوری)

یہ جو گزشتہ اَوراق میں اس اصلِ عمل کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ انقلاب وتخریب اور اِصلاح وتعمیر کے اعمال ایک وقت میں انجام نہیں پا سکتے اور اکثر حالتوں میں ان کا اِشتراک دونوں مقصدوں کا کارخانہ درہم برہم کر دیتا ہے تو اِس صورتِ حال کی ایک واضح مثال ہندستان کی موجودہ حالت میں بھی دیکھی جا سکتی ہے، اور بے محل نہ ہوگا اگر اِس بارے میں بھی چند اِشارات نوکِ قلم پر آ جائیں۔

یہ جو آج کل مسلمانوں کا ایک گروہ ملک کی سیاسی کشمکش کو صرف اِس نظر سے دیکھتا ہے کہ اس سے اپنے جماعتی مستقبل کا کوئی نقشہ پیش کرے، یعنی اُس کے جذبات سیاسی جدوجہد کی طرف نہیں کھنچتے، کیوں کہ سیاسی جدوجہد کو وہ صرف ہندوؤں اور برطانی حکومت کی کشمکش تصور کرتا ہے، البتہ وہ چاہتا ہے بغیر ہاتھ پاؤں ہلائے اِس کشمکش سے اپنے لیے کوئی تعمیری نقشہ نکال لے، تو دَراصل اس کے اندر بھی یہی بنیادی غلطی کام کر رہی ہے۔ یہ لوگ اس بنیادی اصل کو نظر اَنداز کر رہے ہیں کہ بحالتِ موجودہ سیاسی انقلاب مقدم ہے، اور چونکہ مقدم ہے، اس لیے تمام قوتیں صرف اسی میں خرچ ہونی چاہییں۔ کیوں کہ اگر سیاسی انقلاب کی منزل میں تعمیری نقشوں کی فکر کی جائے گی، تو نہ تو اِنقلاب تکمیل تک پہنچے گا، نہ تعمیری مقاصد ہی بروے کار آئیں گے۔ البتہ طرح طرح کی نئی الجھنیں اور کشمکشیں پیدا ہو جائیں گی، اور تیسری طاقت، جو اِنقلاب کے موثرات سے بچنا چاہتی ہے، ان سے فایدہ اٹھا کر اَپنی عمر بڑھائے گی۔

دراصل ہندستان کے مسلمانوں کے لیے صحیح راہِ عمل صرف یہی ہو سکتی تھی کہ سب سے پہلے وہ وقت کے بنیادی سوال کا فیصلہ کرتے، اور پھر اُس فیصلے کے مطابق اپنا سیاسی طرزِ عمل ڈھالتے۔ انھیں سب سے پہلے اس بات پر غور کرنا تھا کہ موجودہ ہندستان میں ان کی جماعتی ہستی کی کمیت اور کیفیت کا کیا حال ہے؟ وہ انگریزی حکومت کے سہارے کے بغیر اپنے

مستقبل کو عزم و اعتماد کی نظر سے دیکھ سکتے ہیں یا نہیں دیکھ سکتے؟ اگر ہندستان میں تعداد اور نوعیت کے لحاظ سے ان کی جماعتی ہستی اتنی گری ہوئی ہے کہ وہ ایک آزاد ہندستان میں ہندو اکثریت کی ممکن زیادتیوں سے اپنی حفاظت نہیں کر سکتے تو اِس صورت میں ان کے لیے کسی سیاسی انقلاب کی خواہش کا سوال سرے سے پیدا ہی نہیں ہو سکتا۔ کیوں کہ ہر اِنقلاب، جو تیسری طاقت کو ہٹا کر اُن کی جگہ ملکی طاقت کو بٹھانا چاہے گا، ان کی جماعتی ہستی کے لیے ایک نیا خطرہ بن جائے گا۔ وہ اپنی حفاظت کے لیے مجبور ہو جاتے ہیں کہ برطانی شہنشاہی سے اپنے آپ کو وابستہ کریں۔ برطانی شہنشاہی جب تک ملک کے تختِ اقتدار پر رہے گی، تھوڑی بہت اُن کی حفاظت ہوتی رہے گی۔ کم از کم وہ انھیں مٹنے نہیں دے گی۔ کیوں کہ خود اُس کی کار براریوں کے لیے ملک کے مختلف عناصر کی موجودگی ہر طرح سود مند ہے۔ ہندستان کے کروڑوں اَچھوت اِسی نظر سے برٹش اقتدار کو دیکھنے لگے ہیں اور کوئی انھیں اِس پر ملامت نہیں کر سکتا۔ ہندستان کے نو کروڑ مسلمان بھی اپنے کو اَچھوتوں کی صف میں لے آئیں، اور اپنی درماندگی اور بیچارگی کا ہاتھ برٹش اقتدار کے دامنِ عاطفت کی طرف بڑھائے رہیں:

برمن منگر، برکرمِ خویش نگر!

لیکن اگر وہ محسوس کرتے کہ باوجود تعداد کی اضافی کمی کے کوئی وجہ نہیں کہ وہ ایک مایوس فیصلے تک پہنچیں۔ نو کروڑ اِنسانوں کے لیے، جنھوں نے اپنی تاریخ کی داستانیں فراموش نہیں کر دی ہیں، اور جن کی مذہبی اور تمدنی زندگی کا مواد ابھی تک جماعتی سیرت کے زندہ اجزا سے بالکل خالی نہیں ہو گیا ہے، اس طرح کی درماندگی و بے چارگی کا کوئی سوال پیدا ہی نہیں ہوتا۔ وہ ایک آزاد ہندستان میں اپنے مستقبل کو خوف اور شک کی نظروں سے نہیں بلکہ صرف عزم اور خود اِعتمادی کی نگاہوں سے ہی دیکھ سکتے ہیں، تو پھر صورتِ حال بالکل منقلب ہو جاتی ہے، اور اُن کے لیے وقت کا سوال یہ نہیں رہتا کہ کل کیا ہوگا؟ بلکہ یہ ہو جاتا ہے کہ آج کیا کرنا چاہیے؟ اس صورت میں وہ وقت کے تقاضوں کی پکار سے اپنے کان بند نہیں کر سکتے اور سیاسی جدوجہد کا میدان صرف ہندوؤں ہی کے لیے نہیں چھوڑ دے سکتے۔ ان کا

فرض ہو جاتا ہے کہ جدو جہد میں کسی سے پیچھے نہ رہیں اور تیسری طاقت کو راہ سے ہٹائیں۔ جب یہ طاقت اپنی جگہ چھوڑنے پر مجبور ہو جائے گی اور ملک کے عزائم سر اُٹھا سکیں گے، تب وقت آئے گا کہ تعمیر کی نقش آرائیاں کی جائیں۔ پھر جو کچھ بھی ہوگا، وہ دو حالتوں سے خالی نہیں: یا تو حالات کی رفتار موافق رُخ اختیار کرے گی یا مخالف، اگر موافق رخ اختیار کیا تو سارے جھگڑے ختم ہو گئے۔ اگر مخالف ہوائیں چلنے لگیں تو نو (۹) کروڑ اِنسانوں کے لیے، جو زندہ رہنا چاہتے ہیں، خوف و ہراس کی کون سی وجہ ہو سکتی ہے؟ جیسی کچھ حالت ہوگی، نپٹ لیں گے، اگر زندگی اور کامرانی کی راہوں کو طے کرنا ہے تو کانٹوں کے اندیشے سے قدم نہیں روکے جا سکتے۔ یہاں پھولوں کی سیج پر کروٹیں بدل کر کبھی کوئی مسافتیں طے نہ کر سکا۔ اگر منزلِ مقصود تک پہنچنا ہے تو راہ کے پیچ و خم کی دشواریوں سے عہدہ برا ہونا ہی پڑے گا:

بے خار گل نہ باشد و بے نیش نوش ہم
تدبیر چیست؟ وضعِ جہاں ایں چنین فتاد

آج سے پینتیس (۳۵) برس پہلے یہ سوال میرے سامنے آیا تھا، اور صورتِ حال کا مطالعہ مجھے دوسرے فیصلے کی طرف لے گیا تھا۔ اب میں اپنے کان اُس کے تقاضوں کی سماعت سے بند نہیں کر سکتا، لیکن بدقسمتی سے ایک گروہ اُن لوگوں کا موجود ہے جن کا مطالعہ اِس فیصلے کا ساتھ نہیں دیتا۔ انھیں پہلی صورت کے اذعان نے اُلجھا لیا ہے۔ وہ اپنے لیے عزم اور خود اِعتمادی کی کوئی جگہ نہیں پاتے، اس لیے سیاسی جدو جہد کی پکار اُن کے دلوں کے لیے کوئی پکڑ نہیں رکھتی۔ وہ اسے صرف ہندوؤں کا سرمایۂ عمل سمجھتے ہیں، خود اپنے جیب و دامن کے لیے کسی سرمایۂ عمل کی طلب نہیں رکھتے۔ انھیں اس کی کوئی فکر نہیں کہ:

بضاعتے بکف آور، کہ ترسمت فردا
بخوں فشانی پیشانی حیا بخشند!

وہ سمجھتے ہیں کہ انھیں سب سے پہلے مستقبل کے تعمیری سوالات چھیڑ دینے چاہییں، اور اُن کا شور و ہنگامہ ایسا برپا کر دینا چاہیے کہ سیاسی مطالبوں کی صدائیں اُس کی گونج میں گم ہو کر رہ جائیں، اور اِس ہنگامے سے فایدہ اٹھا کر برٹش اِقتدار زیادہ سے زیادہ وقت کے لیے

اپنی عمر بڑھاتا رہے:

شادم کہ از رقیباں دامن کشاں گزشتی
گو مشتِ خاکِ ماہم برباد رفتہ باشد!

جب کہ میں نے عزم اور خود اعتمادی کی راہوں کو دیکھا تو اُنھوں نے خوف اور شک کے گوشوں میں پناہ لینی چاہی، اس اختلافِ نظر کا لازمی نتیجہ ہر گوشۂ عمل میں نکلنا تھا، اور نکلا۔ وہ انگریزوں کو بھی خوف ہی کی نظر سے دیکھتے رہے اور اب ہندوؤں کو بھی خوف ہی کی نظر سے دیکھ رہے ہیں۔ میں نے جب پہلوں کو خوف کی نظر سے نہ دیکھا تو دوسروں کو کب خوف کی نظر سے دیکھ سکتا تھا؟ میں ہر صورتِ حال میں مسلمانوں کے لیے صرف عزم اور خود اعتمادی ہی کی راہ دیکھ سکا۔ میں اپنی آنکھوں کو نہیں بدل سکتا تھا، اور نہ اپنے سینے میں دوسروں کا دِل رکھ سکتا تھا:

تفاوت است میانِ شنیدنِ من و تو
تو بستن در و من فتح باب می شنوم!

جب ایک جماعت کی قوتِ عمل کھوئی جاتی ہے تو اُس کے جذبات کی گرم جوشیاں صرف مجہول خواہشوں اور سطحی ولولوں ہی میں اُبھر سکتی ہیں۔ قرآن نے اس حالت کو ''امنیۃ'' کی حالت سے تعبیر کیا ہے: وَمِنهُم اُمِّيُّونَ لَا يَعْلَمُونَ الْكِتٰبَ اِلَّآ اَمَانِيَّ.(۱) تو یہی حالت اس گروہ کی بھی ہوگئی۔ یہ عمل اور جدوجہد کی راہوں سے گریزاں تھا۔ اسے اپنی سرگرانیوں میں مگن رہنے کے لیے ایک مجہول خواہش کی ضرورت تھی۔ وہ اب ''پاکستان'' کی شکل میں جلوہ آرا ہوگئی ہے:

---

(۱) وَمِنهُم اُمِّيُّونَ لَا يَعْلَمُونَ الْكِتٰبَ اِلَّآ اَمَانِيَّ وَاِنْ هُمْ اِلَّا يَظُنُّونَ. (۲:۷۸)

اور (پھر یہ حال تو اُن کے علما کا ہے، جو مقدس نوشتوں کا علم رکھتے ہیں، لیکن) انھی میں وہ لوگ بھی ہیں جو اَن پڑھ ہیں، اور جہاں تک کتابِ الٰہی کا تعلق ہے، (خوش اعتقادی کی) آرزوؤں اور ولولوں کے سوا اور کچھ نہیں جانتے، اور (دین کے علم و عمل کی جگہ) محض وہموں، گمانوں میں مگن ہیں۔ (ترجمان القرآن: جلد اوّل، پہلا ایڈیشن، ۱۹۳۰ء)

اھلاً لطلعت وجھک المتھلل!

اب انھیں زندگی اور مقصد کی طلب وجستجو کی کوئی احتیاج نہیں رہی۔ انھیں صرف ''پاکستان'' چاہیے۔ گو''پاکستان'' کے جلوۂ سراب کی حقیقت کچھ ہی کیوں نہ ہو!

گو جانتا ہوں میں کہ نہیں کچھ بجز فریب

مجھ کو فریب کھانے کی عادت ہے، کیا کروں!

یہ ''پاکستان'' کا کھلونا دراصل لندن میں تیار ہوا تھا۔ کچھ دنوں تک ہندستان کے بازاروں میں اس کی پوچھ گچھ نہیں ہوئی، لیکن پھر یکایک ایسی مانگ بڑھی کہ ہر دُکاندار کو اپنا چبوترہ اسی سے سجانا پڑا۔ اب جس کسی کو دیکھو، اِسی کھلونے سے کھیل رہا ہے اور اِسی میں مگن ہے۔ ہندستان کے لیے ایسے عام پسند کھلونے صرف لندن ہی کے کارخانوں میں ڈھل سکتے ہیں:

سرِ این فتنہ ز جائیست کہ من می دانم!

امام مالک سے کسی نے پوچھا تھا کہ ''الرحمٰن علی العرش استویٰ'' میں خدا کے عرش پر مستوی ہونے کے معنی کیا ہیں؟ انھوں نے جواب دیا تھا کہ ''الاستویٰ معلوم وکیفیتہٗ مجھولٌ، والاعتقاد علیہ واجبٌ، والسوال عنہ بدعۃٌ.'' سو ''پاکستان'' کا معاملہ بھی اِسی قبیل کا ہوا۔ نام اُس کا معلوم ہے، کیفیت اس کی مجہول ہے، اعتقاد اُس پر واجب ہے اور اِس بارے میں پوچھ گچھ کرنا بدعت ہے۔ گویا یہ بھی وہی بات ہوئی کہ:

کان را کہ خبر شد، خبرش باز نیامد!

قطع نظر اِس کے کہ اس معلوم الاسم اور مجہول المعنی لفظ کا کوئی مدلول بھی ہے یا نہیں، صرف اسی بات پر غور کرو کہ یہ تعبیر سرے سے اپنی سرشت ہی میں کس درجہ غیر اسلامی اور سرتا سر ہندوانہ واقع ہوئی ہے؟ ''پاکستان'' کا بظاہر مطلب، جس سے اس وقت تک دنیا کے کان آشنا ہو سکے ہیں، یہ ہے کہ ملک کے دو ٹکڑے کر دیے جائیں۔ ایک ٹکڑا مسلمانوں کی اکثریت کا ہو، اور چوں کہ وہ مسلمانوں کی اکثریت کا ہوگا، اس لیے ''پاکستان'' ہوگا۔ یعنی

پاک جگہ! دوسرا ٹکڑا ہندوا کثریت کا ہو، اور چوں کہ وہ ہندوا کثریت کا ہوگا، اس لیے وہ پاک استھان نہ ہوگا، ''ناپاک استھان'' ہوگا۔ لیکن پاکی اور ناپاکی کا یہ تخیل ہی سرے سے غیر اسلامی اور خالص برہمنی ہے۔ اسلام خدا کی زمین کے کسی حصے کو بھی اس طرح پاک اور ناپاک قرار نہیں دیتا۔ اس کے لیے خدا کی ساری زمین پاک ہے۔ پھر یہ صرف پاک ہی نہیں، بلکہ عبادت گاہ ہے۔ ''جعلنی لی الارض کلھا مسجدًا.''(۱)

ہر جا کینم سجدہ، بداں آستان رسد!

البتہ برہمنی مذہب نے انسانوں کی طرح انسانوں کے بسنے کی سرزمینوں میں بھی پاکی اور ناپاکی کی لکیر کھینچ دی تھی۔ اُن کے نزدیک صرف آریا ورتھ ہی ایک پاک سرزمین تھی۔ اس سے باہر جو کچھ تھا، وہ خود بھی ناپاک تھا اور وہاں کے بسنے والے بھی ناپاک تھے۔ بسنے والے ایسے ناپاک کہ ان کے سایے سے بھی بھاگنا چاہیے۔ زمینیں ایسی ناپاک کہ اگر کسی نے بھولے سے بھی وہاں قدم رکھ دیا تو ہمیشہ کے لیے ناپاک ہو گیا۔ ہندستان کے مسلمانوں نے ہندوؤں کے بہت سے اوہام و رُسوم لے لیے تھے، لیکن ابھی تک تخیل کا یہ خانہ خالی تھا۔ ''پاکستان'' نے یہ کمی بھی پوری کر دی:

اے برہمن! چہ زنی طعنہ، کہ در معبد ما
سبحۂ نیست کہ آن غیرتِ زنارِ تو نیست

بہر حال اس تمام صورتِ حال کے اندر بھی وہی بنیادی غلطی کام کر رہی ہے کہ انقلاب کی منزل کو تعمیری سوالات کی کاوشوں میں ٹالا جا رہا ہے۔ اور چوں کہ بدقسمتی سے حالات کی رفتار ایسی رہی ہے کہ انقلاب کے تقاضے ان لوگوں کے لیے کوئی کشش پیدا نہ کر سکے، اس لیے انھیں ان کی فکر بھی کیوں ہونے لگی؟ معاملہ ٹلتا ہے تو ہزار مرتبہ ٹلے۔ بگڑتا ہے تو لاکھ مرتبہ بگڑے۔ دراصل اس معاملے کی برہمنی ہی میں ان لوگوں نے اپنی جمعیت خاطر کی راہیں نکالی ہیں۔ اس کی فکر تو اُن نامرادوں کے حصے میں آئی تھی جو اَپنے دلوں کو اِس غم کے

(۱) یعنی: خدا نے میرے لیے پورے کرۂ ارضی کو مسجد بنا دیا ہے۔ یہ ایک مشہور حدیث ہے جس میں پیغمبرِ اسلام (علیہ الصلوٰۃ والسّلام) نے اسلام کی خصوصیات بتلائی ہیں۔

زخموں سے بچا نہیں سکتے:

حریفِ کاوشِ مژگانِ خوں ریزش نہ ناصح
بدست آور رگِ جانے ونشتر را تماشا کن!

میرے پاس کبھی کبھی لوگ اسی طرح سوالات لکھ کر بھیجتے ہیں کہ قرآنی نظامِ حکومت کیا ہے؟ اور رَبانی نظامِ حکومت کس طرح کا ہونا چاہیے؟ گویا جو منزل ابھی ہمیں پیش آگئی ہے، وہ حکومت کے نظاموں کے بنانے کی ہے، اور اَب مسلمانوں کے لیے سوچنے سمجھنے کا صرف یہی ایک کام رہ گیا ہے، باقی تمام مراحل طے ہو چکے:

تو کارِ زمین را نکو ساختی
کہ با آسمان نیز پر داختی!

اگر یہ سوالات محض علمی حیثیت سے سامنے آئیں تو بلاشبہ اپنی جگہ رکھتے ہیں، اور میری تحریرات میں ان کا مواد جا بجا پھیلا ہوا ہے، مگر یہ لوگ ان سوالوں کو محض اکیڈیمک حیثیت سے نہیں چھیڑتے۔ مقصود اُن کا یہ ہوتا ہے کہ یہ سوال اٹھا کر وقت کی سیاسی یکسوئیوں کو مختل کیا جائے، اور ''قرآنی نظامِ حکومت'' اور ''ربانی نظامِ حکومت'' کی ابلہ فریب ترکیبیں سنا کر عام مسلمانوں کو اپنے دامِ فریب میں پھنسائیں۔ ممکن ہے، ان میں ایسے لوگ بھی ہوں جو خوش نیتی سے ان سوالوں کو چھیڑتے ہوں، لیکن انھیں معلوم نہیں کہ اس طرح کے سوالات چھیڑ کر عوام کو مذہب کا سبز باغ دکھانا، فی الحقیقت اُن کے مذہبی جذبات کے ساتھ کھیلنا اور اُنھیں راہِ راست سے گمراہ کرنا ہے۔ یہ افکار و خواطر نہیں ہیں جو اُن کے دماغوں کو اپنا نشیمن بنا رہے ہیں۔ یہ وساوس و خطرات ہیں جنھیں ان کا نفسِ خادع پردے کے پیچھے بیٹھا ہوا اُن کے دل و دماغ پر مسلّط کرتا رہتا ہے، اور اِس لیے ان کی اچھی باتیں بھی ''کَلِمَۃ حَقِّ اُرِیْدَ بِھَا الْبَاطِلُ'' کے حکم میں داخل ہو جاتی ہیں۔

خود اِنتخابی یعنی ''سیلف ڈیٹرمینیشن'':

اس موقعے پر یہ بات بھی سامنے رکھنی چاہیے کہ اس صورتِ حال کو اَصلاً اُس سوال سے کوئی تعلق نہیں جو آج کل لوگوں نے اٹھا دیا ہے، یعنی مسلم اکثریت کے صوبوں کو اِس

بات کے فیصلے کا حق حاصل ہونا چاہیے کہ وہ ملک کی ایک متحدہ مرکزی یونین میں شریک ہوں گے یا نہ ہوں گے۔ یہ حق کوئی ایسا حق نہیں ہے جو اکثریت کے دے دینے یا نہ دینے پر موقوف ہو۔ یہ حق قدرتی طور پر ملک کے ہر جغرافیائی حلقے کو حاصل ہے اور اُسے کوئی اُن سے چھین نہیں سکتا۔ وہ زمانہ اب گیا جب انیسویں صدی کے دستوری اصول، مرکزیت کے بندھنوں سے جغرافیائی اور نسلی حلقوں کو کسنا چاہتے تھے، اور یہ سمجھا جاتا تھا کہ اس طرح کا مرکزی کساؤ ملک کو اِنتشار اور تفرقے سے محفوظ کر دے گا۔ دراصل ہر طرح کے تفرقوں کی جڑ یہی جبر و اکراہ کے بندھن تھے جو مختلف ناموں اور مختلف شکلوں میں دستور سازوں نے اختراع کیے، اور جماعتوں کو خود اُن کی پسند اور مرضی سے نہیں، بلکہ دستوری بندھنوں کے زور اور دَباؤ سے باندھنا چاہا۔ اب یہ دباؤ جماعتی اور جغرافیائی حلقوں کو باہم جوڑنے کے لیے کچھ مفید نہیں ہو سکتا۔ کیوں کہ یہی چیز اُن کی دائمی کشمکش اور بے اطمینانی کا ایک دائمی سبب بن گئی ہے۔ جماعتوں کو ایک دوسرے سے جوڑنے اور تفرقوں کو مٹانے کی اصلی راہ یہ ہے کہ ان کے باہمی علایق کے معاملے کو زور اور دَباؤ کے عنصر سے بالکل پاک کر دیا جائے، اور ایسی آب و ہوا پیدا کی جائے کہ وہ خود اپنی پسند اور مرضی سے آپس میں جڑے ہوئے ایک ہو کر رہیں، اور خود اُن کے فایدے اور مصلحتیں انھیں مجبور کر دیں کہ علاحدگی اور بخود مشغولی کا خیال اپنے دل و دماغ سے نکال دیں:

درسِ وفا اگر بود زمزمۂ محبتے
جمعہ بہ مکتب آورد طفل گریز پاے را

دراصل یہی بنیادی اصل دنیا کی تمام قوموں کی باہمی منازعتوں کا بھی حقیقی علاج ہے، اور جب تک دنیا اس اصل کو عمل میں نہ لا سکے گی، باہمی کشاکش ختم ہونے والی نہیں۔ کسی قوم کا دباؤ دوسری قوم پر نہ رہے، کسی قوم کو جبر و اکراہ سے مجبور نہ کیا جائے کہ کسی دوسری قوم کے دامن سے بندھی رہے۔ بین الاقوامی علایق کا میدان جبر و اکراہ سے بالکل پاک کر دیا جائے۔ جب تک دنیا ایک ایسے بے لاگ انٹرنیشنلزم پر متفق نہ ہوگی، قومیتوں کے خودسر خمیر سے ہٹلر اور مسولینی پیدا ہوتے ہی رہیں گے، اور کبھی جابرانہ مسابقتوں کا وَلولہ دنیا سے نابود

نہ ہوگا۔

جدید روس نے اسی بنیادی حقیقت کا عملی نمونہ دنیا کو دِکھلا دیا ہے۔ سڈنی دیب کے لفظوں میں وہ دنیا کے تمام جماعتی اور اِقتصادی مسایل کا ایک نیا حل ہے جو ایک چھوٹی دنیا کے کامیاب تجربے نے بڑی دنیا کے تجربے کے لیے مہیا کر دیا ہے۔ اُس نے بہ یک وقت دونوں کام انجام دے دیے۔ آزاد جغرافیائی اور قومی حلقوں کی تشکیل بھی کر دی، اور ایک طاقتور اور سرگرم مرکز بھی قایم کر دیا۔ یہ دونوں باتیں جو آج تک باہم متضاد سمجھی جاتی تھیں، کس طرح وجود میں آ گئیں؟ اس طرح کہ اس نے پہلے یہ بنیادی اصل بخوشی تسلیم کر لی کہ ہر جغرافیائی اور تمدنی حلقہ اس کی پوری آزادی رکھتا ہے کہ جس طرح کا دستورِ اساسی چاہے، اپنے لیے پسند کر لے۔ مرکزی سوویٹ میں شریک ہونے، نہ ہونے کا فیصلہ خود اُسے کرنا چاہیے۔ اس بارے میں کوئی جبر و اکراہ اُس کی راہ میں حایل نہ ہوگا۔ اس اصل کے تسلیم کرتے ہی صورتِ حال اچانک منقلب ہو گئی، اور وہ تمام جماعتیں جن کا رُخ بالکل دوسری طرف ہو رہا تھا، خود اپنی پسند اور مرضی سے مرکزی سوویٹ کی طرف پلٹ پڑیں اور اس طرح اُس سے جڑ گئیں کہ موجودہ جنگ کا خون ریز ہاتھ بھی انھیں مجروح مرکز سے الگ نہ کر سکا:

اقلیم دل بہ زور مسخر نمی شود
این فتح بے شکست میسر نمی شود

اب سوویٹ روس کے مختلف حلقوں میں سے گیارہ حلقے اگرچہ مرکز سے علاحدگی کا حق رکھتے ہیں، لیکن ان میں سے کوئی حلقہ بھی اس حق کو کام میں لانا نہیں چاہتا، کیوں کہ وہ دیکھتا ہے کہ یہ علاحدگی خود اُس کے مفاد کے لیے مضر ہوگی۔ وقت کی اصلی گتھی اقتصادی گتھی تھی، اور مرکز نے اس کا جو حل تجویز کیا تھا اور جو پروگرام یکے بعد دیگرے اختیار کیے تھے، یکساں طور پر سب کو اِس کی احتیاج تھی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ سب کے آگے سعی عمل کی ایک ہی شاہراہ کھل گئی، اور چند سالوں کے اندر ایک ایسا متحدہ روس پیدا ہو گیا جسے موجودہ جرمنی کا فاتحِ یورپ سیلاب بھی اپنی جگہ سے نہ ہلا سکا۔

ہندستان کے دستوری مبادیات بھی اسی رُخ پر جانے والے ہیں، اس کے بغیر چارہ

کار نہیں۔ اور میں وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اگر اس سوال کو غلط طریقے پر نہ چھیڑا گیا ہوتا، اور بہ حیثیت مجموعی غلط طرزِ عمل نہ اختیار کیا گیا ہوتا، تو یہ مسئلہ اپنے صحیح محل میں اُبھر کر بہ آسانی حل ہو جاتا۔ چناں چہ یہی وجہ ہے کہ جب گزشتہ سال سر اسٹیفرڈ کرپس والے مسودۂ اعلان نے اس سوال کو چھیڑا تو مجھے اس میں کوئی ناقابلِ عبور دُشواری پیش نہیں آئی کہ انڈین نیشنل کانگریس کی ورکنگ کمیٹی کو اس بارے میں ایک متوازن فیصلے پر لے آؤں۔ اس فیصلے میں یہ ظاہر کرنے کے بعد کہ ملک کے لیے صحیح راہِ عمل اتحاد ہے نہ کہ تفرقہ، اور تفرقے کے جو بواعث اُبھر رہے ہیں، اُن کے علاج کی بہت سی کوششیں ہیں جو ابھی کرنی باقی ہیں، یہ اصل تسلیم کر لی ہے کہ اس بارے میں جبر و اکراہ کی گنجایش نہیں، اور بہر حال ایک جغرافیائی حلقے کی اکثریت اپنی راہِ عمل خود تجویز کر سکتی ہے۔

ایک قوم یا دو قومیں؟

جس وقت سے ہندستان میں نئی سیاسی جدوجہد کی بنیاد پڑی، برٹش حکومت کی جانب سے یہ بات کہی جا رہی تھی کہ ہندستان کے لیے نیابتی طرزِ حکومت کا کوئی سوال پیدا ہی نہیں ہو سکتا۔ یہاں کوئی ایک ہی قوم نہیں بستی۔ اور چوں کہ ایک قوم نہیں بستی، اس لیے قومی حکومت ظہور پذیر نہیں ہو سکتی۔ انڈین نیشنل کانگریس کے قیام کے چار سال بعد لارڈ ڈفرن نے اپنی اس مشہور اسپیچ میں، جو سینٹ اینڈ رو ڈنر کلکتہ کے موقعے پر کی گئی تھی، کانگریس کے مطالبوں کے خلاف سب سے بڑی دلیل یہی پیش کی تھی، اور پھر کانگریس کی مخالفت کے لیے جو جماعتیں تیار کی گئیں، انھیں بھی یہی سبق پڑھایا گیا تھا۔ سر سیّد احمد خاں مرحوم کی تمام تقریروں کا، جو اُنھوں نے کانگریس کی مخالفت میں کی تھیں، یہی ماحصل تھا۔

لیکن بعد کو جب کانگریس کی تحریک کے اثرات اس حد تک پہنچ گئے کہ صورتِ حال کی تیز رفتاری کو روکنے کے لیے کچھ نہ کچھ تبدیلیاں ناگزیر ہو گئیں، اصلاحات کا قدم اٹھایا گیا اور نیابتی اداروں کی بنیادیں پڑنے لگیں۔ اب اس بات پر زور نہیں دیا جاتا تھا کہ ہندستان کے لیے نیابتی طرزِ حکومت موزوں نہیں ہو سکتی۔ البتہ کہا جاتا تھا کہ تدریجی ترقی کے بغیر چارہ نہیں، اور آخری منزلِ مقصود تک پہنچنے کے لیے بڑی مدت درکار ہے۔ لیکن اب کچھ عرصے

سے وہی مدفون نعش پھر اُکھاڑی گئی ہے، اور کہا جاتا ہے کہ ہندستان میں ایک قوم کی جگہ دو قومیں بستی ہیں، اس لیے کوئی متحدہ قومی حکومت قایم نہیں ہوسکتی۔ نیز اِس سلسلے میں ہندو اور مسلمانوں کے مذہبی اور تمدنی اختلافات کو اُبھارا جارہا ہے اور اِس پر زور دیا جارہا ہے کہ ایسے دو مختلف موادوں سے ایک متحدہ قومیت کا وجود کیوں کر ڈھالا جاسکتا ہے؟

دراصل قومیت اور قومی حکومت کا یہ سارا تخیل ان بنیادوں کا اُٹھایا ہوا ہے جو کب کی گر چکی ہیں، اور دُنیا اُس جگہ سے منزلوں آگے نکل گئی ہے۔ ایک بڑی مصیبت یہ ہے کہ گو اُنیسویں صدی جاچکی، لیکن وہ اپنا ذہنی ورثہ اس طرح ہمارے دماغوں میں چھوڑ گئی ہے کہ اُس کے اثرات سے الگ ہوکر ہم کسی معاملے پر غور کرہی نہیں سکتے۔ وقت کا کوئی سوال بھی سامنے آجائے، ہم اُسی پرانی دنیا کے فکری کیچڑ میں پھنسے ہوئے اسے دیکھنے لگیں گے اور اُسی گزری ہوئی دنیا کا فرسودہ ترازو نکال کر ہاتھ میں رکھ لیں گے۔ اس صورتِ حال کی ایک واضح مثال آج کل کے بعض علمی مباحث میں ہمارے سامنے آتی رہتی ہے۔ مادّے کی نوعیت اور خواص کا ایک خاص تصور تھا جو اُنیسویں صدی کی طبعیات نے قایم کیا تھا۔ اب وہ تصور تقویم پارینہ ہوچکا ہے اور پورا معاملہ سائنس کے دایرے سے نکل کر پھر فلسفے کے صحرا میں گم ہوگیا ہے۔ لیکن چوں کہ اُنیسویں صدی کے تصور کی پکڑ ابھی تک ہمارے دماغوں میں ڈھیلی نہیں پڑی ہے، اس لیے جب کبھی مادّیات کی حقیقت پر بحث کرتے ہیں تو ہمارا معیارِ نظر اُسی فرسودہ تصور کا پیدا کیا ہوا ہوتا ہے، اور اُس سے الگ ہوکر صورتِ حال کی تصویر اپنے سامنے کھینچ نہیں سکتے۔ ٹھیک یہی حال وقت کے سیاسی اور اِقتصادی مباحث کا بھی ہے۔ پچھلی صدی جاچکی، لیکن اس کے تصورات ابھی تک پیچھا کیے جارہے ہیں۔

انیسویں صدی میں قومیت اور قومی حکومت کا ایک خاص تصور قایم ہوا تھا۔ نپولین کے زوال کے بعد یورپ کی قومیتوں کا رنگ وروغن اسی سے بنایا گیا۔ لیکن اب وہ تقویم پارینہ ہوچکا ہے، اور اُس کی حیثیت صرف یہ ہوگئی ہے کہ موجودہ عہد کا ایک مصنف نظام ہاے حکومت کی تاریخ بیان کرتے ہوئے تمام پچھلے تصوروں کے ساتھ ان کا بھی ذکر کردے۔ بیسویں صدی کی اجتماعی زندگی اور اُس کی نشوونما کی مختلف رفتاروں نے اب بالکل نئی

صورتوں اور نئے نقطہ ہائے نظر کے جامے پہن لیے ہیں، اور اُنیسویں صدی کے رنگ و روغن کا سامان ان کی نقش آرائیوں کے لیے کام نہیں دے سکتا۔ اب کسی جمہوری حکومت کی تشکیل کے لیے یہ تصورات ضروری نہیں رہے کہ انیسویں صدی کے معیار قومیت کے مطابق ایک قومی زندگی وجود میں آ گئی ہو اور اُس کی نسلی اور روایتی زندگی کی اینٹوں سے قومی حکومت کی دیواریں چنی جائیں۔ اب بالکل دوسری طرح کے عوامل [1] اور محرکات ان دیواروں کا سروسامان مہیا کرتے ہیں۔ ان میں سب سے بڑا عامل کسی متحدہ اجتماعی نظام اور کسی متحدہ سیاسی صورتِ حال کا تقاضہ ہے۔

سوویٹ روس نے اوّل روز سے اپنی جمہوریت کا یہ تصور قایم ہی نہیں کیا کہ وہ ایک نیشنل حکومت بنا رہی ہے۔ اُس نے صاف صاف کہہ دیا کہ وہ بہت سی قومیتوں کی ایک مجتمعہ حکومت بنا رہی ہے، اور اُن سب کی متحدہ مرضی سے ایک نئے اقتصادی نظام کی دنیا بسانی چاہتی ہے۔ اس کا نیشنلزم، ملٹی نیشنل ازم ہے، انفرادی نیشنلزم نہیں ہے۔ اس نے سپر نیشنل اسٹیٹ (Super National State) ترتیب دیا ہے، نیشنل اسٹیٹ نہیں بنایا۔ اس نے صرف یہ تصور ہی قایم نہیں کیا، بلکہ اُس کا عملی نمونہ بھی دنیا کے سامنے پیش کر دیا۔ اس کی یہ نئی جمہوری عمارت جو اُنیسویں صدی کے تصورات کے لحاظ سے بظاہر بالکل متخالف مواد اِکٹھا کر کے بنائی گئی ہے، ایسی ٹھوس اور اپنے اجزاے عمارت میں ایسی جڑی اور گتھی ہوئی نکلی کہ تاریخِ عالم کا سب سے بڑا اسیلابِ خون اُس پر سے گزر چکا ہے اور وہ ابھی تک سر اُٹھائے کھڑی ہے:

ہزار دام سے نکلا ہوں ایک جنبش میں
جسے غرور ہو آئے کرے شکار مجھے!

ہٹلر نے اپنی تاریخ عروج کی سب سے بڑی غلطی یہیں کی۔ اس کا خیال تھا کہ جرمن حملے کے ساتھ ہی سوویٹ فیڈریشن کے تمام قومی اجزا بکھر جائیں گے۔ اسے یقین تھا کہ کریمیا، کاکیشیا اور وسط ایشیا کے مسلمان اس موقعے سے فایدہ اٹھا کر موسکو کے خلاف اٹھ

(۱) لفظ عوامل، عامل کی جمع۔ میں عامل کا لفظ انگریزی لفظ ''فیکٹر'' کی جگہ استعمال کرتا ہوں۔ (مقالہ نگار)

کھڑے ہوں گے، لیکن لڑائی پر سولہ مہینے گزر چکے۔ اس تمام عرصے میں ایک واقعہ بھی ایسا نہیں ہوا جس سے سوویٹ یونین کے کسی حصے کی بھی کمزوری نمایاں ہوئی ہو۔ قوموں کی یہ پوری دنیا ایک فردِ واحد کی طرح اسٹالن کے پیچھے کھڑی ہے اور تاریخِ عالم کے سب سے بڑے دفاع کو روز بروز فیصلہ کن نقطے سے قریب تر کر رہی ہے۔ یوکرینیا، جارجیا، آرمیڈیا اور لیتھوینیا کے لاکھوں باشندے اپنا خون روسیوں کے خون کے ساتھ ملا چکے ہیں اور اُزبکستان، آذربائیجان، ترکمانستان، قازقستان، تاتاری، تاجکستان اور کرغز علاقے کے تمام مسلمان اپنی مرکزی یونین کے لیے سربکف ہیں۔ یہی مسلمان ہیں جنھوں نے پچھلی جنگ کے موقعے پر فوجی بھرتی سے انکار کر دیا تھا، اور جب زار کی حکومت نے سختی کی تھی تو ہر طرف بغاوت کا علم لے کر اُٹھ کھڑے ہوئے تھے۔

پس جہاں تک ہندستان کے سیاسی مستقبل کا تعلق ہے، قومی حکومت کا یہ اُسلوبِ نظر یک قلم غیر موثر ہو چکا ہے، اور ہمارے لیے کچھ سود مند نہیں ہو سکتا۔ وقت کا بنیادی سوال اب یہ نہیں رہا کہ انیسویں صدی کی بول چال میں ایک قوم یہاں موجود ہے یا نہیں؟ اصلی سوال یہ ہے کہ ہندستان کی تمام جماعتیں اپنی اپنی تہذیبی اور روایتی جگہ رکھتے ہوئے اس اصل پر متفق ہیں کہ نہیں، کہ برطانی شہنشاہی کا جُوا اپنی گردنوں سے ہٹائیں اور اپنے ملک کی سیاسی اور اِقتصادی زندگی از سرِ نو تعمیر کریں؟ اگر متفق ہیں تو وہ یقیناً ایک متحدہ مقام، ایک متحدہ رخ، اور ایک متحدہ مقصدِ جدوجہد رکھتی ہیں، اور قومیت اور موادِ قومیت کے اختلاف و اِشتراک کا کوئی سوال اُن کی متحدہ راہِ عمل میں خلل نہیں ڈال سکتا۔ لیکن اگر ایسا نہیں ہے تو پھر سارا قصہ ہی ختم ہو جاتا ہے، اور طلب وسعی کا کوئی سوال باقی ہی نہیں رہتا۔ کہاں کی قومیت اور کہاں کے افسانہ ہائے اقوام وجماعات:

فسانہا کہ ببازیچہ روزگارِ سرود
کنوں بہ مسندِ جمشید و تاج کے بستند!

باقی رہی ہندستان کی قومیت یا دو قومیتوں کی کہانی، تو یہ بھی اس قدر سہل اور سادہ مسئلہ نہیں ہے جیسا ان یارانِ سیاستِ اسلامی نے سمجھ رکھا ہے۔ ہندستان ایک شبہٗ براعظم

(سب کونٹی نینٹ) ہے، اور اس کا ایک آباد حصہ، دوسرے آباد حصے سے سولہ سو میل کے فاصلے پر واقع ہوا ہے۔ اگر تصویر کو صرف ایک ہی رخ سے دیکھنا ہے تو یہاں صرف ہندوؤں اور مسلمانوں ہی کا اختلاف نہیں ہے، بلکہ طرح طرح کے اختلافوں کا مواد موجود ہے، اور اِسے تھوڑا سا رنگ و روغن دے کر اُبھار دیا جا سکتا ہے۔ اس کا ہر حصہ دوسرے حصے سے مختلف زندگی رکھتا ہے، اور اِن بہت سی باتوں میں جو وحدتِ قومیت کے عناصر سمجھے جا سکتے ہیں، ہر حصے کا مزاج دوسرے حصے سے الگ واقع ہوا ہے۔ زبانیں الگ الگ ہیں، رنگ الگ الگ ہیں، قد و قامت الگ الگ ہیں، لباس الگ الگ ہیں، معاشرتی زندگی کے رنگ ڈھنگ الگ الگ ہیں، قومی تقریبیں اور تہوار بھی ایک طرح کے نہیں۔ سال کا حساب اور تقویم کے سن بھی جدا جدا واقع ہوئے ہیں:

رستے الگ الگ ہیں، ٹھکانے الگ الگ!

اگر پنجاب کا ایک باشندہ، ہندو ہو یا مسلمان، سکھ ہو یا عیسائی، ترچنا پلی یا کالی کٹ میں چلا جائے تو چوبیس گھنٹے کے اندر چیخ اٹھے گا۔ کیوں کہ کھانے پینے، رہنے سہنے، زبان اور معاشرت میں دونوں صوبوں کی بہت کم باتیں ایسی ہیں جو ایک دوسرے سے میل کھا سکتی ہوں۔ پنجابی روٹی کے بغیر گزارہ نہیں کر سکتا۔ مدراسی چاول کے بغیر جی نہیں سکتا۔ پنجابی کو روٹی کے ساتھ سالن چاہیے، مدراسی کو چاول کے ساتھ راسیم۔ پنجابی بیس گز کا ایک پورا تھان سر پہ لپیٹ لے گا اور اپنے سر کو ہلکا سمجھے گا۔ مدراسی تین گز کی ایک دھجی کو پگڑی کے نام سے پکار لے گا اور اسے اپنی سرگرانیوں کے لیے کافی سمجھے گا۔ پنجابی بولی اور تامل بولی میں اتنا ہی فرق ہے جتنا دو مختلف نسلوں کی زبانوں میں ہو سکتا ہے۔ اسی طرح اگر اٹک کا ایک پٹھان کسی آسامی کے گھر مہمان ہو جائے تو جو کچھ اُس غریب کی جان پر گزرے گی محتاجِ بیان نہیں:

سخن گفتن چہ مشکل بود شب جائیکہ من بودم!

لیکن یہ تو تصویر کا صرف ایک رُخ ہوا۔ اب اُسے پلٹ کے دیکھو تو ان سارے اختلافات پر بھی اشتراک اور ہم آہنگی کے خال و خط صاف ابھرے ہوئے ہیں اور رنگ و

روغن کا ایک ہلکا پُچ انھیں اور زیادہ نمایاں کرسکتا ہے۔ اکبر نے خاندیس کے پہاڑوں سے لے کر ہمالہ کی مشرقی دیواروں تک، اور خیبر سے لے کر خلیج بنگال تک ایک حکومت قایم کر دی تھی۔ اورنگ زیب نے دکن کی سطح بلند بھی ان میدانوں کے ساتھ جوڑ دی، اور اِس طرح یہ پورا شِبہ بِراعظم پورے معنوں میں ایک مملکت بن گیا۔ اس مملکت میں ایک ہی نظامِ حکومت کارفرما تھا۔ ایک ہی سرکاری زبان استعمال کی جاتی تھی۔ ایک ہی عدالت کا سررشتہ کام کررہا تھا۔ ایک ہی درباری لباس سب پہنتے تھے۔ ایک ہی تہذیب و معاشرت کا رَنگ ہر جگہ اُبھرنے لگا تھا۔ انگریز آئے تو اُنھوں نے بھی ملک کی اسی جغرافیائی وحدت پر اپنا نظامِ حکومت استوار کیا۔ ملک کی سرکاری زبان ایک رہی۔ تعلیمی زبان ایک رہی۔ انتظام کا اُسلوب ایک رہا۔ عدالت کا نظام ایک رہا۔ اور اِس طرح یہ دور بھی پچھلے دَوروں کی طرح جغرافیائی وحدت مضبوط کرتا رہا۔ ہندستان اپنی آب وہوا، اپنے جذبات واحساسات، اپنے علوم وفنون، اپنے اُسلوبِ زندگی میں اپنی خصوصیات رکھتا ہے۔ یہاں کے ہر حصے اور ہر نسل ومذہب کے باشندوں کی ملکی جمعیت ڈھالنے میں ان خصوصیات کا ہاتھ کام کرتا رہا ہے۔ بلاشبہ ان کی تصویریں الگ الگ ہیں مگر تہذیب ایک ہی مشترک پس منظر پر دُنیا کے سامنے اُبھر رہی ہے۔ آج اس پورے شِبہٗ براعظم کا ہر باشندہ خواہ دریاے سندھ کے کنارے رہتا ہو، یا برہم پتر کی وادیوں میں رہتا ہو، یکساں طور پر یہ احساس رکھتا ہے کہ ہندستان ایک ملک ہے اور وہ اِس کا باشندہ ہے۔ تم دنیا کے کسی حصے میں بھی چلے جاؤ، تمھیں ایک ہی وطنی نسبت سے پہچانا جائے گا، اور وہ ہندستانی کے سوا اور کچھ نہیں ہوسکتی۔ یہاں کے عام باشندے یکساں طور پر زندگی کی لاحاصل محنتوں سے تھکے ہوئے ہیں، سب یکساں طور پر زندگی اور کامرانی کی راہوں کی ڈھونڈھ میں ہیں، سب یکساں طور پر ایک ہی بیرونی ایجنسی کے بوجھ تلے دبے ہوئے ہیں۔ سب کے آگے یکساں طور پر آزادی وسعادت کی ایک ہی راہ کھلی ہے۔ سب بے قرار ہیں کہ کسی نہ کسی طرح اس بوجھ کو اپنے سینوں سے ہٹائیں۔ سب کا اقتصادی دکھ یکساں طور پر ایک ہی دوا کے لیے فریادی ہے۔ سب کے مستقبل کی سعادتیں اسی پر موقوف ہیں کہ نہ صرف حکومت کے افراد بدل جائیں بلکہ حکومت کا مزاج بھی بدل

جائے۔ ملک میں ہزار اِختلافات ہوں، لیکن کیا صورتِ حال کی اتنی یکسانیاں اس کے لیے کافی نہیں ہوسکتیں کہ اختلافات کی جگہ مشترکات سر اُٹھائیں اور سب ایک متحدہ چال چل کر اپنے مستقبل کی تعمیر میں لگ جائیں؟ تم نے صرف ہندو اور مسلم کے الفاظ رٹ لیے ہیں، نہ اور کوئی لفظ سیکھ سکے نہ دبستانِ زندگی میں کوئی دوسرا سبق ہی یاد کیا:

نسبتِ سبحہٗ و زنار دو صد رنگ آمیخت

ورنہ این رشتہ ہمانست کہ آدم می رشت!

دنیا کے اکثر ترکیبی اوصاف ایسے واقع ہوئے ہیں کہ اگر اُن کے مختلفات ابھارے جائیں تو سر تا سر اِختلاف بلکہ تضاد اُبھرے گا۔ مشترکات ابھارے جائیں تو سر تا سر اِشتراک اور اِرتباط اُبھرے گا۔ یہ ہمارے حالات اور ہمارے فیصلوں پر موقوف ہوتا ہے کہ کن باتوں کو اُبھارنا ہے اور کون سا رُخ اختیار کرنا ہے۔ ہندستان کا بھی اس بارے میں ایسا ہی حال ہوا۔ یہاں دونوں طرح کا سامان موجود ہے۔ اگر اِختلافات کو اُبھارنا چاہیں تو اُس کا بھی سامان موجود ہے۔ اگر مشترکات کو اُبھارنا چاہیں تو اُس کا بھی سامان موجود ہے۔ اب یہ ہمارے ارادوں پر اور اُن موثرات پر، جو اِرادوں کو ڈھالا کرتے ہیں، موقوف ہے کہ دونوں میں سے جو رُخ چاہیں اختیار کرلیں۔ بدقسمتی سے آج ہندوؤں اور مسلمانوں، دونوں میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں جو مشترکات کی جگہ مختلفات میں رنگ و روغن بھرنا چاہتے ہیں۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ انھیں اپنا رُخ بدلنا پڑے گا، کیوں کہ زندگی کے حقیقی مسایل اُن کا ساتھ نہیں دے سکتے اور دُنیا کا موجودہ مزاج بھی ان کے خلاف جا رہا ہے۔

اگر آج ہندوؤں میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں ہے تو اِس کی وجہ سمجھ میں آسکتی ہے۔ کم از کم اُس زمانے سے جب کہ البیرونی نے ہندستان کی سیاحت کی تھی، برہمنی مذہب کا مزاج علاحدگی اور بخود مشغولی کا مزاج رہا ہے، لیکن جو لوگ اسلام کے نام سے مسلمانوں کو علاحدگی اور تفرقے کا سبق دے رہے ہیں، وہ اپنی خود فراموشی کے لیے کوئی معذرت پیش نہیں کرسکتے۔ انھوں نے ہندوؤں کی مخالفت میں خود ہندوؤں کا سا مزاج پیدا کرلیا۔ وہ اپنے آپ کو جن کا مخالف ظاہر کرتے ہیں، غور کریں تو اُنھی کے نقشِ قدم پر چلنے والے ہیں:

رفتم بہ بت شکستن و ہنگامِ بازگشت
با برہمن گزاشتم از تنگ دینِ خویش!

اسلام کی روحِ عمل ہر طرح کی تنگ اندیشیوں اور علاحدگیوں کے خلاف ہے، لیکن وہ مسلمانوں کو تنگ اندیشیوں کا سبق دے رہے ہیں۔ اسلام زندگی کی ہر رَفتار میں انسانوں کو اِنسانوں سے جوڑنا چاہتا ہے۔ مگر وہ سمجھتے ہیں، مسلمانوں کا تحفظ صرف علاحدگی اور گوشہ گزینی ہی میں ہے۔ انھیں جڑنے کی جگہ ہمیشہ کٹتے رہنا چاہیے:

دہر مرد افگن بہ میدانم کند تکلیف و من،
ایں متاعِ افتادہ بر بالاے بستر می خرم!

سلسلۂ سخن جس قدر کوتاہ کرنا چاہتا تھا، اُتنا ہی دراز ہو گیا۔ مقصود اِس تمام درازنفسی سے یہ ہے کہ انقلاب وتخریب اور اِصلاح وتعمیر کی مہمات کو سمجھنا اور ہر مرحلے کے تقاضے سے عہدہ برآ ہونا، اور ساتھ ہی ہر حالت اور ہر منزل میں جماعتی مفاد ومصالح کی رعایت بھی ملحوظ رکھنی، اصحابِ فکر ودرایت اور مردانِ اخلاص وصداقت کا کام ہے، بازار کے ہر بازی گر کا تماشا نہیں ہے۔ یہ سچ ہے کہ تمھیں ان راہوں میں قدم اٹھانے کا بہت کم اتفاق ہوا، لیکن اگر ایک راہ تم پر نہ کھل سکی ہو تو کیوں تم ایسا فرض کر لو کہ کسی دوسرے پر بھی نہ کھلی ہوگی!

زنہار مگو کہ رہروان نیز نمیند — کامل صفتانِ بے نشان نیز نمیند
زین گونہ کہ تو محرم اسرار نۂ — می پنداری کہ دیگران نیز نمیند

(۲)

''تو صاحب منزل ہے کہ بھٹکا ہوا راہی''

پر ایک سرسری نظر!

کراچی

۲۱ر نومبر ۲۰۱۱ء

مکرمی تسلیم!

مجھے آپ کی کتاب **تو صاحب منزل ھے کہ بھٹکا ھوا راھی** برادر مکرم جناب شبیر میواتی کی عنایت سے مل گئی۔ اس کا پہلا ایڈیشن بھی میواتی صاحب نے ہی بھجوایا تھا، وہ بھی میری نظر سے گزرا تھا۔ کہنے کو تو یہ دوسرا ایڈیشن ہے لیکن محسوس کرتا ہوں کہ آپ نے کتاب کی ایک ایک بحث اور مسئلے پر از سر نو غور و فکر کی نظر ڈالی ہے۔ اس کی اصلیت، اس کے پس منظر اور نتائج اور قومی و ملی زندگی پر اس کے اثرات کا جایزہ لیا ہے۔ میں نے اس کے ایک ایک لفظ کو پڑھا اور اس کے معنی پر غور کیا ہے۔ آپ کی کتاب پڑھ کر میں بہت متاثر اور خوش ہوا ہوں۔

یہ کتاب اپنے موضوع کی اہمیت، مضامین کی ترتیب و تدوین، زبان و بیان کے حسن و معیار، اسناد کی پختگی، استدلالات کی محکمی اور پیش کش کے حسن۔ غرضے کہ ظاہر و باطن کے ہر پہلو سے ایک شان دار اور لاجواب کتاب ہے۔

آپ نے مختلف مباحث کو الگ الگ کرنے کے لیے نمبر ڈالے ہیں، جو بہ ترتیب ۱ تا ۲۴ ہیں۔ کیا ہی اچھا ہوتا کہ عنوانات قایم کیے جاتے اور مباحث کی طوالت کے پیشِ نظر اُن کے ضمنی امتیازات اور خصوصیات کو نمایاں کرنے کے لیے ذیلی عنوانات کا اہتمام بھی کیا جاتا! البتہ آپ نے یہ بہت اچھا کیا کہ ایک جامع انڈکس کتاب میں شامل کر دیا ہے۔ قاری

کو اس سے کتاب کے مطالعے میں اور کسی شخص، کتاب، جماعت، مقام کے حوالے سے کسی مضمون کی تلاش میں بڑی آسانی ہو جاتی ہے۔ عام طور پر اس اہم ضرورت کی طرف توجہ نہیں کی جاتی۔

آپ نے اس کتاب میں جناح صاحب کی شخصیت، سیرت، عقاید وافکار، عادات و خصایل، ان کی سیاست، طرزِ سیاست اور نتایج کا جو تجزیہ کیا ہے، ان کے اعمال واقدامات پر جو روشنی ڈالی ہے اور پس منظر بیان کیا ہے، ان کی سچائی میں کوئی شبہ نہیں اور جو نتایج نکالے ہیں، وہ اتنے منطقی اور فطری ہیں جن کا کوئی دوسرا مطلب ہوسکتا ہے نہ ان کی کچھ اور تاویل کی جاسکتی ہے۔ کوئی صحیح الفکر شخص ان حقایق کے اعتراف سے گریز نہیں کرسکتا!

آپ نے جناح صاحب کے غلط فیصلوں اور اقدامات اور ان کے اندوہ ناک نتایج پر بطورِ خاص نظر ڈالی ہے۔ انسان خطا کا پتلا ہے اس سے جانے، انجانے میں کتنی ہی غلطیاں سرزد ہوتی ہیں لیکن شاید جناح صاحب کی مثال نہ مل سکے۔ بعض غلطیوں کے فی الفور نتایج سامنے آگئے اور ان کا کوئی تدارک نہ ہوسکا۔ جناح صاحب نے اپنے آپ کو ہندستان میں مسلم اُمہ کا ہمیشہ وکیل کہا تھا اور مسلمانوں نے بھی بنیادی طور پر انھیں اپنا وکیل ہی سمجھا تھا۔ بلاشبہ جناح صاحب کا مسلمانوں کے دین، مذہبی عقاید، رسوم و رواج، تہذیب وتمدن اور تاریخ سے کوئی تعلق نہ تھا۔ وہ ایک سیاسی مقدمے میں مسلمانوں کے وکیل تھے اور سیاسی دایرے میں بھی معاش واقتصاد کے بعض مسایل زیرِ بحث آجاتے ہیں اور ان میں دینی نقطہ نظر سے رہنمائی کی ضرورت پیش آجاتی ہے، اگرچہ مطلقاً ان مسایل کا تعلق دین سے نہیں ہوتا لیکن اسے گوارا کرنا پڑتا ہے کہ کوئی وکیل دنیا کے تمام علوم وفنون کا ماہر نہیں ہو۔ جناح صاحب سے بھی یہ توقع نہیں رکھی گئی تھی کہ وہ دنیا میں ہر شعبہ زندگی کے تمام ضروری علوم و فنون سے کماحقہ واقف ہوں لیکن یہ توقع تو ناگزیر تھی کہ دین کے کسی معاملے میں دخل نہ دیں گے اور ان کے نفاذ اور ان پر عمل میں رکاوٹ بنیں گے۔ ان کا مسئلہ دین سے محض عدم واقفیت ہی نہیں، بلکہ دین کے انکار اور اس سے دشمنی کا تھا۔ لیکن عجیب بات یہ ہے کہ وہ تحریک پاکستان سے پہلے بھی کسی اسلامی اور دینی تجویز کی منظوری کے خلاف اور قانون

بنائے جانے کی راہ میں ''لے جس لیٹو کونسل'' میں سب سے بڑی رکاوٹ وہی بنتے تھے اور قیام پاکستان کے بعد قانون کا وزیر جوگندر ناتھ منڈل کو بنایا گیا تھا۔ اور اسمبلی کا منصب صدارت گورنر جنرل (یعنی محمد علی جناح) نے اپنے پاس رکھا تھا اور اس کے پہلے اجلاس مورخہ ۱۱راگست ۱۹۴۷ء کے اجلاس ہی میں انھوں نے قیامِ پاکستان کے مقصد کے بارے میں اس خوش فہمی کو دور کر دیا تھا کہ اس کے دستور و نظام حکومت کا تعلق اسلام سے یا کسی بھی دین و مذہب سے ہوگا۔ اب تک مسلم لیگ کے جو جلسے ہوئے تھے، ان کا آغاز تلاوت قرآن پاک سے ہوتا تھا اور اسی روایت کو نبھانے کے لیے لیاقت علی خان نے قاری زاہر قاسمی کو بھی بلا لیا تھا جو شیروانی اور جناح کیپ پہنے ہوئے قرآن حکیم کی تلاوت کے لیے دعوت کے اعلان کے انتظار میں بیٹھے ہوئے تھے، لیکن جناح صاحب نے اسٹیج پر پہنچتے ہی ایجنڈے کی کاپی لیاقت علی خاں کے ہاتھ سے لی اور پہلی ہی نظر میں ایجنڈے سے تلاوت قرآن پاک کے آیٹم کو قلم زد کر دیا تھا اور اس سے پہلے کہ وہ خداداد اسلامی مملکت کے سیکولر اسٹیٹ ہونے اور اپنے سیکولر ہونے کا ثبوت پیش کریں، ثابت کر دیا کہ قرآن کی تلاوت کی اہمیت ان کے نزدیک کیا ہے!

اس اجلاس میں ایک لطیفہ یہ بھی پیش آیا کہ اسٹیج پر جو کرسی جناح صاحب کے لیے ان کے گورنر شپ اور اسمبلی کے صدر ہونے کی حیثیت سے اعلان کے بعد بیٹھنے کے لیے رکھی گئی تھی اس پر وہ پہلے ہی بیٹھ گئے تھے۔

جناح صاحب کو تو جو اپنے ذوق و مزاج اور عقیدے کے طور پر کرنا تھا، انھوں نے وہی کیا۔ افسوس مولانا شبیر احمد عثمانی، دیگر علما اور خود لیگ کے کئی مخلصین دین اسمبلی کے ارکان کی حیثیت سے پارلیمان میں موجود تھے۔ سب کی عقلیں ماری گئی تھیں اور زبانیں گنگ ہوگئی تھیں جنھیں قانون نے حق دیا تھا کہ وہ کسی بھی مسئلے میں اسمبلی کے کسی مقرر کو اس کے بیان پر ٹوک دیں لیکن کسی کو بھی اسمبلی کے رکن کا اپنے استحقاق (پوائنٹ آف آرڈر) کے استعمال کا خیال نہ آیا۔ نہیں کہہ سکتا کہ قدرت نے انھیں بہرا کر دیا تھا یا ان سے گویائی کی قوت چھین لی تھی یا شیطان نے دُنیا میں انھیں رُسوا اور ذلیل کرنے کے لیے کوئی افسوں پھونکا تھا؟

جناح صاحب نے کبھی مسلم عوام کی فلاح و بہبود کی پروانہ کی تھی اور نہ لیگ کے صدر کی حیثیت سے انھوں نے ورکنگ کمیٹی اور کونسل کی حیثیت اور اس کے اختیارات کی کبھی کوئی پروا کی تھی۔ وہ خود ہی فیصلے کرتے اور ان کا نفاذ کر دیتے تھے۔ کبھی وہ مسایل کے آخری فیصلے کے لیے کونسل سے خود اختیار حاصل کر لیتے تھے اور عام حالات میں تو اقدام و بیان کے بعد بھی کونسل کو اعتماد میں لینے کی ضرورت محسوس نہ کرتے تھے۔

١٩٤٦ء میں کیبنٹ مشن نے ہندستان کی آزادی کے لیے جو پلان تیار کیا تھا اسے عام طور پر پسند کیا گیا تھا۔ مسلم لیگ کے ارکان نے بھی اسے پسند کیا تھا۔ جناح صاحب اسے پسند نہیں کرتے تھے لیکن اندرونی دباؤ اور بیرونی فضا کو دیکھ کر انھوں نے لیگ کی کونسل کا اجلاس بلایا اور نہایت اچھے ماحول میں متفقہ طور پر قرارداد منظور کر لی گئی۔ جناح صاحب کے لیے یہ کوئی پسندیدہ فیصلہ نہیں تھا۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے جو پچھلے چار برسوں سے کانگریس کے صدر چلے آ رہے تھے، اطمینان کا سانس لیا اور فیصلہ کیا کہ اب انھیں کانگریس کی صدارت سے الگ ہو جانا چاہیے۔ انھوں نے پنڈت جواہر نہرو کو پروپوز (Propose) کیا اور اسی کے مطابق کانگریس کمیٹی کا فیصلہ آ گیا، لیکن عجیب واقعہ یہ پیش آیا کہ ایک اخبار نویس کے سوال کے جواب میں ١٠؍ جولائی ١٩٤٦ء کو پنڈت جی نے جو کچھ کہا اگر چہ کوئی اہم بات نہ کہی تھی لیکن جناح صاحب نے اس کو بنیاد بنا کر مشن پلان کی منظوری کو واپس لے لیا اور ایک لمحے کے لیے نہ سوچا کہ کونسل نے جو فیصلہ کیا تھا اس سے علاحدگی کا فیصلہ بھی کونسل ہی کر سکتی ہے۔ جناح صاحب نے ٢٨/٢٩؍ جولائی کو بمبئی میں کونسل کا اجلاس بلایا اس وقفے میں اپنے موقف کے مطابق خوب رائے کو ہموار کرنے کی کوشش کی۔ مذکورہ بالا اجلاس میں مسٹر جناح نے بڑی جذباتی اور جارحانہ طویل تقریر کی... اس میں وعدہ خلافیوں کا تذکرہ بدعہدیوں کا گلہ، الزام تراشیاں اور دشنام طرازی تھی۔ جناح صاحب نے مشن پلان کو ماننے سے انکار اور تقسیم ملک کے مطالبے کی قراردادیں منظور کرائی تھیں۔ اس سے نہ صرف غیر مسلم لیگی اور ہندستان کو متحد رکھنے والے عناصر بددل ہوئے تھے، بلکہ مسلم لیگ کے سنجیدہ اور دور اندیش حلقے بھی ناخوش اور بے چین تھے۔ سر یامین خاں نے جناح صاحب اور لیگ

کے فیصلے کو عقل کی کمی اور غصے کا اظہار قرار دیا تھا۔[1] لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے مارچ ۱۹۴۷ء میں ہندستان پہنچ کر وایسرائے کا چارج سنبھالا تھا۔ اولاً انھوں نے چند دن تک حکومت ہند کے اُونچی سطح کے برٹش آفیسرز صوبوں کے گورنروں، فوج کے اعلیٰ احکام وغیرہ سے فرداً اور اجتماعی ملاقاتوں میں ہندستان کی سیاسی صورت حال کو سمجھنے میں گزارے۔ پھر انھوں نے کیبنٹ مشن پلان کو بنیاد بنا کر مختلف جماعتوں اور ان کے رہنماؤں سے ملاقاتیں کیں اور ان کے عام خیال اور مذکورہ پلان سے ان کی آرا کا جایزہ لیا۔ انھیں جلد ہی اندازہ ہو گیا کہ مسٹر جناح اس بارے میں کوئی گفتگو کرنے اور کچھ سننے کے لیے تیار نہیں۔ جناح صاحب کو انھوں نے ہر طرح سے آزمالیا کہ ملک کی تقسیم کی بنیاد پر پاکستان کے موقف سے انھیں کسی قیمت پر ہٹایا نہیں جا سکتا البتہ ان کی ضد سے فایدہ اُٹھایا جا سکتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی ماؤنٹ بیٹن نے جناح صاحب کے قریبی احباب اور لیگ اور دوسری سیاسی پارٹیوں کے رہنماؤں سے بھی ان کی شخصیت، سیرت اور ذوق و مزاج کے بارے میں، ہر پہلو سے ان کو سمجھنے کی کوشش کی اور اس نتیجے پر پہنچے کہ ملک کی تقسیم اور پاکستان کا مطالبہ ان کے نزدیک ہندستان کے سیاسی مسئلے کا واقعی حل ہو یا نہ ہو، ان کی کم زوری ضرور ہے۔ اس بات کا انھیں ثبوت بھی مل گیا۔ ماؤنٹ بیٹن نے لیاقت علی خاں سے گفتگو کی تو معلوم ہوا کہ ان کی ذہنی کیفیت ایسی ہے کہ پاکستان کے نام پر انھیں سندھ کے صحرا کا ایک ٹکڑا بھی دے دیا جائے تو وہ اسے قبول کر لیں گے۔ ماؤنٹ بیٹن کو ان کی طرف سے اطمینان ہو گیا۔ اب انھوں نے دوسرا قدم اُٹھایا اور ولبھ بھائی پٹیل کے دل میں یہ افسوں پھونکا کہ عارضی حکومت میں رہ کر تم نے تجربہ کر لیا کہ لیگ نے تمھیں ملک اور قوم کی وہ خدمت بھی نہیں کرنے دی جو تم کر سکتے تھے! کیا تمھیں یقین ہے کہ متحدہ ہندستان میں یہ تمھارے لیے قدم قدم پر رکاوٹ نہیں کھڑی کر دیں گے؟ ماؤنٹ بیٹن کا تیر نشانے پر لگا۔ مسٹر پٹیل کا تقسیم پر راضی ہو جانا گویا کہ بند کا ٹوٹ جانا تھا۔ اب راستے کی کوئی رکاوٹ باقی نہیں رہی تھی۔ قدموں کی آہٹ سے دروازے کھلتے چلے گئے۔ پنڈت نہرو، گاندھی جی۔ کوئی رکاوٹ باقی نہیں رہی تھی۔

(۱) ابوالکلام اور قوم پرست مسلمانوں کی سیاست، محمد فاروق قریشی، لاہور، ۱۹۹۰ء، ص ۵۵-۴۵۴

ابوالکلام آزاد کو چھوڑ کر شاید ہی کوئی ایسا لیڈر ہو جو اپنی سیاسی فکر رکھتا ہو۔ ہر کسی نے چوں و چرا کے بغیر ملک کی تقسیم ہی کو وقت کا تقاضا اور مسئلے کا حل سمجھ لیا تھا۔ (۱)

درحقیقت پلان کی منظوری واپس لینے کی وجہ یہ تھی کہ برطانوی حکومت کے وزیراعظم مسٹر چرچل اس وقت اپنے ملک سے باہر ٹور پر تھے، انھوں نے کانگریس اور لیگ کے کیبنٹ مشن پلان پر اتفاق کی خبر سنی اور وائسرائے ہند کو طلب کیا کہ کانگریس لیگ کا اتحاد گورنمنٹ کا مقصود نہیں ہے۔ جناح نے منظوری واپس لے لی۔

اب ماؤنٹ بیٹن نے اپنا پلان نکالا اور کام کا آغاز کیا۔ دو مہینے نہیں گزرے تھے کہ وہ لیگ اور کانگریس دونوں کو ایک نقطے پر لے آئے۔ مسلم لیگ مطمئن تھی کہ ملک تقسیم ہو رہا ہے اور پاکستان مل رہا ہے۔ کانگریس مطمئن تھی کہ آزادی مل رہی ہے اور غیر مسلم اکثریت کے علاقے کو پاکستان میں شامل ہونے سے بچا لیا ہے۔ ماؤنٹ بیٹن نے اپنا پلان دونوں فریقوں کو دکھلایا تھا اور ان کی رضامندی حاصل کر لی تھی اور ۷ ارمئی ۱۹۴۷ء کو وائسرائے لندن جا رہے تھے کہ دارالعوام اور دارالخواص سے اپنے پلان کی منظوری حاصل کر لیں۔ ماؤنٹ بیٹن کو جناح صاحب کے بارے میں خطرہ پیدا ہوا کہ وہ اپنی منظوری سے انکار نہ کریں۔ چناں چہ لندن روانہ ہوتے ہوئے انھوں نے لیاقت علی خاں سے کہا کہ وہ تحریری طور پر تقسیم سے رضامندی دے دیں! لیاقت علی نے جناح صاحب کو وائسرائے کے سیکرٹری کے پاس بھیج دیا۔ جناح صاحب نے ڈیکلیریشن پر دستخط کر دیے اور کہا یہ سیکرٹ ہے! سیکرٹری نے جواب دیا: ہاں سیکرٹ! لیکن دوسرے ہی دن سول اینڈ ملٹری گزٹ (لاہور) میں یہ خبر شائع ہوگئی لیکن جناح صاحب اس راز کے اتنے پابند تھے کہ نواب زادہ لیاقت علی خاں کے سوا انھوں نے لیگ کی ورکنگ کمیٹی اور کونسل کو بھی اعتماد میں نہیں لیا۔ جناح صاحب اگر لیگ کونسل کو اپنے اعتماد میں لے لیتے تو انھیں ماؤنٹ بیٹن کی یہ جھڑکیاں نہ سننی پڑتیں کہ

”مسٹر جناح! دنیا میں آپ کہیں بھی جائیے اور کچھ بھی کہیے مجھے اس سے کوئی

(۱) ایضاً ص ۴۵۶

سروکار نہیں! لیکن کم سے کم میرے سامنے ایسا مت کہیے کہ آپ ہی مسلم لیگ نہیں ہیں۔''

(جناح صاحب نے کہا) ''یہ معاملہ قانون کا ہے اور میں غیر قانونی ''ہاں'' نہیں کہہ سکتا!''

''آدھی رات کی آزادی'' کے مؤلف لکھتے ہیں:

''اب ماؤنٹ بیٹن نے اپنے تیور بدلے اور کہا:

مسٹر جناح! اب میں آپ سے ایک خاص بات کہنے جا رہا ہوں۔ اس ٹال مٹول سے پاکستان کا آپ کا خواب ہمیشہ کے لیے ٹوٹ سکتا ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ اتنا زبردست نقصان آپ صرف اس لیے اٹھائیں کہ آپ کے منہ سے ایک چھوٹا سا لفظ ''ہاں'' نہیں نکل سکا۔ جس چیز کو پانے کے لیے آپ نے اپنی تمام عمر داؤ پر لگا دی، اسے آپ پانے سے پہلے پھینک دینا چاہتے ہیں اور میں آپ کو ایسا نہیں کرنے دوں گا۔ میرا ارادہ یہ ہے کہ اس تجویز کو آپ کی طرف سے میں خود منظور کر دوں۔''

جناح صاحب کو ماؤنٹ بیٹن کے بدلے ہوئے تیور پر اس کی سخت کلامی اور بیہودہ گوئی پر غصہ نہیں آیا، ان کی پیشانی پر کوئی شکن بھی نمایاں نہیں ہوئی، انھیں اپنی بے عزتی کا احساس بھی نہیں ہوا، بلکہ اس کے اس راز و کمال کو جاننے کے لیے بے تاب ہو گئے کہ میرے اظہار و بیان کے بغیر لندنی بازی گر میری طرف سے اس تجویز کو کیسے منظور کر دے گا! بے ساختہ ان کی زبان سے نکلا: لیکن کس طرح؟

ماؤنٹ بیٹن نے اس بات یا کرشمے کو ان کے لیے راز نہیں رکھا بلکہ جناح صاحب کے اطمینان قلب کے لیے اپنے فیصلے کے اعلان کے لیے اور اس لیے بھی کہ ایسا نہ ہو کہ جناح صاحب پر سیاست کے اچانک چودہ طبق روشن ہونے پر وہ ہوش و حواس کھو بیٹھیں، یہی مناسب سمجھا کہ وہ اس کرشمے کے اصل اصول کو پہلے ہی ان پر عیاں کر دیں! ''آدھی رات کی آزادی'' کے مؤلفین، ماؤنٹ بیٹن کے جواب کو ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

''کل جب جلسہ ہوگا تو میں یہ کہوں گا کہ کانگریس کا جواب چند برائے نام ترمیمات کے ساتھ مل گیا ہے جن کے بارے میں (میں) انھیں مطمئن کردوں گا۔ سکھوں نے تجویز منظور کر لی ہے۔ اس کے بعد کہوں گا کہ کل رات مسٹر جناح کے ساتھ میری بہت طویل دوستانہ گفتگو ہوئی۔ ہم نے تجویز (ماؤنٹ بیٹن پلان) کی باریکیوں پر تفصیل سے غور کیا اور مسٹر جناح نے مجھے ذاتی طور پر پورا یقین دلایا کہ تجویز انھیں پسند ہے۔ اس جملے کے ساتھ میں آپ کی طرف گھوم کر دیکھوں گا اور مجھ سے نظر ملنے کے بعد میں نہیں چاہتا کہ آپ کچھ بولیں! میں یہ بھی نہیں چاہتا کہ کانگریس آپ کو کچھ بولنے کے لیے مجبور کرے! آپ کو صرف ایک کام کرنا ہے۔ مجھ سے نظر ملنے کے ساتھ آپ کو سر ہلا کر ''ہاں'' کہہ دینا ہے۔ اگر آپ نے ایسا نہ کیا تو سارا معاملہ چوپٹ ہو جائے گا! کانگریس اور سکھوں کے دل میں آپ کے متعلق شکوک پیدا ہوں گے اور وہ اس تجویز کی حمایت سے دست بردار ہو جائیں گے۔ پھر میں آپ کی کوئی مدد نہیں کرسکوں گا۔ سب خاک میں مل جائے گا۔ یہ دھمکی نہیں، میری پیشین گوئی ہے۔''

یہ ماؤنٹ بیٹن کا بیان تھا۔ آخر میں انھوں نے اپنے دل کی پوری صفائی کے ساتھ جناح صاحب کو یقین دلایا کہ یہ دھمکی نہیں ان کی پیشین گوئی ہے۔ یہ ان کے اخلاق کی بڑی دلیل ہے اور جناح صاحب کی نیازمندی کی بھی بڑی دلیل ہے! کہ انھوں نے ماؤنٹ بیٹن کی ''پیشین گوئی'' کو تسلیم کر لیا اور ان کی ہدایت پر عمل سے سرمو انحراف نہیں کیا اور ماؤنٹ بیٹن پلان کے اعلان کے جلسے میں ایجنڈے کے ایٹم کی جو ترتیب رکھی گئی تھی کہ جناح صاحب کو بتلا دیا گیا تھا، اسی کے مطابق انھوں نے عمل کر کے دکھا دیا۔ آدھی رات کی آزادی کا بیان ہے کہ ماؤنٹ بیٹن نے ''جناح صاحب کی طرف گھوم کر دیکھا۔ وہ لمحہ ماؤنٹ بیٹن کے لیے جان لیوا تھا۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ اس وقت ان کے دل کی دھڑکن بند ہو گئی تھی۔ جناح کا چہرہ جذبات سے عاری تھا۔ اس کی ہر شکن نہیں! نہیں! کہہ رہی تھی، لیکن جناح نے (ماؤنٹ بیٹن کے حکم کے مطابق)، بہت دھیرے سے اپنا سر ہلا کر ''ہاں'' کہہ

دی۔ سر کی جنبش اتنی خفیف تھی کہ وہاں موجود افراد کو بمشکل اس کا اندازہ ہو سکا لیکن جناح کے سر کی اس ہلکی سی جنبش سے ایک نیا ملک ''پاکستان'' وجود میں آ گیا![1]

اس روداد سے یہ فایدہ تو ہوا کہ بار بار یہ بات جو عوام کے ذہن میں بٹھائی جا رہی تھی کہ پاکستان کا قیام جناح صاحب کی ان ہم شیر اور جناح صاحب کی ٹائپ رائٹر کا کارنامہ ہے یا کچھ لوگوں کا بیان ہے کہ یہ کارنامہ مسلم لیگ کی تحریک کا ہے یا برطانیہ کے عظیم ڈپلومیٹ ''ریئر ایڈمرل وسکاؤنٹ ماؤنٹ بیٹن آف برما'' کی خدماتِ عالیہ میں اسے شمار کیا جائے گا! مناسب ہوگا کہ جس مقام سے ماؤنٹ بیٹن کی خدمت کا یہ ذکر آیا ہے، اس کے پس منظر پر بھی ایک نظر ڈال لی جائے۔ لیری کولنز وڈومینیک لیپر لکھتے ہیں:

''اس وقت تک جناح کے ساتھ جتنے مذاکرات ہوئے تھے، ان میں وایسرائے کو ہمیشہ مایوسی ہوئی تھی۔ اب ان کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا۔ جناح پاکستان چاہتے تھے، وہ ان کو دیا جا رہا تھا۔ کانگریس نے مان لیا، سکھوں نے حلق سے اُتار لیا۔ عین وقت پر جناح کی طرف سے اڑنگا ڈالنے کا کیا مطلب؟''[2]

جناح صاحب نے ماؤنٹ بیٹن کے پلان میں تقسیم ملک کا لفظ پڑھتے ہی اس پر اپنی رضامندی کا زبانی اظہار کر دیا۔ پھر ماؤنٹ بیٹن کی لندن روانگی کے وقت تحریری طور پر بھی اپنی رضامندی کو ظاہر کر دیا تھا۔ اگر انھیں لیگ کونسل میں اس مسئلے کو لے جانا تھا۔ اگر چہ اس کا وقت گزر چکا تھا تو ماؤنٹ بیٹن کے دہلی لوٹنے سے پہلے جو دو ہفتے کی مہلت ملی تھی اس میں وہ کونسل کا اجلاس بلا سکتے تھے، یہ وقت بھی گنوا چکے تھے اب جبکہ تین جون کو ملک کی قسمت کے فیصلے کا اعلان کر دیا گیا تھا تو اس میں اڑنگا ڈالنے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ ماؤنٹ بیٹن نے جناح صاحب سے جو شرم ناک رویہ اختیار کیا، اس کا جواز نہ تھا لیکن اس کے ضروری تھا کہ وہ کوئی ڈپلومیٹک اور مہذب رویہ اختیار کرتا۔ اب یہ بات پوشیدہ نہ رہی تھی۔ جناح صاحب فرار کی راہ نہ پا کر اور وایسرائے کے جبر سے متاثر ہو کر سر کی جنبش سے تجویز کی اپنی اور اپنی جماعت کی طرف سے منظوری دے چکے تھے۔ اس پر بھی شک اور شبہے

---

(۱) آدھی رات کی آزادی: لیری کولنز وڈومینیک لیپر، ص۱۳۲-۱۳۱

کا اظہار کیا جا سکتا تھا لیکن جب اسی دن کی شام کو انھوں نے ریڈیو پر تقریر کی تھی اور پاکستان زندہ باد کا نعرہ لگایا تھا تو یہ ان کی کامل رضامندی کا اظہار تھا۔ فیصلے پر تاریخ کی مہر لگ گئی تھی اور ماؤنٹ بیٹن کے شرم ناک اور جابرانہ رویے کی سیاہی مٹ چکی تھی لیکن جناح صاحب کو لیگ کی عدالت یعنی کونسل میں جواب دہی کرنی تھی۔ چناں چہ ۹/جون ۱۹۴۷ء کو امپیریل ہوٹل، نئی دہلی میں لیگ کونسل کا اجلاس ہوا تو مولانا عبدالحامد بدایونی کی تلاوت قرآن حکیم اور بیگم محمد علی اور مسٹر اسماعیل کی وفات پر قرارداد کے بعد جناح صاحب کھڑے ہوئے اور ملک معظم کی حکومت کے منصوبے کے چند حصے پڑھ کر سنائے اور کہا کہ منصوبہ کونسل کے سامنے پیش کیا جارہا ہے، تاکہ کونسل اگر اسے قبول کرنا چاہتی ہے تو وہ ایسا کرسکتی ہے اور اس کے خلاف بھی فیصلہ کرسکتی ہے۔ اس پر مولانا حسرت موہانی سب سے پہلے کھڑے ہوئے اور کہا کہ آپ تو یہ منصوبہ پہلے ہی منظور کر چکے ہیں۔ اب یہ ڈراما رچا کر کیوں دھوکا دے رہے ہیں۔ جناح صاحب نے جواب دیا کہ میں نے اسے منظور نہیں کیا ہے یہ فیصلہ کونسل کو کرنا ہے کہ وہ اسے منظور کرتی ہے یا نہیں! حسرت موہانی نے زور دے کر کہا آپ جھوٹ بولتے ہیں۔ اب اس کے نامنظور کرنے کی کوئی گنجایش نہیں ہے۔ مولانا اور کچھ کہنا چاہتے لیکن کئی ممبران نے شور مچایا اور انھیں دھکا دے کر بٹھا دیا اور طے شدہ پروگرام کے مطابق چند پرجوش اور غضب ناک تقریریں ہوئیں جن کا خاتمہ پلان کی منظوری پر ہوتا رہا۔ اس موقعے پر اڑیسہ، یوپی، بنگال، بمبئی کے بعض نمایندوں نے مسٹر جناح صاحب سے حد بندی کمیشن کے اختیارات اور مسلم اقلیتی صوبوں میں مسلمان کے حقوق کے بارے میں سوالات کیے، جن کے جواب میں انھوں نے فرمایا کہ وہ اپنی ذاتی رائے کے سوا کچھ بھی افشا نہیں کر سکتے۔ مسلم اقلیت کے حقوق کے تحفظ کا انحصار ہندستان اور پاکستان کے درمیان تعلقات پر ہے۔ (۱)

اس تحریر کی آخری دو سطروں کے مضمون کو پڑھیے اور غور فرمایئے کہ جس تجویز کو مئی

---

(۱) تحریک پاکستان اور انتقال اقتدار: مرتبہ محمد فاروق قریشی، لاہور، ۱۹۹۷ء، ص ۳۳-۳۴۷

۱۹۴۷ء کے وسط میں پڑھا تھا اور زبانی اس کی منظوری دی، چند دن کے بعد اس کی منظوری کی دستاویز پر دستخط کیے تھے۔ ۳/ جون کو اس کی منظوری کے لیے سر کو جنبش دی اور اس روز جس کی قبولیت کی اپنے لفظوں میں، اپنی زبان سے ریڈیو پر اپنی اور دنیا کی سیکڑوں قوموں اور ملکوں کو جنگ آزادی میں کامیابی اور قیام وطن کی خوش خبری سنائی اور سیکڑوں ہزاروں لوگوں اور پچاسوں ملکوں سے مبارک باد قبول کی تھی، اس کی حقیقت کے افشا کی معذوری تھی اور جس قوم اور جماعت سے پچھلے دس برسوں میں نفرت پیدا کی گئی ہو جس کے بزرگوں رہنماؤں اور مذہب، تمدن، تہذیب، رسم و رواج کو گالیاں دی گئی ہوں، اسی قوم کی حکومت اور اس کے اخلاق پر مسلم اقلیت کے حقوق کے تحفظ کے اعتبار کا سبق دیا جا رہا ہے!

آپ نے نہایت توجہ سے جناح صاحب کے بہت سے اقدامات اور فیصلوں سے، جو نتائج اخذ کیے ہیں، یہ بہت سنگین ہیں۔ ان میں سے بعض فیصلوں کے نتائج نہ صرف یہ کہ فوراً سامنے آگئے بلکہ وہ بہت بھیانک اور اصولوں کے خلاف بھی تھے۔ مثلاً:

۱) جناح صاحب نے پہلے دونوں ملکوں کے لیے ماؤنٹ بیٹن کا گورنر جنرل ہونا منظور کر لیا تھا۔ یہ فیصلہ ایک قلیل مدت کے لیے جب تک کہ دونوں ملکوں میں تمام اثاثوں کی تقسیم نہ ہو جاتی، طے پا گیا تھا۔ ماؤنٹ بیٹن نے جناح سے گفتگو کے بعد برطانوی حکومت اور انڈیا آفس کو مطلع بھی کر دیا تھا لیکن جناح نے کچھ دنوں کے بعد اس فیصلے پر عمل کرنے سے انکار کر دیا۔

۲) اس مسئلے کا تعلق چوں کہ خاص ماؤنٹ بیٹن کی ذات سے تھا، اس فیصلے سے ان کی ہندستان سے لندن تک توہین ہو رہی تھی، اس لیے انھوں نے خاص طور پر محسوس کیا اور اس فیصلے کے نشیب و فراز سمجھائے لیکن انھوں نے اپنی ضد کو نہیں چھوڑا تھا۔ اس لیے اثاثوں کی تقسیم میں ان (ماؤنٹ بیٹن) کی انصاف پسندی اور ذاتی دل چسپی کی جو اُمید تھی، اس کے فواید سے بھی پاکستان محروم رہ گیا۔

۳) یہ فیصلہ جناح صاحب کے اصول و دیانت کے بھی خلاف تھا۔ پاکستان کا گورنر جنرل بن جانے کا فیصلہ انھوں نے از خود کر لیا تھا۔ یہ روزمرہ کے کام چلانے کا مسئلہ نہ تھا جو

جماعت کا سیکرٹری بھی کر لیتا ہے۔ یہ ملکی سطح کا قومی مسئلہ تھا اور اس درجے کے مسایل کے فیصلوں کا اختیار لیگ کونسل کو حاصل تھا۔ جناح صاحب کے اس فیصلے پر خود اراکین کونسل حیرت زدہ تھے۔

۴) کئی بار جناح صاحب کی شخصیت کسی وجہ س زیر بحث آئی تو انھوں نے اس اصول میں پناہ لی تھی کہ وہ ان کے سیاسی مقدمے کے وکیل ہیں، ان کے مذہبی لیڈر نہیں ہیں لیکن عام طور پر وہ مسئلہ ان کے اخلاق و دیانت، جماعتی اختیار کے دایرے وغیرہ کا نہیں تھا۔ یہاں تو مسئلہ یہ تھا کہ وہ مسلمانوں کے مقدمے کے صرف وکیل سیاسی یا ترجمان تھے، انھیں یہ حق کیوں کر پہنچتا تھا کہ وہ مسلمانوں کی منشا اور اجازت کے بغیر سب سے بڑے اور اہم کلیدی اور بے شمار اختیارات کے عہدوں پر قبضہ کرلیں۔

☆ پاکستان کو ان کے اس اقدام سے بے پناہ نقصان پہنچا جس کا اندازہ کرنا بھی ناممکن ہے۔ یہ جناح صاحب کا ایسا اقدام تھا کہ وہ ابھی دہلی سے نکلے بھی نہ تھے کہ اس کے نتایج سامنے آگئے تھے اور ایک مدت تک پاکستان کے حقوق کو ملیامیٹ کیا جاتا رہا۔

☆ دوسرا بہت اہم اور بڑا اقدام جو جناح صاحب کی بہت بڑی غلطی ثابت ہوا امریکہ کو خط لکھنا تھا۔ فوج کی ذمے داری سنبھالنے کی دعوت تھی۔ ان کا یہ لکھنا کہ پاکستان کو جتنی ضرورت امریکہ کی ہے، اس سے کہیں زیادہ ضرورت امریکہ کو پاکستان کی ہے۔ اپنے آپ کو فروخت کرنے کے لیے پیش کر دینے کے مترادف ہے۔ آپ کا یہ کہنا کہ "ان کا کردار ایک بروکر کا سا ہے" بہت صحیح تھا۔ اس کے جو شرم ناک اور بھیانک نتایج نکلنا چاہیے تھے، وہی نکلے۔

آپ نے جناح صاحب پر لٹریچر کا مطالعہ کیا اور ان کی شخصیت کے ہر پہلو سے اس کا عطر کشید کر لیا۔ پھر آپ نے اسے نہایت قابلیت کے ساتھ اور سلیقے سے مرتب کیا اور دلایل و براہین سے مزین کر کے اپنے مقدمے کو اتنا مضبوط کر دیا کہ اب اسے چھیڑنے کی کوئی جرأت نہیں کر سکتا۔ آپ نے اپنے زیر قلم آنے والے تمام مباحث میں حقایق کو بنیاد بنایا ہے۔ میری نظر سے ایک مقام کے سوا خیال آرائی اور مفروضے پر مبنی کوئی بحث نہیں گزری۔

اگر ہو تو اعتراف کرتا ہوں کہ میری نظر چوک گئی، جس بیان کی طرف اشارہ ہے وہ نہ صرف قرین قیاس ہے بلکہ حقیقت سے اتنا قریب کہ اس سے زیادہ تصور نہیں کیا جا سکتا۔ صرف حقیقت ہی ہو سکتی ہے۔ آپ نے لکھا ہے:

''اگر مسٹر چھاگلا کو معلوم تھا کہ جناح صاحب خورد ونوش میں حرام وحلال کی تمیز روا نہیں رکھتے تو مسلم لیگ کے طبقۂ اولیٰ کی قیادت میں ان کے ساتھیوں کو بھی ضرور معلوم ہوگا لیکن انھوں نے اس سے صرف نظر کیا تو کیوں؟ اس کی ایک ہی وجہ ہو سکتی ہے اور وہ یہی کہ وہ تقریباً سب خود بھی خورد ونوش میں حرام وحلال کی تمیز سے بے نیاز ہوں گے۔''(۱)

میرا خیال ہے آپ کو اس تکلف کی ہرگز ضرورت نہ تھی۔ جناح صاحب کا یہ شوق ہرگز راز نہ تھا۔ قیام پاکستان کے بعد لیگ کی ایک جماعت بشمول خواتین کے شراب نوشی کی مجالس اور دیگر صحبتوں کی شہرت عام تھی اور گورنر جنرل ہاؤس کی تقریبات میں اس کا چلن تھا۔ جناح کا رویہ بھی غیر محتاط ہوتا تھا۔ برطانوی ایڈمرل کی دعوت کی رپورٹ تواضع کے خاص اہتمام کے ذکر سے خالی نہیں رہ سکتی تھی۔ سفرا کی اجتماعی دعوتوں میں اور انفرادی ملاقاتوں میں تواضع کا خاص اہتمام ہوتا تھا۔ سری پرکاش نے اپنی یادداشتوں میں گورنر ہاؤس کی ایک دعوت کا بہ طور خاص ذکر کیا ہے اور خود ان کو عدم توجہ کے اعتراف کے ساتھ جناح صاحب کی پیش کش کا انھوں نے ذکر کیا ہے۔ سری پرکاش کی ان یادداشتوں پر مبنی کتاب **پاکستان: قیام اور ابتدائی حالات** کے کئی ایڈیشن پاکستان سے شایع ہو چکے ہیں۔ یہ جناح صاحب کی بخشی ہوئی آزادی ہی کا نتیجہ تھا کہ انور صابری کے بہ قول:

گلی گلی مے خانے ہوں گے
گردش میں پیمانے ہوں گے

گلی گلی نہ سہی کراچی میں کھلے بازاروں سیکڑوں نہ سہی پچاسوں شراب خانے، کیفے اور

---

(۱) **تو صاحب منزل ھے کہ بھٹکا ھوا راھی** / نور محمد قریشی: اشاعت دوم: اگست ۲۰۱۱ء، ص ۸۰

ریفریشمنٹ کے نام سے کھلے ہوئے تھے۔ دو کیفے تو صدر میں تھے۔ ایک پوسٹ آفس سے متصل اور ایک ریگل کے سامنے کیفے ٹیریا کی لائن میں! آخر الذکر کا پورا نام "این ایس کیفے اینڈ ریفریشمنٹ رومز" تھا۔ یہ محترمہ جو خواتین مسلم لیگ کی صدر نور الصباح بیگم کو ان کو اسلامی و ملی خدمات کے صلے میں الاٹ کیا گیا تھا۔ شراب خانے کے نام میں این ایس ان کے نام کا مخفف تھا۔ یہ شراب خانے کیفے اور ریفریشمنٹس کے نام سے قایم تھے۔ جنرل ایوب خان کے اقتدار میں آنے کے کچھ عرصے تک قایم رہے تھے۔

عجیب بات ہے مسلم لیگ کوئی مذہبی یا مسلمانوں کی جماعت نہ تھی، مسلمان اس میں شریک ضرور تھے اور دوسرے مذاہب و عقاید اور مکاتب فکر کے لوگوں سے زیادہ تھے لیکن وہ بھی کسی اصول اور دینی اور سماجی اخلاقیات کے پابند نہ تھے۔ سیاست اور خاص طور پر انتخابات کے موقع پر داب، دھونس، تشدد، جھوٹ، دھوکا، جعل، فریب، الزام، اتہام، خوشامد، جھوٹی تعریف، جھوٹے وعدے، جھوٹے نعرے اور جھوٹے دعوے، بڑ اور سوانگ رچانے کے قایل تھے اور موقعہ و محل کے مطابق بے دھڑک عمل میں لے آتے تھے۔ لیگ نے ۱۹۴۵ء اور ۱۹۴۶ء میں مرکز اور صوبوں کے انتخابات میں وہی سب کچھ اسلام کے نام پر کیا اور الیکشن جیت گئے اور وقت کے مقتدر علما متقین و متدین علما جو بلند سیاسی ذوق و بصیرت رکھتے تھے، لیگ کے رہنماؤں کے حالاتِ درونِ پردہ سے واقف تھے۔ ان کی بے دینی، آزاد خیالی، ان کے ذوقِ ناؤنوش، اسلام دشمنی اور شب و روز کے خفیہ مشاغل و کاروبار سے بہ خوبی واقف تھے لیکن وہ خدا سے ڈرتے تھے۔ انھوں نے مخالف اُمیدواروں کی کمزوریوں کا فایدہ اُٹھانا گوارا نہیں کیا اور خلاف دین و اخلاق اپنی زبان پر کوئی لفظ نہ نکالا، وہ الیکشن ہار گئے۔ لیگیوں نے علمائے دین کے خلاف طلبہ اور نوجوانوں اور جہلاء کو بھڑکایا۔ اسلام کے نام پر اسلام کے خدمت گزاروں اور خدا کے محبوب بندوں کا دشمن بنایا۔ انھوں نے بزرگوں کی ڈاڑھیوں کو نوچا، ان کی ڈاڑھیوں میں شراب ڈالی، ان کی ٹوپیوں کو پیروں تلے روندا، ان کے سامنے برہنہ ہوگئے، ان کے خلاف نعرے لگوائے، ان کے نام بگاڑے، انھیں ہندو کا ایجنٹ کہا، ان پر الزام لگائے، بہتان تھوپے، جھوٹے افسانے گڑھے لیکن اللہ

کے ان نیک بندوں میں لیگیوں کی ذاتی زندگی کی کم زوریوں اور ان کے کرتوتوں کی پردہ دری سے کبھی فایدہ اُٹھانے کا دل میں خیال بھی نہ آیا۔ کیا اس کا یہ نتیجہ نہیں کہ دین واخلاق ہی میں نہیں معاشرت وتمدن اور سماجی اخلاقیات میں بھی وہ بلند مقام تھے اور سیاست میں ان کی خدمات اور ان کے تدبر وبصیرت کا تو عام طور پر ہر کسی نے اعتراف کیا۔ میرے لیے یہ بڑے فخر ومسرت کی بات ہے کہ مسلم لیگ میں مولانا حسرت موہانی، نواب اسماعیل خاں جیسے چند ہی افراد ہوں گے جن کے دامن خودغرضی اور انگریز پرستی سے داغ دار نہ ہوں، ورنہ اس کے بڑوں سے چھوٹوں تک کوئی ایسا نہیں جس کا دامن طرح طرح کی معصیتوں سے آلودہ نہ ہو۔ بعد کے ادوار میں بھی جن نام نہاد رہنماؤں نے ملک کو سب سے زیادہ نقصان پہنچایا اور عوام کو مایوس کیا وہ انھیں زمینداروں، جاگیرداروں اور روایتی ملازم پیشہ خاندانوں کے چشم وچراغ تھے اور انھیں کے وجود سے ملک دشمنی اور قوم فروختگی کی روایت زندہ ہے۔

مسلم لیگ اور جناح صاحب کے بارے میں برٹش استعمار کے آلہ کار کی حیثیت کے بارے میں تو کوئی شک نہیں کیا جاسکتا۔ اس سلسلے میں کئی حضرات کی کاوشیں اور خیالات نظر سے گزرے تھے، خصوصاً خان عبدالولی خان اور محمد فاروق قریشی (لاہور) کی کاوشیں میرے سامنے ہیں لیکن آپ نے جس خوبی اور سلیقے سے اپنی تالیفِ لطیف وبے نظیر میں اپنی تحقیقات ومعلومات اور افکار ونظایر کو مرتب کر دیا ہے، اس کا جواب نہیں! اگر ضرورت ہوئی تو یہ معلومات کافی ہیں۔ امید ہے کہ حقایق پوشیدہ کے علم اور رازِ درون پردہ سے واقفیت کے لیے آپ کی تالیف جامع ومستند کا مطالعہ ہر پہلو سے کافی ووافی ہوگا۔

البتہ جناح صاحب سے لے کر آج تک پاکستان کی حکومتوں اور افراد نے جو خدمات کسی ضرورت، مجبوری یا شوق کے تحت امریکہ کے لیے انجام دیں اور ان کے جو نتایج سامنے آئے، ان کا ماخذ میرے لیے صرف اور صرف آپ کی تالیف ہے۔ میں انھیں پڑھ کر تڑپ اُٹھا۔ خیال آیا کہ افسوس مجھے جانکنی کے وقت مریض کی حالت کا علم ہوا۔ اس سے پہلے یہ حالات میرے علم میں کیوں نہ آئے! پھر سوچا کہ اگر ان حالات کا علم پہلے ہو جاتا تب بھی میں کیا کر لیتا! دراصل بات یہ ہے کہ میں نے ۱۹۵۸ء کے لگ بھگ جب یہ فیصلہ

کیا کہ تصنیف و تالیف کی زندگی گزاروں گا تو ساتھ ہی یہ عہد بھی کیا تھا کہ پاکستان کی وقتی سیاست میں کبھی حصہ نہ لوں گا اور کسی مذہبی بحث سے بھی ہمیشہ دور رہوں گا۔

پہلی بات مولانا ابوالکلام آزاد نے نصیحتاً اور وصیتاً آغا شورش کاشمیری سے کہی تھی۔ جب وہ ۱۹۵۵ء میں مولانا مرحوم کی دعوت پر دہلی گئے تھے اور مولانا کی صحبت سے فیض اُٹھایا تھا۔ واپسی کے سفر سے پہلے شورش مرحوم نے مولانا سے درخواست کی کہ انھیں کوئی نصیحت فرمایئے۔ مولانا نے ان سے کہا کہ ماشاء اللہ تم سمجھ دار ہو، تجربے کار ہو، اب بیوی بچوں کا ساتھ ہے، ان کی ضرورتیں ہیں، اخبار نکال رہے، اب اسی پر توجہ دو اور معاشرتی زندگی کے فرایض ادا کرو۔ سیاست میں پڑنے کی ضرورت نہیں۔ اخبار کے توسط سے صلاح و مشورے اور تبصرے کی حد تک سیاست سے تعلق رکھو۔

تفصیل میں جانے کی فرصت ہے نہ محل! اس قصے کو یہیں ختم کرتا ہوں۔ شورش نے مولانا کی نصیحت پر عمل کیا۔ کسی جماعت کے پلیٹ فلارم پر شہید سہروردی کے ساتھ پنجاب کی حد تک دورہ کیا تھا۔ اس کے سوا کسی سیاسی جماعت سے تعلق نہیں رکھا۔ مذہبی بحث سے دور رہنے کا فیصلہ بھی مولانا ابوالکلام آزاد ہی کی رائے پر مبنی تھا، جو میں نے اپنے طور پر ضروری سمجھا تھا۔ حالانکہ دونوں باتوں کے لیے میرے دل نے مجھے بہت بھڑ کایا تھا۔

ریٹایرمنٹ کے بعد بھی میں اپنے عہد پر قایم رہا اور طے شدہ حدود سے باہر قدم نہیں نکالا اور اللہ کا شکر ہے کہ بہت سے فساد بچا رہا۔ میں نے اپنے تصنیف و تالیف کے دایرے کو بھی حدود ہی میں رکھا۔ زیادہ وسعت نہ دی۔ آپ کی کتاب کے مطالعے سے میں نے محسوس کیا کہ اس کا کینوس بہت وسیع اور سیاست، مذہب، تاریخ، صحافت اور سیاست میں پاکستان کے مسایل تک ہی نہیں براعظم ہند پاکستان، اس کے اطراف اور اسلامی مما لک سے لے کر انٹرنیشنل پالی ٹیکس تک آپ گہری نظر رکھتے ہیں۔ آپ کا مطالعہ وسیع اور تحقیق کا معیار بلند ہے، نیز تالیف و تدوین کا آپ کو بڑا اسلیقہ ہے۔ آپ کی کتاب سے کامل درجے میں استفادے کے لیے بھی ایک خاص ذوق اور سیاسیاتِ پاکستان کی ایک درجے تک مطالعہ کی ضرورت ہے۔ اس کے بغیر کچھ حاصل نہیں ہوسکتا! آپ کی کتاب کے مضامین و

مباحث کی بلندی نے میرے اندر یہ احساس پیدا کیا ہے کہ اس کی بلندی کو چھونے اور حقیقت کو پانے کے لیے ایک سرسری مطالعہ کافی نہیں ہوسکتا۔ میں فرصت پاتے ہی اس کا گہرا مطالعہ کروں گا۔

مجھے آپ کی تالیف کے علاوہ راشد علی بیگ کی کتاب ''ان ڈفرنٹ سیڈلز'' نے خاص طور پر متاثر کیا۔ جو کبھی چار سال تک جناح صاحب کے سیکرٹری بھی رہ چکے تھے اور مارچ ۱۹۴۰ء میں ''لاہور ریزولیوشن'' جو ''پاکستان ریزولیوشن'' کے نام سے مشہور ہوا، اس کے منظور ہونے کی خبر سن کر قطع تعلق کرلیا تھا۔ انھوں نے جناح صاحب کے ساتھ چار سال اس اُمید میں گزارے تھے کہ وہ انھیں قومی سیاست کی شاہ راہ پر لے آئیں گے لیکن ان کی صدارت میں لاہور ریزولیوشن کے پاس ہونے کے عمل نے انھیں قطعی مایوس کر دیا تھا۔ یہ دیکھ کر انھوں نے جناح صاحب کے بمبئی لوٹنے کا انتظار بھی نہ کیا۔ بیگ صاحب نے اپنے اختلاف کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے:

> ''مارچ ۱۹۴۰ء تک پہنچتے پہنچتے اب مجھے صاف نظر آنے لگا کہ ہم دونوں کی باتوں میں بنیادی اختلاف کیا تھا؟ ان کی دلچسپی مسلم لیگ کے ساتھ تھی۔ مسلمانوں کے ساتھ نہیں! مجھے مسلمانوں سے دلچسپی تھی۔ ہندستانی جسم کے ایک کم زور بازو کی حیثیت سے، نہ کہ مسلم لیگ سے!''

جناح صاحب کی لیڈری کی نوعیت کے بارے میں راشد علی بیگ صاحب لکھتے ہیں:

> ''وہ ایسے عوامی لیڈر تھے جن کے پاس عوام کے لیے ذرا سا وقت بھی نہیں تھا۔ عوام کے لیے ان کا رویہ وہی تھا جو ٹینی سن کے مشہور ان دو مصرعوں میں ہے کہ ان کا یہ کام نہیں (کہ پوچھیں) یہ کیوں ہے، یہ کیا ہے؟ بلکہ
>
> ''ان کو کرنا ہے یا مرنا ہے!''

بیگ صاحب نے اس میں کچھ تبدیلی کر کے یہ لکھا ہے کہ ''ان کو صرف ووٹ دیے جانا ہے اور مرنا ہے'' اور یہ خیال ظاہر کیا ہے: بعد میں انھوں نے اس کی بھی شعوری کوشش کی کہ کچھ بدلیں لیکن ہر ایسی کوشش مصنوعی تھی، تکلیف دہ حد تک! انھیں سماجی، تعلیمی وغیرہ کاموں

سے بھی دلچسپی نہ تھی۔ اس سلسلے میں بیگ صاحب نے لکھا ہے:

''میں حسرت کے ساتھ یہ سوچتا رہتا کہ وہ معاشی، سماجی، تعلیمی لحاظ سے مسلمانوں کی تعمیر کا کام کب اپنے ہاتھ میں لیں گے، تاکہ ہندو مسلم اتحاد کے لیے ان کی تجویز عملی جامہ پہن سکے۔''

معاشیات کے علم و ذوق کے بارے میں لکھتے ہیں:

''معاشیات کے بارے میں وہ مجھ سے بھی کچھ کم ہی جانتے تھے۔''

ان کی لیڈرشپ میں لیگ کے کچھ سے کچھ بن جانے کے بارے میں بیگ صاحب لکھتے ہیں:

لیگ اب بجائے مسلمانوں کی تعمیر کے (کام کے) اینٹی کانگریس اور انٹی ہندو تنظیم بنتی جارہی تھی۔''

ان کے مذہب کے بارے میں بیگ صاحب لکھتے ہیں:

''جہاں تک مذہب کا تعلق ہے، پاکستان میں خواہ کوئی کچھ کہا کرے، لیکن وہ بنیادی طور پر سیکولر اور ''ناعقیدہ'' (اگناسٹک) تھے۔''

میرے ذہن میں دنوں سے یہ بات کھٹک رہی تھی کہ یہ معلوم کروں کہ فسادات کے زمانے میں جناح صاحب نے فساد کے دفع، امن کے قیام، فساد زدگان کی امداد، ان کی آبادکاری وغیرہ کے بارے میں کیا خدمات انجام دی تھیں۔ آپ کی کتاب مطالعے میں آئی اور اس میں فسادات اور قتل و غارت گری کا ذکر آیا تو یہ خیال بھی آیا کہ جناح صاحب ۱۹۳۸ء، ۱۹۳۹ء سے ہندو کی مسلم دشمنی اور مسلمانوں کو ملیامیٹ کردیے جانے کے خطرات کا ذکر گویا ان کی سیاسی زندگی کے روز و شب اور صبح و شام کا وظیفہ بن چکا تھا تو یہ بھی ضروری تھا کہ وہ مسلمانوں کے مٹ جانے سے بچانے کا بھی انتظام کرتے اور ایسے کسی انتظام کا ذکر آپ کی کتاب میں اور اس سے باہر جناح صاحب کی ''کتابِ حیات'' میں بھی نظر سے نہ گزرا تھا۔ یاد آیا تو راشد علی بیگ کی کتاب کا حوالہ یہ کہ ''ان کی دلچسپی مسلم لیگ کے ساتھ تھی مسلمانوں کے ساتھ نہیں!''

جواب دینے کو تو کوئی بھی لیگی کہہ سکتا ہے کہ پاکستان کا مطالبہ مسلمانوں کے تحفظ اور ان کو مٹ جانے سے بچانے ہی کے لیے کیا گیا تھا لیکن اول تو پاکستان کے مل جانے کی اُمید نہ جناح صاحب کو تھی نہ کسی لیگی کو پاکستان مل جانے کی توقع تھی۔ اس کا مل جانا بھی انھیں دشمنان دین وملت کی منظوری پر منحصر تھا اور یہ محض اُمید موہوم تھی اور پھر مان لیجیے کہ پاکستان یہی ہے جسے چاہا تھا اور وہ مل گیا۔ تو بتایئے کہ وہ آزادی، سکون واطمینان، وہ ان کے دین وایمان، جان ومال، عزت وآبرو کہاں ہے جس کے لیے یہ حاصل کیا گیا تھا۔ کیا یہ حقیقت نہیں کہ پہلے برٹش استعمار کی غلامی تھی اب اس سے بھی بدتر غلامی کے شکنجے میں گرفتار ہیں۔ سکون واطمینان کے بجائے قوم عذاب میں مبتلا ہے۔ دین وایمان کے نشان مٹ رہے ہیں، جان ومال کے تحفظ کی ذمے داری سے حکومت دست بردار ہوگئی ہے۔ انسانیت کا نام ونشان مٹ گیا ہے۔ لہٰذا آبرو بے آبرو اور شرافت لٹ رہی ہے۔ ۵۸۲ صفحے کی کتاب "تو صاحب منزل ھے کہ بھٹکا ھوا راھی؟" میرے سامنے ہے۔ یہ جناح صاحب کے بارے میں ایک چیلنج ہے۔ ان کی عام سیرت اور سیاست کے کتنے ہی پہلو اس میں زیر بحث آئے ہیں! کیا کوئی ایسا شخص ہے جو اس کے کسی مضمون کی بحث کو کلیتاً یا اس کے کسی حوالے یا اس کے کسی نکتے اور اس کے کسی نتیجے کو غلط ثابت کردے؟

میں نے زیر نظر کتاب پر آخری نظر اس جستجو میں ڈالی تھی کہ جناح صاحب نے ہندو مسلمانوں کو ایک دوسرے کی نفرت اور دشمنی سے بچانے کے لیے اور جو ہندو مسلمان کسی وقت میں ایک دوسرے کی دشمنی کا نشانہ بن چکے تھے ان کی تباہی اور نقصانات کی تلافی کے لیے فسادات کو روکنے اور امن کے قیام کے لیے جس کا بڑا فایدہ یہ ہوتا کہ ہندو اور مسلمان دونوں ہی ایک دوسرے کی ایذا رسانیوں سے محفوظ ہوجاتے اور دونوں ہی کو فسادات سے نجات ملتی اور امن وسکون کی زندگی میسر آجاتی تو یہ مسلمانوں اور ہندوؤں... دونوں پر جناح صاحب کا بہت بڑا احسان ہوتا اور جیسا کہ جناح صاحب کی ابتدائی سیاسی زندگی میں ہندستان کی دو بڑی قوموں میں اتحاد اور دوستی کے لیے ان کی شہرت اور نیک نامی ہوئی تھی، ملک کی عظیم الشان خدمت کے لیے پھر ان کے نام کا ڈنکا بجتا اور نیک نامی کی شہرت ہوتی۔

ملک کی عظیم الشان خدمت کے لیے ہندو اور مسلمان دونوں قوموں میں عزت اور احترام کے ساتھ ان کا نام لیا جاتا اور ملک میں اتحاد اور اتفاق اور امن وسکون کی فصل پھل لاتی، جس کی ملک اور ملک میں بسنے والی چھوٹی بڑی تمام قوموں کو سب سے زیادہ ضرورت تھی لیکن تحریک آزادی کے آخری ۱۰، ۱۲ برس کے اندر اس طرف سے جناح صاحب کا دل اتنا کٹھور ہو گیا تھا کہ انھوں نے تاریخ کی آواز سنی، نہ وقت کے تقاضے کو سمجھا اور نہ اس پر غور کیا کہ اس دور میں دونوں بڑی قوموں کو اتحاد و اتفاق اور ایک دوسرے پر اعتماد کی سب سے زیادہ ضرورت ہے۔ انھوں نے ایک لمحے کے لیے نہیں سوچا کہ وہ جس ''راست اقدام کا دن'' منانے کی اپیل کر رہے ہیں، وہ مسلمانوں کے لیے نہایت منحوس دن بھی بن سکتا ہے۔ چناں چہ یہی ہوا۔ ایک دو روز ہی میں راست اقدام کی بساط کا پانسہ پلٹ گیا۔ نہ صرف یہ کہ مسلمان ہندوؤں سے زیادہ قتل ہوئے بلکہ رُسوائی بھی انھیں کے حصے میں آئی، وہ منھ دکھانے کے قابل بھی نہ رہے۔ افسوس کہ انھوں نے پھر بھی عقل سے کام نہ لیا اور نواکھلی کی غریب بستیوں پر غصہ نکالا، انھیں قتل کیا، عورتوں کو بے عزت کیا اور وہاں پیش آنے والے حالات کا ردعمل بہار کے قتل، لوٹ مار، آتش زنی اور بے عزتی کے واقعات کی صورت میں ظاہر ہوا۔ انور صابری نے معذرت خواہانہ قطعے میں کہا تھا:

نواکھالی سے جو پھوٹا تھا چشمہ
مجھے اس تیز رو دھارے نے مارا
مجھے ہندو سے کچھ شکوہ نہیں ہے
مسلمانوں کو بٹوارے نے مارا

بہار کے فسادات اور غارت گری کلکتہ یا نواکھلی جیسا اچانک پھوٹ پڑنے والا فساد نہ تھا۔ بلکہ پوری تیاری اور منصوبہ بندی کا نتیجہ تھا اس لیے اس کے پھیلنے کے حدود، دورانیہ اور اس کی شدت اور نتایج سب زیادہ اندوہ ناک تھے، جنھوں نے پورے ملک کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ اس میں فساد اور غارت گری کے خاتمے، امن کے قیام، مسلمانوں کی امداد اور ان کی دوبارہ آبادکاری کی کوششوں میں پنجاب کے احرار، سرحد کے خدائی خدمت گاروں، جمعیت

کے رضا کاروں، ندوۃ العلماء (لکھنو) کے طلبہ، گاندھی جی اپنے ساتھیوں کے ساتھ اور کئی دوسری جماعتوں کے افراد بہار کے مصیبت زدگان کی مدد کے لیے پہنچ گئے لیکن لیگ کے کسی رہنما کو اس کی توفیق نہ ملی جوان کی اشک شوئی کرتا۔ بہار کے لیگی رہنما بہار سے فرار ہو چکے تھے، حسین امام کا ایک طویل دور دہلی میں گزرا۔ صبح شام جناح صاحب سے ملتے، مسلمانوں پر ظلم وستم کا ماتم کرتے اور ہندوؤں کو برا کہتے لیکن فساد کو مٹانے، امن کے قیام اور مصیبت زدوں کی امداد سے دور ونفور رہے۔ پاکستان کا نقشِ حقیقت تاریخ کے صفحے پر ابھی نمایاں نہ ہوا تھا کہ سرحد، مغربی پنجاب، مشرقی پنجاب، دہلی، میوات، گڑھ مکتیشر اور مختلف علاقوں میں فرقہ وارانہ فساد پھوٹ پڑے تھے۔ ہندو مسلمان ایک دوسرے کے ہاتھوں سے قتل ہو رہے تھے، مکان لٹ رہے تھے، بستیاں آگ کی نذر ہو رہی تھیں، عزتیں لوٹی جارہی تھیں لیکن جناح صاحب نے نہ پاکستان میں مسلم اکثریت کے علاقوں میں مسلمانوں کو قتل و غارت گری سے روکا، نہ ہندستان میں مسلم اقلیت کی خبر لی۔ پاکستان کے وجود میں آنے سے بہت پہلے ہی جناح صاحب مسلم اقلیت کو اکثریت والے مسلمانوں پر اپنے آپ کو قربان کر دینے کا مشورہ دے چکے تھے۔ پھر انھوں نے کہا کہ قربان کر دیا ہے پھر انھوں نے کہا کہ وہ ان کی فاتحہ بھی پڑھ چکے ہیں۔ جناح صاحب کی شقاوت ملاحظہ کیجیے کہ ایم سی چھاگلا کے ایک سوال کہ ہندستان کی مسلم اقلیت کا کیا بنے گا۔ ان کا جواب تھا ''وہ اپنا انتظام خود کرلیں گے!''

گاندھی جی تو فساد اور غارت گری کو روکنے کے لیے کلکتہ، نواکھلی، بہار اور دہلی پہنچے۔ دہلی میں انھوں نے مسلمانوں کو بچانے اور انھیں ان کے گھروں میں آباد کرنے کے لیے برت رکھا۔ برت توڑنے کے لیے شرایط میں پاکستان کے دابے ہوئے ۶۰ کروڑ روپے ادا کروائے۔ گاندھی جی کو اس مسئلے کی طرف توجہ جناح صاحب کے نئے بنائے ہوئے دشمن ماؤنٹ بیٹن نے دلائی تھی! بالآخر یہ بوڑھا ہندو رہنما مسلمانوں کو بچاتے بچاتے ایک ہندو متعصب اور مسلمان دشمن کے غضب کا نشانہ بن گیا۔ فساد کا دفع، امن کا قیام اور مظلوموں کو ان کا حق دلانا تو مسلمانوں کا فرض تھا۔ افسوس کہ جناح صاحب اس فرض کی ادائیگی میں نہ

صرف ناکام رہے بلکہ ہندستان پاکستان میں پھیلنے والے فساد اور غارت گری میں سب سے زیادہ انھیں کا حصہ ہے۔ حتیٰ کہ پاکستان کے ایک نئے استعمار کی غلامی میں گرفتار ہونے اور تباہی کے گڑھے کے کنارے تک پہنچانے میں سب سے بڑا حصہ انھیں کے طرزِ سیاست غلط اقدامات اور سیاسی فیصلوں کا ہے۔ افسوس اور صد ہزار افسوس، خدا پاکستان کی حفاظت فرمائے۔ والسلام علیکم ورحمۃ اللہ

خاکسار

ابوسلمان شاہ جہان پوری

بمطالعہ محترم نور محمد قریشی (ایڈووکیٹ)

لاہور

نوٹ:

جناب نور محمد قریشی (ایڈووکیٹ) کی کتابِ لاجواب تو صاحبِ منزل ھے کہ بھٹکا ہوا راھی کا پانچواں ایڈیشن حال ہی میں مزید اہم اضافوں کے ساتھ شایع ہوا ہے۔ اس ایڈیشن کی ضخامت ۶۲۰ صفحات ہے۔

(ادارہ)

KASHMIR
AFGHANISTAN
تو صاحبِ منزل ہے کہ بھٹکا ہوا راہی
AGENCY
CENTRAL INDIA
SEA
نور محمد قریشی
(ایڈووکیٹ)
COLOURING
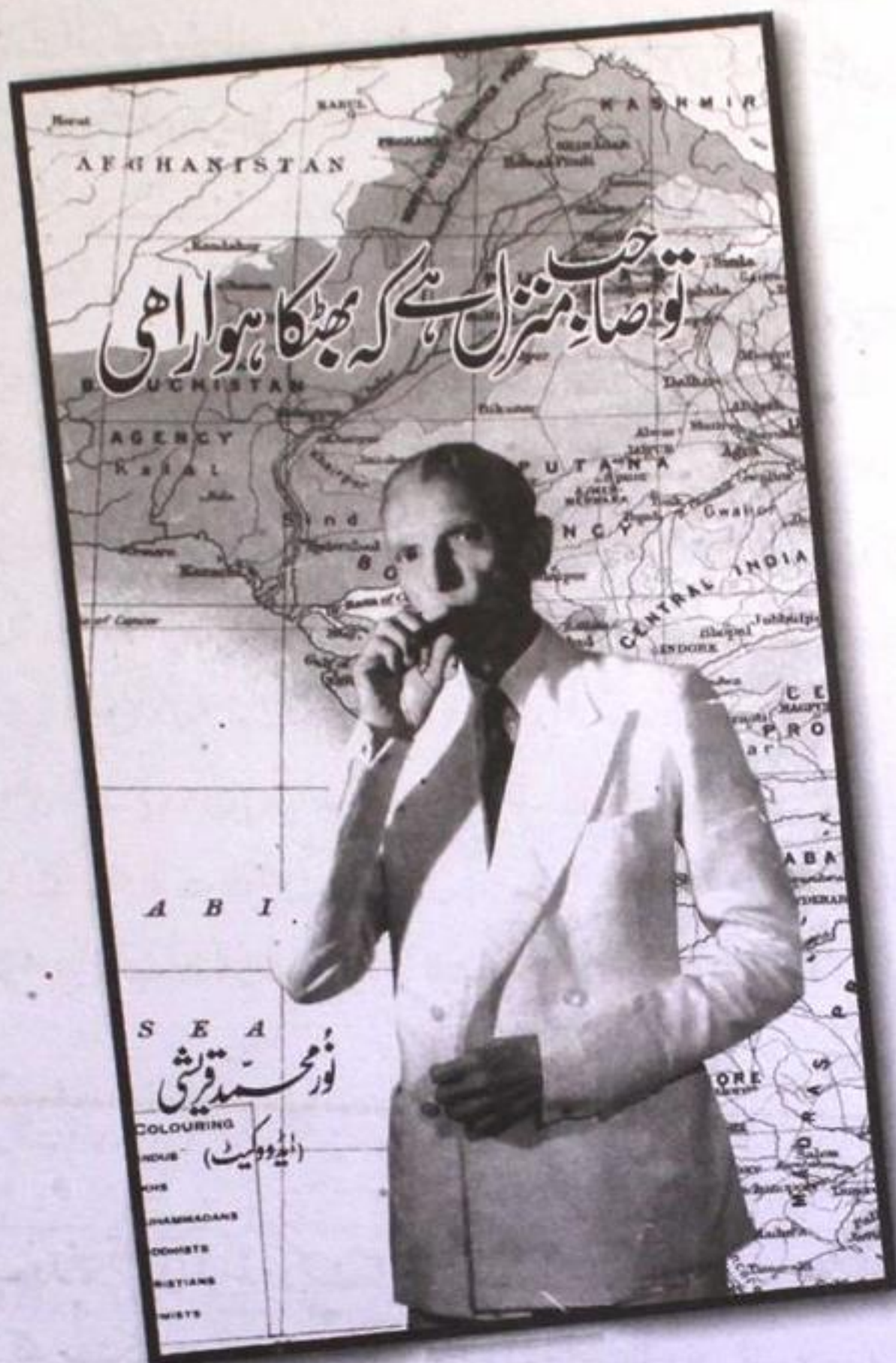
مراجع ومصادر

۱۔ ابوالکلام آزاد اور قوم پرست مسلمانوں کی سیاست/ محمد فاروق قریشی/ مکتبہ فکر ودانش۔لاہور/ اشاعت اوّل: مئی ۱۹۹۱ء/ ۵۱۷ص

۲۔ ابوالکلام آزاد– سوانح و افکار/ شورش کاشمیری/ مطبوعات چٹان۔لاہور/ اشاعت سوم: اکتوبر ۱۹۹۹ء/ ۵۱۶ص

۳۔ اتحاد بین المسلمین اور جمعیۃ علمائے ہند/ مولانا اخلاق حسین قاسمی، مرتبہ: ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہان پوری/ مجلس یادگار شیخ الاسلام۔کراچی/ ۲۰۰۵ء

۴۔ انڈیا ونز فریڈم (انگریزی)/ مولانا ابوالکلام آزاد/ اورینٹ لانگ مین۔دہلی

۵۔ انڈیا ونس فریڈم/ مولانا ابوالکلام آزاد، مرتبہ: ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہان پوری/ مکتبہ رشیدیہ۔کراچی

۶۔ آپ بیتی/ خان عبدالغفار خاں/ روہتاس بکس۔لاہور/ جنوری ۱۹۹۰ء/ ۲۰۵ص

۷۔ آدھی رات کی آزادی/ لیری کولنس ودامنک لیپر، ترجمہ وتلخیص: سعید سہروردی/ سری نگر۔کشمیر/ س،ن

۸۔ آواز دوست/ مختار مسعود/ شاہ بیگم وشیخ عطاءاللہ ٹرسٹ۔لاہور/ جنوری ۱۹۷۳ء

۹۔ باچا خان (سوانح حیات خان عبدالغفار خاں)/ فارغ بخاری/ نیا مکتبہ۔پشاور/ اشاعت اوّل: س،ن/ ۴۲۳ص

۱۰۔ برصغیر پاک و ہند کی شرعی حیثیت/ ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہان پوری/ مجلس یادگار شیخ الاسلام۔کراچی/ ۱۹۹۳ء/ ۱۴۴ص

۱۱۔ برصغیر کیسے ٹوٹا؟/ عارف میاں/ براڈ لے۔لاہور/ اشاعت اوّل: اگست ۲۰۰۹ء/ ۴۱۶ص

۱۲۔ برطانوی راج کے آخری ایام/ لیونارڈ موزلے، مترجمہ: سید فضل حسین/ ادارہ نقوش۔لاہور

۱۳۔ برعظیم پاک و ہند کی ملتِ اسلامیہ/ ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی، مترجم: ہلال احمد زبیری/ کراچی/ ۱۹۶۷ء

۱۴۔ پاکستان: جمہوریت کا زوال / محمد فاروق قریشی / مکتبۂ فکر و دانش۔ لاہور / س،ن / ۳۷۸ص

۱۵۔ پاکستان: قیام اور ابتدائی حالات / سری پرکاش، مترجمہ: محمد حمایت الحسن / تخلیقات۔ لاہور / اگست ۱۹۹۳ء / ۱۵۸ص

۱۶۔ پنجاب کی سیاسی تحریکیں / عبداللہ ملک / کوثر پبلشرز۔ لاہور / اشاعت چہارم: فروری ۱۹۸۶ء / ۳۴۵ص

۱۷۔ پیغامِ ہدایت در تائید پاکستان و مسلم لیگ / مولانا محمد ابراہیم میر سیالکوٹی / ثنائی پریس۔ امرتسر / س،ن

۱۸۔ تاریخ احرار / چودھری افضل حق / مکتبہ مجلس احرار اسلام پاکستان۔ ملتان / اشاعت ثانی: ۱۳۸۷ھ مطابق ۱۹۶۸ء / ۲۷۱ص

۱۹۔ تاریخ پاکستان: پس منظر و پیش منظر / محمود احمد ظفر / نشریات۔ لاہور / ۲۰۱۰ء / ۲۰۷ص

۲۰۔ تاریخ تحریک پاکستان (حصہ اوّل) / ڈاکٹر عبدالسلام خورشید۔ ڈاکٹر روشن آراء راؤ / مقتدرہ قومی زبان پاکستان۔ اسلام آباد / اشاعت دوم: ۲۰۰۲ء / ۲۸۱ص

۲۱۔ تحریک پاکستان اور انتقال اقتدار (آخری وائسرائے ماؤنٹ بیٹن کا عہد- ۲۲/مارچ تا ۱۵/اگست ۱۹۴۷ء) / ترجمہ و ترتیب: محمد فاروق قریشی / فکشن ہاؤس۔ لاہور / س،ن / ۸۲۴ ص

۲۲۔ تحریک پاکستان پر ایک نظر / مولانا محمد حفظ الرحمٰن سیوہاروی / جمعیۃ علمائے ہند۔ دہلی / س،ن / ۶۴ص

۲۳۔ تحریک پاکستان کا ایک باب / پروفیسر محمد سرور / سندھ ساگر اکادمی۔ لاہور / اشاعت اوّل: جون ۱۹۷۵ء / ۲۲۴ص

۲۴۔ تحریک کشمیر سے تحریک ختم نبوت تک / چودھری غلام نبی امرتسری / مؤلف خود: گوجرانوالہ / اشاعت دوم: جون ۱۹۹۳ء / ۳۹۲ص

۲۵۔ تحریکِ خلافت / قاضی محمد عدیل عباسی / قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان۔ نئی دہلی / تیسری اشاعت: ۲۰۱۰ء / ۲۷۹ص

۲۶۔ تو صاحبِ منزل ہے کہ بھٹکا ہوا راہی / نور محمد قریشی (ایڈووکیٹ) / النور۔ لاہور / اشاعت دوم: اگست ۲۰۱۱ء / ۵۸۲ص

۲۷۔ جناح اور گاندھی / ایس کے مجمدار، مترجمہ محمد تقی رحیم / خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری۔ پٹنہ

۲۸۔ جناح آف پاکستان (انگریزی)/اسٹینلے وولپرٹ/آکسفورڈیونیورسٹی پریس۔نیویارک/ ۱۹۸۴ء
۲۹۔ جناح بانی پاکستان (اردوترجمہ)/اسٹینلے وولپرٹ/ کراچی/۱۹۸۹ء
۳۰۔ جوہر تقوم/ضیاءالدین لاہوری/ادارہ ثقافت اسلامیہ۔لاہور/اشاعت اول:۱۹۹۴ء/۲۹۱ص
۳۱۔ جھروکے (آپ بیتی)[پانچویں جلد]/ڈاکٹر فرخ ملک/ڈاکٹر فرخ ملک ٹرسٹ۔لاہور/ ۲۰۱۱ء/۴۷۹ص
۳۲۔ چشم دید (آپ بیتی)/فیروز خان نون/ناشر:لیڈی وقارالنساءنون۔اسلام آباد/اشاعت چہارم:جولائی ۱۹۹۹ء/۴۴۸ص
۳۳۔ حقائق حقائق ھیں/عبدالولی خان/ناشر:زاہد خاں۔راولپنڈی/مارچ ۱۹۸۸ء/۳۰۸ص
۳۴۔ حیات امیر شریعت/جانباز مرزا/ مکتبہ تبصرہ۔لاہور/۱۹۸۰ء
۳۵۔ حیات شیخ الاسلام/مولانا سیّد محمد میاں/ مکتبہ رشیدیہ۔کراچی
۳۶۔ حیات قائداعظم. چند نئے پھلو/ احمد سعید/ قومی ادارہ برائے تحقیق تاریخ وثقافت۔ اسلام آباد/۱۹۷۹ء/۱۲۸ص
۳۷۔ خطبات ابوالکلام آزاد/ناشر:ایم ثناءاللہ خان اینڈ سنز۔لاہور
۳۸۔ خطبات قائداعظم/رئیس احمد جعفری ندوی/مقبول اکیڈمی۔لاہور/س،ن/۶۱۵ص
۳۹۔ دو قومی نظریہ- ایك تاریخی جائزہ/ پروفیسر امجد علی شاکر/جمعیت پبلی کیشنز۔لاہور/ اگست ۲۰۰۷ء/۲۰۰ص
۴۰۔ دی سول سپو کس مین (انگریزی)/عائشہ جلال/سنگ میل پبلشرز۔لاہور/۱۹۹۹ء
۴۱۔ دی گریٹ ڈیوائیڈ (انگریزی)/ایچ وی ہڈسن/ آکسفورڈیونیورسٹی پریس/۲۰۰۸ء
۴۲۔ رتی جناح (انگریزی)/ کانجی دوارکاداس/ ممبئی
۴۳۔ روز ان ڈسمبر (انگریزی)/سی ایم چھاگلا/ممبئی/۲۰۰۰ء
۴۴۔ سندھ کی آواز/جی ایم سید،مترجم: سیّد فہیم شناس کاظمی/ فکشن ہاؤس۔لاہور/ ۲۰۰۳ء/ ۳۴۴ص
۴۵۔ سیکولر اور وطن پرست جناح/ڈاکٹر اجیت جاوید،مترجم:محمد عمر برنی/سانجھ۔لاہور/ مئی ۲۰۰۸ء/۳۲۰ص
۴۶۔ شاہ اسماعیل شھید/عبداللہ بٹ/قومی کتب خانہ۔لاہور
۴۷۔ شاھراہ پاکستان (آپ بیتی)/چودھری خلیق الزمان/ کراچی/۱۹۶۳ء
۴۸۔ شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی- ایك سیاسی مطالعہ/ ڈاکٹر ابو

سلمان شاہ جہان پوری / مجلس یادگار شیخ الاسلام۔کراچی / اشاعت سوم: اگست ۲۰۰۶ء / ۳۶۸ص

۴۹۔ شیخ الاسلام مولانا مدنی کی سیاسی ڈائری: اخبار و افکار کی روشنی میں (آٹھویں جلد) / مرتب: ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہان پوری / مجلس یادگار شیخ الاسلام۔کراچی / ۱۴۳۰ھ۔ ۲۰۰۹ء / ۱۰۴۸ص

۵۰۔ ظہور پاکستان / (آپ بیتی) / چودھری محمد علی (سابق وزیر اعظم پاکستان) / مکتبہ کارواں۔ لاہور

۵۱۔ علمائے حق اور ان کے مجاھدانہ کارنامے / مولانا سیّد محمد میاں / مکتبہ رشیدیہ۔کراچی

۵۲۔ فریڈم ایٹ مڈنائٹ (انگریزی) / لیری کولینز، ڈومینک لیپر / ہارپر کولنز۔لندن / ۱۹۹۷ء

۵۳۔ فیکٹس آر فیکٹس (انگریزی) / عبدالولی خان / باچاخان ٹرسٹ۔پشاور / ۲۰۰۶ء

۵۴۔ قائداعظم اور ان کا عھد / مولانا رئیس احمد جعفری ندوی / مقبول اکیڈمی۔لاہور

۵۵۔ قائداعظم بحیثیت گورنر جنرل / قیوم نظامی / جہانگیر بکس۔لاہور / ۲۰۱۱ء

۵۶۔ قائداعظم جناح اسٹڈیز ان انٹرپریٹیشن (انگریزی) / ڈاکٹر شریف المجاہد / قائداعظم اکیڈمی۔کراچی / ۱۹۸۱ء

۵۷۔ قائداعظم جناح: برصغیر کا مردِ حریّت / شریف فاروق / مکتبہ اتحاد۔پشاور / اشاعت اوّل: س،ن / ۵۳۲ص

۵۸۔ قائداعظم کا مذھب اور عقیدہ / منشی عبدالرحمٰن خاں / کاروانِ ادب۔ملتان / اشاعت اوّل: اپریل ۱۹۸۶ء / ۲۲۲ص

۵۹۔ قائداعظم کے آخری لمحات / ڈاکٹر کرنل الٰہی بخش / کراچی

۶۰۔ قائداعظم کے رفقا سے ملاقاتیں / سیّد محمد ذوالقرنین زیدی / قومی ادارہ برائے تحقیق تاریخ و ثقافت۔اسلام آباد / ۱۹۹۰ء / ۱۴۲ص

۶۱۔ قائداعظم محمد علی جناح: شخصیت و کردار / کرم حیدری / ادارہ تحقیقاتِ اسلامی۔اسلام آباد / اشاعت اوّل: ۱۴۰۰ھ / ۷۹ص

۶۲۔ قائداعظم محمد علی جناح / چودھری رحمت علی علوی / ادارہ صوت الاسلام۔لائل پور [فیصل آباد] / اشاعت اوّل: مارچ ۱۹۷۶ء / ۱۹۱ص

۶۳۔ قائداعظم میری نظر میں / ایم ایچ اصفہانی / روٹا پرنٹ ایجنسی۔کراچی / اشاعت اوّل: ۱۹۶۸ء / ۴۵۳ص

۶۴۔ قائداعظم: ابتدائی تیس سال (۱۸۷۶۔ ۱۹۰۶ء) / رضوان احمد / جنرل نالج اکیڈمی۔ کراچی / اشاعت اوّل: دسمبر ۱۹۷۷ء / ۱۶۰ص

۶۵۔ قائداعظم: کیا تھے، کیا نہیں تھے؟/ ڈاکٹر مبارک علی/ تاریخ پبلی کیشنز۔ لاہور/ ۲۰۱۲ء/ ۱۲۴ص
۶۶۔ قائداعظم، پاکستان اور دنیا/ گوہر سلطانہ عظمیٰ/ فرنٹیئر پوسٹ پبلی کیشنز۔ لاہور/ اشاعت اوّل: ۱۹۹۳ء/ ۲۷۸ص
۶۷۔ قایداعظم کے خاندانی تنازعے/ خالد احمد/ پرنٹ لائن پبلشرز۔ لاہور/ اپریل ۲۰۰۰ء
۶۸۔ قرار داد پاکستان کی حقیقت/ محمد فاروق قریشی/ فکشن ہاؤس۔ لاہور
۶۹۔ قرار داد مقاصد کا مقدمہ/ سردار شیر عالم خاں ایڈووکیٹ، چودھری محمد یوسف ایدووکیٹ/ الشریعہ اکادمی۔ گوجرانوالہ/ ستمبر ۲۰۰۷ء/ ۲۰۶ص
۷۰۔ کاروان احرار (آٹھویں جلد)/ جانباز مرزا/ مکتبہ تبصرہ۔ لاہور/ اگست ۱۹۸۶ء/ ۵۹۶ص
۷۱۔ کیا تقسیم ہند مسئلے کا حل تھا؟/ احمد کلیم ہارونی/ الہارون۔ کوئٹہ/ اشاعت دوم: ۱۹۸۰ء
۷۲۔ گفتار قائداعظم/ احمد سعید/ قومی ادارہ برائے تحقیق تاریخ وثقافت۔ اسلام آباد/ ۱۹۷۶ء
۷۳۔ گم کشتہ قوم (آپ بیتی)/ سردار شوکت حیات خان/ جنگ پبلشرز۔ لاہور/ دسمبر ۱۹۹۵ء
۷۴۔ لبرٹی آر ڈیتھ (انگریزی)/ پیٹرک فرنچ/ ہارپر کولنز۔ لندن/ ۱۹۹۷ء
۷۵۔ مارشل لا سے مارشل لا تک/ سید نور احمد/ دار الکتاب۔ لاہور/ س،ن/ ۵۲۴ص
۷۶۔ متحدہ قومیت اور اسلام/ مولانا سیّد حسین احمد مدنی/ مکتبہ محمودیہ۔ لاہور
۷۷۔ محشرستانِ ہند (۱۹۴۷ء کے خونی انقلاب کی تاریخی دستاویز)/ ایم اے باری نجیب آبادی/ ادارہ شاعت سرحد۔ پشاور/ س،ن/ ۲۳۱ص
۷۸۔ محمد علی جناح/ کانجی دوآرکا داس۔ مترجم ومرتب: سیّد شہاب الدین دسنوی/ علی مجلس۔ دہلی/ اشاعت اوّل: ۱۹۷۰ء/ ۱۲۸ص
۷۹۔ محمد علی جناح/ مرزا راشد علی بیگ/ مترجم: ڈاکٹر عابد رضا بیدار/ خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری۔ پٹنہ/ ۱۹۹۶ء
۸۰۔ محمد علی جناح/ ہیکٹر بولایتھو، مترجم: زہیر صدیقی/ اردو سائنس بورڈ۔ لاہور/ ۲۰۰۱ء/ ۳۲۱ص
۸۱۔ مختصر تاریخ قوم بلوچ اور بلوچ خوانین/ احمد یار خان (خان آف قلات)/ کوئٹہ
۸۲۔ مسلم لیگ کی آٹھ مسلم کش غلطیاں/ مولانا سیّد حسین احمد مدنی/ دہلی/ ۱۹۴۵ء
۸۳۔ مسلمانوں کا روشن مستقبل/ طفیل احمد منگلوری/ دہلی/ ۱۹۴۵ء
۸۴۔ مسلمانوں کے افکار و مسائل آزادی سے پہلے/ مولانا سیّد حسین احمد مدنی، مرتبہ: ڈاکٹر ابو سلمان شاہ جہان پوری/ خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری۔ پٹنہ/ ۲۰۰۳ء/ ۱۰۱ص

۸۵۔ مسئلۂ کشمیر: پس منظر، موجودہ صورتِ حال اور حل / ڈاکٹر محمد فاروق خان / مصنف خود: سوات (خیبر پختون خوا) / اشاعت اوّل: فروری ۲۰۰۲ء / ۶۸ص

۸۶۔ مولانا ابوالکلام آزاد کے انکشافات / شکیل احمد ضیاء / شبل پبلی کیشنز۔ کراچی / مارچ ۱۹۸۸ء

۸۷۔ مولانا غلام رسول مہر اور پاکستان اسکیم / پیر علی محمد شاہ راشدی، مرتب: ڈاکٹر ابو سلمان شاہ جہان پوری / مجلس یادگار مہر۔ کراچی / نومبر ۱۹۹۲ء / ۱۸۰ص

۸۸۔ میرا قائد / زیڈ۔ اے۔ سلہری / لاہور

۸۹۔ میرے بھائی / فاطمہ جناح / کراچی

۹۰۔ میں نے پاکستان بنتے دیکھا / کرنل (ر) حامد محمود / القلم دار الاشاعت۔ اسلام آباد / اشاعت اوّل: اگست ۱۹۹۶ء / ۴۳۱ص

۹۱۔ نامۂ اعمال / سر نواب محمد یامین خاں / آئینۂ ادب۔ لاہور

۹۲۔ نقش حیات (خودنوشت آپ بیتی) / مولانا سید حسین احمد مدنی / عزیز پبلی کیشنز۔ لاہور / س، ن / ۷۶۳ص

۹۳۔ نقشِ آزاد (مولانا ابوالکلام آزاد کے مکاتیب کا مجموعہ) / مولانا غلام رسول مہر / شیخ غلام علی اینڈ سنز پبلشرز۔ لاہور / اشاعت اوّل: جنوری ۱۹۵۹ء

۹۴۔ نقوش قائداعظم / ڈاکٹر رحیم بخش شاہین / القمر۔ لاہور / ۱۹۹۷ء / ۲۴۳ص

۹۵۔ نمود سحر / میر ظفر زیدی / پولیکن سروسز۔ بہاولپور / اشاعت اوّل: ۱۹۸۷ء / ۲۳۲ص

۹۶۔ وہ جناح جنھیں میں جانتا ہوں / ڈاکٹر سچد انند سنہا، مترجم: احمد یوسف / خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری۔ پٹنہ / اشاعت ثانی: ۱۹۹۸ء / ۲۴ص

۹۷۔ ھاری رپورٹ — کل اور آج / ایم مسعود کھدر پوش / جنگ پبلشرز۔ لاہور / اشاعت دوم: اپریل ۱۹۹۱ء / ۹۴ص

۹۸۔ ہند پاکستان کی تحریک آزادی اور علمائے حق کا سیاسی موقف / مولانا سعید احمد اکبر آبادی، ڈاکٹر ابو سلمان شاہ جہان پوری / جمعیت پبلی کیشنز۔ لاہور / جنوری ۲۰۰۷ء / ۲۳۹ص

۹۹۔ ہندستان اپنے حصار میں / ایم جے اکبر / خدا بخش لائبریری۔ پٹنہ

۱۰۰۔ ہندستان میں ابن تیمیہ (مولانا ابوالکلام آزاد) / آغا شورش کاشمیری، مرتب: ڈاکٹر ابو سلمان شاہ جہان پوری / دار الکتاب۔ لاہور / ۲۰۰۶ء / ۳۸۰ص

۱۰۱۔ ہند — پاک ڈائری / مولانا وحید الدین خاں / گڈ ورڈ بکس۔ دہلی / ۲۰۰۶ء

۱۰۲۔ ھنیاموں میں زندیی (آپ بیتی)/ مشتاق احمد وجدی/ مصنف خود۔لاہور/ اشاعت دوم: جنوری ۱۹۸۰ء/۲۱۹ص
۱۰۳۔ ھیں اھل نظر کشور پنجاب سے بیے زار/ جاوید اختر بھٹی/ کتاب دوست۔ملتان/ اشاعت اوّل: جنوری ۲۰۰۹ء/۱۷ص
۱۰۴۔ یادوں کے سائے/ عتیق صدیقی/ تخلیقات۔لاہور/۲۰۱۱ء/ ۲۲۴ص

رسائل وجرائداور اخبارات

۱۔ روزنامہ الجمعیت دہلی (امام الہند نمبر)
۲۔ روزنامہ الجمعیت دہلی (شیخ الاسلام نمبر)
۳۔ ماہنامہ الحق اکوڑہ خٹک (خصوصی اشاعت: پاکستان کے پچاس) سال/ اگست ۱۹۹۷ء/ ۱۶۸ص
۴۔ روزنامہ امروز لاہور
۵۔ روزنامہ انصاری دہلی
۶۔ ماہنامہ آتش فشاں لاہور (قائداعظم نمبر)
۷۔ روزنامہ پاکستان ٹائمز لاہور (انگریزی)
۸۔ روزنامہ جنگ کراچی
۹۔ ہفت روزہ چٹان لاہور
۱۰۔ جریدہ نئی زندیی الہ آباد (خاص پاکستان نمبر)/۱۹۴۶ء
۱۱۔ سہ روزہ زمزم لاہور
۱۲۔ روزنامہ ڈان کراچی (انگریزی)
۱۳۔ مجلّہ علم و آیھی کراچی (اشاعت خاص: محمد علی جناح-حیات، افکار و خدمات)/ ۱۹۷۷ء
۱۴۔ ماہنامہ قومی ڈائجسٹ لاہور (خصوصی اشاعت: مسلم لیگ کے سو سال)/ ستمبر ۲۰۰۷ء/ ۴۰۰ص
۱۵۔ روزنامہ مشرق لاہور
۱۶۔ روزنامہ نوائے وقت لاہور
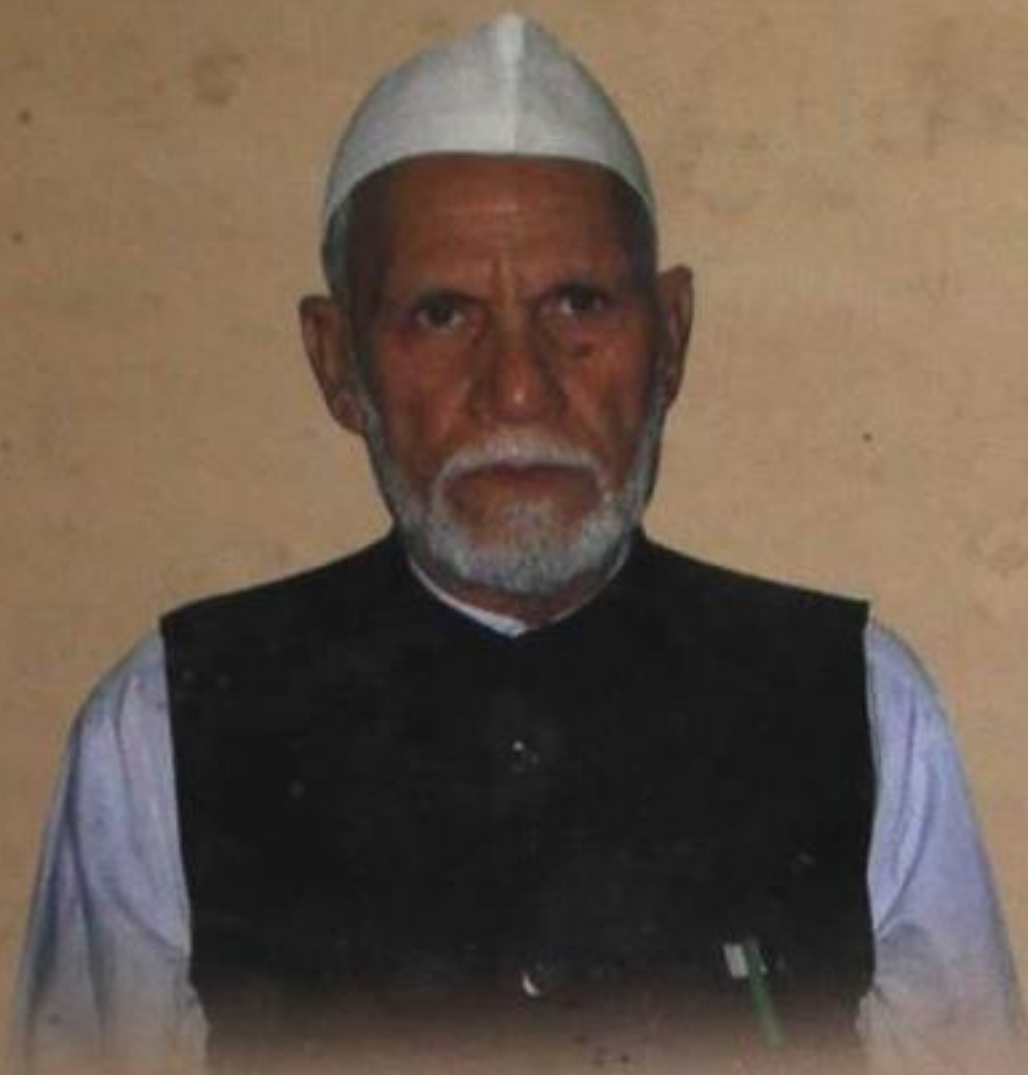
ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہان پوری

سندھ ساگر اکادمی لاہور
0321-4650131